۶۸۶

معاشیات

انجمن ترقی اردو کا ماہوار معاشی رسالہ

ایڈیٹر طفیل احمد خاں ایم۔ اے

نمبر ۱	ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۶ء	جلد ۱

۱ گذارش . . . . مولوی عبدالحق ۲

۲ نئے سال کی غذائی صورت حال . . . . محمد سالم۔ ایم۔ اے ۶

۳ خطہ وار منصوبہ بندی . . . . ڈاکٹر لول جینا ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) ۱۲

۴ سویت معاشی نظام پر پلننگ کی تباہ کاریاں . . . . دو ورکن ۲۶

۵ جائز سود اور ناجائز سود . . . . صاحبزادہ محمد عمر (نور الہیٰ) ۳۱

۶ منصوبہ بندی کیا ہے؟ . . . . محمد عبدالقادر بی۔ ایس۔ سی (آنرز) لندن ۳۶

۷ معاشی دنیا (نوٹ) . . . . ادارہ ۴۰

۸ تبصرے . . . . ادارہ ۴۸

ادارِیہ

گزارِش

جو چیزیں سب سے قریب ہیں اُن پر انسان کی نظر سب کے بعد پڑتی ہے۔ اور جو سب سے دُور ہیں اُن کا مطالعہ وہ سب سے پہلے کرتا ہے۔ فلکیات کا علم انسان نے سب سے پہلے حاصل کیا اور اپنی ذات یعنی نفسیات کے علم کا نمبر سب سے بعد میں آیا۔ یہی حال معاشیات کا ہے جس کا تعلق ہماری زندگی اور زندگی کے ہر شعبے سے قریب تر ہے۔ اِسے علم کی حیثیت حاصل ہوئے کچھ بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ اور اب تو یہ کیفیت ہے کہ یہ زندگی کے تمام شعبوں پر چھایا ہوا ہے۔ اور دوسری سب تحریکیں اس کے سامنے ماند ہوگئی ہیں۔ ہماری زندگی کی ہر تحریک کا اس سے لگاؤ ہے۔ اور بغیر اس کے مسائل سمجھے کوئی تحریک سرسبز نہیں ہوسکتی، کھانا، لباس، رہنے کا آسرا یہ انسان کی مقدم ضروریات ہیں، اور یہی معاشیات کے بنیادی عنصر ہیں۔ یوں دیکھنے میں یہ معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایسی آسان نہیں۔ اِن چیزوں کا تعلق زراعت، حرفت و صنعت، مالیات سیاست، سائنس سب سے ہے پھر یہ مقامی اور ملکی امور نہیں رہے بلکہ عالم گیر ہیں۔ اور ان معمولی چیزوں کے مسائل ایسے پیچیدہ اور وسیع ہوگئے ہیں کہ ان کا اپنی زبان میں سمجھانا سہل نہیں۔

پچھلی صدی میں انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ اب بہت کچھ فرسودہ ہوگئی ہیں۔

ان کی بحثیں اور مسائل یا تو بالکل بیکار ہوگئے ہیں یا قابل ترمیم۔ اُن کی حیثیت زیادہ تر اب تاریخی رہ گئی ہے اور خاص خاص لوگوں کے سوا کوئی ان کا مطالعہ نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ ان مسائل کا تعلق زمانے کے حالات سے ہے۔ جیسے جیسے حالات بدلتے رہے ان مسائل کی نوعیت بھی بدلتی رہی۔ نئی نئی مشینوں، سائنس کے عجیب وغریب انکشافات نے زندگی میں بڑا تغیر پیدا کر دیا ہے۔ پرانے اصول اور قوانین پر از سر نو نظر ڈالنی پڑی اور نئے حالات کی رو سے نئے اصول و قواعد بنانے پڑے۔ اور اس جنگ کے بعد تو معاشیات میں بہت بڑا انقلاب ہوگیا ہے۔ اور اس علم کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ملک کی اصلاح اور خوش حالی کی جدوجہد میں اس کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔

انجمن ترقی اردو کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ اردو ادب کی کمی پوری کرے۔ کوئی زبان شایستہ اور ادبی زبان ہونے کا دعوا نہیں کر سکتی جو علمی خیالات ادا کرنے سے قاصر ہے اور جس میں علوم و فنون کا کافی ذخیرہ نہیں ہے۔ اسی بنا پر انجمن نے رسالہ "سائنس" جاری کیا جو ۱۹۲۸ء سال سے برابر جاری ہے اور اب بہت مقبول ہوگیا ہے۔

معاشیات میں ہم سائنس سے بھی پیچھے ہیں۔ ہماری زبان میں اس کا بہت کم سامان ہے۔ میرا ایک مدت سے یہ خیال تھا کہ جس طرح بن سکے یہ کمی پوری کی جائے۔ اس کی ایک ہی صورت خیال میں آئی کہ کتابیں تالیف اور ترجمہ کرائی جائیں۔ ایسے لوگ جو معاشیات پر کتابیں عام فہم زبان میں لکھ سکیں۔ بہت ہی کم ہیں۔ رہا انگریزی کتابوں کا ترجمہ، تو وہ اس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ اول تو یہ کتابیں ایسے لوگوں کے لیے لکھی گئی ہیں جو پہلے سے معاشیات کے مسائل سے کچھ نہ کچھ واقف ہیں۔ یا ان کا خاص حالات اور ممالک سے تعلق ہے۔ یا ایسی اعلیٰ پایہ کی ہیں جو اس وقت ہمارے کام نہیں آ سکتیں۔ دوسرے ترجمے میں آدمی مقید ہو جاتا ہے۔ اور اسے اصل مؤلف کے خیال و بیان کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے اس میں شگفتگی پیدا نہیں ہوتی۔ اگر مر پٹ کر ترجمہ کیا بھی تو کوئی پڑھتا نہیں اور پڑھتے ہیں تو دل نہیں لگتا۔ یہی وجہ ہے کہ علمی کتابوں کے ترجمے بہت کم مقبول ہوئے۔ ہمارے مخاطب اردو داں ہیں جو اس علم کے مسائل سے بہت کم واقف ہیں۔ انھیں مائل کرنے کے لیئے اس بات کی ضرورت ہے کہ بیان کا ڈھب

ایسا ہو جو دل کو لگے اور اس میں مثالیں اور حالات ایسے ہوں جن سے وہ مانوس ہوں۔ یہ بات تالیف ہی سے حاصل ہوسکتی ہے جس میں بیان کی آزادی ہوتی ہے۔ ترجمہ صرف انھیں کتابوں کا کارآمد ہوتا ہے جو بنیادی ہیں اور کسی فن یا علم میں اعلیٰ رتبہ رکھتی ہیں۔ لیکن ان کا نمبر تالیف کے بعد آنا چاہیے۔ بالفرض اگر ان تمام دشواریوں کے باوجود کسی کتاب کے لکھوانے کی کوشش بھی کی تو کتاب کا تیار کرانا، اس کا چھپوانا، پھر اس کی اشاعت کا اہتمام کرنا بہت دیر طلب ہو اور فائدے کے لحاظ سے غیر یقینی۔ اور اب دنیا کا یہ حال ہے کہ آن میں کچھ ہے آن میں کچھ۔ اور ہمیں یہ جلدی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو جلد سے جلد ملک میں علم کے دریا بہادیں۔ کتابیں لکھنا، اور شائع کرنا بیشک مفید ہے اور یہ بھی ہم کریں گے۔ لیکن یہ کافی نہیں وقت اور کام کی اہمیت کسی اور چیز کی بھی طالب ہے۔

حسن اتفاق سے ۳۱ دسمبر ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا معاشیات کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی۔ اگرچہ میں اس علم سے بالکل بے بہرہ ہوں مگر میں اس میں شریک ہوا۔ میرا مقصد کچھ اور تھا۔ میں نے جلسے کے ختم پر سب اردو داں معاشیین کو پکڑا اور اپنے ہاں دعوت دی۔ اس صحبت میں اردو میں معاشیات پر کتابیں لکھنے اور معاشیاتی مسائل کو ملک میں مقبول کرنے کے متعلق دیر تک گفتگو رہی۔ منجملہ دوسری تجویزوں کے ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی جسے سب نے پسند کیا کہ اردو میں ایک ماہانہ رسالہ معاشیات پر جاری کیا جائے۔ اور ان میں سے اکثر نے اس میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔

ان میں سے بعض صاحبوں نے یہ عذر پیش کیا کہ اگرچہ ہم زبان جانتے ہیں لیکن اس میں علمی مضمون لکھنا مشکل ہے۔ فی الحال انگریزی میں لکھیں گے۔ جب ہم نے "سائنس" جاری کرنے کا ارادہ کیا تھا تو اس وقت بھی بعض صاحبوں نے یہی عذر پیش کیا تھا۔ اسے رسالہ سائنس کی برکت سمجھنا چاہیے کہ وہ لوگ جو اردو میں "سائنس" پر مضامین لکھتے ہوئے جھجکتے اور ڈرتے تھے آج بے تکلف سائنس کے مسائل پر ایسی اچھی زبان میں لکھتے ہیں کہ عام پڑھے لکھے بھی سمجھ سکتے ہیں

ان کا عذر بیجا بھی نہیں۔ جب سے ہوش سنبھالا ان مضامین کو انگریزی میں سنا، انگریزی میں پڑھا انگریزی میں پڑھایا اور انگریزی میں لکھا۔ جو خیال آیا وہ انگریزی میں اور خیال ادا کرنے کے لیئے جو لفظ آئے وہ انگریزی کے۔ اپنی زبان ان کے لیئے بیگانہ رہی۔ اب خدا خدا کر کے یہ کفر ٹوٹتا جاتا ہی اور امید ہی کہ ہماری زبان بھی بہت جلد علمی افکار و خیالات سے بہرہ ور ہو جائے گی۔

غرض جو تجویز ۱۹۴۵ء کے شروع میں پیش ہوئی تھی وہ ۱۹۴۶ء کے آغاز میں عمل میں آگئی۔ اس میں معاشیات کے ہر موضوع سے بحث ہوگی جس کا اندازہ آپ کو آئندہ صفحات کے مطالعہ سے بخوبی ہو جائے گا۔

یہ خوشی کی بات ہی کہ ہمیں اس کی اڈیٹری کے لیئے ایک ایسے قابل اور مستعد نوجوان کی خدمات حاصل ہوگئی ہیں جنھیں معاشیات کا خاص ذوق ہی اور جن کا مطالعہ وسیع ہی اور اس قسم کے کام کا تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ یقین ہی کہ یہ رسالہ بھی "سائنس" کی طرح مقبولِ خاص و عام ہوگا۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ اردو کے بہی خواہ جو اسے علمی و ادبی زبان بنانے کے خواہشمند ہیں اپنی اعانت سے محروم نہ رکھیں گے:

عبدالحق

مسائل حاضرہ (ہندوستان)

نئے سال کی غذائی صورت حال

از:—————— محمد سالم۔ ایم اے

یوں تو ہندوستان غذا کے معاملے میں جنگ سے پہلے بھی خود کفالتی (Self-Sufficient) نہیں تھا اور آبادی کا ایک خاصا بڑا حصہ ناکافی غذا پر کسی طرح گذر بسر کرتا تھا۔ لیکن بنگال کے قحط کے بعد سے اس مسئلہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور اخبارات اور عوام دونوں غذائی صورت حال سے بہت زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اب وقتاً فوقتاً یہ مسئلہ بحث کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور موافق اور مخالف رایوں کے ماننے والے بڑے جوش و خروش سے اس میں حصہ لیتے ہیں پچھلے سال کے آخر میں ایک بار پھر اس بات پر زور ڈیتوریل لکھے گئے کہ ہندوستان دوسرے قحط کے دروازہ پر کھڑا ہے۔ نئے سال کے پہلے پرچے میں انسانی زندگی کی اس سب سے اہم ضرورت کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

آیئے سب سے پہلے تو بنگال کے قحط کے اہم ترین اسباب پر نظر ڈال لیں۔ اس سلسلہ میں ایک غلط فہمی جو رواج پاگئی ہے یہ ہے کہ قحط کا سبب محض غلہ کی مقدار کی کمی تھی۔ یہ صحیح نہیں۔ وڈہیڈ کمیشن نے اس سلسلہ میں ٹھیک کہا ہے" جتنے لوگ قحط میں غلہ نہ ملنے کی وجہ سے مرے کم و بیش اتنے ہی غلے کی قیمتوں کی زیادتی سے فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ اس لئے کہ غلہ عوام کی قوت خرید سے باہر تھا۔ چاول کی قیمت، میں غیر معمولی اضافہ کے اسباب میں مطلق قلت کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں چند اور باتیں سامنے رکھنی چاہئیں

۱۹۴۲ء کی گرمیوں میں. بنگال کی "امان" فصل کے ضائع ہو جانے کے بعد تقریباً ہندوستانی چاولوں کے بازار میں ایسے حالات پیدا ہو گئے جس سے عام تجارتی ادارے مناسب قیمتوں پر چاول تقسیم کرنے سے مجبور ہو گئے. برما کے چاولوں کی درآمد بند ہو جانے سے لنکا، ٹراونکور اور دیگر مقامات کی چاول کی مانگ اب ہندوستان ہی کے ذریعے پوری ہونے لگی. ہندوستان میں بنگال چاول کی پیداوار کے لحاظ سے سب سے اہم خطہ ہے. طلب میں اس غیر معمولی اضافہ کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوا کہ چاول کی قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا اور اس اضافہ کو مزید سہارا ملا اس زمانے کی جنگی صورت حال سے. بنگال محاذ جنگ سے سب سے زیادہ قریب تھا. اور یہ خطرہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا تھا کہ برما کے چاولوں کی درآمد بند ہو جانے سے ہندوستان میں چاول کی رسد اتنی کم ہو گئی ہے کہ مستقبل قریب میں قیمتیں بڑھتی ہی رہیں گی. اور جب قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو رہا ہو اور مستقبل میں مزید اضافہ ہی کا امکان ہو تو ایسی حالت میں خریدنے والے یہ چاہتے ہیں کہ مزید اضافے سے پہلے ضرورت بھر خرید لیں. اور بیچنے والے اس امید میں کہ قیمتوں میں مزید اضافہ ہوگا اپنی طرف سے بازار میں چیزیں لانے سے دریغ کرتے ہیں. اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بازار میں رسد کی قلت ہو جاتی ہے اور طلب کا غیر معمولی اضافہ قیمتوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے. بنگال میں قحط سے پہلے ایسے ہی حالات پیدا ہو گئے تھے! ایسی صورت میں بنگال کی حکومت کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ رسد پر نگرانی رکھے اور غلہ ایسی قیمتوں پر فروخت کرنے کا انتظام کرے کہ لوگوں کو ضرورت بھر مناسب داموں پر مل جائے لیکن ایسا وقت پر نہ ہو سکا. گویا مختصراً بنگال کے قحط کے دو اسباب تھے (۱) غلہ کی مقدار ضرورت کے لحاظ سے ناکافی تھی (۲) کوئی ایسا انتظام نہ تھا جس سے غلہ مناسب قیمتوں پر لوگوں تک پہونچایا جا سکتا.

جنگ کے حالات اب ختم ہو چکے ہیں. اس لیے وہ نفسیاتی اسباب بھی موجود نہیں ہیں جنھوں نے پچھلی بار اتنی تباہی پھیلائی. ہمیں ان کی اہمیت کا صحیح طور پر احساس نہیں ہے. لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ اگر وہ نفسیاتی اسباب نہ ہوتے تو بنگال میں چاول کی قیمتوں میں اتنا غیر معمولی اضافہ نہ ہوتا. دوسری بات یہ ہے کہ قحط کے بعد حکومت کے پاس ایسا کوئی انتظام نہ تھا جس سے غلے کی تقسیم مناسب طور پر عمل میں آتی. لیکن اب "محکمہ غذا" اور صوبوں کے غذائی انتظامات کی مشینری چاہے وہ کتنی ہی نامکمل ہو موجود ہے. مثال کے طور پر بنگال کے صوبہ ہی کو لے لیجیے. بنگال کے انتظامات کے متعلق سر جے بی سریواستو نے جتنے اچھے الفاظ صرف کئے ہیں ممکن ہے وہ ان سب کا مستحق نہ ہو. لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ انتظامات پہلے کی بہ نسبت یقیناً بہتر ہیں. بنگال کے پاس پچھلے سال کے آخر میں تقریباً ۵ لاکھ ٹن کا ذخیرہ بھی موجود تھا. پھر پچھلے موقعہ پر ہندوستان میں کسی کل ہند غذائی پالیسی کا تعین بھی نہ ہو سکا تھا بعض صوبوں کی زائد پیداوار قلت کے صوبوں کے کام مناسب وقت پر نہ آ سکی. ۶ر اگست ۱۹۴۲ء کے ایسٹرن اکونومسٹ

EASTERN ECONOMIST) میں یہ خبر ملی کہ حکومت ہند کی یہ پالیسی کہ بہتات کے صوبوں سے ساری فاضل پیداوار خرید لی جائے صوباتی عصبیت کی بنا پر ناکامیاب رہی۔ آج بھی گیہوں اور چاول پنجاب سے باہر نہیں جاتے کیونکہ حکومت پنجاب غلہ باہر بھیجنے پر راضی نہیں ہوتی۔ پنجاب کے کئی بیوپاریوں نے تجارت سے خبریں ملی ہیں کہ پنجاب میں فاضل چاول کی بہت بڑی مقدار موجود ہو لیکن پنجاب اسے باہر بھیجنے کے لئے تیار نہیں۔

حکومت ہند کو اس خرابی کے دور کرنے کی ضرورت بہت دیر میں محسوس ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں چوتھی کل ہند غذائی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے سر جے پی سریواستو نے ارشاد فرمایا

> ہمیں ایک دوسرے کا بھی خیال کرنا چاہیے محض اپنا لینا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستان کے تمام ذرائع (غذائی) کو یکجا کرنے میں حکومت ہند کو ایسے اقدام لینے پڑیں گے جو بعض اوقات مقامی اور جماعتی مفاد کے خلاف ہونگے۔ ۔ ہمارے اندر اب اتنی طاقت نہیں کہ ناکامیابی برداشت کرسکیں ہم اب ناکامیابی کا امکان بھی نہیں پیدا ہونے دینگے اور میں اپنی ذمہ داریوں کی ادائگی میں نگرانی اور کنٹرول قایم کرنے میں خواہ وہ کسی اسٹیج پر ہو اور کتنا ہی سخت ہو گریز نہیں کرونگا اور نہ کامیابی حاصل کرنے کے لیئے ضروری طاقت کے استعمال میں پس وپیش کی جائیگی۔

یہی بات ۱۹۴۰ء سے حکومت ہند کے سامنے رکھی جارہی تھی، یہ مشورہ مان لیا گیا ہوتا تو بقول افضل حسین صاحب بنگال قحط سے بچ گیا ہوتا لیکن یہ صورت حال بھی اب بدل چکی ہو بھلی بری ایک کل ہند غذائی پالیسی کا تعین ہو چکا ہو اور یہ "بنیادی پالیسی" اب بہتات کے صوبوں کو قلت کے صوبوں کی مدد پر مجبور کرسکتی ہو۔ یہ امید افزا حالات ہیں۔ اور پھر چاول کے ذرائع پر سے ایک اور بوجھ اٹھ گیا ہو یا کم از کم بوجھ اس قدر وزنی نہیں رہا جتنا پچھلے قحط کے دوران میں اور اس سے کچھ پہلے تھا۔ یعنی فوجی مانگ میں بھی اب کمی ہوگئی ہو۔

یہ حالات امید افزا ہیں اور آئندہ قحط کے امکان کو بڑی حد تک ہلکا کر دیتے ہیں، موجودہ صورت حال کا ایک اور اچھا پہلو ہو اب ذرائع نقل وحمل پر وہ بوجھ یا اتنی مصروفیت باقی نہیں رہی ہو جو جنگ کے دوران میں تھی۔ کہا جاتا ہو کہ جنگ کے ختم ہونے سے ریلوں کی مصروفیت میں کمی نہیں آئی ہو اور فوجیوں کے گھر پہونچانے وغیرہ کا کام اتنے ہی بڑے پیمانے پر اب بھی انکے ذمہ ہو۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد بھی یہ بات ناقابل انکار ہو کہ جنگ کے دوران میں فوجی ضروریات کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہو اتنی امن کے زمانے میں (خصوصا جب ملک ایک خطرناک صورت حال مثلاً قحط کا شکار ہو) حاصل نہیں رہ سکتی۔ اب سے پہلے برطانوی حکومت کے ذمہ دار عہدہ داروں نے بار بار اس بات پر فخر کا اظہار کیا ہو کہ برطانوی سلطنت کے قیام نے ہندوستان کو قحط کی مصیبت سے بچا لیا ہو

جو اکثر یہاں نازل ہوتی رہتی تھی۔ ریلوں کے جاری ہونے کے بعد سے یہ واقعہ ہو کہ ہندوستان کی قحط سالی زیادہ تباہ کن نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن جنگ کے دوران میں غلّہ کی نقل و حرکت اتنی تیز رفتار اور آسان نہیں رہی۔ بنگال کے قحط میں اتنی جانیں غالباً ہرگز نہیں ضائع ہوتیں۔ اگر یہ ذرائع پوری طرح قحط زدہ افراد کی امداد کے لئے استعمال کیئے جاتے۔ حکومت نے اپنے اس اہم قحط کو دور کرنے کے لئے ریل استعمال نہیں کیا۔ یہ بات کیسے بھول سکتی ہو کہ عین اسوقت جب بنگال میں لوگ بھوکوں مر رہے تھے حکومت کے محکمہ نقل و حرکت نے بنگال کی گھوڑ دوڑ میں گھوڑوں کی شرکت کے انتظامات کو زیادہ ضروری اور اہم قرار دیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہو کہ اگر ریلوں کا صحیح طریقے سے استعمال کیا گیا ہوتا تو بھی ان کی مشغولیت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ قحط میں امداد کا کام بہت کامیابی سے نہیں انجام پا سکتا تھا۔

حکومت کی انتظامی مشینری کی موجودگی، غلّہ کی رسد پر حکومت کی نگرانی اور نقل و حرکت کے بہتر ذرائع اگلے قحط کو روکنے کے لئے امید افزا صورت حال پیدا کر دیتے ہیں۔ اب اس پس منظر میں ملک کے اندر غذا کی رسد کی مقدار پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہئے جولائی اور اگست ۱۹۴۵ء میں بنگال میں بارش کی مقدار نسبتاً کم رہی اسکی وجہ سے شروع میں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر موسم کا حال یہی رہا تو چاول کی پیداوار پر خراب اثر پڑے گا۔ اور ۱۹۴۶ء میں بنگال کو بڑی دقت کا سامنا کرنا ہوگا۔ لیکن خوش قسمتی سے اکتوبر کے آخری حصہ میں کافی بارش ہوگئی اور جاڑوں کی فصل کے متعلق امیدیں بڑھ گئیں۔

مسٹر جے پی سریواستو حکومت ہند کے غذائی ممبر نے نومبر میں بنگال کا سفر کیا اور واپسی پر انھوں نے یہ امید افزا بات کہی کہ فصل کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا ہو۔ ہاں کہیں کہیں یہ اندیشہ ضرور ہو کہ پیداوار عام مقدار سے کم ہوگی۔ ایک اندازہ کے مطابق اب کے چاول کی پیداوار ۸۰ فی صدی کے قریب ہوگی۔ پچھلے قحط سے پہلے سر عزیز الحق اور دوسرے ذمہ دار عہدہ داروں نے پیداوار وغیرہ کے متعلق جو اعداد و شمار وقتاً فوقتاً پیش کیے تھے۔ اگر وہ صحیح ہوتے تو بنگال میں قحط نہیں پڑنا چاہیئے تھا۔ یا کم سے کم اتنی جانیں ضائع نہیں ہونی چاہیئے تھیں۔ قدرتاً عوام کے دلوں میں عہدہ داروں کے اعداد و شمار کے متعلق شبہات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس بار بھی غذائی ممبر کے ان امید افزا بیانات کو لوگ مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن بہر حال پچھلی بار اعداد و شمار حاصل کرنے کے ذرائع بہت ناقص تھے۔ حکومت نے اپنی پچھلی غلطیوں سے کچھ تو سبق سیکھا ہوگا، ہمارے خیال میں اس بار کم سے کم فوڈ ممبر کا بیان محض طفل تسلی نہیں ہو۔ بہر حال خراب موسمی حالات سے بنگال میں تقریباً دس لاکھ ٹن کی کمی ضرور واقع ہوگی۔

ملک کے بعض دوسرے حصوں میں بھی فصل کو موسمی حالات سے نقصانات پہنچے ہیں، مثلاً بمبئی میں اور شولاپور، بیجاپور اور ہبلی وغیرہ ضلعوں میں بارش کی بہت کمی رہی ہو۔ اور اندازہ کیا گیا ہو کہ اس سے تقریباً ۴۰۰۰۰۰ ٹن کا نقصان ہوا ہوگا۔ اور اکتوبر کے پچھلے ہفتہ میں مدراس کے مشرقی ساحل پر جو سمندری طوفان آیا تھا اس سے بھی مدراس میں فصل کو بہت زیادہ نقصان پہنچا ہو۔ صحیح صحیح نقصانات کا پتہ نہیں۔ لیکن ایک جائزے سے یہ معلوم ہوا ہو کہ مدراس کے بعض ضلعوں میں، جو بدقسمتی سے مدراس کے اہم ترین چاول پیدا کرنے والے ضلعے ہیں، فصل کی پیداوار میں کوئی نصف کی کمی پڑ جائیگی۔ ایسٹرن اکانومسٹ کا خیال ہو کہ ناموافق موسمی حالات سے ہندوستان میں کوئی بیس لاکھ ٹن کے قریب غلے کی مقدار میں کمی پڑیگی۔

اس کمی کو کیوں کر پورا کیا جاسکتا ہو؟ پورا کرنا ممکن بھی ہو یا نہیں؟ یہ سوالات بہت اہم ہیں۔ کیونکہ تقسیم کے انتظامات کتنے ہی مکمل کیوں نہ ہوں تقسیم کیجانے والی چیز کی عدم موجودگی بہرحال مصیبت لائے گی۔ مگر قلت کا یہ مسئلہ ہمارے لئے نیا نہیں ہو اور اس کا حل جیسے ہمیشہ ہوتا رہا ہو اسی طرح اب بھی ہوگا۔ جیسا کہ حکومت ہند کے ایک ذمہ دار عہدہ دار نے ایسوشی ایٹڈ پریس کے ایک نمایندے کو کہا تھا کہ ہندوستان کی غذائی صورت حال کی بہتری کا دار و مدار غلہ کی درآمد پر ہو، وڈہیڈ کمیشن نے بھی درآمد کی اہمیت پر زور دیا ہو۔ برما اور جنوبی ایشیا کے دوسرے چاول پیدا کرنیوالے ملک اب آزاد ہو چکے ہیں اور لڑائی سے پہلے ہندوستان میں چاول کی کمی انھیں ملکوں سے درآمد کے ذریعہ پوری کیجاتی تھی۔ پچھلے سال غذائی ممبر نے برما اور سیام سے ایک لاکھ ۶۰ ہزار ٹن چاول حاصل ہونے کی خوشخبری سنائی تھی۔ کیا اس سال برما اور سیام سے ضرورت کے مطابق چاول کی درآمد پر بھروسہ کیا جاسکتا ہو؟ ممبر کا خیال ہو کہ نئے سال میں ہم کافی مقدار میں درآمد کی توقع کر سکتے ہیں لیکن ایسوشی ایٹڈ پریس کی بعض خبروں سے یہ پتہ لگتا ہو کہ ان ملکوں میں خود چاول کی کمی ہو۔ مثلاً برما میں پچھلے سال محض تیس لاکھ ٹن چاول پیدا ہوا اور یہ محض برما کے لئے کافی ہوگا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جنگ سے پہلے برما ساٹھ لاکھ ٹن چاول پیدا کرتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہو پیداوار میں اس کمی کی وجہ یہ ہو کہ برما کی چاول کی پیداوار کو جنگ سے شدید نقصانات پہنچے ہیں اور برما کو اپنی زراعتی زندگی کی ازسرنو تعمیر میں کافی وقت لگیگا۔ برما سے خبریں کم آتی ہیں اس لیئے یہ صحیح اندازہ تو نہیں کیا جاسکتا کہ وہاں کھیتوں اور زراعتی سامان کا کتنا نقصان ہوا ہو اور اس نقصان کی تلافی میں کتنی مدت لگے گی۔ لیکن یہ بات ممکن ہو کہ پیداوار کی یہ تمام کمی جنگ کے نقصانات کی وجہ سے ہی واقع نہیں ہوئی ہو۔ جنگ کی وجہ سے برما کے لیئے بیرونی بازاروں میں چاول بھیجنے کا موقع نہیں رہ گیا تھا ضرورت سے زیادہ جو کچھ بھی پیدا ہوتا غالباً جاپانی حکومت اسے اپنے قبضہ میں کر لیتی۔ یا کم سے کم چاول کی بہتات خود اندرون ملک میں قیمتوں

کے گھٹنے کا سبب بنجاتی، دونوں ہی صورتوں میں بر ملک کے کسان کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔

غالباً یہ اندازہ بہت غلط نہیں ہوگا کہ جنگ سے پہلے کے ۱۰۵ لاکھ ٹن کے بدلے میں چاول کی کم سے کم نصف مقدار ہمیں اس سال بر ما سے حاصل ہو سکے گی۔ اس کے بعد ہمیں بیس لاکھ ٹن غلہ کی اور ضرورت ہوگی اس کے لئے ہمیں گیہوں کی درآمد پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ گیہوں کی رسد کے حالات کیا ہیں؟ سر جے پی سر یواستوا نے یقین دلایا ہے کہ گیہوں کی رسد امید افزا ہے۔

اتحادی غذائی بورڈ سے (COMBINED FOOD BOARD) ہندوستان کو ہر مہینے ایک لاکھ ٹن گیہوں کی فراہمی کا انتظام ہو چکا ہے۔ ہندوستان کو اس سے کچھ زیادہ مقدار میں گیہوں کی ضرورت ہوگی۔ ایک لاکھ ۵۰ ہزار ٹن۔ یا ۲ لاکھ ٹن گیہوں ماہوار حکومت کو باہر سے منگوانا پڑیگا۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قحط بنگال کے زمانہ میں جب کہ ابھی دونوں محاذوں پر لڑائی جاری تھی، آسٹریلیا اور کنیڈا سے گیہوں بھیجنے کی پیشکش آئی تھی۔ ہم ان سے فائدہ اس لئے نہ اٹھا سکے کہ جہازوں کی بہت کمی تھی۔ جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد اب فوجی ضروریات میں کمی آگئی ہے۔ اور نقل و حرکت میں نسبتاً سہولت ہوگی، جہاں تک گیہوں کی رسد اور نقل و حرکت کا سوال ہے کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان اپنی ضرورت بھر گیہوں باہر سے نہ منگوا سکے۔ حکومت ہند کا فرض ہے کہ وہ اتحادی فوڈ بورڈ کے سامنے ہندوستان کا معاملہ پر زور الفاظ میں پیش کرے اور اس پر دباؤ ڈالے کہ ہندوستان کو غلہ پہنچانے کے لئے کافی جہاز مہیا کیئے جاویں۔ پچھلے قحط کے زمانے میں مسٹر ایمری نے جہازوں کی کمی کا بہانہ کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت جہازوں کی قلت تھی۔ لیکن اگر حکومت چاہتی تو ہندوستان کی ضرورتوں کو زیادہ اہمیت دے سکتی تھی اور امریکہ سے انگلستان میں شادی بیاہ کے سامان بہم پہنچانا ہندوستان کے قحط زدوں کی جان بچانے سے زیادہ اہم نہ تھا۔

اگر حکومت ہند اپنی انتظامی مشینری کو برقرار رکھے غلے کی رسد اور تقسیم پر نگرانی قایم رکھے اور بیرون ہند سے ضروری مقدار وقت پر منگائے تو ہندوستان میں دوبارہ قحط کا امکان نہیں ہے۔ ایسی کوئی بھی بات ایسی نہیں جس پر عمل نہ کیا جا سکے۔ چنانچہ ہمیں توقع ہے کہ اب اتنی کثیر تعداد میں لوگ بھوکوں نہ مرینگے لیکن ہندوستان میں غذا کی قلت ابھی سالوں تک دور نہ ہوگی۔ محض مقدار ہی کی قلت نہیں رہے گی، بلکہ جو چیزیں میسر ہیں وہ بھی اچھی نہیں ملیں گی۔ ہندوستان کی آبادی کے ایک تہائی حصے کو ہمیشہ آدھا پیٹ کھانا ملتا ہے ہر شخص کو صحت بخش غذا مہیا کرنے کے لیے ملک کی زرعی پیداوار میں زبردست اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے نہ صرف زراعت کی از سر نو تنظیم کرنی لازمی ہے۔ بلکہ صنعتی ترقی کی رفتار کو بھی کئی گنا تیز کرنا ہوگا۔

مسائل حاضرہ (ہندوستان)

خطّہ وار منصوبہ بندی

از: ڈاکٹر بول چند ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن)
صدر شعبۂ سیاسیات جامعہ بنارس

ایک ضروری بات:- ڈاکٹر بول چند خطہ وار تقسیم پر بحث کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر "پاکستان" کے لئے وجہ جواز پیدا کر دیتے ہیں لیکن وہ پھر چونکتے ہیں اور چونک کر کہتے ہیں کہ معاشی بنیاد پر جو تقسیم عمل میں لائی جائے اُسے سیاسی شکل دینے کی ضرورت نہیں۔ اتفاق سے اس بحث و تکرار کی زد میں پروفیسر کوپلینڈ آجاتا ہے جس نے اپنی ایک بے حد "حجم ناک" تصنیف[1] میں بالکل اُسی خطّہ وار تقسیم کی بنیاد پر ہندستان کے مسئلے کا مناسب یا غیر مناسب حل پیش کیا ہے جس کی ڈاکٹر بول چند نے اپنے مضمون میں بالتشریح تائید کی ہے۔

ہم اس مسئلے کے اخلاقی پہلو سے خود کو قطعی علٰحدہ رکھتے ہوئے یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں ......
...کہ معاشیات کے صفحات ہر اس مضمون کے لئے کھلے ہیں جس کا لب و لہجہ سنجیدگی اور متانت کا حامل ہو۔

[1] ہندستان کے دستوری مسائل ۱۲۰

جس کا انداز علمی ہو، اور جس میں سیاسی کیچڑ اچھالنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ ہم خود کو کسی خاص سیاسی پروگرام
سے وابستہ کرنا نہیں چاہتے لیکن ہم ہر سیاسی نکتہ نظر سے لکھے ہوئے علمی مقالات اور مضامین کا خیر مقدم
کریں گے ۔

ایڈیٹر

معاشی منصوبہ بندی کے سلسلے میں تین باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے، سب سے پہلے تو اس بات کا تعین کرنا کہ کن سماجی مقاصد کے حصول کے لئے منصوبہ بندی عمل میں لائی جائے، دوسرے یہ معلوم کرنا کہ ملک میں پیدائش کے کیا کیا ذرائع اور وسائل موجود ہیں اور کام میں لائے جاسکتے ہیں، تیسرے اس بات کا خیال رکھنا کہ پیدائش کے جو ذرائع موجود ہیں ان کی کس طرح مناسب اور منصفانہ تقسیم عمل میں لائی جائے ۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ معاشی منصوبہ بندی کا مطلب ہے معینہ سماجی مقاصد کے تحت بازار میں جن اشیا کی طلب ہے ان کے مطابق مہیا کرنے کے ذرائع کو کام میں لانا، رسد اور طلب کے درمیان ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنا۔

سماجی مقاصد کے تعین کا کام اگر منصوبہ بندی کرنیوالوں کی کسی مرکزی مجلس کے سپرد کر دیا جائے تو مناسب ہے، یہ مرکزی مجلس اگر مجمل اور موٹے طور پر یہ بھی بتا دے کہ ملک کے موجودہ ذرائع پیدائش کو کن طریقوں پر کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اور کس طرح ان کی صحیح اور مناسب تقسیم کی جاسکتی ہے تو اور بھی بہتر ہے جہاں تک تفصیلات کے تعین اور ان کو عملی صورت میں لانے کا کام ہے ہندوستان جیسے بڑے ملک میں یہ بات زیادہ مفید ہوگی کہ یہ کام مقامی افسروں کے سپرد کیا جائے ۔

اوپر جن عام خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ سوویٹ روس کے تجربے کی روشنی میں صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ دنیا میں سب سے پہلی بار روس ہی میں بڑے پیمانے پر معاشی منصوبہ بندی کی گئی، ابتدا میں جب روس میں پنج سالہ منصوبہ بندی شروع ہوئی، تب سے منصوبے بنانا اور ان کے عمل میں آجانے کے بعد اُن کی نگرانی کا کام ایسے مرکزی افسروں کے سپرد کیا گیا جو پورے سوویٹ یونین پر اپنا اقتدار رکھتے تھے ۔ یہ اس نظریے کے تحت اس لئے کیا گیا کہ اسی قسم کی مرکزیت سے طلب اور رسد کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی ہے یعنی بازار میں اشیا کی مانگ کے مطابق پیدائش اور رسد کا انتظام اگر کیا جاسکتا ہے تو اسی قسم کی مرکزیت کے ذریعے جس سے پورے ملک کی معاشی ترقی پر نگرانی قایم رہے، اور اسی کے ذریعے زائد اور فاضل پیدائش کے رجحان کو بھی ختم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ۱۹۳۲ء میں روس کے ماہرین معاشیات نے محسوس کیا کہ پلان بنانا اور ان کو عمل اور نگرانی میں لانا یہ دو مختلف چیزیں ہیں چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ پلان کو عمل میں لانے اور عمل میں آجانے کے بعد اُن پر نگرانی رکھنے کا کام علیحدہ علیحدہ طور پر ان جمہوری ریاستوں کے

سپرد کر دیا جائے جو سویت وفاق میں شامل ہیں اور انھیں ریاستوں کے مقامی افسر اس کام کو انجام دیں۔ اس طرح گویا سویت روس میں منصوبہ بندی علاقائی بنیاد پر عمل میں لائی گئی۔ صرف زراعت اور ذرائع حمل و نقل کے شعبے بدستور مرکزی اقتدار و انتظام کے تحت رکھے گئے۔ لیکن صنعتی پیدائش کے پورے پلان کو عمل میں لانے اور نگرانی کی ذمہ داری مقامی افسروں کے سپرد کر دی گئی۔

اس تبدیلی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ مرکزیت کی وجہ سے بیجا قسم کی افسرشاہی پیدا ہوتی ہے، دوسرے سویت یونین اس قدر وسیع خطہ ہے کہ مرکز سے پورے ملک کی منصوبہ بندی پر نگرانی قایم رکھنا بہت دشوار ہے۔ ہندستان میں ان کے علاوہ بھی ایسے اسباب ہیں جن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوویت یونین کی طرح یہاں بھی علاقائی بنیادوں پر منصوبہ بندی کو عمل میں لایا جائے تو بہتر ہے۔ آب و ہوا، قدرتی ذرایع، قوت پیداوار اور قوت ترقی کے اختلاف کی وجہ سے اور بعض خالص تاریخی اسباب کی بنا پر ہندستان کے مختلف علاقوں اور صوبوں کی معاشی ترقی بالکل ناہموار رہی ہے اور ان کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں بھی بہت اختلاف پیدا ہو گیا ہے چنانچہ کوئی بھی معاشی پلان اگر اس میں صاف صاف طور پر اشتراکی اصولوں کا دخل نہیں ہے تو اس کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اختلافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہو اور اس کی تفصیلات کو عمل میں لانے کے لئے ہر خطے کے تہذیبی حالات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہو۔ اس کے بغیر وہ پلان عملی صورت سے کامیاب نہیں ہو سکتا۔

علاقائی منصوبہ بندی غرض ہندستان میں معاشی منصوبوں کی تشکیل و تعبیر اور اُن کا عمل میں آنا دونوں علاقائی بنیادوں پر ہونا چاہئے خود ہندستان کا دستور حکومت وفاق کے طرز پر قایم ہے جس میں صوبوں اور مرکز کی علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں ہیں۔ اور بہت سے اختیارات مرکزی حکومت سے ہٹا کر صوبائی حکومتوں کو دے دیے گئے ہیں۔ لیکن یہاں پر اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ آج کل صوبوں کی جو تقسیم ہے وہ ملک کی طبعی اور اقتصادی حالت کے مطابق نہیں ہے۔ چنانچہ منصوبہ بندی کے سلسلے میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوگی کہ ہندستان میں کہیں کہیں پر ایسے علاقوں کی تشکیل کی جائے جن میں صوبائی حدبندیوں کا کوئی خیال نہ رکھا جائے۔

منصوبہ بندی کے سلسلے میں اس وقت دو نظریئے رائج ہیں ایک تو یہ کہ ہندستان جغرافیائی وحدت کا حامل ہے اور پورے ملک کی و نیز صوبوں اور ریاستوں کی معاشی زندگی ایک ہی طرز اور نمونے کی پابند ہے اس لئے پورے ملک کی منصوبہ بندی مرکزی حکومت کے زیر اختیار اور زیر نگرانی عمل میں لائی جائے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ہر صوبہ اور ہر ریاست اپنے اپنے ہاں کی معاشی منصوبہ بندی خود ہی کرلے اور مرکزی حکومت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں نظریئے

غلط اور حقیقت سے بہت دور ہیں۔ برِاس ملک میں جہاں وفاق کے طرز کی حکومت قایم ہو یہ طریقہ رائج ہو کہ وہاں کی تمام ریاستیں ساتھ مل کر کچھ مخصوص علاقوں کی معاشی ترقی کے لئے مشترکہ پالیسی کا تعین کرتی ہیں۔ حکومت ہند کی اس کمیٹی نے جسے ازسرِنو معاشی تنظیم کا کام سپرد کیا گیا ہو ۔ اپنی دوسری رپورٹ میں اس بات پر زور دیا ہو کہ معاشی منصوبہ بندی کے سلسلے میں مختلف علاقوں کو عمل اور نگرانی کے اختیارات دینا بنیادی اور اصولی طور پر ضروری ہے۔ اور غالباً یہی وہ بہترین طریقہ ہے جس کے ذریعے ملک کے مختلف حصے منصوبہ بندی سے اپنے اپنے قدرتی ذرائع اور طبعی خصوصیات کے مطابق یکساں اور ہموار طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حال ہی میں ہندوستان کے بڑے بڑے سرمایہ داروں نے بمبئی میں ملک کی معاشی ترقی کے لئے جو لائحہ عمل تیار کیا ہو اور جو بمبئی پلان کے نام سے مشہور ہو اس میں بھی خطہ وار منصوبہ بندی کے اصول کو تسلیم کیا گیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اپنے پروگرام میں کوئی ایسا تنظیمی ڈھانچہ نہیں پیش کیا ہے جس کے ذریعے اس پروگرام کو خطہ وار بنیاد پر عمل میں لایا جائے پھر بھی انھوں نے خطہ وار تنظیم کے اصول کو موٹے طور پر ضرور مان لیا ہو۔ مثلاً انھوں نے مختلف علاقوں کے لئے علیحدہ علیحدہ معاشی اسکیموں کی ضرورت پر بھی زور دیا ہو اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہو کہ معاشی پلان کو عملی صورت دینے کے لئے کسی ایسے اقتدارِ اعلیٰ کی بھی ضرورت ہوگی جو صوبائی حکومتوں کے اختیارات سے بلند تر ہو۔

حکومت ہند نے ملک کی ازسرِنو تنظیم کے لئے جو کمیٹی مقرر کی ہو اس نے تو خطہ وار منصوبہ بندی کے اصول کو اور بھی کھلے لفظوں میں تسلیم کیا ہو۔ اس کمیٹی نے اپنی دوسری رپورٹ میں یہ کہا ہو کہ ہر صوبہ اور ہر ریاست پہلے اپنے یہاں کی معاشی ترقی کے لئے پلان بنائے اور پھر ان تمام پلانوں کو یکجا کر کے ان پر مجموعی طور پر غور و خوض کیا جائے اور ان کو ایک دوسرے سے مربوط کیا جائے۔ اس طرح پورے ملک کے لئے ایک عام پلان تیار ہو جائیگا ۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا ہو کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں خاص خاص خطے خود اپنے لئے پلان تیار کریں گے اِن خطوں کا صوبائی حدبندیوں سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ یہاں پر خطہ وار منصوبہ بندی اور صوبائی منصوبہ بندی کے درمیان جو فرق ہو اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اول الذکر کا تعلق ایسے خاص خاص خطوں سے ہوگا جنھیں معاشی ذرائع کی بنا پر علیحدہ علیحدہ طور پر وحدت قرار دیا جا سکے۔ ایسے خطوں کے تعین میں اس بات کا خیال رکھنے کی بالکل ضرورت نہیں کہ یہ ایک صوبے کی عملداری میں ہیں یا ایک سے زیادہ کی۔

وادی ٹینیسی کی مثال | خطہ وار منصوبہ بندی کی سب سے نمایاں مثال وادی ٹینیسی کی ہے جو ریاستہائے متحدہ امریکہ میں واقع ہے

ٹینیسی ور یا الیگنی پہاڑوں سے نکلتا ہو اور نو سو میل کا فاصلہ طے کر کے دریائے اوہیو سے جا ملتا ہو۔ اس کے دونوں طرف جو سطح زمین ہو اور جسے یہ دریا سیراب کرتا ہو اس کا رقبہ کوئی چالیس ہزار چھ سو مربع میل ہو۔ یہ خطہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی سات ریاستوں میں تھوڑا تھوڑا بٹا ہوا ہو جس کا تناسب مندرجہ ذیل ہو۔

ریاست کے نام	تناسب فی صدی کے حساب سے
ٹینیسی	۵۳٫۸ فی صد
الباما	۱۳ 〃
کینٹکی	۲٫۷ 〃
شمالی کیرولینا	۱۱٫۲ 〃
ورجینیا	۸٫۴ 〃
جارجیا	۲٫۷ 〃
مسی سیپی	۰٫۹ 〃

یہ خطہ بہت زرخیز تھا جنگلات وافر تھے، معدنیات اور پانی کے لحاظ سے بھی یہ پورا علاقہ بہت اہم تھا۔ لیکن اس خطے کی زیادہ تر آبادی زراعت پر لبسر کرتی تھی، چنانچہ "یہاں کے زیادہ صلاحیت رکھنے والے لوگ وطن چھوڑ کر دوسرے مقامات پر چلے جاتے تھے اسلیے کہ انھیں خود وطن میں اپنی ذاتی ترقی کی کوئی صورت نہیں نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں کے باشندے روزی حاصل کرنے کے لئے اس علاقے کے زرخیز قدرتی ذرائع اور قدرتی دولت کا غلط استعمال کر کے انھیں برباد کر رہے تھے" اس افسوس ناک صورت حال کو دفع کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس لئے کہ یہ علاقہ متعدد ریاستوں کی عملداری میں تھا۔ لیکن جب یہاں خطہ وار منصوبہ بندی اور نگرانی کا طریقہ اختیار کیا گیا تو تمام مسائل حل ہو گئے۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں صدر روز ویلٹ کی کوششوں سے کانگریس[1] میں ایک قانون پاس ہوا جس کے تحت پوری وادی ٹینیسی کی معاشی ترقی کے لئے ایک با اقتدار مجلس قایم کی گئی۔ اس مجلس کے ذمے وادی ٹینیسی کے قدرتی ذرائع کے تحفظ ترقی اور صحیح استعمال کا کام دیا گیا۔ اس مقصد کے تحت کہ اس سے پوری قوم کی سماجی اور معاشی دولت میں اضافہ ہو۔ اس مجلس کے زیر اختیار تمام امور نہیں بلکہ صرف بین الریاستی امور رکھے گئے جیسے سیلاب پر قابو اور نگرانی رکھنا، دریا کے

[1] ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مجلس قانون ساز۔

ملک
مرکز
کی

راستے سے نقل وحمل اور تجارت کا جو سلسلہ قایم تھا اُسے اور ترقی دینا اور بجلی کی طاقت ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچانا وغیرہ اس سلسلہ میں گذشتہ گیارہ سال میں وادی ٹینیسی کی مجلس امور نے بڑے اہم کام انجام دیئے۔ اس مجلس کو اپنے امور کی انجام دہی میں مقامی افسروں اور ریاستوں کے حاکموں سے روز افزوں مدد اور تعاون حاصل ہوتا رہا۔

یہ مجلس اس وقت قایم کی گئی تھی جب دنیا تاریخ عالم کے سب سے ہولناک معاشی بحران میں مبتلا تھی، ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت اس وقت ناامید اور مایوس ہو کر زرعی اور صنعتی پیدائش کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ہی پہلے سے جو اشیا موجود تھیں ان کو برباد اور تلف کرنے میں مصروف تھی تاکہ معاشی بدحالی دور ہو۔

وادی ٹینیسی کی معاشی ترقی کے لئے جو انتظام کیا گیا وہ اسوقت اپنی نوعیت کا بالکل نیا انتظام تھا اور ایک جدید ترقی یافتہ قوم کے معاشی ذرائع کو ترقی دینے کا یہ طریقہ دنیا کو بالکل عجیب وغریب سا معلوم ہوا۔ یہ طریقہ بڑی امیدوں کے تحت اختیار کیا گیا تھا اور اس سے معاشی زندگی کے پھیلنے اور بڑھنے کا امکان تھا، اس میں حکومت گویا سب کچھ تھی اور حکومت ہی کی حرکت و قوت سے اسے عملی صورت دینا تھا۔ اس کے سامنے ایک بہت بڑے لیکن بچھڑے ہوئے اور غیر ترقی یافتہ علاقے کے معاشی حالات کو درست کرنے کا کام تھا۔ اس میں پوری پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ آب پاشی کے لئے پشتے اور پانی کے ذخیرے (RESERVOIR) تعمیر کرائے گئے بجلی گھر قایم ہوئے مختلف قسم کی کھاد پیدا کی گئی۔ شیر سازی اور سوتی پالنے کی صنعتوں کو آگے بڑھایا گیا۔ اس طور پر وہاں کے معیار زندگی میں بنیادی انقلاب ہو گیا۔ یہ گویا دنیا کے سامنے مثال ہو کہ اگر خطہ وار بنیاد پر معاشی تنظیم اور منصوبہ بندی کی جائے تو اس سے کتنے مفید نتایج پیدا ہو سکتے ہیں۔

دنیا کے اور بہت سے حصوں میں بھی اس طریقے پر کاربند ہونے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ بعض ذمہ دار حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہو کہ دریائے ڈنیوب، دریائے ایمزن اور دریائے یانگسٹر کے میدانوں میں بھی اسی اصول پر منصوبہ بندی کی جائے۔ بلکہ ان علاقوں کے لئے بھی اس قسم کی تجویز پیش کی گئی ہے جو اس وقت بین الاقوامی کنٹرول کے تحت ہیں۔

ہندوستان کے متعلق بھی ایسا ہی خیال ظاہر کیا گیا ہو۔ ہندوستان میں یہ صورت ہو کہ یہاں پنجاب، سندھ اور کچھ حد تک بنگال کے علاوہ جتنے صوبے ہیں ان کی حد بندیاں ملک کے جغرافیائی حالات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں چنانچہ جب یہاں خطہ وار منصوبہ بندی کے اصول پر کاربند ہونے کی کوشش کی جائے گی تو اس میں متعدد صوبوں

کے تعاون اور اشتراک عمل کی ضرورت ہوگی اس لئے کہ اس قسم کے خطے لازمی طور پر ایک سے زیادہ صوبوں میں پھیلے ہوں گے۔

ہندوستان کے زرعی علاقے | اوپر جو کچھ لکھا جا چکا ہو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ کیا ہندوستان کو ایسے مختلف خطوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہو جہاں خطہ وار منصوبہ بندی کے اصول پر عمل کیا جا سکے؟ اور اگر تقسیم کیا جائے تو کس بنیاد پر؟ ہندوستان جیسے مخصوص طور پر زرعی ملک میں اس قسم کی علاقائی تقسیم اگر ہو سکتی ہو تو اس بنیاد پر کہ کون سا علاقہ کتنا زیادہ زرخیز ہو اور کس علاقے میں پیداوار کی زیادہ قوت ہو۔ یعنی ہندستان کو زرخیزی اور قوت پیداوار کے مطابق مختلف علاقوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت ہو۔ قدرتی ماحول کے مطابق ہر علاقے کی زرخیزی اور قوت پیداوار مختلف ہوتی ہو۔ پھر یہ دیکھنا پڑیگا کہ کس علاقے کی مٹی کیسی ہو، وہاں بارش کتنی ہوتی ہو اور کہاں بارش زیادہ ہوتی ہو کہاں کم۔ اس کی جغرافیائی شکل وصورت کیا ہو، کہاں پر دریا ہو کہاں پر پہاڑ وغیرہ وغیرہ پھر سمندر کی سطح سے وہ علاقہ کتنا بلند ہو۔ اس لئے کہ انھیں باتوں پر مخصوص خطوں کی زرخیزی کا دارو مدار ہو۔

اس نقطۂ نظر سے ہندستان کو دو خاص حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہو۔ ایک تو مسطح میدانوں کا حصہ اور دوسرا سطح مرتفع کا۔ اول الذکر کے تحت دو حصے آتے ہیں۔

(۱) شمالی ہندوستان کا وسیع وعریض مسطح خطہ جو ہمالیہ اور اس سے ملے ہوئے پہاڑی سلسلوں سے شروع ہوتا ہو اور وسطی ہندوستان میں جا کر ختم ہو جاتا ہو۔

(۲) جنوبی ہندوستان کے دونوں طرف کے ساحلی میدان جو پہاڑیوں اور سمندر کے درمیان ہندستان کے مشرقی اور مغربی ساحلوں پر پھیلتے چلے گئے ہیں۔ مغرب میں خلیج کیمبے سے لے کر اس کماری تک اور مشرق میں گنگا کے دہانے سے لیکر اس کماری تک، ان ساحلی میدانوں میں بارش بہت ہوتی ہو۔ لیکن مٹی کے زیادہ زرخیز نہ ہونے کے سبب قوت پیداوار شمالی ہندستان کے مقابلے میں کچھ کم ہو۔

شمالی ہندستان کے وسیع وعریض میدان کو بارش کی کمی اور زیادتی کی بنا پر متعدد حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہو۔

(۱) وہ خطہ جہاں سے گنگا کا نچلا حصہ بہتا ہو۔ اس حصے کی مٹی زیادہ تر دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی ہو اور یہاں پیداوار بھی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن یہاں صرف چند قسم کے غلے پیدا کیے جاتے ہیں۔ اس خطے کا کوئی بڑا حصہ چاول پیدا کرتا ہو، یہاں کی آب وہوا ایسی چیزوں کی کاشت کے لئے قدرتی طور پر زیادہ موزوں ہو جن کی تجارتی اہمیت ہو مثلاً

پٹوا اور چائے چنانچہ ہندوستان میں ان دو چیزوں کی تقریباً تمام تر پیداوار یہیں ہوتی ہی۔

(۲) شمالی ہندوستان کا وہ حصہ جہاں سے گنگا کا اوپری حصہ بہتا ہو اس خطے میں صوبہ بہار اور یوپی کے حصے شامل ہیں، یہاں بارش اور مٹی کی زرخیزی وغیرہ چونکہ معتدل حالت میں ہو اس لئے یہاں انواع و اقسام کے غلّے پیدا ہوتے ہیں یہاں کی آب و ہوا گنّے کی کاشت کے لئے بہت موزوں ہو۔ چنانچہ ہندوستان کی شکر سازی کی صنعت اسی علاقے میں مرکوز ہو گئی ہو۔

(۳) شمالی ہندوستان کا وہ خطہ جس سے ہو کر دریائے سندھ اور اس کی معاون ندیاں بہتی ہیں۔ اس خطے میں پورا پنجاب اور صوبجات سندھ اور سرحد کے کچھ حصے پڑتے ہیں، یہاں کی مٹی بھی دریا کی لائی ہوئی ہو لیکن وہ پتلی ہو، جہاں جہاں بارش کم ہوتی ہو وہاں ریگستان کے سے حالات ہیں۔ اس علاقے کی خاص پیداوار گیہوں ہو۔ ہمالیہ کے ترائی والے حصے میں پھلوں کی کاشت بھی خوب ہوتی ہو۔

(۴) ریگستانی علاقہ جس میں سندھ اور راجپوتانہ کے حصے شامل ہیں۔ یہاں بارش بہت کم ہوتی ہو، یہاں صرف اس قسم کے غلّے پیدا ہوتے ہیں جن کے پودوں کے نشو و نما میں تری یا نمی کی سب سے کم ضرورت ہوتی ہو اور جو گرمیوں کے موسم میں ریگستان کی شدید حدت کو برداشت کر سکتے ہیں۔

اب رہ گیا ہندوستان کا وہ خطہ جسے سطح مرتفع کہا جاتا ہو اسے بھی ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) سطح مرتفع دکن۔ یہاں کے بعض حصوں میں کالی مٹی پائی جاتی ہو مثلاً بمبئی، صوبہ متوسط اور مدراس کے کچھ حصوں میں، یہاں بہت اچھی قسم کی روئی کثرت سے پیدا ہوتی ہو۔ بعض حصوں میں سرخ مٹی پائی جاتی ہو۔ مثلاً پورا میسور، اور مشرقی حیدرآباد یہاں بارش کی قلت ہو اور جو تھوڑی بہت بارش ہوتی بھی ہو تو اس کا کوئی وقت یا موسم مقرر نہیں ہو کبھی ہوئی کبھی نہیں ہوئی کبھی موسلا دھار ہو گئی تو کبھی کچھ بھی نہیں۔ لازمی طور پر اس علاقے میں زرعی پیداوار کم ہو۔

(۲) دکن کا سرا یعنی وہ خطہ جو سطح مرتفع دکن کو گنگا اور جمنا کی وادیوں سے ملاتا ہو۔ یہاں بھی زرعی پیداوار بہت کم ہوتی ہو۔

ہندوستان کے صنعتی علاقے | صنعتی ذرائع اور وسائل کا جہاں تک تعلق ہو، بہار، اڑیسہ، اور بنگال کے صوبے پورے ملک میں سب سے زیادہ دولت مند قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

ملک میں کوئلے کی مجموعی مقدار کا ستانوے فی صدی حصہ علاقہ گونڈوانہ میں تہ نشین ہو اور اس کی اہم ترین کانیں جھریا اور رانی گنج میں ہیں۔ یہ دونوں مقامات دریائے دمودر کے نشیب میں واقع ہیں اور ہندوستان کے کوئلے کا بیشتر حصہ یہیں سے

کھودا جاتا ہی۔ لوہا بہت زیادہ مقدار میں ضلع سنگھ بھوم میں، اور کیونجھر، بونائے اور میوربھنج کی ریاستوں میں تہ نشین ہی۔ یہ علاقے بھی [illegible] کوئلے کی کانیں ہیں۔ جمشید پور میں ہندوستان کے مشہور لوہے اور اسٹیل کا کارخانہ جو قایم ہوا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ یہاں سے لوہے اور کوئلے کی کانیں قریب واقع ہوئی ہیں۔

کوئلے کے علاوہ جب اور چیزیں بھی کارخانوں کے لئے ایندھن کا کام دینے لگیں گی۔ تو دوسرے دوسرے علاقے بھی اسی طرح صنعتی لحاظ سے ترقی کریں گے۔ مثال کے طور پر پیٹرول صنعتی ایندھن کی حیثیت سے روز افزوں مقبولیت حاصل کر رہا ہی، اور صنعتوں میں روز بروز اس کا استعمال بڑھتا ہی چلا جا رہا ہی۔ اس کی وجہ یہ ہو کہ اوّلاً تو آسانی کے ساتھ اسے ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جا سکتے ہیں دوسرے اس کے استعمال میں بربادی بہت کم ہوتی ہی۔ لیکن افسوس کہ ہندستان میں پٹرول بہت کم پایا جاتا ہی۔ آسام میں اور پنجاب کے کچھ علاقوں میں تھوڑا بہت پٹرول موجود ہی لیکن دونوں صوبوں کا پٹرول ملا کر سات کروڑ گیلن بھی نہیں ہوتا۔

ملک میں صنعتوں کی ترقی کے لئے ایندھن کا جو مسئلہ ہی وہ اگر حل ہو سکتا ہی تو صرف یوں کہ بجلی کی طاقت پیدا کی جائے اور اسے ایندھن کے طور پر کام میں لایا جائے۔ پانی یا بھاپ کی طاقت سے بجلی پیدا کرنے کے لیے جن تین باتوں کا ہونا ضروری قرار دیا گیا ہی وہ یہ ہیں۔ شدت کی بارش۔ کوہستانی غیر مسطح زمین اور پانی کا مسلسل بہاؤ۔

اوّل الذکر دونوں باتیں ہندستان کے کافی حصوں میں پائی جاتی ہیں، ہندوستان میں چونکہ خاص خاص موسم میں بارش ہوتی ہی اس لیے چشموں کی صورت میں پانی کا بہاؤ سال بھر تک مسلسل نہیں رہتا۔ چنانچہ سال بھر تک مسلسل طور پر پانی کی طاقت مہیا کرنے کے لئے بڑے بڑے پشتے تعمیر کرنے پڑتے ہیں جس میں کافی رقم خرچ ہوتی ہی، اس سے بجلی کی قیمت بڑھ جاتی ہی، لیکن ان دقتوں کے باوجود بجلی کے اہم کارخانے ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ٹاٹا بجلی کا کارخانہ جو پونا میں ہی، اس سے بمبئی میں کپڑے کی ملوں کو بجلی مہیا کی جاتی ہی۔ جنوبی ہند کے بجلی کے کارخانے سے جس کا مرکز پیکارا ہی، مدراس پریزیڈنسی اور میسور کو بجلی مہیا کی جاتی ہی یہ کارخانہ مدراس اور میسور کی معاشی زندگی میں زبردست اہمیت رکھتا ہی۔

پنجاب میں بجلی کے کارخانے کی اسکیم منڈی کے مقام پر چلائی گئی اور بڑی امیدوں اور توقعات کے ساتھ لیکن وہ پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکی۔ مغربی یو۔ پی میں "اوپری گنگا نہر" کے کنارے متعدد مقامات پر بجلی گھر قایم کئے گئے ہیں جہاں پانی کا تیز دھارا گرتا ہی، یہ بجلی گھر تاروں کے ذریعے کچھ شہروں میں بجلی پہنچاتے ہیں اور اس سے بعض علاقوں میں

آب پاشی کا بھی بہتر انتظام ہوگیا ہے۔ دریائے کاویری میں میٹر کے مقام پر جو بجلی کا کارخانہ کھولا گیا ہے۔ وہ بھی آب پاشی ہی کے لئے ضرورت کے مطابق اور بھی بجلی پیدا کرنے کی اسکیمیں آسانی سے چلائی جا سکتیں ہیں اس لئے کہ ہندستان میں ایسے علاقے اور مقامات لا تعداد ہیں، جہاں بجلی کی طاقت پیدا ہو سکتی ہے۔

ہندستان میں صنعت دراصل اگر پھیلی ہے تو بمبئی اور کلکتہ کے شہروں سے جہاں بندرگاہیں موجود ہیں، اس لئے کہ ان بندرگاہوں کے ذریعے یورپ سے مشین اور دیگر ضروری سامان کی درآمد آسان تھی۔ یہ شہر پہلے ہی سے بہت بڑے تجارتی مرکز بن گئے تھے اور یہاں بینک کاری کی بھی آسانیاں مہیا تھیں، چنانچہ یہاں فطری طور پر صنعتی کاروبار بہت ترقی کر گیا ان باتوں کی وجہ سے ہندوستان کی صنعت بہت حد تک مقامی اور ناہموار ہو کر رہ گئی اور اب تک اس کا یہی حال ہے۔ بہر حال کچھ خاص صنعتیں ہندوستان میں ایسی ضرور موجود ہیں جن کے لئے مقام کا انتخاب طبیعی حالات کے مطابق کیا گیا اور جہاں اس صنعت کو مدد پہنچانے والی قدرتی پیداوار موجود تھی۔ مثال کے طور پر جمشید پور کا لوہے اور اسٹیل کا کارخانہ اور برن پور کلٹی کا لوہے کا کارخانہ یہ کارخانے ایسے علاقوں میں ہیں جہاں لوہا اور کوئلہ دونوں پائے جاتے ہیں۔ پھر بمبئی احمد آباد شولاپور اور ناگپور کی کپڑے کی ملیں ایسے علاقوں میں ہیں، جہاں روئی اور دیگر خام اشیا کثرت سے پیدا ہوتی ہیں اور جہاں کی آب و ہوا پارچہ بافی کے لئے بہت موزوں ہے۔ پٹ سن کی تقریباً تمام تر صنعت بھی دریائے ہگلی کے کنارے کلکتے کے نزدیک گویا ایک ہی مقام پر مرکوز ہو گئی ہے ۱۹۲۲ء میں ۱۰۳ جوٹ کی ملوں میں کوئی ۹۵ ملیں اسی مقام پر تھیں۔ اور بقیہ آٹھ دوسرے مقامات پر شکر سازی کی صنعت کے لئے بھی ایک ہی علاقہ مخصوص ہو گیا ہے۔ اور یہ ہے وہ میدان جس سے دریائے گنگا ہو کر گذرتا ہے، یو پی اور بہار میں ہندوستان کی پچھتر فی صدی شکر سازی کی فیکٹریاں موجود ہیں۔ ہندستان میں کاغذ سازی کی صنعت دوسرے کاغذ ساز ملکوں کے مقابلے میں تقریباً کچھ بھی نہیں۔ کلکتے کے قریب کاغذ کی کچھ ملیں ضرور موجود ہیں۔ ان ملوں کو یہ فائدہ حاصل ہے کہ کوئلہ کافی مقدار میں مہیا ہو جاتا ہے اس لئے کہ کوئلے کی کانیں قریب ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بازار بھی قریب ہیں جہاں کاغذ کی خوب کھپت ہو جاتی ہے۔ پھر نقل و حمل کی سہولت بھی میسر ہے۔ البتہ ایک دقت یہ ہے کہ ان خام اشیا کو جن سے کاغذ تیار ہوتا ہے بہت دور سے منگوانا پڑتا ہے اور اگر خام اشیا کے نزدیک ملیں قائم کی جاتی ہیں تو پھر کوئلے کی کانیں دور ہو جاتی ہیں اور وہ بازار بھی دور ہو جاتا ہے جہاں کاغذ کی کھپت ہوتی ہے۔ شیشہ سازی کی صنعت گنگا کے نشیبی خطے میں ہوتی ہے جہاں کوئلہ اور شورہ آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے اور جہاں مہارت رکھنے والے مزدور اور کارکن مل جاتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان کے صنعتی علاقے بڑے بڑے شہروں ہی کے چاروں طرف مرکوز ہیں۔ مثلاً کلکتہ، بمبی، مدراس اور کان پور اس لئے کہ ان شہروں کے ذریعے بینک کاری کی سہولتیں میسر ہیں اور یہاں ذرائع رسل ورسائل وآمدورفت کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ کچھ قدرتی ذرائع کے موجود ہونے کے سبب کو مبٹور اور ٹاٹا نگر جیسے صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ علاقے بھی بس گئے ہیں جن کا بڑے بڑے شہروں سے تعلق نہیں ہے لیکن ہندستان میں ایسے مقامات بہت کم ہیں اور ان کے درمیان فاصلہ بھی بہت ہے۔ صنعتی علاقے ابھی تک بہت حد تک خاص خاص مقامات ہی پر بسے ہیں اور ان کا تعلق ابھی بڑے بڑے شہروں ہی سے ہے، صنعت ابھی ان شہروں سے ہٹ کر ملک کے وسیع وعریض حصوں میں نہیں پھیل سکی ہے۔

ہندوستان کی تقسیم دریائی میدانوں کے لحاظ سے زراعت اور صنعت کے علاوہ ایک اور بنیاد ہے جس پر ہندستان کو مختلف علاقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس بنیاد کو پروفیسر کوپلینڈ نے اپنی مشہور ومعروف تصنیف "ہندستان کے دستوری مسائل" میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر کوپلینڈ کے نزدیک ملک کی بہترین تقسیم یوں عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ کہ اسے چاروں بڑے بڑے دریائی میدانوں میں تقسیم کردیا جائے۔

(۱) دریائے سندھ کا میدان کشمیر سے کراچی تک، اس میں پنجاب، سندھ، سرحدی صوبہ اور برٹش بلوچستان شامل ہوگا۔

(۲) گنگا اور جمنا کا میدان جس میں یوپی، بہار اور اڑیسہ کے صوبے ہوں گے۔

(۳) دریائے برہمپتر کا میدان جس میں آسام اور بنگال کے صوبے ہوں گے۔

(۴) اس کے بعد پورا دکن جو اگرچہ صحیح معنوں میں کوئی دریائی میدان نہیں ہے پھر بھی ایک طبعی وحدت کا حامل ہے، پروفیسر کوپلینڈ کے ذہن میں کچھ سیاسی خیال بھی تھا جس کے تحت اس نے اس قسم کی تقسیم کی تجویز پیش کی۔ اس کے پیش نظر اوّلین مقصد یہ تھا کہ متحدہ ہندستان میں کسی طرح ہندو مسلم مسئلے کا حل پیش کیا جائے، چنانچہ اس نے یہ سوچا کہ ملک کو اس طرح چار حصوں میں تقسیم کردینے سے پاکستان کے مطالبے کا اصل مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

پروفیسر کوپلینڈ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان چار علاقوں میں دو علاقے ہندوؤں کے زیر اثر رہیں گے۔ اور دو مسلمانوں کے اس طرح مرکز میں دونوں کا برابر توازن قایم رہے گا۔

لیکن ہندستان کو اس طرح چار حصوں میں تقسیم کرنے سے کچھ بنیادی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں جن سے خود پروفیسر کوپلینڈ بھی آگاہ تھا، پنجاب کا ضلع انبالہ دراصل دریائے سندھ نہیں بلکہ دریائے گنگا کے میدانی علاقے میں پڑتا ہے پھر اڑیسہ کی اپنی ایک انفرادیت ہے اور وہ ایک علیحدہ دریا کا تشیبی میدان ہے۔ دریائے مہاندی اڑلیسہ کو صوبہ متوسط سے ملاتا ہے اس کا دریائے گنگا کے میدان میں شامل کیا جانا بالکل غلط ہوگا۔ دکن بھی کسی طبیعی وحدت کا حامل نہیں ہے اور اس کا متعدد دریائی میدانوں میں تقسیم کیا جانا ضروری ہوگا۔ پروفیسر کوپلینڈ ان دقتوں سے واقف تھا پھر بھی اس نے ملک کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے انھیں نظر انداز کر دیا۔

جہانتک اس کا یہ کہنا ہے کہ کسی طویل اور مدت طلب معاشی ترقی کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے ملک کو دریائی میدانوں کے لحاظ سے تقسیم کرنا مفید ثابت ہوگا کسی شک کی گنجائش نہیں۔ آج کل ہندستان کی بیشتر آبادی کی زندگی دریاؤں ہی پر گذرتی ہے۔ کروڑوں آدمی براہ راست اور اس سے بھی زیادہ آدمی بالواسطہ آب پاشی سے اپنی غذا اور روزی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشی خوش حالی کا دار و مدار ملک کی عظیم آبی طاقت کے صحیح اور مناسب استعمال پر ہے۔

بجلی کی طاقت پیدا کرنے کے کارخانوں سے نہ صرف صنعت کو فروغ ہوگا بلکہ اس سے ملک کی بہت بڑی اکثریت کو فائدہ پہنچیگا اس لئے کہ ملک کی کثیر آبادی آخر زمین ہی سے اپنی روزی حاصل کرے گی۔ لیکن پروفیسر کوپلینڈ نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ ایک ہی دریا متعدد صوبوں سے ہو کر گذرتا ہے۔ چنانچہ پانی کو مصرف میں لانے کے معاملے پر ان صوبوں کے درمیان شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان اختلافات اور تصادم کو روکنے کے لئے کسی متحدہ سرکاری کنٹرول کا ہونا ضروری ہے۔ جو آب پاشی پر قابو رکھ سکے اور دریاؤں کے پانی کے صحیح مصرف کا انتظام کر سکے۔

بجلی کی طاقت پیدا کرنے کی صنعت بھی علیحدہ علیحدہ صوبائی بنیادوں پر چلائی جانے والی ہے لیکن بجلی کی طاقت پیدا کرنے کے جو طبیعی ذرائع ہیں ان کے صحیح استعمال کے لئے اور مختلف صوبوں کے کام کو مربوط کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہوگی کہ یہ کام کسی ایسی خطہ وار (REGIONAL) قوت کے تحت رہے جو کسی صوبائی حکومت کے ماتحت نہ ہو بلکہ اس سے بلند درجہ رکھتی ہو۔

پروفیسر کوپلینڈ نے دراصل وادی ٹینیسی کی مثال پیش نظر رکھ کر دریائی میدانوں کے لحاظ سے ہندستان کے تقسیم کئے جانے کی تجویز پیش کی ہے لیکن وہ وادی ٹینیسی کی مثال کی اصل حقیقت اور نوعیت بالکل بھول جاتا ہے اس لئے کہ کسی

دریائی میدان کو معاشی لحاظ سے واحد انتظام کے تحت لانے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے انتظام حکومت کو بھی مستقل طور پر علیحدہ کر دیا جائے۔ پروفیسر کوپلینڈ کی غلطی یہی ہے کہ وہ ہندستان کے مختلف دریائی میدانوں کو انتظام حکومت کے لحاظ سے بھی مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ رکھنا چاہتا ہے۔ پروفیسر کوپلینڈ نے یہ فرض کر لیا ہے کہ وادی ٹینیسی والا معاشی تجربہ اگر ممکن ہے تو صرف دریائی میدانوں میں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

وادی ٹینیسی کے ساتھ یہ سوال درپیش تھا کہ وہاں ایک دریا کو ترقی دینا تھا جو بہت سے قدرتی ذرائع میں سے ایک ہے، چنانچہ پورے دریائی میدان کو ایک واحد انتظام کے تحت لے لیا گیا۔ لیکن دریا ہی تو محض قدرتی دولت نہیں ہے اور بھی بے شمار قدرتی ذرائع ہیں جن کو ملک کی معاشی بہتری کے لئے ترقی دینے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اب جس قسم کی دولت کی تنظیم اور بندوبست کا سوال پیش ہوتا ہے اسی کے مطابق علاقے اور خطے کا بھی تعین کیا جاتا ہے چنانچہ وہ علاقہ یا خطہ جسے علیحدہ انتظام کے تحت لانا ہوتا ہے ایک مربع میل بھی ہو سکتا ہے ایک میل بھی ہو سکتا ہے اور پورا ملک بھی محض ایک قدرتی وسیلہ یعنی دریا اور اس سے ملحقہ میدان کی بنیاد پر پورے ملک کو مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا مناسب نہیں ہے۔ مخصوص طور پر جب کہ ان علیحدہ علیحدہ ریاستوں کی سیاسی باگ ڈور فرقہ وارانہ ہاتھوں میں ہوگی جو ان ریاستوں کے باہمی تعاون اور اشتراک عمل کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ ہندوستان کے قدرتی ذرائع میں ایک دریائی میدان ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سے ہیں جن کو ترقی دینے کے لئے ملک کو عارضی طور پر بے شمار علاقوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت پیش ہوگی۔

وادی ٹینیسی کی مثال ہمارے سامنے محض اسی بات کا نمونہ پیش کرتی ہے کہ کس طرح ایک قوم اپنے پچھڑے ہوئے علاقوں کو پستی اور بدحالی سے نکال کر معاشی ترقی کی راہ پر لگا سکتی ہے۔ اگر ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت چاہتی تو کوئی اور پالیسی بھی اختیار کر سکتی تھی اور نکتہ چینی سے بھی محفوظ رہ سکتی تھی۔ مثال کے طور پر معاشی بحران کے زمانے میں امریکی حکومت نے صنعتی اور زرعی پیدائش روک دی اور کچھ پیداوار کو برباد بھی کر دیا۔ لیکن بعد میں معاشی بحران ہی کا مقابلہ کرنے کے لئے وادی ٹینیسی کی اسکیم بنائی گئی تاکہ بے کاری دور ہو اور اسکیم کو چلانے کے لئے جس سامان اور اشیا کی ضرورت ہوگی ان کو پیدا کرنے کے سلسلے میں کچھ بے کار پڑے ہوئے کارخانوں کو کام مل جائے۔ دراصل شروع میں یہ اسکیم اسی مقصد کے تحت چلائی گئی تھی، یہ سوال بعد میں پیدا ہوا کہ جن قدرتی ذرائع کو اس اسکیم کے ذریعے ترقی دی گئی ہے۔ انھیں وہاں کے

بسنے والوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے کام میں لایا جائے۔ لیکن جب یہ سوال پیدا ہوا تو اسے بھی کر ڈالا گیا۔ وادی ٹینیسی کی اسکیم کے عمل میں آنے سے معاشی بحران میں یوں بھی کمی ہوئی کہ جب معاشی زندگی کو بہتر بنانے والے قدرتی ذرائع کو ترقی دی گئی تو امریکہ کے اُن علاقوں میں بھی اس کا خوشگوار اثر ظاہر ہوا جو پہلے سے ترقی یافتہ تھے اور وہاں کی صنعتوں میں جو ناہمواری پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی۔ شروع میں جب کوئلے کی کانوں کے مالکوں اور کوئلے کھودنے والے مزدوروں کو یہ معلوم ہوا کہ ٹینیسی وادی میں بجلی پیدا کرنے کی صنعت کو بہت پھیلایا جا رہا ہے۔ تو انھوں نے پریشانی کا بھی اظہار کیا لیکن جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اس سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں اور صنعت کے پھیلنے اور بڑھنے کے زبردست امکانات ہیں تو وہ اس کام میں لگ گئے اور آخر ان کی محنت کے اچھے نتائج نے ان کی امیدیں پوری کر دیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندستان میں بھی وہ علاقے جو صنعتی لحاظ سے اس وقت ترقی یافتہ ہیں پچھڑے ہوئے اور پست علاقوں کی صنعتی ترقی میں ہاتھ بٹائیں گے، علاقائی منصوبہ بندی کا یہ بنیادی سوال ہے اب تک ہندستان کی صنعتی ترقی بہت ناہموار سی رہی ہے۔ ملک کی تمام صنعتیں خاص خاص مقامات پر محدود سی ہو کر رہ گئی ہیں اور ان کے سارے ملک میں پھیلنے اور بڑھنے کی امید کم ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لوہے اور کوئلے کی کانیں ملک کے ایک ہی گوشے میں مرکوز ہیں، اگر بجلی کی طاقت نے ترقی کی اور کوئلے کی بجائے اسی سے ایندھن کا کام لیا جانے لگا تو اس خرابی کے دور ہونے اور سارے ملک میں صنعت کے پھیلنے کی امید کی جا سکتی ہے۔ حکومت ہند نے اس سلسلے میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ ہندستان میں علاقائی بنیاد پر بجلی کی طاقت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اگر اس پروگرام کے ساتھ اسی علاقائی بنیاد پر ملک کی معاشی ترقی کا کام بھی شروع کیا جائے تو بہتر ہوگا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ملک میں جو معاشی ترقی ہوگی وہ خطّہ وار بنیاد ہی پر ہوگی۔

مسائل حاضرہ (غیر ممالک):-

سوویت معاشی نظام پر جنگ کی تباہ کاریاں

از:- دو۔ رکن

جنگ ایک ایسی چیز ہی کہ اس سے کسی قوم کی مادی اور روحانی طاقتوں کا پورا پورا اندازہ ہوجاتا ہی خاص کر ایک ایسی بڑی جنگ جو حال ہی میں ختم ہوئی ہی۔ اور جس کی کامیابی کا سہرا اتحادیوں کے سر ہی ہٹلر نے اچانک حملہ کرکے گویا روس کی مادی اور اخلاقی طاقت کا امتحان لیا تھا۔ روس کے لئے یہ فخر کی بات ہی کہ اس کا معاشی نظام اس امتحان میں پورے پورے طور پر کامیاب رہا۔ ابتدا میں جرمنی کی فوجیں اپنے اچانک حملے سے فائدہ اٹھاکر اسٹالن گراڈ تک بڑھ آئیں اور سوویٹ یونین کے یورپی علاقے کے ایک بڑے حصے پر قابض ہوگئیں جس میں روس کے اہم صنعتی علاقے بھی شامل تھے، مثلاً یوکرین کا علاقہ یوکرین میں کوئلے اور لوہے کی بڑی بڑی کانیں، خام دھات کو صاف کرنے کے کارخانے (Metallurgical) اور مشین بنانے کے بڑے بڑے کارخانے اور بجلی گھر تھے، جرمن فوجوں نے ڈان اور کیوبن پر بھی قبضہ کرلیا تھا، ڈان کیوبن اور یوکرین کے علاقے مل کر سوویٹ یونین کے لئے سب سے زیادہ مقدار میں غلہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ اگر کوئی اور ملک ہوتا تو اتنے قیمتی علاقوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اس کے لئے اپنی آزادی اور وجود کو برقرار رکھنا غیر ممکن ہوجاتا۔

گذشتہ جنگ میں سوویٹ یونین نے نہ صرف فوجی لحاظ سے جرمنی کے مقابلے میں اپنے برتر ہونے کا ثبوت دیا بلکہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے بھی۔ جرمنی روس کے خلاف تقریباً پورے یورپ کے صنعتی اور زراعتی وسائل اور ذرائع نقل و حرکت کو کام میں لایا، لیکن جنگ نے یہ ثابت کر دیا کہ سوویٹ یونین جرمنی سے معاشی اعتبار سے زیادہ طاقتور ہو۔

جنگ کے ابتدائی حصے میں سوویٹ روس کی بہت سی صنعتیں جنگی علاقوں سے ہٹا کر مشرق کی طرف یورال اور سائبیریا میں منتقل کی گئیں۔ اس کے علاوہ جنگ کے دوران میں بھی بہت بڑے بڑے پیمانے پر نئے نئے کارخانے کھولے گئے حالانکہ اس زمانے میں سوویٹ قوموں کی تمام تر توجہ اور طاقت جنگ میں لگی ہوئی تھی۔ یہ حیرت کی بات ہو کہ جنگ سے ٹھیک پہلے کے تین سالوں میں سوویٹ یونین میں جتنے کارخانے کھلے اُن سے کہیں زیادہ کارخانے جنگ چھڑنے کے بعد تین سالوں کے اندر اندر قایم ہو گئے۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد یہ پتہ چلا کہ سوویٹ یونین کے بجلی گھر اب جتنی بجلی کی طاقت پیدا کر سکتے ہیں، اتنی جنگ سے پہلے نہیں پیدا کر سکتے تھے۔ حالانکہ جنگ کے دوران میں جرمنوں نے روس کے بے شمار کارخانوں اور یوکرین کے بڑے بڑے بجلی گھروں کو تباہ و برباد کر دیا تھا جن میں دریائے نیپر کا عظیم الشان بجلی گھر بھی شامل تھا۔ کوئلے کی کانوں اور لوہے اور اسٹیل کی ملوں کو قایم کرنا یا از سر نو بنانا کوئی آسان کام نہیں چاہے جنگ کا زمانہ ہو یا امن کا لیکن یہ کس قدر حیرت کی بات ہو کہ ۱۹۴۳ء میں سوویٹ یونین میں جتنا لوہا، اسٹیل اور کوئلہ پیدا ہوا اس کا ایک تہائی حصہ زیادہ ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوا۔

سوویٹ قوموں نے اپنے ذرائع اور وسائل کو کام میں لا کر اتنے زیادہ ہوائی جہاز، توپیں، اسلحہ جات اور دیگر سامان جنگ پیدا کئے کہ جرمنی کو آخر شکست کھانی پڑی۔ جنگ کے ابتدائی حصے میں جرمنی زیادہ سامان جنگ پیدا کر سکتا تھا اس لئے وہ آگے بڑھتا گیا لیکن جب بہت جلد سوویٹ یونین جرمنی کے مقابلے میں زیادہ سامان جنگ پیدا کرنے لگا تو جرمنی کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

یہی قوت پیداوار تھی جس نے سرخ افواج کی جانبازی، روسی فوجی افسروں کی صلاحیت اور اسٹالن کی اعلیٰ رہنمائی کے ساتھ مل کر جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ اور بہت جلد یہ بات واضح ہو گئی کہ روسیوں کی فتح یقینی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے بہت جلد جرمنوں سے بخارسٹ، صوفیہ، بوڈاپسٹ، وارسا، وائنا، برلن اور پراگ اور دیگر شہر

اور افغانستان واپس نے بیماوراتحادی فوجوں کے ساتھ مل کر یورپ کی تمام قوموں کو جرمنی کی غلامی سے نجات دلائی۔

جنگ کے شروع سے آخر تک ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ روس جرمنی کے مقابلے میں معاشی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، چنانچہ اسٹالین نے کہا تھا کہ "سوویت ریاست کی معاشی بنیاد دشمن کی ریاست کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ تمام غیر جانب دار لوگوں کی رائے یہ ہے کہ سوویت یونین کی اس معاشی طاقت کا راز وہاں کے معاشی نظام میں پوشیدہ ہے۔"

سوویت یونین ایک اشتراکی ملک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں دولت پیدا کرنے کے آلات اور ذرائع خاص خاص لوگوں کی ذاتی ملکیت میں نہیں ہیں بلکہ پوری قوم کی ملکیت میں۔ وہاں کی ملیں، فیکٹریاں، بینک، زمین اور ذرائع نقل وحرکت وذرائع رسل ورسائل پر پوری قوم کی ملکیت قایم ہے اور وہاں کی حکومت پوری قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے سائنٹیفک بنیادوں پر صنعتوں کو چلاتی اور ان کی ترقی کے لئے پلان بناتی ہے۔ سوویت یونین میں استحصال کا نام ونشان نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنے علم، مہارت اور صلاحیت کے مطابق سماج کی خدمت کرتا ہے اور کام کی مقدار اور خوبی کے لحاظ سے اسے معاوضہ دیا جاتا ہے۔

سوویت روس کے دستور اساسی کے بارہویں دفعہ میں یہ درج ہے "ہر اس فرد کے لئے جو کسی جسمانی کمزوری یا خرابی کا شکار نہیں ہے کام کرنا فرض ہے اور باعث عزت بھی۔"

سوویت یونین کا ہر فرد اشیا کی پیداوار میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتا ہے اسلئے کہ وہ جانتا ہے کہ کسی ملک میں جتنی ہی زیادہ پیداوار ہوگی اسی قدر اس ملک میں زیادہ خوشحالی پیدا ہوگی، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جو فرد جتنا زیادہ پیدا کریگا اسی قدر وہ اور اس کے گھر والے زیادہ خوش حال ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوویت یونین میں سماج اور فرد کے مفاد ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آہنگ ہیں اور ان دونوں میں کسی اختلاف کی صورت قایم نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ سوویت یونین کے لوگ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کے بہت خواہشمند رہتے ہیں اور ملک کی پیداوار بڑھانے اور پیداوار کے طریقوں کو بہتر بنانے میں بڑی دلچسپی اور جوش وخروش کا اظہار کرتے ہیں۔

سوویت یونین میں ایسے طبقے یا گروہ موجود نہیں ہیں جو دوسروں کی محنت پر جیتے ہوں۔ سوویت یونین میں تو مزدوروں اور کسانوں کے ایسے طبقے ہیں جو ایک دوسرے کے مددگار اور دوست ہیں اور جو ادیبوں اور عالموں کو

شانہ بہ شانہ مفادِ عامہ کی خاطر محنت و مشقت کرتے ہیں۔

سوویٹ یونین میں اتنی زبردست صنعتی ترقی کیوں ہوئی اس کی وجہ یہی ہے کہ وہاں کا معاشی نظام اشتراکی اصول پر قایم ہے سنہ ۱۹۴۱ء میں وہاں . . . . کی صنعتی پیداوار سنہ ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں تیرہ گنی زیادہ ہوگئی سنہ ۱۹۱۲ء ہی کے دو سال بعد پہلی عالمگیر جنگ چھڑ گئی اور اس کے بعد روسی انقلاب رونما ہوا" اور سنہ ۱۹۴۱ء میں دوسری عالمگیر جنگ کا وہ دور شروع ہوا جب ہٹلر نے روس پر حملہ کیا۔ گویا روس کی یہ عظیم الشان صنعتی ترقی اشتراکی انقلاب کے بعد ہی ہوئی۔ اسی عرصے میں بڑی بڑی صنعتوں کی پیداوار پندرہ گنی زیادہ ہوگئی اور مشین ڈھالنے کی صنعت نے اپنی پیداوار پچاس گنی زیادہ کر دی منظم معاشی نظام کی برکتوں سے روس جو زار کے عہد میں دنیا کا ایک غیر ترقی یافتہ اور پچھڑا ہوا ملک سمجھا جاتا تھا بہت جلد دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملکوں میں شمار کیا جانے لگا۔ وہاں ایک اول درجہ کی اشتراکی صنعت قایم ہوگئی اور زراعت کا کام خاص طور پر مشینوں کے ذریعے اور بہت بڑے پیمانے پر انجام دیا جانے لگا۔

اسی اشتراکی نظام کی بدولت سوویت یونین کو جرمنی کے مقابلے میں فوجی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے فتح حاصل ہوئی اور اسی اشتراکی نظام نے غلامی اور بربریت پر آزادی اور تمدن کو حاوی کر دیا۔

جرمنوں نے اپنے مفتوح علاقوں میں بہت بڑے پیمانے پر تباہی مچائی تھی۔ سترہ سو قصبے اور کوئی ستر ہزار گاؤں اجاڑ ڈالے اور ان کے ساتھ ان قصبوں اور گاؤں کے صنعتی کارخانے مکانات، اسکول، عجائب خانے پورے یا ادھورے طور پر تباہ کر دیے جرمنوں نے روس کو جتنا مادّی نقصان پہنچایا اس کا اندازہ روسی سکے میں سات کھرب روبل لگایا گیا ہے۔

ان قصبوں اور گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے اور وہاں کی حالت دوبارہ درست کرنے میں کیسی کیسی دقّتوں کا سامنا ہے اسے سوویٹ حکومت نے دنیا سے چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مشکل کام کو سرانجام دینے کے لئے سوویٹ حکومت کے پاس وافر اور لاتعداد ذرائع و وسائل بھی موجود ہیں پنج سالہ منصوبہ بندیوں کی تعمیر کردہ صنعتیں عوام کا جوش و خروش، منظم معاشیات جو پہلے سے موجود ہے اور اشتراکی نظام ——— اتنی چیزیں ان نقصانات کے اٹھانے اور حالات کو دوبارہ بحال کرنے کے لئے کافی ہیں، عنقریب نافذ ہونے والے چوتھے پنجسالہ پروگرام میں تباہ شدہ علاقوں کی حالت درست کرنے کا کام بھی شامل ہے۔ یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ صنعت اور زراعت میں بڑی بڑی ترقیاں ہونگی تاکہ صنعتی اور زراعتی پیداوار کو دوبارہ جنگ سے پہلے کے معیار پر لایا جا سکے۔ چوتھے پنج سالہ پروگرام کے تحت ان علاقوں کی معاشی ترقی کو دوبارہ

بحال کرنے کا کام کیا جائے گا جن پر جرمنی کا عارضی قبضہ ہوگیا تھا، پھر پورے سوویٹ علاقے کو جنگ کے پیدا کردہ حالات سے نکالکر امن کے حالات میں لیجانے اور ان کو مزید طور پر ترقی دینے کا کام بھی ہوگا۔

اب جبکہ سوویٹ یونین جنگ میں فتح حاصل کر چکا ہے۔ اس کے سامنے معاشی حالات کو جنگی بنیادوں سے ہٹاکر امن کے حالات میں لے جانے کا سوال پیدا ہوگیا ہے اور اس وقت سوویٹ حکومت کی توجہ اسی طرف مبذول ہے، ہزاروں کارخانے جہاں پہلے جنگی سامان تیار ہوتے تھے اب ایسی اشیا پیدا کرنے لگے ہیں جن کی ملک کے افراد کو ضرورت ہے، ان علاقوں میں جہاں پہلے جرمنوں کا قبضہ تھا اب بڑے بڑے پیمانوں پر تعمیری کام شروع کر دئے گئے ہیں، ہزاروں کانیں اور بیسیوں انجن بھٹیاں (BLAST FURNACES) لوہا گلانے کی بھٹیاں (STEEL FURNACES) بجلی گھر اور غذا اور میوہ جات کو خراب ہونے سے محفوظ رکھنے کے بے شمار کارخانے کپڑوں کی ملیں اور دیگر صنعتیں دوبارہ بحال کردی گئی ہیں۔

سوویٹ یونین میں بے کاری اور معاشی بحران کا نام و نشان بھی نہیں، ان سپاہیوں اور افسروں کے لئے جنھیں فوجی ملازمتوں سے برخاست کیا جا چکا ہے، ذاتی صلاحیت اور مہارت کے مطابق بے شمار کام موجود ہیں۔ بلکہ اس وقت سوویٹ یونین میں بے کاری کے پھیلنے کی بجائے کام کرنیوالوں کی کمی محسوس کی جارہی ہے۔ صنعت اور زراعت میں بڑی بڑی اسکیموں کو عمل میں لانے کے لئے کارکنوں کی سخت ضرورت ہے۔

سوویٹ روس نے فاشسٹ حملہ آوروں کے خلاف ایک خونریز جنگ میں فتح حاصل کی ہے۔ اب یہ ملک دوبارہ اس پرامن ترقی اور عروج کے کام میں لگ گیا ہے، جو جنگ کی وجہ سے درمیان میں رک سا گیا تھا، سوویٹ یونین کے عوام کے سامنے عظیم الشان مادی اور تہذیبی ترقی کے دروازے کھلے ہیں۔

(تاس)

نظری معاشیات :-

جائز سود اور ناجائز سود

از :- ——— صاحبزادہ محمد عمر (نور الٰہی)

معاشیات کے لحاظ سے دنیا کے ممالک دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اول وہ ممالک جن میں زیادہ تر صنعتی کاروبار ہوتا ہے، اور دوم وہ ممالک جہاں زرعی پیداوار پر زندگی کا دارومدار ہے، اور یہ دونو اپنے کاموں کو جاری رکھنے کے لئے ایک اور طاقت کے دست نگر ہیں جسے سرمایہ کہتے ہیں، سرمایہ بہم پہنچانے اور سرمایہ لینے کے بھی دو طریقے ہیں ۔

۱- جب سرمایہ کا لین دین تجارت یا صنعت کو فروغ دینے کے لئے ہوتا ہے۔ تو صناع یا یا تاجر کی صنعت میں سرمایہ دار اخراجات کے لئے روپیہ دے کر شریک ہو جاتا ہے، اس منفعت کو سود (INTEREST) اور اس کے دینے والے کو بینکر (Banker) یعنی ساہوکار کہتے ہیں

۲- جب سرمایہ کسی ہنگامی غرض کے پورا کرنے کے لئے لیا دیا جاتا ہے۔ تو سرمایہ دار اپنے سرمایہ کے استعمال کا بے تحاشا کرایہ لیتا ہے جس کا ادا کرنا بسا اوقات قرض لینے والے کی استطاعت سے باہر ہوتا ہے، اس قسم کی منفعت یا کرایہ کو سود ناواجب (ربا) (USURY) اور لینے والے کو سود خوار (USURER) کہتے ہیں۔

سود کی ان دو صورتوں کے عمل میں بڑا فرق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول صورت میں جب روپیہ تجارت یا صنعت و حرفت

کے لئے لیا جاتا ہے۔ تو اسے صرف کرنے کے بعد نہ صرف وہ کلہم واپس آجاتا ہے۔ بلکہ اپنے ساتھ کچھ منافع کا روپیہ بھی لاتا ہے، روپیہ لینے کے وقت قارض و مقروض دونوں اپنے سود و زیاں کا توازن کرنے کے لئے ایک سطح پر کھڑے ہوتے ہیں، اور شرکت منفعت کا تعین کرنے کی یکساں اہلیت رکھتے ہیں۔ قرض لینے والا اس وقت تک سود مطلوبہ دینے پر رضا مند نہیں ہوتا جب تک اس امر کی نسبت اس کا اطمینان نہ ہوجائے کہ اصل زر اور سود مقررہ ادا کرنے کے بعد اس کے حصہ میں معقول منافع آئے گا۔ اس طریق سود کو شائد کوئی ذی فہم مذموم خیال نہ کرے۔ لیکن جب روپیہ کسی ہنگامی غرض کو پورا کرنے یا کسی آئی بلا کو ٹالنے کے لئے قرض لیا جاتا ہے تو حالت صورت اول سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ جو روپیہ قرض لیا جاتا ہے وہ صرف کے ساتھ ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہوجاتا ہے جس کے واپس آنے کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ ضرورت اسے مجبور کردیتی ہے کہ وہ نتائج سے بے نیاز ہوکر کسی شرح سود پر قرض اٹھالے، اور قرض دینے والا جانتا ہے کہ قرض خواہ اس کے جنگل میں پھنس گیا ہے، تو سود مانگے گا۔ اسے مل جائیگا۔ اس لئے بقول سرایڈورڈ بو،   قرض لینے والا اس شرح سود پر رضامند نہیں ہوتا، بلکہ اس کی ضرورت یا مصیبت اس کا سر تسلیم خم کردیتی ہے، اس لئے   کہ اس معاہدے کے فریقین کی معاشرتی اور ذہنی حالت یکساں نہیں ہوتی۔ اور جو شرح سود اس حالت میں مقرر ہو، اسے کوئی ذی فہم واجب نہیں کہہ سکتا۔

سطور بالا کے پیش نظر یہ کہنے میں مبالغہ نہیں کہ سود (INTEREST) ایک بے ضرر چیز ہے بلکہ تجارت، صنعت، حرفت اور زراعت کی قوت بازو ہے۔ لیکن سود ناواجب (USURY) ایک خون آشام درندہ ہے۔ جسے کسی پنجرے میں بند نہ رکھنا سماج کے لئے خطرناک ہے۔ سود واجب اور سود ناواجب میں تمیز زمانہ حال کی ایجاد ہے۔ اگلے زمانہ میں سود واجب (INTEREST) پر روپیہ قرض لے کر روپیہ پیدا کرنا شاذ ہی کسی کو معلوم تھا، سود ناواجب (USURY) ہی کا رواج تھا اور اسی کا ذکر خیر سطور آئندہ میں ہوگا۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دنیا میں سود ناواجب (جسے آئندہ صرف سود کہا جائیگا) کا ڈول کب ڈالا گیا مگر یہ مسلّم ہے کہ حضرت مسیح سے ۴۰۰۰ سال پیشتر بابل، نینوا، فنیشیا، مصر، اور یونان میں سود کا رواج تھا، قرض زیادہ تر قحط پڑ جانے کے باعث لیا جاتا تھا اور کسانوں کی نہ صرف فصل، باغ، اور گھر بار ہاتھ سے نکل جاتے تھے، بلکہ ان کی اولاد دائمی غلام بن جاتی تھی، (۱) یہ حالات تھے جب حضرت موسےٰؑ نے یہ پیغام سنایا کہ   اسرائیل کا کوئی فرد قوم اسرائیل کے کسی دوسرے فرد سے سود نہیں لے سکتا۔

(۲) یونان میں لوگوں کی حالت مصر سے بھی بدتر تھی، ساری کی ساری آبادی سود کے بندھنوں میں پھنس کر سرمایہ داروں کی

غلام بن گئی تھی، اتنا قرض بن گیا تھا جو وہ پشتوں تک نہ اتار سکتے تھے۔ تمام زمینوں پر پتھر کے ستون نصب تھے! جن پر قرض کی تعداد اور قرض خواہ کا نام کندہ ہوتا تھا۔ جب کسانوں کی حالت اس سے بھی بدتر ہوگئی تو ۵۹۴ ق.م میں سولن (۳) نے مداخلت کی اور ایسے تمام قرضوں کو کالعدم کر دیا جو زمین یا کسی ذاتی مکان پر دیے گئے تھے۔ (۴) بعد ازاں ارسطو نے تمام سودی کاروبار کو غیر فطری قرار دیا (۵) اٹلی میں جس ٹی نین اول (JUSTINIAN 1st) نے یہ حکم دیا کہ کسانوں سے ۴ فیصدی اور تاجروں سے ۸ فی صدی سے زیادہ سود نہ لیا جائے۔ (۶) سسرو بیان کرتا ہے کہ کیٹو سے کسی نے پوچھا کہ سود کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے تو کیٹو نے کہا جو قتل عمد کے بارے میں آپ کا ہے (۷) فلسطین میں حضرت مسیح نے آج سے ۱۹۴۵ برس پہلے یہ حکم سنایا کہ قرض دو مگر کسی اور چیز (فائدہ۔ سود) کی ہوس نہ رکھو اور تمام عیسائیوں میں سود لینا ممنوع ہوگیا۔

عرب میں ۵۰۰ سال ب۔ ح۔ اسلام نے سود لینا یا دینا حرام کر دیا۔

مذہب میں سود کی ممانعت کا ارتقا قابل غور ہے۔ موسیٰ نے جو پابندی کی وہ اس کی امت تک محدود تھی، امت کے حلقہ سے باہر وہ سود لے دے سکتے ہے۔ عیسیٰ کے حکم کا یہ اثر ہوا کہ سود لینا تو بند ہوگیا مگر دینا جاری رہا۔ اسلام نے سود لینا بھی اور دینا بھی بند کر دیا۔

انگلستان میں احکام کلیسا کے مطابق سودی کاروبار ممنوع تھا۔ مگر یہودی اندر ہی اندر سود پر قرض دیتے تھے اور اسی لئے سماج میں انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا بلکہ ایذا پہنچائی جاتی تھی، جب وہ سود لینے میں بہت کھیل کھیلے تو انھیں جبراً ۱۲۹۰ء میں انگلستان سے جلاوطن کر دیا گیا اور چار صدیوں کے بعد انھیں انگلستان واپس آنے کی اجازت ملی۔ انگلستان میں آزادی رائے ترقی کر گئی اور کلیسا تن داہد سود کی روک تھام کے قابل نہ رہا۔ تو ۱۴۸۲ء میں ایک قانون منظور ہوا جس کی رو سے سودی لین دین کے فریقین کو ایک سو پونڈ (ڈیڑھ ہزار روپیہ) جرمانہ کا مستوجب قرار دیا گیا، پھر یہ تجویز ہوئی کہ سودی قرض کی اصل رقم کا نصف حصہ ضبط کیا جائے اسکے بعد یہ قانون نافذ ہوا کہ سودی داد وستد کے فریقین کو پلوری (pillory) میں کھڑا کر کے رسوائے کوچہ و بازار کیا جائے اور وہ نیز چھ ماہ قید اور ۲۰۰ روپیہ جرمانہ ادا کرے۔

شاہ ہنری ہشتم کے عہد (۱۴۹۱-۱۵۴۷) میں جب انگلستان کی تجارت چمک اٹھی اور لوگ اپنا نفع و نقصان سمجھنے لگے تو ضرورت لاحق ہوئی کہ سود کو جائز قرار دے کر شرح سود مقرر کر دی جائے، چنانچہ ۱۵۴۶ء میں اس شرح پر سود لینے کی اجازت دی گئی کہ شرح سود ۱۰ فی صدی سے تجاوز نہ کرے۔ (۸) اگرچہ قانون نے سود پر جواز ثبت کر دی لیکن لوگ بدستور اسے فعل زبوں خیال کرتے ہے

ڈاکٹر ولسن (Wilson) کے ان الفاظ سے اس وقت کے خیال کا اندازہ لگائیے ۔

" میں تہ دل سے چاہتا ہوں کہ ڈاکوؤں اور قاتلوں کی طرح سود خواروں کو بھی قصاص کی قسم کی کوئی سزا دی جائے ۔ کیوں کہ وہ چوروں اور قاتلوں سے زیادہ عبرت ناک سزا کے مستحق ہیں ، سود خوار نہ صرف خاندانوں کے خاندان بلکہ ملکوں کے ملک نگل جاتے ہیں ۔ اور جس شخص کو ان سے پالا پڑے اس کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی دیدیتے ہیں (۵) اس شورش کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاہ ایڈورڈ ششم (۱۵۴۷ - ۱۵۵۳) کے عہد حکومت میں یہ قانون منسوخ کرنا پڑا ، اور ملکہ الزبتھ (۱۵۵۳ - ۱۶۰۳) کے زمانہ تک سودی لین دین بالکل بند رہا ۔ اور اس کے عہد میں شاہ ہنری کا قانون پھر سے نفاذ پذیر ہوا ۔ مگر لارڈ بیکن (Bacon) نے صاف کہدیا ، اگر سود کو جائز قرار دینا ہو تو اسکے دانت خوب رگڑ دو تاکہ کسی کو زیادہ کاٹ نہ سکے (۶) اس کے بعد شرح سود میں یہ اتار چڑھاؤ ہوتا رہا ۔

(۱) شاہ جیمز اول کے عہد میں	۸ فی صدی
(۲) کرام ویل " " "	۶ " "
(۳) ملکہ این " " "	۵ " "
(۴) ملکہ وکٹوریہ " "	۵ " "

۱۸۵۴ء میں یہ قرین مصلحت معلوم ہوا کہ سود کو جملہ قیود سے سبک دوش کیا جائے

ان قیود کا ہٹنا تھا کہ سود خواروں نے اودھم مچادی ۔ اور انھوں نے نوجوانوں کو اپنے دام تذویر میں پھانس کر تباہ کرنا شروع کیا ۔ یہ نوجوان اپنے عیاشانہ اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ساٹھ فی صدی سالانہ سود لینے سے دریغ نہ کرتے تھے بلکہ ایک نوجوان ۳۰۰۰ فی صدی سالانہ سود دینے پر رضامند ہوگیا ۔

(۱) اسی قسم کے کئی ایک اور واقعات رونما ہوئے تو سودی کاروبار کو پھر چند قیود کا پابند کیا گیا اور ۱۹۰۰ء میں ایک قانون جاری ہوا جس کے تحت ہر ایک سود خوار کو ہر سال ۱۱۲ روپئے فیس ادا کر کے لائسنس لینا پڑتا وہ یک وقت ۱۵۰ روپے سے زیادہ قرض نہ دے سکتا ، نیک چلنی کی سند پیش کرنا لازم تھا پھر اس امر کا اشتہار دینا پڑتا کہ وہ سود خواری کے لائسنس کے لئے درخواست دے رہا ہے اور بھی بیسیوں ایسی شرائط عائد کی گئیں ، لیکن یہ قانون صرف چھوٹی رقموں تک محدود تھا ۱۹۱۱ء میں ایک اور قانون بڑی رقموں پر سود لگانے کے متعلق جاری ہوا (۳) مگر ان قوانین کا کوئی اثر (Interest) سود پر نہ پڑا ، اور بنک اپنے کام میں

بغیر کسی مداخلت کے مصروف ہے۔

ہندوستان میں سود کو کبھی اچھی نگاہ سے نہ دیکھا گیا۔ سود لینا پاپ تھا اور سود خوار چور سے بدتر۔ چنانچہ منوشاستر باب ۱۰ میں برہمن اور چھتری کو اجازت نہیں کہ وہ کسی کو سود پر قرض دیں (۴)۔ وششٹ جی فرماتے ہیں کہ جنین کو ہلاک کرنے اور سود لینے کے فعل کو ترازو میں وزن کیا گیا تو سود لینے کا پلڑا بھاری نکلا (۵)۔ اس اشارے کے ذریعے رشی کو یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ سود جو زندہ انسان کا لہو پیتا ہے۔ اس بچے کے قاتل سے زیادہ قابل سرزنش ہے جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں اپنے طور پر سودی داد و ستد ہوتی تھی۔ مگر عدالت ایسے معاہدوں کو قبول نہ کرتی تھی۔ انگریزی حکومت نے سود کی ایک حد مقرر کرنا مناسب خیال کیا اور ۱۷۷۴ء میں ایک قانون جاری کر کے شرح سود مقرر کر دی کہ سود اصل زر کے نصف سے کبھی بڑھنے نہ پائے۔ ۱۷۹۳ء میں ایک نئے قانون نے شرح سود انتہائی ۱۲ روپے فی صدی سالانہ مقرر کر دی۔ اس کے بعد ایکٹ نمبر ۲۸ ۱۸۵۵ء کے ذریعہ جملہ قوانین در بارہ سود منسوخ کئے گئے اور شرح سود سترہ فی صدی قابل وصول قرار دی گئی۔ لیکن تھوڑے سے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ سود کو بالکل مطلق العنان چھوڑنا مناسب نہیں اور ضرورت محسوس ہوئی کہ بقول ڈاکٹر میران ماتھ سین "قانون کو چاہیے کہ وہ سود کو باقاعدہ کر دے تاکہ تباہ کن اور خلاف ضمیر داد و ستد کا امکان نہ رہے (۶) اور لوگوں نے بھی رائے دی کہ سودی کاروبار پر کچھ قیود ضرور عائد ہونا چاہئیے (۷)۔ آخر سابقہ ایکٹ منسوخ ہو کر ایکٹ نمبر ۱۰ ۱۹۱۸ء جاری ہوا جس کے مطابق سود مقررہ کی جوازیت کا فیصلہ عدالت کی مرضی پر چھوڑا گیا۔ اب ہندوستان میں واجب سود ۶ فی صدی خیال کیا جاتا ہے۔ صوبہ پنجاب میں سود کی گرفت کو کم کرنے کے لئے چند قوانین وضع کئے گئے ہیں۔ جو بہت کامیاب ثابت ہوئے مگر صرف صوبائی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔

منصوبہ بندی کیا ہی؟

از:- محمد عبدالقادر صاحب بی ایس سی آنرز (اکنامکس) لندن شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ

ہندستان میں پچھلے دو تین سال سے "منصوبہ بندی" کا چرچا ہی، اور اس وقت ملک کے سامنے کئی منصوبے ہیں، یہاں کی معاشی ترقی کے لئے بمبئی کے صنعت گروں نے ایک خاکہ پیش کیا ہی جو "بمبئی پلان" کے نام سے مشہور ہی، ایم این رائے کی جماعت نے عوام کے نقطۂ نظر سے ایک منصوبہ مرتب کیا ہی - اور اس کا نام "پیپلز پلان" رکھا ہی، اگروال نے "گاندھین پلان" کی بنیاد گاندھی جی کے معاشی مسلک پر رکھی ہی - ان غیر سرکاری منصوبوں کے علاوہ خود حکومت ہند نے اپنا ایک منصوبہ تیار کیا ہی - مذکورہ بالا مضمون کے مطالعہ سے ہمیں ان عملی تجاویز کا ضرور علم ہوتا ہی جو کہ یہاں کی معاشی ترقی کے سلسلہ میں پیش کئے گئے ہیں لیکن ان سے صحیح استفادہ اسی وقت ہو سکتا ہی جب کہ ہم منصوبہ بندی کے مفہوم اور عام اصول سے واقف ہو جائیں۔

منصوبہ بندی کے تحت ساری معاشی جد وجہد کو ایک لائحۂ عمل یا پروگرام کے تابع کر دیا جاتا ہی، معاشی سرگرمی افراد یا جماعتوں کے من مانے مقاصد یا ان کے آزاد عمل کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ ایک مرکزی ادارہ کے تجویز کردہ خاکے کے مطابق ہوتی ہی، کیا پیدا کیا جائے، کس مقدار میں پیدا کیا جائے، ہر کارخانہ کس قدر پیدا کرے، کارخانوں

کی تعمیر کہاں ہو، نئی سڑکیں کن علاقوں میں ہوں، معاش کے مختلف طبقوں کا معاوضہ کن اصولوں پر ہو، مزدوروں کو کم سے کم کتنی اجرت دی جائے۔ یہ سب امور پہلے سے ہی طے کر لئے جاتے ہیں، اور اس طرح سارا معاشی کاروبار ایک مرکزی نظام کے تحت آجاتا ہے۔

اب بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی معیشت جس میں منصوبہ بندی نہ ہو اسکی کیا خصوصیات ہیں یہاں معاشی کاروبار کسی مرکزی نظام کے تابع نہیں ہوتے۔ مختلف افراد یا گروہ اپنے اپنے اندازوں کے لحاظ سے اشیاء پیدا کرنے اور زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، جب ان کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ وہ کن اشیا کو پیدا کریں اور ان کی مقدار کیا ہو تو وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کس صورت میں انھیں خاطرخواہ منافع ملےگا، ملک کی حقیقی ضروریات کی انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بہت ساری ایسی اشیا جو معاشرہ کے بیشتر افراد کے لئے غیر اہم یا کم اہم ہوتی ہیں انھیں بغیر کسی تامل کے پیدا کر لیا جاتا ہے اور بہت ساری ضروری اشیا کی مناسب مقداروں میں پیدائش ہونے نہیں پاتی۔ روپیہ ایسے کاروباروں میں لگایا جاتا ہے جن میں زیادہ منافع ملنے کی توقع ہو۔ اسی سلسلہ میں بعض مرتبہ بڑے بڑے صنعت گروں کو اپنے غلط اندازوں کی بنا پر کثیر نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ نیز معاشی زندگی کے مختلف شعبوں اور ہر شعبہ کے مختلف کاروباروں میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔

منصوبہ بندی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے تحت ملک کے مختلف منصوبوں میں ربط قایم کیا جاتا ہے۔ زراعت صنعت و حرفت، حمل و نقل، بنک کاری، مالیات، ان سب سے متعلق پالیسی پہلے سے ہی طے کر لی جاتی ہے اور ہر ایک شعبے کی ترقی کو دوسرے شعبے کی ترقی سے متعلق کر دیا جاتا ہے، ہندوستان کے صنعتی اور زرعی منصوبوں میں باہمی ربط کا سراغ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ زراعت میں جو زائد از ضرورت افراد پائے جاتے ہیں ان کی کھپت صنعتوں میں ہوگی، نیز صنعتی ترقی کے بدولت زرعی اشیا کے استعمال کے مواقع ہاتھ آئیں گے۔ اسی طرح زرعی ترقی کی بدولت کسانوں اور دیہی آبادی کی خوشحالی میں جب اضافہ ہوگا تو لازماً انکی صنعتی اشیا کو خریدنے کی قوت میں بھی اضافہ ہوگا۔

منصوبہ بندی کے اور بھی فوائد ہیں۔ بالفرض غلط اندازوں یا دوسرے اسباب کی بنا پر کسی صنعت میں کثرت سے اشیا پیدا کر دی جائیں تو اس صنعت کو بند نہیں کر دیا جاتا بلکہ اسکی جدید تنظیم ہوتی ہے اور اسی دوران میں اسے دوسری

[illegible] سے چلانے کی کوشش ہوتی ہے، منصوبہ بندی کے ذریعہ بے روزگاری کو بھی دور کیا جا سکتا ہے بے روزگاری کا ایک اہم سبب یہ ہوتا ہے کہ عوام کی قوت خرید کم ہونے کی وجہ سے بہت سارے کاروباروں کو برخاست کر دیا جاتا ہے، لیکن منصوبہ بندی کے تحت آمدنیوں کے اختلافات کو دور کرنے سے سب کی قوت خرید میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اسی طرح بے روزگاری کی ایک اہم وجہ باقی نہیں رہتی۔

منصوبہ بندی اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ شروع سے ہی منصوبہ کے مقصد کا تعین ہو جائے یعنی اس کی وضاحت ہونی چاہیے کہ ہم جو منصوبہ تیار کر رہے ہیں اس کی غرض و غایت کیا ہے، مثلاً ہندوستان کی معاشی ترقی کے لئے جو منصوبے تیار کئے گئے ہیں، ان کا مقصد یہاں کے باشندوں کے معیار زندگی کو بڑھانا ہے۔ اسی سلسلہ میں موجودہ معیار زندگی کا جائزہ لینے کے بعد یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ بہت ہی پست ہے، معیار کو بلند کرنے کی خاطر غذا، لباس، مکان، تعلیم اور طبی امداد سے متعلق اعلیٰ معیارات مقرر کئے گئے ہیں اور ان کا حاصل کرنا قومی ترقی کے لئے ناگزیر ہے۔ "بمبئی پلان" کا مقصد یہ ہے کہ سالانہ آمدنی جو اوسطاً فی کس ۶۵ روپیہ ہوئی ہے اسے بڑھا کر ۱۳۰ روپیہ کر دیا جائے۔

جس طرح تمام مقصد کا تعین ضروری ہے اسی طرح ہر شعبہ کے لئے جو منصوبے تیار ہوں ان کے مقاصد کی بھی وضاحت ہونی چاہیئے مثلاً ہندستان کی صنعتی ترقی کا ایک اہم مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے ہمارے یہاں زراعت اور صنعت و حرفت میں جو عدم توازن ہے اسکی اصلاح کی جائے۔ ہندستان کی آبادی کے کثیر حصہ کا انحصار زراعت پر ہے اور زراعت کا دارومدار زیادہ تر قدرتی حالات پر ہے۔ کسی ایک سال خشک سالی ہو جائے تو آبادی کے ایک بڑے حصہ کے ذرائع معاش بری طرح متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ضرورت سے زائد جو زراعت کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں ان کے لئے بھی کچھ نہ کچھ معاش کی صورت نکالنی چاہیئے، ان حالات کے تحت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں کے باشندوں کو بڑھتی ہوئی تعداد میں صنعتوں کو بطور پیشہ اختیار کرنا چاہیئے۔

ہر ملک کو اپنے منصوبوں کو تیار کرنے سے پہلے اپنے یہاں کے معاشی ذرائع اور معاشی حالات کی تحقیق کرانی چاہیئے جملہ معاشی ذرائع کا جائزہ لینے کے بعد یہ دیکھنا ہوگا۔ کہ ان سے کس طرح زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔ زراعت صنعت و حرفت حمل و نقل اور دیگر شعبوں میں جو حالات پائے جاتے ہیں ان کے متعلق مواد کی فراہمی بھی ضروری ہے۔ مثلاً ہندستان کے لئے منصوبہ بندی کے سلسلہ میں ہمیں یہاں کے معدنی زرعی اور صنعتی ذرائع کی تحقیق کرنی ہوگی آبنائی قوت سے

جوکام لیا جاتا ہے اس کا اندازہ کرنا پڑیگا اور قوت محرکہ جو دستیاب ہوسکتی ہے اس کے امکانات کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ علاوہ ازیں ملک کے موجودہ معاشی حالات کا بھی جائزہ لینا پڑیگا تاکہ ہمیں یہ معلوم ہوجائے کہ اب کام کہاں سے شروع کرنا ہے۔

منصوبوں کی تیاری کا کام ایک ایسے کمیشن کے سپرد ہونا چاہیئے جو فنی ماہرین پر مشتمل ہو۔ صرف عام ہدایات کی حد تک یہ مجلس قانون ساز کے محتاج رہیں۔ مثلاً انہیں یہ بتادیا جائے کہ منصوبہ بندی کی تیاری کے وقت کن مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے وپیدائش کے ذرائع کی ملکیت اور ان کے انتظام کے متعلق کیا مسلک ہونا چاہیئے۔ سب سے پہلے کن صنعتوں کی ترقی کی طرف توجہ ہو۔ اس قسم کی عام ہدایات کی روشنی میں مرکزی کمیشن ملک کے مختلف حصوں کی کمیٹیوں سے منصوبے تیار کروالے اور پھر ان سب میں ربط پیدا کرنے کے بعد ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرے جو سارے ملک کے مشترک مسائل کو حل کرسکے، صوبائی یا مقامی مسائل کو حل کرنے کی تدبیروں کو دریافت کرنے کا کام صوبائی یا مقامی کمیٹیوں کے تفویض کردیا جائے۔

منصوبے جب تیار ہوجائیں تو ان کی زیادہ سے زیادہ نشر واشاعت ہو اور مختلف طبقوں کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ منصوبوں کے فوائد عوام کے ذہن نشین نہ کرائے جائیں اور ان کے ردعمل کا پتہ نہ چل سکے تو منصوبے کچھ زیادہ کامیاب نہ رہینگے۔

منصوبہ بندی کمیشن کا کام ہے کہ جو کچھ بھی مشورے ملے ہوں ان کی روشنی میں اپنے منصوبوں پر حسب ضرورت نظر ثانی کرے۔

منصوبوں کے نفاذ کا مسئلہ بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں موزوں اور ماہر افراد کا انتخاب ضروری ہے جو کہ اپنے سے متعلقہ کام اور اس کے فنی نکات سے بخوبی واقف ہوں۔ بڑے سے بڑا منصوبہ بھی ناکام رہیگا اگر اس کے نفاذ کی ذمہ داری غیر موزوں اور نااہل افراد کے تفویض ہو۔

معاشی صورت حال :-

۱ برطانوی امریکی معاہدہ

۲ اور ہندستان

۳ ہندستان کے چھوٹے سکوں میں تبدیلی

"ادارہ"

برطانیہ اور امریکہ کا مالی معاہدہ

۶ دسمبر ۱۹۴۵ء کو تین ماہ کی مسلسل گفت و شنید کے بعد برطانیہ اور امریکہ کے درمیان ایک مالی معاہدہ وجود میں آیا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے دنیا کے معاشی حالات ایک نئی منزل میں داخل ہوتے ہیں، اس معاہدے میں مندرجہ ذیل خاص باتیں ہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ کو چار ارب چالیس کروڑ ڈالر قرض دے گی جو چودہ ارب چھیاسٹھ کروڑ روپیوں کے برابر ہوتے ہیں، اس میں سے تین ارب ۷۵ کروڑ ڈالر یعنی بارہ ارب پچاس کروڑ روپیے برطانیہ تجارتی امور میں صرف کریگی اور بقیہ پینسٹھ کروڑ ڈالر یعنی ۲ ارب ۱۶ کروڑ روپیوں سے اس امریکی مال کی قیمت ادا کرے گی جو اس وقت برطانیہ میں جمع ہے یہ مال امریکہ نے دوران جنگ میں "قرضہ ٹھیکہ" راضی نامے (LEND-LEASE AGREEMENT) کے تحت مہیا کیا تھا جس کی برطانیہ نے ابھی قیمت نہیں ادا کی ہے۔

اس قرضے کے عوض میں برطانیہ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ عہد نامے کے عمل میں آنے کے سال بھر بعد ہندستان، مصر اور دیگر نوآبادیاتی ممالک کے دوران جنگ والے قرض ادا کر دے گی۔

۳۱ دسمبر ۱۹۵۱ء سے برطانیہ، امریکہ کا یہ قرضہ دو فی صدی شرح سود پر ادا کرنا شروع کرے گی اور پچاس سال تک ادا کرتی رہے گی، اس طرح قرضہ اور سود ملا کر برطانیہ امریکہ کو ۵ ارب ۹۶ کروڑ ۵ ۲ لاکھ ڈالر ادا کرے گی جو ۱۸ ارب ۹۰ کروڑ روپیہ کے برابر ہوتے ہیں، اگر کسی سال برطانیہ کو مالی مشکلات کا سامنا ہوگا تو بین الاقوامی مالی فنڈ جو اقوام متحدہ کی ایک شاخ ہے غور وخوض کرنے کے بعد اس مخصوص سال کی ادائیگی سے برطانیہ کو بری کر سکتا ہے۔

اس معاہدے کا فوری نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ برطانیہ اپنی صنعت اور تجارت کو جنگ کی تباہیوں سے نکال کر دوبارہ اچھی حالت پر لا سکے گی۔ اور امریکہ کو برطانیہ اور اس کی نوآبادیات میں بغیر کسی رکاوٹ کے اپنا صنعتی مال بھیجنے اور بیچنے کی آزادی حاصل ہوگی۔ دنیا کے ان دو سب سے بڑے صنعتی اور تجارتی ملکوں کی معاشی حالت کے اچھے ہونے کے یہ معنی ہیں کہ عام طور پر ساری دنیا کی تجارت اور صنعت دوبارہ بحال ہو جائیگی اور از سر نو خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔ معاہدے کے ساتھ صدر ٹرومین اور وزیر اعظم اٹیلی کا جو مخلوط بیان شائع ہوا ہے اس میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ دنیا کے معاشی لحاظ سے مخالف گروہوں میں بٹ جانے کا خطرہ اب جاتا رہا اور دنیا سے بے کاری کے دور ہونے صنعتی پیداوار کے بڑھنے اور تجارت کے ترقی کرنے کی زبردست امیدیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مخلوط بیان میں برطانیہ کو قرضہ دینے کا یہ مقصد بتایا گیا ہے کہ برطانیہ اس رقم سے امریکی مال خریدے گی۔ تاکہ وہ جنگ اور اس کے زمانہ تداخل میں اپنی مالی حالت درست کر کے ہندوستان اور دیگر نوآبادیات کے پچھلے قرضے ادا کر سکے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اب برطانیہ اپنے خزانے میں سونا اور ڈالر کی کافی مقدار جمع کر سکے گی اور ساتھ ہی تجارتی آزادی کے اصول پر عمل کر سکے گی۔ برطانیہ اب اس قابل ہو جائے گی کہ ہندستان اور نوآبادیات میں درآمد کی پابندیاں ہٹا سکے اور ریاستہائے متحدہ امریکہ و دیگر ممالک کے ساتھ مل کر دنیا بھر میں تجارتی آزادی قایم کر سکے تاکہ ہر ملک کو ہر جگہ اپنے مال بھیجنے کا اختیار اور حق حاصل ہو۔

یہ تو معاہدے کی ظاہری شکل وصورت ہوئی لیکن اس کے اندر جو سیاسی مفہوم پوشیدہ ہے اس کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے بقول لوئی فیشر اس معاہدے کے ذریعہ امریکہ نے گویا سونے کی پچر سے سلطنت برطانیہ کے بند دروازے توڑ ڈالے۔ اس کی تشریح یوں ہے۔

پہلے سلطنت برطانیہ میں جتنے ملک شامل تھے وہ اپنا مال برطانیہ کے ہاتھ فروخت کرتے تو انھیں پونڈ یا برطانوی نوٹ (اسٹرلنگ) کی شکل میں قیمت ادا کی جاتی[1] - اس پونڈ یا برطانوی نوٹوں کو وہ ملک سلطنت برطانیہ کے حدود کے اندر ہی صرف

[1] یہی پابندی ان ملکوں پر بھی عاید تھی جنھوں نے برطانیہ کے مالی نظام میں شامل ہونا قبول کر لیا تھا مثلاً ناروے، سویڈن وغیرہ۔

کر سکتے [illegible] سے باہر نہیں، ان کے مال کی قیمت کا محض تھوڑا سا حصہ ڈالر کی شکل میں ادا کیا جاتا اور اسی رقم کو انھیں سلطنت برطانیہ سے باہر خرچ کرنے کی اجازت تھی۔

اس انتظام کے تحت برطانیہ کا فائدہ تھا اور امریکہ کا نقصان امریکہ کا اس لئے نقصان تھا کہ وہاں کے صنعت گر اور تاجر سلطنت برطانیہ کے وسیع و عریض بازاروں میں اپنی خواہش کے مطابق مال نہیں بیچ سکتے تھے، بلکہ محض ایک محدود مقدار میں اس لئے کہ سلطنت برطانیہ کے ملکوں کو ڈالر کی محض ایک محدود سی مقدار رکھنے کی اجازت تھی اور برطانیہ کا اس لئے فائدہ تھا کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے مال ان خالی بازاروں میں بیچ سکتی تھی۔

اب اس نئے معاہدے کی رو سے سلطنت برطانیہ کے تمام ممالک کو اس بات کی پوری آزادی حاصل ہو کہ وہ برطانیہ سے اپنا پچھلا قرضہ یا اپنے مال کی قیمت ڈالر کی شکل میں طلب کریں یا پونڈ کی شکل میں اور برطانیہ مجبور ہو کہ اسی شکل میں ادا کرے۔ پھر ان ملکوں کو اس بات کی بھی مکمل آزادی حاصل ہو کہ وہ اس رقم کو جہاں چاہیں خرچ کریں اور جس ملک سے چاہیں مال خریدیں۔ اس طرح امریکہ کے صنعتی اور تجارتی مال کے لئے برطانوی سلطنت کے وسیع و عریض بازار کھل گئے ہیں "امریکہ نے اپنے سونے کے تبر سے سلطنت برطانیہ کے دروازے توڑ ڈالے"۔

اس معاہدے کے عمل میں آنے کے سال بھر بعد سلطنت برطانیہ کے ممالک جس ملک سے چاہیں مال خرید سکتے ہیں اور اسی تاریخ سے انھیں ڈالر کی مقدار بھی ضرورت بھر مہیا کی جانے لگے گی، مثلاً اگر ۱۹۴۷ء سے ہندستان چاہے گا کہ برطانیہ اپنا دوران جنگ والا قرضہ یا اپنے مال کی قیمت ڈالر کی شکل میں وصول کرلے تو اسے ڈالر ہی ادا کئے جائینگے، پھر ہندستان بلا کسی رکاوٹ کے ان ڈالروں سے امریکہ کے مال خرید سکے گا، ہندستان کو اس سے یہ فائدہ ہو کہ اب وہ اپنے ہاں کی صنعت کو ترقی دینے کے لئے امریکہ سے جتنا بھاری مال اور مشین چاہے منگوا سکتا ہو۔ برطانیہ پر جن اسٹرلنگ والے ملکوں کا قرض آتا ہو انھیں اس معاہدے کی رو سے قرضے کا ایک حصہ فوری طور پر ادا کر دیا جائے گا۔ لیکن کتنی رقم دی جائے گی اس کا ابھی تعین نہیں کیا گیا ہو۔ اس رقم کو فوری طور پر ڈالر کی شکل میں بھی تبدیل کیا جا سکے گا۔ قرضوں کا بقیہ حصہ حقدار ملکوں کو (جن میں ہندستان بھی شامل ہو) آئندہ چھ سالوں میں دیا جائیگا جبکہ برطانیہ کو بھی امریکہ سے موجودہ معاہدے کے تحت قرضے کی رقم ملنے لگے گی۔

یہ بھی خیال جاتا ہو کہ برطانیہ پر نوآبادیات اور محکوم ملکوں کے جو قرضے آتے ہیں ان کا کچھ نہ کچھ حصہ برطانیہ کو معاف کر دیا جائے گا۔ اسی میں ہندستان بھی شامل ہو، اس پر ہندستان کے طول و عرض میں مخالفت اور غم و غصے کا اظہار کیا جا رہا ہو۔

معاہدے کے وجود میں آنے کے بعد امریکہ کے شعبہ ریاست (STATE DEPARTMENT) کی طرف سے ایک اعلان شائع ہوا ہے جس میں اس معاہدے کے خوشگوار نتائج کی تشریح کی گئی ہے اور ساتھ ہی اس بات کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے کہ ۱۹۴۶ء کی گرمیوں میں بے کاری اور تجارت کے مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس طلب کی جائے۔

اب ضرورت ہے کہ اس معاہدے کے نتائج پر ہندستان کے نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے۔

مسرآر کے شنموکھم چیٹی صدر بمبئی ٹارف بورڈ کا خیال ہے کہ اگر برطانیہ اور امریکہ کے درمیان یہ معاہدہ نہ ہوتا تو دنیا پھر چند سال پہلے کی طرح بدحالیوں میں مبتلا ہو جاتی۔ اور برطانیہ اور امریکہ کے درمیان معاشی جنگ کا سلسلہ چھڑ جاتا۔ اس وقت ان دو بڑی طاقتوں میں دنیا کے بازاروں پر قبضہ کرنے کے لئے سخت مقابلہ جاری ہے، اس معاہدے سے یہ فائدہ ہوا کہ اس معاملے پر ان کے درمیان ایک قسم کا سمجھوتا سا ہو گیا، ہندستان بھی ایک بڑا تجارتی اور صنعتی ملک ہے اس لیے اس کو بھی اس معاہدے اور اس کے نتائج سے دلچسپی ہونا لازمی ہے، اگر یہ معاہدہ نہ ہوتا تو امریکہ کے خلاف معاشی جنگ میں برطانیہ ہندستان کو بھی زبردستی ساتھ لانے کی کوشش کرتی۔ کینیڈا اور آسٹریلیا تو نیم آزاد اور طاقت ور ہیں اس لیے وہ برطانیہ کی اس کوشش کو رد بھی کر سکتے تھے لیکن ہندستان ایسی حالت میں بالکل بے بس ہوتا ہے۔

بہر حال اس معاہدے سے اب برطانیہ اور امریکہ کے درمیان معاشی جنگ کا کوئی امکان نہیں اگرچہ مقابلہ اب بھی جاری رہے گا اس لیے ہندستان کے سر سے یہ خطرہ جاتا رہا۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اس وقت برطانیہ ہندستان کے سولہ ارب روپیوں کی مقروض ہے اگر یہ معاہدہ وجود میں نہ آتا تو اس رقم کے واپس ملنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

لیکن اس میں کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو ہندستان کے لیے زیادہ اطمینان بخش نہیں، سر بدری سنگھ گوئنکا ہندستانی انوانہائے تجارت کے وفاق کے صدر نے اس بارے میں کہا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانیہ پر ہندستان کا جو قرضہ آتا ہے اس کا ایک بڑا حصہ ڈالر اور دیگر سکوں کی شکل میں ادا ہو جائے گا لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس کی پہلی باقاعدہ قسط معاہدے کے عمل میں آجانے کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۵۱ء میں ملے گی۔ سوائے اس تھوڑی سی رقم کے جو فوری طور پر ہندستان کو دی جانے والی ہے چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ بفرض اگر رقم اتنی کافی ہو کہ اس سے ہندستان کی آئندہ پانچ سال

...میں پوری ہو سکیں اور ملک میں صنعت اور حرفت کو ترقی دینے کا جو پروگرام ہے اسے عمل میں لایا جا سکے۔

برطانیہ اور امریکہ کی طرف سے اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ ہندوستان اپنے قرض کا کچھ حصہ معاف کر دے۔ گذشتہ دسمبر میں ہندوستانی ایوانہائے تجارت بمبئی نے اس کے خلاف ایک تجویز پاس کی جس میں اس مطالبے کو غیر واجب قرار دیا گیا ہے۔ برطانیہ پر ہندوستان کا جو قرضہ آتا ہے اس کا یہاں کے سکے سے گہرا تعلق ہے۔ اسی رقم کی ادائگی کے وعدوں پر برطانیہ نے ہندوستان میں نئے نوٹ جاری کیے۔ اگر اس رقم کا تھوڑا سا حصہ بھی روک لیا گیا تو ہندوستان کے سکے پر لوگوں کا اعتماد نہیں رہے گا اور ان نوٹوں کی حیثیت کاغذی ہو کر رہ جائے گی۔

یہ کہنا بھی سراسر خلاف حقیقت ہے کہ ہندوستان نے جنگ کے اخراجات میں زیادہ حصہ نہیں لیا ہے اس لئے اگر وہ قرض کی تھوڑی سی رقم سے دستبردار ہو جائے تو کوئی ہرج کی بات نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہندوستان نے اپنی طاقت سے کہیں زیادہ جنگ کے اخراجات برداشت کیے۔ یہاں تک کہ قحط بنگال میں پینتیس لاکھ انسانی جانوں کی قربانی کی۔

یہ کہنے سے بھی کام نہیں چلتا کہ برطانیہ جنگ کے بعد اتنی زیادہ غریب ہو گئی ہے کہ اپنی خواہش کے باوجود اپنا قرض ادا کرنے سے معذور ہے اس وقت کو حل کرنے کی ایک آسان صورت یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سرمایہ داروں اور تاجروں کے جو کئی ارب روپیوں کے سامان بطور سرمایہ کے لگے ہوئے ہیں انہیں حکومت برطانیہ ہندوستانیوں کے ہاتھ بیچ دے اور ان کی قیمت ان کے مالکوں کو اپنے ہاں کے نوٹوں کی شکل میں ادا کر دے۔

اسی قرض کے معاملے کو طے کرنے کے لیے سر آرچی بالڈ راولینڈز، ممبر مالیات حکومت ہند، سرکاری افسروں کا ایک وفد انگلستان بھیج رہے ہیں، اس وفد میں وہ کچھ غیر سرکاری ماہرین کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس کام کو بہتر طور پر عوام کی نمائندہ حکومت ہی انجام دے سکتی تھی لیکن حکومت کہتی ہے کہ ملک کے موجودہ سیاسی حالات کے تحت اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔

یہ وفد روانگی سے پہلے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرے گا کہ ہندوستان کو آئندہ ہر سال غیر ملکوں سے کتنا مال و اسباب اور خدمات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اسی اندازے کے مطابق برطانیہ سے قرض کے کچھ حصے کی ادائگی کا مطالبہ کیا جائے گا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ عام اندازے کے برخلاف ہندوستان میں ابھی بھاری مال (CAPITAL GOODS) مثلاً کارخانوں

کے لئے مشینوں وغیرہ کی زیادہ کھپت نہیں ہو، چنانچہ یہ وفد یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ کہ جنگ سے پہلے یہاں دوسرے ملکوں سے کتنی قیمت کا بھاری مال آتا تھا، پھر صنعت اور کاروبار کو ملک میں ترقی دینے کے لیئے اندازاً کتنی رقم کا مزید بھاری مال خریدنے کی ضرورت ہوگی۔ عام اندازہ ہو کہ آئندہ سال دو سال کے اندر ہندستان کو کوئی دو ارب پچاس کروڑ روپئے کا بھاری مال غیر ملکوں سے خریدنا ہوگا۔

---

۲ برٹین ووڈس کا راضی نامہ اور ہندستان

اس مسئلے کا تعلق ایک اور سوال سے ہو اور وہ یہ ہو کہ ہندستان کا برٹین ووڈس کے راضی نامے پر دستخط کرنا قومی مفاد کے نکتہ نظر سے غلط تھا یا صحیح۔ لیکن اس سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہو کہ یہ برٹین ووڈس کا راضی نامہ ہو کیا۔ جولائی ۱۹۴۴ء میں دنیا کے چوالیس ملکوں کے نمایندے جن میں ایک ہندستانی بھی تھا، امریکہ میں برٹین ووڈس کے مقام پر جمع ہوئے اور یہ طے کیا کہ ایک بین الاقوامی فنڈ اور ایک بین الاقوامی بینک قائم کیے جائیں جن میں حسب ترتیب ۸۴ کروڑ پونڈ اور ۸۰ کروڑ پچاس لاکھ پونڈ جمع کیئے جائیں۔ مقصد یہ قرار دیا گیا کہ اس رقم سے دنیا کی تجارت کو جو جنگ کے دوران میں تباہ و برباد ہوگئی ہو پھر سے اچھی حالت پر لایا جائے۔ اور ان قوموں کی امداد و اعانت کی جائے جو جنگ کے اثرات سے معاشی بدحالیوں میں گرفتار ہیں یہ بھی طے پایا کہ اس بین الاقوامی بینک کا جتنا کاروبار ہوگا وہ سب ڈالر (امریکی سکہ) اور سونے سے ہوگا، نوٹ یا کسی اور سکے کو رواج نہیں دیا جائیگا۔ یہ بھی طے پایا کہ اگر کوئی حکومت مخصوص حالات کے تحت اور تجارتی مفاد کے پیش نظر اپنے سکّے کی قیمت گھٹانا چاہتی ہو تو دس فیصدی کی حد تک اسے بین الاقوامی فنڈ سے اجازت لینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اگر کسی ملک کے اندرونی اور خارجی حالات نے مزید تخفیف کرنے پر مجبور کردیا تو اسے بین الاقوامی فنڈ سے رائے مشورہ لینے کے بعد ہی ایسا کرنا پڑیگا۔ اس راضی نامے کی رو سے ڈالر (امریکی سکّہ) اور اسٹرلنگ (برطانوی کاغذی سکہ) کے درمیان شرح تبادلہ یہ رکھی گئی ہو ایک اسٹرلنگ = ۴٫۰۳ ڈالر کے۔ یہ راضی نامہ اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتا جب تک اس کی جینہ رقم کا ۶۵ فی صد حصہ جمع نہ ہوجائے اور اس رقم کے دینے والے ملک اس پر دستخط نہ کریں۔

جب برطانوی پارلیمنٹ میں گذشتہ دسمبر میں راضی نامہ پاس ہوگیا تو ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے حکومت ہند سے درخواست کی کہ اگر ہندستان براہ راست طور پر اور برطانیہ کے توسط کے بغیر بین الاقوامی فنڈ کا ممبر بننا چاہتا ہو تو

اسے چاہیے کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۵ء تک اس راضی نامے پر دستخط کر دے۔

قومی مفاد کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ نئی مرکزی اسمبلی سے اس بارے میں رائے مشورہ لے لیا جاتا لیکن ۳۱ دسمبر کی قید کچھ ایسی تھی کہ ایسا کرنا غیر ممکن تھا۔ اس لیے ممبر مالیات نے یہ فیصلہ کیا کہ اس بارے میں کم سے کم ہندستان کی خاص خاص تجارتی انجمنوں ہی سے مشورہ لے لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ۲۴ دسمبر ۱۹۴۵ء کو حکومت ہند نے برٹین وو ڈس کے راضی نامے پر دستخط کرنے کا اعلان کر دیا۔

اب اس سلسلے میں ہندستان کے قومی نقطۂ نظر سے کچھ قابل اعتراض باتیں پیدا ہوتی ہیں جن کا تذکرہ کر دینا ضروری ہے (۱) ایک تو یہ کہ چونکہ ہندستان کو اس راضی نامے کے تحت ایک ارب تیس کروڑ روپئے جیسی بڑی رقم بین الاقوامی بینک کو چندہ کے طور پر دینا ہے اس لیے یہ ضروری تھا کہ مرکزی اسمبلی کے قومی نمائندوں سے مشورہ لے لیا جاتا۔ (۲) برطانوی پارلیمنٹ میں راضی نامے کے پاس ہونے کے فوراً ہی بعد امریکہ نے ہندستان سے دستخط کا مطالبہ کر دیا اور ساتھ ہی تاریخ بھی مقرر کر دی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ امریکہ نے گویا پہلے سے فرض کر رکھا تھا۔ کہ ہندستان کے لیے برطانیہ کے نقش قدم پر چلنا لازمی ہے، اس لیے جب برطانیہ نے راضی نامہ قبول کر لیا تو ہندوستان کے قومی نمائندوں سے مشورہ کرنا ضروری نہیں (۳) حکومت ہند کو یہ خوف دامنگیر تھا کہ مرکزی اسمبلی کے نئے نمائندے اس راضی نامے کے ان پہلوؤں پر اعتراضات کی بوچھار نہ کر دیں جو ہندستان کے قومی مفاد کے پیش نظر قابل اعتراض ہیں۔ چنانچہ حکومت نے مناسب سمجھا کہ جتنا جلد ممکن ہو سکے مرکزی اسمبلی کی نشست سے پہلے ہی ہندستان سے دستخط حاصل کر لیے جائیں۔ (۴) ایک ارب تیس کروڑ روپئے چندہ ہندستان کی ناگفتہ بہ معاشی حالت کے پیش نظر قطعی غیر مناسب ہے اس رقم کے تعین میں ہندستان کی سالانہ آمدنی کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا ہے (۵) ہندستان چندے کی یہ رقم اس وقت تک ادا کر رہا ہے۔ ضرور ہے جب تک برطانیہ مستقبل قریب میں ہندستان کا پورا قرض ادا نہ کر دے (۶) جیساکہ بین الاقوامی بینک نے اعلان کیا ہے، بین الاقوامی چندے کی رقم دنیا کی صنعت اور کاروبار میں ایک نئی روح پھونکنے کے لیے صرف کی جائے گی لیکن ہندستاں چونکہ مخصوص طور پر زراعتی ملک ہے اس لیے اسے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کا موقع نہیں ہے تو پھر اس پر اتنا بڑا چندہ کیوں عائد کر دیا گیا ہے؟ (۷) اس چندے کی رقم سے بینک جو کام شروع کرے گا اس میں اگر ناکامی ہوئی تو دوسرے ملکوں کے ساتھ ہندستان کو بھی بھاری خسارہ برداشت کرنا پڑے گا۔ امریکہ اور برطانیہ جیسے دولت مند ملکوں کے لیے یہ چیز چنداں بار نہ ثابت ہوگی لیکن ہندستان کے لیے تو یہ حادثہ موت کے برابر ہوگا۔

بہرحال خیریت یہ ہو کہ اس راضی نامے میں اس بات کا التزام کردیا گیا ہو کہ ہندستان جب چاہے بغیر کسی اطلاع کے بین الاقوامی فنڈ اور بنک سے علیحدگی اختیار کرسکتا ہو۔ اب دیکھنا یہ ہو کہ مرکزی اسمبلی کے نئے قومی نمائندے آئندہ کیا فیصلہ کرتے ہیں ؂

ہندستان کے چھوٹے سکوں میں تبدیلی

۱۹۴۲ء میں چھوٹے سکوں کی مانگ بہت بڑھ گئی جنگ کی وجہ سے نکل اور رانگے کی کمی واقع ہوئی اور ساتھ ہی لوگوں نے بڑی تعداد میں چھوٹے سکوں کے ذخیرے جمع کرنے شروع کیے۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت نے نئی قسم کی دوّنیاں، اکنیاں اور پیسے جاری کیے لیکن اب یہ محسوس کیا جارہا ہو کہ سوراخ والے پیسے زیادہ کامیاب نہیں ثابت ہوئے، ساتھ ہی دونیاں اکنیاں اور ادھنے جو جنگ کی وجہ سے نکل اور پیتل کی ملاوٹ سے بننے لگے تھے غیر مقبول ہورہے ہیں چنانچہ حکومت ہند اب یہ سوچ رہی ہو کہ یہ چھوٹے سکے جنگ سے پہلے کی طرح نکل اور تانبے کی ملاوٹ سے ڈھالے جائیں اور ایک نئے طرز کا پیسہ جاری کیا جائے۔

حکومت ہند کی ایک اور اسکیم یہ ہو کہ اب دوّنیوں، اکنیوں، ادھنوں، پیسوں، اَدھیوں اور پائیوں کو اٹھا دیا جائے اور امریکہ کی طرح سینٹ کے سکے کو رواج دیا جائے۔ سینٹ ایک چھوٹا سکہ ہوتا ہو جو امریکہ میں رائج ہو۔ سو سینٹوں کا ایک ڈالر ہوتا ہو اور ڈالر کی قیمت کوئی تین روپیوں کے برابر ہوتی ہو، اس حساب سے ایک امریکی سینٹ کی قیمت کوئی ۱٫۹۲ پیسوں یا ۵٫۷۶ پائیوں کے برابر ہوتی ہو گویا امریکی سینٹ کی قیمت ہندستانی پیسے سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہو اب دیکھنا یہ ہو کہ ہندستان میں جو سینٹ جاری ہوگا اس کی قیمت یہاں کے پیسے سے زیادہ ہوگی یا کم۔

موجودہ طریقہ جو رائج ہو اس کے مطابق روپیہ کو ۱۹۲ پائیوں میں تقسیم کیا گیا ہو لیکن نئے طریقے کی رو سے روپیہ کو سو عدد سینٹوں میں تقسیم کیا جائے گا یعنی سو سینٹوں کا ایک روپیہ ہوگا۔ اسی بنیاد پر تین نئے سکے ڈھالے جائینگے، ایک کی قیمت دس سینٹوں کے برابر ہوگی، دوسرے کی پانچ اور تیسرے کی دو سینٹوں کے برابر لیکن نئی اسکیم کے تحت اٹھنّیاں اور چونّیاں برقرار رکھی جائینگی ہندستانی سکہ جات میں ردوبدل کرنے کے لیے اس وقت ایک بل تیار کیا جارہا ہو جو مرکزی اسمبلی میں بحث مباحثے کے لیے پیش ہوگا، اس بل سے ہندستان کے پرانے "قانون سکہ جات" میں ترمیم کی جائے گی۔

تبصرہ

ہندستان کی آبادی | سلسلۂ مطبوعات ادارہ معاشیات نمبر(۲) مصنفہ ڈاکٹر انور اقبال قریشی حجم تین سو صفحات، لکھائی چھپائی غنیمت قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ فاطمہ منزل حمایت نگر حیدرآباد دکن۔

آبادی کے مسئلے پر جو کتابیں موجود ہیں اُن میں زیادہ تر موجودہ زمانے کے مسائل سے بحث کی گئی ہے اور ان کے عملی پہلوؤں پر غور کیا گیا ہے۔ زیر نظر تصنیف نہ صرف اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں موجودہ مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے بلکہ مسئلہ آبادی سے متعلق مختلف نظریوں اور تاریخی پہلوؤں سے بھی روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً عہد قدیم کے یونان سے لے کر "زمانہ جدید" تک کے آبادی سے متعلق اہم نظریئے پیش کئے گئے ہیں۔ مالتھس پہلا شخص ہے جس نے مسئلہ آبادی کی معاشی بنیادوں کو اجاگر کیا، زیر نظر تصنیف میں اس کے نظریوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے ہندستان کے مسائل آبادی سے بھی بحث کی ہے۔ کتاب کے اس حصے میں اعداد و شمار اور حقائق و واقعات کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پیدائش پر اگر کنٹرول رکھا جائے تو ملک کی معاشی بدحالی کو بہت حد تک دور کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ منصوبہ بندیوں سے جو کچھ فائدہ پہنچنے والا ہے وہ بے اثر ثابت ہوگا، دوسرا نظریہ یہ ہے کہ دراصل ملک کی غربت کا سبب کثرت آبادی نہیں ہے بلکہ معاشی نظام کی خرابی کثرت آبادی اس وقت سبب قرار دی جاسکتی تھی، جب آبادی کے بڑھنے یا گھٹنے سے فی کس آمدنی کے بھی بڑھنے یا گھٹنے کا امکان ہوتا۔ لیکن ہندستان میں ایسا نہیں ہے یہاں تو بڑے پیمانے پر صنعتی ترقی کا عمل شروع ہوگا۔ تو اس وقت سوال یہ پیدا ہوگا کہ اتنے کام کرنیوالے کہاں سے لائے جائیں چنانچہ یہاں پیدائش پر کسی خاص کنٹرول کی ضرورت نہیں ہے۔ زیر نظر تصنیف میں اول الذکر نظریے کی حمایت کی گئی ہے۔

بحیثیت مجموعی زبان اور طرز ادا آسان ہے۔ امید ہے کہ عام لکھے پڑھے لوگوں میں جنھیں ملک کے معاشی مسائل سے دلچسپی ہے یہ کتاب مقبول ہوگی۔

"ادارہ"

معاشیات

جلد ۱ فروری سنہ ۱۹۴۶ء نمبر ۲

فہرست مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱۔	صنعتی صورتِ حال	ادارہ	۲
۲۔	ہندستان میں زرعی پیداوار کی خرید و فروخت	سید احمد حسین بی کام، پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)	۵
۳۔	آزاد مقابلے کو جوہری بم کے ساتھ دفن کردو	نقاد	۱۱
۴۔	سرمایہ داری	افتخار احمد مختار ایم۔ اے (علیگ)	۱۸
۵۔	معاشی منصوبہ بندی اور تخلیق شدہ زر	امتیاز حسین خاں بی کام، آنرز (لندن)	۲۷
۶۔	صنعت اور کاروبار پر حکومت کی نگرانی	معاشی	۳۵
۷۔	معاشی صورتِ حال	ادارہ	۴۱
	تبصرہ	ادارہ	۴۷
	'معاشیات' کے قلمی و دیگر معاونین	ادارہ	۴۷

اداریہ

صنعتی صورتِ حال

از : ———— ایڈیٹر

ملک کے گوشے گوشے سے آواز بلند ہو رہی ہو کہ ہندستان کے لیے صنعتی ترقّی کا یہی موقع ہو۔ جہاں تک بین الاقوامی فضا کا تعلق ہو وہ کافی سازگار ہو۔ جرمنی اور جاپان کی شکست سے صنعتی دنیا میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہو۔ جاپان کی شکست ایشیا کے لیے مخصوص طور پر اہم ہو اور دراصل اسی چیز نے ہندستانی صنعت کے لیے ترقی کے زبردست مواقع فراہم کر دیے ہیں۔ چین باوجود ایک فاتح ملک ہونے کے اندرونی کش مکش اور خلفشار میں مبتلا ہو۔ باقی رہ گیا ہندستان۔ اس جنگ میں ہندستانی صنعت کو، چاہے وہ ابھی سرمایہ داروں ہی کے ہاتھ میں کیوں نہ ہو، کچھ نہ کچھ ضرور شہ مل گئی ہو۔ اس محض برائے نام ترقّی ہی نے ہندستان کے لوگوں پر زبردست صنعتی عروج کے امکانات واضح کر دیے ہیں لیکن جب بین الاقوامی فضا کے دوسرے رُخ پر نظر پڑتی ہو تو مایوسی کا احساس ہونا لازمی ہو اور وہ ہو برطانیہ اور امریکہ کی نظرِ بد۔ دونوں سامراجی طاقتیں ہندستان کے وسیع و عریض بازاروں پر تاک لگائے بیٹھی ہیں ظاہر ہو کہ اگر ہندستان جنگ سے پہلے کی طرح بدستور دوسرے ملکوں کو خام مال دیتا رہا اور اُن کے صنعتی مال خریدتا رہا تو یہاں کی صنعتی ترقّی کا خدا ہی حافظ ہو۔ اس بین اقوامی خطرے کو دور کرنے کا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں کہ ہندستان آزاد ہو جائے لیکن ہندستان کی آزادی ایک ایسا خواب ہو جو کانگریس لیگ اتحاد کے بغیر کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ اس وقت امریکہ اور برطانیہ دونوں ہندستان کے وسیع و عریض بازاروں کو اپنے صنعتی مال سے بھر دینا چاہتے

ہیں۔ برطانیہ اگر چاہتی تو ہندستان کو جنگ سے پہلے کی طرح صرف اپنے لیے مخصوص رکھتی لیکن اس وقت وہ امریکہ کی ہر لحاظ سے دست نگر ہے۔ گزشتہ دسمبر میں ان دو ملکوں کے درمیان جو مالی معاہدہ ہوا ہے اس کی رو سے برطانیہ مجبور ہو گئی ہے کہ اپنے حدودِ سلطنت کے دروازے امریکی مال کے لیے کھول دے۔ اسی کو لوئی فشر نے کہا ہے کہ امریکہ نے سونے کے پچر سے سلطنتِ برطانیہ کے بند دروازے توڑ ڈالے ہیں۔ اب چوں کہ اسٹرلنگ قرضہ ڈالر کی شکل میں آزادی کے ساتھ ادا ہو سکتا ہے اس لیے ہندستانی صنعت کو بھی ترقی کا ایک موقع ہاتھ آگیا ہے۔ ہندستان اس رقم سے امریکہ سے بھاری مال اور مشین خرید سکتا ہے جو صنعتوں کے اجرا کے لیے بنیادی طور پر ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اب بھی بے شمار رکاوٹیں حائل ہیں۔ مثلاً برطانیہ اس قرضے کا کچھ حصہ حذف کرلینے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ رقم باقاعدہ طور پر ۱۹۵۱ء سے ملے گی۔ اور وہ بھی قسطوں میں۔ جو رقم فوری طور پر ملنے والی ہے۔ اس کا تعین ابھی تک نہیں ہو سکا ہے ممکن ہے وہ اتنی کم ہو کہ ہندستان کی آیندہ پانچ سالوں کی صنعتی ضرورتیں نہ پوری ہو سکیں۔ پھر سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ممکن ہے امریکہ اور برطانیہ ہندستان کی صنعتی ترقی سے خوف کھا کر کلیں اور مشینیں کافی تعداد یا مقدار میں نہ سپلائی کریں۔ پھر صنعتی دوڑ میں امریکہ اور برطانیہ کا مقابلہ کرنا اور وہ بھی سیاسی محکومی کی حالت میں ہندستان کے لیے جس قدر مشکل ہے وہ واضح ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ مستقبل قریب میں ہندستان کے بازار امریکی اور برطانوی براہِ راست استعمال کے مال و اسباب (CONSUMER GOODS) سے اس قدر بھر جائیں کہ ہندستانی صنعت کی سانسیں گھٹ کر رہ جائیں۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے ملک کی آزادی کے علاوہ اور کوئی راستہ ہے؟ کیا سیاسی خودمختاری کے بغیر ہم امریکی اور برطانوی مال کے سیلاب کو ہندستان کی بندرگاہوں میں داخل ہونے سے روک سکتے ہیں؟

اس وقت ہندستان میں صنعتی ترقی کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وافر مقدار میں کلیں اور مشینیں کسی طرح جلد سے جلد حاصل کرلی جائیں۔ پہلی عالمگیر جنگ کے موقع پر بھی کلوں اور مشینوں کی ہی قلت سے ہندستان کی صنعتی ترقی خاطرخواہ طور پر نہ ہو سکی اور آج بھی وہی مسئلہ سنگِ گراں بن کر حائل ہے۔ گزشتہ دسمبر کے آخری ہفتے میں ہندستان کے مالکانِ صنعت کی انجمن کا چھٹا سالانہ جلسہ مدراس میں منعقد ہوا جس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے سر ویسی درایا نے من جملہ اور باتوں کے اس بات پر بھی زور دیا کہ اس وقت ضرورت ہے کہ فوری طور پر ہر صوبے میں کم سے کم دو بھاری صنعتیں کھول دی جائیں مثلاً جہاز سازی، مشین سازی، برقی مشین سازی، موٹر سازی، ہوائی جہاز سازی، انجن سازی وغیرہ۔ صاحب موصوف کے اندازے کے مطابق ہر صوبے میں اس قسم کی کوئی دو صنعتیں جاری کرنے میں ساڑھے تین کروڑ اور پانچ کروڑ کے درمیان صرفہ ہوگا اور ہر جو بیس صنعتوں کا مجموعی صرفہ سو کروڑ یعنی ایک ارب روپیہ ہوگا۔

ہندستان میں مشینوں اور کلوں کے ڈھالنے کی صنعتوں کی اہمیت اب اچھی طرح محسوس کی جا رہی ہے۔ چناں چہ اس وقت پارچہ بافی (TEXTILE) کی مشین ڈھالنے والی صنعت کے قیام کی جو کوشش کی جا رہی ہے وہ اسی شدید ضرورت اور احساس کا نتیجہ ہے۔ دسمبر میں یہ خبر آئی کہ حکومت ہند کے (سابق) پلاننگ ممبر سر اردیشر دلال بل کے بعض مالکوں سے اس سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ امید افزا خبر موصول ہوئی کہ پارچہ بافی کی صنعت کے ذمے دار لوگ اس بات پر رضامند ہو گئے ہیں کہ ملک میں پارچہ بافی کی مشینیں ڈھالنے کا کام سنبھالنے کے لیے ایک انجمن امداد باہمی "قائم کی جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ حکومتِ ہند بھی اس صنعت کو مدد پہنچانا چاہتی ہے (چاہے خالی باتوں ہی سے سہی)۔ دراصل دیکھا جائے تو ہندستان میں اس صنعت کی ابتدا ۱۹۴۳ء میں ہی ہو چکی تھی۔ اسی سال پارچہ بافی کی مشین سے متعلق ایک کارپوریشن (TEXTILE MACHINERY CORPORATION)

قائم ہوا اس مقصد سے کہ پارچہ بافی کے لیے ہر قسم کی مشین ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ دورانِ جنگ میں اس کے کام میں یوں رکاوٹ پیدا ہوگئی کہ اس کی فیکٹری واقع بلگھریا (چوبیس پرگنہ بنگال) فوجی ضروریات کے لیے استعمال کی جانے لگی۔ اس کارپوریشن کے تحت ایک اور فیکٹری ٹیکسمیکو لمیٹڈ (TAX MACOLTD) قائم کی گئی تھی جس نے کافی اچھا کام کیا۔

جہاں تک غیر ممالک سے مشینیں اور کلیں خریدنے کا سوال ہے گزشتہ امریکی برطانوی معاہدے سے یہ بات ممکن ہوگئی ہے گر اس سلسلے میں جو زبردست رکاوٹیں حائل ہیں ان کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ خاص کر جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ وہ ہندستان میں مشینوں اور کلوں کی بہ جائے بہ راہ راست استعمال کی اشیا (CONSUMER: GOODS) بھیجنے کی کوشش کر رہی ہے۔ نومبر ۱۹۴۵ء میں مسٹر جی۔ ڈی۔ برلا صنعتی مالکوں کے نمایندے کی حیثیت سے بین اقوامی مزدور کانفرنس (منعقدہ پیرس) میں شرکت کی غرض سے گئے تھے۔ انھوں نے وہاں سے واپس آ کر بتایا کہ انگلستان میں اس وقت ہندستان کو مشینیں اور بھاری مال کی بہ جائے استعمال کی اشیا بھیجنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں مثلاً سوتی کپڑے، بجلی کی چیزیں، سائکلیں، شیشے کی بنی ہوئی چیزیں، چینی کے برتن وغیرہ ۱۹۴۶ء میں انگلستان سے کوئی پانچ لاکھ سائکلیں ہندستان آ رہی ہیں۔ یہ تعداد جنگ سے پہلے کی تعداد سے تین گنی ہے۔ انگلستان کا یہ رویہ ہندستانی صنعت کے حق میں بے حد خطرناک ہے۔ خاص کر ان صنعتوں کے لیے جو حال ہی میں قائم ہوئی ہیں مثال کے طور پر سائکل سازی کی صنعت۔

جہاں تک محض دکھاوے کا تعلق ہے حکومت ہند اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کر رہی ہے۔ اس وقت ایک ہندستان سپلائی وفد واشنگٹن میں موجود ہے اور مسٹر سی۔ ڈبلیو کیسے (MR C W.CASSE) کو انجنیری مشورہ کار بنا کر بھیجا گیا ہے جو ہندستان کی صوبائی حکومتوں اور مالکانِ صنعت کو امریکہ کی فالتو مشینوں کے متعلق اطلاعات مہیا کریں گے۔ امریکہ سے حکومتِ ہند کے پاس فالتو بھاری بھاری مشینوں اور ان کے متعلقات (PLANTS) اور کلوں کی فہرستیں آئی ہیں جنھیں امریکہ فروخت کرنا چاہتا ہے۔ کچھ دن پہلے یہ معلوم ہوا تھا کہ حکومت ہند یہ فہرستیں صوبوں میں اور ہندستان کے مالکانِ صنعت میں گشت کرانا چاہتی ہے تاکہ وہ اپنی اپنی ضروریات کے مطابق مشینوں کے لئے آڈر دیں، مسٹر کیسے اسی مقصد سے کنیڈا بھی جائیں گے۔

حکومتِ ہند نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ عارضی طور پر آلات اور سامانِ جنگ پیدا کرنے والی فیکٹریوں سے اب شہری ضروریات کی چیزیں پیدا کرائی جائیں اس سے مشینوں کی قلت کا مسئلہ ایک حد تک حل ہو سکتا ہے۔ بہر حال ہی میں حکومت ہند اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان ہندستان میں پڑے ہوئے فالتو امریکی مال کے متعلق جو راضی نامہ ہوا ہے اس سے بھی ہندستان کو کچھ کلیں اور مشینیں مل جائیں گی۔

ہندستانی وفاق ایوان ہائے تجارت (INDIAN FEDERATION OF CHAMBERS OF COMERCE) کی کمیٹی میں جس کی نشست گزشتہ دسمبر میں کلکتہ میں ہوئی تھی اس بات پر زور دیا گیا کہ ہندستان کی جو رقم برطانیہ پر عائد ہوتی ہے اسے اب برطانیہ اسٹرلنگ کی شکل میں نہ ادا کرے بلکہ بھاری مال اور مشینوں کی شکل میں، اس لیے کہ اس سے ہندستان کی ایک اہم ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اسٹرلنگ قرضے کی ادائگی کے سلسلے میں بھی ہندستانی ایوان ہائے تجارت اور مالکانِ صنعت کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ برطانیہ اور انگریزوں کی جو ملیں اور کارخانے اس وقت ہندستان میں موجود ہیں انھیں ہندستانی مالکانِ صنعت کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے اور حکومت برطانیہ ان کی قیمت اسٹرلنگ کی شکل میں ان صنعتوں کے انگریز مالکوں کو ادا کر دے اس طرح برطانیہ کے سر سے بھی ایک بوجھ اتر جائے گا اور ہندستان کی بنیادی صنعتی ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔ جرمنی سے تاوان کی شکل میں ہندستان کو جو صنعتی بھاری مال ملنے والا ہے اس سے بڑی حد تک اس مشکل مسئلے کے حل ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

ہندستان میں زرعی پیداوار کی خرید وفروخت

از : ——————— سید احمد حسین بی کام، پی۔ایچ، ڈی (لندن)

ہندستان کی زراعتی صورتِ حال کے خراب ہونے کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ یہاں کے کاشت کار مفلس، ان پڑھ، تنگ نظر اور عام طور سے فضول خرچ ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف یہاں غلّہ پیدا کرنے کے طریقوں میں بلکہ زراعتی اشیا کی خرید وفروخت میں بھی کوئی ضبط ونظام نہیں ہے۔ اگر یہاں کاشت کاری اچھے اُصولوں پر چلائی بھی گئی تو کاشت کار کو اُس وقت تک پُورے طور سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا جب تک غلّے کو زیادہ منافع انگیز صورت سے فروخت کرنے کا انتظام نہ کیا جائے۔ غیر مُلکوں سے تجارت کے سلسلے میں ہندستان کی زرعی پیداوار کی بڑی اہمیت ہے لیکن اس اہمیت کے لحاظ سے ہندستان میں کافی لوگ زرعی پیداوار کی تجارت میں دلچسپی نہیں لیتے۔ اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ ہندستان میں بڑے پیمانے پر کھیتی نہیں ہوتی، قابلِ کاشت زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹتی ہوئی ہے۔ کاشت کار صرف اپنی نجی ضرورت کے لیے پیدا کرتا ہے اور اگر کچھ فاضل بچتا ہے تو مقامی بازار میں جاکر بیچ آتا ہے۔

چھوٹے پیمانے کی کھیتی میں یہ خرابی ہے کہ کاشت کار کے اندر محنت ومشقت کرنے کا جذبہ نہیں اُبھرتا اور نہ وہ ضرورت سے فاضل غلّے کو زیادہ داموں پر فروخت کرسکتا ہے۔ بیچنے کے لیے اُس کے پاس جو غلّہ بچ رہتا ہے اُس کی مقدار بھی تھوڑی ہوتی ہے، اس لیے اگر اچھے دام ملنے کا یقین بھی ہو تو وہ دُور دراز مقام پر غلّہ لے جاکر فروخت کرنا نہیں چاہتا۔ ایک اوسط درجے کا کسان

جو غلہ پیدا کرتا ہے وہ کچھ اعلا قسم کا بھی نہیں ہوتا جس سے اُس کے فاضل غلّے کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ ہندستان کے زیادہ تر کاشت کار اپنی زرعی پیداوار یا تو گاؤں ہی میں فروخت کر دیتے ہیں یا نزدیک کے چھوٹے چھوٹے بازاروں میں۔ نقل و حمل کی بھی بہت سی دِقّتیں حائل ہیں جن کی وجہ سے غلّہ خرید و فروخت کے لیے دُور دراز مقامات پر نہیں لے جا سکتے۔ ہندستان کے دیہی علاقے ابھی تک شہروں، بڑی بڑی منڈیوں اور تجارتی مرکزوں سے دُور ہیں اِس لیے کہ نہ تو سڑکیں اچھی ہیں اور نہ ریل کی لائنیں وہاں تک پہنچتی ہیں۔ ایک اور عجیب دقت یہ ہے کہ اگر کاشت کار کبھی اتّفاق سے اپنا غلّہ فروخت کرنے کے لیے بڑی بڑی منڈیوں میں جہاں تھوک مال بِکتے ہیں، پہنچ بھی جاتا ہے تو وہاں کے طریقوں سے ناواقفیت کی بنا پر گھبرا جاتا ہے۔ وہ دلّالوں کے چُنگل میں پھنس جاتا ہے اور یہ دلّال اکثر خریداروں ہی کے موافق معاملہ طے کرتے ہیں۔ ہندستان میں وزن کرنے اور ناپنے جوکھنے کا بھی کوئی ایک طریقہ رائج نہیں ہے، بلکہ ہر علاقے کے مخصوص تجارتی حالات اور روایات کے مطابق وزن کرنے کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ ایک ہی ریاست اور صوبے کے مختلف ضلعوں میں مختلف طریقے رائج ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی مقام پر مختلف چیزوں کے تولنے کے طریقے بدل جاتے ہیں مثلاً اگرچہ پُورے مُلک میں من کو وزن کا ایک خاص پیمانہ مان لیا گیا ہے لیکن دراصل دیکھا جائے تو مختلف مقامات پر من کی مقداریں فرق ہو جاتا ہے۔ یہ بتانا تو واقعی مشکل ہے کہ کاشت کار کو کس حد تک جان بُوجھ کر دھوکا دِیا جاتا ہے اور کس حد تک وہ محض وزن کے نقائص کا شکار ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عام طور سے غلّہ خریدنے والے بے چارے کاشت کاروں کو خوب ٹھگتے ہیں۔

غلّے کی خرید و فروخت کے موقع پر کاشت کاروں سے دستوری کے طور پر ہمیشہ کچھ زیادہ وصول کر لیا جاتا ہے۔ آڑھتی اس دستوری کی رقم یا غلّے کی مقدار خود ہی مقرّر کرتے ہیں۔ اور پُورے بازار کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہیں۔ دستوریوں میں کچھ کے نام یہ ہیں: پلّے داری، تُلائی، چُنگی یا چُنگی، دلّالی، خیراتی، گوشالہ، چنگر، ڈھلتا، بچت، کباری، نمونہ، آڑھت داری، زمیں داری وغیرہ وغیرہ۔ ہر بازار میں بہ یک وقت یہ تمام مدیں نہیں وصول کی جاتیں لیکن جس بازار میں دو چار مدیں بھی ہوتی ہیں وہاں سے کاشت کار بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ انھی تمام باتوں کی وجہ سے ہندستان کی تقریباً پچھتر فی صد زرعی پیداوار کاشت کار خود اپنے گاؤں میں بیچ دیتے ہیں۔ بیس فی صد پیداوار نزدیک کے چھوٹے چھوٹے بازاروں میں پہنچتی ہے۔ لے دے کر پانچ فی صد بڑے بڑے تھوک بازاروں میں آتی ہے۔

ہندستان کی زرعی پیداوار کی خرید و فروخت کے سلسلے میں ایک اور غلط طریقہ یہ رائج ہے کہ کاشت کار اپنی پیداوار وقت سے پہلے فروخت کر دیتا ہے۔ ایک اوسط درجے کا کاشت کار بہ مشکل دو یا تین ماہ تک اپنی فصل کھڑی رکھتا ہے۔ فصل کو قبل از وقت بیچ دینے میں بجائے خود کوئی ہرج نہیں لیکن اصل چیز جو باعثِ نقصان ہے وہ یہ ہے کہ مُلک میں بہ یک وقت بہت

بڑی مقدار میں زرعی اشیا جمع ہوجاتی ہیں۔ اگر زرعی پیداوار کی خرید و فروخت کا مناسب انتظام کیا جائے تو اس سے ملک کو ان نقصانات سے نجات مل جائے۔

موجودہ غیر اطمینان بخش صورتِ حال کی ذمے داری دو چیزوں پر عائد ہوتی ہے۔ (۱) ہندستان کے ادنا کاشت کاروں کی مالی حالت اچھی نہیں۔ وہ رُپیہ قرض لیتا ہے اور اس کا سود ادا کرتا ہے پھر زمیں دار کو مال گزاری دیتا ہے۔ زمیں دار اور مہاجن یہ جانتے ہیں کہ اگر کاشت کار یہ فصل بیچ کر اپنا قرضہ اور مال گزاری نہیں ادا کر سکا تو پھر وہ دوسری فصل تک ہرگز ادا نہیں کر سکے گا۔ اس لیے وہ فصل کٹنے کے فوراً ہی بعد مطالبہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ خود کاشت کار کو بھی اپنی نجی ضروریات پوری کرنے اور آنے والی فصل کے جوتنے بونے کے لیے رُپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان حالات کے تحت ادنا درجے کے کاشت کار کے لیے غلّہ جمع رکھنا بہت دُشوار ہوجاتا ہے اور وہ جلدی ہی بیچ ڈالتا ہے۔ سنٹرل بینک اور انجمنِ قرضِ امدادی (CO-OPERATIVE CREDIT SOCIETIES) سے مختصر عرصے کے لیے کچھ کاشت کاروں کو قرض ضرور دیے جاتے ہیں لیکن یہ رقم اُن کی ضروریات کا ایک حصّہ بھی نہیں پورا کرتی۔ اس کے علاوہ اس قرضے کی مدت فصل کاٹتے ہی ختم ہوجاتی ہے، چناں چہ بینک کو ٹھیک تاریخ پر قرض ادا کرنے کے لیے بھی فصل کو فروخت کرنے میں جلدی کرنی پڑتی ہے۔ ہندستان میں زرعی پیداوار کی خرید و فروخت کے سلسلے میں امدادِ باہمی کا طریقہ ابھی رائج نہیں ہوا ہے، اور زرعی پیداوار کی ضمانت پر کاشت کاروں کو کوئی انجمن قرض دینے کے لیے تیار نہیں۔ (۲) ہندستان میں زرعی پیداوار کیوں اس قدر جلد فروخت کر دی جاتی ہے اُس کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ کاشت کاروں کے مکان میں غلّے کا ذخیرہ محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ ایک اوسط درجے کا کسان عموماً اپنی پیداوار کو محفوظ رکھنے کے لیے کوئی علاحدہ مکان نہیں بنواتا بلکہ اپنے جھونپڑے یا کچے مکان ہی میں رکھتا ہے۔ اگر کسان عام معیار سے کچھ زیادہ پیسے والا ہے تو اُس کے مکان میں دو یا تین چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر خاندان میں پانچ یا چھ آدمی ہوے تو اتنے چھوٹے سے مکان میں رہنا ہی تکلیف دہ ہوجاتا ہے غلّہ رکھنے کے لیے جگہ خالی کرنا تو الگ چیز ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر پیداوار کو جلد از جلد فروخت کر دینا ضروری ہوجاتا ہے۔

یہ تو ان مشکلات کا تذکرہ ہوا جن کا تعلق خود کسانوں کے معاشی حالات سے ہے لیکن زرعی پیداوار کی خرید و فروخت کے انتظام میں بھی کچھ ایسی خرابیاں موجود ہیں جن کا تذکرہ لازمی ہے۔

کاشت کار جب کبھی اپنا غلّہ فروخت کرتا ہے تو اچھا اور خراب دونوں ملا کر۔ حالاں کہ وہ بڑی آسانی سے اچھی اور بُری پیداوار کو علاحدہ کر سکتا ہے۔ اچھے اور بُرے غلّے کی تقسیم کے کچھ ایسے من مانے طریقے رائج کر دیے گئے ہیں کہ کسان اپنا غلّہ چھانٹ کر فروخت ہی نہیں کر سکتا وہ اپنی پیداوار کو ملی جُلی صورت میں بازار میں لانے پر مجبور ہے۔ خریدار بھی ایسا نہیں کرتے کہ اچھے غلّے کے لیے

کچھ بڑھوتی (PREMIUM) یا زائد رقم مقرر کردیں، نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ کاشت کار اپنے غلّے کی کوئی خاص طور سے حفاظت نہیں کرتے اور جیسا تیسا لاکر بیچ دیتے ہیں۔ اس قسم کے ملے جلے مال کے انھیں بہت کم دام ملتے ہیں لیکن اگر اُسی کو چھانٹ کر اور اچھے بُرے کو علاحدہ کرکے فروخت کیا جائے تو دونوں کے مجموعی دام زیادہ نکل سکتے ہیں۔ اس طرح کسان گھاٹے میں رہتا ہو۔ اُن غیر ممالک سے جو ہندستان سے خام مال مثلاً غلّہ وغیرہ منگاتے ہیں بار بار یہ شکایت آتی ہو کہ جو مال یہاں سے بھیجا جاتا ہو اُس میں قرار داد سے زیادہ ملاوٹ ہوتی ہو۔ مُلکی اور غیر مُلکی دونوں قسم کی تجارت کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہو کہ زرعی اشیا کا ایک مستقل اور معقول معیار مقرر کردیا جائے جو کاشت کار اور خریدار دونوں کے مفاد کی نظر سے منصفانہ ہو۔

کاشت کاروں کو چوں کہ بازار کے بھاؤ کا صحیح صحیح علم نہیں ہوتا اس لیے وہ بڑے گھاٹے میں رہتے ہیں اور یہ لاعلمی اُن کے لیے بڑی رکاوٹیں پیدا کردیتی ہو۔ وہ ایسے چھوٹے چھوٹے گانوؤں میں رہتے ہیں جہاں ذرائع رسل و رسائل کی بڑی کمی ہو، ڈاک کا بھی اچھا انتظام نہیں ہوتا۔ بازار کا بھاؤ معلوم کرنے کے لیے انھیں سفری تاجروں اور پھیری کرنے والوں پر بھروسا کرنا پڑتا ہو۔ چناں چہ منڈیوں میں جو قیمتیں ہوتی ہیں اُن کا صحیح علم انھیں کبھی نہیں ہوتا۔ حالاں کہ وہ منڈیاں گانوؤ سے بمشکل پندرہ بیس میل کے فاصلے پر ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں کسانوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ آیندہ بازار کا رنگ معلوم کرلیں اور بھی غلط ہو۔ لہٰذا حکّام کا فرض ہو کہ وہ بازار سے متعلق خبریں اور اشیا کی قیمتوں کی اطلاعات دیہاتوں میں پہنچانے کی کوشش کریں۔

ہندستان کی زرعی پیداوار کم سے کم مُلکی بازاروں میں ہمیشہ ملاوٹ کے ساتھ فروخت کی جاتی ہو۔ اس صورتِ حال کی ذمّے داری کاشت کاروں اور بنیوں، دونوں پر عائد ہوتی ہو۔ نہ صرف یہ کہ اشیا میں گرد اور بھوسی ملی ہوتی ہو بلکہ خریدار کو ٹھگنے کے لیے جان بُوجھ کر اُن میں نمی پیدا کردی جاتی ہو تاکہ وزن بڑھ جائے یا اُن کے ساتھ دیگر کم قیمت اشیا ملا دی جاتی ہیں۔ یہ بالکل غلط خیال ہو کہ ملاوٹ کا پتا نہیں چلتا۔ بنیے اور تاجر اشیا کی ملاوٹ سے کچھ زائد منافع کما لیتے ہیں مگر آخر میں اس کا خمیازہ کاشت کار ہی کو بھگتنا پڑتا ہو۔

ہندستان کی زرعی پیداوار کی خرید و فروخت کے نظام میں جو نقائص اور خرابیاں ہیں اُن کی طرف پہلی بار شاہی کمیشن نے توجہ دلائی جو ۱۹۲۶ء میں اس مُلک کے زراعتی حالات کی تحقیق و تفتیش کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ بعد میں مرکزی اور صوبائی تحقیقات بینک کاری کی کمیٹیوں نے اس مسئلے پر خاص طور سے غور و خوض کیا۔ آگے چل کر ۱۹۳۵ء میں حکومتِ ہند نے ایک "مرکزی مارکٹنگ اسٹاف" مقرر کیا اور اُسی سال صوبوں اور بڑی بڑی ریاستوں میں بھی اسی قسم کے اسٹاف مقرر کیے گئے۔ دو سال کے بعد ۱۹۳۷ء میں ہندستانی مرکزی جوٹ کمیٹی کا تقرر ہوا اس اسٹاف کے وجود میں آنے کے بعد گیہوں، چاول، مونگ پھلی، جوٹ، آلو، السی اور تمباکو وغیرہ کی خرید و فروخت کی جانچ پڑتال کی گئی اور اُن کے متعلق رپورٹیں شائع ہوئیں۔

دیگر اشیا کی تحقیق و تفتیش کا کام بھی شروع کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زرعی خرید فروخت کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے ملک کے متعدد علاقوں میں انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً کچھ غلّوں، پھلوں اور دودھ کی بنی ہوئی اشیا کے خالص اور اچھے ہونے کا معیار مقرر کیا جا رہا ہے۔ کم تر اور بہتر ہونے کی بنا پر ان اشیا کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے، مثلاً چاول نمبر ایک، چاول نمبر دو، وغیرہ وغیرہ۔

مرکزی جوٹ کمیٹی نے کچھ اسکیمیں بنائی ہیں۔ یہ اسکیمیں ابھی تک اپنی ابتدائی حالت میں پڑی ہیں، اُن میں سے کچھ کا عملی تجربہ کرکے دیکھا جا رہا ہے کہ وہ درست ہیں یا نادرست۔

۱۹۳۷ء میں حکومتِ ہند نے زرعی پیداوار کے سلسلے میں ایک قانون پاس کیا جس سے زرعی اشیا کی اچھائی بُرائی کا ایک آل انڈیا معیار قائم کرنا آسان ہوگیا ہے۔ صوبوں کے درمیان اور غیر ملکوں سے زرعی خرید و فروخت کا جو سلسلہ قائم ہے اس کی دیکھ بھال تو مرکزی حکومت کر لیتی ہے لیکن صوبوں کے اندر کے جو مسائل ہیں انھیں حل کرنے کے لیے زیادہ تر خود صوبائی حکام ہی کو توجہ کرنی پڑتی ہے۔ کئی صوبوں میں ایسے قانون پاس کیے گئے ہیں جن کے ذریعے زرعی خرید و فروخت پر کنٹرول رکھنا، خرید و فروخت کے طریقوں کو ہموار اور یکساں بنانا اور بازاروں کا خرچ کم کرنا ممکن ہوگیا ہے۔ سب سے پہلے یہ قانون صوبۂ متوسط، بمبئی، مدراس اور حیدرآباد میں پاس کیے گئے اُن کی تقلید میں پنجاب، سندھ اور کچھ ریاستوں نے بھی اس قسم کے قانون پاس کیے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ کچھ صوبوں اور ریاستوں میں اُن لوگوں نے اس کی بڑی مخالفت کی جن کے مفاد پُرانے نظام سے وابستہ ہیں، مثلاً مہاجن بنیے، اور زمیں دار وغیرہ۔ ان لوگوں نے نہ صرف یہ کہ قانون کے منظور ہونے میں رُکاوٹیں اور دقتیں پیدا کیں بلکہ منظور ہو جانے کے بعد بھی اُس کی مخالفت کرتے رہے۔ سندھ کی اسمبلی میں جس وقت زرعی پیداوار کی خرید و فروخت میں انتظام اور باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے ایک بل پر غور و خوض کیا جا رہا تھا تو کچھ وزرا نے مستعفی ہو جانے کی دھمکی دی۔ پنجاب میں غلّے کے سوداگروں نے ہفتوں تک اپنی دُکانیں بند رکھیں۔ بنگال، یو۔پی، بہار، آسام اور اُڑیسہ کے صوبے تو ابھی تک ان قوانین سے محروم ہیں۔

صوبائی حکام کو چاہیے کہ وہ محض قانون منظور کرکے بیٹھ نہ جائیں بلکہ یہ دیکھیں کہ وہ عمل میں بھی لائے جا رہے ہیں یا نہیں۔ اس وقت لوگوں کے دِل میں یہ جاننے کی خواہش ہے کہ کتنے بازاروں میں زرعی پیداوار کی خرید و فروخت پر کنٹرول قائم ہے اور اس سے کس قسم کے نتیجے برآمد ہو رہے ہیں۔ محض بازاروں پر کنٹرول کرنے سے زرعی پیداوار کی خرید فروخت کی حالت بہتر نہیں بنائی جا سکتی۔ کنٹرول سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ بازاروں کے اندر باقاعدگی آ جائے گی اور بہت سے ناگوار طریقے بطر ہو جائیں گے، مثلاً ڈنڈی مارنا، ناجائز دستوری طلب کرنا، غلّہ تولتے وقت کچھ زبردستی

کاٹ لینا، رائج قیمتوں سے کاشت کاروں کو بے خبر رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ لیکن ان اصلاحات سے اُنھی کی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ جو غلّہ لے جاکر بازار میں فروخت کرتے ہیں، غلّہ بونے والوں کو اُس وقت تک فائدہ نہ ہوگا جب تک انھیں زیادہ نفع انگیز طور پر غلّہ فروخت کرنے کے مواقع نہ فراہم کیے جائیں۔ اگر وہ ان بازاروں میں بھی جاکر اپنی پیداوار فروخت کریں جہاں حکومت نے اپنے کنٹرول کے ذریعے باقاعدگی پیدا کر دی ہو تو بھی انھیں خریداروں کے مقابلے میں دب کر ہی رہنا پڑے گا۔ اس لیے کہ بنیے زیادہ منظم ہوتے ہیں اور عام طور پر وہی قیمتیں مقرر کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے نہ صرف بازاروں میں باقاعدگی اور کنٹرول قائم رکھا جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ غلّہ فروخت کرنے کی انجمنیں بھی قائم کی جائیں۔ اور انھیں امدادِ باہمی کے اُصولوں پر چلایا جائے۔ تاکہ کاشت کار قیمتیں طے کرنے میں بنیوں اور خریداروں کا آسانی سے مقابلہ کر سکیں۔

مسائلِ حاضرہ (غیر ممالک)

آزاد مقابلے کو جوہری بم کے ساتھ دفن کر دو

(از نقاد)

انسان کے اجتماعی فعل کا ارتقائی مطالعہ ثابت کرتا ہی کہ انسانی تہذیب میں سیاست و معیشت ایک دوسرے سے مثلِ علت و معلول کے وابستہ ہیں۔ جہاں قبیلے داری نظام سے جاگیریت و ملوکیت اور جاگیریت و ملوکیت سے عوامیت کی تشکیل ہوئی بعینہٖ جنگی کے غیریت آفریں نظام سے آزاد مقابلے او آزاد مقابلے سے بین الاقوامی متوازن معیشت مترتب ہوئی ہی۔

سولن، چانک اور ابن الرشد نے اپنے اپنے زمانے کی محدود معیشت کے سلسلے میں اپنی بساط بھر اس معمے کو بیان کرنے کی کوشش ضرور کی مگر اس کی نکھری ہوئی شکل ایڈم اسمتھ کی تصنیف "دولتِ اقوام" میں نظر آتی ہی جس نے اسے ایک علاحدہ مضمون کا اعزاز عطا کیا اور آزاد مقابلے (LAISSEZ FAIRE) کی بنیاد رکھی۔ اس نے یورپ کے "دلِش کال" کی گتھیوں کو سلجھا کر چند اصول وضع کیے اور یہ دعوا کیا کہ دنیا کی معاشی ترقی کا دار و مدار آزاد مقابلے پر ہی ایڈم اسمتھ نے جو کچھ نظریہ پیش کیا وہ اس زمانے کے لحاظ سے قابلِ قدر تھا مگر بعد کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کے مرتبہ اصول ایسے ہی غیر مکمل تھے جیسا کہ پانی کو عنصر تسلیم کرنے کا نظریہ۔ ۱۷۷۶ء سے ۱۹۴۶ء تک تہذیب نے بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں اور دنیا نے معیشت دانوں کے سامنے ایسے حقائق پیش کیے ہیں جن کے باعث وہ اس نظریے کو شک و شبہے کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔ آیئے ہم بھی جانچیں کہ آزاد مقابلے سے خوش گوار نتائج مترتب ہوتے ہیں یا عبرت انگیز عواقب اور یہ طے کریں کہ آیندہ نوعِ انسان کو اس عنوان سے

کیا تدابیر اختیار کرنی چاہییں۔

تاریخی پس منظر ایڈم اسمتھ نے جس وقت اپنے جدید معاشی نظریات دُنیا کے سامنے پیش کیے وہ دَور انگلستان کے تجارتی انقلاب کا تھا اور وِگیوں[1] کی اکثریت انگلستان کے سیاسی ماحول پر متصرّف ہو کر ایک معاشی سامراج کی تعمیر میں مصرُوف تھی۔

انگلستان کے تجارتی تموّل کا نتیجہ میکانی انقلاب (MECHANICAL REVOLUTION) کی صورت میں نمایاں ہو رہا تھا۔ لوہے کو کوئلے میں بڑے پیمانے پر پگھلایا جا چکا تھا واٹ (WATT) کا دخانی انجن ایجاد ہو چکا تھا اور آرک رائٹ اور کارٹ رائٹ کی ایجادات منظرِ عام پر آچکی تھیں۔ سرمایہ محدود ہاتھوں میں مرتکز ہوتا جا رہا تھا اور ایک نئے سرمایہ دارانہ نظام کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ اس نئے نظام کی تشکیل کے راستے میں چنگی کی فصیلیں امرِ مانع تھیں۔ ایڈم اسمتھ نے انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب کو جو میکانی انقلاب کا نتیجہ تھا اُفقِ یورپ پر تقریباً پچاس برس پہلے پڑھ لیا اور کارخانوں کے نئے سرمایہ دارانہ نظام کے لیے راستہ صاف کرنے کے واسطے "آزاد مقابلے" کے عقیدے کو انیسویں صدی کے مفکرینِ سیاست و معیشت کے لیے ایک ترکے کی شکل میں چھوڑ دیا۔

لیکن ایڈم اسمتھ نے ان معاشی پیچیدگیوں اور غیر متوازن تقسیمِ نو آبادیات و محروسات کے خونیں نتائج کا تخمینہ نہیں کیا جو آزاد مقابلے سے پیدا ہونے والے تھے۔ ہٹلر کی وہ تقریر پڑھیے جو اس نے ۱۹۳۶ء میں نیورم برگ (NUREMBURG) کے نازی اجتماع کے سامنے کی' آزاد مقابلے کا دامن چاک ہوا جاتا ہے۔ نسلی برتری کے اس دیوانے فدائی نے یہ کہہ ڈالا کہ ہم زندہ رہنے کے لیے وسعت چاہتے ہیں (LEBENSRAUM) ہم بھی افراط میں تیرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں بھی یوکرین (UKRAINE) کے گیہوں کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر گوئے بیلز (GOEBBLES) کی اہم تقریروں کا ماحصل یہی رہا کہ ہمیں یوکرین کے گیہوں ڈونیٹز (DONETZ) کے معادن اور کاکیشیا کے پٹرول کی ضرورت ہے۔ مسولینی نے حبش پر حملہ کرنے سے پہلے طنزیہ انداز میں یہ کہا کہ مشرقی سالی لینڈ میں مجھے خالص ریت کے سوا اور کچھ میسّر نہیں آتا۔

یہ سب کچھ 'آزاد مقابلے' کی رُست و خیز نہیں تو اور کیا ہے۔ چناں چہ اسی کا نتیجہ ۱۹۱۴ء-۱۸ کی جنگِ عظیم اور ۱۹۳۹ء-۴۵ کی عالمی جنگ کی صورت میں نکلا جس نے لرزہ بر اندام تہذیبِ انسانی کو ایسی منزل پر لا کھڑا کیا جہاں سے موت و حیات کی الگ الگ شاہ راہیں پھوٹتی ہیں۔

جب انسان کی ابتدائی معاشرت قبیلے داری پدری نظام کے دوران میں تنازع للبقا سے متاثر ہونے لگی اور انسان کا ماضی و مستقبل اس کے نئے نظام پر چھانے لگا تو باہمی کش مکش نے جاگیریت و ملوکیت کا نظام پیدا کیا۔ ایسا ہونا بالکل قدرتی امر تھا۔ انسانی اجتماعی سعی کی پیداوار جو وافر دولت کی شکل میں نمودار ہوئی انسانوں کے درمیان چپقلش کا سبب بنی اور سب سے زیادہ قوی و ہوشیار انسان نے ماحول کی سازگاری سے اپنی برتری کے لیے فضا تیار کر لی اور ملوکیت کی بنیاد پڑی۔ ویسے ہی جب

[1] انگلستان میں دو سیاسی جماعتیں تھیں وِگ (WHIGS) اور ٹوری (TORY) اوّل الذکر جماعت ترقی پسند سمجھی جاتی تھی۔

تجارت کے آزاد مقابلے کو بین الاقوامی تجارتی فضا پر قابض ہونے کا موقع دیا گیا تو وافر پیدائشِ دولت نے ان ہول ناک جنگوں کے اسباب پیدا کر دیے جن سے آج دنیا خوف ناک طور پر گھائل ہے اور اس کھینچ تان میں تمام دنیا کے سرمایے کی باگ ڈور ایک ہی قوم کے ہاتھ میں آگئی۔ سیاسی ملوکیت کی بجائے معاشی ملوکیت و سامراج کا نیا نظام قائم ہوا اور امریکہ کو اقتصادی آمریت کے تاج کے ساتھ ساتھ جوہری بم کی ہیبت ناکیاں ہم دست ہوئیں۔

ممالکِ متحدہ امریکہ کا معاشی سامراج

ہاٹ اسپرنگز (HOT SPRINGS) برٹن وڈز (BRETTON WOODS) شکاگو (CHICAGO) رائی (RYE) سان فرانسسکو (SAN FRANCISCO) کانفرنسوں کا امریکہ میں منعقد ہونا اور امریکی رہنماؤں کے تیوروں پر قراردادوں کا وضع ہونا اس چیز کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ امریکہ آج بین الاقوامی معیشت پر ایسے ہی مسلط ہے جیسے دورِ ملوکیت میں فردِ واحد ایک کش مکش کے بعد ملک کے اقتدارِ اعلیٰ پر قابض ہو جاتا تھا۔ فضائی کانفرنس منعقدہ شکاگو کی بحث کا انداز ملاحظہ فرمایئے۔ آزاد مقابلے کا پرستار انگلستان بھی اس فرسودہ نظامِ معیشت سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے مگر امریکہ کے نمایندے "آزاد مقابلے" کا بھجن گاتے ہیں۔ چناں چہ یہ کانفرنس بلا اہم امور طے کیے ختم ہوگئی یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ امریکہ بین الاقوامی معیشت کا سرتاج ہے مگر اس سے یہ مطلب نہ اخذ کیا جانا چاہیے کہ امریکہ کو بے غل و غش ان کانفرنسوں کی رہ نمائی کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ امریکہ کے ہم راہ برطانیہ اور روس بھی ہیں جنھوں نے فسطائی بربریت کے خلاف کام یابی حاصل کرنے میں جتن کیا ہے۔ دنیا کے مستقبل کی تشکیل میں تینوں برابر کے ساجھی ہیں اور اب یہ خیال نہ کیا جانا چاہیے کہ امریکہ بے روک ٹوک آزاد مقابلے کے عقیدے کو دنیا کے ایمان پر نافذ کر سکے گا۔

برطانیہ

برطانیہ کا قومی قرضہ ایک لاکھ ملین[۲] ڈالر[۱] کے لگ بھگ ہے جس میں صرف قرضے پٹے کے سلسلے میں اسے امریکہ کو ۱۰ ہزار ملین ڈالر ادا کرنے ہیں۔ اُس سے کچھ زیادہ رقم کی حد تک برطانیہ محروسات اسٹرلنگ کا مقروض ہے جن میں مصر، آسٹریلیا اور ہندستان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ صرف ہندستان کو پانچ ہزار ملین ڈالر واجب الوصول ہیں۔ ایک جانب قرضے کا یہ پہاڑ ہے دوسری جانب ملک کی معیشت خستہ حال ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں سربہ فلک عمارتیں تودۂ خاکستر ہیں۔ اس ذہنی منزل میں اگر برطانیہ امریکہ کے سامنے نہ جھکتا تو تعجب خیز ہوتا۔ چناں چہ برطانیہ جھکا اور بڑی حد تک جھکا۔ قرضے پٹے کی اعانت بند ہوتے ہی مجبور ہوا کہ لارڈ کینز (LORD KEYNES) کو واشنگٹن بھیجے اور امریکہ سے حصولِ قرضے کا فیصلہ کرے۔ تین مہینے خون پسینہ ایک کر کے ماہرینِ مالیات کی امداد سے یہ شخص امریکہ کے قارونوں سے قرضے کے حاصل کرنے میں شاد کام ہوا۔ مگر اس کے نفسیاتی اثرات ملاحظہ کیجیے۔ دارالعوام میں ۱۲ دسمبر ۱۹۴۵ء کے دن برطانیہ کے وزیر خزانہ ڈاکٹر ڈالٹن نے جو بیان دیا اس میں قومی مالی بے چارگی کا کھلم کھلا اظہار کیا گیا جس کے متعلق اس سے پہلے مسٹر چرچل نے یہ کہا تھا کہ "ہم دوسروں کی خیرات پر جینا نہیں چاہتے۔" آج برطانیہ ممنون ضرور

---

[۱] یعنی ایک کھرب ڈالر

[۲] ایک ملین دس لاکھ کے برابر ہوتا ہے۔

ضرور ہو مگر وہ اس سبق کو غائبانہ بھولے گی جو اس نے اس جنگ کے دوران میں حاصل کیا ہو۔ اس موقع پر لیبر وزارت کا برسرِ اقتدار آنا اک فالِ نیک ہو۔ ممکن ہو کسی موقع پر برطانیہ "آزاد مقابلے" سے سرکشی کرے اور روس کے ساتھ اتحادِ عمل کرکے بین الاقوامی متوازن معیشت کے لیے ایک واضح طرزِ عمل اختیار کرے۔

روس

اشتراکی روس کا نظریۂ معیشت اپنے ملک کی حد تک تو آزاد مقابلے کے تصور سے بے گانہ ہو البتہ بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے اسے کوئی طرزِ عمل اختیار کرنا پڑے گا۔ روس کے مدبرین اس امر سے بہ خوبی واقف ہیں کہ یہ سب تباہ کاریاں "آزاد مقابلے" کے سبب پیدا ہوئی ہیں اور اسے ختم کر دینا ضروری ہوگا۔ روس کی رائے بین الاقوامی امور میں خاص اہمیت کی حامل ہو۔ کیوں کہ اس جنگ میں اس نے مردانہ وار مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ ایم مولوتوف (M. MOLOTOV) کے بیان کے مطابق "۵۰ لاکھ آدمی ہلاک اور ایک کروڑ اہلِ کار شہری نازی چنگیزیت کی بھینٹ چڑھ گئے" درجنوں شہر اجڑ گئے۔ کانیں تباہ ہوگئیں۔ کارخانے برباد ہوگئے۔ ان کا مالی نقصان ۲۰۰ (دو سو) ارب روبل کے قریب قریب ہو مگر چوں کہ روس کا نظام اشتمالی ہو اس لیے تنظیمِ جدید میں اسے کوئی دشواری پیش نہ آئے گی پیدائشِ دولت کے خصوص میں ستاخاناو (STAKHANOV) کی تحریک مقبولِ ملک ہو چکی ہو اور کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیدائشِ دولت ان کے لیے ایمان کا درجہ رکھتی ہو۔ علاوہ بر آں خام اشیا کے ذرائع کی نظر سے روس تقریباً مکتفی بالذات ہو مگر وہ اپنی صنعت کے بے طور مجروح ہو جانے کے باعث قرضے کا حاجت مند ضرور ہو اور قرضے[1] کی طرح وہ ہندوستان کے ۴۴ فی صدی کے مقابلے میں ۲۸ فی صدی کو قبول کرے گا مگر دنیا جانتی ہو کہ وہ آزاد مقابلے کے سلسلے میں امریکہ کی تحریکات کی مزاحمت ضرور کرے گا۔

اگر نظریات کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو برطانیہ کی سوشلسٹ وزارت اور سرخ روس دونوں کو آزاد مقابلے کا دشمن ہونا چاہیے۔ آج قومی اعتبار سے لیبر وزارت بنک آف انگلینڈ اور کانوں کو مشترک بناتے ہوئے انفرادی سعی پر عرصۂ حیات تنگ کر رہی ہو۔ ناممکن امر نہیں کہ کل کو بین الاقوامی اعتبار سے وہ روس کی ہم نوا ہو جائے۔

امریکہ

مملکتِ متحدہ امریکہ میں بھی ماحول مصروفِ تغیر ہو یہ امر محتاجِ ثبوت نہیں کہ آج ایک بٹن کے دبانے سے امریکہ کسی ملک کو دھن دولت سے نہال کر سکتا ہو اور بھوکوں بھی مار سکتا ہو۔ خود ہمارے ملک میں اس وقت ۶ ارب روپے کا امریکی سامان رکا پڑا ہو۔ آج اگر حکومت امریکہ اس کے فروخت کی اجازت دے دے تو باوجود تعینِ قیمت اشیا کے تجارتی منڈیوں پر اس کا اثر پڑے گا۔ ۶ دسمبر کے دن جب برطانی امریکی معاشی معاہدے پر دستخط ہوئے تو تمام دنیا کے تجارتی حلقوں میں عجیب مد و جزر کا عالم تھا۔ خود ہمارے ہاں کے سونے چاندی کے سٹے بازوں کی ہمت ٹوٹ گئی اور آج سیم و زر سر کے بل اتر رہے ہیں۔

امریکہ نے زمانۂ جنگ کی معیشت کو زمانۂ امن کی معیشت میں بدل دیا ہو اور اس تیز گامی سے اشیا تیار ہونے لگی ہیں کہ مسٹر

---

[1] یہ مضمون جب لکھا گیا اس وقت ہندوستان اور امریکہ کے درمیان وہ معاہدہ ابھی نہیں ہوا تھا جس کی رو سے اس مال کو ہندوستان اب خریدے گا۔

چرچل تک پکار اُٹھے ہیں کہ امریکہ آندھی کی رفتار سے پیدائشِ دولت میں مصروف ہے۔ ایک جانب امریکہ کا سرعت سے زمانۂ امن کی ضروریات تیار کرنا، برطانیہ کے قرضے کو تین مہینے تک کھٹائی میں ڈال دینا، اپنے ۶ ارب کے سامان کو ہندستان میں بن بکے رہنے دینا اور ان سب سے بالاتر جوہری بم کے راز کی حاسدانہ حفاظت کرنا امریکہ کی نیت پر غبار سا ڈال دیتا ہے اور یہ یقین سا ہونے لگتا ہے کہ وال اسٹریٹ کے منعم آزاد مقابلے کے بل پر تمام دنیا کو لپیٹ لینا چاہتے ہیں۔

زمانۂ امن کی معیشت

مگر زمانۂ جنگ کے مصنوعی زرکی پیدائشِ اشیا اور زمانۂ امن کی پیدائشِ اشیا میں بڑا فرق ہے۔ جن کارخانوں کو ایک لاکھ سالانہ کے حساب سے ہوائی جہاز تیار کرنے پڑتے تھے ان کو بہ درجۂ اتم مصروف نہیں رکھا جا سکتا۔ امریکہ کے بحری سامان تیار کرنے والے کارخانے کسی اور کام میں لگانے پڑیں گے۔ دیگر سامانِ جنگ اور موٹروں کے کارخانوں کو بھی چوبیس گھنٹے مشغول نہیں رکھا جا سکتا۔ اس تمام انتقالِ شغل (RECONVERSION) کا مطلب یہ ہوگا کہ علاوہ ستر لاکھ فوجوں میں سے پچاس لاکھ سپاہیوں کے کارخانوں میں سے کئی لاکھ مزدوروں کو ان کارخانوں سے ہٹانا پڑے گا اور آج نہیں تو کل ایک کروڑ کے قریب سپاہیوں اور مزدوروں کے لیے کام مہیا کرنا ہوگا۔ مسٹر ہنری ویلیس معتمدِ تجارت نے اس خصوص میں معاشی تنظیم کے جو نقشے تیار کیے ہیں اور ۷ کروڑ انسانوں کے لئے کام مہیا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے وہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ جرمنی جاپان کے ہلاک ہو جانے، انگلستان اور یورپ کے اکثر ممالک کے بے طور زخمی ہو جانے کے سبب جو معاشی خلا پیدا ہوا ہے اسے امریکہ استعمال کرنے پر تُلا بیٹھا ہے مگر اس وقت ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ امریکہ لاتعداد سامان تیار کرکے مفلوک الحال دنیا کے کس ملک میں بیچ سکے گا۔ سوکے ڈن کا بساطی فرزند کار تب ہی خرید سکتا ہے جب اس کی جیب اجازت دے۔ دمشق کا باغ بان گھر میں امریکی ریڈیو نصب کرنے کی جرأت تب ہی کر سکتا ہے جب وہ گراں بازاری سے نجات پائے۔ بہ الفاظِ دیگر امریکہ سے بے روزگاری کو بے دخل کرنے کے لیے یہ لازم ہے کہ کھپت کی منڈیوں میں عام انسانوں کی قوتِ خرید میں اضافہ ہو اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ آزاد مقابلے کو ختم کرکے تمام دنیا کے لیے ایک متوازن "نظامِ معیشت" ترتیب دیا جائے۔

آزمودہ را آزمودن جہل است

اگر آزاد مقابلے کو زندہ رکھا گیا تو اس کی عملی صورت یہ ہوگی کہ انگلستان، فرانس، روس اور یورپ کے دوسرے ممالک، کینیڈا اور آسٹریلیا بھی وہی سامان تیار کریں گے جو امریکہ تیار کر رہا ہے۔ وہ قدرے پیچھے رہ جائیں گے مگر کسی نہ کسی وقت دوڑ میں شریک ہو جائیں گے۔ پھر مقابلہ شروع ہوگا، قیمتیں گریں گی۔ مالکین کارخانہ کو سرٹیکس ادا کرنے کے بعد منافع کی گنجائش کم رہے گی۔ نتیجتاً مزدوروں کی اُجرت میں تخفیف کرنی پڑے گی۔ پھر کیا ہوگا وہی معاشی بے چینی ہوگی جس نے سنہ ۱۹۳۱ء کی لیبر وزارت کی کشتی کو ڈبو دیا اور انگلستان استقلالِ زر سے بے گانہ ہوا۔ وہی معاشی نزاع ہوگا جس نے ہٹلر کو تہذیب کُشی پر مجبور کیا اور پھر مسٹر ہنری والیس کی ۷ کروڑ امریکنوں کو مصروف بہ کار رکھنے کی تنظیم شیخ چلی کا افسانہ بن کر رہ جائے گا۔

امریکہ میں نئی ہل چل

پھر خود امریکہ پرانی کینچلی اتار پھینکنا چاہتا ہی۔ جہاں امریکہ کی کانگریس اور صدر ٹرومن کی متحدہ قوتیں کام کر رہی ہیں وہاں مزدور بھاؤں کے وفاق میں بھی احساسِ خودی پیدا ہو چکا ہی۔ جنرل موٹرز (GENERAL MOTORS) کے مزدوروں سے لے کر بجلی کے نفٹوں کے مزدوروں تک سب کے سب زندگی کا نیا عمومی سبق پڑھ چکے ہیں۔ جنرل موٹرز والے تو اپنی موجودہ اُجرتوں پر تیس فی صدی کا اضافہ چاہتے ہیں۔ غور کیجیے ۲۵ شلنگ روزانہ کی اُجرت کفالت نہیں کرتی اور ھل مِن مَزید کا تقاضا ہو رہا ہی۔ اب اسے آپ بجائے کشادِ زر کے بستِ زر کی معیشت کی روشنی میں دیکھیے جو دو سال تک بہ تدریج فضا پر محیط ہو جائے گی اور فیصلہ کیجیے کہ ہنری والیس کی انفرادی سعی اور دفعِ بے روزگاری کو کیوں کر ایک دوسرے پر منطبق کیا جا سکتا ہی۔

اس جنگ کے دوران میں امریکی سپاہیوں نے کرۂ ارض کے ہر حصے کی جہاں گشتی کی ہی اور موسموں اور دشمنوں کی بے رحمی کے زیرِ سایہ آبنوسی افریقیوں، سانولے ہندیوں اور گورے برطانیوں کے ساتھ ساتھ رہ کر جنگ کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ ان میں سے اکثر نے فولاد و بارود کی اس سازش کے اسباب پر غور بھی کیا ہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہی کہ ان کی حساس اکثریت اس عقیدے پر قائم ہو گئی ہی کہ یہ جنگ انفرادی سعی اور آزاد مقابلے کا سم آلود پھل ہی۔ وہ اس دقیانوسی نظام کے دشمن ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ اب ان سپاہیوں اور کارخانوں کے مزدوروں کے متحدہ محاذ پر نظر ڈالیے جو کانگرس اور امریکہ کے خلاف تیار ہو رہا ہی تو آپ فیصلہ کر سکیں گے کہ "آزاد مقابلے" کا کیا حشر خود امریکہ میں ہونے والا ہی۔

"آزاد مقابلے" کا سادہ لفظوں میں ترجمہ کیجیے تو یہ کہنا پڑے گا کہ کشمکشِ حیات کو انسانی تہذیب میں دخل دینے کی ایسے اجازت دی گئی ہی جیسے چینی کے سامان کی دکان میں بپھرے بیل کو شوقِ رقص کی اجازت دی جا سکتی ہی۔

نجات کا ایک ہی راستہ ہی

صدر ٹرومن، میجر اٹیلی اور جنرل سیمو اسٹالن میں سے ہر ایک انسانی تہذیب کی حفاظت کے لیے شمشیر بکف ہی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ قومی ملی اور نسلی مفادات کی حفاظت کے لیے بھی جد و جہد ہو رہی ہی۔ آگ پانی کا ساتھ کیوں کر ہو سکتا ہی۔ متعصب قوم پرستی اور انسانی تہذیب کا بقا و عروج ایک دوسرے کے سراسر منافی ہیں۔ اس منجدھار سے بچ نکلنے کا ایک ہی راستہ ہی کہ صلح کانفرنس کے وقت آزاد مقابلے کو بلا کسی شان و شکوہ کے جوہری بم کے ہم راہ دفن کر دیا جائے۔ متحدہ اقوام کی مجلسِ حفاظت کے زیرِ ادارہ معاشی کمیٹی کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کے مطابق دُنیا کی تمام ان اقوام کی احتیاجات کا خاکہ تیار کیا جائے جو اس وقت 'متحدہ اقوام' کی رکن ہیں بلکہ ان میں جاپان جرمنی کے گناہوں پر خطِ عفو کھینچ کر انھیں بھی شریک کیا جائے اور ہر ملک کو اس کی موجودہ معاشی حیثیت کے مطابق ان اشیا کے تیار کرنے کی اجازت دی جائے جو کم خرچ سے پیدا کی جا سکتی ہیں۔ پس افتادہ ممالک کو قرضہ جات دے کر پیدایشِ دولت کا صحیح ماحول پیدا

کیا جائے اور ان کے معیارِ زندگی کے بلند کرنے کے لیے تدابیر اختیار کی جائیں۔ ہر ملک کے لیے اغذیہ و دیگر ضروریاتِ انسانی کا ایک مرکزی محفوظ خزانہ قائم کر دیا جائے تاکہ بنگال کے ایسا قحط رونما نہ ہو اور ایسی مہنگائی بھی نہ رہے کہ دیا سلائی کی ڈبیا ۲ ڈالر کو میسر آئے جب بین الاقوامی طور پر انسانی معیشت کی تنظیم عمل میں آئے گی تب ہی فورڈ کی گاڑی قندھار یا مدراس میں مونھ مانگے داموں بک سکے گی۔

عبوری دَور اگرچہ دُنیا کے مختلف ممالک نے مابعدِ جنگ کے معاشی خاکے تیار کر رکھے ہیں مگر ان کو بہ روے کار لانا ممکن نہیں جب تک تینوں بڑوں یعنی روس، امریکہ اور برطانیہ میں کامل سیاسی اعتماد اور معاشی مفاہمت نہ ہو۔ مزید برآں یہ بھی ضروری ہو کہ دہشت خیز عبوری دَور (TRANSITION) کی فوری تنظیم عمل میں آئے کیوں کہ جب تک اسے قابو میں نہیں لایا جاتا اور جب تک ضروری اشیا کی قیمت انگلستان کی مانند ماقبلِ جنگ کی قیمت سے ۷۶ فی صدی اضافے کے اندر اندر نہیں لائی جاتی مابعدِ جنگ کی تنظیم بے ڈھنگی رہ جائے گی۔ یہ ممکن ہو کہ ہم اس دو تین سال کے زمانے کی تغیر پذیر معیشت کو گرفت میں لاسکیں جب کہ ہر ملک میں محکمہ جاتِ رسد قائم ہو چکے ہیں اور اشیا کی ضرورت کی تحدید اور ان کی قیمتوں کا تعین عمل میں آچکا ہو۔ اس عبوری دَور میں صرف اتنی ضرورت ہو کہ رشوت، چور بازاری، احتکار اور خطرناک نفع خوری کو قانوناً بغاوت کے برابر سمجھا جائے اور مجرمین کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں مگر یہ سب کچھ تب ہی معرضِ امکان میں آسکتا ہو جب تینوں بڑے رہ نماؤں میں کامل اعتماد موجود ہو۔ ہمارا یہ خیال ہو کہ اس جنگ نے بڑی طاقتوں کو بے طور سہما دیا ہو اور دن بہ دن حالات ایسے پیدا ہوتے جا رہے ہیں کہ باہمی سیاسی و معاشی سمجھوتا عمل میں آسکے اور تمام دُنیا کو ایک خاندانی سلک میں منسلک کیا جاسکے۔

نظریٔ معاشیات

سرمایہ داری

از : ——— جناب افتخار احمد مختار ایم۔اے (علیگ) اینگلو عربک کالج دہلی

ہمارا زمانہ بھی عجیب زمانہ ہی۔ کتنا سخت! بوکھلا دینے والا، جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ بیسویں صدی کیا آئی کہ ہولناکیوں بدبختیوں اور مصیبتوں کا تانتا بندھ گیا۔ حضرتِ انسان پر وہ مار پڑی۔ کہ سب چوکڑی بھول گئی۔ ڈیڑھ دو صدی سے ایک نئی تہذیب بنا رہے تھے۔ جس کی بنیاد اپنی پندار میں انسانی آزادی، فطرت کے قوانین، فارغ البالی، مسرت اور فردوس در دُنیا کے اُصولوں پر رکھی تھی اور اپنی کامیابی پر وہ ناز تھا جس کی حد نہیں۔ "ہم نے ریلیں بنائیں۔ بھاپ سے چلنے والے جہاز بنائے۔ ہوائی جہاز ایجاد کیے۔ ٹیلی فون اور وائرلیس پیدا کیے۔ زمین کی طنابیں کھینچ دیں۔ دُنیا کے ہر ایک حصّے کو دوسرے حصّوں سے ملا دیا۔ لکڑی ور لوہے کے فرسودہ اوزاروں کی بہ جائے کل پُرزے اور مشینیں بنائیں۔ اور اتنی دولت پیدا کی جس کی نظیر انسان کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔"

——— یہ سب کچھ ہماری نئی تہذیب ہی۔ اور اس تہذیب کے بنانے میں انسان کے دماغ کے علاوہ جس چیز نے مدد دی ہی، وہ ہمارا معاشی نظام ہی۔ جس کو سرمایہ داری کہا جاتا ہی۔ اس نظام نے، اس میں کوئی شک نہیں، انسانی دماغ کو وہ قوتِ پرواز بخشی۔ جو اس کو پہلے کبھی حاصل نہ تھی۔ اور اگر تھی۔ تو اس کا استعمال نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ قوتِ پرواز یک طرفہ نہ نکلی۔ اس نے صرف انسان کی بہبودی، مسرت اور معاشی فارغ البالی کی بلند اور کٹھن منزلیں ہی طے نہیں کیں۔ بلکہ ادبار، مصیبت، ظلم و تعدّی، حرص و آز، کینہ و نفرت کے دیوؤں سے بھی ہمارا ناتہ زیادہ مضبوط کر دیا۔ چناں چہ آج انسانی تہذیب ایک ایسی پھسلواں چٹان پر لڑکھڑا رہی ہی جہاں سے گرنے پر اس کا

پاش پاش ہو جانا یقینی ہے۔ چاروں طرف سے تباہی بھیانک ترین شکلوں میں ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔ انسانی دل لرز رہا ہے اور اس میں کوئی شبہے کی گنجائش نہیں۔ کہ اگر اس وقت انسان نے اپنے راستے کو نہ بدلا تو اس کی تہذیب، اس کا عروج، اس کی کامیابی اور کامرانی سب خاک میں مل جائیں گی۔ اور شاید اس کی ہستی بھی مٹ جائے۔

اس نازک موقع پر یہ ضروری ہے۔ کہ انسان اپنے پس پشت نظر ڈالے۔ اور معلوم کرے۔ کہ وہ کیا قوتیں ہیں۔ جو اس کو اس تباہی کی طرف گھیر کر لائی ہیں۔ جنھوں نے اس کو گزشتہ پچیس تیس سال کے مختصر سے عرصے میں تاریخ کی دو مہلک ترین لڑائیوں کی آگ میں دھکیل دیا۔ اور جن کا زہر ابھی تک برقرار ہے۔ اور شاید عنقریب ہی وہ ایک تیسری جنگِ عالم بپا کر دیں۔ جو گزشتہ دو جنگوں سے بھی زیادہ خوفناک ہو۔ جس کے شعلے میدانِ جنگ کے سپاہیوں کو ہی نہیں، بلکہ امن و عافیت پسند شہریوں اور دیہاتیوں، بچوں، بوڑھوں، مریضوں، عورتوں غرض کہ بستیوں کی بستیوں اور ملکوں کے ملکوں کو بھسم کر ڈالیں۔ ان قوتوں کو کچھ لوگ بد دینی اور لامذہبیت کا نتیجہ بتائیں گے۔ کچھ ہماری سماجی اور اخلاقی خرابیوں کا۔ لیکن ہوش و خرد والے ان کا ماخذ ہمارے موجودہ معاشی نظام میں پاتے ہیں۔ اور غالباً یہی درست بھی ہے۔ تاریخ کے ورق پلٹیے۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ انیسویں اور بیسویں صدی کی اکثر لڑائیاں اور خانہ جنگیاں زیادہ تر معاشی وجوہ کی بنا پر ہوئیں۔ قرونِ وسطیٰ تک قوموں اور ملکوں کی مذ بیشتر مذہبی تعصب، لوٹ کھسوٹ کے جذبے یا ملک گیری کی ہوس کے باعث ہوتی رہی۔ لیکن اس کے بعد مادہ پرستی کا دور دورہ ہوا۔ مذہبی اثرات ماند پڑ گئے۔ اور ملک گیری کی ہوس نے سامراجیت کی شکل اختیار کی۔ مغربی ممالک اپنے اپنے مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈیوں کی تلاش میں نکلے۔ اس تلاش میں پورے کے پورے برِاعظموں کے حصے بخرے ہو گئے۔ جہاں کہیں صلح صفائی سے کام چلا، چل گیا۔ ورنہ اکثر میدانِ جنگ نے تصفیہ کیا۔ بیسویں صدی کی لڑائیوں میں بھی یہی وجہ کامراں رہی ہے۔

میں اس مضمون میں اس موجودہ معاشی نظام یعنی سرمایہ داری سے بحث کروں گا۔ یہ بحث مفصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ مفصل بحث کو "معاشیات" کے بہت سے مضامین میں سے ایک میں کوزہ بند نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ سرمایہ داری میں بحث کے کئی پہلو ہیں۔ اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو خشک اور اصطلاحات سے پُر ہونے کے سبب سے عام لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ مثلاً سرمایہ داری کی تکنیک۔ میں یہاں مختصر طور پر سرمایہ داری کا مفہوم واضح کروں گا مجھے اس نظام پر اشتراکیت پسندوں کے حملوں اور اعتراضات سے بھی سروکار نہ ہوگا۔ میری تمام تر کوشش یہ ہوگی کہ میں اردو داں حضرات کو سرمایہ داری کے موٹے موٹے نقوش سے متعارف کر دوں۔ سرمایہ داری کے عنوان پر ایک خالص علمی مضمون انشاءاللہ "معاشیات" کے کسی آئندہ نمبر میں جگہ لے گا۔

نظامِ سرمایہ داری کے سراہنے والے اس کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ کہ اس نظام کا امتیازی نقش انفرادی آزادی ہے۔ افراد

جو چاہیں کریں۔ان کو آزادی ہو کہ جس طرح چاہیں دولت پیدا کریں۔ اور جیسے چاہیں' اس کو خرچ کریں۔ پیدا کی ہوئی دولت میں سے جتنا چاہیں بچائیں ۔اور اس کو جس کام میں چاہیں لگائیں ۔ افراد آپس میں ہر طرح کے معاہدے کریں ۔لیکن آزاد رہ کر۔ ایک کا زور دوسرے پر نہ ہو۔ اور نہ ہی حکومت مداخلت کرے۔ حکومت کا صرف یہ کام ہو کہ ملک کو بیرونی حملے آوروں سے بچائے۔ انفرادی ملکیت کو چوروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ کرے۔ قتل ، دھوکے بازی اور فریب دہی کے خلاف قانون بنائے۔ اور بس۔جب ہر فرد کو یہ معلوم ہوگا۔ کہ اس کی محنت کا نتیجہ اس کی گاڑھے پسینے کی کمائی اُس کے اور صرف اُسی کے استعمال کے لیے ہے تو وہ معاشی سعی اور جدوجہد میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھے گا۔ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے گا۔ اور جب افراد علاحدہ علاحدہ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے تو سب کی پیدا کی ہوئی دولت مِل کر زیادہ سے زیادہ ہو جائے گی۔ اس طرح سے اس نظام کو قبول کرنے والے ملکوں میں غربت اور افلاس کی جگہ مادّی بہبودی' بشاشت اور آسودہ حالی لے لے گی۔ چوں کہ ہر شخص اپنے معاہدوں میں آزاد ہوگا۔ اس لیے اس کی پیدا کی ہوئی دولت میں کوئی اور حصّے دار نہ ہوگا۔ امیر غریبوں کے خون پر نہ پلیں گے۔

اس نظام کا دور صنعتی انقلاب کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ چناں چہ سرمائے داری نے درحقیقت جو شکل اختیار کی۔ وہ یہ تھی۔ کہ پیدائشِ دولت کا ڈھنگ بدل گیا۔ لوگ پہلے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنے سرمائے اور اپنی محنت سے اپنے گھروں میں معاشی پیداوار کیا کرتے تھے ۔اور اپنی بنائی ہوئی معاشی اشیا کو بازار میں فروخت کر کے اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کر ان کو استعمال میں لاتے تھے۔ اب اشیا کی پیدائش کے لیے مشینوں کا استعمال شروع ہوا۔ اور چوں کہ مشینیں گراں قیمت تھیں۔ اور ان سے پوری طرح کام لینے کے لیے ایک' دو' دس بیس یا پچاس ساٹھ نہیں ، بلکہ سیکڑوں ہزاروں انسانوں کی ضرورت تھی ۔اس لیے پیدائشِ دولت گھروں کی بہ جائے بڑی بڑی فیکٹریوں میں ہونے لگی ۔مشینوں کو بنانے کے لیے اور ان کو خریدنے کے لئے خام پیداوار کے حصول کے لیے اور ان انسانوں کی محنت کے معاوضے یا صلے کے لیے' جن سے مشینوں پر کام لیا گیا۔ اور جن کو مزدور کا لقب ملا۔ سرمائے اور کثیر سرمائے کی ضرورت پیش آئی ۔ یہ سرمایہ ان لوگوں نے مہیا کیا ۔جن کی آمدنی کے ذرائع وسیع تھے یا جن کی آمدنی خرچ سے زیادہ تھی ۔ان کو اس نئے ڈھنگ کی پیداوار میں مدد دینے کے صلے میں سود ملنے لگا ۔لیکن اس کا تاج دار سرمائے دار بنا۔ جو محض اپنا سرمایہ ہی نہیں لگاتا تھا۔ بلکہ اپنی معاشی مہم کی قسمت اور اس کے نتیجے کا ذمّے دار بھی تھا ۔ سود پر روپیہ دینے والوں کو معاشی مہم کے نفع و نقصان سے کوئی بحث نہ تھی ۔ وہ ایک مقررہ شرح سے اپنے دیے ہوئے سرمائے پر فاضل رقم وصول کرتے تھے ۔گویا مردہ جنّت میں جائے یا دوزخ میں' اِن ملّاؤں کو اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ معاشی مہم کے نفع و نقصان سے تمام تر سرمائے دار کو سروکار تھا۔ یہی وہ لوگ ہیں ۔جو ہمارے نظامِ سرمائے داری کی روحِ رواں ہیں ۔ اصولاً ان کو بلند خیالی' بلند حوصلگی اور دور بینی کی صفات سے متصف ہونے کے علاوہ صائب الرّائے' ہوشیار و چالاک ، نڈر اور باخبر ہونا چاہیے ۔کون سی شے پیدا کی جائے ۔ کتنے

بڑے پیمانے پر پیدا کی جائے۔ کس کس قسم کی مشینیں استعمال ہوں۔ مشینوں اور مزدوروں میں کیا تناسب رکھا جائے۔ ہنرمند مزدوروں کی غیر ہنرمند مزدوروں کے ساتھ کیا نسبت ہو۔ خام پیداوار، مشینیں اور مزدور کون سی منڈیوں سے اور کن قیمتوں پر خریدے جائیں۔ مال کے نکاس کے کیا راستے ہوں۔ کہاں کہاں مال بھیجا جائے۔ اور کن داموں پر۔ مال کو فیکٹری سے منڈی تک پہنچانے کی کیا تدبیر ہو۔ یہ اور اسی قسم کے کئی اور فیصلے سرمایہ دار کو کرنا ہوتے ہیں۔ اس کی پہلی اور آخری کوشش اس تمام سلسلے میں یہ ہوتی ہے کہ مال کو سستے سے سستا پیدا کر کے مہنگے سے مہنگا بیچا جا سکے۔ تاکہ اس کا منافع زیادہ سے زیادہ ہو۔

نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کا کہنا ہے۔ کہ اس نظام کے ماتحت پیدایشِ دولت بیش ترین مقدار میں ہو سکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان اشیا کا تعین جو پیدا ہوتی ہیں، سرمایہ دار نہیں کرتا۔ بلکہ دولت کے صرف کرنے والے کرتے ہیں۔ یہ صارف اپنی اپنی جگہ سب پیداوارِ دولت میں حصہ لیتے ہیں۔ کچھ مزدوروں کی حیثیت سے۔ کچھ اپنا روپیہ سود پر دے کر یا زمینیں کرایے پر چڑھا کر اور کچھ خود سرمایہ داروں کی شکل میں۔ جب پیداوارِ دولت میں سے ان کو ان کا حصہ مل چکتا ہے۔ خواہ اُجرت کے طور پر یا سود اور کرایے ولگان یا منافع کی صورت میں۔ تو فرداً فرداً یہ سب اپنی اپنی آمدنی کی حد تک بازار کے حاکم اور بادشاہ ہوتے ہیں۔ یہ جو چیز چاہیں، خریدیں جس شے کو چاہیں رد کریں۔ کسی کو کم خریدیں، کسی کو زیادہ۔ اور طرہ یہ کہ اپنی من مانی قیمت سے زیادہ کسی چیز کے لیے بھی دینے پر مجبور نہیں کیے جا سکتے۔ اگر صارف کی قیمت پر بازار میں کوئی خاص چیز نہ ملتی ہو تو اسے اختیار ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ کر کوئی دوسری چیز لے لے۔ جب ایسا ہے۔ تو ظاہر ہوا۔ کہ سرمایہ دار صرف ان چیزوں کو پیدا کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں جن پر صارف اپنی آمدنی کے خرچ کرنے کا میلان رکھتے ہیں۔ پھر اس نظام سے کون سا نظام بہتر ہو سکتا ہے۔ اشیا کی پیداوار بڑھتی ہے۔ لوگوں کی آمدنیاں بڑھتی ہیں۔ اور ان کی خرچ کرنے کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ قیمتیں سرمایہ دار مقرر نہیں کرتے بلکہ ان کے تعین کا انحصار صارفین کی رغبت اور معاشی قدروں پر ہوتا ہے۔ گویا اس نظام میں سرمایہ داری کی خدمات سے مُلک کا ہر فرد فائدہ اُٹھاتا ہے۔ سود پر روپیہ دینے والے اس لیے کہ ان کو سود ملتا ہے۔ اور ان کو آزادی ہے کہ جتنا چاہیں سرمایہ بہم پہنچائیں۔ سب پر سود ملے گا۔ مزدور اس لیے کہ مشینوں کی مدد سے فیکٹریوں میں ان کی قوتِ پیداوار یا اہلیت دوگنی چوگنی ہو جاتی ہے۔ اور ان کی اُجرت کا تعین ان کی اہلیت سے ہوتا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ فیکٹری میں سرمایہ دار کے ماتحت کام کرنے کی صورت میں اس کو قطعی فکر نہیں۔ کہ گاہک ملے گا یا نہیں! کیا قیمت لگائے گا اور مال بن چکنے کے بعد اگر آگ لگ گئی تو! مال پر ڈاکہ تو نہیں پڑ جائے گا! وغیرہ وغیرہ۔ ہفتہ یا مہینہ گزرا اور اس کی بندھی ہوئی اُجرت اس کی جیب میں آگئی۔ جائے اور گل چھرّے اُڑائے۔ اسی طرح سے زمین داروں کے پو بارے ہو گئے۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری، بیٹھے بٹھلائے ان کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ کیوں کہ ان کی زمینوں اور جائدادوں کی مانگ بڑھ گئی۔ مزے سے بیٹھے رہا کریں۔ اور دین و دنیا کی فکر سے آزاد زندگی بسر کریں ـــــ سرمایہ دار یہ سب کچھ کرتا ہے۔ پھر بھی وہ بادشاہ نہیں خادم ہے۔ اُسے میری آپ کی، سب کی آنکھ دیکھنا

ہوتی ہے۔ نہیں کیا چاہتا ہوں۔ آپ کیا چاہتے ہیں۔ اور لوگ کیا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہشات اور ضروریات کا جائزہ لے کر وہ اپنی معاشی مہم میں پہلا قدم اُٹھاتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ یقینی نہیں کہ غریب کی محنت پھل لائے۔ ممکن ہے کہ مال بن چکنے پر اس کو معلوم ہو کہ لوگوں کی مانگ بدل گئی اور وہ اس کا مال نہ خریدیں گے۔ مال کے بنانے میں اس نے نہ صرف اپنی منتظمانہ قابلیت اور دماغی کاوش ہی لگائی تھی بلکہ اپنا تمام سرمایہ بھی لگایا تھا۔ دُوسروں سے سود کے وعدے پر قرض لیا تھا۔ کچا مال خریدا تھا۔ مزدوروں کو اُجرتیں دی تھیں زمین داروں کو کرائے بھرے تھے۔ یہ سب اکارت گیا۔ اور وہ اب ایک دیوالیے کی حیثیت رکھتا ہے ——— کتنی قابلِ رحم حالت ہے غریب کی! تو جس نظام میں عوام کو اتنی طاقت اور قوت حاصل ہو، جہاں وہ اپنی ذات سے متعلق اپنے فیصلوں میں اتنے خود مختار ہوں، جہاں بادشاہت ان کی اور صرف انھی کی ہو۔ اور جس کے سائے میں انسان نے ترقی کی منازل اتنی سرعت سے طے کی ہوں۔ کہ ابھی دو صدی پہلے وہ کتنا مجبور تھا، کتنا لاچار تھا۔ قدرت اس پر کتنی بُری طرح سے حاوی تھی۔ زندگی میں ہر ہر قدم پر وہ لڑکھڑاتا تھا۔ اس کی آسودگی، اس کے چین و اطمینان، اس کی صحت، اس کی ہستی سب قدرت کے رحم و کرم پر تھی۔ اور آج وہ کتنا قوی ہے۔ اس میں کتنی خود اعتمادی ہے۔ اس نے فطرت کے سب راز پالیے اور قدرت کا سینہ چیر کر اس کی سب اقلیموں پر حاوی ہو گیا۔ اس نے نیستی کو ہستی میں تبدیل کر دیا۔ جس مُلک میں دو سو سال پہلے چار انسانوں کو پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملتا تھا۔ وہاں اب اتنی انسان عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہی کیا! اس نے ہر لحاظ سے انسانی زندگی کی کایا پلٹ دی۔ ایسا نظام یقیناً بہترین نظام ہے۔ آفریں اس نظام پر! اور صد آفریں اس کے بنانے والوں پر۔

لیکن ذرا ٹھیریے۔ یہ سب جو کہا گیا ہے، سرمایہ داری کے سراہنے والوں کی زبانی تھا۔ ضروری نہیں کہ یہ صحیح بھی ہو۔ اس نظام سرمایہ داری کو خود اپنی آنکھ سے دیکھیے، تو پتا چلے گا۔ کہ سرمایہ داری وہ نظام ہے جس میں کہنے کو تو معاشی جدوجہد آزاد ہے، بالکل آزاد ——— نہ حکومت اس میں مداخلت کر سکتی ہے، اور نہ ہی ایک شخص دُوسرے شخص کو زبردستی اس کی مرضی کے خلاف کوئی معاشی کام کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ لیکن اصل میں اس نظام میں عوام کی معاشی جدوجہد کی باگ ڈور چند خوش قسمت انسانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جو اپنے سرمائے کے زور سے اپنی قابلیت کے بوتے پر، اپنی سماجی یا سیاسی شخصیت کی وجہ سے ہماری معاشی زندگی پر چھا جاتے ہیں۔ بے شک ہمیں آزادی ہے کہ ہم ان کے ہتکنڈوں میں نہ آئیں۔ اور اپنے لیے آزادانہ کوئی اور راہ نکال لیں۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ عوام کے لیے تمام راہیں بند ہیں۔ وہ خود مختارانہ پیدائشِ دولت میں حصہ نہیں لے سکتے۔ (اور نہ ہی سرمائے دار صرف وہ چیزیں بنانے اور پیدا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، جن کو عوام چاہتے ہیں۔ عوام کی فطری ضروریات کے لیے بھی پُوری طرح سے پیدا نہیں کیا جاتا کہ یہ سرمائے دار امیروں کے لیے موٹریں، ہوائی جہاز، اعلا اور نفیس شرابیں، ریشم اور مخمل کے کپڑے اور دُنیا بھر کی عیاشی کا سامان پیدا کر کے رکھ دیتے ہیں،) عوام کو مجبوراً ان سرمائے داروں کے ہاتھ اپنی آزادی کو بیچ دینا پڑتا ہے۔ ایسا وہ خوشی سے نہیں کرتے۔

ہاں آزادی سے کرتے ہیں۔ ان کو اختیار ہے، چاہے ایسا کریں چاہے بھوکے مرجائیں۔ ان خوش قسمت انسانوں کو، ان سرمایہ داروں کو اپنے سرمایے، قابلیت اور شخصیت کی وجہ سے پیدائش دولت کا اجارہ مل جاتا ہے۔ اس لیے کہ نظامِ سرمایہ داری میں پیدائشِ دولت کا سب سے بڑا اور اہم عامل انسان نہیں سرمایہ ہے۔ سرمایہ نہ ہو تو مشینیں، خام پیداوار، بجلی یا بھاپ کی طاقتیں کہاں سے آئیں۔ عام لوگوں کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا۔ ان پر پیٹ بھرنا اور تن ڈھانپنا دوبھر ہے۔ ناچار وہ ان سرمایہ داروں کی مشینوں کی خدمت کا ذمہ لیتے ہیں۔ مزدور بنتے ہیں اور مزدوری کی اُجرت پر جیتے ہیں۔ سرمایہ دار خوش ہیں کہ ان کی مشینوں کے صدقے سے لاکھوں، کروڑوں کا پیٹ پلتا ہے۔

یہ مٹھی بھر سرمایہ دار ہماری معاشی زندگی کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ لیکن دیکھنا چاہیے کہ ان کی منزل کیا ہے؛ ان کو کس کنارے کی جستجو ہے؟ کیا ان کا مقصد مُلک کی معاشی زندگی کو سُدھارنا ہے یا محض اپنی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ حد تک پُورا کرنا، یا کچھ اور! بدقسمتی سے سرمایہ دار کو نہ مُلک کی آسودگی اور فارغ البالی سے غرض ہے اور نہ ان کی معاشی جِدوجہد کی محرک ان کی اپنی ضروریات ہیں۔ وہ سرمایہ دار ہیں۔ اس لیے ان کا پہلا اور آخری مقصد اپنے منافع کو بڑھانا ہے۔ اس کو دوگنا، چوگنا، دس گنا، بیس گنا کرنا ہے۔ سرمایہ داری کے دور سے پہلے دولت پیدا کی جاتی تھی۔ تاکہ اس کو بیچ کر دُوسری دولت یعنی اپنی ضرورت کی اشیا خریدی جاسکیں۔ اور بس۔ لیکن سرمایہ داری میں دولت پیدا کرنے کا تعلق نہ انسان سے ہے نہ اس کی ضروریات سے۔ یہ جدوجہد کبھی پوری نہ ہونے والی ایک ہوس کے زیرِ تحت ہوتی ہے ——— منافع اور منافع، منافع ہی منافع ——— پہلے معاشی جِدوجہد کا چکّر اشیا سے بڑھ کر رُپے میں داخل ہوتا تھا اور رُپے سے نکل کر پھر چیزوں میں پہنچ جاتا تھا۔ اس کا اوّل آخر معلوم تھا، دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اب معاشی جدوجہد کا چکّر رُپے سے چلتا ہے، چیزوں میں جاتا ہے لیکن پھر رُپے میں واپس آنے کے لیے۔ پھر چیزیں، اور اور رُپیہ، بے حد رُپیہ، رُپیہ ہی رُپیہ۔ رُپیہ چیزیں پیدا کرنے کے لیے نہیں، رُپیہ پیدا کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ رُپیہ کاہے کے لیے ہے، اور رُپیہ پیدا کرنے کے لیے۔ اس کی کوئی منزل نہیں، اس کا کوئی منتہا نہیں۔ ایک سراب ہے، جس کا آخر نہیں ——— ہر سرمایہ دار کا یہی حال ہے۔ اس لیے نہیں کہ سرمایہ دار سب کے سب لالچی، خود غرض اور ہوس کے بندے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ وہ سرمایہ دار ہیں، وہ بے بس ہیں، لاچار ہیں۔ اپنی مشینوں کی دیکھا دیکھی وہ خود بھی مشین بن جاتے ہیں۔ جس کا کام منافع پیدا کرنا ہوتا ہے۔ صبح وشام، مہینے اور سال بھر، پھر سال بہ سال کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ، یہ منافع پیدا کرنے کی مشین چلتی رہتی ہے۔

یہ دُھن، مزید منافع حاصل کرنے کا یہ سودا، یہ بے پناہ اکتسابی جذبہ، نظامِ سرمایہ داری کا واحد محرک ہے۔ اس لیے اس نظام میں اس جذبے کی عملی تشکیل کے لیے ہر ممکن صورت موجود ہے۔ مکمل آزادی کا ہونا ضروری ہے۔ کسی کو یہ مجال نہ ہو کہ وہ اس جذبے کو محدود کرنے کا خیال بھی دِل میں لائے۔ حکومت اور سوسائٹی اس کو اُبھارنے اور بڑھانے کے لیے ہیں۔ اس کی راہ میں اڑکاڈیں

پیدا کرنے کے لیے نہیں۔ سرمایہ داروں کو آزادی ہو، کہ وہ جتنا چاہیں پیدا کریں اور جیسے چاہیں پیدا کریں۔ ان میں آپس میں مقابلہ ضرور ہوگا۔ لیکن آزاد مقابلہ ۔ جو سستے داموں مال تیار کرلیتا ہو، وہ بڑا سرمایہ دار ہو۔ اور چھوٹے سرمایہ داروں کو کچل دیتا ہو۔ بہ سبب اخلاقیات اور انسانیت کے لیے سرمایہ داری میں کوئی جگہ نہیں ۔ یہ سرمایہ دار کی آزادی کو محدود کرتے ہیں ۔ اس نظام میں تو صرف وہ چیز ہوسکتی ہو یا ہوسکتی ہو، جس میں کوئی معاشی قدر ہو۔ جس کا روپوں سے تبادلہ کیا جاسکے۔ جس کو بہی کھاتوں میں روپوں، آنوں، پائیوں کے ہندسوں میں ڈھال کر درج کیا جاسکے۔ (یہاں تک کہ سرمایہ دار کے بیوی بچے بھی بہی کھاتوں پر چڑھائے جاتے ہیں) انفرادیت اور مزید منافع کی ہوس دو پہیے ہیں ۔ اور ان پر سرمایہ داری کی گاڑی ہر رُکاوٹ کو کچلتی اور روندتی آگے بڑھے چلی جاتی ہو ——— اس کی منزل اُفق سے بھی دُور شاید کوئی جلتا ہوا دوزخ ہو۔ جس کو منافع کا ایندھن چاہیے ۔ اور جس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔

منافع کو بڑھانا ہو۔ اس لیے انسانی دماغ اور سمجھ اس مقصد کے حصول کے لیے جوتے جاتے ہیں۔ اور پیدائشِ دولت کا وہ طریقہ نکالا جاتا ہو، جس میں منافع زیادہ سے زیادہ ہو۔ معاشی جدوجہد کی یہ عقلی تنظیم پیدائشِ دولت کی موجودہ صورت پیدا کرتی ہو۔ جس میں کپڑا تیار کرنے کے لیے کپاس، چرخے اور کھڈی کی ضرورت نہیں ۔ بلکہ ہزاروں لاکھوں ٹن لوہے اور کوئلے کی ہو۔ بڑے بڑے سائنس دانوں انجنیروں اور بنکوں کی ہو۔ لاکھوں مزدوروں کی ہو اور جہازوں، ریلوں اور موٹروں کی ہو، تب کپڑا بنتا ہو۔ کپڑا مشینیں بناتی ہیں۔ مشینوں کو اور مشینیں بناتی ہیں ۔ اور ان مشینوں کو اور مشینیں ۔ علیٰ ہذا القیاس ۔ ان سب مشینوں کے بنانے کے لیے لوہا، کوئلہ اور مزدور درکار ہوتے ہیں ۔ ان کو خریدنے کے لیے سرمایہ ۔ جو بنکوں سے آتا ہو۔ انجنیروں کی ضرورت قدم قدم پر پڑتی ہو۔ سیکڑوں بڑی بڑی عمارتیں یہاں وہاں فیکٹریوں اور گوداموں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں ۔ پھر لوہے، کوئلے، کپاس اور مزدوروں کو، یا ان کی بنائی ہوئی چیزوں کو ادھر سے اُدھر منتقل کرنے کے لیے لامحدود ذرائع نقل وحمل چاہییں ۔ چناں چہ اب پیدائشِ دولت کے معاملے میں چٹ منگنی پٹ بیاہ کا اصول کام نہیں دیتا۔ پہلے تدبیر کی جاتی ہو۔ طویل عرصوں کے لیے، اور پھر اس تدبیر پر عمل ہوتا ہو۔ تب کہیں سرمایہ دار اپنی لاگت اور وصولی میں زیادہ سے زیادہ فرق ڈالتا ہو۔ پیدائشِ دولت کا یہ طریقہ لمبا ہو لیکن احمقانہ نہیں (سرمایہ دار سب کچھ ہوسکتا ہو احمق نہیں ہوسکتا۔) اس طریقے سے زیادہ دولت پیدا کی جاسکتی ہو۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اس طریقے سے زیادہ منافع حاصل کیا جاسکتا ہو۔

یہی وہ نظامِ سرمایہ داری ہو جس کو آزاد، فطرت کے قوانین کے مطابق، انسان کو اس کی جبلی قوتوں کے اظہار کا موقع دینے والا، اور انسان کی تخلیق کو معنی کا جامہ پہنانے والا کہا جاتا ہو ——— اس میں انسان آزاد ہے، اپنا بادشاہ۔ مثلاً ایک رُپیہ روز کمانے والا مزدور آزاد ہو۔ کہ اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنالے، یا انجنیر یا کسی بنک کا منیجر۔ اس کو خود بھی اختیار ہو کہ اپنی موجودہ جگہ پر ایک رُپیہ روز کی مزدوری کرے، یا قالینوں کی دُکان کرلے یا کوئی مل اور فیکٹری قائم کرکے لکھو کھا رُپیہ وار کمائے۔

یا ہزاروں ایکڑ زمین خرید لے اور اس کے لگان کی آمدنی سے کسی اچھے سے شہر میں یا کہیں سمندر کے کنارے یا کسی سرسبز پہاڑ کی چوٹی پر ایک خوش نما بنگلہ یا کوٹھی بنا کر رہے اور جب تک جئے، چین کی بنسری بجائے۔ کتنی آزادی ہے! کتنی خود مختاری ہے! لیکن باوجود اس کے سوائے معدودے چند انسانوں کے سب کے سب اپنی حماقت کے باعث مزدور اور غریب رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کو اسی وقت خوشی ملتی ہے اور اطمینان محسوس ہوتا ہے جب وہ روز آٹھ دس گھنٹے ملوں اور فیکٹریوں میں اپنے سے اونچے مزدوروں یا افسروں کی گالیاں سن سن کر کام کر لیتے ہیں۔ جب وہ اپنے بچوں کو بھی اپنی طرح مزدوری پر کام کرتا دیکھتے ہیں۔ جب مزدوری نہ ملنے کی صورت میں ان پر فاقے پڑتے ہیں اور ان کے سامنے ان کے ننھے ننھے بچے بھوک سے بلک بلک کر اور سسک سسک کر دم توڑتے ہیں۔ یہ آزادی نہیں تو اور کیا ہے!

یہ دعوا بھی کہ سرمایہ داری میں انسانی صلاحیتوں کو اُبھرنے کا پورا پورا موقع ملتا ہے۔ کتنا درست ہے! تبھی تو سرمایہ داروں کی نالائق اور اوباش اولاد عمر بھر رُپے میں کھیلتی رہتی ہے۔ جائداد کا کرایہ، کمپنیوں کے حصّوں کا منافع، بنکوں کا سود انھیں ہر حال میں ملے گا۔ کیوں کہ ان میں امیرانہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت ہے۔ مزدور کا بیٹا اپنے میں کوئی صلاحیت نہیں رکھتا۔ وہ لٹھ ہے، گنوار ہے۔ اس میں اور گائے بیل وغیرہ میں کیا فرق ہے! چناں چہ اس کی بازار میں قیمت لگتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے جانوروں کی یا جوتے کے نعل کی۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں میں محض سیکڑوں ہزاروں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے۔ کہ وہ دماغی کام کر کے اپنی روزی کمائیں۔ باقی سب قدرتاً باربرداری کے جانور ہوتے ہیں! سرمایہ دار جب اپنے دعوے کی دلیل میں اِکّے دُکّے کی مثال دے کر کہتے ہیں۔ کہ ان مواقع کی بہ دولت جو سرمایہ داری کا نظام سوسائٹی کے لیے مہیا کرتا ہے، ہر شخص ادنا درجے سے اعلا درجے تک پہنچ سکتا ہے۔ تو شاید وہ اپنے ضمیر کی آواز کی طرف سے کان بند کر لیتے ہوں گے۔

سرمایہ داری کے موافقین کا یہ کہنا کہ سرمایہ داری نے انسانی زندگی کو آسودہ کیا۔ (اس طرح سے کہ انسان کی فطری ضروریات کو مشینوں کی مدد سے کم سے کم وقت اور تھوڑی سے تھوڑی محنت لگا کر پورا کیا اور انسان کو اس چیز نے موقع دیا کہ وہ بقیہ وقت کو خالصتاً خوشی اور مسرّت کے حصول میں صرف کرے) اس حد تک صحیح ہے کہ اس نے چند افراد کو اپنی جائداد کا کرایہ کھا کر یا بنک میں پڑے ہوئے رُپے کی مدد سے یا کمپنیوں کے حصّوں کے منافع کی بدولت یہ موقع دیا۔ کہ وہ مختلف اصناف کے فنونِ لطیفہ پر پہلے سے زیادہ رُپیہ اور وقت صرف کر سکیں۔ چناں چہ سینما تھیٹر، ناچ و گانے، ٹینس اور گالف، مصوّری اور شعر و شاعری کے قدردان اکثر یہی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ اپنی زندگی کو حیوانیت سے نکال کر جس میں ہمیشہ اور ہر وقت تن کی فکر رہتی ہے، انسانیت کا جامہ پہناتے ہیں۔ جس میں دماغ اور رُوح کو سینچنا اور اُبھارنا منشائے قدرت ہے۔ ان لوگوں کو سرمایہ داری نے یقیناً زیادہ آسودہ حال بنا دیا ہے۔ اس لیے کہ اب ان کی تفریح و تفنّنِ طبع کے لیے زیادہ مواقع زیادہ صورتیں موجود ہیں۔ لیکن سوسائٹی پر کیا اثر پڑا؟

سوسائٹی میں ایسے لوگوں کا وجود بالکل ایسے ہی ہوتا ہے جیسے آٹے میں نمک۔ ان بے فکروں کے علاوہ بقیہ تمام افراد کے لیے روزی کا مسئلہ اب بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا پہلے تھا۔ بلکہ اکثر کے لیے تو یقیناً زیادہ اہم ہے۔ تفریح ان کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ سرمایہ داری نے ان کی زندگی کو خوب صورت نہیں بنایا گھناؤنا کر دیا ہے۔

یہ ہے سرمایہ داری کا نظام۔ اب مختصر طور پر یہ بھی معلوم کر لیجیے۔ کہ اس کا تعلق ہماری موجودہ بے بسی اور پریشانی سے کیا ہے۔ گویا بیسویں صدی کے بین الاقوامی تعلقات کے لیے سرمایہ داری کا نظام کس حد تک ذمے دار ہے؛ سرمایہ دار سرمایے کی جستجو میں سرگرداں ہر اس چیز کی پیدائش کا ذمہ لینے کو تیار ہے۔ جو بازار میں بک سکے۔ اور منافع بخش قیمت پر۔ افیون، شراب اور کوکین کو بھی وہ اتنی ہی تن دہی سے پیدا کرتا ہے جتنی تن دہی سے شکر کو یا نمک کو۔ کپڑے کو یا موٹر کار کو۔ چناں چہ جنگی اسلحہ جات، گولہ بارود، بندوقیں، توپیں وغیرہ بھی سرمایہ دار ہی بناتے ہیں۔ منافع کو بڑھانے کے لیے ان چیزوں کی پیدائش کا بھی وہی طریقہ نکالا جاتا ہے، جو دوسری عام مصنوعات کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ مشینیں، ان کو بنانے کی مشینیں، اور پھر اور مشینیں۔ اس پر بے حد سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ پیدائش تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ تھوڑے سے عرصے میں اس جنگی مال کے انبار لگ جاتے ہیں۔ صلح و امن کی صورت میں اس جنگی مال کی مانگ ایک حد تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس کے آگے نہیں۔ تمام ملک کو ہتھیار بند نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ ساز و سامان صلح کے زمانے کی ٹریننگ میں اتنی جلدی ضائع نہیں ہوتا۔ بندوقیں اور توپیں شب و روز استعمال نہیں ہوتیں۔ لیکن مانگ کی کمی سرمایہ داروں کے لیے تباہی کا پیغام ہے۔ وہ سرمایہ لگا چکے ہیں اب مال کو بکنا ہی چاہیے ——— اُدھر وہ سرمایہ دار جو منڈیوں کے لیے سامان بنا رہے ہیں۔ اپنے طویل لیکن زیادہ کامیاب اور نفع بخش طریقے سے مال کو زیادہ اور زیادہ مقدار میں بناتے چلے جاتے ہیں۔ ایک حد سے گزرنے کے بعد پرانی منڈیوں میں اس مال کی کھپت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے نئی منڈیاں چاہییں۔ ان نئی منڈیوں میں پہلے سے یہاں کے اپنے یا کسی آس پاس کے ملک کے سرمایہ دار قابض ہوتے ہیں۔ ان کو حاصل اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ جب یہاں کے اجارے دار سرمایہ داروں کو یہاں سے نکالا جائے۔ یہ آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ اُس طرف کے سرمایہ داروں کی پُشت پر ان کی حکومت بھی ہے ——— لیکن ایسا ضرور ہوگا۔ ورنہ پہلے ملک کے سرمایہ داروں کا دیوالہ نکل جائے گا۔ اور ان کے دیوالے سے ان کی حکومت دیوالیہ ہو جائے گی۔ — اسلحہ جات بنانے والے سرمایہ دار موقع کے منتظر تھے ہی ——— سرمایہ دار سرمایہ دار سب بھائی بھائی ہیں۔ ایک کے مفاد دوسرے کے مفاد میں مضمر ہیں۔ چناں چہ سب مل کر حکومت کی نکیل موڑ کر اس کو لڑائی کے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ ادھر جنگ کا اعلان ہوتا ہے اور اُدھر سرمایہ داروں کے ہاں گھی کے چراغ جلتے ہیں۔ ان کی بن آئی۔ اب خوب منافع ہوگا۔ لڑائی جتنی بڑھے جتنی پھیلے اتنا ہی اچھا ہے ——— ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم، اٹلی اور حبشہ کی لڑائی، جاپان اور چین کی لڑائی، اس کے بعد ابھی کل کی جنگِ عظیم ہمارے سامنے کے واقعات ہیں۔ ان سب کا ایک ہی رنگ تھا۔ ایک ہی سبب۔ یہ لڑائیاں منڈیوں کے لیے ہوئیں۔ یا جنگی ساز و سامان تیار کرنے والے سرمایہ داروں کی کوششوں سے ہوئیں یا دونوں وجوہ سے ہوئیں۔ حکومتوں کی قومیت پسندی بذاتِ خود کوئی وجہ نہیں۔ جرمنی کا ہٹلر، برطانیہ کا چرچل اور امریکہ کا روزویلٹ فقط اپنے اپنے ملک کے سرمایہ داروں کے علم بردار تھے۔

منصوبے بندی

منصوبے بندی اور تخلیق شدہ زر

از ---------- جناب امتیاز حسین خاں بی کام آنرز (لندن) ریڈر کامرس جامعہ عثمانیہ

پچھلے دو سال کے عرصے میں مختلف نقطہ ہائے نظر اور تصورات کو پیشِ نظر رکھ کر ملک کی معاشی ترقی کے لیے چند منصوبے تیار کیے گئے ہیں۔ ان منصوبوں کو کامیاب بنانے کی غرض سے جن مختلف ذرائع سے کام لیا جائے گا ان سے بھی بحث کی گئی ہے بیان کردہ ذرائع میں تخلیق شدہ زر کا مسئلہ سب سے زیادہ اعتراض کا مرکز بنا ہوا ہے۔ بمبئی پلان میں یہ کہا گیا ہے کہ سرکاری ہنڈیوں کی ضمانت پر ۳۴۰۰ کروڑ روپے کے برابر زر کی مقدار میں اضافہ کرکے ملک کے اندرونی وسائل کو کام میں لایا جاسکے گا اور پیدائشِ دولت بڑھائی جاسکے گی۔ ہندستانی معاشین کی ایک جماعت بمبئی پلان کے تیار کرنے والوں کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتی۔ ان کا کہنا ہے کہ زر اور اعتبار میں توسیع کرکے اشیا اور خدمات کی مقداروں میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہندستانی معاشین کے اس خیال کو تقویت دوسرے ممالک کے بعض مشہور معاشین کے نظریات سے ملتی ہے۔ ڈاکٹر ہائک موجودہ پروفیسر جامعہ لندن بھی زر اور اعتبار میں توسیع کے سخت مخالف ہیں۔ ان کے خیال میں معاشرے میں تمام خرابیاں اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ انھوں نے تجارتی چکر کا بہت ہی پیچیدہ نظریہ پیش کیا ہے۔ یہاں ان کے خیالات کو آسان طریقے اور اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ڈاکٹر ہائک اپنے نظریے کی ابتدا کامل روزگار کے حالات کے مفروضے سے کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں معاشرے میں توازن رہنے کی صورت میں معاشی ترقی کے لیے اختیاری بچتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اختیاری بچتوں کے پیدا ہونے کا سبب ضروریات پر صرف میں کمی ہے۔ اشیائے صرف

کی مانگ کم ہو جاتی ہو اور ان کی تیاری بھی کم کی جاتی ہو۔ اس طرح سے اشیاے صرف کی صنعتوں میں بعض عاملینِ پیدائش بے کار ہو جاتے ہیں۔ لوگ چوں کہ اپنی پس انداز کی ہوئی دولت کو بنکوں کے پاس فاضلات کے طور پر رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بنکوں کے وسائل میں اضافہ ہو جاتا ہو اور ان کی کم شرح سود پر قرض دینے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہو۔ اشیاے پیدائش تیار کرنے والے آجر بنکوں سے قرضے اور ان کی مدد سے عاملینِ پیدائش حاصل کر کے نئی نئی مشینیں وغیرہ تیار کرتے ہیں۔ جب نئی اشیاے پیدائش تیار ہو جاتی ہیں تو ان کی مدد سے کم مصارف سے اشیاے صرف کی زیادہ مقداریں تیار کی جاسکتی ہیں اور اس طرح سے عوام کا معیارِ زندگی بلند کیا جاسکتا ہو۔ ڈاکٹر ہائک کا خیال ہو کہ اس قسم کے حالات اس وقت پیدا نہیں ہوتے جب کہ لوگ اختیاری طور پر بچتیں نہ کر رہے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہو کہ معاشی ترقی ارادی طور پر زر اور اعتبار میں توسیع کر کے نہیں کی جاسکتی۔ بنک زر اور اعتبار میں توسیع شرحِ سود میں کمی کر کے کرتے ہیں۔ اشیاے پیدائش تیار کرنے والے آجر کم شرح سود پر قرض لے کر عاملینِ پیدائش کو اپنی طرف منتقل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ چوں کہ اشیاے صرف کی مانگ میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی۔ عاملینِ پیدائش بغیر ان کی قیمتوں میں اضافے کے منتقل نہیں کیے جاسکتے۔ عاملینِ پیدائش کی قیمتوں میں اضافے کا لازمی نتیجہ لوگوں کی آمدنیوں میں اضافہ ہوتا ہو اور وہ زیادہ قیمت دے کر اپنی ضروریات کی مختلف چیزیں خریدتے ہیں اور اس طرح سے زر اور اعتبار میں توسیع کا اثر قیمتوں میں اضافے کی شکل میں نمودار ہوتا ہو قیمتوں کا اضافہ ایسے افراد کو جن کی آمدنیاں مقررہ ہوتی ہیں اور جن میں عام طور پر ماہرینِ معاشیات بھی شامل ہوتے ہیں اپنے حقیقی صرف میں کمی کرنے پر مجبور کرتا ہو۔ وہ اپنی مقررہ آمدنی سے اشیا اور خدمات کی کم مقداریں حاصل کر سکتے ہیں اور اس طرح سے ڈاکٹر ہائک کے خیال کے بموجب معاشرے میں جبری بچت (FORCED SAVING) پیدا ہوتی ہو۔ ڈاکٹر ہائک کو اس کا یقین ہو کہ کسی صورت میں بھی معاشی ترقی اور خوش حالی ارادی طور پر زر اور اعتبار میں توسیع کر کے پیدا نہیں کی جاسکتی۔ جب کبھی ایسا کرنے کی کوشش کی گئی تو معاشرے کا معاشی توازن بگڑ جائے گا اور معاشی بحران سے دوچار ہو کر کساد بازاری کے مضر اثرات کو برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ نظریہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہو جب کہ معاشرے میں کامل روزگار (ایسے حالات جب کہ تمام عاملین پیدائش اپنی پوری صلاحیت سے کام پر لگے ہوں) کے حالات موجود ہوں اس نظریے کا اطلاق ایسے معاشرے پر جہاں کہ عاملین پیدائش کی بڑی بڑی مقداریں بے کار ہوں نہیں کیا جاسکتا۔ ضمناً اس کا تذکرہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جو لوگ اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں ان کی اکثریت ایسی ہو جو پچھلی جنگِ عظیم اور اس کے بعد کے افراطِ زر کے حالات سے خود بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی ممکن ہو ان کا یہ نظریہ انھی حالات کی پیداوار ہو۔

ڈاکٹر ہائک کے خیالات سے متاثر ہو کر اور دوسری جنگِ عظیم کے حالات کو دیکھ کر ہندستانی معاشین کا ایک گروہ زر اور اعتبار میں توسیع کی پالیسی کو معاشی منصوبے بندی کے سلسلے میں اختیار کرنے کا مخالف ہو۔ پروفیسر وکیل استاد معاشیات جامعہ بمبئی اس مخالفت میں پیش پیش ہیں ان کا کہنا ہو کہ جنگ کے دوران میں نوٹوں کی مقدار میں کئی گنا اضافہ کر کے حکومتِ ہند نے جنگی مصارف پورے کیے۔

اور ہندستانی معاشرے کو تاریخ میں پہلی مرتبہ افراطِ زر کے مضر اثرات سے دوچار ہونا پڑا اس لیے اس پالیسی کو جنگ کے بعد کی منصوبہ بندی کو کامیاب بنانے کے لیے کبھی بھی اختیار کرنے کی سفارش نہیں کی جاسکتی لیکن اس خیال کے حامی اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جنگ کے دوران کے حالات اور جنگ کے بعد کی منصوبہ بندی کے حالات میں بڑا فرق رہے گا۔ جنگ کے دوران میں زر کی مقدار تو بڑھائی گئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسے موثر ذرائع اختیار نہیں کیے گئے جن کی وجہ سے ملک کی معیشت کی اہم خامیاں دور ہوجاتیں اور عاملینِ پیدائش کو کام پر لگاکر پیدائشِ دولت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جاتا۔ زر کی مقدار میں چھ گنا اضافہ ہوا اور اس کے مقابلے میں پیدائشِ دولت مشکل سے ۲۰ فی صدی بڑھی۔ حکومتِ ہند کی صرف یہ کوشش تھی کہ جنگی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے زیادہ سے زیادہ وسائلِ زر کی مقدار میں اضافہ کرکے اپنی طرف منتقل کرلے۔ عوام کی ضروریات کے لیے چیزوں کی کم مقداریں رہ گئی ہیں حکومت نے قیمتوں وغیرہ پر کنٹرول قائم کرنے کی نہ تو شروع سے سعی کی اور نہ اُسے اس میں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ قیمتیں چڑھ گئیں۔ ان حالات کے بالکل برعکس معاشی منصوبہ بندی میں جب زر کی مقدار بڑھانے کی کوشش کی جائے گی تو اس کی غرض محض یہ ہوگی کہ بے کار عاملینِ پیدائش سے کام لے کر قومی آمدنی بڑھائی جائے تاکہ سرمایہ کاری کے ساتھ ساتھ زائد آمدنی سے بچتیں بھی حاصل ہوسکیں۔

جن لوگوں نے پچھلے دس سال کے معاشی ادب کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے سے تقریباً تین سال قبل لارڈ کینس نے اپنی مشہور کتاب لکھ کر معاشی دنیا میں ایک ذہنی انقلاب کی ابتدا کردی تھی۔ کینس نے اپنی اس کتاب میں بہت سے پرانے نظریات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس پرانے نظریے کہ کسی ملک میں معاشی ترقی کے لیے بچتوں اور تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے کی تردید کی ہے۔ وہ اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے کہ اگر کوئی ملک معاشی ترقی کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ لازمی ہے کہ پہلے بچتیں کی جائیں اور ملک میں ایسا طبقہ موجود ہو جو ان بچتوں سے کام لے سکے۔ لارڈ کینس کہتے ہیں کہ جب تک معاشرے میں کامل روزگار کے حالات پیدا نہ ہوں نئی سرمایہ کاری اپنے برابر بچتیں خود پیدا کرلیتی ہے۔ نئی سرمایہ کاری کی وجہ سے لوگوں کی آمدنیاں بڑھ جاتی ہیں اور زائد آمدنی سے بچتیں حاصل ہوجاتی ہیں۔ کامل روزگار کے حالات تک معاشرے میں بے کار عاملینِ پیدائش کی شکل میں سرمایے کا فنڈ سا موجود رہتا ہے۔ اس فنڈ کو زر کی مقدار بڑھاکر حرکت پذیر کیا جاسکتا ہے اور سرمایے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ لارڈ کینس کی رائے میں یہ ضروری نہیں کہ عدمِ مداخلت کی پالیسی اور خانگی اہتمام کے تحت سرمایہ کاری کی شرح ہمیشہ ایسی سطح پر رہے گی جو کامل روزگار کے لیے ضروری ہے اس لیے سرمایہ کاری پر حکومت کی نگرانی ہونی چاہیے۔ حکومت اگر ایک طرف شرحِ سود میں زیادہ سے زیادہ کمی کرکے سرمایہ کاری کی ترغیب دلائے تو دوسری طرف اسے روزگار بڑھانے کی غرض سے رفاہِ عامہ کے کاموں کو شروع کرکے سرمایہ کاری کو بڑھانے کی عملی سعی کرے۔

لارڈ کینس کے نظریے سے اس خیال کی کہ اگر عاملینِ پیدائش بے کار ہوں تو زر کی مقدار میں اضافہ کرکے پیدائشِ دولت

بڑھائی جاسکتی ہو تائید ہوتی ہو۔ اس خیال کے ثبوت میں چند عملی مثالیں بھی جدید معاشی تاریخ سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ جنگِ عظیم اور اس کے بعد کی خانہ جنگی کے دوران میں روس میں جو حالات نمودار ہوئے اس کی وجہ سے اس کی مالی اور معاشی حالت بالکل تباہ ہوگئی تھی اور عوام کا معیارِ زندگی چینی اور ہندستانی معیارِ زندگی کے برابر رہ گیا تھا۔ روس میں سرمایے کاری کی کمی تھی البتہ اہلِ روس کے پاس قدرتی وسائل اور محنت کی کسی طرح سے قلت نہ تھی۔ روسی حکومت نے اپنے یہاں منصوبی معیشت قائم کر کے چودہ سال کی مختصر سی مدت میں ملک میں معاشی انقلاب پیدا کر دیا اور زر اور مالیے کے تمام پرانے نظریات کو باطل کر دکھلایا۔ ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک زر کی مقدار (نوٹوں) پانچ گنا بڑھائی گئی تاکہ قدرتی وسائل اور محنت کو حرکت پذیر کیا جائے۔ بے کار عاملینِ پیدائش کو کام پر لگا کر بڑے بڑے صنعتی مراکز، ہزاروں کارخانے اور اجتماعی اور سرکاری مزرعے قائم کیے گئے۔ قومی آمدنی کئی گنا بڑھی یہ ضرور صحیح ہو کہ اس دوران میں روسی زر روبل کی اندرونی قدر قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہونے کی وجہ سے بہت گر گئی جس کا عوام کے معیارِ زندگی پر بُرا اثر پڑا۔ عوام کو منصوبے بندی کے دوران میں تکالیف اٹھانی پڑیں۔ ان تکالیف کا منجملہ اور اسباب کے سب سے اہم سبب یہ تھا کہ روسی حکومت کو سرمایہ دارانہ ممالک سے جنگ کے خطرے کی وجہ سے قومی آمدنی کا کافی حصہ جنگی تیاریوں پر صرف کرنا پڑا۔ اس کے باوجود عوام کو ان کی قربانیوں کا صلہ ملک کی صنعتی ترقی اور بے روزگاری اور جہالت کے خاتمے کی شکل میں ملا۔ جدید معاشی تاریخ میں روس کی صنعتی اور معاشی ترقی بہت حیران کن ہو۔ دوسری مثال عالمی کساد بازاری کے بعد جرمنی کی معاشی حالت سے ملتی ہو۔ اس وقت کی جرمن حکومت کو بہت سے مشکل مسائل کا سامنا کرنا تھا لیکن ان معاشی مسائل کی نوعیت روسی مسائل سے بالکل جدا تھی۔ جرمنی مالی حیثیت سے دیوالیہ ہو چکا تھا۔ البتہ اس کا حقیقی سرمایہ اور باہمارت عملہ محفوظ تھی۔ اس کے یہاں کساد بازاری کے بدترین دنوں میں بے روزگار مزدوروں کی تعداد ساٹھ لاکھ تک پہنچ گئی تھی ان مزدوروں کو کام پر لگانے کے لیے اس کے پاس خام مال کی کمی تھی نازی جماعت نے جنگی تیاریوں کے سلسلے میں منصوبی معیشت قائم کی۔ ڈاکٹر شاخت جرمنی کے مشہور ماہر مالیات نے اپنی پالیسی کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ معاشی اصول و قوانین تمام حالات میں صحیح ثابت نہیں ہوسکتے۔ ڈاکٹر شاخت ہی تھے جنھوں نے ۱۹۲۳ء میں افراطِ زر کی پالیسی کو روک کر مارک کی قدر کو استحکام دینے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں حالات بدلنے کی وجہ سے انھوں نے زر کی مقدار بڑھا کر ملک میں پیدائشِ دولت اور روزگار میں اضافہ کیا۔ عوام کی آمدنی اور اُجرتوں میں اضافہ ہوا۔ تجارتِ خارجہ اور مبادلاتِ خارجہ پر سخت قسم کی نگرانی قائم کر کے اشیاے خام کے اہم مسئلے کو حل کیا گیا۔ نہ صرف ملک میں معاشی توازن قائم ہوا بلکہ اس کی معاشی قوت اور پیدائشِ دولت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ یہاں اس کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہو کہ جرمنی میں منصوبے بندی کو کامیاب بنانے کے لیے روس کی طرح نوٹوں میں فوری اضافہ نہیں کیا گیا۔ جرمنی میں ہنڈیاں جاری کر کے زرِ بنک سے کام نکالا گیا۔ ملک میں نئے نئے کارخانے قائم کرنے کے لیے حکومت کے نئے قائم کردہ ادارے کی طرف سے روزگاری ہنڈیاں جاری کی

جاتی تھیں ان ہنڈیوں کے حاصل کرنے والے کاروباری بنکوں سے ان ہنڈیوں کی ضمانت پر قرضے لے سکتے تھے اور کاروباری بنک مرکزی بنک کے پاس ان ہنڈیوں پر بٹہ کٹا سکتے تھے۔ یہ ہنڈیاں جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے ایک خاص مقصد کو کام یاب بنانے کی غرض سے جاری کی جاتی تھیں جیسے ہی مقصد پورا ہو جائے ہنڈیاں ختم کردی جاتی تھیں۔ نوٹوں کی طرح یہ ہنڈیاں چلن میں زیادہ دنوں تک نہیں رہتی تھیں ہنڈی کے طریقے کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ پہلے سے نوٹوں کی بڑی مقدار جاری نہیں کرنی پڑتی تھی اور دوسرے مرکزی بنک کی طرف سے ضرورتاً نوٹ جاری کیے جاتے تھے۔ اس لیے نوٹوں کی زیادہ تعداد جاری کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جرمنی میں قیمتوں میں بہت تھوڑا اضافہ ہوا اور وہاں کے لوگوں کو روس والوں کی طرح منصوبے بندی میں کام یابی حاصل کرنے میں بہت زیادہ قربانیاں ادا نہیں کرنی پڑیں۔

روس کے پنج سالہ منصوبوں اور جرمنی کے چار سالہ منصوبوں میں کام یابی مقدارِ زر بڑھاکر حاصل کی گئی اس طرح سے جنگ کے دوران میں بھی جنگی مصارف کو پورا کرنے کے لیے منصوبی معیشت قائم کرنی پڑتی ہے اور حکومتیں زر کی مقدار بڑھا کر وسائل کو اپنی طرف منتقل کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ بے کار عاملینِ پیدایش سے کام لے کر جہاں تک ہو سکے پیدایشِ دولت بھی بڑھائی جائے۔ اس کے علاوہ زر کی مقدار بڑھنے کی وجہ سے لوگوں کے پاس جو زائد قوتِ خرید آجاتی ہے اس کو مختلف ذرائع (مثلاً راشننگ، اختیاری و لازمی قرضوں اور مختلف قسم کے محاصل) سے جنگی مصارف پورے کرنے کے لیے حاصل کر لیا جاتا ہے تاکہ اس کا قیمتوں پر کم سے کم اثر پڑے۔ جنگ میں کام یابی حاصل کرنے کی غرض سے حکومتِ برطانیہ تقریباً ۵۰۰۰ کروڑ روپے سالانہ صرف کرچکی ہے۔ دو سال کے عرصے میں حکومتِ برطانیہ نے جنگ پر اتنی رقم صرف کی جتنی بمبئی پلان میں پندرہ سال کے عرصے میں ملک کی معاشی ترقی پر صرف کرنے کا اندازہ پیش کیا گیا ہے۔ انگلستان میں معاشی کنٹرول اس قدر کام یاب ثابت ہوے کہ اتنے زیادہ مصارف ہونے اور کامل روزگار کے حالات ہونے کے باوجود افراطِ زر کے مضر اثرات پیدا نہیں ہوے۔ تھوک فروش قیمتوں میں کچھ تھوڑا سا اضافہ ہوا اور مصارفِ زندگی کے اشاری عدد میں بہت ہی تھوڑا اضافہ ہوا۔

منصوبی معیشت میں زر یا مالیہ اندرونی معاشی وسائل اور محنت کو حرکت میں لانے کا صرف ایک ذریعہ ہوتا ہے تاکہ بے کار عاملینِ پیدایش کو کام پر لگا کر پیدایشِ دولت میں اضافہ کیا جائے۔ پابند سرمایہ داری یا منصوبی معیشت کے تحت زر کی حیثیت اور اہمیت بدل جاتی ہے۔ جب تک معاشرے میں بے روزگار وسائل اور محنت موجود ہیں زر کی مقدار بڑھائی جا سکتی ہے اور منصوبے بندی کو کام یاب بنانے میں کسی قسم کی خرابی کے پیدا ہونے کا بہت کم امکان ہے۔ خام اشیا یا فنی محنت کی کمی منصوبے کو کام یاب بنانے کے راستے میں رکاوٹیں ڈال سکتی ہے۔ اصل میں منصوبے کے لیے قدرتی وسائل اور محنت درکار ہوتے ہیں اور ان دونوں کی ہندستان میں کمی نہیں۔ یہاں کامل روزگار کے حالات منصوبی معیشت میں شاید بیس سال تک پیدا نہ ہوسکیں اس لیے تخلیق شدہ زر کا ذریعہ

منصوبے کو کام یاب بنانے کے لیے اختیار کیا جاسکتا ہی۔ مزید برآں یہ یقین ہو کہ اگر ملک کی صرف ارادی بچتوں پر بھروسہ کیا گیا تو منصوبے میں کام یابی حاصل نہیں کی جاسکتی اور ملک کی بے روزگاری اور غربت کو شاید کبھی بھی دُور نہ کیا جاسکے۔

تخلیقِ زر کی پالیسی کو اختیار کرنے میں افراطِ زر کا خطرہ اسی صورت میں لگا رہتا ہی جب کہ حکومت پیدائشِ دولت، صرفِ دولت اور تقسیمِ دولت وغیرہ پر پوُری طرح سے اپنا کنٹرول قائم نہ کرے۔ اس قسم کا کنٹرول منصوبی معیشت کی ایک لازمی شرط ہی نئی سرمایہ کاری اور چیزوں کی تیاری کے درمیان وقفہ ہوتا ہی چیزیں تیار کرنے میں وقت لگتا ہی لیکن سرمایہ کاری کے ساتھ ساتھ لوگوں کی آمدنیوں میں فوری اضافہ ہوجاتا ہی اور ظاہر ہی کہ آمدنی بڑھنے کی وجہ سے ہر شخص کی یہ بھی کوشش ہوگی کہ اپنے صرف میں اضافہ کرے۔ چیزوں کی مقدار میں فوری کوئی اضافہ نہیں ہوتا یا دُوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہی کہ پیدائشِ دولت صرفِ دولت کا ساتھ نہیں دے سکتی اس لیے چیزوں کی قیمت کا بڑھنا لازمی امر ہی۔ زر کی مقدار بڑھنے اور چیزوں کی تیاری میں جتنا زیادہ طویل وقفہ ہوگا اتنا ہی قیمتوں کے بڑھنے کا خطرہ بھی زیادہ لگا رہے گا۔ اس قسم کے حالات اسی وقت پیدا ہوسکتے ہیں جب کہ ہم یہ فرض کرلیں کہ حکومت معاشی کنٹرول قائم نہیں کرتی یا اسے کنٹرول میں پوُری کام یابی نہیں ہوتی۔ منصوبی معیشت کے تحت قومی معیشت کا ہر شعبہ حکومت کی نگرانی کے تحت ہونا لازمی ہی۔ منصوبے بندی کے عبوری دَور میں قومی معیشت کے ہر شعبے پر کنٹرول قائم کرنے کا سب سے اہم سبب یہ ہوتا ہی کہ معاشرے کے کسی ایک طبقے کو بہت زیادہ مصیبتیں نہ اُٹھانی پڑیں۔ قیمتوں پر نگرانی، ذخیرے اندوزی اور چور بازار کو منصوبی معیشت میں روکنے کی غرض غریب طبقے کو مشکلات سے بچانا ہوتی ہی۔

جنگ کے دوران میں مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں نے مختلف قسم کے جو معاشی کنٹرول قائم کیے اور جس حد تک انھیں کام یابی حاصل ہوئی اس کو دیکھتے ہوے یہ کہنا مشکل ہی کہ حکومت کی موجودہ ہیئتِ ترکیبی منصوبے بندی کے دوران میں معاشی کنٹرول کو کام یاب بنا سکے گی۔ اس کے لیے مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں پر عوام کے حقیقی نمایندوں کا اقتدار ہونا ضروری ہی۔ مزید برآں ملک کی موجودہ سول سروس جس کے سپرد معاشی کنٹرول کے انتظامی اُمور کیے گئے تھے اپنے فرائض انجام دینے میں بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ ایک نئی معاشی سول سروس کا قیام بھی بہت ضرُوری ہی۔ نئی سول سروس کی تعلیم و تربیت معاشی مسائل کے انتظامات کی غرض سے ہونی چاہیے۔ منصوبے بندی کے تحت ملک کی اہم اور کلیدی صنعتیں حکومت کی ملکیت میں ہوں گی۔ اور بہت سی دُوسری صنعتوں پر حکومت کا کنٹرول ہوگا۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کے معاشی کنٹرول کو کام یاب بنانے کے لیے بھی انتظامی عہدے داروں کی ایک بڑی تعداد درکار ہوگی۔ جس طرح سے فنی مزدوروں کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص طور پر توجہ کی جارہی ہی اسی طرح سے نئی سول سروس قائم کرکے اس کی تعلیم و تربیت کی طرف جلد سے جلد توجہ کرنے کی ضرورت ہی تاکہ منصوبے بندی کو کام یاب بنانے کے لیے تربیت یافتہ انتظامی عہدے داروں کی کمی نہ پڑے۔ ان انتظامی عہدے داروں میں کارکردگی، دیانت اور خدمت کا جذبہ ہونا چاہیے۔

تخلیق شدہ زر کی پالیسی کو کام یاب بنانے کے لیے ملک کے نظامِ بنک کاری میں بعض اہم تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ ان تبدیلیوں کے سلسلے میں مندرجہ ذیل چند تجاویز اختصار کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ نوٹوں کی مقدار بڑھانے کے بہ جائے زرِ بنک میں توسیع کی پالیسی کو کام یاب بنانا چاہیے اس کے لیے جرمن طریقے کو اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے۔ روزگاری ہنڈیاں جاری کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے ایک علاحدہ ادارہ قائم کیا جائے۔

۲۔ تخلیق شدہ زر کی پالیسی کو کام یاب بنانے کے لیے ہندستان کے نظامِ بنک کاری میں اہم تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اب تک بنک کاری نے ملک کی صنعتی اور زرعی ترقی میں بہت کم مدد کی ہے۔ ریزرو بنک کی حیثیت محض نمایشی بن کر رہ گئی ہے۔ وہ تمام اہم فرائض جو دوسرے ممالک کے مرکزی بنک انجام دیتے ہیں یہاں کا مرکزی بنک انجام نہیں دے رہا ہے۔ اپنے موجودہ دستور کے تحت ریزرو بنک شرح سود اور قیمتوں پر نگرانی قائم نہیں کر سکتا اس کے لیے اس کے دستور میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ ریزرو بنک کے قیام کے وقت ہندستان کے نمایندوں کی اکثریت حکومت کا بنک قائم کرنے کی حمایت میں تھی لیکن اس کے باوجود اسے حصے داروں کے بنک کی حیثیت سے قائم کیا گیا۔ اب جب کہ بنک آف انگلینڈ کو حکومت کا بنک بنانے کا مسودۂ قانون پارلیمنٹ میں پیش ہو چکا ہے حکومتِ ہند کو بھی ریزرو بنک کی ہیئت بدل کر حکومت کا بنک بنانے میں عذر نہ ہونا چاہیے۔

۳۔ کاروباری بنکوں کی بھی نئے سرے سے تنظیم ہونی چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے بنکوں کو ختم کر کے بڑے بڑے چند بنک قائم کیے جائیں اور شاخ داری بنک کاری کو فروغ دینا چاہیے تاکہ بنک کاری میں غیر ضروری مقابلہ ختم ہو جائے اور ان کی کارکردگی بڑھ کر ان کے زیادہ وسائل سے ملک کی صنعتی اور زرعی ترقی میں مدد مل سکے۔ عوام کو چھوٹے چھوٹے بنکوں پر اعتماد نہیں ہوتا اور اسی لیے وہ بنکوں میں اپنی امانتیں رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ بڑے بڑے بنک قائم ہونے کی وجہ سے اس قسم کا اعتماد خود بہ خود قائم ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اگر امریکہ کی طرح ایک خاص حد تک امانتوں کے بیمے کا طریقہ بھی قانوناً رائج کر دیا جائے تو اعتماد قائم کرنے میں اور بھی زیادہ سہولت پیدا ہو جائے گی اس طرح سے کاروباری بنکوں کو زیادہ امانتیں مل سکیں گی اور انھیں اپنی موجودہ پالیسی کو بدل کر صنعتوں کو کم مدتی قرضوں کی سربراہی کرنی چاہیے۔

۴۔ صنعتوں کو طویل المدت قرضوں کی فراہمی کے لیے ملک میں صنعتی بنکوں کا قیام بھی ضروری ہے۔ اس قسم کے بنکوں کو قائم کرنے کا مطالبہ ایک عرصے سے کیا جا رہا ہے۔ انتظامی ایجنسی کے طریقے کی افادیت ختم ہو چکی ہے اس کی وجہ سے صنعتوں کی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس طریقے کو جلد سے جلد ختم کر کے بھاری اور کلیدی صنعتوں کے لیے طویل المدت

قرضے فراہم کرنے کی غرض سے ایک کل ہند صنعتی بنک قائم کرنا چاہیے۔ اس بنک کا سرمایہ ریزرو بنک، دوسرے کاروباری بنک اور بیمہ کمپنیاں وغیرہ فراہم کریں اور اس کا انتظام ایک ایسے بورڈ کے سپرد رہے جس میں ان سب کی نمایندگی کی گئی ہو۔

۵۔ چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے ہر صوبے میں علاحدہ ایک صنعتی بنک قائم کرنے کی ضرورت ہی اب تک ان صنعتوں کو حکومت کی طرف سے مالی امداد دینے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہی اس میں کچھ بہت زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہی۔ یہ طی شدہ امر ہی کہ اس کام کو بنک ہی زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے سکتا ہی۔ صوبجاتی صنعتی بنکوں کی حیثیت بھی نیم سرکاری ہونی چاہیے۔ ان کے سرمایے کا ایک حصہ وہاں کی حکومت فراہم کرے اور بقیہ سرمایہ اداروں اور افراد سے حاصل کیا جائے۔

صنعت اور کاروبار پر حکومت کی نگرانی

از :— "معاشی"

اس مضمون کا موضوعِ بحث یہ ہے کہ حکومت کس طرح ذاتی ملکیت پر قابو رکھ سکتی ہے، اور حکومت کی رہ نمائی کا کام کیوں کر انجام پا سکتا ہے۔ بغیر ملکیت کے حقوق کو ختم کیے کس طرح ایسا انتظام کیا جائے کہ عوام کا فائدہ ہو۔

حکومت کے کنٹرول کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں: (۱) قانون کے ذریعے نگرانی کی جائے (۲) حکومت براہِ راست انتظام کرے (۳) نمایندگی کے حقوق کے ذریعے کنٹرول کرے (۴) یا اشتراک سے کام لیا جائے۔ ذیل میں مثالوں کے ذریعے ان کی وضاحت کی جائے گی۔

قانونی کنٹرول

قانونی کنٹرول کا مفہوم یہ ہے کہ حکومت قوانین کے ذریعے بعض معاشی مقاصد کے حصول کی کوشش کرے۔ یہ قوانین کم و بیش دائمی ہوں اور انتظام کی ہر شاخ پر ان کی پابندی یکساں طور پر لازم ہو۔ ایسے قوانین کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اُن کے ذریعے اس عام ڈھانچے میں ترمیم و تبدیلی کی کوشش کی جاتی ہے جن کے ماتحت کمپنیاں اپنے کام انجام دیتی ہیں۔ ان قوانین سے روزمرہ کے انتظامی معاملات سے بھی تعرض نہیں کیا جاتا۔ عموماً ایسے قوانین منفی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ یعنی کیا نہیں ہونا چاہیے اس پر زیادہ توجہ کی جاتی ہے اور کیا ہونا چاہیے اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ فیکٹری سے متعلق جو قوانین موجود ہیں اور اسی قسم کے بہت سارے قوانین مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بعض اوقات اتفاقی حادثات کا مثلاً جنگ سے پیدا شدہ حالات

کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی حکومت قانونی کنٹرول عمل میں لاتی ہے۔ راشننگ اسی قسم کے براہِ راست کنٹرول کی ایک مثال ہے۔ ایسی صورتوں میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ کنٹرول کا مقصد بہت ہی واضح اور متعین ہو۔ لیکن قوانین کی مدد سے عارضی قلت کا مقابلہ کرنا یا لوگوں کو انتہائی محنت و مشقت کے لیے مجبور کرنا مشکل ہے۔

ظاہر ہے کہ حکومت کی نگرانی کے تمام مسائل امن کے زمانے میں قوانین کی مدد سے حل نہیں ہو سکتے۔ ایسے قوانین جنھیں اکثریت کی مدد اور ہمدردی نہیں حاصل ہوتی حالات کو بد سے بدتر کر دیتے ہیں۔ خصوصاً جب ان کا مقصد کاروباری طبقے کی آزادیٔ عمل پر کسی قسم کی پابندی لگانا ہوتا ہے۔ جنگ کے زمانے کا تجربہ اس بات کا شاہد ہے۔ معمولی جرائم سے متعلق جو قوانین ہوتے ہیں ان کے ذریعے یہ فیصلہ کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے کہ جرم کا ارتکاب ہوا ہے یا نہیں۔ سوال صرف مجرم کے پتا لگانے کا رہ جاتا ہے۔ لیکن معاشی مسائل یا تجارتی لین دین کے رواج یا دستور پر جو پابندی لگائی جا سکتی ہے وہ اس مقصد سے کہ عوام کے مفاد کی حفاظت ہو سکے۔ اور "عوام کے مفاد" کا یقین کوئی آسان کام نہیں۔

براہِ راست انتظام حکومت کی نگرانی کبھی ایسے قوانین کے ذریعے بھی ہوتی ہے جو عارضی اور متعین مقاصد کے لیے ہوں۔ اسے ہم انتظامی نگرانی کہہ سکتے ہیں ایسے قوانین کا مقصد کسی ہنگامی ضرورت کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے اور ان کا اطلاق سب پر نہیں بلکہ خاص خاص جماعتوں پر ہوتا ہے۔ لائسنس کا رواج، خاص خاص باتوں کی اجازت دینا، حکومت کی طرف سے امداد مہیا کرنا، وغیرہ یہ تمام چیزیں اسی ذیل میں آتی ہیں قومی شرحِ اُجرت کا نفاذ قانونی کنٹرول کے تحت آتا ہے لیکن مختلف صنعتوں کے لیے الگ الگ شرحوں کا نفاذ انتظامی نگرانی کے تحت ہوتا ہے۔ دونوں کا فرق معمولی سا ہے لیکن واضح ہے۔ حکومت کسی مخصوص کمپنی کو اس پر مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اپنے پیٹنٹ کے حقوق میں کسی دوسری کمپنی کو شریک کرے یا پھر ایسا قانون بھی پاس کر سکتی ہے جو اسے لازمی کر دے تاکہ متعلقہ صنعت میں حصہ لینے والی ہر کمپنی قانوناً ان حقوق کا استعمال کر سکے۔ صنعتوں کی قانونی نگرانی عموماً منفی قسم کی نگرانی ہوتی ہے یعنی قانوناً حکومت کسی کام کو کرنے سے روک سکتی ہے لیکن انتظامی نگرانی میں حکومت نہ صرف بعض اُمور کو روک سکتی ہے بلکہ ساتھ ہی کسی کام کو کرنے پر مجبور بھی کر سکتی ہے۔

انتظام کے ذریعے حکومت جو نگرانی عمل میں لاتی ہے وہ سب سے موثر ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں یہ خوبی بھی ہے کہ جلد سے جلد اسے حالات کے مطابق بدلا اور ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس کے اثرات جلد نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ انتظام کا طریقہ پُرپیچ نہیں بلکہ بالکل سیدھا سادا سا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بعض خرابیاں بھی ہیں۔ جن افسروں کے ہاتھ میں انتظام کی باگ ڈور ہوتی ہے وہ من گھڑت قسم کے کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بے ایمانی اور رشوت ستانی کا بازار بھی گرم ہو جاتا ہے۔ ذمّے دار عہدے داروں اور کمپنی کے منیجروں کے درمیان ذمّے داری تقسیم ہو جاتی ہے اور ان کے الگ الگ فرائض پوری پوری طرح متعین نہیں ہوتے اس طرح کام میں سہولت نہیں رہتی۔

آزاد قسم کے سماج میں روزمرہ کے معاملات میں کسی سرکاری عہدے دار کی مداخلت لوگ خوشی سے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے ایک تاجر یا کاروباری آدمی یہ تو خوشی سے قبول کرے گا کہ کسی غیر سرکاری آدمی کو اس کا شریک کار بنا دیا جائے اور فرائض اور ذمے داریوں کی واضح طور پر حدبندی کر دی جائے لیکن وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ہر دم ہر کام کے لیے اجازت حاصل کرنے کے واسطے سرکاری افسروں کے دروازے کا طواف کرتا رہے۔

نمایندگی انتظامی احکامات کے ذریعے معاشی کنٹرول کی دقتوں اور کمزوریوں سے بچنے کا ایک ذریعہ یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت پرائیویٹ کاروبار میں اپنے نمایندے مقرر کرے۔ اس سلسلے میں ایک تجویز تو یہ پیش کی گئی ہے کہ حکومت خاص قسم کی کمپنیوں اور تمام اجارے داری کی انجمنوں اور اداروں کے صدر کا تقرر کرے۔ اس سے بھی زیادہ دور رس تجویز یہ ہے کہ ہر کمپنی کے منتظمین میں کم سے کم دو ایسے آدمی مقرر ہوں جن کا اس کمپنی میں کوئی حصہ یا فائدہ نہ ہو تاکہ وہ عوام کے مفاد کی نگرانی کر سکیں۔

اس قسم کی تجویزوں سے بعض اہم مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں ان پر بحث کا موقع نہیں۔ پسندیدگی یا ناپسندیدگی سے قطع نظر ان میں ایک بڑی کمزوری ہے۔ فرض کیجیے کہ صدر خود اسی صنعت کا آدمی ہو اور ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں کیوں کہ صدر کے تقرر میں لازمی طور پر اس مخصوص صنعت سے واقفیت کو بہت اہمیت دی جائے گی۔ چناں چہ ہو سکتا ہے کہ جب عوام اور اس مخصوص صنعت کے مفاد میں کوئی تصادم کی صورت پیدا ہو تو وہ شعوری یا لاشعوری طور پر محض اس صنعت کے مفاد کو ترجیح دے۔ اور اگر صدر ایسا آدمی ہے جو اس مخصوص صنعت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ عدم واقفیت کی وجہ سے وہ بہ حیثیت صدر کے زیادہ موثر نہ ثابت ہو اور آسانی سے اُن لوگوں کے چکموں میں آجائے جو اس صنعت سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔

اشتراک جب حکومت کسی فرم کے لیے مالی مدد فراہم کرے گی تو لازماً اسے انتظام میں بھی دخل ہونا چاہیے۔ ایسی صورت میں بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ حکومت اپنے نمایندے مقرر کرے۔ اشتراک کی اس شکل کے علاوہ اور بھی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً دوران جنگ میں حکومت نے بعض اشیا کی خرید کا کل کام اپنے ذمے لے لیا تھا یعنی معاشی کارکردگی کے فرائض میں سے کچھ کو حکومت نے خود پورا کرنا شروع کر دیا۔ حکومت اس طرح پرائیویٹ فرموں کی مکمل اور موثر قسم کی نگرانی کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں حکومت کام کا معیار متعین کر سکتی ہے، پیداوار کے طریقوں پر اثر ڈال سکتی ہے اور مقدار، خوبی، قیمتیں، نفع اور خود پیداوار کی نوعیت یہ تمام باتیں حکومت کی نظر کے سامنے رہتی ہیں۔ ایسی صورت میں حکومت فرموں کے معاملات میں مداخلت کرتی ہے لیکن ایسی مداخلت میں اور انتظامی احکامات والی نگرانی میں بڑا فرق ہے۔ اول الذکر واقفیت پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ مداخلت ایسے خریدار کی مداخلت ہوتی ہے جو جانتا ہو کہ اسے کیا چاہیے اور اس کی قیمت بھی دینے کو تیار ہے۔ جنگ کے دوران میں جو ممالک لڑائی میں شامل تھے ان کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ طریقہ انتہائی موثر اور مکمل ہے۔ نگرانی کی مختلف شکلوں کا ہم نے مطالعہ کر لیا ہے۔ اس تجزیے کا منشا یہ نہیں ہے کہ ہم ان میں سے بعض کو ٹھکرا دیں اور بعض کو اختیار

کرلیں بلکہ مقصود یہ تھا کہ ان تمام طریقوں کے امکانات اور حدود ہمارے سامنے آجائیں۔ اُوپر جو کچھ کہا جاچکا ہی اس کا خلاصہ یہ ہی: قانون کے ذریعے پرائیویٹ فرموں کی نگرانی سب سے زیادہ "عام" نوعیت کی ہی۔ لیکن یہ سب سے کم موثر ہی۔ کوئی حکومت اگر محض اسی طریقے کو اختیار کرنے پر اکتفا کرے تو وہ عہدِ حاضر کے اہم ترین معاشی فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ اور نہ وہ موجودہ مسائل کو حل کرسکتی ہی۔

جنگ کے زمانے میں (جب معاشی زندگی پر نگرانی کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہی) دنیا کی حکومتوں نے ان چاروں طریقوں سے کام لیا۔ اور آخر میں یہ معلوم ہوا کہ ان چاروں میں سب سے زیادہ نتیجہ خیز وہ کنٹرول ہی جس کی اوپر کی سطروں میں "انتظام اور اشتراک" کے عنوانات کے تحت تشریح کی گئی ہی۔ لیکن انتظامی نگرانی میں بھی بعض ایسی خرابیاں ہیں جنھیں امن کے زمانے میں باقی رکھنا اُس وقت تک مناسب نہیں جب تک وہ ناگزیر نہ ہوجائیں۔ نمایندگی کے ذریعے پرائیویٹ فرموں پر نگرانی رکھنے کی دورانِ جنگ میں زیادہ کوشش نہیں کی گئی ہی۔ لیکن امن کے زمانے میں اس طریقِ عمل سے کام لیا جاسکتا ہی۔ اس میں نوکرشاہی کے بلاجانے بوجھے دخل درمعقولات دینے کا اندیشہ نہیں۔ کیوں کہ مختلف افراد کی ذمّے داریاں پہلے ہی واضح کردی جاتی ہیں۔ اور عوام کے مفاد کے تحفّظ کو بہانہ بناکر منیجر کی کارکردگی میں مداخلت نہیں کی جاسکتی۔ اس میں تو بعض منیجروں کو مقرر کرکے خود کارخانے کی پالیسی پر اثر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہی تاکہ وہ عوام کے مفاد کے خلاف نہ ہو لیکن اس میں ایک دقّت یہ ہی کہ ایسے لوگوں کا ملنا بعض اوقات مشکل ہوجاتا ہی جو پوری واقفیت بھی رکھتے ہوں اور مفادِ عامّہ کی مناسب نگرانی بھی کرسکیں۔

نوکرشاہی کا مسئلہ

نوکرشاہی کی نگرانی کے خلاف عام مخالفت کا جذبہ پایا جاتا ہی۔ نوکرشاہی کے ذریعے جو نگرانی کا انتظام ہوتا ہی اس میں سب سے بڑی خرابی اس کا سرُخا پن ہی۔ یعنی "الف" کو اگر "ب" سے کوئی معاملہ کرنا ہی تو اسے "س" سے اجازت لینی پڑتی ہی۔ حالاں کہ "س" کو اس معاملے سے کوئی واسطہ یا واقفیت نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں ذمّے داریوں کی ٹھیک طور پر تقسیم نہیں ہو پاتی اور فرائض کی غیر متعیّن تقسیم سے متعدد نقصانات پہنچتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہر جماعت نئی باتوں سے گھبرانے لگتی ہی کیوں کہ کسی کو بھی یہ ٹھیک طور سے نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے اختیارات یا ذمّے داریوں کے حدود کیا ہیں۔ دُوسرے اس میں دیر بھی لگتی ہی۔ کیوں کہ "تیسری پارٹی" کو معاملات سے کما حقّہٗ آگاہی نہیں ہوتی اور اسے اپنا فیصلہ دینے سے پہلے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے وقت کی ضرورت ہوتی ہی۔

مکمل واقفیت کے بغیر یہ بالکل صحیح ہی کہ موثر نگرانی ہو نہیں سکتی۔ اب اشتراک کے ذریعے نگرانی کی حمایت کرنے سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ حکومت ضروری معلومات کیوں کر حاصل کرسکتی ہی۔

یہاں بھی سب سے پہلی دقّت یہ ہی کہ معلومات جمع کرنے میں لازمی طور پر دیر لگتی ہی۔ اگر حکومت معاشی فرائض میں سے کچھ متعیّنہ فرائض اپنے ذمّے نہیں لے سکتی تو نگرانی کے لیے اسے جن باتوں کے متعلّق معلومات کی ضرورت ہوگی وہ صرف اس طرح حاصل کی

جا سکتی ہیں کہ حکومت خاص ذرائع استعمال کرے۔ عموماً یہ خاص ذرائع یہ ہوتے ہیں کہ حکومت کاروبار کرنے والوں کو مختلف فارم بھرنے اور مختلف معلومات فراہم کرنے کے لیے مجبور کرتی ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہو کہ حکومت کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کرتی ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہو کہ اس قسم کی حاصل کی ہوئی معلومات حقیقی "اندرونی" باتوں سے کم اہم ہوتی ہیں۔ پھر اس میں دیر بھی لگتی ہو۔ لیکن اگر حکومت خود کچھ فرائض اپنے ذمّے لے لے، مثلاً خود خریدار بن جائے یا کسی صنعت کی ذمّے داری اپنے ہاتھ میں لے لے تو اس قسم کی بہت ساری اندرونی باتیں اسے از خود معلوم ہو جاتی ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہو کہ پرائیویٹ فرموں کی موثر نگرانی میں دو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہو۔ ایک تو "نوکر شاہی"[1] کی مداخلت کے خلاف لوگوں کے دل میں عام تعصب پایا جاتا ہو۔ دوسرے اندرونی مسائل سے ناواقفیت نگرانی کو غیر موثر بنا دیتی ہو۔ لیکن اگر حکومت خود معاشی شغل کاری کی ایک شریک بن جائے تو نگرانی کا کام بہت سہل ہو جاتا ہو۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہو کہ کس کام میں حکومت کی شرکت سب سے زیادہ مفید اور موثر ہو سکتی ہو؟

نگرانی کے مقاصد قبل اس کے کہ ہم اس سوال پر غور کریں مناسب معلوم ہوتا ہو کہ نگرانی کے مقاصد متعین کر لیے جائیں۔ حکومت دو قسم کے فرائض انجام دے سکتی ہو۔ ایسی پالیسی اختیار کرنا جس سے مکمل باکاری (FULL EMPLOYMENT) کے حالات پیدا کیے اور برقرار رکھے جا سکیں۔ دوسرا فرض یہ ہو کہ مکمل باکاری کی 'نوعیت' پر حکومت اس طرح اثر ڈالے کہ ہمارا نظام عوام کو جو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہو، پہنچاتا رہے۔

مکمل باکاری کے حالات کے پیدا ہو جانے کے بعد معیارِ زندگی کے بلند اور بہتر ہونے کا دار و مدار فنی ترقیوں، بے کار چیزوں کو ترک کر دینے اور تقسیمِ دولت کی بہتری پر ہو۔ جنگ کے تجربے سے یہ بات معلوم ہوئی ہو کہ پیداوار میں زیادہ اضافہ کرنے کے لیے اور عوام کو حقیقی آسودگی مہیا کرنے میں ضرورت کے وقت ان ترکیبوں سے بہت کام لیا جا سکتا ہو۔ امن کے زمانے میں یہی نتائج کیوں کر حاصل کیے جا سکتے ہیں؟ مکمل باکاری کے قیام کے بعد حکومت کیوں کر معیارِ زندگی کی بہتری کی صورتیں پیدا کر سکتی ہو؟

اس مقصد کے حصول کے لیے پیداوار پر حسب ذیل پابندیاں لگائی جا سکتی ہیں:-

قیمتوں پر پابندیاں۔ ہر شخص اگر باکار ہو تو اس کے پاس کافی قوتِ خرید ہوگی۔ اس لیے مکمل باکاری کی صورت میں اشیا کی طلب زیادہ ہوتی ہو اور مستقل بھی۔ قیمتوں پر پابندی عائد کرنے سے مقصد یہ ہوتا ہو کہ بڑھی ہوئی طلب سے قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہونا نہ شروع ہو جائے۔ اگر ایسا ہونا شروع ہو گیا تو اس سے پیداوار اور روزگار دونوں پر غیر مناسب اثر پڑے گا۔

قیمتوں پر پابندی اس لیے لگائی جانی چاہیے کہ سرمایہ دار اور اجارہ دار مکمل "باروزگاری" یا "باکاری" کے حالات سے

---

[1] سوال یہ ہو کہ کس قسم کی نوکر شاہی سے لوگوں کے دل میں عام نفرت کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ ہر زمانے کی ہر نوکر شاہی سے؟ یا صرف غیر مقبول حکومت کی نوکر شاہی سے؟ کیا صحیح معنوں میں قومی حکومت کے افسروں کے خلاف بھی یہی جذبہ رہے گا؟ (مدیر)

فائدہ اُٹھا کر" صرفِ پیداوار" کی کمی کا فائدہ (جو بڑے پیمانے پر پیدا ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے) عوام اور مزدوروں کو نہ پہنچنے دیں گے۔ کارخانوں کی کارکردگی (EFFICIENCY) کی بھی حکومت نگرانی کرسکتی ہے تاکہ اجارے دار پیداوار کے ایسے طریقے باقی نہ رکھ سکیں جن میں خواہ مخواہ محنت اور سرمایہ ضائع ہوتا ہے۔ پیداوار کی خوبی اور اچھائی پر بھی حکومت کو اس لیے نظر رکھنی چاہیے کہ لوگ خراب اور گھٹیا چیزیں بیچ کر نفع نہ کما سکیں۔

(STANDARDIZATION) پیداوار کے معیاروں کا تعین اس لیے ضروری ہے تاکہ محض فرموں کی نہیں بلکہ ساری صنعتوں کی کارگزاری میں اضافہ ہو سکے۔

یہ تو ان خرابیوں کا تذکرہ ہوا جو موجودہ نظام کے تحت اشیا اور دولت پیدا کرنے کے طریقوں میں موجود ہیں لیکن پیداوار کی تقسیم میں اور بھی زیادہ نمایاں خرابیاں ہیں۔ ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنی چیزیں فروخت کرنے کی کوششیں، اشتہار بازی اور اس قسم کی اور بہت سی چیزیں ہیں جن سے قوم یا ملک کو بہت کم فائدہ پہنچتا ہے۔ چاہے یہ چیزیں خود کسی فرم کے لیے کتنی ہی ناگزیر اور مفید ہوں۔ "مینچسٹر گارجین" میں کسی مضمون نگار نے لکھا تھا: "ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ امریکہ میں خردہ اشیا کی قیمتوں کا ½ سے زیادہ حصہ وہ ہوتا ہے جو پیداوار کو کارخانے سے "صارفِ دولت"[1] تک پہنچانے میں خرچ ہوتا ہے۔ . . . بڑے پیمانے پر کامیاب طریقے سے مختلف چیزیں پیدا کرنے میں جو ترقی ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے "صرفِ پیداوار" میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے وہ ابھی تک تقسیمِ پیداوار میں حاصل نہیں کی جا سکی ہے۔ نتیجۃً پیداوار کے مصارف میں کمی سے خردہ قیمتوں پر محض معمولی اثر پڑ سکا ہے۔"

اس لیے حکومت پر دو فرائض عائد ہوتے ہیں (۱) صنعتوں کی کارکردگی میں اضافے کی کوشش اور قیمتوں اور نفع پر پابندی لگانا — (خاص کر ایسی صنعتوں میں جن میں اجارے کے قیام کے امکانات زیادہ ہوں) (۲) اور تمام سرمایہ دارانہ نظاموں کے اس رجحان کو ختم کرنا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی پیداواری صلاحیت کا خاصا بڑا حصہ اشیا کی نامناسب تقسیم میں ضائع ہو جاتا ہے۔

یہ بہت ہی مشکل قسم کی نگرانی ہے۔ کیا اس کو اس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے کہ نامناسب نتائج پیدا نہ ہو سکیں؟ اس سوال کا کوئی جامد قسم کا جواب دے دینا ظاہر ہے کہ بالکل بے فائدہ ہوگا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ فلاں چیز اتنی اچھی نہیں جتنا اسے ہونا چاہیے یا جتنی وہ ہو سکتی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اصلاح کی کوششیں کامیاب نہ ہوں گی۔ اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں ہو سکتی کہ خرابیوں کو دُور کرنے کی ترکیب خود خرابیوں سے زیادہ ضرر رساں نہ ثابت ہوگی۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پرائیویٹ صنعت اور کاروبار پر حکومت کی نگرانی کے قیام کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں تمام امکانات کا احتیاط اور عقل مندی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

---

[1] یعنی وہ لوگ جو پیداوار کو استعمال کرتے ہیں وہ خریدار جو اشیا بیچنے کے لیے نہ خریدیں بلکہ استعمال کے لیے۔

معاشی صورتِ حال

۱۔ سو روپیوں سے اوپر کے نوٹ

۲۔ ہندستان میں کوئلے کی صنعت

سو روپیوں سے اوپر کے نوٹ

از :— "ادارہ"

۱۲ر جنوری ۱۹۴۶ء کو حکومتِ ہند کی طرف سے ایک "حکمِ خاص" (ORDINANCE) جاری ہوا کہ ہندستان بھر کے بینک اور سرکاری خزانے تین بجے دن تک ہندستان کے ریزرو بینک کو یہ بتا دیں کہ ان کے پاس ۱۱ر جنوری کو سو رُپے اور اس سے زیادہ قیمت کے کتنے نوٹ تھے۔ اُسی روز حکومت کا ایک اور "حکمِ خاص" جاری ہوا جس کی رُو سے پانچ سو رُپے، ایک ہزار رُپے اور دس ہزار رُپے کے تمام نوٹوں کو منسوخ کر دیا گیا اور ۱۲ر جنوری کی تاریخ مقرر کی گئی کہ اس سے پہلے تمام لوگ جن کے پاس سو رُپے سے زیادہ قیمت کے نوٹ ہیں، بینکوں میں جاکر اپنے اپنے نوٹ بُھنا لیں۔ لوگوں کی آسانی کے لیے بعد میں یہ تاریخ بڑھا کر ۲۶ر جنوری کر دی گئی۔ ہر شخص کو جس کے پاس سو رُپے سے زیادہ قیمت کے نوٹ ہیں اور جو اُن کے بدلے سو رُپے یا اُس سے کم قیمت کے نوٹ حاصل کرنا چاہتا ہے ایک وضاحت نامہ (DECLARATION FOAM) بھر کر دینا ہے جس کا اصلی مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ اُس شخص کے پاس اتنی قیمت کے نوٹ کس طرح پہنچے۔ حکومت نے اپنے اس حکمِ خاص (ORDINANCE) کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا مقصد مُلک میں چور بازاری کا خاتمہ کرنا ہے۔ حکومت کی رائے میں رشوت اور چور بازاری (BLACK MARKETING) کا زیادہ تر معاملہ بڑی قیمتوں کے نوٹوں سے چلتا ہے۔ اس حکمِ خاص کے جاری ہونے سے یہ ہوگا کہ جن لوگوں کے پاس جائز طور پر اس قسم کے نوٹ جمع ہیں انھیں وضاحت نامہ بھر دینے کے بعد آسانی سے کم قیمتوں کے نوٹ

بدل جائیں گے، لیکن وہ لوگ جن کے پاس ناجائز طور پر پہنچے ہیں، رشوت کے طور پر یا چوربازاری کے ذریعے، وہ یا تو ان نوٹوں کو چھپا دیں گے یا پکڑے جائیں گے اور ان کی ناجائز طور پر کمائی ہوئی دولت حکومت اور ٹیکس افسروں کی نظر میں آجائے گی۔

اس سرکاری حکم کے جاری ہونے کے بعد لازمی طور پر چوربازاروں اور رشوت بازوں کی دنیا میں ایک کھلبلی مچ گئی، اُن لوگوں کو بھی ضرور فکر لاحق ہوئی جن کے پاس یہ نوٹ جائز طور پر پہنچے تھے لیکن اُن کے لیے بہت زیادہ پریشان ہونے کا اس لیے موقع نہیں تھا کہ وہ وضاحت نامے میں آسانی سے اپنی ملکیت کا جائز ہونا ثابت کرسکتے تھے۔ اگر آخری تاریخ کا تعین نہ ہوتا اور یہ حکم اچانک طور پر نہ جاری ہوتا تو غالباً انھیں اتنی تھوڑی سی پریشانی بھی نہ ہوتی۔ لیکن رشوت خوروں کے حلقوں میں اور چوربازاری میں اس سرکاری حکم کے جاری ہونے کے بعد جو واقعات رونما ہوئے وہ بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً خود منسوخ شدہ نوٹوں کی خرید فروخت کا "چوربازار" گرم ہوگیا۔ پانچ سو رُپے کے نوٹ چالیس فی صد کم قیمت پر بکنے لگے۔ ایک اندازے کے مطابق پانچ پانچ سو رُپے کے نوٹ کوئی دو ارب سے لے کر تین ارب کی تعداد میں چوربازاروں میں پہنچا دیے گئے تاکہ وہ "آمدنی ٹیکس" اور "زائد منافع" ٹیکس کی زد میں نہ آئیں۔ جب پہلا "حکمِ خاص" (ORDINANCE) جاری ہوا تو لوگ اپنے سو رُپے سے زیادہ کے نوٹ لے کر چاندی سونا خریدنے کے لیے دوڑ پڑے اور سونے کی قیمت دفعتاً ۷۵ رُپے سے ۹۶ رُپے ہوگئی۔ لیکن دوسرا "حکمِ خاص" جب جاری ہوا تو یہ بھگدڑ بند ہوگئی۔ بعض مقامات پر ہزار رُپے کی قیمت کے نوٹ پانچ سو یا چھ سو میں فروخت ہوئے۔ جب وضاحت نامے (DECLARATION FORMS) کافی تعداد میں نہیں ملنے لگے تو خود "وضاحت ناموں" کی خرید و فروخت کا چوربازار گرم ہوگیا اور ایک ایک وضاحت نامہ بیس رُپے سے لے کر سو رُپے تک کی قیمت کو بکنے لگا۔

اب ضرورت ہے کہ لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ اس سرکاری حکم سے مُلک کو فائدہ پہنچا یا نقصان۔ اس سلسلے میں ہم زیادہ تر دوسروں ہی کے خیالات اور ردِّعمل پیش کرنے پر اکتفا کریں گے جو متضاد ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپی سے بھی خالی نہیں ہے۔

کچھ بینکروں اور کاروباری لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اس سے چوربازاری کرنے والوں اور ذخیرے بازوں پر چوٹ پہنچی ہے اور ان کو عوام دشمنی کا خاطر خواہ بدلہ ملا ہے لیکن اُن میں سے کچھ نے یہ کہا کہ اس سے مُلک کی معیشت میں گڑبڑی پیدا ہوگئی ہے اور زیادہ تر اُن لوگوں کو نقصان پہنچ رہا ہے جنھوں نے اپنی جائز کمائی کی قلیل رقموں کو بڑے نوٹ کی شکل میں جمع کر رکھا تھا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد (ممبر کانگرس ورکنگ کمیٹی) نے بھی وہی بات کہی جو عام طور پر ذخیرے اندوزوں اور بڑی بڑی قیمتوں کے نوٹ رکھنے والوں کی طرف سے کہی جارہی ہے یعنی حکومت کے اِن احکام سے فائدے کی بجائے نقصان پہنچا ہے اور اس کا زیادہ تر متوسط طبقے اور نچلے طبقے کے لوگوں پر اثر پڑے گا۔ سردار پٹیل اور مسٹر کے۔ ایم۔ منشی نے بھی ذخیرے اندوزوں کی حمایت کرتے ہوئے ان احکام

کے نافذ ہونے کی مخالفت کی۔ کے۔ ام۔ منشی صاحب نے تو بمبئی ہائی کورٹ میں ریزرو بینک کے خلاف دعوا بھی دائر کر دیا اور بلا کسی شرط کے (یعنی وضاحت نامہ بھرے بغیر) چاندی کے سکّوں میں ایک ہزار رُپیے کے مبادلے کا مطالبہ کیا۔ اور اپنے ایک بیان میں یہ بتایا کہ حکومت نے ۱۲ جنوری والے احکام کے ذریعے ایک ہزار یا پانسو رُپے کے نوٹوں کا تبادلہ نوٹوں ہی کی شکل میں کرنے کا وعدہ کیا ہے، اور سکّوں کو نظر انداز کر دیا ہے حالاں کہ ریزرو بینک کے دستورِ اساسی کے مطابق ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اگر چاہے تو تبادلہ سکّوں کی شکل میں طلب کر سکتا ہے اور ریزرو بینک اس کا مطالبہ پورا کرنے پر مجبور ہے۔ مرہٹہ ایوانِ تجارت وصنعت (پونا) کی کمیٹی نے ایوانِ تاجرانِ ہند نے اور بنگال اور یوپی کے ایوانِ تجارت نے بھی حکومتِ ہند کے اِن احکام سے بددلی اور بیزاری کا اظہار کیا۔ یہ واضح رہے کہ ان ایوان ہائے تجارت وصنعت کی آواز ملک کے سرمایہ داروں اور ذخیرہ اندوزوں کی آواز ہے۔ پروفیسر جے۔ سی کمار اپا سکریٹری کل ہند انجمن صنائعِ دیہی (ALL INDIA VILLAGE INDUSTRIES ASSOCIATION) نے یہ فرمایا کہ ریزرو بینک گویا سلطنتِ برطانیہ کی "رہن کی دُکان" ہے جو کاغذی ٹکڑوں کی (یعنی نوٹوں کی) تجارت کرتی ہے۔ حکومتِ ہند نے گزشتہ احکام نافذ کرکے یہ دکھا دیا ہے کہ وہ خود اپنے عہد ناموں کو (یعنی نوٹوں کو) کاغذی ٹکڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ ہندستان کے مشہور مالکِ صنعت اور سرمایہ دار برلا صاحب نے بھی سرکاری احکام کی مخالفت کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اُن کے نفاذ سے اور بھی بہت سے چور بازار کھل گئے ہیں۔

کے۔ سنتھانم صاحب نے بھی اس سلسلے میں چند پتے کی باتیں کہیں جو قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ سو رُپے سے زیادہ کے نوٹوں کو منسوخ کر دینے سے کوئی ضروری نہیں کہ چور بازاری کرنے والوں، ذخیرہ اندوزوں اور رشوت خوروں ہی کو نقصان پہنچا ہو ممکن ہے ان میں سے بہتوں نے پہلے ہی بڑے بڑے نوٹوں کو کم قیمت کے نوٹوں میں تبدیل کر رکھا ہو۔ بڑی قیمتوں کے نوٹوں کے منسوخ ہو جانے سے مجرم اور معصوم دونوں قسم کے لوگوں کو پریشانی اور نقصان اُٹھانا پڑ رہا ہے۔ اس لیے کہ نوٹوں کا حصول جائز ثابت کرنے اور ان کا تبادلہ کرانے میں بے شمار دقّتیں حائل ہیں۔ پھر ان احکام کے نافذ ہونے سے مُلک کے پُورے مالی نظام پر بھی خراب اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اگر یہ بڑی قیمتوں کے نوٹ لوگوں نے تلف کر ڈالے یا ان کے حکومت کی نظر میں آجانے کے بعد ٹیکس وصول کیے جانے لگے تو تفریطِ زر (DEFLATION) کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ اور اگر پہلے کے جمع شدہ بہت سے زر کو دفعتًا چالو کرنے کی کوشش کی گئی تو اس سے افراطِ زر (INFLATION) کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اور دونوں صورتوں میں ملک کی معیشت میں بے چینی اور خلل رونما ہو گا۔ اس سے مُلک کی موجودہ مالی صورتِ حال کے دوبارہ بحال ہونے میں خواہ مخواہ کی تاخیر ہوگی۔ موجودہ زر پر لوگوں کا اعتبار بھی کم ہو جائے گا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ وائسرائے اور ممبرِ مالیات کی من مانی خواہش سے ہو رہا ہے، کیا یہ ممکن نہ تھا کہ یہ احکام نافذ کرنے سے پہلے وہ مرکزی اسمبلی کے ممبروں سے مشورہ کر لیتے؟

مندرجۂ بالا سطور میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے ہے جو اگر خود سرمایہ دار، چور بازاری کرنے والے، رشوت باز یا ٹیکس سے بچنے والے نہیں تو کم سے کم اُن کے حامی و مددگار ضرور ہیں۔ لیکن اس وقت ملک کے زیادہ تر سوچنے سمجھنے والے اور عوام دوست لوگ حکومت کے ان احکام کی تائید اور حمایت کر رہے ہیں۔ اُن کے خیالات کو بھی اگر مختصراً یہاں پیش کر دیا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔

ہمیں سب سے پہلے تو ان احکام کو اِس نظر سے دیکھنا ہے کہ یہ دراصل ابتدا ہے حکومت کی اُس پالیسی کی جو وہ ملک کے چند بے حد پیچیدہ اور فوری طور پر حل طلب مسائل کو سلجھانے میں اختیار کرنے والی ہے۔ حکومت نے پہلے تمام بینکوں سے یہ معلوم کر لیا کہ ان کے پاس مختلف قیمتوں کے کتنے نوٹ موجود ہیں۔ اس طرح اُسے اُن نوٹوں کا بھی اندازہ ہو گیا جو ذخیرے اندوزوں یا عام لوگوں اور ایجنسیوں کے پاس موجود تھے۔ اس کے بعد حکومت نے سو روپیوں سے اوپر کے نوٹ منسوخ کر دیے اور یہ شرط لگا دی کہ جن کے پاس زیادہ قیمتوں کے نوٹ ہیں وہ ایک وضاحت نامے میں یہ بتائیں کہ انھوں نے کیوں کر یہ نوٹ حاصل کیے۔ وضاحت ناموں والی شرط اس مقصد سے تھی کہ حکومت کے پاس بہت سی قیمتی معلومات اور اطلاعات کا ذخیرہ جمع ہو جائے گا جس کی بنیاد پر وہ رشوت بازوں، چور بازاری کرنے والوں اور ٹیکس سے بچنے والوں کے خلاف دیگر کارروائی کر سکتی ہے۔ اس طرح ان احکام کو نافذ کر کے حکومت نے عوام دشمن لوگوں کے خلاف گویا پہلی جنگ لڑی ہے جس میں اُسے پوری کامیابی حاصل ہوئی اس لیے کہ آہستہ آہستہ وہ تمام نوٹ جو ناجائز طور پر لوگوں کے پاس جمع ہوئے ہیں یقیناً حکومت کے پاس پہنچ جائیں گے۔ موجودہ ذہنی خلفشار اور بے چینی کی کیفیات میں نوٹوں کی چور بازاری (یعنی کم قیمتوں پر نوٹوں کی خرید و فروخت) کچھ زیادہ نہیں چل سکتی۔ عوام دشمنی کے خلاف حکومت کا یہ پہلا قدم تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت آیندہ کیا قدم اُٹھاتی ہے۔ یہ تو گویا محاذ کی تیاری تھی۔ باقاعدہ جنگ کی ابتدا تو اب ہوگی۔

حکومت نے پہلے یہ قدم کیوں اُٹھایا اسے سمجھنا مشکل نہیں۔ نوٹوں کے ذخیرے اندوزوں کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے اور عوام کو اُن کے پنجوں سے بچانے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ اُن کے ذخیروں کو اُن لوگوں کی ملکیتِ زر سے علاحدہ کیا جائے جن کے پاس زیادہ قیمتوں کے نوٹ جائز طور پر پہنچے ہیں۔ حکومت نے یہ احکام جاری کر کے گویا اچانک اس قسم کی تحقیقات شروع کر دی کہ کس کے پاس جائز نوٹ ہیں اور کس کے پاس ناجائز اور حکومت کے اس اچانک حملے سے عوام دشمن ذخیرے بازوں کا بچ نکلنا غیر ممکن ہو گیا۔ وضاحت ناموں کے ذریعے حکومت کے پاس جب تمام ضروری اطلاعات اور معلومات پہنچ جائیں گی اس کے بعد وہ یہ فیصلہ کرے گی کہ رشوت بازوں اور ذخیرے اندوزوں کے خلاف علاحدہ علاحدہ طور پر کیا کارروائی کی جائے۔

لیکن یہاں پر کچھ اور بھی ایسی پیچیدگیاں ہیں جن کا سمجھنا ضروری ہے۔ ان احکام سے یہ ضرور معلوم ہو جائے گا کہ کن لوگوں کے پاس چور بازاری کے ذریعے بہت سے زیادہ قیمتوں کے نوٹ جمع ہو گئے ہیں اور اس طرح وہ ٹیکس کی زد میں آجائیں گے لیکن اس سے

بہ جائے خود چور بازار کے کاروبار پر زیادہ مہلک اثر نہیں پڑے گا۔ جہاں تک رشوت بازوں کا تعلق ہے صرف بڑی بڑی رشوت بازیاں ہی گرفت میں آسکتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ ان احکام کے نفاذ کا اصلی مقصد اور اصلی فائدہ یہی ہے کہ وضاحت نامہ میں ممکن ہے حکومت کو بعض ایسی اطلاعات اور معلومات حاصل ہو جائیں جن کے ذریعے رشوت بازوں کے خلاف با اثر کارروائی کرنے کی اور بھی صورتیں پیدا ہو جائیں۔ غالباً انھی باتوں کی بنا پر جب بھولا بھائی دیسائی کی راے دریافت کی گئی تو انھوں نے حکومت کے اِن احکامات کی حمایت و تائید کی۔ برخلاف اس کے پٹیل، کے۔ ایم۔ منشی، راجندر بابو، برلا اور دیگر کانگریسی دیش بھگتوں نے وہی بات کہی جو عام طور سے چور بازاری کرنے والوں، رشوت بازوں اور ذخیرے اندوزوں کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے۔

ہندستان میں کوئلے کی صنعت

اِس وقت عام طور پر محسوس کیا جا رہا ہے کہ ہندستان میں اوّلاً تو کوئلے کے ذرائع کم ہیں اور جو ہیں بھی تو ان کے زیادہ سے زیادہ استعمال کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مُلک میں اعلا اور وسیع پیمانے پر اگر صنعتی ترقی کا پروگرام کام یاب ہو سکتا ہے تو صرف برقابی طاقت کی مدد سے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندستانی صنعتوں کو کوئلے کی ضرورت نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ابتداءً یعنی جب تک برقابی کی اسکیمیں پورے طور سے عمل میں نہیں آجاتیں اُس وقت تک صنعتوں کو جاری کرنے کے لیے کوئلے ہی سے مدد لینی پڑے گی۔

ہندستان میں کوئلہ کھودنے کی صنعت اس لیے ترقّی یافتہ نہیں ہے کہ اُس پر کافی توجہ نہیں کی گئی۔ کم مزدوری، غیر صحت مند ماحول، کانوں میں عورت مزدوروں سے کام لینا، وغیرہ وغیرہ یہ تمام خرابیاں بین الاقوامی مزدور دفتر (I.L.O) کی کوئلہ کان کمیٹی کی اس کانفرنس کے بعد بالکل پبلک کے سامنے آگئی ہیں جو ماہِ دسمبر میں لندن میں منعقد ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کروک شینک ہندستان کے جیالوجیکل (علمِ طبقات الارض سے متعلق) سروے کے ڈائرکٹر ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک بیان میں بتایا کہ سنہ ۱۹۳۹ء میں جتنا کوئلہ کھودا جاتا تھا اُس سے آج ۱۵ لاکھ ٹن کم کھودا جاتا ہے۔ اس وقت دھاتیں صاف کرنے (METALLURGICAL) کے کاموں کے لیے جتنا کوئلہ کھودا جاتا ہے اُس کی سالانہ مقدار ایک کروڑ سے لے کر ایک کروڑ بیس لاکھ ٹن تک ہے اور یہ مقدار ہندستانی صنعتی ضرورتوں سے کم ہے۔ ڈاکٹر کروک شینک نے یہ بھی پیشین گوئی کی ہے کہ پانچ سال کے اندر اندر جب مُلک میں صنعتی منصوبوں پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا تو ہندستان کی

ریلوں کو کوئلے کی زبردست کمی پڑ جائے گی۔

بہرحال اب کوئلے کی صنعت کی بہتر تنظیم اور اس کے ذرائع کو پورے طور پر کام میں لانے کی اہمیت محسوس کی جانے لگی ہے۔ اس وقت کوئلے کی صنعت سے متعلقہ مسائل یہ ہیں :- اعلا درجے کے دھات صاف کرنے کے (METALLURGICAL) کوئلے اور اسٹیم کوئلے کو کس طرح حفاظت سے رکھا جائے۔ کوئلے کے معادن کو ملکیت کے تحت ٹکڑوں میں تقسیم ہوجانے سے روکا جائے۔ کوئلے کی نئی کانیں کھودی جائیں۔ کوئلے کی صنعت سے متعلقہ معاشی مسائل حل کیے جائیں۔ کوئلے کی قیمتوں کا تعین کیا جائے۔ حکومتِ ہند نے ان مسائل پر غور وخوض کرنے کے لیے گزشتہ دسمبر میں ایک کمیٹی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے بھی حکومت نے کوئلے کی صنعت سے متعلقہ مسائل پر غور وخوض کرنے کے لیے تین بار کمیٹیاں بنائیں۔ ایک سنہ ۱۹۲۰ء میں، دوسری سنہ ۱۹۳۶ء میں اور تیسری سنہ ۱۹۳۷ء میں۔ ان کمیٹیوں نے جو سفارشیں کیں اُن میں سے بیش تر کو حکومت عمل میں نہ لاسکی۔ اور یہ بات حکومتِ ہند کی بہترین روایات کے مطابق بھی تھی۔ اس لیے کہ حکومتِ ہند کا فرض تو صرف پلان پر پلان اور کمیٹی پر کمیٹی بناتے چلے جانے پر ختم ہوجاتا ہے اور بس۔

ممکن ہے سر سیرل فوکس سابق ڈائرکٹر جیالوجیکل سروے (پیمایشِ طبقات الارض) کی سفارش کے مطابق اگر ہندستان کے معادن قومی ملکیت کے تحت آگئے تو اس سے کوئلے کی صنعت کی تقدیر بھی چمک اُٹھے۔ بغیر اس کے تو ترقّی کی صورت نظر نہیں آتی۔

———— ※ ————

تبصرہ

معیشتِ زر مطبوعہ مکتبۂ اُردو لاہور۔ مصنفہ جناب ابن الحسن صاحب بی۔ اے (آنرز) حجم ۳۶ صفحات۔ لکھائی چھپائی نفیس اور دیدہ زیب۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتا:۔ مکتبۂ اُردو لاہور۔

۳۶ صفحات کا یہ چھوٹا سا سُرخ رنگ کا نظر فریب پمفلٹ معاشیات کے ایک اہم موضوع یعنی "زر" (MONEY) سے بحث کرتا ہے "زر" ہر ملک کے معاشی نظام کا ایک بے حد ٹیکنیکل پہلو ہوتا ہے۔ زر بہ جائے خود انسانی تمدن کے پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہو جانے کی وجہ سے وجود میں آیا۔

ممکن ہے کافی عرصہ گزر جانے کے بعد ایک ایسا سماج پیدا ہو جس میں "اشیا" اور "انسان" کے درمیان "زر" حائل نہ رہے جس طرح تمدن سے پہلے یا اس کے ابتدائی دَور میں تھا لیکن آج کل تو "زر" انسان کی معاشی زندگی میں بہت بُری طرح داخل ہے بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کے اس انحطاط پذیر عہد میں "زر" معاشی زندگی کے علاوہ انسان کی اخلاقی اور جمالیاتی زندگی پر بھی تباہ کن انداز میں حاوی ہو رہا ہے۔

اس قدر معمولی لیکن اہم اور ہمہ گیر شے کی نوعیت کو فاضل مصنف نے جیسے سلیس، عام فہم اور جامع طور پر سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ خاص کر جب کہ اس کا دائرۂ بحث محض نظریوں (THEORIES) تک محدود ہے اور کسی خاص ملک کے نظامِ زر سے بحث نہیں کی گئی ہے۔

"معاشیات" کے قلمی و دیگر معاونین

مسرت کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ مندرجۂ ذیل حضرات نے رسالہ "معاشیات" کی قلمی اعانت کرنے یا دیگر شکلوں میں تعاون کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند صاحب، صدر شعبۂ معاشیات پٹنہ کالج، پٹنہ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، پرنسپل جامعۂ ملیہ دہلی۔ ڈاکٹر سردار اختر صاحب ام۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر معاشیات اسلامیہ کالج، لاہور۔ ڈاکٹر بول چند صاحب ام، اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر معاشیات بنارس ہندو یونی ورسٹی۔ اندر موہن کپور صاحب، پرنسپل ہیلی کالج آف کامرس لاہور۔ ڈاکٹر ال۔ سی۔ جین صاحب۔ پنجاب یونی ورسٹی لاہور۔ پروفیسر عبد الصمد صاحب پرنسپل

کامرس کالج، کلکتہ۔ ڈی۔ آر۔ گیڈگل صاحب پرنسپل تلک انسٹی ٹیوٹ پونا۔ ڈاکٹر پی۔ اس۔ لوک ناتھن صاحب ایڈیٹر "ایسٹرن اکانومسٹ" دہلی۔ پروفیسر پی۔ سی۔ جین صاحب الہ آباد، یونی ورسٹی الہ آباد۔ پروفیسر برج نرائن صاحب، سناتن دھرم کالج، لاہور۔ شیخ عطاء اللہ صاحب، ام۔ اے، استادِ معاشیات، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب پروفیسر معاشیات عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدرآباد (دکن)۔ مولوی فخرالحسن صاحب ام، اے، عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد (دکن)، پروفیسر پریم چند صاحب سابق پروفیسر رام جس کالج، دہلی۔ لطیف قریشی صاحب، پروفیسر اینگلو عربک کالج، دہلی۔ افتخار احمد مختار صاحب استادِ معاشیات اینگلو عربک کالج، دہلی۔ ابوسالم صاحب، ایم۔ اے (علیگ) سب اڈیٹر "ایسٹرن اکانومسٹ" دہلی۔ ڈاکٹر رام پرتاپ بہادر، ام۔ اے، ڈی فل استادِ معاشیات، الہ آباد یونی ورسٹی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)۔ مولوی ناصر علی صاحب۔ استادِ جامعۂ عثمانیہ۔ حیدرآباد (دکن)۔ مولوی اختر حسن صاحب۔ استاد جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)۔ عاقل صاحب استاد جامعۂ ملیہ، دہلی۔ سید منیر الہدیٰ صاحب، شعبۂ غذا، حکومتِ ہند۔ مولوی عبدالقادر صاحب بی۔ ایس۔ سی، آنرز (لندن) استادِ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)۔ مولوی باقر فریدی صاحب، ام۔ اے، انٹرمیڈیٹ کالج، ورنگل صاحب زادہ محمد عمر صاحب، جموں (کشمیر)۔ سید معین الدین قادری صاحب۔ بہار شریف، پٹنہ۔ مولوی امتیاز حسین خاں صاحب، استاد جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)، شیخ منظور قادر صاحب، بار ایٹ لا۔ لاہور۔ سریندر موہن صاحب، لائل پور۔ ڈاکٹر ام۔ ام جیند صاحب جوائنٹ سکریٹری شعبۂ غذا، حکومتِ ہند، ڈاکٹر احمد مختار صاحب ممبر لیبر تحقیقی کمیٹی، حکومتِ ہند۔ محمد یونس صاحب ام۔ اے، دفتر معاشی مشورہ کار، حکومتِ ہند، ڈاکٹر احمد حسین صاحب بی کام۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) ڈائرکٹر زرعی خرید و فروخت، حکومتِ بنگال —— پروفیسر مجید الدین صاحب علی گڑھ یونی ورسٹی۔ پروفیسر حسن محمد حسن صاحب علی گڑھ یونی ورسٹی۔ مسز فاطمہ اسلم خاں، ام۔ اے۔ مس حمیدہ نقوی، لکھنؤ۔ طفیل احمد خاں ام اے (الہ آباد) ایڈیٹر "معاشیات" دہلی۔

"ادارہ"

معاشیات

جلد ۱ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء نمبر ۳

فہرستِ مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱	امن اور قحط	ایڈیٹر	۲
۲	برطانیہ پر ہندستان کا قرضہ	ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اختر، ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی (معاشیات) (لندن)	۶
۳	جنگ کے بعد دنیا کا تجارتی چکر	ای۔ درگا	۱۲
۴	زر اور اس کا استعمال	حمیدہ نقوی	۲۰
۵	صنعتی و تجارتی انجمنیں	معاشی	۲۷
۶	معاشی صورتِ حال	ادارہ	۳۱
۷	تبصرہ	ادارہ	۴۸

اداریہ

امن اور قحط

از : ـــــــــ ایڈیٹر

جنگ کے ختم ہوتے ہی امن کا زمانہ نہیں شروع ہو جاتا۔ جنگ اور امن کے بیچ میں ایک عبوری دوَر حائل ہوتا ہے جو لازمی طور پر ہر قسم کی دقتوں اور مشکلات سے پُر ہوتا ہے۔ آج ہم اسی عبوری دوَر سے گزر رہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان مشکلات کو آسان نہیں بنا سکتے۔ اگر ایک غیر ذمے دار غیر ملکی حکومت ہمارے سروں پر نہ سوار ہوتی تو جنگ اور امن کے درمیانی زمانے کے مسائل بہت آسانی کے ساتھ حل کیے جا سکتے تھے اور ہماری معیشت میں اتنا خلل نہیں رونما ہوتا۔ لیکن جنگ کے فوراً بعد پیدا ہونے والی تکلیفوں کو جو چیز اذیت ناک بنا رہی ہے اس کا ایک یہ بھی سبب ہے کہ مرکزی حکومت جو چاہتی ہے کرتی ہے اور اسے عوام کے جذبات اور ارادوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

"معاشی صورتِ حال" کے کالم میں دیدِ نظر رسالے کے آخری صفحوں پر آپ دنیا کے دیگر ممالک کی غذائی صورتِ حال کا مطالعہ فرمائیں گے۔ آئیے اس وقت ہم مخصوص طور پر ہندستان کی غذائی قلت، اس کے اسباب اور اس سے نجات پانے کے مسائل پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ بدیشی سامراج نے بعد از جنگ کی معاشی دقتوں اور مشکلات کو ہمارے لیے کتنی خطرناک منزل پر پہنچا دیا ہے۔

اناج کی قلت ـــــــ یہاں پر ہمارے دماغ میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا واقعی اناج کی قلت ہے؟ ظاہر ہے کہ اناج اگر عام لوگوں کو آسانی سے میسر نہیں آتا چاہے بھوک سے مرتے ہوئے لوگوں سے صرف دو قدم کے فاصلے پر بنیوں، زمین داروں اور فوجی گوداموں

میں ہزاروں، لاکھوں من غلہ جمع ہو تو ہم ایسی صورتِ حال کو اناج کی قلت ہی سے تعبیر کریں گے۔ بہرحال یہ سوال تو بعد میں آئے گا۔ اس وقت ذرا یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ ملک میں اناج کی قلت کس حد کو پہنچ چکی ہے۔

صورتِ حال کا ایک عام اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ہندستان میں ہر کوئی اپنی خوراک میں تخفیف کرکے صرف آدھا کھانے لگے تو بھی غلے کی قلت رہے گی۔ اس کے بعد اگر مزید اندازہ لگانا ہو تو اس حقیقت پر غور کیجیے کہ موجودہ راشن کے تحت فی کس روزانہ صرف پندرہ سو کیلوری میسر ہوتی ہے اور راشن میں گزشتہ تخفیف کی رو سے اس میں بھی معتد بہ کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہر شخص کے لیے روزانہ تین ہزار کیلوری سے اوپر مہیا کی جاتی ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ پندرہ سو کیلوری کھا کر انسان صرف اسی حالت میں اپنی صحت برقرار رکھ سکتا ہے جب وہ کوئی جسمانی یا دماغی محنت نہ کرتا ہو۔ لیکن کیا آپ پندرہ سو کیلوری کھا کر ملوں، کارخانوں اور دفتروں میں آٹھ آٹھ گھنٹے مسلسل اپنا جسم و جان نہیں کھپاتے؟ ان حالات کے تحت اگر ملک میں وبائی امراض اور بے شمار دیگر بیماریاں پھیل جائیں تو تعجب کی کیا بات ہے۔

اس وقت ہندستان کے سب سے زیادہ قلت زدہ علاقے مدراس اور بمبئی کے صوبے اور میسور، حیدرآباد اور راج پوتانہ کی ریاستیں ہیں۔ شمالی اور مشرقی ہند میں جاڑوں کی بارش نہ ہونے کی وجہ سے فصلیں کچھ خراب ضرور ہوگئی ہیں لیکن وہاں حالت زیادہ نازک نہیں ہے۔

ان میں سب سے زیادہ قلت والا صوبہ مدراس ہے۔ وہاں کے قلت زدہ علاقوں میں تو نچلے طبقے کے لوگوں میں ابھی سے کم خوری کے نتائج ظاہر ہونا شروع ہوگئے ہیں اور اگر ایک ماہ تک یہی حال رہا تو لوگ مرنا شروع ہوجائیں گے۔

برطانوی وزیرِ غذا نے جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں اُن کی رو سے صوبہ مدراس میں بارش کی قلت اور دیگر آفات کے سبب سے دس لاکھ ٹن چاول کا نقصان ہوا ہے اور ریاست میسور میں تین لاکھ ٹن چاول اور کودوں کا۔ حیدرآباد میں ضلع بیدر کے کئی تعلقوں کو ... قلت زدہ علاقہ تسلیم کرلیا گیا ہے۔ وہاں تیس ہزار کی رقم سرکاری طور پر کسانوں کو تقاوی قرضے کے طور پر دینے کے لیے منظور ہوئی ہے ... کے لیے کسانوں میں تقسیم کیے جائیں گے۔ مویشیوں کے لیے چارہ مہیا کرنے کے لیے پچاس ہزار روپے منظور کیے گئے ہیں۔ اور قحط زدہ ... تعمیر سے متعلق امور ابھی سے زیرِ غور ہیں۔

صوبہ بمبئی کے بعض اضلاع میں بھی نازک صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔ حکومتِ بمبئی نے ضلع احمد نگر کے سات سو نو گانوؤں کو ۱۳ فروری سے قحط زدہ علاقہ ہونے کا اعلان کیا، ایک لاکھ چالیس ہزار کی رقم تقاوی قرضوں اور امدادی امور کے لیے منظور کی گئی۔

کاٹھیاواڑ اور راج پوتانے کی ریاستیں مثلاً مارواڑ اور بھاونگر وغیرہ کی بدحالیوں کے تذکرے اکثر و بیشتر اخبارات میں آتے رہتے ہیں۔ ... کی حالت مخصوص طور پر خراب ہے جن کی ذمے داری دو باتوں پر عائد ہوتی ہے۔ ایک تو بنیوں اور زمیں داروں کی ذخیرہ اندوزی اور دوسرے ریاست کے عمال و حکام کی خود غرضی جو صرف محصولات کی آمدنی پیدا کرنے کے لیے بڑی مقدار میں غلہ ریاست سے باہر بھیج رہے ہیں۔

شمالی ہند میں پنجاب، سندھ، یوپی اور بہار کے صوبوں کی غذائی صورتِ حال نازک تو نہیں لیکن کچھ اچھی بھی نہیں۔ پھر چونکہ حکومتِ ہند نے آنے والے قحط کی روک تھام کے لیے ایک کُل ہند غذائی پالیسی اختیار کی ہے اس لیے جنوبی ہند، بمبئی اور راج پوتانے میں اناج کی قلت کا اثر شمالی ہند کے صوبوں پر پڑنا ضروری ہے۔

سرکاری اندازے کے مطابق اِس سال بہار میں جاڑے کے چاول کی مقدار ۱۹۶۸۸۰۰ ٹن ہے، برخلاف اس کے سنہ ۱۹۴۴ء میں ۲۱۳۳۳۸۰ ٹن تھی۔ اناج کی کمی کی خبر سُن کر بہار میں بڑے پیمانے پر زمیں داروں اور بنیوں نے ذخیرہ اندوزی شروع کر دی ہے اور چاول اور دھان کی قیمتیں دفعتاً چڑھنا شروع ہو گئی ہیں۔

یو۔پی کو فالتو غلّے والا صوبہ کہا جاتا ہے لیکن وہاں بھی چاول اور گیہوں کی کمی ہے۔ اور وہ بھی اس بات کے پیشِ نظر کہ حکومتِ یو۔پی بار بار اس سے انکار کر رہی ہے کہ غلّہ صوبے سے باہر بھیجا گیا ہے۔ حکومتِ یو۔پی کے اعداد و شمار کے مطابق پہلی مئی سنہ ۱۹۴۵ء کے بعد سے اگر بارہ ہزار ٹن مکئی، چنا، جوار، باجرہ باہر بھیجا گیا تو اس کے بدلے مئی سنہ ۱۹۴۴ء سے اس وقت تک ۲۳۳۰۰۰ ٹن گیہوں بھی صوبے کے اندر آیا۔ اس کے علاوہ چھ ہزار ٹن چاول، باجرہ، جوار اور چنا بھی باہر سے منگوایا گیا۔ اب یو۔پی سے غلّے کی درآمد قطعی روک دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یو۔پی میں فالتو غلّہ موجود نہیں ہے۔

پنجاب کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پہلی مارچ سنہ ۱۹۴۵ء سے لے کر فروری سنہ ۱۹۴۶ء کے ابتدائی دنوں تک ۶۸۰۰۰۰ ٹن غلّہ پنجاب سے قلت والے صوبوں میں بھیجا گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آزاد تجارتی ذریعوں سے کوئی ۹۷۰۰۰ ہزار ٹن غلّہ پنجاب سے صوبۂ دہلی کے غیر راشنی علاقوں میں بھیجا گیا۔ اس طرح کُل ملا کر ۷۷۷۰۰۰ ٹن غلّہ پنجاب سے برآمد کیا گیا لیکن اب سرکاری بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس برآمد کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ پنجاب کے ناظمِ غذا مسٹر اف۔ بی۔ ویس نے اپنے بیان میں قلت کی افواہوں کی ضرور تردید کی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ بارش نہیں ہونے کی وجہ سے اتنا غلّہ نہیں پیدا ہوا ہے کہ باہر بھیجا جا سکے۔ پنجاب میں جتنی زمین میں گیہوں کی کاشت ہوتی ہے اُس کا اوسط ایک کروڑ ایکڑ ہے۔ اس میں سے ساٹھ لاکھ ایکڑ زمین میں آب پاشی کا انتظام ہے اور اس سے تقریباً ۲ ملین ٹن گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ پنجاب میں سالانہ ۳۰ (تیس) لاکھ ٹن گیہوں کا خرچ ہے۔ مگر امید ہے کہ جو غلّہ پیدا ہوگا وہ سال بھر کے لیے کافی ہوگا لیکن پنجاب دوسرے صوبوں کو غلّہ نہ بھیج سکے گا۔ اس بات کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب جو عام طور سے ہر سال سات لاکھ سے لے کر نو لاکھ ٹن تک غلّہ باہر بھیجتا تھا مارچ سنہ ۱۹۴۵ء سے لے کر اس وقت تک صرف پانچ لاکھ ٹن غلّہ باہر بھیج سکا ہے۔

جہاں تک سندھ کا تعلق ہے یہ کسی قدر حیرت کی بات ہے کہ وہ فالتو پیداوار کے لیے مشہور ہوتے ہوئے بھی آج کل قلت کا سامنا کر رہا ہے۔ مگر اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہاں کے بنیے اور زمیں دار بڑے پیمانے پر ناجائز ذخیرہ اندوزی سے کام لے رہے ہیں۔ حکومت ان سے غلّہ حاصل کرنے کے لیے کارروائی کر رہی ہے۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے اس وقت حکومتِ ہند ایک کُل ہند غذائی پالیسی پر کاربند ہے جس کے تحت مُلک میں غلّے کی جو مجموعی مقدار ہے اُسے پورے مُلک کے کام میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں خوش حال صوبے غلّے کی برآمد کو روک نہیں سکتے۔ وائسرائے کا پنجاب اور یو۔پی کے گورنروں سے ملنا اور حکومتِ بہار سے سلسلۂ جنبانی کرنا اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ وافر غذا والے صوبوں سے قلت والے صوبوں کے لیے غلّہ حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا جائے گا۔ موجودہ حالات کے تحت کروڑوں ہم وطنوں کی جان بچانے کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت بھی نہیں۔ جہاں تک راشن کی کل ہند تخفیف کا تعلق ہے وہ بہت مہم اور نامناسب ہے۔

حکومت ہند یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے عمّال دیانت دار و کارگزار نہیں ہیں اور ان کے ذریعے ذخیرہ اندوزوں کے خلاف باا ثر کارروائی نہیں کر سکتی چناں چہ مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی اور مسٹر جناح سے وائسرائے کی ملاقاتیں یا سلسلۂ جنبانی کا اس کے علاوہ کچھ مطلب نہیں ہے کہ حکومت ہند قومی جماعتوں کے ذریعے عوام اور ان کے لیڈروں کا تعاون چاہتی ہے۔ یہ بہت اچھا شگون ہے کہ سیاسی رہنماؤں نے غذائی قلت کو سیاسی اختلافات کا اکھاڑہ بنانے سے انکار کیا ہے تاکہ کسی طرح آنے والے قحط کی مصیبت بہ خیر و خوبی ٹل جائے۔

سیاسی رہنماؤں اور جماعتوں کے تعاون کے حصول کا ایک یہ بھی مقصد ہے کہ "مزید غلّہ پیدا کرو" والی اسکیم جو اب تک اسی تعاون کی عدم موجودگی میں اور حکام کی بے ایمانی اور نا اہلی کی وجہ سے محض مذاق کی حیثیت رکھتی تھی اُسے ایک سنجیدہ عملی شکل دی جا سکے۔

برطانوی کابینہ کے وزرا کا جلد ہی ہندستان آنے کا فیصلہ غذائی صورتِ حال کے پس منظر میں بہت اہم ہے۔ کیا ہندستان کے سیاسی رہنماؤں کا یہ مطالبہ کہ عوامی حکومت کے قیام کے بغیر غذائی مشکلات کو نہیں حل کیا جا سکتا حکومتِ برطانیہ کی نگاہوں میں کچھ زیادہ اہم ہو گیا ہے؟ اس سوال کا ابھی کوئی واضح اور قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آج ہم کیوں اتنی خطرناک غذائی قلت کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس کے اسباب متعدد ہیں لیکن ہم انھیں بہ آسانی تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) دو سو سال کی برطانوی غلامی جس کے تحت ہمارا زراعتی نظام ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا اور آبادی میں اضافے کے ساتھ زرعی پیداوار کو جدید مشینی طریقوں سے بڑھانے کی کوشش نہ کی گئی۔ اگرچہ بہ قول شخصے اس عرصے میں ہندستان کی آبادی میں اتنا اضافہ ہوتا رہا کہ "ہر بیس سال میں ہندستان نے گویا ایک برطانیہ جن دیا" یعنی ہر بیس سال میں ہندستان کی آبادی میں دس کروڑ کا اضافہ ہوتا رہا۔ (۲) جنگ کے دوران میں زرعی پیداوار اور تقسیم کا جو نظام تھا وہ بالکل درہم برہم ہو گیا۔ اور رشوت باز حکام اور آدم خور بنیوں کی سازش نے عظیم پیمانے پر ذخیرہ اندوزی کو رواج دیا (۳) سیلاب، طوفان، خشک سالی اور بارش کی کمی نے موجودہ صورتِ حال کو نازک سے نازک تر کر دیا ہے۔

لیکن ان تمام اسباب کی اصل جڑ ہمیں موجودہ سیاسی اور معاشی نظام میں ملتی ہے۔ مثلاً اگر آج غیر ملکی حکومت ہمارے سر پر نہ سوار ہوتی تو آب پاشی کے جدید طریقوں سے ہم سیلاب اور خشک سالی دونوں کے اثرات کو دُور کر سکتے تھے اور ان دونوں چیزوں کا پیداوار پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ پھر قومی حکومت با اثر انداز میں ذخیرہ اندوزوں کے خلاف کارروائی کر سکتی تھی۔

موجودہ معاشی نظام پر یوں ذمّے داری عائد ہوتی ہے کہ قلتِ پیداوار اور تقسیم پیداوار کو کسی طرح بھی زمیں داری اور تعلقہ داری کے نظام سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قطعی ضروری ہے کہ غذائی اشیا کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے لیے زمیں داروں کے پاس بے کار پڑی ہوئی زمینیں اور سرکاری پڑتی زمینیں بے زمین کسانوں اور مزدوروں کو دے دی جائیں۔ پورے نظامِ آراضی (LAND SYSTEM) کی خرابیوں پر بحث کرنے کا اس وقت موقع نہیں۔ خاص کر موجودہ عارضی مصیبت کو رفع کرنے کے لیے مزید تفصیلات میں جانا غیر ضروری ہوگا۔

صورتِ حال کے بے حد خطرناک ہوتے ہوئے بھی اگر ہم کمربستہ ہو جائیں تو اتحادی غذائی بورڈ کی ناتوجہی اور غذائی وفد کی ناکامیابی کے باوجود مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ کل ہند راشن بندی، ذخیرہ اندوزوں کے خلاف موثر کارروائی، عوام اور قومی جماعتوں کا تعاون، غذائی اشیا کی پیداوار میں اضافہ کرنے کی کوشش، اور سب سے ضروری بات، عوامی حکومت کا قیام ـــــ اتنی باتیں اگر ہو جائیں تو ہندستان بھوکوں مرنے سے بچ جائے گا۔

(ہندستان) [illegible]

برطانیہ پر ہندستان کا قرضہ

ڈاکٹر [illegible] ایم۔ اے، پی۔ ایچ ڈی (معاشیات) (لندن)

ریزرو بینک قانون سنہ ۱۹۳۵ء کی رو سے ریزرو بینک آف انڈیا کو اختیار ہے کہ مندرجہ
ذیل [illegible] کی [illegible] اشیا کے مقابلے میں نوٹ چھاپے اور جاری کرے: طلائی سکّے، طلائی فلز (GOLD)
[illegible] اسٹرلنگ تمسکات، روپی اور روپی کے تمسکات۔ اِن کا کم سے کم چالیس فی صد حصہ طلائی سکّے، طلائی فلز
[illegible] تمسکات [illegible] ہونا قانونی طور پر ضروری ہے بشرطیکہ طلائی سکّے اور طلائی فلز کی مقدار کسی وقت بھی چالیس کروڑ روپوں

ہندستان کے نقطۂ نظر سے مندرجہ بالا [illegible] یہ تو مقرر کر دیا گیا ہے کہ طلائی اور اسٹرلنگ کے تمسکات
[illegible] سے نیچے نہ گرنے پائیں لیکن اس میں اس بات کا التزام نہیں کیا گیا ہے کہ یہ تمسکات ایک خاص حد سے زیادہ
[illegible] ہونے پائیں۔ [illegible] ریزرو بینک ایک خاص مقدار سے زیادہ نوٹ نہ چھاپے۔ اسی بنیادی نقص سے فائدہ اٹھا کر [illegible] بجائے
دیے گئے کہ افراطِ زر کی صورت پیدا ہو [illegible] قیمتیں [illegible]) اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ریزرو بینک
کے پاس مزید اسٹرلنگ تمسکات جمع ہو جاتے ہیں تو وہ اس کے مطابق مزید نوٹ چھاپ سکتا ہے اور اس کی کوئی حد نہیں۔
چوں کہ عام طور پر اسٹرلنگ تمسکات اس وقت جمع ہوتے ہیں جب ہندستان کی تجارت میں درآمد کے مقابلے میں برآمد زیادہ

ہوتی ہے۔ اس لیے یہ خیال کیا گیا کہ قانون میں اسٹرلنگ تمسکات کے مقدار میں کم ہونے کی جو حد مقرر کردی گئی ہے اُس سے یہ ہوگا کہ زیادہ نوٹ نہ جاری ہوسکیں گے لیکن کس قدر عجیب اور متضاد بات ہے کہ وہ دفعہ جو نوٹوں کی افراط کو روکنے کے لیے وضع کی گئی تھی اس کا نتیجہ بالکل اُلٹا نکلا یعنی اُسی دفعے کی رُو سے نوٹوں کی افراط ہوگئی۔

دورانِ جنگ کے مالی نظام کی خرابی

ایسا کیوں ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندستان سے ملک معظم کی حکومت نے جنگی ضروریات کے جو مال واسباب خریدے ان کی قیمت ادا کرنے کا طریقہ غلط تھا۔ جنگ کے سلسلے میں کچھ رقم تو حکومتِ ہند نے ہندستان کی طرف سے جنگی ضروریات کے لیے خرچ کی۔ جو حکومتِ ہند کے بجٹ میں فوجی تحفظ کی مد کے تحت دکھلائی گئی۔ یہ رقم کچھ تو ٹیکس کے ذریعے اور کچھ مختلف قسم کے قرضوں کے ذریعے حاصل کی گئی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ حکومت ہند ہر سال ملک معظم کی حکومت اور دیگر اتحادی حکومتوں کی طرف سے ہندستان سے جنگی مال واسباب خریدتی رہی۔ اِن مال واسباب کی قیمت، ملک معظم کی حکومت نے اسٹرلنگ کی شکل میں ادا کی جو لندن میں جمع ہے۔ اس اسٹرلنگ کا کچھ حصہ اس رقم کی ادائیگی میں صرف کیا گیا جو ہندستان پر برطانیہ کی طرف سے بہ طورِ خراج عائد ہوتی ہے اور جسے اصطلاحی طور پر "ہوم چارجز" (HOME CHARGES) کہا جاتا ہے اور کچھ حصہ اس رقم کی ادائیگی میں صرف ہوا جو ہندستان پر برطانیہ کی طرف سے قرضے کے طور پر عائد ہوتی تھی۔ ان ادائگیوں کے علاوہ اسٹرلنگ کا جو بڑا حصہ بچ رہا وہ ہندستان کی طرف سے برطانیہ پر بہ طور قرضہ عائد ہے۔ ان اسٹرلنگ تمسکات کو لندن میں ریزروبینک آف انڈیا کے اثاثے (ASSETS) کے طور پر جمع رکھا گیا اسی اثاثے کے مقابلے میں ضرورت کے مطابق ہندستان میں نوٹ چھاپے گئے اور انھی نوٹوں سے برطانیہ نے ہندستان سے جنگی ضروریات کی چیزیں خریدیں۔ اس طرح ہندستان میں نوٹوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہوگئی اور اشیا کی قیمتیں چڑھ گئیں۔

اسٹرلنگ تمسکات کا اجتماع اور نکاس

ذیل میں اسٹرلنگ تمسکات کے جمع ہونے اور اُن کی نکاسی سے متعلق اعداد و شمار پیش کیے جاتے ہیں:-

اجتماع:-

۱۔ اگست ۱۹۳۹ء تک ریزروبینک کے پاس اسٹرلنگ کی رقم۔ ۶۴ کروڑ تھی

۲۔ ستمبر ۱۹۳۹ء سے مارچ ۱۹۴۵ء تک ریزروبینک نے ۶۴۴ کروڑ کے اسٹرلنگ تمسکات خریدے۔

۳۔ مارچ ۱۹۴۵ء کے آخر تک ریزروبینک نے ملک معظم کی حکومت سے ۱۲۹۲ کروڑ کے اسٹرلنگ تمسکات حاصل کیے۔

اسٹرلنگ تمسکات کا میزان ——— ۲۰۰۰ کروڑ

نکاسی :-

۱۔ مارچ ۱۹۴۵ء کے آخر تک ۴۱۱ کروڑ کے اسٹرلنگ ہندستان پر برطانیہ کے قرض کی ادائگی میں صرف کیے گئے۔
۲۔ ،، ،، ،، ،، ۲۲۶ کروڑ کے اسٹرلنگ ہندستان نے برطانیہ کو خراج کے طور پر ادا کیے۔
۳۔ ،، ،، ،، ،، ۱۳۶۳ کروڑ کے اسٹرلنگ ریزروبینک کے پاس جمع تھے۔

اسٹرلنگ تمسکات کا میزان ــــــــ ۲۰۰۰ کروڑ

مارچ ۱۹۴۵ء سے دسویں اکتوبر ۱۹۴۵ء تک ریزروبینک کے پاس جو اسٹرلنگ جمع تھا وہ ۱۳۶۳ کروڑ سے ۱۵۵۱ کروڑ ہوگیا۔

ہندستان کا مطالبہ یہ اسٹرلنگ تمسکات یا اسٹرلنگ قرضہ جو ہندستان کی طرف سے برطانیہ پر عائد ہوتا ہے اس وقت ان دو ملکوں کے درمیان سخت قسم کے بحث و نزاع کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ہندستان کا کہنا یہ ہے کہ ہم نے برطانیہ کو یہ اسٹرلنگ قرضہ بڑی مصیبتیں اُٹھا کر دیا ہے۔ ڈٹ چھاپ چھاپ کر جب برطانیہ نے ہندستان سے جنگی ضروریات کے مال و اسباب خریدنے شروع کیے تو اس سے ملک بھر میں افراطِ زر (INFATION) کی صورت پیدا ہوگئی۔ عام لوگوں کے استعمال کی اشیا کی کمی پڑگئی یہاں تک کہ ہندستان کے بعض علاقوں میں قحط کے مصائب بھی نازل ہوئے۔ ہندستانیوں نے زندگی کی بنیادی ضروریات کی چیزوں سے خود کو محروم رکھا تاکہ برطانیہ اور دیگر اتحادی ممالک یہاں سے جنگی ضروریات کی چیزیں خرید سکیں۔ اس طرح ہندستانیوں کے ہاتھوں میں جو بچت آئی وہ اسٹرلنگ تمسکات کی شکل میں انگلستان میں جمع ہوتی رہی۔

برطانیہ کو ہندستان نے یہ قرضہ بہ خوشی نہیں دیا بلکہ سیاسی دباؤ کے تحت۔ برطانیہ نے ریزروبینک آف انڈیا کے دستورِ اساسی کے دفعات کی خامیوں سے فائدہ اُٹھاکر زبردستی یہ قرضہ اینٹھا۔ ہندستان آزاد ہوتا تو وہ اپنے مال و اسباب اور خدمات کی قیمت سونے کی شکل میں طلب کرتا۔ یا اس کے عوض میں برطانوی باشندوں کی صنعتی اور دیگر قسم کی ملکیتیں اور جائدادیں مانگتا، یا ان اشیا کا مطالبہ کرتا جن کی ہندستان والوں کو اشد ضرورت تھی اور ہے۔ لیکن ہندستان والوں نے قربانی سے کام لیا اور اس قربانی کی قیمت "ہندستان کی طرف سے برطانیہ پر قرض" کی شکل میں جمع ہے چنانچہ یہ بالکل صحیح مطالبہ ہے کہ بچت کی وہ رقمیں اس طرح سے صرف کی جائیں کہ ہندستان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔

ہندستان کے اس وقت دو مطالبات ہیں :-

۱۔ برطانیہ ہندستان کو اپنا قرضہ مناسب قسطوں میں اور قلیل ترین مدت میں ادا کردے

۲- یہ قرض کس شکل میں ادا کیا جائے اس کا فیصلہ ہندستانیوں پر چھوڑ دیا جائے۔

ہندستان اس وقت اشیائے اصل (CAPITAL GOODS) خریدنا چاہتا ہے اور سستے سے سستے داموں پر۔ اس لیے وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ برطانیہ اپنے قرضے کا ایک معتبدہ حصہ غیر ممالک کے سکوں میں ادا کرے مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سکے یعنی ڈالر میں۔ تاکہ ہندستان' امریکہ سے بالکل نئے طرز کی مشینیں خرید سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انگلستان اپنی اُس ڈالر رقم کا ایک حصہ جو امریکہ میں جمع ہے ہندستان کو دے دے یا امریکہ سے ڈالر قرض[۱] لے کر ہندستان کو دے۔ تاکہ ہندستان اُس سے امریکہ سے مشینیں اور دیگر اشیائے اصل خرید سکے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ برطانیہ جنگ کی تباہ کاریوں کے سبب ابھی ہندستان کو کئی سال تک مشینیں اور دیگر اشیائے اصل نہ دے سکے گی۔ ایسی حالت میں ہندستان اگر مشینیں خرید سکتا ہے تو صرف امریکہ سے۔ ہندستان کی معاشی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ منصوبے بندیوں کے تحت صنعتی ترقی عمل میں لائی جائے۔ اسٹرلنگ۔ قرضے کی رقموں کو اسی صنعتی ترقی کے سلسلے میں خرچ کرنا ضروری ہے۔

برطانیہ کی مشکلات جنگ کے نتیجے کے طور پر برطانیہ' جو پہلے قرض خواہ مُلک تھی اب مقروض مُلک بن گئی ہے۔ غیر ملکوں میں اس کے جو سرمایے لگے تھے اُن کا زیادہ تر حصہ ادائگی میں صرف ہوگیا اور اب اُن سے آمدنی بند ہوگئی ہے۔ اسی آمدنی سے اور تجارتی برآمد کی آمدنی سے برطانیہ اپنی صنعتوں کے لیے کچّا مال اور اپنے باشندوں کے لیے غذا دوسرے مُلکوں سے خریدتی تھی۔ چناں چہ اب برطانیہ کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ کسی طرح صنعتوں کو دوبارہ فروغ دے کر اپنی تجارت کو ترقی دے تاکہ غیر ملکوں سے غذا اور صنعتوں کے لیے کچّا مال خرید سکے۔ اگر ہندستان اور دیگر قرض خواہ ممالک برطانیہ سے اپنے قرضوں کی ادائگی کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ برطانیہ کو اپنا مال تو باہر بھیجنا پڑے گا لیکن اس کے عوض میں وہ باہر سے کچھ نہ منگوا سکے گی۔ اور برطانیہ کے باشندوں کو ایک پست معیار زندگی پر قانع ہونا پڑے گا۔

امریکی مفاد امریکہ نے جب "قرضے پٹے" کے تحت برطانیہ کی امداد کرنی بند کردی تو برطانیہ کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد دونوں مُلکوں میں قرضے کے راضی نامے کی بات چیت شروع ہوئی۔ ۶ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو ایک راضی نامہ وجود میں آیا جس کی رو سے برطانیہ کو امریکہ نے چار ارب چالیس کروڑ ڈالر کا قرضہ دینا منظور کیا۔ امریکہ اس وقت اپنی بڑے پیمانے پر توسیع یافتہ صنعت کی پیداوار کو فروخت کرنے کے لیے دنیا کے بڑے بڑے بازاروں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ برطانیہ نے اب تک اپنے حدودِ سلطنت کو صرف اپنے صنعتی مال کے لیے مخصوص رکھا ہے۔ یہ چیز امریکہ کے راستے میں رُکاوٹ تھی۔ لیکن گزشتہ راضی نامے کے ذریعے

ف۱ جس وقت یہ مضمون لکھا گیا تھا اُس وقت برطانیہ اور امریکہ کے درمیان "قرضے معاہدے" کی بات چیت ہو رہی تھی۔ جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے برطانیہ کو امریکہ سے جو قرضہ ملا ہے اس کا ایک حصہ ہندستان کو ملنے والا ہے اور وہ یوں کہ برطانیہ من جملہ اور باتوں کے اس سے ہندستان کا اسٹرلنگ قرضہ ادا کرے گی۔

امریکہ نے برطانیہ کی لاچاری سے فائدہ اُٹھا کر بہ قول لوئی فشر اپنے سونے کے پنجرے سے سلطنتِ برطانیہ کے بند دروازے توڑ ڈالے ہیں۔ اس طرح اب حدودِ سلطنتِ برطانیہ کے بازار امریکی مال کے لیے کھُل گئے ہیں۔ یہ بات امریکہ کے عین حسب منشا ہے۔ امریکہ اپنے مفاد کے پیشِ نظر یعنی آزاد بین الاقوامی تجارت کے عوض میں برطانیہ کے اس مطالبے کے ساتھ ہے کہ اس پر غیر ملکوں کے جو اسٹرلنگ قرضے آتے ہیں ان کا کافی حصّہ حذف کر دیا جائے یا قرض خواہ ممالک اُن رقموں سے بالکل دست بردار ہو جائیں۔ ۷ دسمبر والے راضی نامے کے بعد امریکہ نے اِس خواہش کا کھُلم کھلّا اظہار بھی کر دیا ہے کہ ہندستان کو چاہیے کہ وہ اپنے قرضے کے کچھ حصّے سے دست بردار ہو جائے۔ اس پر پورے ہندستان میں اختلاف اور ناراضگی کا اظہار کیا ہے ——— ایڈیٹر)

برطانیہ کا رویّہ

برطانیہ نے اب تک بہ راہِ راست یا کھُلم کھلّا اسٹرلنگ قرضے کی تخفیف یا حذف کر دینے کا مطالبہ نہیں کیا ہے۔ لیکن کچھ سرکاری اور غیر سرکاری بیانات سے بہ ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ اِس سے پورے یا ادھورے طور پر نجات پانا چاہتی ہے۔ لیکن ابھی اسے کوئی معقول وجہِ جواز نہیں مل رہی ہے۔

برطانیہ کی حقیقی پوزیشن کیا ہے؟

برطانیہ پوری رقم کی ادائیگی کے خلاف مندرجۂ ذیل دلائل اور اسباب پیش کرتی ہے:

(۱) جنگ کے اخراجات کی تقسیم اور تعین کے سلسلے میں ہندستان اور انگلستان کے درمیان جو معاملہ طے ہوا تھا اُس میں ہندستان بہت سستے چھوٹا۔ حالاں کہ برطانیہ نے یہ جنگ نہ صرف اپنے تحفظ بلکہ ہندستان کے تحفظ کے لیے بھی لڑی تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ برطانیہ اور ہندستان کے درمیان مالی معاہدے کے ہونے سے پہلے تمام ضروری باتوں پر غور کر لیا گیا تھا اور ہندستان کی "قوتِ ادائیگی" کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ ہندستان کا جو اسٹرلنگ قرضہ برطانیہ کے پاس جمع ہوا وہ اُس کی اس "قوتِ ادائیگی" سے کہیں زیادہ تھا۔

(۲) برطانیہ کی طرف سے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اگر ہندستان نے قربانیاں کیں تو جنگ کے سلسلے میں کیں۔ اب وہ برطانیہ سے اُن قربانیوں کا بدلہ کیوں مانگتا ہے۔ جب کہ اس جنگ میں دونوں کی متحدہ کوششیں شامل تھیں اور اُس سے دونوں کا مفاد وابستہ تھا

اس کا جواب یہ ہے کہ جنگ کی وجہ سے ہندستان کی معیشت ناگفتہ بہ حالت کو پہنچ گئی ہے۔ ہندستان کے لوگوں نے کم خوراکی کے مصائب برداشت کیے اور اب بھی برداشت کر رہے ہیں۔ اُن کے پاس پہننے کو کپڑے نہیں ہیں اور علاج کے لیے کافی مقدار میں ادویات نہیں مہیا ہیں۔ اگر اس اسٹرلنگ قرضے کی رقموں کو ہندستان کے قدرتی ذرائع کے استعمال میں صرف کیا جائے تو ہندستان کو ان مصائب سے نجات مل سکتی ہے۔

(۳) تیسرا حیلہ برطانیہ کی طرف سے یہ پیش کیا جارہا ہو کہ برطانیہ نے ہندستان سے جنگی مال واسباب بہت اونچی قیمتوں پر خریدے۔ اگر قیمت زیادہ نہ ہوتی تو اِس وقت برطانیہ پر جو اسٹرلنگ قرضہ ہر وہ بھی بہت کم ہوتا

اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہو کہ اشیا کی جو قیمتیں چڑھ گئیں تو اس کی ذمے داری خود برطانیہ ہی کے اختیار کردہ مالی انتظام پر عائد ہوتی ہو جس میں خامیاں تھیں اور جس کی وجہ سے ہندستانیوں کو بھی بڑے بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے برطانیہ نے ہندستان سے کنٹرول کے داموں پر مال و اسباب خریدے جو بازار کی قیمتوں سے بہت کم تھے۔

(۴) سب سے آخری حیلہ برطانیہ یہ پیش کرتی ہو کہ رُپے کی شرح تبادلہ صنوعی طور پر بہت اونچی رکھی گئی تھی۔ اگر قیمتوں میں اضافے کے متوازی اس میں کمی پیدا کی جاتی تو اُسی کے مطابق خرید کردہ مال و اسباب کی اسٹرلنگ والی قیمت بھی کم ہوتی اور اسٹرلنگ قرضہ کم ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہو کہ چوں کہ ہندستان کے مال واسباب کی فوری اور زبردست مانگ تھی اس لیے رُپے کی شرحِ تبادلے کا گھٹنا غیر ممکن تھا۔ بلکہ اگر اس پر کنٹرول نہ رکھا گیا ہوتا تو یہ شرحِ تبادلہ اور بھی زیادہ ہوجاتی۔ اور اگر رُپے کی شرح تبادلے کو تیز ہوجانے دیا جاتا تو اس سے فائدہ یہ ہوتا کہ قیمتوں کا بڑھنا رُک جاتا اور ایک حد تک افراطِ زر کے ہول ناک نتائج کا ملک کو سامنا نہ کرنا پڑتا۔

متذکرہ بالا باتوں پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جمع شدہ اسٹرلنگ کو "برطانیہ پر ہندستان کا تجارتی قرضہ" سمجھا جائے جس کی ادائگی ضروری ہو۔ یہ ضرور ہو کہ اس سلسلے میں ہندستان کو چاہیے کہ برطانیہ کی مشکلات اور دقتوں کا خیال رکھے۔ قرضے کی ادائگی کا ایسا انتظام کیا جائے کہ اس سے برطانیہ کی معیشت پر زیادہ بُرا اثر نہ پڑے۔ برطانوی امریکی مالی معاہدہ مورخہ ۶ر دسمبر ۱۹۴۵ء کے ذریعے امریکہ نے برطانیہ کی اس سلسلے میں ضرور مدد کی ہو (اگرچہ برطانیہ کو جو قرضہ امریکہ سے دست یاب ہوا ہو وہ بلا سودی نہیں ہو) اس معاہدے سے یہ ممکن ہوگیا ہو کہ ہندستان کو اسٹرلنگ کے عوض میں ڈالر کی ایک مخصوص رقم فوری طور پر دست یاب ہوگی۔ ہندستان اس ڈالر سے امریکی مشینیں اور کلیں اور دیگر اشیائے اصل خرید سکتا ہو جو صنعتی ترقی کے لیے بنیادی طور پر ضروری ہیں۔

اگر برطانیہ نے پورے یا ادھورے طور پر ہندستان کا قرضہ ادا کرنے سے انکار کردیا تو یہ بداخلاقی اور بے انصافی کی بدترین مثال ہوگی خصوصاً جب کہ ہندستان اس وقت ایسی حالت میں نہیں ہو کہ اس ظلم کا انتقام لے سکے۔

مسائلِ حاضرہ (غیر ممالک)

جنگ کے بعد دُنیا کا تجارتی چکّر

از: ـــــــــ ای ۔ درگا

جنگ ختم ہو چکی ہے اور اب یہ سوال زیرِ غور ہے کہ انسان کی معاشی زندگی کیا رُخ اختیار کرے گی اور مستقبل قریب میں حالات کیا ہوں گے؟ اگر اسی سوال کو زیادہ ٹھوس لفظوں میں پیش کیا جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ جنگ کے بعد دنیا کا صنعتی اور تجارتی چکّر کس طرح گردش کرے گا؟

اس سلسلے میں واضح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، خاص کر جب کہ اعداد و شمار کی کمی کے سبب مستقبل تو الگ خود موجودہ معاشی حالات کے متعلق بھی ٹھیک ٹھیک رائے قائم کرنا دشوار ہے۔ بہرحال اس وقت کو یوں حل کیا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد جو معاشی صورتِ حال پیدا ہوئی تھی اُس کے سائنٹفک مطالعے اور تجربے کی روشنی میں موجودہ معاشی رجحانات اور مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ پھر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی معیشت سے متعلق جو اعداد و شمار دست یاب ہیں اُن سے بھی بڑی مدد مل سکتی ہے۔ یہاں پر یہ جان لینا چاہیے کہ سنہ ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد جو حالات رونما ہوئے کوئی ضروری نہیں کہ من و عن وہی حالات دوبارہ اس جنگ کے خاتمے پر بھی پیدا ہوں۔ اُس وقت کے حالات اور موجودہ حالات میں کئی اہم باتوں کا فرق ہے۔ یہ باتیں کیا ہیں اُن کا تذکرہ ذیل میں آتا ہے۔

ابتداءً یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر عالم گیر جنگ کے چھڑنے کے بعد دُنیا کے صنعتی چکّر کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے، دورانِ جنگ میں

اشیا کی پیدائش کا پُرانا تسلسل کچھ عرصے کے لیے رُک جاتا ہے اور اس کے بعد تجارت اور کاروبار میں ایک خاص قسم کی گرم بازاری (Boom) پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ جنگ کے سبب سے ہر ملک کی معیشت میں گڑبڑی پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔

امن کے زمانے میں تو یہ سوال ہوتا ہے کہ پیدا کردہ اشیا کو کس طرح فروخت کیا جائے یعنی کس طرح "اشیا" کو "زر" میں تبدیل کیا۔ لیکن جنگ کے زمانے میں یہ مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ جنگ کے زمانے میں سرمایے داروں کو یہ فکر بالکل نہیں ہوتی کہ ہمارے کارخانوں کا تیار شدہ مال فروخت ہو سکے گا یا نہیں۔ ایک طرف تو امن کے زمانے میں مال کے فروخت نہ ہونے سے ملک کے ذرائع پیدائش اور قوتِ پیدائش بے کار پڑی رہتی ہے۔ اس کے بعد جنگ کے چھڑ جانے سے دفعتاً فوجی ضروریات اور مطالبات بڑھ جاتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کی قوتِ پیدائش اور ذرائع پیدائش سے اُن مطالبات کا پُورا ہونا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ پھر مزید مال پیدا کرنے کا سوال درپیش ہوتا ہے۔ اس طرح سرمایے دار کو جنگ کے زمانے میں مال کے نہ فروخت ہونے کا قطعی کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔

گزشتہ جنگ میں حکومت خود خریدار کی حیثیت رکھتی تھی اور یہ سب کو معلوم ہے کہ حکومت کے پاس لامتناہی قوتِ خرید ہوتی ہے۔ غرض دورانِ جنگ میں سرمایے دار کو مال کے فروخت ہونے یا پڑے رہنے کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے برعکس اُسے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ اپنے زر کو کس طرح ایسی اشیا میں تبدیل کر دے جن سے زیادہ مال پیدا ہو، تاکہ اُسے فروخت کر کے وہ منافع حاصل کر سکے۔ دُوسرے لفظوں میں دورانِ جنگ میں سرمایے دار ہمیشہ اپنے زر کو نئے نئے کاموں میں لگانا اور زیادہ سے زیادہ مال پیدا کرنے کی فکر میں ڈوبا رہتا ہے۔ امن کے زمانے میں تو یہ ہوتا ہے کہ مانگوں کی کمی سے اشیا کی پیدائش پر رُکاوٹ سی رہتی ہے۔ لیکن جنگ کے زمانے میں مانگوں کے مقابلے میں پیدائش اتنی کم ہوتی ہے کہ خود لوگوں کے مطالبوں میں رُکاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

جنگ جتنا ہی طول کھینچتی ہے اتنی ہی مانگیں پیدائش سے زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔ سرمایے کا وہ حصّہ جو خام مال، مشین، عمارت اور مزدوروں کی قلت کی وجہ سے اشیا کی پیدائش کے کاموں میں نہیں لگایا جا سکتا، بینک میں بے کار پڑا رہتا ہے۔ اسی طرح مزدوروں، کارکنوں، افسروں اور حکام کی آمدنیوں کا کچھ حصّہ بھی بچت کے طور پر بینکوں میں یا خود اُن کے پاس جمع ہوتا رہتا ہے، اس لیے کہ بازار میں اشیا کی قلّت کے سبب وہ اپنی پُوری آمدنی نہیں خرچ کر سکتے۔

بچت کی یہ تمام رقمیں جنگ کے ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ اور جنگ کے ختم ہونے کے بعد جب حکومت کے عائد کیے ہوئے تمام کنٹرول اور پابندیاں ہٹالی جاتی ہیں تو یہ تمام رقمیں پُوری طاقت اور تیزی کے ساتھ اشیا کی خرید کے لیے بازار میں پہنچ جاتی ہیں۔

موجودہ معاشی نظام کے اس بنیادی اصول کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب ہم موجودہ حالات کی طرف آتے ہیں۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد اور مکمل امن کے قیام سے پہلے ایک عبوری دور رہتا ہے جو لازمی طور پر عارضی دقتوں اور دشواریوں سے پُر ہوتا ہے۔ اس

وقت ہم اُسی دور سے گزر رہے ہیں۔ لیکن وہ تمام علامات اِس وقت پورے طور پر موجود ہیں جو اِس مختصر سے "عرصۂ تداخل" کے گزر جانے کے بعد ہمیں بالکل ایک نئے تجارتی اور صنعتی چکّر کے ابتدائی دور میں پہنچا دیں گے۔ یہ ابتدائی دور "چڑھاؤ" کا زمانہ ہوگا جس کے بعد "اُتار" لازمی طور پر آئے گا۔ لیکن ابھی بہرحال ہمیں "چڑھاؤ" ہی کے زمانے میں داخل ہونا ہے جو معاشی خوش حالی سے معمور ہوگا۔

پہلی عالمگیر جنگ (سنہ۱۹۱۴-۱۸ء) کے بعد بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اُس وقت "چڑھاؤ" کا زمانہ یعنی اشیا کی پیدایش میں ترقی اور اضافے کا زمانہ، بہت مختصر تھا۔ پیدایش اپنے آخری نقطۂ عروج پر امریکہ میں مارچ سنہ۱۹۲۰ء میں پہنچی، برطانیہ میں سنہ۱۹۲۰ء کے پہلے تین مہینوں میں اور فرانس میں نومبر سنہ۱۹۲۰ء میں۔ گویا دُنیا کے دو سب سے بڑے صنعتی مُلکوں —— امریکہ اور برطانیہ —— میں پہلی عالمگیر جنگ کے بعد پیدایش میں اضافے کی مدت صرف پندرہ مہینے تھی۔

یورپ کے دوسرے مُلکوں میں، غیر جانب دار مُلکوں کو چھوڑ کر، حالات کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ ان مُلکوں کی حالت اتنی دگرگوں تھی کہ اشیا کی پیدایش خاطر خواہ طور پر نہ ہو سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی بستی کی رقمیں اسی طرح ان کے پاس پڑی رہیں اور اُن کی کاسی کا سامان نہ ہو سکا۔ ایسی حالت میں جبکہ زر کی افراط ہو اور اشیا کی کمی، "نوٹ" اور "زر" (INFLATION) کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور قیمتیں کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یورپ کے ان افلاس زدہ ملکوں میں اشیا کی پیدایش میں اضافہ ہونے کی بجائے افراطِ زر کی صورت پیدا ہوگئی۔ بازار میں مانگیں رسد سے زیادہ تھیں لیکن اشیا کی پیدایش کی رفتار بے حد سست تھی۔ ایسا اس لیے تھا کہ ان مُلکوں میں پیدایش کے ذرائع —— خام مال، مشینیں اور ذرائع حمل و نقل —— کی کمی تھی۔ ان حالات میں جو معاشی بحران اور کساد بازاری پیدا ہوتی ہے اُسے "پیدایش کی کمی کا لایا ہوا بحران" کہتے ہیں۔ یہ اُس بحران سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو پیدایش کی زیادتی اور افراط کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ موخر الذکر اس وقت وجود میں آتا ہے جب اشیا بہت زیادہ پیدا ہو جائیں اور بازار میں مانگ نہ ہو۔ لیکن سنہ۱۹۱۹ء میں اور اس کے بعد یورپ کے بہت سے مُلکوں میں جو بحران آیا وہ اشیا کی کمی اور مانگوں کی زیادتی کی وجہ سے۔ اشیا کی اس لیے کمی پڑ گئی کہ پیدایش کے ذرائع قطعی ناکافی تھے۔

اُس زمانے کے اعداد و شمار کے مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ جنگ کے بعد یورپ میں پیدایش کی رفتار کے تیز ہونے کا جو مختصر سا زمانہ آیا اُس میں تیزیٔ رفتار کے باوجود پیدایش کبھی اُس منزل پر نہ پہنچ سکی جو جنگ سے پہلے تھی۔ اگر اُس منزل پر پہنچی بھی تو اُس مختصر سے عرصے کے گزر جانے کے بعد یعنی سنہ۱۹۲۰ء کے بعد۔ فرانس میں سنہ۱۹۲۴ء میں، جرمنی میں سنہ۱۹۲۶ء میں اور انگلستان میں سنہ۱۹۲۹ء میں پیدایش جنگ سے پہلے کی منزل پر پہنچ سکی۔ انگلستان میں رفتارِ پیدایش گویا اُس وقت جنگ سے پہلے والی منزل پر پہنچی جب عالمگیر کساد بازاری اور معاشی بحران عن قریب شروع ہونے والا تھا۔ اِس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ پہلی عالمگیر جنگ کے ختم ہونے کے بعد یورپ کے خاص خاص ترقی یافتہ مُلکوں کو قبل از جنگ کی منزل پر پہنچنے میں چھ سال، یا نو سال،

یا گیارہ سال لگے۔

پہلی عالم گیر جنگ کے ختم ہونے کے بعد تھوک قیمتیں اپنی انتہائی منزلِ عروج پر امریکہ میں جنوری سنہ ۱۹۲۰ء میں اور انگلستان میں مارچ سنہ ۱۹۲۱ء میں پہنچیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابلِ غور اور اہم بات یہ ہو کہ اگرچہ سنہ ۱۹۲۰ء کے دوران میں قیمتیں تیزی سے گر رہی تھیں لیکن سنہ ۱۹۱۳ء میں یعنی جنگ چھڑنے سے ایک سال پہلے جو قیمتیں تھیں اُتنی کبھی نہیں ہوئیں بلکہ اُن سے کچھ زیادہ ہی رہیں۔ امید تو یہ تھی کہ قیمتیں سنہ ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں کم ہو جائیں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اُس کے متعدد اسباب تھے۔ بڑے بڑے صنعتی اجاروں کے لیے قیمتوں کو اوپر اُٹھائے رکھنا آسان تھا۔ ٹیکس، کرایہ، حمل و نقل کے محصولات اور دیگر محصولات کی وجہ سے اشیا کو پیدا کرنے کا خرچ بڑھتا ہی رہا اور اُس کا اثر قیمتوں پر پڑنا لازمی تھا۔ قیمتیں اگر سنہ ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں کم بھی ہوئیں تو جاکر کہیں سنہ ۱۹۲۹-۳۳ء کے عالم گیر معاشی بحران کے بعد۔ اور وہ بھی اِس بُری طرح کہ سنہ ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں کہیں زیادہ گر گئیں۔ سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء کے دوران میں قیمتوں کو مصنوعی طور پر جو بڑھا ہوا رکھا گیا تھا اُس کا خراب اثر یہ ظاہر ہوا کہ سنہ ۱۹۲۹-۳۳ء کے معاشی بحران کی شدت اور گہرائی اور بھی بڑھ گئی۔

پہلی عالم گیر جنگ کے خاتمے پر جو حالات رونما ہوئے تھے اور جن کا اوپر تذکرہ آچکا ہو اُن کے مقابلے میں دیکھا جائے تو اِس وقت یعنی دوسری عالم گیر جنگ کے خاتمے پر سرمایہ دارانہ نظام والے مُلکوں کی معیشت میں اور بھی بدعنوانیاں پھیلیں گی۔

سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ، عالم گیر ہونے کے باوجود اپنے تباہ کن اثرات کے لحاظ سے درآصل صرف یورپ کی جنگ کہی جانے کی مستحق ہو۔ لیکن حال کی جنگ صحیح معنوں میں عالم گیر جنگ تھی اور اس کے خاتمے پر پوری سرمایہ دارانہ دنیا کا مفلس اور قلاش ہو جانا لابدی ہو۔

زمانۂ امن میں جو ممالک محاذِ جنگ کی حیثیت رکھتے تھے اُن کی حالت میں اور اُن مُلکوں کی حالت میں جو ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی زد سے محفوظ رہے، بہت نمایاں فرق ہوگا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، برطانوی نوآبادیات اور ایک حد تک برطانیہ بھی، جنوبی امریکہ کے ممالک اور یورپ کے غیر جانب دار ممالک مثلاً اسپین، سویڈن، پرتگال، سوئزرلینڈ ـــــ ان مُلکوں کی حالت یورپ کے اُن سرمایہ دار مُلکوں کی حالت سے بدرجہا بہتر رہے گی جن پر جرمنی کی فوجوں نے چڑھائی کی تھی۔ اِن مُلکوں میں مفلسی اور مکمل بدحالی کا دور دورہ ہوگا، ہر چیز کی قلت رہے گی اور ان کی معیشت ابتر ہو جائے گی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کنیڈا، جنوبی افریقہ وغیرہ کے پیدائشی ذرائع پہلے سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ حالت میں ہوں گے۔ اس کے برعکس یورپ کے جنگ زدہ مُلکوں کے ذرائع پیدائش تباہ و برباد ہو چکے ہوں گے اور اُن کے قصبے اور ذرائع حمل و نقل مکمل بدحالی اور بدانتظامی کے شکار رہیں گے۔ اِن حالات میں اوّل الذکر ممالک "زائد پیدائش کے ممالک" کہے جائیں گے اور تباہ حال مُلکوں میں پہلی جنگِ عظیم کے

بعد کی طرح قلت پیدائش کی شکایت عام ہوگی۔ اس بار تباہ حال ملکوں کا علاقہ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء) کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہوگا۔ مشرقی یورپ کے اُن ممالک میں جو سودیت یونین کے ساتھ مِل گئے ہیں یہ قلتِ پیدائش نہیں ہوگی اس لیے کہ سودیت یونین سے اتحاد و اتفاق کی بنا پر انھیں معاشی تعاون اور امداد حاصل ہوتی رہے گی۔

برطانیہ کی پوزیشن کچھ بیچ بیچ میں رہے گی۔ برطانیہ کی سرزمین پر اگرچہ جنگ نہیں لڑی گئی لیکن ہوائی حملوں سے مادّی نقصان بہت پہنچا ہے۔ جنگ کے زمانے میں برطانیہ کو اپنے بہت سے غیر ملکی کاروبار اور سرمایے سے ہاتھ دھونا پڑا۔ چناں چہ جنگ کے بعد برطانیہ اپنے نو آبادیاتی اور مقبوضہ ممالک کی مقروض رہے گی۔ خود انگریز ماہرینِ معاشیات نے اندازہ لگایا ہے کہ برطانیہ کے لیے جنگ سے پہلے کے مقابلے میں اپنی برآمد کی تجارت میں پچاس فی صدی کا اضافہ کرنا ہوگا تب کہیں جاکر وہ اس قابل ہوگی کہ جنگ سے پہلے کے معیارِ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے غیر ملکوں سے غذا اور کچا مال منگوا سکے۔ اس کو عمل میں لانے کے لیے برطانیہ ایک بے حد غیر مستقل سی اور بدلتی ہوئی معاشی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور ہوگی۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں صورتِ حال یہ ہوگی کہ وہاں کے ذرائع پیدائش ترقی یافتہ حالت میں ہوں گے، پھر پچاس ارب ڈالر کی قیمت کی اشیا اُسے غیر ملکوں کو مہیا کرنی ہوں گی۔ اِن حالات کے تحت وہاں عارضی خوش حالی کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ ٹھیک جس طرح پہلی عالم گیر جنگ کے بعد ہوا۔ جو اشیا امریکہ سے طلب کی جائیں گی اُن میں زیادہ تر ثانوی ضرورت کی اشیا ہوں گی۔ مثلاً موٹر کار، ریفریجریٹر، ٹیلی وژن کے آلے، فرنیچر، مکانات وغیرہ۔ ان اشیا کی ضرورت اس لیے سب سے پہلے ہوگی کہ دورانِ جنگ میں یا تو ان کی پیدائش بالکل روک دی گئی تھی یا بہت کم کردی گئی تھی۔ اوّلین ضرورت کی اشیا مثلاً کھانا، کپڑا، اور جوتے اِن کی مانگ معمول سے کچھ ہی زیادہ ہوگی، اس لیے کہ دورانِ جنگ میں ان کی پیدائش پر بہت کم اثر پڑا تھا۔ پیدائش کے ذرائع مثلاً مشینوں اور کلوں کی مانگ جنگ سے پہلے کے مقابلے میں کم ہوگی اِس لیے کہ جنگ کے دوران میں ان کی کافی پیدائش ہو چکی ہے۔ ۔ ۔ ۔

یہاں پر ہمیں ایک اور بات پر غور کرنا ہے اور وہ یہ کہ دورانِ جنگ کی ٹیکنیکل (فنی) ترقیوں کی وجہ سے کم آدمی اب زیادہ اشیا پیدا کرسکیں گے دورانِ جنگ میں فنی ترقی اس طرح ہوئی کہ مانگیں زیادہ تھیں اور قوتِ پیدائش کم۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے؛ چناں چہ فنی ایجادیں اور ترقیاں خوب ہوئیں اور کم وقت میں اور کم محنت سے اشیا پیدا کرنے کے نئے نئے طریقے نکالے گئے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قوتِ پیدائش میں چار فی صدی سالانہ کا اضافہ ہوا ہے۔ امن کے زمانے میں قوتِ پیدائش کی رفتار دو فی صد سالانہ تھی۔ یہ اضافہ بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس کا اثر جنگ کے بعد کے تجارتی چکر پر ہونا لازمی ہے۔

جب امریکہ جنگی ضروریات کی چیزوں کی پیدائش بند کرکے امن کے زمانے کی چیزیں پیدا کرنے لگے گا تو اُس وقت کئی صنعتوں میں افراطِ پیدائش کا خطرہ لاحق ہوگا۔ اگرچہ اُس وقت پہلے کی جمع شدہ مانگیں کافی ہوں گی، لیکن بازار پر اِن مانگوں کا خوش گوار اثر اس لیے نہیں پڑے گا

کہ اُس وقت بے روزگاری پھیلی ہوگی، کام کرنے کے گھنٹے کم ہوں گے اور مزدور فوجوں سے اپنے وطن واپس آئیں گے۔ اس عام بیروزگاری کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مزدوروں کی آمدنیوں میں کمی ہو جائے گی اور اس طرح اُن کی قوتِ خرید بھی گھٹ جائے گی۔

جہاں تک اشیا کی قیمتوں کا سوال ہی جنگ میں جو ملک شامل رہے ہیں وہاں دورانِ جنگ میں پہلی جنگِ عظیم کے مقابلے میں بہت کم اضافہ ہوا۔ اس کے دو اسباب ہیں:-

(۱) بڑے سرمایہ دار ممالک میں جنگ سے پہلے کی غیر استعمال شدہ قوتِ پیدائش کافی موجود تھی، جس کی وجہ سے اشیا کی پیدائش میں کمی نہیں ہوئی اور قیمتیں اوپر نہیں چڑھ سکیں۔

(۲) حکومت نے اس جنگ میں شروع ہی سے قیمتوں پر کنٹرول جاری کر دیے تھے اور گزشتہ جنگ کی بہ نسبت کنٹرول کے طریقے بھی زیادہ اچھے تھے۔

تھوک قیمتوں پر نظر ڈالنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہو کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سنہ ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں سنہ ۱۹۴۳ء میں صرف ۳۵ فی صدی کا اضافہ ہوا اور برطانیہ میں ۶۷ فی صدی کا۔ غیر جانب دار ملکوں میں البتہ بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ مثلاً سوئیڈن میں ۹۷ فی صدی، سوئزرلینڈ میں ۱۰۷ فی صدی اور ٹرکی میں ۴۷۸ فی صدی۔

چوں کہ برطانیہ اور امریکہ میں قیمتوں میں زیادہ اضافہ نہیں ہوا اس لیے ممکن ہو لوگ یہ خیال کریں کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد کی طرح جنگ کے خاتمے پر اُن ملکوں میں قیمتوں کو بہت چڑھ جانا چاہیے لیکن ایسا ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:۔ جنگی معیشت کو رفتہ رفتہ امن کے زمانے کی معیشت میں بدل دیا جائے گا۔ قیمتوں پر حکومت کا کنٹرول رہے گا۔ پھر جنگ کی وجہ سے زراعت اور صنعت میں قوتِ پیدائش پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہوگی جس سے اشیا کی کمی نہیں پڑے گی اور نہ قیمتوں میں اضافہ ہوگا۔ خاص کر اُن ملکوں میں جہاں زر کا نظام پائے دار اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہو قیمتوں میں اضافہ نہیں ہو سکے گا یا کم سے کم یہ ضرور ہوگا کہ قیمتوں کے بڑھنے کا رجحان زیادہ تیزی سے کام نہ کر سکے گا۔

اگرچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سنہ ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں قیمتوں میں زیادہ اضافہ نہیں ہوا ہو، پھر بھی اس وقت قیمتیں اوسطاً زیادہ ہی ہیں۔ اور چوں کہ وہاں دورانِ جنگ میں کم محنت میں زیادہ اشیا پیدا کرنے کی صلاحیت بڑھ گئی ہو اس لیے بعد از جنگ والے زمانے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قیمتوں کے زیادہ بڑھنے کی گنجائش نہیں ہو۔ بلکہ بعد میں جو بحرانی دور آئے گا اس میں قیمتیں بہت گر جائیں گی۔ اُن ملکوں میں بھی ایسا ہی ہوگا جن کے سکوں کا ڈالر سے تبادلہ رہے گا مثلاً برطانیہ اور برطانوی نوآبادیات۔

لیکن برِ اعظم یورپ کے ملکوں میں صنعتی اور تجارتی چکر کی گردش بالکل مختلف ہوگی۔ ان ملکوں میں اشیا کی پیدائش اتنی تیز نہیں ہوگی کہ جنگ سے پہلے کے معیار پر پہنچ جائے۔ مانگیں تو ضرور ہوں گی لیکن اُن مانگوں کو پورا کرنے کے لیے کافی مال پیدا کرنے کے

ذرائع نہ ہوں گے ۔ چناں چہ اِن مُلکوں میں قلّتِ پیدایش کی وجہ سے نازک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی ۔ ٹھیک جس طرح پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہوا ۔ افراطِ زر کا پورا خطرہ رہے گا اور قیمتیں بہت چڑھ جائیں گی ۔ زیادہ شدید افراطِ زر کو روکنے کے لیے یا کم سے کم اس میں ردّ و بدل کرنے کے لیے یورپ کے ممالک میں جنگ کے بعد والے سالوں کی قیمتوں اور پیدایشِ اشیا پر سرکاری نگرانی سے کام لیا جائے گا ۔

یورپ کے مُلکوں میں قلّتِ پیدایش کا پیدا کیا ہوا معاشی بحران کب تک رہے گا اور کس حد تک جائے گا اور کتنی افراطِ زر پیدا کرے گا ـــــــ ان تمام باتوں کا انحصار امریکہ، کنیڈا اور شاید برطانیہ کے طرزِ عمل پر ہو ۔ اگر اِن مُلکوں نے فوری اور پورے طور پر یورپ کی مدد کی اور وہاں کے ذرائع پیداوار کو ترقّی دینے کے لیے قرضے دیے تو صورتِ حال زیادہ نازک نہ ہوگی اور اگر یہ سب کچھ نہ کیا گیا تو حالت بد سے بدتر ہوتی جائے گی ۔ فرانس[1] کو امریکہ سے امداد مل ہی چکی ہو مشرقی یورپ کے مُلکوں کو سوویت یونین سے مدد ملے گی ۔ بین قومی مالی فنڈ اور بینک سے بھی امید کی جاتی ہو کہ وہ ضرورت مند مُلکوں کی مالی اعانت کریں گے اور اُن کے ذرائع پیدایش کی ترقّی میں ہاتھ بٹائیں گے ۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پاس اتنے وسیع اور کامل معاشی وسائل اور ذرائع موجود ہیں کہ وہ یورپ کے مُلکوں کو عظیم سرمایے دے سکتا ہو ۔ افراطِ پیدایش اور عام بے روزگاری کے خطرات کو دُور کرنے کے لیے بھی امریکہ کے لیے اپنا سرمایہ غیر مُلکوں میں بھیجنا ضروری ہو ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ جو سرمایے یورپ کے مُلکوں میں بھیجے گا اُن کا منافع یا سود اُس کے پاس کیوں کر اور کس شکل میں پہنچے گا ۔ اس سوال پر پہلی عالم گیر جنگ کے بعد بھی کافی بحث و تمحیص ہوئی تھی ۔ جنگ کی وجہ سے اِس منافع کا خام مال کی شکل میں حاصل ہونا بہت مشکل ہو گیا ہو ۔ چناں چہ جنگ کے بعد والے زمانے میں کئی مُلکوں میں خام مال کی درآمد بہت کم ہو جائے گی ۔ جہاں تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا تعلق ہو وہاں ربڑ، نباتاتی روغن، (VEGETABLE OILS) اور ریشم کی درآمد بہت گھٹ جائے گی ۔ امریکہ جتنا خام مال باہر سے منگواتا ہو اُس کا ½ حصّہ انھی چیزوں پر مشتمل ہو ۔ لیکن اب اِن اشیا کی درآمد اِس لیے کم ہو جائے گی کہ دورانِ جنگ میں کیمیاوی ربڑ (SYNTHETIC RUBBER)، سویابین اور مصنوعی ریشم کی صنعت میں بہت ترقیاں ہوئی ہیں ۔

چناں چہ امریکہ کو نئی چیزیں درآمد کرنی پڑیں گی ۔ اِسی ضرورت کی بنا پر غیر مُلکی مال کی درآمد پر محصولات کے سلسلے میں امریکہ کا جو پرانا طرزِ عمل ہو وہ اب ہی صورتِ حال کے مطابق نہیں رہا ۔ اور اُسے بدلنے کی ضرورت ہو ۔ جنگ کے زمانے میں صدر روزولٹ نے اِس پر کافی زور دیا تھا ۔

اوپر کے سطور میں دُنیا کی معاشی صورتِ حال کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہو اُسے مختصر طور پر یوں پیش کیا جاسکتا ہو : اُن ممالک میں جن کی کلیں مشینیں اور دیگر ذرائع پیدایش نقصان سے محفوظ رہے ہیں یا پہلے سے زیادہ ترقّی یافتہ ہو گئے ہیں، دو سے لے کر چار سال تک

---

[1] جس وقت یہ مضمون لکھا گیا تھا اُس وقت امریکہ اور برطانیہ کا مالی معاہدہ وجود میں نہ آیا تھا، اُس کے بعد فرانس کو امریکہ سے مزید امداد اور قرضے ملے ہیں ۔

کے عرصے تک اشیا کی پیدائش کی رفتار بہت تیز رہے گی۔ کچھ عرصے کے بعد چیزیں ضرورت سے زیادہ پیدا ہوجائیں گی اور اُس سے نازک صورتِ حال رونما ہوگی۔ یہ بحران ۱۹۲۰ء۔۲۱ء کے بحران سے زیادہ طویل عرصے تک قائم رہے گا۔ صنعتی ملکوں کی اِس بدحالی سے جزاعظم یورپ کے ملکوں کی حالت اور بھی خراب ہوجائے گی۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں جس وقت افراطِ پیدائش کی وجہ سے بدحالی پھیل رہی ہوگی اُس وقت یورپ کے ممالک پہلے کی بہ نسبت تو ضرور اپنی کمیٔ پیدائش کو دور کر چکے ہوں گے، پھر بھی وہ اُس کے اثرات سے پورے طور پر نجات نہیں پا چکے ہوں گے اور "کمیٔ پیدائش" اور "افراطِ زر" کے خلاف جدوجہد میں معروف ہوں گے۔

جب جنگ کے بعد والا یہ معاشی بحران ختم ہوجائے گا اور یورپ کے کم سے کم کچھ ملکوں کا نظامِ زر مضبوط اور پلے دار بنیادوں پر قائم ہوچکے گا تو ایک نیا صنعتی دور شروع ہوگا۔ لیکن یہ دور ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیانی دور جیسا نہ ہوگا جب کہ صنعتی پیدائش کی رفتار تیزی سے بڑھ رہی تھی، خاص کر امریکہ اور جرمنی میں۔ بلکہ یہ نیا صنعتی دور ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۷ء والے انحطاط پذیر دور کی طرح ہوگا، اور پورے طور پر خوش حالی کبھی نہ قائم ہوسکے گی۔ وہ حالات جو ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۷ء رونما ہوئے تھے اس بار زیادہ شدت اور تباہ کن انداز میں پیدا ہوں گے۔ پھر اُسی طرح سرمایہ ساری دُنیا پر پھیل جانا چاہے گا اور پھر وہی سماج میں قوتِ خرید کے فقدان سے سرمایے کی توسیع رُک جائے گی۔ پھر وہی ہولناک بے روزگاری پھیلے گی، مشینیں اور کلیں بےکار ہوجائیں گی اور معاشی بدحالی کا دور دورہ ہوگا۔

لیکن یہ صورتِ حال ان ملکوں میں نہیں پیدا ہوگی جو معاشی اعتبار سے سوویت یونین سے ملحق اور اس کے زیرِ اثر ہیں مثلاً مشرقی یورپ کے ممالک۔ سوویت یونین کے معاشی نظام میں اشیا کا ضرورت سے زیادہ پیدا ہونا ایک ناممکن العمل سی بات ہے اس لیے وہاں معاشی بحران کبھی نہیں پیدا ہوسکتا۔ لیکن برطانیہ اور امریکہ میں یہ بحران رونما ہوکر رہے گا اِس لیے کہ اُن ملکوں میں ہر خاص مدت پر "افراطِ پیدائش" کا پیدا ہوجانا ایک لابدی امر ہے۔ برطانیہ اور امریکہ کا یہ معاشی بحران تمام سرمایہ دار ممالک میں پھیل جائے گا اور اُن کو بدحالیوں میں گرفتار کردے گا۔

نظریۂ معاشیات

زر اور اُس کا استعمال

اقتباس از "ایمائل برنس" ——————— مؤلفہ حمیدہ نقوی

زر کی نوعیت اور اقسام | جدید ملکوں میں ہر کوئی زر کو سکّوں کی صورت میں جانتا ہے۔ سکّوں کے علاوہ ایسی کاغذی دستاویزیں بھی ہوتی ہیں جنھیں زر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن در اصل دیکھا جائے تو وہ کاغذی دستاویزیں محض "سکّوں کی شکل میں زر ادا کرنے کے وعدے" ہوتی ہیں۔ حکومت یا بینک کے جاری کیے ہوئے نوٹ، ڈاک خانے کے آڈر چک، بینک ڈرافٹ، تبادلے کی ہنڈیاں مسافروں کے چک وغیرہ ——— سب اِسی زُمرے میں آتے ہیں۔

ہر ملک میں زر کی ایک معیاری اکائی ہوتی ہے جیسے برطانیہ کا پونڈ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ڈالر، فرانس کا فرینک وغیرہ[1]۔ یہی معیاری اکائی تمام لین دین کی بنیاد ہوتی ہے۔ شلنگ اور پنس، سینٹ اور سینٹی میٹر اپنی اپنی معیاری اکائیوں کے مقررہ حصّے ہیں۔ لیکن بہ ذات خود اُن کے کوئی معنی نہیں۔

مثال کے طور پر ایک پونڈ والے نوٹ کو لیجیے۔ یہ نوٹ بہ جائے خود ایک پونڈ ہونے کا دعوا نہیں کرتا۔ اس کا دعوا صرف اتنا ہے:-

"بینک آف انگلینڈ حامل کے مطالبے پر ایک پونڈ یا ایک پونڈ کی قیمت کے سکّے ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔"

اگر ہم اپنی تشویش رفع کرنے کی غرض سے بینک آف انگلینڈ میں نوٹ لے جائیں اور مسٹر مانٹیگو نارمن سے اپنا وعدہ وفا کرنے کو کہیں تو یا تو

---

[1] ہندستان کا رُپیہ۔

وہ نوٹ اور قسم کا نوٹ دے دیں گے جو بجائے خود گویا دوسرا وعدہ ہوگا یا چاندی کے کچھ سکے دیں گے۔ ان چاندی کے سکوں کے متعلق ... اقرار کریں گے کہ یہ پونڈ کے صرف حصے ہیں۔ ہمیں پونڈ شاید نہ ملے۔ چناں چہ بینک آف انگلینڈ سے واپس ہوتے ہوئے ہمیں یقین ہو جائے گا کہ پونڈ کوئی ایسی پُر اسرار اور مقدس چیز ہے کہ اُسے مالیات کے صرف بڑے بڑے پجاریوں ہی کو چھونے کی اجازت ہے۔

لیکن ہمیشہ ایسا نہیں تھا۔ پہلی عالم گیر جنگ ۱۹۱۴ء-۱۸ء سے پہلے جب ہر اہم ملک سونے کے معیار پر تھا۔ یعنی جب ہر ملک میں بینک کے جاری کیے ہوئے نوٹوں کو سکوں سے بدلا جا سکتا تھا۔ اُس وقت برطانیہ کی معیاری اکائی یعنی پونڈ اتنی پُر اسرار چیز نہ تھا۔ پونڈ ساورن (گنی) کی صورت میں تھا جو سونے میں ڈھالا جاتا ہے۔ اُس کا وزن اور معیار ایک قانون کے ذریعے مقرر تھی۔ اُس کا نشان یہ تھا: £۔ بعض کاغذات میں L لکھا جاتا تھا جو لاطینی زبان کے لفظ "لبرا" کا پہلا حرف ہے۔ "لبرا" کا مطلب ہے ایک پونڈ وزن۔ شروع میں لفظِ پونڈ کا مطلب تھا ایک پونڈ چاندی کا وزن۔ اُس زمانے میں سب سے قیمتی سکہ چاندی کی پینی (PENNY) تھا۔ پینی میں ایک پونڈ چاندی کا دو سو چالیسواں حصہ ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں جتنا سونا ایک پونڈ چاندی کی قیمت کے برابر ہوتا تھا ایک پونڈ کہلاتا تھا۔ جب سونے کا استعمال شروع ہوا تو یہ لفظ سونے کے سکے کے لیے استعمال ہونے لگا۔

آج کل اگر آپ کے پاس خوش قسمتی سے ایک ساورن (گنی) موجود ہے تو آپ اُسے ڈیڑھ پونڈ میں بیچ سکتے ہیں۔ یعنی آپ کو اس ساورن کے بدلے وہ ڈیڑھ پونڈ ملیں گے جو نہ تو دکھائی دیتے ہیں اور نہ جن کا پتا لگتا ہے، بلکہ جو صرف "ادا کرنے کے وعدے" ہوتے ہیں۔

خوش قسمتی سے ہم عملی زندگی میں چیزوں کی اصلیت جانے بغیر اُن کا استعمال جاری رکھتے ہیں۔ اگر ہم بجلی کے متعلق تمام باتیں جانے بغیر اس کی روشنی جلانے سے انکار کر دیں تو ہماری دنیا تاریک ہو جائے۔ بالکل اسی طرح ہم زر کی اصلیت نہ جانتے ہوئے بھی عملی زندگی میں اس کا استعمال جاری رکھتے ہیں یعنی پونڈ اور اس کے ٹکڑوں یعنی چھوٹے سکوں سے خرید و فروخت کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ اُن سے ہمارا کام چلتا ہے۔ عملی زندگی میں ہر شخص چیزوں کے بدلے زر قبول کر لیتا ہے۔

جب زر سکوں کی شکل میں ہوتا ہے اور اس کی حقیقی قیمت[1] ہوتی ہے تو لوگ اسے چیزوں کے بدلے کیوں قبول کر لیتے ہیں۔ اس کے سمجھنے میں تو کوئی دقت نہیں۔ لیکن تجارت کی ترقی کے ساتھ زر کی حقیقی قیمت کا سوال غیر اہم ہو جاتا ہے اور جو چیز زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ زر کی حقیقی قیمت کی پروا کیے بغیر اُسے تبادلے کے ذریعے کی حیثیت سے قبول کر لیتے ہیں۔ سکہ چاہے گھسا ہوا ہو، یا دھات کے لحاظ سے اُس کی قیمت کچھ بھی نہ ہو، لیکن لوگ اس کی ظاہری قیمت کا خیال کر کے اُسے قبول کر لیتے ہیں۔ جب تجارت اور زیادہ ترقی کرتی ہے تو بینک نوٹوں کا استعمال شروع ہوتا ہے۔ یہ بینک نوٹ کیا ہیں؟ محض سونے کے سکے ادا کرنے کے وعدے اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن وہ بخوشی قبول کر لیے جاتے ہیں۔ پھر زر کی ایک اور قسم وجود میں آتی ہے۔ یعنی چیک۔ اس کے بعد ادائی ...

[1] کاغذی نوٹوں کی حقیقی قیمت کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن رُپے یا پونڈ کے سکوں کی حقیقی قیمت ہوتی ہے۔

آڈر ہیں جنھیں عام طور سے قبول کیا جاتا ہے۔ اُن کی حیثیت بھی ادائی کے وعدوں ہی کی سی ہوتی ہے۔ بینک نوٹ اور سکّے دونوں ریزگاری کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ چوں کہ پشت ہا پشت سے ہم زر کو مختلف شکلوں میں استعمال کرتے آئے ہیں جو رفتہ رفتہ حقیقت سے دُور ہوتا جا رہا ہے، اس لیے اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ سونے کے سکّے کا رواج اُٹھا دینے کے بعد بھی مبادلہ جاری رہے۔ یہ مبادلہ اُس چیز کی بنیاد پر جاری رہ سکتا ہے جو کم سے کم سطحی طور پر زر کی اکائی ہے لیکن دراصل دیکھا جائے تو بالکل غیر حقیقی ہے۔

زر کا استعمال روزمرہ کے کام کاج اور خرید و فروخت میں کس حد تک کاغذی نوٹوں اور چکوں نے سکّوں کی جگہ لے لی ہے اس کا بتانا مشکل ہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں انگلستان میں جتنے نوٹ گشت میں تھے اُن کا شمار اوسطاً ۴۵۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ ہے۔ جو بینک نوٹ گشت میں رہتے ہیں اُن کا ایک بڑا حصّہ ممکن ہے کسی بینک یا ڈاک خانے میں وقتِ ضرورت کے لیے یا اچانک مطالبوں کو پورا کرنے کے لیے احتیاطاً رکھ دیا گیا ہو۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ بینک کے ادا کیے ہوئے نوٹ ایک ہی دن میں درجنوں ہاتھوں سے گزر جائیں۔ یا کسی کی جیب میں ہفتوں پڑے رہ جائیں۔ ان باتوں کے پیشِ نظر سال بھر کے لین دین کی میزان بتانا غیر ممکن ہے۔

قاعدہ ہے کہ لندن اور صوبائی کلیرنگ ہاؤس (CLEARING HOUSE) سے جتنے چک گزرتے ہیں اُن کے مجموعی اعداد شائع کیے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۶ء کے اعداد ۳۴،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ تھے۔ اگر دو بینکوں سے متعلق اشخاص کے درمیان لین دین کرنا ہوتا ہے تو چک کلیرنگ ہاؤس کے ذریعے پاس ہوتا ہے۔ اگر "لائڈس" کا کوئی چک "بارکلے" میں ادا کر دیا جائے تو "لائڈس" اُسے جمع نہیں کرے گا بلکہ چک کو کلیرنگ ہاؤس لے جا کر کسی ایسے چک کے بدلے جمع کر دیا جائے گا جو بارکلے کو لائڈس نے اس سے پہلے ادا کیا تھا۔ دونوں طرف کا حساب بینک آف انگلینڈ سے ایک چک لے کر طے کر دیا جاتا ہے۔ اس طے ہونے کی نوعیت صرف یہ ہوتی ہے کہ کاغذی صورت میں ایک حساب دوسرے حساب میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

اس قسم کے لین دین کے علاوہ ایک ہی بینک سے متعلق دو اشخاص چک کے ذریعے آپس میں ادائی کرتے ہیں۔ بینک صرف رجسٹر میں تبادلہ ظاہر کر دیتا ہے۔ "الف" کے حساب سے "ب" کے حساب میں ڈال دیا اور بس۔ اس قسم کے لین دین کی میزان بہت طویل ہو جاتی ہے۔ اس طرح چک کے ذریعے جتنا لین دین ہوتا ہے اُس کا اصلی شمار، کلیرنگ ہاؤس کے بتلائے ہوئے اعداد سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

لین دین کی یہ بے شمار رقمیں بہت سی مدوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ اگرچہ ہر مد کو ظاہر کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی اعداد و شمار نہیں ہیں۔

زر، نوٹ اور سکّوں کی شکل میں بینک سے متواتر تنخواہوں اور مزدوریوں کے لیے نکالا جاتا ہے۔ یہ نوٹ اور سکّے کام

کرنے والوں اور مزدوروں کو ادا کیے جاتے ہیں جنھیں وہ کرایے کی ادائی، خوراک اور دیگر ضرورت کی چیزیں خریدنے میں صَرف کرتے ہیں۔ اِس طرح نوٹ اور سکّے مکانوں کے مالکوں اور دُکان داروں کے ذریعے دوبارہ بینک میں واپس آجاتے ہیں۔ یہی نوٹ اور سکّے دُوسرے ہفتے یا اس کے بعد مزدوریوں اور تنخواہوں کی ادائی کے لیے برآمد کیے جاتے ہیں۔ اب ہم یہ غور کریں کہ اس چکّر میں اُن نوٹوں اور سکّوں نے کتنے کام انجام دیے:۔ مزدوروں کی ایک ہفتے کی محنت خریدی۔ پھر مزدوروں کے ہاتھوں میں آنے کے بعد ضرورت کی چیزیں خریدنے میں کام آئے تاکہ اُن کا استعمال کرکے وہ خود اور اُن کے اہل و عیال زندہ رہ سکیں اور اگلے ہفتے میں کام جاری رکھ سکیں۔ زر ہی وہ وسیلہ ہے جس سے مزدور اپنی محنت کو اُن چیزوں سے بدلتا ہے جو اُس کی محنت کی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے درکار ہوتی ہیں۔

مالک کو خام پیداوار، ایندھن، اور دیگر ذرائع پیداوار کے دام ادا کرنے ہوتے ہیں۔ مگر عام طور سے خام اشیا پیدا کرنے والوں اور صنعت کے مالکوں کے درمیان بیچ کے لوگوں کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے۔ روئی کی ایک مقدار امریکہ کے کاشت کار سے لنکاشائر کے دست کار تک پہنچتے پہنچتے بے شمار سوداگروں کے ہاتھوں سے گزر جاتی ہے۔ اس درمیانی عرصے میں یعنی روئی کے ایک ہاتھ سے دُوسرے ہاتھ میں منتقل ہونے میں بے شمار چکوں کا استعمال ہو جاتا ہے۔ یہ چک ایک فرم دوسرے فرم کو روئی کی ملکیت منتقل کرنے کی غرض سے دیتا ہے۔ ہر لین دین میں دراصل زر کی غرض سے چیزوں کا تبادلہ کیا جاتا ہے۔ مگر استعمال شدہ زر کی مجموعی رقم چیزوں کی قیمت سے بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔

جب صنعتوں کے مالک اپنی تیار شدہ چیزیں فروخت کرتے ہیں تو بھی یہی ہوتا ہے۔ بیچ کے آدمیوں کے علاوہ لوگوں کی ایک اور بڑی تعداد ہوتی ہے جن کے ہاتھوں سے چیزیں گزر کر اُن لوگوں کے پاس پہنچتی ہیں جو براہ راست استعمال کے لیے خریدتے ہیں، فروخت کرنے کے لیے نہیں، استعمال کرنے والے لوگوں کے پاس جب چیزیں پہنچ جاتی ہیں تو ان چیزوں سے متعلق تمام لین دین کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس تمام عرصے میں مزدوری خریدنے اور اشیا کے منتقل ہونے میں، پھر پیداوار سے لے کر تقسیم تک، ہر حالت میں زر ذریعۂ تبادلے کا کام دیتا ہے۔ اور اُن چیزوں کی پیداوار اور تقسیم کو ممکن بناتا ہے جن سے ہم زندہ رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ زر کے اور بھی استعمال ہیں۔ صرافے (STOCK EXCHANGE) میں حصّوں کی خرید و فروخت زر ہی سے ہوتی ہے۔ حساب گھر (CLEARING HOUSE) سے نکلی ہوئی مجموعی رقم کا بہت بڑا حصّہ جو چک کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے وہ اسی مد کی ادائی کو ظاہر کرتا ہے۔ حصّوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں دراصل کیا چیز خریدی اور بیچی جاتی ہے اس کا جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اگر ۱٫۰۰۰٫۰۰۰ پونڈ سرمایے کی کمپنی سے ایک پونڈ کا حصّہ خریدا جائے تو گویا کمپنی کی پوری جائداد میں سے دس لاکھواں حصّہ خریدار کے ہاتھ میں

چلا گیا۔ قانونی نقطۂ نظر سے یہ صورتِ حال بالکل درست ہو لیکن ظاہر ہو کہ کوئی شخص اپنا زر کسی ایسی چیز سے بدلنا پسند نہ کرے گا جسے نہ وہ سمجھ سکتا ہو اور نہ استعمال کر سکتا ہو۔ تو خریدار نے آخر کیا خریدا؟ اس کا جواب یہ ہو کہ خریدار کمپنی کے آیندہ منافع میں سے اپنا متناسب حصّہ طلب کرے گا۔ اُسے اُمید ہو کہ وقت آنے پر اُسے حصّہ ملنے کا ایک آرڈر موصول ہوگا اور یہ آرڈر چک کی شکل میں ہوگا۔ اِس چک کا مطلب یہ ہوگا کہ کمپنی اپنے گزشتہ سال کے پیدا کیے ہوئے زر میں سے اس خریدار کا متناسب حصّہ ادا کر رہی ہو۔ یہاں پر یہ سمجھ لینا ضروری ہو کہ صرافے کا، کاروبار اور سامان و اشیا سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ صرافے میں جو زر استعمال ہوتا ہو وہ صرف آیندہ کے منافع کے مطالبے بدل دیتا ہو۔

یہ امر کہ آیندہ کے زر کے مطالبوں کی مسلسل خرید و فروخت جاری رہتی ہو اور جن قیمتوں پر وہ خریدے اور بیچے جاتے ہیں وہ بدلتی رہتی ہیں۔ اِس سے زر کا ایک اور استعمال پیدا ہوتا ہو۔ اور وہ یہ ہو کہ کمپنی کے نفع و نقصان سے قطع نظر خود زر پیدا کرنے کی غرض سے حصّے خریدے اور فروخت کیے جاتے ہیں۔ یہ اُس وقت ہوتا ہو جب خرید کی قیمت سے زیادہ داموں پر حصّے فروخت کیے جاتے ہیں۔

یہ خرید و فروخت اس وجہ سے ہو کہ زر اس سے پہلے بھی ایک اور طریق پر استعمال ہو چکا ہو۔ اُس کی تشریح یوں ہو۔ جب کوئی نئی کمپنی قائم ہوتی ہو تو اپنے حصّے پبلک کے سامنے پیش کرتی ہو۔ لوگ اِن حِصّوں ــــ یعنی آیندہ زر کے مطالبوں ــــ کے عوض میں زر دیتے ہیں تب کمپنی زر، زمین، عمارت، خام پیداوار، مشین، ایندھن اور اپنی مخصوص صنعت سے متعلق دُوسری ضرورت کی چیزیں خریدتی ہو۔ پھر کمپنی اپنے حاصل کیے ہوئے زر کا کچھ حصّہ مزدوریوں اور تنخواہوں کی ادائی کے لیے وقف کرتی ہو جو اُن لوگوں کو ادا کی جاتی ہیں جو اشیا کی پیداوار کے دوران میں نگرانی کا کام انجام دیتے ہیں یا پیدا کرتے ہیں یعنی مشین چلاتے ہیں۔ جو لوگ کمپنی کے حصّے خرید کر زر مہیا کرتے ہیں وہ گویا زر سُود پر لگاتے ہیں یا دُوسرے لفظوں میں اپنے زر کو ایسے سرمایے میں تبدیل کرتے ہیں جس سے مزید زر پیدا ہوتا ہو۔

کمپنی کے قائم ہو جانے کے بعد حصّے داروں میں حصّوں سے متعلق لین دین شروع ہوتا ہو۔ اِس کاروبار کا تعلق گویا آیندہ کے منافع کے باہمی مطالبوں سے ہوتا ہو۔ ایسے لین دین کا اشیا سے کوئی ربط نہیں ہوتا۔ کمپنی کا کوئی حِصّہ اس لین دین کے ذریعے چاہے ہزاروں ہاتھوں سے گزر جائے مگر جو زر صرافے میں پیدا ہوتا ہو، وہ ایک شخص سے دُوسرے شخص کے پاس، زر کی مجموعی تعداد یا لوگوں کی ضروریات کی مجموعی اشیا میں اضافہ کیے بغیر منتقل ہوتا رہتا ہو۔ یہ سلسلہ بالکل جوے کے کھیل کی مانند ہو۔ زر ایک شخص کی جیب سے دُوسرے شخص کی جیب میں چلا جاتا ہو مگر اس کی مجموعی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

کاروبار کی ایک اور قسم ہے جس سے مزید زر پیدا ہوتا ہو۔ اور وہ ہو مختلف صورتوں میں قرضوں کا لین دین۔ اوپر کی سطروں میں جب کاروبار کا تذکرہ آیا ہو اُس کے تو یہ معنی ہیں کہ خریدار کے پاس اشیا، حصّے، یا کسی اور چیز کے خریدنے کی قیمت موجود ہو۔ مگر ذاتی غرض کے علاوہ

قرض کی ایک اور قسم ہوتی ہے۔ یہ قرض وہ لوگ لیتے ہیں جن کو زر کی فوری ضرورت تو نہیں ہوتی لیکن جن کے پاس خام پیداوار، ایندھن، تنخواہوں اور مزدوریوں کی ادائی کے لیے اور پیداوار و تقسیم کی دیگر قیمتیں ادا کرنے کے لیے زر کا ہونا ضروری ہے۔ پھر انھیں بھی زر کی حاجت ہوتی ہے جو منفعت کے لیے یا سود پر دینے کے لیے لینا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے قرضوں سے اشخاص یا کمپنیاں کم سرمایے میں بھی پیداوار اور تقسیم کا سلسلہ جاری رکھ سکتی ہیں۔ اشخاص یا کمپنیاں دو ایک ماہ کی ضرورت کے لیے روپیہ قرض لے کر پھر عام خزانے (POOL) میں واپس کر دیتی ہیں۔ اس عام خزانے سے پھر کوئی اور شخص یا کمپنی کاروبار چلانے کے لیے قرضے لے لیتی ہے۔ گویا یہ ایک تیرتا ہوا سرمایہ ہے جو ایک کاروبار سے دوسرے کاروبار میں مزید زر کی پیدائش کے لیے استعمال ہوتا رہتا ہے۔

اسی قسم کے قرضوں کی گنجایش کے سبب سے زر کا ایک بازار (MONEY MARKET) وجود میں آگیا ہے۔ یہ وہ بازار ہے جہاں قرض خواہ زر خرید سکتا ہے، یا کچھ عرصے کے لیے سود ادا کر کے زر کا استعمال حاصل کر سکتا ہے۔

جب اشیا کی پیداوار اور تقسیم نسبتاً زیادہ ہوتی ہے تو تجارت کے لیے اور اشیا کی خرید و فروخت میں منافع حاصل کرنے کے لیے زیادہ قرضے لیے جاتے ہیں۔ فراوانی کے زمانے میں صرافوں میں حصّوں کی خریداری بڑھ جاتی ہے اور حصّوں کی خریداری کے لیے قرضوں کا لین دین بھی پہلے کی بہ نسبت زیادہ تیزی سے چل پڑتا ہے۔ ٹھیک اس کے برعکس معاشی انتشار کے زمانے میں جب عام تجارت اور صرافے میں حصّوں کی خریداری مدھم پڑ جاتی ہیں تو قرضوں کا لین دین بھی کم ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کی صورتِ حال جب پیدا ہوتی ہے تو ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ زر زیادہ ہے اور شرحِ سود کم۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس زر موجود ہے اور وہ قرض بھی دینا چاہتے ہیں۔ مگر قرضوں کی مانگ اتنی کم ہے کہ قرض دینے والوں میں باہمی مقابلے کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ ان حالات کے تحت قرض خواہ کے سامنے اگر شرحِ سود میں قلیل اضافے کی بھی شرط پیش کی گئی تو وہ بہ آسانی انکار کر سکتا ہے۔

زر میں لچک دار ہونے کی بھی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جب اشیا کی قیمت گرتی ہے تو اشیا کی پیداوار اور تقسیم کے لیے اتنا زیادہ زر درکار نہیں ہوتا جتنا گرانی کے زمانے میں قیمتوں کے کم ہو جانے سے منافع کی بہ جائے نقصان ہوتا ہے، اس سے بہت سا زر صرف ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جب قیمتیں چڑھتی ہیں تو اشیا کی پیدایش اور تقسیم کے لیے بھی مزید زر درکار ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس کا اثر صرافے اور عام تجارت میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور بنک مزید زر کے مطالبوں کو پورا کرنے کے لیے مزید زر پیدا کرتا ہے۔

اگرچہ تجارت کے نشیب و فراز کے ساتھ زر کے استعمال کی جتنی صورتیں ہوتی ہیں اُن کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مگر بہ حیثیت مجموعی ہر ملک میں ایک طویل عرصے کے دوران میں زر کی مقدار بڑھتی ہی رہتی ہے۔ اس چیز کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ زر گردش کا ایک ذریعہ ہے۔ زر کا وہ حصّہ جو استعمال میں رہتا ہے، یعنی وہ حصّہ جو سرمایے کا کام دیتا ہے ہر سال مزید زر پیدا کرتا ہے۔ اس زائد زر کا ایک حصّہ پھر سرمایے میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جو اور زیادہ زر پیدا کرتا ہے۔ جب تک موجودہ نظام قائم ہے

یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

یہ پورا سلسلہ اشیا کی پیدایش اور تقسیم کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ لین دین کی جو دیگر قسمیں ہیں ——— مثلاً زر ایک شخص سے دوسرے شخص کے پاس پہنچ جائے ——— اُن سے مبادلے کی قدروں کی مجموعی تعداد میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اُن کی حیثیت تو بس اتنی ہے جیسے کوئی مکان ایک شخص کی ملکیت سے نکل کر دوسرے شخص کی ملکیت میں آجائے۔

قرض خواہ جو اشیا کی پیدایش اور تقسیم کے لیے قرض لیتا ہے منافع کے حصول کے بعد اپنے مزید پیدا شدہ زر کا ایک حصہ سود کی ادائی کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ جن کے پاس زر ہے وہ ہمیشہ سود پر ہی قرض دیتے ہیں۔ چناں چہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زر ہی مزید زر پیدا کرتا ہے۔

———— ※ ————

صنعت و تجارت

صنعتی و تجارتی انجمنیں

از :۔۔۔۔۔ معاشی

تھوڑے سے آدمی اگر فٹ بال کا میچ دیکھنے جائیں تو انھیں اپنی مرضی کے مطابق کھڑے ہونے یا بیٹھنے کی اجازت دی جا سکتی ہی۔ لیکن اگر تماشہ بینوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جائے تو ان کے کھڑے رہنے یا بیٹھنے کا باقاعدہ انتظام کرنا ناگزیر ہوجاتا ہی۔ تاکہ ہر کوئی کھیل سے یکساں طور پر لطف اندوز ہو سکے۔ اسی طرح ایک معمولی کسان جو اپنے کھیت سے ضرورت کی تمام چیزیں پیدا کر لیتا ہی اُسے پوری آزادی دینا اوروں کے لیے ممکن ہی مشکلات کا باعث نہ ہو۔ لیکن کسی بڑے شہر میں جب لاکھوں مزدوروں کی زندگی کا سوال پیدا ہوتا ہی تو بہت پیچیدہ قسم کے انتظامات کی ضرورت ہوتی ہی۔ تنظیم، جس کا مطلب ہی افراد کے اعمال کی سوچ بچار کے بعد باقاعدہ تنظیم و ترتیب کرنا، بڑے پیمانے پر کام کرنے کا ناگزیر تقاضا ہی۔ آزاد مقابلے کے دن اب ختم ہوگئے، اور آبادی کا اضافہ، سیاسی آزادی کا عروج، عوام کے معیارِ زندگی کا بلند ہوجانا ۔۔۔۔۔ ان تمام باتوں نے تنظیم کو ناگزیر بنا دیا ہی۔

پچھلے پچاس سالوں میں انسان کی معاشی زندگی کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار ہوگیا ہی جس میں سوچ بچار اور تنظیم کو اہم مقام حاصل ہی۔ اس ڈھانچے میں جو بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں، اُن سب کا رُخ بڑھتی ہوئی تنظیم ہی کی طرف رہا ہی۔ چھوٹے فرم بڑھ کر یا دوسرے فرموں میں شامل ہو کر بڑے فرم بن گئے ہیں۔ اور پھر ان بڑے فرموں کی وجہ سے ہر جگہ اجاروں اور کارٹلوں کے بننے میں مدد ملی ہی۔ اس تنظیم میں محض ذاتی لالچ یا اقتدار کی خواہش ہی کارفرما نہیں رہی ہی۔ ایسا سمجھنا تاریخ کے میلانات سے عدم واقفیت کا ثبوت دینا ہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب مختلف

افراد نے مل کر کارٹل[1] بنائے، یا تجارتی انجمنیں قائم کیں تو ان کے پیشِ نظر ذاتی منافع اور حصولِ اقتدار کے بھی مقاصد تھے لیکن انھوں نے جس راستے کا انتخاب کیا، وہ دراصل نتیجہ تھا فنی (ٹیکنیکل) اور دیگر ایسی ضروریات کا جو آج انسان کے معاشی تعاون اور جدوجہد کے حلقے کو وسیع سے وسیع تر کر رہی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں الگ الگ تنظیمی اداروں کی تعداد اشتمالی نظام کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام پر تنظیم سے یکسر عاری ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ زیادہ صحیح تنقید یہ ہوگی کہ سرمایہ دارانہ نظام میں افراد کے منصوبوں اور ارادوں کو ایک دوسرے سے باربط اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ سرمایہ داری کے تحت خرابی یہ ہے کہ معمولی باتوں میں تو تنظیم یا منصوبے بندی کو بہت سا دخل ہوتا ہے لیکن اہم تر مسائل میں اس چیز کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ حکومت میں اور مزدور سبھاؤں، کارٹلوں اور تجارتی انجمنوں میں، منتظم کاروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن ان میں ہر ایک کے پیشِ نظر معاشی جدوجہد کا محض ایک چھوٹا سا پہلو ہوتا ہے۔ پھر ان کی تنظیم کا مقصد بھی اسی طرح محدود اور معمولی سا ہوتا ہے۔ چنانچہ اصل مسئلہ جو اس وقت ہمارے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ مختلف منصوبوں اور ارادوں کو جو اکثر ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں کیوں کر ہم آہنگ کیا جائے۔ آج ضرورت محض اس بات کی نہیں ہے کہ معاشی تنظیم اور زیادہ سائنٹفک بنائی جائے بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ تنظیم کے دائرے کو وسیع تر کیا جائے، یہاں تک کہ وہ مقامی، صوبے جاتی اور قومی ——— تمام حدوں کو پار کر جائے، نہ کہ کسی ایک صنعت، تجارت یا پیشے ہی پر اس کی حدیں ختم ہو جائیں۔

اس قسم کی تنظیم جبھی ممکن ہے کہ طاقت اور اقتدار کسی ایک مرکز پر مجتمع ہو۔ لوگ یہ اقتدار حکومت کے ہاتھوں میں دینا اس لیے نہیں چاہتے کہ سیاسی آزادی خطرے میں پڑتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ قومی معاشی زندگی منتظم ہو۔ ان دونوں باتوں کے درمیان جو تضاد ہے وہ واضح ہے۔ تنظیم کے لیے طاقت کی ضرورت ہے اور طاقت ہی سے تنظیم ممکن ہے۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ طاقت کی بہ جائے اشتراکِ عمل اور ترغیب سے کام لینا زیادہ مناسب ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اشتراکِ عمل اور ترغیب دراصل طاقت ہی کے حصول کے ذرائع ہیں۔ ان دونوں چیزوں کا مقصد یہی ہے کہ طاقت اور اقتدار ایک ایسی جماعت کے سپرد کر دیا جائے جو قومی مفاد کی خاطر طبقے وارانہ مفاد کو نظر انداز کر سکے، اور ایسے فیصلے جاری کر سکے جن کی پابندی سب کے لیے لازمی ہو۔

غرض چند افراد کے ہاتھوں میں غیر معمولی اقتدار سونپ دینا بہت سے نقصانات کا باعث ہوتا ہے۔ شاید ان خطرات کو صدر روزولٹ مرحوم سے زیادہ زوردار الفاظ میں کسی نے نہیں پیش کیا۔ ۲۹ ر اپریل ۱۹۳۸ء کو امریکی کانگرس کے نام پیام دیتے ہوئے روزولٹ نے کہا:

"دوسرے ملکوں میں جو افسوس ناک واقعات ظہور پذیر ہوئے ان سے ہم نے جمہوری قوموں کی آزادی کے متعلق دو اہم سبق سیکھے ہیں پہلا تو یہ کہ جمہوری نظام کی آزادی اس وقت خطرے میں پڑ جاتی ہے جب افراد کے ہاتھوں میں اتنی طاقت اور اتنا اقتدار آ جائے کہ وہ ریاست

[1] بڑی بڑی تجارتی اور صنعتی انجمنیں

سے بھی طاقت ور ہو جائیں۔ فسطائیت اسی قسم کی صورتِ حال کا نتیجہ ہے جس میں حکومت ایک فرد یا جماعت کی ملکیت ہو کر رہ جاتی ہے جمہوری ملکوں کی آزادی کے لیے دوسرا نہایت اہم خطرہ یہ ہے کہ ان کی صنعت و حرفت ایسے ڈھنگ پر چل رہی ہو کہ لوگوں کو روزگار نہ مل سکے اور چیزیں اس طرح بنائی اور تقسیم نہ کی جائیں کہ ایک مناسب معیارِ زندگی حاصل ہو سکے۔

لیکن متذکرہ بالا دلیل کے باوجود، جب تک انفرادی ملکیت کا وجود ہے، افراد کو اس بات کی آزادی دینی ہی پڑے گی کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کے حصول کے لیے جد و جہد کریں۔ جب اُن کے انفرادی مفاد کا تقاضا ہوگا وہ باہم مل جل کر بھی کام کریں گے اور کارٹلوں یا اس قسم کے اداروں کے ذریعے اپنے مفاد کے حصول کی کوشش کریں گے۔ ایسی صورت میں انھیں دوسرے راستوں پر لے جانے کی کوشش کام یاب نہیں ہو سکتی۔ جب مل جل کر کام کرنا مفید ہوگا تو آزاد مقابلے کو قانوناً رائج کرنا مشکل ہوگا۔ پھر مل جل کر کام کرنا ایک حد تک عوام کے لیے بھی مفید ہوتا ہے اس لیے کہ اُس سے فنی ترقی اور بڑے پیمانے پر چیزیں پیدا کرنے کے معاشی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں اسے قانوناً ممنوع قرار دینا اور بھی غلط ہوگا اور یہی کام چوری چھپے ہونے لگے گا۔

چند مستثنیات کو چھوڑ کر بیشتر صورتوں میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کسی مخصوص کارٹل یا تجارتی انجمن سے محض کسی فرد یا بعض افراد کو فائدہ پہنچتا ہے یا عوام کو بھی۔ پروفیسر شمپیٹر نے اپنی تصنیف "سرمایہ داری، اشتراکیت اور جمہوریت" میں ثابت کیا ہے کہ "بہت سے تجارتی کام جو بہ ظاہر تجارت کو زنجیروں میں جکڑ دینے والے معلوم ہوتے ہیں، دراصل کاروباری دنیا کے طریقے ہیں جن کی مدد سے اشیا کے پیدا کرنے کا خرچ بہت کم ہو جاتا ہے اور عوام کے معیارِ زندگی میں بلندی آتی ہے۔" پروفیسر موصوف کی رائے میں تجارتی جتھابندی سے جو منافع ہوتا ہے وہ دراصل اس وجہ سے کہ جتھے بندی سے بڑے پیمانے پر اشیا پیدا کرنے میں بہت کم خرچ ہوتا ہے۔ پروفیسر میک کریگر کے قول کے مطابق تنظیم کی بلند تر شکلوں اور اجارے کے مقاصد میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ پچھلے پچاس سالوں میں صنعتی اور تجارتی دنیا میں بہتر تنظیم پیدا کرنے کے سلسلے میں جو کوششیں کی گئی ہیں اُن کے متعلق یہ شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اُن کا مقصد اجارہ حاصل کرنا ہے۔ لیکن اجارے کے خطرات سے غیر معمولی گھبراہٹ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صنعت کے اِس نظام کو جو افراد کی محنت اور سوجھ بوجھ کا نتیجہ ہے، سخت نقصان پہنچے گا۔ اسی غلط فہمی کے تحت لوگ ایسے فرموں اور تجارتی انجمنوں کے منافع کو استحصال کا نام دینے لگے ہیں، جن سے اشیا کے پیدا کرنے کا خرچ کم ہو گیا ہے۔ جن سے مزدوروں کو اچھی اُجرتیں ملی ہیں، جنھوں نے مزدوروں کو کام کی طرف سے اطمینان دلایا ہے، اور جو صنعتی تحقیق وغیرہ میں بھی پیش پیش رہی ہیں۔

اجارہ یا اجارے سے ملتی جلتی تنظیم دراصل فنی (ٹکنیکل) اسباب کی عائد کردہ ضرورت ہے اور اسے محض صنعتی طبقے کی گندی چال سمجھنا نادانی ہے۔ جو لوگ اسے روکنے کے لیے امتناعی قوانین کا سہارا ڈھونڈتے ہیں، اندیشہ ہے کہ وہ اپنی کوششوں سے اس نظام کی باقاعدہ کارکردگی پر بُرا اثر ڈالیں گے۔ اس طرح نہ تو معاشی کارکردگی میں اضافہ ہوگا اور نہ آزادی کے بقا کو مدد ملے گی۔ بڑے

پیمانے پر اشیا پیدا کرنے کے طریقوں نے جو ضرورتیں پیدا کردی ہیں، یہ پالیسی اُن کے منافی ہو۔

آج سے پچاس سال پہلے تقریباً سبھی کام ازخود ہوجاتے تھے لیکن آج لاشخصی ضرورتوں کا تقاضا منصوبے بندی ہو۔ انفرادی طور پر تجارتی کمپنیاں اس تقاضے کو ایک ہی طریقے سے پورا کرسکتی ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہو کہ مختلف طاقت ور جتھے مختلف ترکیبوں اور ذرائع سے اپنی طاقت کی وسعت اور نوعیت میں اضافہ کریں۔ اس انفرادی منصوبے بندی یا تنظیم سے طاقت مختلف مرکز پر جمع ہوجاتی ہو۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایسی جماعتیں خود حکومت سے بھی زیادہ مضبوط ہوجاتی ہیں۔ اُن کا مقصد مخصوص جماعتوں اور جتھوں کے مفاد کی ترقی ہوتی ہو۔ اِس قسم کے طاقت ور اور خود مختار گروہوں مثلاً مالکوں اور مزدوروں کی انجمنوں کے باہمی تصادم سے ملک کی معاشی زندگی میں ہنگامے برپا ہوسکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات ایسی مخالف طاقتیں امن و آشتی سے بھی رہ سکتی ہیں لیکن ان کی موجودگی میں یہ ناممکن ہوجاتا ہو کہ ایسے مقاصد سامنے رکھے جائیں یا ایسی حکمت عملی اختیار کی جائے جس سے پورے معاشرے کی بھلائی ہوسکے۔ سوسائٹی کی یہ تقسیم "صرف دولت" کی طرف سے آنکھیں بند کرلیتی ہو۔ درآں حالے کہ بہ قول ایڈم اسمتھ صرف دولت ہی پیدائش دولت کا واحد مقصد ہو۔ دولت کے صارفین کے مفاد سے یہ بے خبری یا بے نیازی سارے معاشی نظام کو بے مقصد بنا دیتی ہو۔ ایسی حالت میں یہ ہوتا ہو کہ چیزیں تو بہت پیدا ہوجاتی ہیں لیکن لوگوں کے پاس اتنی قوتِ خرید نہیں ہوتی کہ ان کو خرید سکیں۔ ایک طرف چیزوں کا ڈھیر لگا رہتا ہو دوسری طرف ضرورت مند عوام فاقے کرتے ہیں اور دیگر مصائب اٹھاتے ہیں۔ دولت پیدا کرنے والی جماعتیں جوں جوں اپنی منصوبے بندی کو وسعت دینے کی کوشش کرتی ہیں، یہ تضاد نمایاں تر ہوتا جاتا ہو اور جو کچھ حاصل ہوتا ہو وہ اُس سے کہیں کم ہوتا ہو جو حاصل کیا جاسکتا تھا۔

معاشی صورتِ حال

۱۔ اناج

۲۔ ریل

۳۔ مرکزی بجٹ

دنیا بھر میں اناج کی کمی ہے

از ——— "ادارہ"

چاول چاول کی قلت سے آنے والے چند مہینوں میں دنیا کے ایک ارب لوگ قحط کا سامنا کریں گے۔ چاول کی یہ قلت پورے جنوبی مشرقی ایشیا میں عام ہے۔ گزشتہ چند مہینوں میں بنگال کے چاول کی حالت کچھ بہتر ہوئی لیکن جنوبی ہند میں چاول کی اتنی کمی ہوگئی کہ مجموعی طور پر اس سال کی پیداوار سنہ ۱۹۴۴-۴۵ء کے مقابلے میں بھی کم ہوگی۔ لنکا اور برما میں چاول کی پیداوار اور سالوں کے مقابلے میں بہت کم ہوگی۔ باہر بھیجنا تو درکنار خود برما کی ضرورت بھر کے لیے وہاں کا چاول کافی نہیں ہوگا۔ جنوبی برما کا فالتو چاول شمالی برما میں چلا جائے گا اس طرح وہ ملک سے باہر نہیں بھیجا جاسکے گا۔ سیام کا جہاں تک تعلق ہے تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ وہاں ۱۶ لاکھ ٹن فالتو چاول موجود ہے لیکن اس چاول کو سیام سے برآمد کرنے میں بڑی بڑی دقتیں حائل ہیں جن کا تذکرہ آگے آئے گا۔ جاپان میں چاول کی پیداوار میں ۱۵ فی صد کی کمی ہوگئی ہے۔ چین اور فلپائن میں بھی پیداوار پہلے کی بہ نسبت بہت کم ہوگئی ہے۔ جنوبی افریقہ کی اطلاع ہے کہ وہاں بھی بارش نہیں ہونے کی وجہ سے فصلیں خراب ہوگئی ہیں۔

چاول کی پیداوار گھٹ جانے کی وجہ سے تمام چاول خور ملکوں میں نازک صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔ چین نے یو۔ ان۔ آر۔ آر۔ اے سے سنہ ۱۹۴۶ء کے لیے دس لاکھ ٹن چاول کی درخواست کی تھی۔ لیکن اُسے جنوری، فروری اور مارچ کے لیے صرف ۴۸ ہزار ٹن چاول دیا گیا۔ جزائر فلپائن اور برطانوی ملایا میں بھی غلے کی کمی ہے اس لیے کہ وہاں فرانسیسی ہند چینی، برما اور سیام سے غلہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ سنہ ۱۹۴۶ء

کے لیے ملایا نے پانچ لاکھ ٹن غلّے کا مطالبہ کیا ہے لیکن اس کے ملنے کی کوئی امید نہیں۔ ہانگ کانگ میں راشن میں آدھے آدہ کی تخفیف کردی گئی ہے۔ اب فی کس ہر پانچ روز کے لیے صرف چار کاٹی[1] کی بجائے صرف دو کاٹی چاول ملے گا۔ اور اس کے علاوہ صرف ۱½ کاٹی آٹا۔ برطانوی اندازے کے مطابق سنہ ۱۹۴۶ء میں برما، سیام اور ہند چینی سے ۱۵ لاکھ ٹن سے بھی کم چاول حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جنگ سے پہلے ان ملکوں سے ساٹھ لاکھ ٹن چاول باہر جاتا تھا۔ ہندستان اور مشرق بعید میں عام طور سے دُنیا کے چاول کا ۹۵ فی صد حصّہ پیدا ہوتا تھا اور اب دنیا کے اِس حصّے میں ۱۵ فی صد کی کمی ہے۔ مجموعی طور پر دُنیا میں کوئی ۳۰ لاکھ ٹن چاول کی کمی محسوس کی جارہی ہے۔ صرف ہندستان ہی میں بارہ یا پندرہ فی صد چاول کی کمی ہے۔ لیکن اس تاریکی میں ہمیں امید کی روشنی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ امریکہ کے شعبۂ زراعت کے اعداد وشمار کے مطابق شمالی امریکہ میں چاول کی پیداوار بڑھ گئی ہے اور جنوبی امریکہ کی چاول کی پیداوار گزشتہ سال سے زیادہ ہے لیکن بدقسمتی سے امریکہ میں دنیا کے چاول کا صرف ایک فی صد حصّہ پیدا ہوتا ہے۔

گیہوں چاول کی کمی پڑجانے کی وجہ سے گیہوں کی مانگ زیادہ ہوگئی۔ لیکن دوسری طرف گیہوں کی فصلیں بھی اچھّی نہیں آئیں۔ اس دوہری گرفت میں گیہوں کی صورتِ حال بھی بہت نازک ہے۔ دُنیا کے جو ممالک باہر سے گیہوں منگواتے ہیں ان کو سنہ ۱۹۴۶ء کے پہلے چھ مہینوں میں مجموعی طور پر ایک کروڑ ستر لاکھ ٹن گیہوں کی حاجت ہوگی۔ لیکن جتنا گیہوں اُن مُلکوں میں بھیجا جاسکتا ہے اور جو اِس وقت مہیا ہے اُس کی مقدار صرف ایک کروڑ بیس لاکھ ٹن ہے۔ گویا پچاس لاکھ ٹن سے زیادہ کی کمی ہے۔ لیکن یہ شمار دسمبر میں کرسمس کے بعد کا ہے۔ ——— اس کے بعد بارش نہ ہونے کی وجہ سے اور دیگر آفات کے سبب فصلیں خراب ہوگئی ہیں۔ دوسری طرف گیہوں کا جو ذخیرہ جمع تھا وہ بھی خرچ ہو رہا ہے۔ چناں چہ گیہوں کی قلّت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ یو۔ این۔ آر۔ آر۔ اے کو جنوری میں سات لاکھ ٹن غلّے کی ضرورت تھی مگر صرف چار لاکھ ٹن غلّہ آسکا۔ حالات بتارہے ہیں کہ فروری میں اور بھی کم غلّہ آیا ہوگا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یورپ میں اناج کی پیداوار جنگ سے پہلے کے مقابلے میں ۲۵ فی صد کم ہوگئی ہے۔ اٹلی میں بھی گیہوں کی کمی ہے۔ شمالی ہندستان میں بھی جاڑوں میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے گیہوں کی فصلیں خراب ہوگئی ہیں اور قلّت کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔

ان تمام حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ بہ قول صدر ٹرومین یورپ کے چودہ کروڑ انسانوں کے لیے اگر مزید غلّہ نہیں فراہم کیا گیا تو ان کو فی کس پہلے سے بھی کم غذا میسر ہوگی۔ ابھی سے انھیں فی کس جو کچھ مِل رہا ہے اُس کی مقدار قطعی ناکافی ہے۔

اوسطاً ایک امریکن ۳۳۰۰ کیلوری روزانہ کھاتا ہے لیکن یورپ کے بارہ کروڑ پچاس لاکھ انسان دو ہزار کیلوری روزانہ سے بھی کم کھاتے ہیں بلکہ بعض اوقات صرف ایک ہزار کیلوری۔ اس وقت یورپ میں سب سے ردّی حالت ہنگری خاص کر بوڈاپسٹ کی ہے، آسٹریا کی حالت بھی بے حد نازک ہے۔ ڈلمیشیا اور یونان کے بعض علاقے شدید غذائی قلّت کا سامنا کر رہے ہیں۔ وہاں روٹی، گوشت اور دودھ

---

[1] ایک کاٹی برابر ہے ۱⅓ پونڈ کے۔

کی بڑی کمی ہو۔ فروری کے دوسرے ہفتے میں تو یہ اطلاع آئی تھی کہ یورپ کے بعض حصّوں میں صرف چودہ روز [illegible] کا سامان رہ گیا ہو۔

یورپ کے حالات کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہو۔ اس سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کیلوری اس گرمی یا طاقت کو کہتے ہیں جو انسانی جسم میں کھانے سے پیدا ہوتی ہو سخت جسمانی محنت کرنے والوں کو روزانہ فی کس چار ہزار کیلوری کی ضرورت ہوتی ہو۔ ایک جگہ بیٹھ کر کام کرنے والوں کو روزانہ فی کس دو ہزار چار سو کیلوری کھانا چاہیے۔ ہر اس شخص کو جو اپنی صحت برقرار رکھنا چاہتا ہو لیکن جو سخت محنت نہیں کرتا اسے کم سے کم (تاکہ وہ امراض سے اپنے جسم کی حفاظت کرسکے) پندرہ سو کیلوری کی اشد ضرورت ہو۔ اور اگر کوئی شخص ایک ہزار کیلوری سے کم کھاتا ہو تو اس کا یہ مطلب ہو کہ وہ فاقے کر رہا ہو۔ اس لحاظ سے اب ہندستان اور یورپ کے مختلف ممالک کے حالات ملاحظہ ہوں:۔

برطانیہ	فی کس روزانہ	۳۰۰۰	کیلوری کے قریب
ڈنمارک	"	۳۰۰۰	کیلوری سے زیادہ
ناروے	"	۲۴۰۰	کیلوری
زیکوسلاویکیہ	"	۲۴۰۰	"
ہالینڈ	"	۲۲۰۰	"
فرانس	"	۲۰۰۰	"
جرمنی	"	۱۵۵۰	"
آسٹریا	"	۱۵۵۰	"
ہندستان	"	۱۵۰۰	"

عام اندازے کے مطابق پورے یورپ میں ۱۲ کروڑ پچاس لاکھ آدمیوں کو دو ہزار کیلوری سے کم پر گزارا کرنا پڑتا ہو۔ اور دو کروڑ اسّی لاکھ آدمی ایسے ہیں جو پندرہ سو سے بھی کم کیلوری پر گزارہ کرتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو ایک ہزار سے کم کیلوری پر سانس کی آمد و شد برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں امریکہ میں لوگ روزانہ فی کس تین ہزار کیلوری کھاتے ہیں۔ ہندستان میں راشن کے تحت ہر کوئی پندرہ سو کیلوری کھاتا ہو۔ مزید تخفیف کی رُو سے اب اس سے بھی کم مقدار مہیا ہوگی۔

ان تمام باتوں کے پیشِ نظر اور موجودہ فصلوں کے خراب ہوجانے کے بعد یہ کہنا غلط نہیں کہ یورپ اور ایشیا کے وسیع و عریض علاقوں میں چند ہی مہینوں کے بعد قحط کا سامنا ہو اور افریقہ کے بھی بڑے بڑے علاقوں میں یہی صورتِ حال ہو۔ تاریخ کے جدید دَور کا غالباً یہ سب سے نازک موقع ہو۔

قلّت کے اسباب | دنیا بھر میں اجناس کی اس قلّت کے اسباب میں جنگ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہو۔ جنگ زدہ علاقوں میں

زراعت کا پورا انتظام درہم برہم ہوگیا ہے اور وسیع و عریض خطے جن میں پہلے کاشت ہوتی تھی بے کار پڑے ہیں۔ ان کو زیر کاشت لانے میں وقت، محنت اور سرمایہ درکار ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ برما میں سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء میں صرف ۶۶۳۰۰۰۰ (چھیاسٹھ لاکھ تیس ہزار) ایکڑ زمین میں چاول کی کاشت ہوئی جو جنگ سے پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء میں ۸۰۰۰۰۰۰ (اسی لاکھ) ایکڑ زمین زیر کاشت آجائے گی۔

جنگ کے زمانے میں ذرائع حمل و نقل بھی تباہ و برباد ہوگئے ہیں جس کی وجہ سے اجناس قلت والے علاقوں اور مقامات میں فوری طور پر اور آسانی سے نہیں پہنچائے جاسکتے۔

اس سلسلے میں ایک اور چیز کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سائنٹفک حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اس بار سورج کا دھبہ اپنی منزل عروج پر ہوگا جس سے فصلیں خراب ہوں گی اور ساری دنیا کی اوسط حرارت نسبتاً کم ہوگی۔ یہ بات جانوروں اور پودوں کی زندگی پر اثر انداز ہوگی۔ ایسے موقعوں پر عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ ہندستان میں موسمی بارشیں نہیں ہوتیں۔ افریقہ میں بھی اسی قسم کے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ وہاں سورج کے دھبے میں کمی اور زیادتی سے پانی کی مقدار میں بھی کمی بیشی پائی گئی ہے۔

ہندستان میں جاڑے کی بارش نہ ہونے نیز دیگر آفات سماوی و ارضی کے نازل ہونے کے سبب سے فصلیں خراب ہوگئیں۔ ہندستان کی قلت نے ساری دنیا کی غلے کی قلت کو اور بڑھا دیا ہے۔

لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ آنے والے عالم گیر قحط کی روک تھام کے لیے کیا کیا جارہا ہے۔

اس سلسلے میں، ساری دنیا کی امیدیں زیادہ تر ریاست ہائے امریکہ سے وابستہ ہیں اس کے بعد اتحادی غذائی بورڈ، آسٹریلیا، کنیڈا اور سیام سے۔

امریکہ | ریاست ہائے متحدہ، آسٹریلیا، کنیڈا، سیام، آرجینٹینا ——— یہ وہ ممالک ہیں جو جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہے۔ چناں چہ یہاں کے سامانِ زراعت اور ذرائع حمل و نقل تباہ ہونے کی بجائے جنگی ضروریات کے تحت پہلے سے بھی ترقی یافتہ ہوگئے ہیں۔ اور ان ملکوں میں فالتو اجناس کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔

۶ فروری کو صدر ٹرومین نے اپنا چھ نکات والا پروگرام پیش کرتے ہوئے دو باتوں پر زور دیا، ایک تو یہ کہ ریاست ہائے متحدہ کے گوشے گوشے سے فالتو غلہ یک جا جمع کیا جائے، دوسرے ذرائع حمل و نقل کو بندرگاہوں تک اور پھر وہاں سے دنیا کے قلت زدہ ملکوں میں غلہ پہنچانے کے لیے پورے پورے طور سے کام میں لایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی صدر ٹرومین نے تمام ملکوں کو متحدہ طور پر آنے والے قحط کے خلاف جنگ آزما ہونے کی دعوت دی۔

۷ فروری کو صدر ٹرومین نے ایک اعلان میں بتایا کہ امریکہ سنہ ۱۹۴۶ء کے نصف اوّل میں ساٹھ لاکھ ٹن گیہوں قلت زدہ ممالک میں

بھیجنا چاہتا ہے۔ یہ مقدار پچاس لاکھ نفوس کو دو ہزار کیلوری روزانہ مہیا کرنے کے لیے کافی ہے۔ مسٹر کلنٹن۔ پی۔ اینڈرسن، ناظم زراعت ریاست ہائے متحدہ نے بھی اپنے ایک سابقہ اعلان میں اس کی تصدیق کی۔ مسٹر اینڈرسن نے یہ بھی کہا کہ آنے والے قحط کے پیش نظر امریکی حکومت چاول کی خوراک کو صرف ۳ ریاستوں تک محدود رکھنا چاہتی ہے جہاں یہ لوگوں کی غذا کا ایک اہم حصہ ہے۔ امریکی چاول بڑی مقدار میں یورپ اور مشرق بعید کے ملکوں میں بھیجا جارہا ہے۔

امریکی حکومت غلّے کی بربادی کی روک تھام کے لیے ایک کُل ملک تحریک چلا رہی ہے۔ اسی تحریک کے سلسلے میں صدر ٹرومین نے یہ حکم نافذ کیا ہے کہ گیہوں سے اسّی فی صدی تک آٹا نکالا جائے۔

ریاست ہائے متحدہ میں پوری تن دہی کے ساتھ کاشت کاروں سے فالتو غلّہ فراہم کیا جارہا ہے اور لوگوں کو ذخیرہ بازی سے روکنے کی کوشش جاری ہے۔

۴ ار فروری کو امریکہ کے ریلوں کے نام یہ حکم صادر کیا گیا کہ وہ تمام دیگر اشیا کے مقابلے میں گیہوں، غلّہ، گوشت اور دیگر غذائی اشیا کی نقل و حرکت کو سب سے پہلے ترجیح دیں۔ یہ چیزیں، ریاست ہائے متحدہ کے گوشے گوشے سے فراہم کرکے بندرگاہوں میں جمع کی جارہی ہیں تاکہ وہاں سے ضرورت مند ملکوں میں بھیجی جاسکیں۔ امریکی شعبۂ زراعت نے بتایا کہ ریاست ہائے متحدہ سالِ رواں کے پہلے چھ ماہ کے اندر اندر ساٹھ لاکھ ٹن گیہوں کے علاوہ .... ۱۶ گوشت کے ڈبّے، ۳۷۹۰۰۰ چربی، تیل، پنیر اور دودھ کے ڈبّے ضرورت مند ملکوں میں بھیج دے گا۔

برطانیہ

عالم گیر قحط کو روکنے کے لیے برطانیہ سے زیادہ امید کرنا غلط ہے۔ اس لیے کہ وہ خود باہر سے آنے والی اجناس اور دیگر غذائی اشیا کی محتاج ہے۔ پھر بھی برطانیہ نے جو کچھ کیا ہے وہ غنیمت ہے۔ برطانیہ میں چاول کی درآمد بالکل بند کردی گئی ہے۔ اور گیہوں کی درآمد میں ڈھائی لاکھ ٹن کی تخفیف منظور کرلی گئی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ متحدہ غذائی بورڈ میں گیہوں کی جو از سرِ نو تقسیم ہوگی اُس میں برطانیہ کو مزید گیہوں نہیں ملے گا۔ بلکہ ممکن ہے برطانیہ خود اپنے کوٹے میں سے کچھ ہندستان کو دے دے۔ دارالعوام میں وزیرِ غذا سر بن اسمتھ کی تقریر سے معلوم ہوا کہ برطانیہ میں بھی گیہوں سے زیادہ آٹا نکالنے کی بابت سوچا جارہا ہے۔

برطانیہ کے وزیرِ غذا نے ساری دُنیا کے سامنے اعلان کیا ہے کہ عالم گیر قحط کو روکنے کے لیے تمام ملکوں کو متحدہ طور پر کمربستہ ہوجانا چاہیے۔

اقوامِ متحدہ

لندن میں دُنیا کی پانچوں عظیم ترین طاقتوں کی ایک نشست ہوئی جس میں عالم گیر قحط پر بحث و مباحثہ ہوا۔ فروری کے دُوسرے ہفتے میں برطانیہ کے وزیرِ خارجہ مسٹر بیون نے پانچوں بڑی طاقتوں سے لندن میں اس موضوع پر بات چیت کی۔ اُس کے بعد اقوامِ متحدہ کی عام مجلس کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ دُنیا کے تمام ملکوں کے ماہرین اور غذائی وزیروں

کی ایک کانفرنس بُلائی جائے تاکہ آنے والے قحط کا مقابلہ کرنے کے لیے بین الاقوامی ذرائع و رسائل کو پُورے پُورے طور پر کام میں لایا جاسکے۔ عام مجلس میں مسٹر بیون نے پانچوں بڑی طاقتوں کی طرف سے جو تجویز پیش کی تھی وہ اتفاق رائے سے پاس ہوگئی۔ اس تجویز میں دنیا کی تمام حکومتوں سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ غلّہ فراہم کرنے، فصلیں جمع کرنے اور آنے والے چند مہینوں میں غلّے کی پیداوار بڑھانے کے لیے فوری کارروائی شروع کر دیں۔

عالم گیر غذائی اور زراعتی انجمن کے ڈائرکٹر جنرل "سر جان بوائڈ اور" نے اقوامِ متحدہ کو تار سے مطلع کیا کہ غذائی قلت دُور کرنے کے لیے انجمن عالم گیر بنیادوں پر جد وجہد کرنے کے لیے تیار ہے۔ تار میں اس بات کی بھی استدعا کی گئی تھی کہ اس مسئلے سے جو جو بین اقوامی انجمنیں متعلق ہیں اُن تمام کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ یو۔ ان۔ آر۔ آر۔ اے کے ڈائرکٹر جنرل "مسٹر ہربرٹ لہ یمن" نے بھی موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل سے فوری کارروائی شروع کرنے کی درخواست کی۔

دیگر ممالک | ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بعد فالتو اجناس کے لحاظ سے کنیڈا کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ کنیڈا کے شعبۂ تجارت نے اعلان کیا ہے کہ کنیڈا جولائی ۱۹۴۶ء تک ۱۴ کروڑ بوشل غلہ غیر ملکوں میں بھیجے گا۔ اس اعلان کے مطابق یہ مقدار اتنی ہے کہ اس سے پُورے انگلستان کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ یہ غلہ اتحادی غذائی بورڈ کے ذریعے ضرورت مند ملکوں میں تقسیم ہوگا۔ چھٹی کے دِنوں کو چھوڑ کر روزانہ اوسطاً دس لاکھ بوشل کی رفتار سے کنیڈا اپنا گیہوں جہازوں پر لاد کر باہر بھیج رہا ہے۔

اقوامِ متحدہ کی عام مجلس میں مسٹر پال مارٹن نمایندۂ کنیڈا نے اقوامِ عالم سے یہ وعدہ کیا کہ کنیڈا عالم گیر قحط کو روکنے کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھے گا۔ کنیڈا میں گیہوں اور دیگر رَوَانی اشیا کی نقل و حرکت کے لیے تمام ذرائع حمل و نقل درست کیے جارہے ہیں۔

آسٹریلیا کے وزیر اعظم مسٹر جے۔ بی۔ چیفلے اور وزیر تجارت مسٹر ولیم اسکلی نے بھی ایک اعلان میں ضرورت مند ملکوں میں گیہوں بھیجنے کا وعدہ کیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اُس ذخیرے میں سے بھی وقتِ ضرورت بھیجنے سے دریغ نہ کیا جائے گا جو دُوسرے موسم کے لیے محفوظ رکھا گیا ہے۔ جہازوں، ریلوں اور دیگر ذرائع حمل و نقل کو پُورے پورے طور پر کام میں لانے کی کوشش کی جائے گی۔ ان وزیروں نے کاشتکاروں سے مزید گیہوں پیدا کرنے کی بھی درخواست کی۔

جہاں تک سیام کا تعلق ہے ۱۵ ار فروری کو یہ خبر سُننے میں آئی کہ بنکاک میں ایک امریکی، برطانوی چاول کمیشن قائم ہونے والی ہے تاکہ سیام کے ۱۷ لاکھ ٹن فالتو چاول حاصل کرنے کا کام زیادہ تیزی سے چلایا جاسکے۔ اس میں حکومتِ سیام اور جنوبی مشرقی ایشیا کے دیگر فالتو چاول والے ملکوں سے باقاعدہ گفت و شنید کر کے مشترکہ پالیسیوں کی تشکیل کی جائے گی۔ معلوم ہوا کہ کچھ چاول سیام سے ہندستان پہنچ بھی چکا ہے۔ لیکن اندازہ ہے کہ اگر محض ہندستان ہی کی چاول کی قلت کو لیا جائے تو وہ سیام کے فالتو چاول سے دُور نہیں ہوسکتی۔ سیام میں جو فالتو چاول ہے وہ عام مقدار سے صرف دس یا بیس ہی فی صد زیادہ ہے۔ یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ سیام سے جو چاول باہر بھیجا جانے والا ہے اُس کا زیادہ تر

حصہ جنوبی مشرقی ایشیا کی قوموں کو دیا جائے گا۔ کچھ حصہ فلپائن میں بھی بھیجا جائے گا جہاں سخت قلت کا سامنا ہو۔

برطانیہ سیام کو سب سے زیادہ براہِ راست استعمال کی اشیا سپلائی کر رہی ہو مثلاً زراعتی آلات اور کپڑے وغیرہ تاکہ سیام کے کاشت کاران اشیا کے بدلے زیادہ سے زیادہ مقدار میں اپنا چاول فروخت کردیں۔ اصلی دقت یہ ہو کہ سیام کے کاشت کار اپنا غلہ جلدی نہیں فروخت کرتے اس لیے کہ اُن کو وہاں کے رائج سکہ جات پر اعتبار نہیں ہو۔ وہ اُس وقت تک اپنا غلہ نہیں بیچتے جب تک ان کو زر کے بدلے اشیا نہ ملیں۔

حکومت ارجنٹائن بھی عالم گیر قحط کو روکنے کے لیے تمام کوششیں عمل میں لا رہی ہو۔ فروری کے پہلے ہفتے میں جب عالمگیر غذائی قلت کا احساس بڑھنے لگا تو ارجنٹائن کے وزیروں کی ایک نشست ہوئی جس میں عوام سے غلہ کم خرچ کرنے کی استدعا کی گئی۔

رُوس کی طرف بھی بھوکی دُنیا کی امید بھری نگاہیں اُٹھ رہی ہیں۔ روس پہلا ملک ہو جہاں جنگ کے بعد کنٹرول اور راشن ختم کردیا گیا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہو کہ وہاں کی غذائی صورتِ حال بہت اطمینان بخش ہو۔ روس کے اخبارات میں ہندستان کی غذائی قلت سے کافی دلچسپی لی جا رہی ہو۔ سر راما سوامی موداِلیر نے اقوامِ متحدہ کی عام مجلس میں تقریر کرتے ہوئے روس سے ہندستان کی امداد کی خواہش ظاہر کی۔ یہ بھی سُننے میں آیا تھا کہ رُوس اگرچہ گیہوں کی پیداوار کے لیے مشہور ہو لیکن جدید زراعتی ترقیوں کے تحت وہ اب بڑی مقدار میں چاول بھی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس بات کے پیشِ نظر کہ اِس وقت پوری دُنیا، مخصوص طور پر ہندستان میں چاول کی سخت قلت ہو، کیا رُوس سے امداد کی توقع کی جاسکتی ہو؟

اس سلسلے میں ایبی سینیا کی پیش کش بہت دِل چسپ ہو۔ اقوامِ متحدہ کی عام مجلس میں غذائی مسئلے پر بحث و مباحثے کے دوران میں ایبی سینیا کے نمایندے نے بتایا کہ پتلے سوتی لباس کے عوض میں ایبی سینیا، ہندستان کو گیہوں اور دیگر اجناس مہیا کرسکتا ہو۔ ایبی سینیا میں سوتی کپڑوں کی بڑی قلت ہو اور وہاں ہندستان کی طرح بڑی بڑی کپڑے کی ملیں نہیں ہیں۔

(نوشتہ ۲۸ر فروری سنہ۱۹۴۶ء)

معاشی صورتِ حال

ریل بجٹ

پچھلے ماہ مرکزی اسمبلی میں سر ایڈورڈ بنتھل نے جو ریلوے بجٹ پیش کیا اس کے مطالعے سے سب سے پہلی بات جو واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جنگ کے ساتھ ساتھ ریلوں کی عارضی خوش حالی کا دور ختم ہوگیا۔ ۱۹۳۹ء میں ریلوں کی مجموعی آمدنی محض ۱۰۲ء۷۳ کروڑ رہی تھی۔ اس کے بعد جنگ کے چار سالوں میں اس آمدنی میں مستقل اضافہ ہوتا رہا۔ پچھلے سال کے اعداد کے مطابق یہ آمدنی بڑھ کر ۲۲۵ء۶ کروڑ تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن اگلے سال کے میزانیے میں آمدنی گھٹ کر محض ۱۷۷ کروڑ رہ جائے گی۔

جنگ کے دوران میں کارکردگی کے مصارف میں بھی قدرتاً اضافہ ہوا تھا ۱۹۳۹-۴۰ء میں ان مصارف کی مجموعی مقدار ۵۴ء۷۷ کروڑ رہی تھی ۱۹۴۴-۴۵ء میں ان کی مقدار ۱۲۳ء۴۳ کروڑ تھی۔ پچھلے سال کے مصارف کے اعداد کے مطابق ان میں تھوڑا سا اضافہ ہوا ہے بجائے متوقع ۱۴۰ء۶۵ کروڑ کے ان مصارف کی مقدار ۱۴۹ء۹۱ کروڑ ہوگئی ہے ان مصارف میں اضافے کے اسباب میں اسٹاف کا اضافہ، مہنگائی بھتہ، رعایتی غلّے کی دکانیں، کوئلہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۴۶-۴۷ء کے میزانیے کے متعلق جو تخمینے سر ایڈورڈ نے اسمبلی میں پیش کیے ہیں ان کے مطابق اگلے سال آمدنی میں کوئی ۴۸ کروڑ کی کمی ہوگی۔ سر ایڈورڈ کا خیال ہے کہ نئے سال میں مسافروں کی تعداد پچھلے سالوں کے مقابلے میں کم نہ ہوگی کیوں کہ جنگ کے دوران کی سفر کی پابندیوں یا دشواریوں کے خاتمے سے غالباً مسافروں کی تعداد کچھ بڑھے گی۔ ضروری اشیا کی ملک کے مختلف حصوں میں بڑی کمی ہے اس لیے یہ خیال غالباً غلط نہ ہوگا کہ اس قسم کی اشیا کی نقل و حرکت

سے ریلوں کی آمدنی کو بڑا سہارا ملے گا۔ لیکن فوجوں کی نقل و حرکت میں کمی ہوگی۔ ساتھ ہی پارسلوں کی آمدنی میں بھی تخفیف کا اندیشہ ہے۔ اس بنا پر بجٹ میں آئندہ سال ۴۸ کروڑ کی تخفیف کا اندازہ غالباً غلط نہیں ہے۔ کارکردگی کے مصارف کا تخمینہ ۱۲۵٫۷۳ کروڑ ہے۔

ریلوں کے منافع کے اعداد پر نظر ڈالیے تو یہ نتیجہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ۱۹۴۰-۴۱ء میں ریلوں کو ۱۸ کروڑ ۴۶ لاکھ کا نفع ہوا تھا۔ ۱۹۴۶-۴۷ء کے تخمینے میں اس کی مقدار گھٹ کر محض ۱۲ کروڑ ۲۲ لاکھ رہ گئی ہے۔ ۱۹۴۵-۴۶ء کے دُہرائے ہوئے (REVISED) اعداد کے مطابق اس سال کا نفع ۳۲ کروڑ ۷ لاکھ تھا۔

جنگ کے ابتدائی چند سالوں میں ریلوں نے اپنی آمدنی سے نہ صرف حکومتِ ہند کی وہ واجب الادا رقمیں جو سال بہ سال انھیں دے دینی ہوتی تھیں، ادا کر دیں بلکہ ساتھ ہی اپنے (DEPRECIATION FUND) فرسودگی کے فنڈ سے کوئی ۱ء۴۵۶ کروڑ کے گراں قدر عارضی قرضے بھی چکا دیئے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۴۶ء تک کے سات سالوں میں ریلوں نے حکومت کو کُل ۵۸۲٫۴۳ کروڑ روپے ادا کیے ہیں۔ ان میں (STRATEGIC) ریلوں کے نقصانات شامل نہیں ہیں۔ اور اس عرصے میں انھوں نے اپنے فنڈ اور سرمایہ محفوظ میں ۱۰۰٫۶۱ اور ۲۹٫۰۵ کروڑ روپے جمع کر لیے تھے۔

اِن اعداد سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ آنے والے سالوں کے لیے ریلوں کی مالی حیثیت بہت مضبوط ہے۔ ریلیں جیسا کہ سر ایڈورڈ نے اپنی بجٹ کی تقریر میں ارشاد فرمایا ہندُستان کی بہت بیش قیمت ملکیت ہیں اور ان کے متعلق اس سے زیادہ خوش آیند اور کون سی بات ہو سکتی ہے کہ سر ایڈورڈ نے اپنے زمانے میں ان کی مالیات کا انتظام اتنی لیاقت سے کیا تھا کہ ریلیں آنے والے زمانے کے تمام اندیشوں اور خطرات سے حُسن و خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں گی۔ لیکن آیئے ان اعداد پر ذرا نا ر نظر ڈالیں۔ سب سے پہلے سرمایۂ محفوظ کو لیجیے ——— ۱۹۴۴-۴۵ء میں اس فنڈ کو ۱۷٫۸۹ کروڑ ملے۔ ۱۹۴۵-۴۶ء کے بجٹ کے اعداد کے مطابق ریلوں کی آمدنی ۵۹٫۴۳ کروڑ روپے تھی۔ اس میں سے سود کے ۳۶٫۷۲ کروڑ اور حکومتِ ہند کی عام آمدنی میں ۲۳ کروڑ کی ادائیگی کے بعد اس فنڈ کے لیے صرف ۷ لاکھ روپے بچ رہتے ہیں۔ آیندہ سال اس فنڈ میں مزید ۱۰٫۸۶ کروڑ کے اضافے کی امید ہے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۴۷ء کو اس فنڈ میں ۲۹٫۱۱ کروڑ روپے لگے۔ لیکن اس میں سے ۱۲ کروڑ الگ کر کے ایک اور فنڈ جاری کیا گیا ہے جس کا نام اصلاحی فنڈ رکھا گیا ہے (ہم اس فنڈ سے آگے چل کر بحث کریں گے) ۷ کروڑ ابھی سے ریلوں کی عام کارکردگی کے لیے ضروری اصلاحات پر جو جنگ کی وجہ سے ٹل گئی تھیں خرچ کرنے کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ گویا اگلے سال کے اختتام پر ریلوں کے سرمایۂ محفوظ کی کُل مقدار ۱۰٫۱۱ کروڑ کی گراں بہا رقم رہ جائے گی۔ ''ایسٹرن اکونومسٹ'' نے ٹھیک کہا ہے '' آنے والے سالوں میں جب آمدنی گھٹے گی اس کی کم ہی امید کی جا سکتی ہے کہ اس فنڈ میں کوئی معتدبہ اضافہ ہو سکے گا اور یہ محفوظ سرمایہ ایک مضحکہ خیز سی بات ہو کر رہ جائے گا۔'' کم و بیش یہی حال D.F کا بھی ہے۔ پچھلے سال سر ایڈورڈ بنتھل نے اپنی بجٹ کی تقریر میں بتایا تھا کہ تقریباً ۲۹ فی صد انجن اپنی مدت سے زیادہ کام کر چکے ہیں اور انھیں جلد سے جلد بدل دینے

کی ضرورت ہو۔ اس سال بھی انھوں نے یہی بات دُہرائی ہو گو یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہو کہ ایک سال کے عرصے میں اس تناسب میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ گاڑیوں اور دُوسرے سامان کو بھی جنگ کے دوران میں بے تحاشا استعمال کیا گیا ہو۔ اس سلسلے میں بھی لازماً ترمیم وغیرہ کی ضرورت پیش آئے گی اور اس کل کام کے لیے جو مستقبل کے سالوں کے لیے اٹھا رکھا گیا ہو اس فنڈ کی رقم کسی طرح امید افزا نہیں کہی جا سکتی۔

اصلاحی فنڈ کے قیام کا اس حیثیت سے ضرور استقبال کیا جائے گا کہ آیندہ سال کی متوقع آمدنی میں سے تین کروڑ کی یہ رقم اگر اس فنڈ میں نہ ڈال دی گئی ہوتی تو غالباً یہ بھی حکومت ہند کے حوالے ہو جاتی۔ اور ریلوے کے نچلے درجے کے مسافروں کے لیے حالات کے بہتر بنانے کا کام اور بھی ٹل جاتا۔ ابتدا میں اس فنڈ میں ۱۱ کروڑ محفوظ سرمایے سے اور تین کروڑ سال کی آمدنی سے لیے جائیں گے۔ لیکن اس سلسلے میں چند باتیں ذہن میں رکھنے کی ہیں۔ یہ فنڈ تیسرے درجے کے مسافروں کے حالات بہتر بنانے اور ریلوے کے ملازمین کو مختلف آسانیاں فراہم کرنے کے لیے وجود میں آیا ہو۔ ریلوے کے ملازمین کو سہولتیں فراہم کرنا مسافروں کو سہولتیں فراہم کرنے سے بالکل الگ ایک کام ہو۔ ریلوے کے ملازموں پر جو کچھ بھی خرچ ہو وہ ریلوں کی کارکردگی کے اخراجات کا جزو قرار پانا چاہیے۔ یا پھر اس کے لیے ریلوں کے سرمایے سے رقم حاصل کی جانی چاہیے کہ ان اخراجات سے ریلوں کو مزید آمدنی کی امید ہو سکتی ہو۔ فارسی کا مشہور مصرع ہو کہ؎

نہ دور نوش دل کند کار نیش

پھر اب تک یہ فیصلہ نہیں کیا گیا ہو کہ اس فنڈ سے کسی پروگرام پر عمل کرنے کی کوئی اسکیم نہیں بنی ہو اس لیے گویا یہ اصلاحی کام حقیقتاً ایک اور سال کے ختم ہو جانے پر شروع ہوگا۔ اس فنڈ کے مستقبل کے متعلق بھی بہت سے شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ سر ایڈورڈ نے فرمایا ہو "اس سوال کا دار و مدار کہ آیندہ سالوں میں اس فنڈ میں کتنی رقم دی جائے اس پر ہوگا کہ حکومت ہند کی عام مالی ضروریات اور خود ریلوں کی اپنی ضروریات کیا ہوں گی"۔ مستقبل کے متعلق اس شتبہ سے اندازہ ہو جیسا کہ کیپیٹل نے لکھا ہو یہ خیال پیدا ہوتا ہو کہ ایک نئے فنڈ کے قیام کی ضرورت ہی کیا ہو۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس مقصد کے لیے ریلوے کے محفوظ فنڈ سے کام نہ لیا جائے۔ ایک اصلاحی فنڈ کی ضرورت تو ایک مستقل ضرورت ہو لیکن اگر اس کا قیام باقاعدہ بنیادوں پر نہ پڑے تو اس سے کچھ بہت زیادہ فائدہ پہنچنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہو کہ آل انڈیا ریلوے مین فیڈریشن نے اس فنڈ کے قیام کے لیے یہ تجویز کیا تھا کہ اس کے لیے ہر سال سرمایے کا ½ فی صدی الگ کر دیا جایا کرے۔

کونسل آف اسٹیٹ میں ریلوے کی جنگی خدمات کو سراہتے ہوئے سر آرتھر گرفن نے ریلوے کے کارخانوں کی بنائی ہوئی بہت سی چیزوں کی مقدار کا ذکر کیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ہندستان سے باہر انجن اور دوسری ضروری چیزوں کی برآمد کا بھی ذکر کیا۔ چھوٹے انجنوں (METRE GUAGE LOCOMOTIVES) میں سے آٹھ فی صدی اور ۱۵ فی صدی چھوٹے ڈبے اس طرح باہر بھیجے گئے تھے۔ بڑی لائنوں پر

چلنے والے انجنوں کو بھی ترمیم کے بعد باہر بھیج دیا گیا۔ چار ہزار میل لمبی ریلوے لائنیں بھی برآمد کی گئیں۔ اور نتیجۃً خود ملک کے اندر ریلوں میں کمی کرنی پڑی۔ اب بھی جنگ سے پہلے جتنی گاڑیاں چلتی تھیں سب نہ چل سکیں گی کیوں کہ ۱۸۰۰ ڈبّے اب بھی فوج کے پاس ہیں۔ اس سلسلے میں یہ خبر خوش آیند ہے کہ کچھ نئی لائنوں کی تعمیر اور کچھ موجودہ لائنوں کی ترمیم وغیرہ کے لیے آیندہ سال ۲۲ کروڑ رُپے صرف کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ نئی ریلوں کی تعمیر اور جنگ کے دوران میں جو لائنیں ختم کردی گئی تھیں انھیں دوبارہ جاری کرنے کا ایک پروگرام صوبہ جاتی حکومتوں سے مل کر بنالیا گیا ہے۔ ۳۰۰۰ میل لمبی لائنوں کے لیے مختلف ضروری جائزے لیے جارہے ہیں اور اس مقصد کے لیے ۲ کروڑ رُپے صرف کیے جائیں گے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی بیش تر کام آیندہ سال کے اختتام پر ہی شروع ہوگا۔

سر ایڈورڈ کے اس آخری بجٹ کی شاید سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں ہر بات مستقبل کے لیے اٹھا رکھی گئی ہے۔ مسافروں کے آرام و آسایش کے لیے سر ایڈورڈ نے بہت سارے وعدے کیے ہیں۔ نئے قسم کے ڈبّے اور درمیانہ درجوں کے لیے سونے اور پنکھے کا انتظام وغیرہ اور اسی طرح نئی لائنوں کی تعمیر کے لیے بھی۔ مزدوروں کے مطالبات اور ان کی آسایش کے مسئلے کو بھی اسی طرح انھوں نے مستقبل کے متعلق امیدیں دلا کر ٹال دیا ہے۔ ان کے لیے طبّی اور تعلیمی سہولتوں، مکانات، فنّی تربیت وغیرہ کے مسائل پر غور و خوض ہو رہا ہے اور ریلوے بورڈ انشاء اللہ اپنے بعد از جنگ کے پروگرام میں مزدوروں کی بہبود کے مقصد کو ضرور پیش نظر رکھے گا۔

سر ایڈورڈ بنتھل نے مستقبل کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ریلوے کنونشن میں تبدیلی کی بہت سخت ضرورت ہے۔ حکومتِ ہند کو ایک متعین رقم کی ادائگی کی پابندی کی وجہ سے ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح ریلیں جنگ کی خوش حالی کے زمانے میں بھی اپنے محفوظ فنڈ یا سود تی فنڈ میں کوئی معتدبہ رقم جمع کرنے سے محروم رہیں۔ اس سال بجٹ کے تخمینے میں آمدنی سے ایک کروڑ ۸۶ لاکھ کی رقم ریلوے کے محفوظ سرمایے میں منتقل کرنے کی امید ظاہر کی گئی ہے۔ لیکن یہ بھی اس لیے ممکن ہو سکا ہے کہ ریلوں کی بچت میں سے حکومتِ ہند کی عام آمدنی (GENERAL REVENUES) کے لیے پُرانے اصولِ تقسیم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور بہ جاے ایک متعین رقم کی ادائگی کے اب حکومتِ ہند کو تجارتی لائنوں میں لگے ہوئے سرمایے کا ایک فی صدی ملے گا۔ اس میں سے STRATEGIC لائنوں کے نقصانات بھی نکال دیے جائیں گے اور اس کے بعد جو کچھ بچ رہے گا اس میں سے تین کروڑ نکال کر نصف حکومت کو دے دیا جائے گا۔ آنے والے سالوں میں جب ریلوے کے میزانیے میں توازن کے متعلق بھی اندیشے پیدا ہو رہے ہیں، ریلوے کی مالیات کے لیے اس کنونشن سے ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوگا۔

اوپر ہم نے فرسودگی فنڈ کی کمی کا ذکر کیا ہے۔ اس صورتِ حال کی ذمّے داری اس بات پر ہے کہ اس فنڈ کے لیے رقمیں علاحدہ کرنے کا اصول غلط ہے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں جب یہ فنڈ قائم کیا گیا تھا تو اصول یہ بنایا گیا تھا کہ ریلوں میں لگے ہوئے سرمایے سے ۱/۶۰ فی صدی اس فنڈ کے لیے الگ کر دیا جائے گا۔ خیال یہ تھا کہ ریلوے انجن، مال ڈبّوں وغیرہ کی عمر ۶۰ سال ہوتی ہوگی یعنی انھیں ۶۰ سال بعد بدلنے کی ضرورت

پیش آئے گی۔ اس وقت یہ بات بھلا دی گئی کہ جب یہ فنڈ قائم ہوا تو ریلوے انجنوں کی عمر کا ایک حصہ گزر چکا تھا۔ گویا یہ فنڈ شروع سے ہی اپنے مقصد کے لیے ناکافی تھا۔ پچھلے سال حکومتِ ہند نے تحقیقات کا کام شروع کیا تھا لیکن مختلف بہانے بنا کر اسے کرد یا گیا۔ اس سلسلے میں بجا طور پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حکومت اس تحقیقات کے نتائج سے ڈر گئی۔ کیوں کہ اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ ریلوں کے ایسے سامانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنھیں بدلنے کا کام بہت اہم ہو چکا ہے تو ریلوں کی مجموعی آمدنی سے اس مقصد کے لیے بڑی رقم الگ کرنی پڑتی۔ کیوں کہ یہ مسئلہ اصل اتنی ہی اہم ہے جتنی ریلوں کی عام کارکردگی کے مصارف۔ اور نفع کے تعین سے پہلے اس فنڈ کے لیے رقم الگ کرنی ہوتی اور اس بات کا ریلوں نے حکومتِ ہند کو جو سال بہ سال رقمیں دی ہیں اُن پر اثر پڑتا۔ پچھلے سال ہی یہ فنڈ ختم ہو چکا تھا کیونکہ پچھلے سال جو ریلوں کے لیے نیا سامان منگایا گیا اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ اور اگر اس فنڈ سے ان کی قیمت ادا کی گئی ہوتی —— جیسا کہ عام حالات میں ہونا چاہیے تھا تو یہ فنڈ ختم ہو چکا ہوتا۔ لیکن اس مقصد کے لیے سال کی آمدنی سے ایک خطیر رقم لی گئی۔ آیندہ کے متعلق جب ریلوں کی آمدنی گر رہی ہوگی اس فنڈ کے لیے اس طرح کے سہارے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ضرورت ہے کہ اس فنڈ کی بنیاد سائنٹفک اصولوں پر رکھی جائے۔

ریلوے کے کرایوں کے متعلق یہ امید کی جا رہی تھی کہ جنگ کے اختتام کے بعد ان میں کچھ کمی ہو سکے گی یہ امید پوری نہیں ہوئی سر ایڈورڈ بنتھل نے یہ سوال بھی مستقبل کے لیے اُٹھا رکھا ہے۔ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ کرایوں کی سطح، اُجرت وغیرہ کے مسائل بہت ہی پیچیدہ ہیں اور ان کا دار و مدار اس پر ہے کہ مستقبل میں قیمتوں کی عام سطح کیا ہوگی۔ مصارفِ زندگی کم ہوں گے یا اسی سطح پر باقی رہیں گے جو دورانِ جنگ میں تھی۔ یہ سب ٹھیک بھی ہے، اس مسئلے کا کوئی دیرپا حل ابھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ریلوں کے کرائے کے موجودہ نظام میں تبدیلیوں کی گنجایش ہے بلکہ ان تبدیلیوں کی بڑی سخت ضرورت ہے کرایوں کے متعلق ایک عام شکایت یہ رہی ہے کہ ان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیرونی ممالک سے درآمد کو ملک کے اندر دور دراز حصوں میں نسبتاً سستے طور پر پہنچایا جاتا ہے۔ اور یہ صورت ملکی صنعتوں کے لیے بہت ہی نقصان دہ ہے۔ اس کے علاوہ اس نظام میں اور بھی بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔ ریلوے کانفرنس ایسوسی ایشن نے ان اصلاحات کا کام سنہ ۱۹۴۳ء میں شروع کیا تھا۔ یہ کام خاصا پیچیدہ اور مشکل تھا۔ اب تک ہندستان کی مختلف ریلیں مختلف کمپنیوں کی ملکیت تھیں۔ اور ان کمپنیوں کو اپنی ریلوں کے کرائے وغیرہ کے تعین کرنے کا پورا پورا حق تھا۔ نتیجتہً اب کوئی دس سے بیس ہزار تک کے مختلف کرایوں کا مطالعہ کرنا اور انھیں باہم ہم آہنگ کرنا ہے تب کہیں جا کر یہ خرابیاں دور کی جا سکیں گی۔ مثلاً اب سے پہلے ایک خرابی یہ تھی کہ کوئی سامان اگر دو ریلوں پر سفر کرے تو دونوں ریلیں کرائے کے تعین میں اس بات کا خیال رکھتی تھیں کہ اس سفر کا کتنا حصہ ان کی اپنی لائن پر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سفر کے طول کا جو فائدہ سامان بھیجنے والوں کو ملتا تھا وہ نہ مل سکتا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ سفر جتنا طویل ہو کرائے کی شرح اسی تناسب سے کم ہوتی جائے۔ لیکن جُداگانہ ریلوں کی موجودگی میں یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں ویجوڈ کمیٹی نے ٹیلیس کوپ

شرحوں کی مخالفت کی تھی کہ اس سے ریلوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ لیکن خوشی کی بات ہو کہ ریلوے کانفرنس ایسوسی ایشن کی محنتوں سے یہ اور اس طرح کی اور بہت سی اصلاحات اب ممکن ہوگئی ہیں۔ اور سر ایڈورڈ بنتھل نے وعدہ کیا ہو کہ سال گزرنے سے پہلے اسمبلی کی ایک کمیٹی کے سامنے وہ ان اصلاحی تجویزوں کو پیش کریں گے۔

لیکن مستقبل کے متعلق سر ایڈورڈ نے ایک اور خطرے کا اظہار کیا ہو۔ ریلوں کے مصارف کارکردگی میں بہت نمایاں اضافہ ہوگیا ہو۔ پھر بعد از جنگ کے لیے سہولتوں کی فراہمی کی بہت ساری اسکیمیں بنائی گئی ہیں۔ انھیں پورا کرنے کے لیے غالباً موجودہ شرحوں کو اونچا کرنا ہوگا کیوں کہ یہ آج کی عام قیمتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہیں۔ اخراجات کا تناسب (یعنی کارکردگی کے مصارف اور مجموعی آمدنی کا باہمی تناسب) اگلے سال کے لیے بہت ہی اونچا ہوگیا ہو۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں یہ تناسب ۶۷،۶ فی صدی تھا۔ سنہ ۱۹۴۴-۴۵ء میں ۶۶ فی صدی لیکن آیندہ سال کے لیے یہ تناسب ۹۷،۸ فی صدی ہوگا۔ ریلوں کے ان مصارف کو کم کرنے یا پھر آمدنی بڑھانے کی کوشش ناگزیر ہو۔ اسمبلی میں بجٹ کے مباحثوں میں یہ بات کہی گئی ہو کہ اونچی اونچی تنخواہ پانے والوں کی تنخواہوں میں کمی کی جائے۔ بلاشبہ یہ ضروری اصلاح ہو لیکن اس سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اونچی تنخواہیں پانے والوں کی تعداد بہت ہی مختصر ہو۔ سر ایڈورڈ بنتھل نے اسمبلی کو بتایا ہو کہ ۰۰۰ ۱ سے زیادہ پانے والوں کی تنخواہیں کم کردی جائیں تو اس طرح دوسرے مزدوروں کو محض ۸ر اور فی کس دیا جاسکے گا۔ اور یہ شکایت پرانی ہو کہ ریلوے کے مزدوروں کی تنخواہیں بہت کم ہیں۔ اور ان میں اضافہ ہونا چاہیے۔ پچھلے سال مصارف میں اضافے کے اسباب میں مہنگائی بھتہ، کوئلے کا خرچ اور ریلوے کے سامان کی بڑھی ہوئی قیمت کو بہت دخل تھا۔ اجرتوں میں کمی کا تو اس وقت کوئی سوال نہیں۔ کوئلے کی قیمتیں بھی فی الحال کم نہیں ہوسکتیں۔ لیکن جیسا کہ اسمبلی میں تجویز کیا گیا ہو اس سلسلے میں ضروری ریسرچ ہونا چاہیے۔ ریلوے کے لیے مختلف ضروری چیزوں کو ملک کے اندر تیار کیا جائے تو بہت ہی اچھا ہو۔ بدقسمتی سے یہ بات اب تک اٹھا رکھی گئی ہو۔ حالاں کہ دورانِ جنگ میں اسٹریلیا اور کینیڈا وغیرہ نے صنعتی حیثیت سے بہت زیادہ ترقی کی ہو۔ اور یہ سب کچھ ہماری سیاسی محکومی کا نتیجہ ہو۔

(نوشتہ ۳ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء)

مرکزی بجٹ

قبل اس کے کہ مرکزی بجٹ کی خامیوں یا خوبیوں پر بحث کی جائے ضرورت ہو کہ ہم اس کے اہم نکات پر ایک نظر ڈال لیں سالِ رواں (سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء) کے تخمینے جو سال کے شروع میں پیش کیے گئے تھے، یہ ہیں :-

اخراجات	۵۱۷،۶۳ کروڑ روپے
آمدنی	۳۶۲،۳۴ 〃 〃
خسارہ	۱۵۵،۲۹ 〃 〃

لیکن گزشتہ نظرِ ثانی کے بعد سالِ رواں کی آمدنی اور خرچ کا حساب یہ ہے :۔

اخراجات	۵۰۵،۶۱ کروڑ رُپے
آمدنی	۳۶۰،۶۶ " "
خسارہ	۱۴۴،۹۵ " "

نئے سال (سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء) کے لیے جو تخمینے پیش کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں :۔

اخراجات	۳۵۵،۷۱ کروڑ رُپے
آمدنی	۲۸۵،۵۵ " "
خسارہ	۷۰،۱۶ " "

اس خسارے میں کمی کرنے کے لیے "وار رسک انشورنس فنڈ" کی آمدنی کو مرکزی حکومت کی آمدنی میں شامل کر دیا گیا ہے جس کے بعد نئے سال کے خسارے کا تخمینہ صرف ۴۴،۰۶ کروڑ رُپے کے برابر ہوتا ہے۔

فوجی دفاع کے اخراجات یہ ہیں :۔

سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء کے لیے ابتدائی تخمینہ	۳۹۴،۲۳ کروڑ رُپے
سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء کے لیے نظرِ ثانی کے بعد کا تخمینہ	۳۷۶،۴۲ کروڑ رُپے
سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء کا تخمینہ	۲۴۵،۳۴ " "

ممبر مالیات نے یہ اعلان کیا کہ فوجی دفاع کے سلسلے میں حکومتِ ہند اور حکومتِ برطانیہ کے درمیان جو مالیاتی معاہدہ ہے وہ نئے سال میں بھی جاری رہے گا۔

ٹیکسوں کے سلسلے میں مندرجۂ ذیل تبدیلیاں ہوئی ہیں :۔

زائد منافع ٹیکس ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء کے بعد سے اُٹھا دیا جائے گا۔ ساڑھے تین ہزار سے اوپر کی آمدنی پر اب ۱۵ پائی کی بجائے ۱۲ پائی یعنی ایک آنہ ٹیکس عائد ہوگا۔ اور پانچ ہزار سے اوپر کی آمدنی پر دو آنے ایک پائی کی بجائے صرف دو آنے۔ کمائی آمدنی پر جو ٹیکس ہے اسے ⅕ حصے تک رکھا جائے گا۔ کمپنیوں پر جو موجودہ انکم ٹیکس اور "سوپر ٹیکس" ہے اسے اب ۷½ آنے سے گھٹا کر چھ آنے کر دیا جائے گا۔ سونا اور سونے کے سکوں پر ۲۵ رُپے فی تولہ محصول بٹھا دیا جائے گا۔ چاندی کا محصول بڑھا کر ۸ رتی اونس کر دیا جائے گا۔ کراسن تیل کا محصول ۴ آنے ۶ پائی سے گھٹا کر ۳ آنے ۹ پائی کر دیا جائے گا۔ موٹر اسپرٹ کا محصول بھی گھٹایا جائے گا۔ چھالیہ کی درآمد پر محصول بڑھایا جائے گا۔ سینی میٹوگراف فلموں پر محصول لگایا جائے گا۔ نئی عمارتوں اور نئی مشینوں اور پلینٹوں کو فرسودگی بھتہ اور سائنٹفک ریسرچ کے لیے الاؤنس دیا جائے گا۔ خام مال اور مشینوں اور پلینٹوں کی درآمد پر محصول گھٹایا جائے گا۔ روئی کی درآمد پر سنہ ۱۹۴۲ء میں جو محصول کا اضافہ کیا گیا تھا اُسے اب عام محصول میں شامل کیا جائے گا۔

کمپنیوں کے منافع کا وہ حصہ جو حصّے داروں میں قابلِ تقسیم ہوتا ہے اُس کے ٹیکس میں بھی ردّوبدل کیا گیا ہے جس پر آیندہ سطور میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔ انشورنس کمپنیوں کے موجودہ ٹیکس میں ۳ پائی کی کمی کی گئی ہے۔ ۱۵ ہزار سے زیادہ کی آمدنی پر ½ آنے کا ٹیکس بڑھا دیا گیا ہے۔

بجٹ سے متعلق اب تک مُلک کے مختلف حلقوں میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے انھیں ہم مختصر طور پر دو حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اس بجٹ سے مزدور و کسان اور نچلے متوسط طبقوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اور دولت مند تجارتی و صنعتی طبقوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ دُوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کی رائے میں موجودہ بجٹ اس لیے غیر منصفانہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے صنعتوں اور تجارت پر سے موجودہ پابندیوں کو ہٹا کر مُلک کی آیندہ معاشی ترقی کی راہ کھول دی ہے جس سے بے روزگاری دُور ہوگی اور اس طرح نچلے متوسط اور مزدور طبقوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اس اختلافِ رائے کی بنیاد اس بات پر قائم ہے کہ بجٹ کی مد سے زائد منافع ٹیکس کو اُٹھا دیا گیا ہے لیکن بالواسطہ ٹیکسوں میں بہت کم کمی کی گئی ہے۔ ہم عام طور پر انھی دو مخالف زاویۂ نگاہ سے قارئین کو موجودہ بجٹ کی خامیوں یا خوبیوں سے آشنا کرانے کی کوشش کریں گے۔ ہم موخرالذکر نقطۂ نگاہ سے پہلے بحث کریں گے۔

موخرالذکر حلقہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہمیں بجٹ کو سب سے پہلے اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ یہ مُلک کے موجودہ مالیاتی اور معاشی تقاضوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں یعنی موجودہ بجٹ ان ضرورتوں کے مطابق ہے یا نہیں جو اختتامِ جنگ اور ابتدائے امن کے عبوری دَور کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ جنگ کے ختم ہونے سے جو مسائل پیدا ہوگئے ہیں اور مُلک کی نئی منصوبہ بندیوں سے جو مسائل پیدا ہوں گے وہ اس بجٹ کی مدد سے حل ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً جنگ کے ختم ہونے کے بعد ضرورت ہے کہ جنگی مصارف کو بند کیا جائے۔ افراطِ زر کا خاتمہ کیا جائے اور جنگ کے زمانے کے عائد کردہ ٹیکسوں میں کمی کی جائے۔ پھر نئی معاشی منصوبہ بندی کا تقاضا ہے کہ حکومت کے لیے آمدنی کے نئے ذرائع پیدا کیے جائیں۔ تفریطِ زر کے خطرناک رجحانات کو روکا جائے اور سرکاری اخراجات کو جہاں تک ممکن ہوسکے زمانۂ جنگ کی سطح پر رکھا جائے۔ وغیرہ۔

ان باتوں کا جہاں تک سوال ہے نئے سال کا بجٹ یقیناً ہماری توقعات کو بہت حد تک پورا کرتا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ ہم انھی باتوں کی روشنی میں موجودہ بجٹ کی تفصیلات پر غور کریں یعنی موجودہ بجٹ سے خصوصاً ٹیکسوں میں ردّوبدل سے مرکزی حکومت کی مالی پوزیشن مضبوط ہوتی ہے یا نہیں؟ موجودہ بجٹ نے کس طرح ملک کی معاشی حالت درست کرنے کے لیے صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کی ہے۔ اور منصوبہ بندی کے سلسلے میں بجٹ کے اندر اخراجات کی مد کیا ہے ٹیکسوں میں جو ردّوبدل ہوا ہے اُس سے صنعت کو کیا فائدہ پہنچتا ہے اور اس کا حکومت کی مالی حالت پر خراب اثر پڑتا ہے یا اچھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک مرکزی حکومت کی مالی حیثیت کا سوال ہے سب سے پہلے ہم اخراجات کو لیں۔ عام توقع کے مطابق جنگی اخراجات اور خسارے میں کمی ہونی چاہیے۔ موجودہ بجٹ اس توقع کو بڑی حد تک پورا کرتا ہے۔ سالِ رواں کے شروع میں خسارے کا جو تخمینہ کیا گیا تھا اُس میں ۴۳ر۰۱ کروڑ روپیوں کی کمی ثابت ہوئی۔ پھر نئے سال کے لیے خسارے کا جو تخمینہ کیا گیا ہے وہ ٹیکسوں میں ردّوبدل کے باوجود صرف ۴۴ر۰۷ کروڑ رُپے ہیں لیکن یہاں پر یہ بھی خیال رہے کہ توسیع و ترقی کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے اور صوبائی حکومتوں کے لیے جو رقمیں نکالی جائیں گی وہ بھی مرکزی حکومت کے اخراجات میں شامل ہیں اس طرح سالِ آیندہ کے خسارے کی اہمیت بہت گھٹ جاتی ہے جنگی اخراجات کے سلسلے میں حکومتِ ہند کے قرضوں میں ۷۰۰ کروڑ رُپیوں کا جو اضافہ ہوگیا ہے اس سے یقیناً مرکزی حکومت کی مالی پوزیشن پر خراب اثر پڑا ہے لیکن اس کی ذمّے داری ایک شخص پر عائد نہیں کی جاسکتی بلکہ

[illegible] وحالات پر۔ جنگی اخراجات میں بہت زیادہ کمی نہیں ہوسکی۔ لیکن یہ چیز کوئی بہت زیادہ قابلِ اعتراض نہیں ہے اس لیے کہ جنگ کے ختم ہونے کے [illegible] دفاع کے سوال کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ بلکہ ممکن ہے متوقع سیاسی تبدیلیوں کے بعد حکومت کو دفاع میں اور بھی زیادہ اخراجات برداشت کرنا پڑیں۔ کم سے کم جنگ سے پہلے کے مقابلے میں ہندستان کو اب کہیں زیادہ دفاعی اخراجات برداشت کرنا پڑیں گے۔ چنانچہ دفاعی اخراجات میں موجودہ کمی قابلِ اطمینان قرار دی جاسکتی ہے۔ دوسری مدوں کے تحت بھی زیادہ کمی کی توقع کرنا نامناسب ہوگا۔ آیندہ دنوں میں حکومت کے تنظیمی ڈھانچے میں اور اضافے ہی کی امید ہے۔ بڑی بڑی تنخواہوں میں کمی ضرور کی جاسکتی ہے لیکن کم تنخواہوں کے بھتوں میں اس وقت تک کمی نہیں کی جاسکتی جب تک مہنگائی باقی ہے۔

جہاں تک آمدنی کا سوال ہے پوزیشن یہ ہے۔ آمدنیوں پر ٹیکس سے جو رقم آتی تھی اس میں کمی ہوگئی ہے۔ ریلوں اور تجارتی شعبوں اور سکہ جات سے حاصل ہونے والی آمدنی میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء کے لیے سکہ جات کی آمدنی کے سلسلے میں جو تخمینہ کیا گیا ہے اُس سے معلوم ہوا کہ وہ سالِ رواں کی آمدنی (۲۲ء۵ اکروڑ رُپے) سے صرف چار لاکھ رُپے کم ہوگی۔ اگر تفریطِ زر کی صورت نہیں پیدا ہوئی تو سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء کے بعد ریزرو بینک کی آمدنی میں کوئی بہت زیادہ کمی نہیں ہوگی۔ جہاں تک تجارتی شعبوں کی آمدنی کا تعلق ہے کمی بالکل واضح ہے اس لیے کہ سنہ ۴۴-۱۹۴۳ء میں اس مد کے تحت حکومت کو ۱۶ء۴۶ کروڑ رپیوں کی آمدنی ہوئی تھی لیکن سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء کے لیے جو تخمینہ پیش کیا گیا ہے وہ ۱۲ء۱۷ کروڑ ہے۔ ڈاک اور تار کی بچت کا تخمینہ سالِ آیندہ کے لیے دس کروڑ رُپے ہے لیکن اس کا صرف ۱/۲ حصہ حکومت کی آمدنی میں آئے گا۔ ریلوں سے البتہ جنگ کے دوران میں حکومت کو معقول آمدنی ہوئی ہے۔

مرکزی حکومت کی آمدنی میں سب سے بڑی کمی بلاواسطہ ٹیکسوں کی تخفیف سے ہوئی ہے۔ سالِ رواں کے بجٹ میں یہ آمدنی ۸۶ء۱۶۱ کروڑ رُپے دکھلائی گئی ہے جو سنہ ۴۵-۱۹۴۴ء کے مقابلے میں ۸۲ء۴۷ کروڑ رپے کم ہے۔ صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو کمی اس سے بھی زیادہ ہوگی اس لیے کہ سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء کے لیے اس مد کے تحت جو تخمینہ پیش کیا گیا ہے اس میں وہ ۷۵ کروڑ رُپے بھی شامل ہیں جو زائد منافع ٹیکس کے تحت سالِ آیندہ تک وصول کیے جاتے رہیں گے اگرچہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء سے اس ٹیکس کو منسوخ کردیا گیا ہے۔ ٹیکسوں میں جو کمی کی گئی ہے اُس سے مجموعی طور پر مرکزی حکومت کی آمدنی میں ۴۰ کروڑ رُپے کی کمی ہوگئی ہے۔

لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو ٹیکسوں میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں اُن سے ایک ایسا ٹیکس سسٹم وجود میں آیا ہے جس سے حکومت کی آمدنی میں سال بہ سال اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔ موجودہ ردّوبدل کے تحت امیر طبقوں سے زمانۂ جنگ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ٹیکس کی رقم وصول ہوگی۔ جہاں تک سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء کا تعلق ہے زائد منافع ٹیکس کے تحت حکومت کے پاس رقم آتی ہی رہے گی جس سے معاشی منصوبہ بندی کا کام شروع کیا جاسکے گا۔ اگر بالواسطہ ٹیکسوں میں بہت زیادہ ردّوبدل نہ ہوا تو اُن کے ذریعے حکومت کی آمدنی میں سال بہ سال اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔ پھر جب ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت ایک بار چل پڑے گی تو حکومت کی آمدنی کے جتنے خاص خاص ذرائع ہیں وہ سال بہ سال سرعت کے ساتھ وسیع ہوتے چلے جائیں گے۔ اس طرح موجودہ تبدیلیوں سے حکومت کی آمدنی میں جو کمی ہوگئی ہے وہ دور ہوجائے گی۔ بالکل فوری طور پر منصوبہ بندی کا کام شروع کرنے کے لئے حکومت کو چاہیے کہ فوتی محصول کا طریقہ جلد از جلد جاری کردے تاکہ منصوبہ بندی کے کام کے لیے اُسے مندرجہ بالا ذریعوں سے آمدنی کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

تعمیر و توسیع کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے صوبائی حکومتوں کو ۹۰ کروڑ روپے منصوبہ بندی کی اسکیموں کے لیے پیشگی کے طور پر دیے جائیں گے اور مزید ۱۵ کروڑ بہ طور قرض پیداواری کاموں کے اجرا کے لیے۔ ۷ کروڑ روپے اُن علاقوں کے لیے نکالے گئے ہیں جن کی تنظیم مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں ۲۲ کروڑ روپے ریلوں کی توسیع و ترقی کے لیے جو ریل بجٹ میں شامل ہے۔ تعمیرات کے اخراجات کا ۱۲ ½ فی صد حکومت ادا کرے گی بہ شرطیکہ صوبائی حکومتیں بھی ۱۲ ½ فی صد خرچ برداشت کرنے پر تیار ہو جائیں۔ ریلوں، سڑکوں اور ہوائی حمل و نقل کی توسیع و ترقی کے لیے بھی مرکزی حکومت نے نئے بجٹ میں اخراجات کی مد نکالی ہے۔

ٹیکسوں میں نئے ردّ و بدل سے مُلک کی صنعت و حرفت کو ترقی کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ زائد منافع ٹیکس اور خام مال اور مشینوں کی درآمد پر سے موجودہ پابندیوں کا اُٹھا لینا، سائنٹفک ریسرچ کے لیے امدادی رقم دینا، صنعتی مالیاتی کارپوریشن کا قیام، کمپنیوں کے منافع کو سرمایے میں لگانے کے لیے کنٹرول کا انتظام وغیرہ ــــــــ یہ تمام باتیں صنعتی ترقی کے لیے ضروری اور مفید ہیں۔

کمپنیوں کے منافع کی تقسیم کے سلسلے میں حکومت نے جو نیا ٹیکس رائج کیا ہے اس سے یہ ہوگا کہ کمپنی کے منافع کا معقول حصہ سرمایے میں چلا جائے گا جو اس کی توسیع و ترقی کے لیے ضروری ہے۔

جن لوگوں کا خیال ہے کہ نئے ٹیکسوں سے صرف امیروں کا فائدہ ہے اور غریبوں کو نقصان۔ ان کو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ غریبوں کا اصل فائدہ اس میں ہے کہ صنعتوں کو ترقی دے کر اور منصوبہ بندی کے پروگرام کو عمل میں لا کر بے روزگاری دُور کی جائے اور اس طرح اُن کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کی جائے اس کے لیے ملکی صنعتوں پر سے موجودہ پابندیوں کا ہٹانا ضروری تھا۔

یہ صحیح ہے کہ موجودہ کارروائیوں سے مُلک کی صنعتی ترقی بڑے پیمانے پر ہوگی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومت نے اس بات کا انتظام کیا ہے کہ سرمایے داروں کو جو منافع ہوگا اس کا ایک معقول حصہ مزدوروں اور عوام کی جیب میں بھی پہنچے۔ یہ فرض کر لینا کہ جب صنعتی ترقی ہوگی تو عوام کا معیارِ زندگی خود بہ خود بلند ہوگا اس بات کا ثبوت ہے کہ حکومت نے محنت کشوں اور مزدوروں کو سرمایے داروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔

جنگ کی معیشت کو امن کی معیشت میں بدلنے کے لیے اور اس سے پیداشدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے پُورے طور پر ذاتی کاروبار کے غیر یقینی رجحانات پر بھروسہ کیا جا رہا ہے جو خطرناک ہے۔

انگریزی حکومت ہندستان کے موجودہ معاشی نظام کی خرابیوں کو دائمی بنا دینا چاہتی ہے۔ جس سے یہ ہوگا کہ عوامی وزارتیں عوام کے فائدے کے لیے کچھ نہ کر سکیں گی اور بدنام ہو جائیں گی۔ اور بے روزگار پبلک اور سرمایے داروں کے باہمی تصادم و آویزش کا شکار ہو کر رہیں گی۔

یہ ہیں وہ موافق اور ناموافق خیالات جو موجودہ بجٹ کے متعلق مُلک کے طول و عرض میں ظاہر کیے جا رہے ہیں۔

ـــــــ ٭ ـــــــ

تبصرہ

ہندستانی معاشیات کے مبادی | مصنفہ جناب شرف الدین صاحب بی۔ اے۔ حجم ۲۵۸ صفحات۔ قیمت ۲ رُپے (عگہ)

پیشِ نظر کتاب ہندستان کے معاشی مسائل کا ایک ابتدائی (ELEMENTARY) مطالعہ ہے۔ قدرتی ذرائع، مسئلۂ آبادی، معاشی زندگی کی تبدیلی، زراعت، صنعتی ترقّی، نقل وحمل، تجارت، زر اور مالیات سبھی مسائل سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ لیکن یہ بحثیں بہت حد تک تشنہ ہیں۔ مثال کے طور پر مسئلۂ آبادی کو لے لیجیے۔ یہ ہماری معاشی زندگی کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ لیکن اس کتاب میں اسے صرف دو صفحے ملے ہیں۔ ظاہر ہے ان دو صفحوں میں اس مسئلے کی نوعیت یا اس کے حل کی تفصیل اور دلائل کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔

ہندستان کے معاشی مسائل | سلسلۂ مطبوعات ادارۂ معاشیات نمبر (۸)، از محمد ناصر علی صاحب ایم۔ اے، قیمت چار رُپے ضخامت ۳۹۹ صفحات۔

یہ کتاب بھی مبتدیوں کو معاشیات سے آشنا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ لیکن الگ الگ مضامین کا مجموعہ ہونے کی حیثیت سے جو ناصر صاحب نے بعض اُردو رسائل کے لیے لکھے تھے اس میں کوئی منطقی ترتیب یا نظم نہیں۔ زراعت اور آبادی کے مسائل سے نسبتاً تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ مزدوروں کے بعض مسائل، دیسی بنک کاری، زر و بنک کا بھی ذکر آگیا ہے۔

اُردو میں معاشیات پر کتابوں کی بڑی کمی ہے۔ اس حیثیت سے یہ کوشش لائقِ تحسین ہے لیکن عوام کے لیے جو کتابیں لکھی جائیں ان میں کوشش یہ ہونی چاہیے کہ انھیں ایسی معلومات مہیا کی جائیں کہ ان کے ذہن کو تعمیری طور پر سوچنے کی تحریک ہو۔ مثلاً ہندستان کی بیرونی تجارت کا مسئلہ اگر زیرِ بحث ہو تو اس میں عوام کے لیے محض یہ جان لینا کافی یا کم از کم کچھ بہت زیادہ مفید نہیں کہ ہندستان کتنی جوٹ باہر بھیجتا ہے اور کتنے موٹر منگواتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں بتایا جائے کہ ایک زرعی اور ایک صنعتی ملک کی باہمی تجارت میں یہ ہوتا ہے کہ زرعی ملک بظاہر اپنی ہر چیز کی پوری پوری قیمت وصول کر لینے کے باوجود دراصل گھاٹے ہی میں رہتا ہے۔ امید ہے کہ ناصر صاحب اس کتاب کے آیندہ اڈیشن کو ازسرِنو ترتیب دے کر کتاب کو زیادہ مفید بنا دیں گے۔ ساتھ ہی اپنی اس تصنیف کو ایک مستقل اور علمی حیثیت دینے کی کوشش کریں گے۔

معاشیات

جلد ۱ — اپریل سنہ ۱۹۴۶ء — نمبر ۴

فہرستِ مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱	محصول جایداد کا قانون	ایڈیٹر	۲
۲	ہندستان کی تجارتِ خارجہ	سید فخرالحسن ایم اے ، جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۶
۳	اسٹرلنگ قرضہ	مظہر ایچ . یوسف بی . اے (علیگ)	۱۰
۴	آزاد تجارت اور امنِ عالم	کلیئر وِل کوکس	۱۵
۵	معاشی ماحول کا اثر سماج پر	پروفیسر سیتارام باہری ایم . اے . ایم . او . ایل	۲۳
۶	ہندستان کی صنعتی ترقی کے چند پہلو	ابوسالم ایم . اے (علیگ)	۲۸
۷	اتحادی غذائی بورڈ اور ہندستان	ادارہ	۳۷
۸	صوبائی حکومتوں کی آمدنی اور خرچ	ادارہ	۴۱
۹	انجمن ترقی اردو کی وضع کردہ چند معاشیاتی اصطلاحات	"	۴۸

اداریہ

محصول جایداد کا قانون

از ـــــــــ ایڈیٹر

۱۱ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء کو مرکزی اسمبلی میں حکومتِ ہند کے مالیاتی وزیر سر آرچی بالڈ رولینڈز نے محصول جایداد کا بل پیش کیا۔ اُس کے بعد سے مُلک کے مختلف حلقوں میں اس قانون کے غلط یا صحیح، مفید یا نقصان رساں ہونے کی بابت مختلف خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے قبل اس کے کہ ذیل کے سطور میں اس قانون کی حمایت یا مخالفت کی جائے خود قانون ہی کے بارے میں چند ضروری باتوں کا جان لینا ضروری ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ حکومت ہند اس قانون کو نافذ کرنے کے بارے میں بہت عرصے سے سوچ رہی تھی، لیکن مخصوص حالات کی بنا پر اسے ٹالتی رہی آج سے بیس سال پہلے "محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی" نے بہت غور و خوض کے بعد یہ مشورہ دیا کہ اس محصول کا اجرا ہندستان میں ضروری ہے۔ اگر دُنیا کے دوسرے مُلکوں پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ سنہ ۱۹۱۰ء ہی سے دُنیا کی تمام جمہوری حکومتیں اپنے اپنے مالی نظام میں اس محصول کو جگہ دے چکی ہیں۔ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء میں نئی دہلی میں ہندستان کے تمام صوبوں کے مالیاتی وزیروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں یہ قرار پایا تھا کہ فوتی محصول کو ہندستان میں جاری کرنے کے لیے ضروری تحقیق و تفتیش کا کام شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ اُس وقت کے مرکزی مالیاتی وزیر سر اَئلمن لوانڈز نے اس بارے میں صوبائی حکومتوں سے بات چیت بھی کی تھی۔ بہار، بمبئی اور وسطی صوبے نے یہ کہا تھا کہ جب تک مرکز میں قومی حکومت نہ قائم ہو جائے اُس وقت تک یہ محصول نہ جاری کیا جائے۔ دوسرے صوبوں مثلاً بنگال اور پنجاب نے کہا کہ اس محصول سے جو آمدنی حاصل ہوگی وہ ان مشکلات اور دقتوں کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہوگی جو اس کے جاری اور وصول کرنے میں حائل ہیں۔ مدراس اور یو پی نے اپنی رائے دینے سے گریز کیا۔ دو سال ہوئے کہ سابق مالیاتی وزیر سر جیریمی رائسمین نے یہ اعلان کیا کہ حکومت یہ محصول اب ہندستان میں جاری کرنا چاہتی ہے۔

لیکن چل کر ایسا کرنا ۱۹۳۵ء کے دستور کے تحت حکومت ہند کے اختیار سے باہر تھا اس لیے برطانیہ کے دارالعوام نے دستوری قانون میں ترمیم کر کے حکومت ہند کی پوزیشن صاف کر دی اور اب مرکز ملک کے اختیار میں ہے کہ زرعی زمینوں کے علاوہ دیگر ملکیتوں پر فوتی محصول لگائے۔

۱۸ مارچ کو جو بل پیش ہوا ہے اس کے مطابق فوتی محصول صرف غیر زرعی جائداد پر لگایا جائے گا۔ بل میں کوئی سترکات اور تشریحی نوٹ ہیں اور اس کا ڈھانچہ زیادہ تر انگلستان کے اسٹیٹس ڈیوٹی ایکٹ پر مبنی ہے۔ ٹیکس کی شرح جائداد کی قیمت کے لحاظ سے مقرر کی جائے گی۔ شرح کے تقرر کے سلسلے میں پروفیسر رگنانو کی جو تجویز ہے اُسے مسترد کر دیا گیا ہے اور نہ قرابت مندی (CONSANGUINITY) کے اصول کو اہمیت دی گئی ہے جس جائداد کی قیمت ایک لاکھ رُپے سے کم ہے اُس پر یہ محصول نہیں عائد کیا جائے گا۔ بل میں دو باتوں کا فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔ (۱) شرح کا تعین کیا ہو گا۔ (۲) اس محصول سے جو آمدنی ہوگی وہ صوبوں میں کس طرح تقسیم ہوگی۔ یہ باتیں آگے چل کر ایک اور قانون کے ذریعے طے ہوں گی۔ زرعی جائداد پر بھی اسی قسم کے کسی محصول کے عائد کرنے کا سوال آیندہ کے لیے اُٹھا رکھا گیا ہے جس پر ہر صوبہ علاحدہ علاحدہ طور پر غور کرے گا۔ اس طرح موجودہ بل کا صرف اتنا مقصد ہے کہ اس محصول کو اصولی طور پر جائز اور صحیح اور ضروری تسلیم کر لیا جائے اور اُس سے متعلق عام اور بنیادی باتوں کے بارے میں بھی کچھ باتیں طے پا جائیں۔ موجودہ بل اس سے آگے نہیں جاتا۔

ہمارا خیال ہے کہ اصولی طور پر فوتی محصول کا جاری ہونا ملک کے لیے ضروری اور مفید ہے۔ اگر اس کی شرحوں کا موزوں تعین ہو گیا اور ساتھ ہی کوئی ایسی مناسب اقل ترین حد مقرر کر دی گئی جس کے نیچے زرعی اور غیر زرعی جائدادیں محصول سے بری ہوں گی تو آدم اسمتھ کے چاروں مشہور معاشی اصول پُورے ہو سکتے ہیں۔ مساوات۔ یقین۔ کفایت اور سہولت۔ یہ حقیقت ہے کہ بڑی بڑی جائدادیں، بڑی بڑی آمدنیوں کی بہ نسبت زیادہ محصول ادا کر سکتی ہیں۔ انکم ٹیکس تو ہر سال ادا کرنا پڑتا ہے لیکن فوتی محصول ایک پشت میں ایک بار۔ اس محصول کے ساتھ ایک قسم کی سادگی، سیدھا پن وابستہ ہوتا ہے اور اس کی زد سے بچنا غیر ممکن ہوتا ہے۔" غالبًا انھی اسباب کی بنا پر آج سے پچاس سال پہلے ہی دُنیا کے تمام روشن خیال معاشیاتی ماہرین اور ترقی پسند حکومتوں نے اس کا مفید اور ضروری ہونا تسلیم کر لیا ہے۔ اگر اختلافِ رائے پایا جاتا ہے تو صرف شرحوں کے تعین کے متعلق یا اس بارے میں کہ کس قسم کی جائدادوں اور ملکیتوں پر یہ محصول عائد کیا جائے۔ اطالیہ کے پروفیسر رگ نانو، برطانوی مفکر لارڈ اشامپ نے، پھر مشہور امریکی مفکرین ٹیفٹ، ایلی، روزولٹ اور کارنیگی نے بھی فوتی محصول کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔

بل کی افادیت اور ضرورت پر بحث کرتے ہوئے مالیاتی وزیر نے یہ کہا کہ جمہوری اصول کے مطابق مرنے والوں کی بڑی بڑی جائداد میں ریاست کا بھی حصہ ہونا چاہیے۔ دوسرے اس سے لوگوں میں دولت کی غیر مساوی تقسیم کے رجحان کو بھی ایک حد تک روکا جا سکتا ہے خاص کر دورانِ جنگ میں دولت کا اختلاف بہت زیادہ بڑھ گیا ہے ــــــــــــ اگر ریاست نے اُن کی دولت کا ایک حصہ اپنے اختیار میں کر کے پبلک کے فائدے کے کاموں میں دلگایا تو یہ ایک قسم کی سماجی بے انصافی ہوگی۔ اس وقت صوبائی حکومتوں کو

اور تعمیر و تنظیم و تعمیر کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے عظیم رقموں کی ضرورت ہے۔ چناں چہ آمدنی کے اتنے اہم ذریعے کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اگرچہ ہندستان کے مشہور معاشیاتی رسالہ "ایسٹرن اکانومسٹ" دہلی نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ آمدنی غالباً پانچ یا سات کروڑ سے زیادہ نہ ہوگی جو معاشیاتی تنظیم کے کاموں کے لیے قطعی ناکافی ہو لیکن یہاں پر اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ابھی جب کہ شرحوں کا تعین نہیں ہوسکا ہے مجموعی آمدنی کا اندازہ کیوں کر لگایا جاسکتا ہے۔

اس محصول کو پورے طور پر رائج کرنے کے سلسلے میں جو خاص دقت حائل ہے وہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے شخصی قانون پر اس کا اثر پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ اور کوئی دقت راستے میں حائل نہیں ہے۔ بعض حلقوں میں زور دیا جارہا ہے کہ اس محصول کی شرح کم رکھی جائے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ صرف بڑی بڑی جائدادوں ہی پر محصول لگایا جائے تاکہ اسے عام بنایا جاسکے اور ساتھ ہی لوگوں کو ناگوار بھی نہ گزرے۔ موجودہ بل کے تحت صرف ایک لاکھ سے اوپر کی جائداد پر فوتی محصول عائد کیا جائے گا۔ آج سے بائیس سال پہلے جو محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی نے حد مقرر کی تھی وہ صرف پانچ ہزار روپے تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ پانچ سے اوپر لیکن ایک لاکھ سے بہت کم اگر حد مقرر کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

بل کے تحت فوتی محصول کا اجرا اور اس کی وصولی تو مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں ہوگی، لیکن آمدنی صوبوں میں تقسیم کی جائے گی۔ بعض حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ طریقہ صوبائی خودمختاری و ذمے داری کے اصول کو صدمہ پہنچاتا ہے اور ہندستان کے آیندہ دستورِ حکومت کی وفاقی نوعیت اور ہندستانی معیشت کی دیہی خصوصیات کو نظرانداز کردیتا ہے۔

شرح کے تعین کے سوال کو آیندہ پر اٹھا رکھنا ابہام پیدا کرتا ہے۔ ضرورت تھی کہ کم سے کم بنیادی شرحوں کا تعین ابھی سے کردیا جاتا اور بعد میں اسے قانون کے ذریعے ردّ و بدل کیا جاتا۔

اس محصول سے جو آمدنی پیدا ہوگی اس کی صوبوں میں تقسیم کا سوال بہت اہم ہے اور اس کے لیے کسی خاص اصول کا تعین بھی ضروری ہے۔ بل میں یہ نہیں طے کیا گیا ہے کہ کس اصول پر یہ تقسیم عمل میں آئے گی۔ ویسے تقسیم کی دو بنیادیں ہیں:-

(۱) وصولی کا ذریعہ۔

(۲) آبادی۔

اگر پہلی بنیاد پر آمدنی کی تقسیم کی گئی تو بمبئی اور بنگال جیسے صوبوں کو زیادہ حصے ملیں گے اس لیے کہ انھی صوبوں سے سب سے زیادہ فوتی محصول کی آمدنی کی امید ہے۔ اس پر دوسرے صوبوں کو اعتراض ہوگا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ تقسیم کی جس بنیاد کی تشکیل کی جائے اس میں دونوں باتوں کا مساوی طور پر خیال رکھا جائے۔ بعض حلقوں میں خیال ظاہر کیا جارہا ہے کہ نصف آمدنی آبادی کا لحاظ

کرتے ہوئے تقسیم کی جائے اور نصف ذریعۂ آمدنی کا۔

ایک اور بات کا خیال رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ کچھ ایسا انتظام کیا جائے کہ اس محصول کا چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں پر خراب اثر نہ پڑے۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ مرکز میں کسی ذمے دار اور ایسی حکومت کے قیام کے بغیر اس قانون کی تمام تفصیلات نہ طے کی جائیں جسے تمام سیاسی جماعتوں کا اعتماد حاصل ہو۔ تفصیلات کے تعین میں ماہروں کی کسی تحقیقاتی کمیٹی سے مدد لینا اشد طور پر ضروری ہے۔ ملک کے عام حلقوں اور پبلک اداروں کے مشوروں سے بھی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

ہندستان کی تجارتِ خارجہ

از :— سید فخرالحسن صاحب ایم۔ اے جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

مقدارِ تجارت ۱۹۲۹ء کی عالمی کساد بازاری شروع ہونے تک دُنیا کے اکثر و بیشتر ممالک کی طرح ہندستان میں بھی گرم بازاری رہی اور تجارتِ خارجہ کو ترقی ہوتی رہی۔ کساد بازاری کا اثر ہندستان کی تجارت پر بھی پڑا اور اس میں کمی ہونے لگی جو چار پانچ سال تک جاری رہی اس کے بعد سے اس میں اضافہ شروع ہوا البتہ جنگ شروع ہونے سے ایک سال قبل اس میں کچھ کمی ہوگئی تھی آغازِ جنگ کے وقت تجارتِ خارجہ کی جو مقدار تھی اور اس کے بعد سے اس میں جو کچھ اضافہ ہوا وہ حسبِ ذیل ہے :—

سال	برآمد (کروڑ روپیہ)	درآمد (کروڑ روپیہ)	توازن (کروڑ روپیہ)
۱۹۳۸ - ۳۹	۱۶۳	۱۵۲	+ ۱۱
۱۹۳۹ - ۴۰	۲۰۴	۱۶۵	+ ۵۹
۱۹۴۰ - ۴۱	۱۸۷	۱۵۷	+ ۳۰
۱۹۴۱ - ۴۲	۲۳۸	۱۷۳	+ ۶۵
۱۹۴۲ - ۴۳	۱۸۸	۱۱۰	+ ۷۸
۱۹۴۳ - ۴۴	۱۹۹	۱۱۹	+ ۸۰
۱۹۴۴ - ۴۵	۲۱۱	۲۰۱	+ ۱۰

مندرجہ بالا جدول سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۹-۱۹۳۸ء کے مقابلے میں تجارتِ خارجہ میں بہ لحاظ قیمت اضافہ ہوا۔ برآمد میں سب سے زیادہ اضافہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں ہوا اور درآمد میں ۴۵-۱۹۴۴ء میں۔ توازنِ تجارت میں سوائے ۴۰-۱۹۳۹ء کے مسلسل اضافہ رہا جو ۴۴-۱۹۴۳ء میں ۸۰ کروڑ تک پہنچ گیا لیکن اس کے بعد اس میں غیر معمولی کمی ہوگئی اس لیے کہ درآمد میں کافی اضافہ ہوگیا۔
اس میں شک نہیں قیمت کے لحاظ سے مقدارِ تجارت جنگ کے دوران میں بڑھ گئی لیکن بہ لحاظ مقدارِ اشیا تجارت میں کمی ہوتی گئی۔ چنانچہ برآمد میں سوائے جنگ کے پہلے سال کے مسلسل کمی ہوتی رہی اور آغازِ جنگ کے مقابلے میں ۴۵-۱۹۴۴ء میں یہ ۵۳ فی صد کی سطح تک پہنچ گئی۔ درآمد کا بھی یہی حال رہا کہ سوائے جنگ کے پہلے سال کے اس میں متواتر کمی ہوتی گئی جو ۴۴-۱۹۴۳ء میں ۳۹ فی صد کی سطح تک پہنچ گئی البتہ ۴۵-۱۹۴۴ء میں اس میں اضافہ ہوا اور ۷۱ فی صد کی سطح تک آگئی۔ غرض اس طرح ہندستان کی تجارتِ خارجہ میں قیمت کے لحاظ سے اضافہ ہوا لیکن مقدارِ اشیا کے لحاظ سے کمی ہوئی۔

ترکیب تجارت | مختلف قسم کی اشیا کے لحاظ سے تجارت میں جو تغیرات ہوئے وہ حسبِ ذیل ہیں:—

برآمد (بہ شمول مکرر برآمد)

[کروڑ روپیہ (جملہ برآمد کا فی صد)]

سال	خوردنی اشیا	خام اشیا	مصنوعات
۳۹-۱۹۳۸ء	۳۹ (۲۳%)	۷۶ (۴۵%)	۵۰ (۳۰%)
۴۰-۱۹۳۹ء	۴۰ (۱۹%)	۹۱ (۴۳%)	۷۹ (۳۷%)
۴۱-۱۹۴۰ء	۴۲ (۲۱%)	۶۸ (۳۴%)	۸۵ (۴۳%)
۴۲-۱۹۴۱ء	۶۰ (۲۳%)	۷۳ (۲۸%)	۱۱۴ (۴۵%)
۴۳-۱۹۴۲ء	۴۹ (۲۵%)	۴۵ (۲۳%)	۹۸ (۵۰%)
۴۴-۱۹۴۳ء	۵۰ (۲۴%)	۴۸ (۲۳%)	۱۱۰ (۵۲%)

درآمد

[کروڑ روپیہ (جملہ درآمد کا فی صد)]

سال	خوردنی اشیا	خام اشیا	مصنوعات
۱۹۳۸ - ۳۹ء	۲۴ (۱۵ %)	۳۳ (۲۱ %)	۹۲ (۶۰ %)
۱۹۳۹ - ۴۰ء	۳۵ (۲۱ %)	۳۶ (۲۲ %)	۹۱ (۵۵ %)
۱۹۴۰ - ۴۱ء	۲۳ (۱۵ %)	۴۲ (۲۶ %)	۸۹ (۵۷ %)
۱۹۴۱ - ۴۲ء	۲۷ (۱۶ %)	۵۰ (۲۸ %)	۹۳ (۵۴ %)
۱۹۴۲ - ۴۳ء	۸ (۷ %)	۵۲ (۴۷ %)	۴۹ (۴۴ %)
۱۹۴۳ - ۴۴ء	۸ (۷ %)	۶۳ (۵۲ %)	۴۵ (۳۷ %)

اُوپر کے دونوں جدولوں کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ جنگ سے پہلے ہندستان کی برآمدی اور درآمدی ترکیب تجارت کی کوئی بہتر صورت نہ تھی یعنی ۴۵ % خام اشیا اور صرف ۳۰ % مصنوعات برآمد ہوتی تھیں برخلاف اس کے ۲۱ % خام اشیا اور ۶۰ % مصنوعات درآمد ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ درآمد کے مقابلے میں خام اشیا کی زیادہ برآمد اور مصنوعات کی کم برآمد مُلک کی معاشی خصوصاً صنعتی اعتبار سے پستی کی علامت تھی۔ لیکن جنگ کی وجہ سے اب حالت برعکس ہوگئی ہے یعنی ۲۳ % خام اشیا اور ۵۲ % مصنوعات برآمد ہو رہی ہیں گویا اس لحاظ سے یہ صورتِ حال صنعتی ترقی اور معاشی اعتبار سے مُلک کے لیے بہتری کی علامت ہے۔

ترکیبِ تجارت کے سلسلے میں چند خاص چیزوں کی درآمد برآمد کے تغیرات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً روئی کی برآمد جو قبل جنگ ۴۲ کروڑ روپے کے مساوی تھی اس میں غیر معمولی کمی ہوگئی اس کی وجہ جاپان کے بازار کا نکل جانا ہے۔ لیکن اس کی درآمد میں اضافہ ہوا یعنی ۸ کروڑ سے ۱۵ کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔ روئی کے دھاگے اور مصنوعات کی برآمد ۷ کروڑ سے بڑھ کر ۴۲ کروڑ روپے ہوگئی اور درآمد ۱۴ کروڑ سے کم ہو کر ایک کروڑ رہ گئی۔ جوٹ کی مصنوعات کی برآمد میں ابتداءً اضافہ ہوا لیکن بعد میں کمی ہوگئی۔ خام جوٹ کی برآمد کم ہوگئی۔ تیسری اہم چیز جس کی درآمد میں خاص حد پر اضافہ ہوا وہ مختلف قسم کے تیل ہیں چنانچہ اس کی درآمد ۱۵ کروڑ سے بڑھ کر ۲۶ کروڑ تک پہنچ چکی ہے۔

سمتِ تجارت جنگ سے قبل مختلف مُلکوں کے ساتھ ہندستان کے جو تجارتی تعلقات تھے ان میں شہنشاہی ممالک کا نسبتاً

زیادہ حصّہ تھا اور ان میں برطانیہ کو باوجود اس کے حصّے میں سابقہ زمانے کے مقابلے میں بہت کچھ کمی ہو جانے کے خاص اہمیت حاصل تھی۔ غیر شہنشاہی ممالک میں جاپان، جرمنی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی۔ جنگ کی وجہ سے جو تبدیلی واقع ہوئی اس کا اندازہ حسب ذیل جدول سے ہو سکتا ہے:۔

	جملہ برآمد کا فی صد حصّہ		جملہ در آمد کا فی صد حصّہ	
	۱۹۳۸-۳۹ء	۱۹۴۳-۴۴ء	۱۹۳۸-۳۹ء	۱۹۴۳-۴۴ء
برطانیہ	۳۴٫۳	۳۰٫۰	۳۰٫۵	۲۵٫۱
برما	۶٫۶	—	۱۶٫۰	—
سیلون	۱٫۳	۷٫۷ (۱۹۴۳ء)	٫۷	۳٫۹ (۱۹۴۳ء)
جنوبی افریقہ	٫۹	۵٫۷ 〃	٫۲	۲٫۰ 〃
اسٹریلیا	۱٫۸	۸٫۵ 〃	۱٫۵	۳٫۰ 〃
جاپان	۸٫۸	—	۱۰٫۱	—
امریکہ	۸٫۴	۲۰٫۲	۶٫۴	۱۵٫۰
جرمنی	۵٫۰	—	۸٫۵	—
مصر	٫۷	۲٫۲ (۱۹۴۳ء)	۱٫۴	۷٫۳ (۱۹۴۳ء)
ایران	٫۵	۲٫۰ 〃	۲٫۲	۱۶٫۱ 〃
جملہ شہنشاہی ممالک	۵۲٫۴	۶۴٫۳	۵۸٫۱	۴۸٫۰
جملہ غیر شہنشاہی ممالک	۴۷٫۶	۳۵٫۷	۴۱٫۹	۵۲٫۰

مندرجہ بالا جدول سے پہلی بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ آغاز جنگ کے مقابلے میں شہنشاہی ممالک کے ساتھ برآمدی تجارت میں اضافہ ہوا اور غیر شہنشاہی ممالک کے ساتھ کمی ہوئی لیکن در آمدی تجارت کا جہاں تک تعلق ہے شہنشاہی ممالک کے ساتھ کمی ہوئی اور غیر شہنشاہی ممالک کے ساتھ اضافہ ہوا۔ لیکن یہ چیز قابل ذکر ہے کہ برطانیہ کے ساتھ در آمدی اور برآمدی دونوں تجارتوں میں تخفیف ہوئی لیکن اس کی بجائے لنکا، جنوبی افریقہ اور اسٹریلیا کے ساتھ خاص طور پر برآمدی اور در آمدی تجارتوں میں اضافہ ہوا۔ غیر ممالک میں جرمنی اور جاپان ظاہر ہے کہ باقی نہ رہے البتہ امریکہ کے ساتھ دونوں تجارتوں میں اضافہ ہوا۔ نیز مصر اور ایران کے ساتھ دونوں تجارتوں خصوصاً در آمدی تجارت میں پہلے کے مقابلے میں کافی اضافہ ہوا۔

مسائلِ حاضرہ (ہندوستان)

اسٹرلنگ قرضہ

از:—— مظہر ایچ۔ یوسف۔ بی اے (علیگ)

جنگ کے زمانے میں ہندوستان کو دفاعی کاموں میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنی پڑیں۔ برطانوی، امریکی اور ہندوستانی فوجوں کی آمد اور ملک کے اندر اُن کی طویل موجودگی نے ہندوستان کی مالی حالت کو بہت متاثر کیا۔ جنگ کے شروع ہونے کے بعد حکومتِ ہند کے لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ جنگی اخراجات کے مسئلے کو حل کرنے کی کیا صورت نکالی جائے۔ حکومت کے سامنے سب سے آسان راستہ یہ تھا کہ بڑی تعداد میں نوٹ چھاپنا شروع کرے، چناں چہ سینما کے اشتہارات کی طرح نوٹ چھپنے شروع ہوئے۔ ہندوستان میں چھپنے والے انھی نوٹوں کے مقابلے میں لندن میں خزانہ ہنڈیاں جمع ہوتی رہیں۔ اب اگر برطانیہ نے اِن نوٹوں کے بدلے ہندوستان کو سونا یا دوسرے مُلکوں کے سکے (مثلاً ڈالر) نہیں ادا کیے تو ہندوستان اپنی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لیے امریکہ سے ضروری مشینیں نہیں خرید سکتا۔

اس طرح یہ رقم ہندوستان کی طرف سے برطانیہ پر قرضے کے طور پر عائد ہے۔ اس قرضے کی موجودگی ہندوستان کی محکومی اور بے دست و پائی کا ثبوت بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ ہندوستان نے برطانیہ کو یہ قرضہ خوشی خوشی نہیں دیا بلکہ خلافِ مرضی اُس سے وصول کیا گیا۔ اور مشکل یہ ہے کہ ہندوستان آج اس قابل نہیں کہ اپنے مالکوں سے یہ قرضہ بزورِ تقاضا وصول کر سکے۔

۱۹۳۹ء میں جب جنگ کی ابتدا ہوئی تو برطانوی ہند کے بیشتر صوبوں میں کانگریسی وزارتیں برسرِ اقتدار تھیں۔ اس وقت ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے یہ ظاہر کردیا کہ ہندستان نہ تو جنگ میں شامل ہونے کے لیے تیار ہے اور نہ شامل ہونا چاہتا ہے۔ حکومتِ برطانیہ کے لیے یہ تو آسان تھا کہ ہندستان کی طرف سے اعلانِ جنگ کرکے اُسے زبردستی جنگ میں شامل کرلے اس لیے کہ حکومتِ ہند کا دفاعی شعبہ حکومتِ برطانیہ ہی کے ہاتھوں میں تھا۔ لیکن برطانیہ یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ہندستان سے جنگ کے اخراجات وصول کرنا آسان کام نہیں اور اس سلسلے میں کانگرسی وزارتیں یقیناً مشکلات پیدا کریں گی۔ چناں چہ ان مشکلات سے اور ہندستان کی سیاسی جماعتوں سے سمجھوتا کرنے سے دامن بچانے کے لیے اعلانِ جنگ سے دو ماہ بعد ملک معظم کی حکومت اور حکومتِ ہند کے درمیان ایک مالی "معاہدہ" وجود میں لایا گیا۔

اس معاہدے کی رُو سے ہندستان نے گویا یہ "منظور" کیا کہ ہندستان کے اندر جتنی فوجیں تیار ہوں گی ان کی بھرتی، تربیت اور فراہمیِ سامان کے تمام اخراجات وہ خود برداشت کرے گا۔ لیکن اگر وہ فوجیں ہندستان سے باہر لے جائی گئیں تو تمام پچھلے اخراجات برطانیہ کو ادا کردینے پڑیں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ برطانوی اور دیگر غیرملکی فوجوں پر ہندستان میں جو کچھ خرچ ہوگا وہ بھی ہندستان کو واپس مل جائے گا، پھر ملک معظم کی حکومت ہندستان میں جو خدمات اور جنگ کے مال و اسباب خریدے گی اُس کی قیمت بھی وہ خود ادا کرے گی۔ حکومت ہند اور ملک معظم کی حکومت کے درمیان یہ پُرفریب معاہدہ اس لیے بھی وجود میں لایا گیا کہ برطانیہ جانتی تھی کہ ہندستان مفلس اور قلاش ہے اگر مزید ٹیکس عائد کیے گئے تو صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہوجائے گی چناں چہ بہتر یہ سمجھا گیا کہ نوٹ چھاپ چھاپ کر ان اخراجات کو پورا کیا جائے۔

برطانیہ نے یہ سوچ کر یہ مالی معاہدہ کیا تھا کہ جنگ یورپ ہی تک محدود رہے گی اور اس کے اخراجات زیادہ نہ ہوں گے لیکن امریکہ و جاپان کو آخر میدانِ جنگ میں آنا پڑا اور ہندستان مشرقی جنگی محاذ کا مرکز بن گیا۔ مشرقی بنگال کی سرحدوں پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے، برطانیہ کا وقار اور تسلط معرضِ خطر میں پڑ گیا اور اس کے تمام گزشتہ تخمینے اور اندازے غلط ثابت ہوئے جاپانی فوجوں کی طوفانی رفتار کو روکنے کے لیے امریکی اور برطانوی فوجیں ہندستان میں داخل ہونا شروع ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی بہت بڑے پیمانے پر ہندستان سے اشیا کی خرید بھی شروع ہوئی۔ بے شمار لوگ فوج اور اس سے ملحقہ ملازمتوں میں داخل کیے گئے۔ معاہدے کی رُو سے برطانیہ کو ان تمام خدمات اور اشیا کی قیمت ادا کرنی تھی۔ اس طرح برطانیہ کے سر پر ہندستان کے قرضوں کا بوجھ زیادہ سے زیادہ وزنی ہوتا گیا۔

دوسرا ذریعہ جس سے برطانیہ پر ہندستان کے قرضے کی مقدار بڑھتی گئی یہ تھا کہ جنگ کے چھ سال کے اندر ہندستان کی تجارتِ درآمد کی بہ نسبت تجارتِ برآمد کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

[...] نہ ہوتی تو ہندستان میں جتنی خدمات حاصل کی گئیں اور اشیا خریدی گئیں اور برآمد کی تجارت میں جو فائدہ ہوا اُن سب کا معاوضہ ہندستان کو یا تو اشیا کی صورت میں ملتا، یا سونے کے سکوں کی شکل میں۔ لیکن برطانیہ خود مختاری سے ان رقموں کو اسٹرلنگ (برطانوی زرِ قانونی) کی شکل میں جمع کرتی رہی۔ اور اسی اسٹرلنگ کے مقابلے میں ہندستان میں ریزرو بینک نوٹ پر نوٹ چھاپتا رہا۔ اس طرح ہندستان سے جو کچھ اشیا خریدی گئیں اور ہندستانیوں سے جتنی خدمات حاصل کی گئیں اُن سب کا برطانیہ نے ایک پائی بھی معاوضہ نہیں ادا کیا اس لیے کہ ہندستانی اشیا اور خدمات کی قیمت تو ریزرو بینک کے شائع کردہ کاغذی نوٹوں کی شکل میں ادا کی گئی نہ کہ سونے یا اشیا کی صورت میں۔ اگست سنہ ۱۹۴۵ء تک یہ اسٹرلنگ قرضہ ایک ارب دس کروڑ پونڈ تک پہنچ گیا۔

اب جب کہ جنگ ختم ہو چکی ہے، اِس قرضے کی وصولی کا مسئلہ بہت اہم ہو گیا ہے۔ برطانیہ کے ماہرینِ معاشیات، مدبرین اور وہاں کے صحافتی حلقے اس مسئلے کو ٹال جانا چاہتے ہیں یا کم سے کم یہ چاہتے ہیں کہ اِس قرضے میں معتدبہ کمی کر دی جائے۔ چناں چہ برطانیہ کے اخبار "فائینینشیل نیوز" مورخہ تیسری جون سنہ ۱۹۴۴ء میں درج ہے کہ:-

"برطانیہ نے جنگ کے دوران میں ہندوستان میں جو رقم خرچ کی وہ خود ہندستان کے دفاع اور فوجی تحفظ کے لیے تھی۔ اگر ہم ہندستان کی مدد نہ کرتے تو وہ آسانی سے جاپانی مظالم کا شکار ہو جاتا۔ اس کے علاوہ، اُس رقم کا بیش تر حصہ ہندستان میں فنی اور مشینی اسکولوں اور فوجی تربیت گاہوں کے قیام میں صرف کیا گیا جس سے ایک طرف تو ہندستان کی دورانِ جنگ والی معیشت کو تقویت حاصل ہوئی، دوسری طرف اس کی قومی دولت میں زبردست اضافہ ہوا۔ اِن حالات کے تحت اِس رقم کو "برطانیہ پر ہندستان کا قرضہ" سمجھنا غلط ہے۔"

لندن کا مشہور و معروف معاشیاتی جریدہ "دی اکانومسٹ" بھی اپنی اشاعت مورخہ چوتھی اگست، سنہ ۱۹۴۵ء میں اسی خیال کی تائید کرتا ہے:-

"پورے مشرقِ وسطیٰ اور ہندستان میں اشیا کی قیمتوں میں برطانیہ کی بہ نسبت کہیں زیادہ اضافہ ہوا ہے لیکن اِن مُلکوں کے سکوں کا برطانوی زرِ قانونی سے شرحِ تبادلہ وہی ہے جو جنگ سے پہلے تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسٹرلنگ قرضے میں بہت زائد اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر ان ملکوں کی معیشت پر زیادہ مضبوط نگرانی رکھی جاتی تو یہ اسٹرلنگ قرضے بہت کم ہوتے۔"

اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جو اسی نقطۂ نظر کی حامل ہیں:-

"چوں کہ جنگ کے دوران میں تمام اشیا اور خدمات کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی، اس لیے اس قرضے میں تیس فی صدی کی تخفیف کر دینا مناسب ہوگا۔" ["فائینینشیل نیوز"]

"یہ معاہدہ اُس وقت عمل میں آیا تھا جب مشرقِ بعید میں جنگ کے امکانات نہیں تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

ہندوستان جنگ کے شعلوں سے محفوظ رہے گا۔ اُس وقت یہ بات بالکل مناسب معلوم ہوئی کہ فوجی بھرتی، تعمیرات اور جنگی اشیا کے اخراجات کا بوجھ ملک معظم ہی کی حکومت برداشت کرے۔ لیکن جب جاپان جنگ میں شامل ہوا تو اس معاہدے کی پوری بنیاد ہی ختم ہو گئی۔ خود ہندوستان کی مشرقی سرحد پر ہندوستانی فوجوں کو استعمال کرنا پڑا»۔

["اکانومسٹ"]

اِس طرح برطانوی اخبارات اور رسالے ہندوستان کے منصفانہ مطالبے کو غلط طریقے سے پیش کر رہے ہیں۔ ہندوستان نے تو خود اپنا پیٹ کاٹ کر اور اپنی ضروریات میں کمی کر کے برطانیہ کو اشیا اور خدمات فراہم کیں اور برطانیہ ہندوستان کو کاغذی پرزوں سے بہلاتی رہی لیکن اب جب کہ ادائگی کا وقت آیا ہے تو برطانیہ ٹال مٹول کر رہی ہے اور بہانے تراش رہی ہے۔ برطانیہ اور امریکہ کو جنگی مال واسباب اور جنگی خدمات مہیا کرنے میں قلاش ہندوستان کو جن ہولناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ بلا شک وشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ برطانیہ پر اس وقت جو قرضے کی رقم عائد ہوتی ہے وہ گویا ہندوستانیوں کے عام معیارِ زندگی کو گھٹا کر حاصل کی گئی ہے۔ اس رقم کی ایک ایک پائی میں کروڑوں ہندوستانی مزدوروں، کسانوں اور نچلے متوسط طبقے کے لوگوں کے مصائب اور درد کی کہانیاں مضمر ہیں جو صرف اس وجہ سے بھوکے اور ننگے رہے کہ ہندوستان کے مال واسباب برطانوی اور امریکی فوجوں کے پاس چلے گئے تھے۔ کثیر نوٹوں کی پیدا کردہ افراطِ زر اور قلتِ اشیا نے اُن کا ناک میں دم کر دیا۔ اُن کے مصائب کا یہی سبب تھا کہ برطانیہ نے ہندوستان کے مال واسباب اور اشیا کی قیمت سونے یا دیگر اشیا کی صورت میں نہیں ادا کی بلکہ کاغذی پرزوں کی شکل میں۔

یہ کہنے سے کام نہیں چل سکتا کہ ان اشیا کی قیمت بہت زیادہ وصول کی گئی۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، حکومت نے کنٹرول کی قیمتوں پر خریداری کی جو بازار کی عام قیمتوں سے بہت کم تھی۔ اور اگر کہیں زیادہ قیمتوں پر اشیا خریدی بھی گئیں تو حکام کی سرپرستی میں اور ان کی رضامندی سے جس کے عوض میں اُن کی جیبیں بھی سونے کے مہر اور بھاری بھاری قیمتوں کے نوٹوں سے بھر گئیں۔

یہ جو کہا جا رہا ہے کہ یہ رقمیں خود ہندوستان ہی کے فوجی تحفظ میں خرچ ہوئیں تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ ہندوستان کو اُس کی خواہش کے خلاف جنگ میں شریک کیا گیا۔ اگر فوجی تحفظ نہ کیا جاتا تو یہی ہوتا نا کہ ہندوستان، جاپان کا غلام بن جاتا! لیکن فرق کیا ہوتا؟ ہندوستان آج اپنی فوجی حفاظت کر لینے کے بعد کون سا آزاد ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کی حفاظت نہیں کی ہے بلکہ مشرق میں اپنے وقار کو ختم ہونے سے بچایا ہے، جو جاپان کے اعلانِ جنگ کے بعد معرضِ خطر میں پڑ گیا تھا۔

اِس سلسلے میں امریکہ کا کیا طرزِ عمل ہے، اس کا جاننا بھی ضروری ہے۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ امریکہ بھی، جو خود کو جمہوریت، مساوات اور آزادی کا علم بردار سمجھتا ہے، برطانیہ کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہے اور ہندوستان کے اسٹرلنگ قرضے میں تخفیف کی حمایت کر رہا ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد سے برطانیہ اپنے قرضے ہندوستان کو قسط وار ادا کرنا شروع کرے گی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ دافعی نام کے

سلسلے میں واشنگٹن میں جو گفت وشنید ہوئی تھی اُس میں امریکہ نے ہندستان کے اسٹرلنگ قرضے میں تخفیف کی حمایت کی تھی۔

۲۸ر دسمبر کو حکومت امریکہ کی سازش سے حکومتِ ہند نے اسٹرلنگ قرضے کا معاملہ طے کیے بغیر ہندستان کو بریٹن ووڈس کے عالم گیر مالی نظام کا رکن بنا دیا۔ موجودہ مرکزی اسمبلی میں اس مسئلے پر جو مباحثے ہوئے اُن سے ایک اہم بات صاف ہو گئی۔ کیا بریٹن ووڈس میں شامل ہونے کے سوال کو اسٹرلنگ قرضے کے سوال سے الگ سمجھا جائے یا دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے؟ ہندستان کے مفاد کے پیشِ نظر کون سا طرزِ عمل صحیح ہوگا؟ ہم سر ضیاء الدین ام۔ ال۔ اے (مرکزی) کی اس تجویز کو بالکل غلط قرار دیتے ہیں کہ ان دونوں کو دو علاحدہ اور ایک دوسرے سے غیر متعلق معاملہ قرار دیا جائے۔ برطانیہ نے جو بریٹن ووڈس میں شریک ہونا گوارا کیا تو صرف امریکی قرض کی شرط کے پورے ہونے پر۔ اسی طرح ہندستان کا بھی یہ حق ہے کہ وہ برطانیہ سے اپنے قرض کا معاملہ طے کر لے اُس کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ اُسے بریٹن ووڈس میں شریک ہونا چاہیے یا نہیں۔ روس کے شریک نہ ہونے کی بڑی وجہ یہی تھی کہ اُسے امریکہ سے قرض نہ حاصل ہو سکا۔

مرکزی اسمبلی میں اس سلسلے میں جو قرارداد منظور ہوئی ہے بالکل صحیح ہے اور اب مقرر کردہ کمیٹی۔ نے جو رپورٹ پیش کی ہے اُس میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ برطانیہ اور ہندستان کے درمیان اسٹرلنگ قرضے کا معاملہ طے ہونے سے پہلے ہندستان بریٹن ووڈس میں شریک ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

———— ※ ————

مسائلِ حاضرہ (غیر ممالک)

آزاد تجارت اور امنِ عالم

از: ——— کلیر وِل کوکس

اداریہ نوٹ:- اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ جنگ کے بعد بین اقوامی معاشی تعلقات کی از سرِ نو تعمیر کا سوال بہت اہم ہوگیا ہے۔ معاشیات میں سلسل اس موضوع پر ماہِ فروری سے مضامین چھپ رہے ہیں جو مختلف نقطۂ خیال کے حامل ہوتے ہیں۔ فروری کی اشاعت میں "آزاد مقابلے کو جوہری بم کے ساتھ دفن کر دو" جس نقطۂ نظر کی پیش کش کرتا ہے وہ زیرِ نظر مقالے کا بہ راہِ راست نقیض ہے۔ اوّل الذکر میں آزاد مقابلے کو قومی اور بین اقوامی دونوں لحاظ سے امنِ عالم کے لیے خطرناک بتایا گیا ہے۔ برخلاف اس کے زیرِ نظر مقالے میں اُسی چیز کو امنِ عالم کا ضامن قرار دیا گیا ہے۔ مارچ کی اشاعت میں بین اقوامی معیشت سے متعلق فاضل مقالہ نگار ای۔ ورگا نے جو اندازے پیش کیے ہیں اُن سے بھی آزاد معاشی مقابلے کے خلاف ہی نتائج مترتب ہوتے ہیں۔ اِن تینوں مقالوں کا اگر یک جا کر کے مطالعہ کیا جائے تو بین اقوامی معاشی مسائل کی ایک جامع تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

سماجی ادارے ہمیشہ تغیر پزیر ہوتے رہتے ہیں۔ انسان اپنے فیصلوں اور ارادوں سے واقعات وحالات کی کلائی مروڑ سکتا ہے اور مروڑ رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں خاص طور سے واقعات کے تعین میں انسان کی ارادی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ جنگ کی وجہ

سے دنیا کا سیاسی اور معاشی نظام درہم برہم ہوگیا ہے۔ چنانچہ دنیا کی قوموں اور ملکوں کے درمیان از سرِ نو صنعتی، مالی اور تجارتی تعلقات کی تعمیر کرنا بہت ضروری ہے۔ ان تعلقات کا جو پرانا ڈھانچا تھا اس میں آزادی کوششوں کے تحت ردّ و بدل کرنے کا یہی موقع ہے لیکن ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ آج ہم جتنی آسانی سے اپنے سماجی نظام میں ردّ و بدل کرسکتے ہیں وہ آیندہ برسوں میں غیر ممکن ہے۔ اگر دیر کی گئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بین اقوامی معیشت اپنی تمام موجودہ خامیوں کے ساتھ مستقل صورت اختیار کرے گی جسے بعد میں بدلنا غیر ممکن ہو جائے گا۔ اس طرح بین اقوامی معیشت کو امن اور خوش حالی کے اصولوں کے مطابق بنانے کا جو نادر موقع ہمارے ہاتھ آیا ہے اس سے ہم فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

موجودہ بین اقوامی معیشت کی اصل خرابی یہ ہے کہ آج دنیا کے مختلف ملکوں میں بلا کسی رکاوٹ کے بالکل آزاد طور پر تجارت نہیں ہوسکتی۔ اس راستے میں جان بوجھ کر بے شمار سرکاری اور غیر سرکاری رکاوٹیں پیدا کردی گئی ہیں۔ گزشتہ بیس پچیس سال سے اِن رکاوٹوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ دو عالم گیر جنگوں کے باعث اور پھر ان دو جنگوں کے درمیان جو عالم گیر معاشی مشکلات اور بحران کا دور آیا اُس کی وجہ سے بھی یہ رجحان ترقی کرتا گیا۔ ہر ملک میں یہ ہوا کہ غیر ملکوں سے مال و اسباب، انسانی خدمات، زر اور تمسکات (SECURITIES) کی آمد و رفت کے کام میں حکومت کی دخل اندازی روز بروز بڑھتی گئی۔ دوسرے ملکوں سے مال کی درآمد کو روکنے کے لیے سمندری محصول بڑھا دیے گئے، کروڑ گیری (TARIFFS) کی رقموں میں اضافہ کیا گیا، مال کا کوٹا باندھا گیا، بندرگاہوں میں غیر ملکی جہازوں کے داخلے پر پابندیاں عائد کی گئیں اور غیر ملکی سکّوں کی فراہمی پر پابندی لگائی گئی تاکہ لوگ اُن سکّوں سے غیر ملکی مال و اسباب نہ خرید سکیں۔ دوسری طرف اپنے ملک کا مال باہر بھیجنے کے لیے بھی اسی قسم کے مصنوعی طریقے اختیار کیے گئے، ہر ملک کی حکومت نے اپنے سکّوں کی قیمت گھٹا دی، اپنے ملک کی صنعتوں کو مصنوعی طور پر امداد مہیا کی، پھر بعض حالتوں میں غیر ملک والوں پر یہ شرط عائد کی کہ اگر تم اپنا مال ہمارے ملک میں فروخت کرنا چاہتے ہو تو اس کے عوض میں تمھیں بھی ہمارا مال ہی لینا ہوگا۔ ہم سکّہ یا سونا نہیں دے سکتے۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ حریف کو نقصان پہنچانے کے لیے ایک حکومت نے دوسری حکومت کے ساتھ علاحدہ طور پر تجارتی سمجھوتا کرلیا جس کے تحت اُن ملکوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا جو معاہدے میں شامل نہیں تھے۔ اور اُن کو کچا مال بھیجنے یا اُن کی صنعتی پیداوار کی درآمد میں رکاوٹ پیدا کی گئی ہے۔ پھر حکومتوں نے اپنے ملک کے تاجروں کو مزید نفع خوری کا موقع دینے کے لیے بڑے بڑے کارٹل (CARTELS) قائم کرنے کی اجازت دی۔ ان کارٹلوں نے صنعتی پیداوار میں کمی کرکے مصنوعی طور پر قیمتوں میں اضافہ کردیا اور دنیا کے بازاروں کو آپس میں تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ بعض اوقات پوری پوری قوموں نے اس قسم کے انتظامات قائم کرنے میں حصہ لیا جن کا مقصد تھا کہ صرف اپنے ملک کی صنعتوں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ انھوں نے خاص خاص اشیا کی پیدائش کم کرکے قیمتوں کو چڑھ جانے کا موقع دیا تاکہ اُن اشیا کے استعمال کرنے والے غیر ملکی باشندوں سے زیادہ نفع حاصل کیا جاسکے۔

اس قسم کے مصنوعی طریقوں سے تو ہر کوئی واقف ہے لیکن اُن کے ہولناک نتائج سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ جب کوئی

قوم اپنی کرُوڈ گیری کی شرح بڑھا دیتی ہے یا غیر ملکوں سے آنے والے مال کے لیے کوٹا مقرر کر دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دیگر قوموں کو اپنے بازاروں میں مال فروخت کرنے سے روکتی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے سکوں کی قیمت گھٹا دیتی ہے یا اپنے مُلک کے بنے ہوئے مال کو دُوسرے مُلکوں کے بازاروں میں بھیجنے کے لیے آسانیاں اور امداد فراہم کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قوم دُنیا کے بازاروں میں خود اپنے صنعتی مالکوں کو دُوسرے مُلکوں کے صنعتی مالکوں کے مقابلے میں ناجائز اور غلط طور سے فائدہ پہنچانے کے لیے مصنوعی طریقے اختیار کرتی ہے۔ جب دو قومیں آپس میں معاہدہ کر کے دُنیا کی تمام دیگر قوموں کے تجارتی اور صنعتی مال کا بائیکاٹ کرتی ہیں تو ایسا کرنے سے اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ مخصوص بازاروں میں دُوسری قوموں کے مقابلے میں انھیں زیادہ مضبوط حیثیت حاصل ہو جائے۔ جب کوئی قوم اپنے زیرِ اثر علاقوں میں ایسا تجارتی نظام وجود میں لاتی ہے جس کے تحت دُنیا کی دُوسری قوموں کو اپنا مال فروخت کرنے کی آسانیاں نہیں رہتیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دُوسرے مُلکوں کے صنعتی مالکوں کو مال فروخت کرنے کے حقوق سے محروم کیا جاتا ہے۔ جب کوئی دُوسرے مُلکوں کے مال کی قیمت ادا کرنے کے سلسلے میں سکوں کی بجائے مال قبول کرنے پر اصرار کرتی ہے تو وہ گویا دُوسرے مُلکوں کے بازاروں میں زبردستی اپنا مال بھیجنے کی مرتکب ہوتی ہے جس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ دُوسرے ممالک کے مال اُن بازاروں میں داخل ہونے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان تمام حالتوں میں یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم دُوسری قوم کو غیر ملکی سکۂ مبادلہ کے حصول سے محروم رکھتی ہے جس کے بغیر کوئی قوم اپنی صنعتی ترقی کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے دُوسرے مُلکوں سے مشین اور دیگر ضروری اشیا نہیں خرید سکتی۔

جب کوئی صنعتی قوم اپنے صنعتی مالکوں کو کارٹل بنانے کی اجازت دیتی ہے جس سے اشیا کی پیدائش کم ہو جاتی ہے اور قیمتیں مصنوعی طور پر اوپر چڑھ جاتی ہیں یا جب کوئی کچا مال پیدا کرنے والی قوم جماعت بندیوں کے ذریعے کچے مال کی تیاری روک کر قیمتوں میں اضافہ کر دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا کی دُوسری قوموں کو اُن اشیا کے فوائد سے محروم رکھا جاتا ہے۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن قوموں کے خلاف اِس قِسم کی کارروائیاں کی جاتی ہیں اُن کی قوتِ خرید گھٹ جاتی ہے اور اُن کے لیے اپنی صنعت کو ترقی دینے اور اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا موقع نہیں رہ جاتا۔ اسی سے بین اقوامی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ قومیں ایک دُوسرے سے بدلہ لینے کی کوشش کرتی ہیں اور جنگ چھڑ جاتی ہے۔

پہلی جنگِ عظیم اور دُوسری جنگِ عظیم کے درمیانی عرصے میں یہی سب ہوتا رہا۔ لیکن اس تاریک پس منظر میں کچھ ایسی روشن مثالیں بھی نظر آتی ہیں جن کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ۱۹۳۴ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں "بالعوض تجارتی راضی ناموں کا قانون" (RECIPROCAL TRADE AGREEMENTS ACT.) پاس ہوا۔ اس قانون کے تحت ریاست ہائے متحدہ نے دُنیا کی کوئی بیس قوموں سے الگ الگ راضی نامہ کر کے تجارتی محصولات میں تخفیف کرانے کی کوشش کی۔ پھر دُوسری روشن مثال

یہ تھی کہ ۱۹۳۶ء میں پونڈ، ڈالر اور فرانک[1] کے درمیان شرح تبادلہ کو مستقل اور دائمی بنانے کی کوشش کی گئی۔ سوائے ان دو واقعات کے اور جو کچھ ہوا وہ بین اقوامی تجارت پر بے جا پابندیاں عائد کرنے اور دوسری قوموں اور ملکوں کے تجارتی بائیکاٹ کے واقعات سے معمور ہے۔ جنگ سے پہلے کی بین اقوامی تجارت کو جس شخص نے سب سے عظیم صدمہ پہنچایا وہ ہٹلری جرمنی کا وزیر مالیات ڈاکٹر شاخت تھا جس پر اب جنگی مجرم کی حیثیت سے نورم برگ میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر شاخت سیاسی دنیا سے نکالا تو جا چکا ہے لیکن بدقسمتی سے ابھی وہ طریقے اور وہ حربے نہیں ختم کیے جا سکے ہیں جو اس نے بین اقوامی تجارت کو صدمہ پہنچانے کے لیے ایجاد کیے تھے ممکن ہے اب دوسری قومیں اپنے خودغرضانہ مفاد کو آگے بڑھانے کے لیے انھی طریقوں پر کاربند ہونے کی کوشش کریں۔

جب ۱۹۳۹ء میں عالم گیر جنگ چھڑ گئی تو جنگ کی ضرورتوں اور مجبوریوں نے عالم گیر تجارت کو افراد کے ہاتھوں سے نکال کر حکومتوں کی مضبوط گرفت میں پہنچا دیا۔ پھر مختلف ملکوں کے درمیان جو تجارتی تعلقات قائم تھے اُن کے تار و پود بکھر گئے اور جہاں نہیں بکھر سکے وہاں جنگی ضروریات کے پیش نظر اُن میں کافی رد و بدل کیا گیا۔ مثلاً دشمن کے خلاف معاشی جنگ چھیڑنے کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو غیر ملکوں سے بہت سی ایسی چیزیں خریدنی پڑیں جن کی اُسے کوئی ضرورت نہ تھی، تاکہ وہ چیزیں دشمن کے پاس نہ پہنچ جائیں۔ پھر ریاست ہائے متحدہ نے دوسرے ملکوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنے مال و اسباب بھیجے اور اُن کے عوض میں اُن کے مال بھی خریدے۔ ایسا کرنے کا یہ مقصد تھا کہ اتحادی مقاصد کے لیے اُن ملکوں کی ہمدردی اور حمایت حاصل کی جا سکے۔ پھر ریاست ہائے متحدہ نے ایسے ملکوں کو مال بھیجنے سے گریز کیا جنھوں نے جنگ میں تعاون سے انکار کیا تھا تاکہ وہ دشمن کو مدد نہ پہنچا سکیں۔ پھر جنگ کے دوران میں یہ بھی ہوا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے جو مال غیر ملکوں کو بھیجے گئے اُن میں زیادہ مقدار شہری استعمال کی نہیں بلکہ فوجی استعمال کی تھی۔ غرض جنگ کے زمانے میں بین اقوامی تجارت پورے طور پر جنگ کا آلہ کار بنی رہی۔ اور یہ سب جنگی ضروریات کے تحت ہوا۔ اب جو سوال ہمارے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ کیا بین اقوامی تجارت واقعی "شہید جنگ" ثابت ہو کر رہے گی یا اس کے دوبارہ پنپنے کی بھی امید کی جا سکتی ہے۔

جنگ کی وجہ سے تجارت کو کنٹرول کرنے کے بیسیوں طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔ مختلف ملکوں کے سکوں کے تبادلے میں عالم گیر دقتیں اور رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں۔ وہ لوگ جو غیر ملکوں میں اپنا مال فروخت کرتے تھے انھیں اپنے غیر ملکی سرمایے حکومتوں کے حوالے کر دینے پڑے۔ پھر جو لوگ غیر ملکوں سے مال خریدتے ہیں وہ حکومت کی اجازت کے بغیر اُن کی قیمت نہیں ادا کر سکتے۔ غیر ملکوں سے مال کی آمد و رفت پر "مقداری پابندیاں" (QUANTITATIVE CONTROLS) بھی عائد کر دی گئی ہیں۔ یعنی حکومتوں نے یہ مقرر کر دیا ہے کہ کتنا مال ملک کے اندر آئے گا اور کتنا ملک سے باہر جائے گا۔ مال منگانے اور بھیجنے کے لیے لوگوں کو

---

[1] فرانسیسی سکہ

لائسنس حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جنگ کے دوران میں یہ طریقہ بھی رائج ہوا ہے کہ بعض حالتوں میں حکومت نے افراد کو غیر ملکی تجارت کا لائسنس دینے کی بجائے پبلک ایجنسیاں کھڑی کر دی ہیں اور اُن کے ہاتھوں میں غیر ملکی تجارت کا بڑا حصہ سونپ دیا ہے۔ یہ بھی ہوا ہے کہ آزادانہ اور غیر پابند خرید و فروخت کی بہ جائے مال کا مال ہی سے تبادلہ کیا گیا ہے۔ غرض پوری بین اقوامی اور عالم گیر تجارت پر حکومتوں نے پہرے بٹھا دیئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کے بعد کیا صورت ہوگی۔ فوری صورت حال زیادہ امید افزا نہیں قرار دی جا سکتی۔ اس وقت دنیا کے تمام تجارتی ملکوں کے پاس معاشی جنگ چھیڑنے کے تمام ساز و سامان موجود ہیں اور عالم گیر آزاد تجارت کو نقصان پہنچانے کے لیے وہ تمام حربے کام میں لائے جائیں گے جو سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۹ء کے درمیان میں وجود میں آئے اور جنگ کے زمانے میں جن کو تیز کیا گیا۔ اس وقت ساری دُنیا میں معاشی بدحالی کا دور دورہ ہے۔ تمام بڑی طاقتیں ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھ رہی ہیں اور ایک دوسرے پر الزام دھرتی ہیں۔ ایسی فضا میں قطعی تعجب انگیز نہ ہوگا کہ دُنیا کے تمام ممالک اپنے اپنے خود غرضانہ مفاد کے پیشِ نظر آزاد تجارت کے راستے میں رُکاوٹیں پیدا کرنا شروع کر دیں۔ اگر سوویت یونین، برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ اپنے اپنے زیرِ اثر حلقوں اور علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لیں۔ امتیازانہ طریقوں، جنسی مبادلوں اور معاہدوں کے ذریعے دوسرے علاقوں پر بھی قبضہ جما لیں تو معاشی تعلقات کے ذریعے دُنیا متحد ہونے کی بہ جائے ایسے معاشی علاقوں میں منقسم ہو جائے گی جن کا آپس میں سخت مقابلہ ہوگا۔ اگر یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تو دُنیا خوش حالی اور امن کی طرف بڑھنے کی بجائے مفلسی اور جنگ کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے گی۔ ایسی صورتِ حال کا پیدا ہونا کچھ مشکل نہیں۔

ان خطرات سے بچنے کا صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ ہے مکمل معاشی آزادی۔ بین اقوامی دُنیا میں اس آزادی کے معنی یہ ہیں کہ زر بلا کسی روک ٹوک کے ایک مُلک سے دُوسرے مُلک میں جانے لگے، دُنیا کے مختلف مُلکوں کے سکّوں کے شرح تبادلہ میں اعتدال پیدا ہو، ایک مُلک سے دُوسرے مُلک کے درمیان مال و اسباب کی آمد و رفت پر موجودہ پابندیوں کو گھٹا کر برائے نام کر دیا جائے۔ اپنی غیر مُلکی تجارت پر کنٹرول کرنے کے سلسلے میں کوئی قوم دُوسری قوموں کے ساتھ امتیازی سلوک نہ روا رکھے۔ چوں کہ دُنیا میں معاشی پابندیاں بہت مضبوطی کے ساتھ اور بہت عرصے سے قائم ہیں اس لیے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ ہفتے عشرے میں ساری دُنیا میں معاشی آزادی قائم ہو جائے گی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے میں یقیناً دیر لگے گی۔ لیکن ہماری کوشش یہی ہونی چاہیے کہ ہم جو قدم بھی اُٹھائیں وہ اِس مقصد کی طرف ہو۔

اگر دُنیا متعدد معاشی علاقوں میں تقسیم ہوگئی تو اس میں کاروبار اور تجارت کے راستے میں بے شمار ناخوش گوار رُکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی دُوسرے مُلکوں سے مال منگوانے یا دُوسرے مُلکوں کو مال بھیجنے کے لیے پہلے سے پروگرام بنانا ہوگا اور اُن مُلکوں سے بہت پہلے سے

گفت و شنید کا سلسلہ شروع کرنا ہوگا۔ حکومت کے ہاتھوں میں اس بات کا تعین کرنے کا اختیار ہوگا کہ کون تاجر کتنا مال باہر سے منگوائے یا غیر ملکوں میں بھیجے۔ ان تمام امور سے متعلق جو قانون بنیں گے اُن کو عمل میں لانے کے لیے اور اندراجات قائم رکھنے کے لیے لائسنس کا طریقہ رائج کرنا پڑے گا۔ آزاد تجارت میں تو یہ ہوتا ہے کہ تاجر جس وقت چاہے، جس مقام پر چاہے، مُتعینہ قیمت پر جو چیز چاہے خرید سکتا ہو اور بیچ سکتا ہو۔ لیکن آزاد تجارت کی عدم موجودگی میں یہ ہوگا کہ اشیا خریدنے اور بیچنے کے سلسلے میں تاجر کو ہزاروں پابندیوں سے گزرنا ہوگا۔ حالاں کہ انفرادی سعی و عمل کو ترقی کا موقع دینے کے لیے اور انفرادی تجارت اور کاروبار کے فائدے حاصل کرنے کے لیے ضروری ہو کہ تاجروں کو دفتری طوالت اور جھمیلوں سے محفوظ رکھا جائے۔

اُن عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے بھی اگر دیکھا جائے جو اشیا خریدتے اور استعمال کرتے ہیں تو دُنیا کا متعدد معاشی علاقوں میں تقسیم ہو جانا بدقسمتی کا باعث ہوگا۔ اگر مختلف مُلکوں کو ملا کر تجارتی علاقے بنائے گئے تو بھی عام لوگوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان علاقوں کے لوگوں کا معیارِ زندگی ایسے ملکوں کی بہ نسبت بہتر ہوگا جو بالکل الگ تھلگ رہنے کی کوشش کریں گے لیکن مکمل طور پر آزاد بین اقوامی تجارت کی موجودگی میں لوگوں کے معیارِ زندگی کو جتنا بلند کیا جا سکتا ہو اُس کے مقابلے میں وہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اگر مختلف مُلکوں کو ملا کر تجارتی علاقے قائم کیے گئے تو اُس صورت میں ایک اور خطرہ ہے اور وہ یہ کہ جمعیت کے اندر جو سب سے طاقت ور اور با اقتدار مُلک ہوگا وہ کم زور ملکوں پر حاوی ہونے اور دباؤ ڈال کر زیادہ منافع حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ طاقت ور مُلک کم زور مُلکوں کو ایسی اشیا پیدا کرنے پر مجبور کرے گا جو اُس کے اپنے فائدے کی ہوں نہ کہ خود اُن کم زور ملکوں کے فائدے کی۔ اس طرح پیداوار اور آمدنی دونوں میں کمی واقع ہوگی۔

لیکن سب سے بڑا خطرہ یہ ہو کہ اگر دُنیا مختلف معاشی علاقوں میں منقسم ہوگئی تو ہر علاقہ سیاسی اور فوجی لحاظ سے بھی دُوسرے علاقوں کا مخالف بن جائے گا۔ ہر مخصوص معاشی علاقہ بقیہ دُنیا کے خلاف معاشی جنگ چھیڑنے کے بعد اپنے تحفظ کے لیے لازمی طور پر فوجی اور سیاسی اعتبار سے بھی مضبوط اور متحد ہونے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح جنگ کے خطرات پیدا ہوں گے۔ غرض اگر دُنیا معاشی اور تجارتی لحاظ سے مختلف اور متعدد علاقوں میں بنٹ گئی تو پھر دُنیا میں امن اور تحفظ قائم کرنے کے لیے تمام مُلکوں کا اتحاد نہیں قائم کیا جا سکتا۔

برخلاف اس کے اگر ہم آزاد بین اقوامی تجارت کے فوائد پر نظر ڈالیں تو وہ بالکل واضح اور یقینی نظر آئیں گے۔ آزاد تجارت سے انفرادی معاشی سعی و عمل کو تقویت حاصل ہوگی۔ "جغرافیائی تقسیمِ عمل" وجود میں آئے گی، یعنی ہر مُلک وہی اشیا پیدا کرے گا جس کے لیے وہ سب سے زیادہ موزوں ہو اور ضرورت کی بقیہ چیزیں دُوسرے مُلکوں سے طلب کرے گا۔ اس طرح ساری دُنیا کی صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور ساری دُنیا میں عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو جائے گا۔ تمام مُلکوں کے لوگ ایک دُوسرے سے قریب آنے کی کوشش

کریں گے۔ انھیں ایک دوسرے کو سمجھنے اور ساری دنیا کی بھلائی کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا موقع ملے گا۔ امن اور تحفظ کا قیام اُسی وقت ممکن ہے جب دنیا میں دولت کی فراوانی ہو اور تمام ممالک متحد ہو جائیں۔ ایسی دنیا میں امن و تحفظ کا قیام ناممکن ہے جس میں اشیا کی قلت ہو اور تمام ممالک مخالف گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہوں۔ بین اقوامی معاشی آزادی خوش حالی پیدا کرتی ہے اور خوش حالی سے امن کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔

اس وقت فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں کے سکوں کی شرح تبادلہ کا مستقل تعین ہو جائے۔ زر کے تبادلے پر سے تمام پابندیاں ہٹالی جائیں، تجارت پر سے کڑوڑگیری اور دیگر محصولات میں معتد بہ کمی کی جائے، درآمد اور برآمد کے معاملے میں کوئی بھی قوم کسی بھی قوم کے ساتھ امتیازی سلوک نہ روا رکھے۔ ایسے طریقوں اور انتظامات کو اُٹھا دیا جائے جن سے دنیا کے مختلف ملکوں کے درمیان مال کی آمد و رفت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، چاہے وہ طریقے اور انتظامات حکومت کے عائد کیے ہوئے ہوں یا عام لوگوں کے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا کے تمام لوگوں کو بڑھی ہوئی تجارت سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا اور عالم گیر خوش حالی پیدا ہوگی۔

انھی مقاصد کو حل کرنے کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے کچھ تجویزیں تیار کی ہیں جن سے عالم گیر تجارت کے ترقی کرنے اور دنیا میں خوش حالی اور بارزگاری کے پھیلنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ یہ تجویزیں آنے والی عالم گیر تجارتی کانفرنس میں پیش کی جائیں گی۔ اس کے کچھ خاص اصول مندرجہ ذیل ہیں:-

صرف ضروری اور خاص خاص حالات کے تحت درآمد یا برآمد کے مال پر کوٹا باندھا جائے یا تجارتی جہازوں کی آمد و رفت پر پابندی لگائی جائے۔ ان پابندیوں کے عائد کرنے میں کسی ملک کے ساتھ امتیازی سلوک نہ روا رکھا جائے۔ کڑوڑگیری کے محصولات میں کمی کی جائے اور اس سلسلے میں تمام ملکوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔ خاص خاص صنعتوں کو سرکاری امداد عطا کرنے کا سوال بین اقوامی سوال قرار دیا جائے۔ برآمد کے مال پر سرکاری امداد صرف خاص خاص حالتوں میں دی جائے۔ وہ حکومتیں جو اپنے ملک اور دوسرے ملکوں کے درمیان تجارت کو خود اپنے ہاتھوں میں رکھتی ہیں وہ اس بات کا وعدہ کریں کہ وہ تمام اتحادی ملکوں کے ساتھ مناسب تجارتی سلوک روا رکھیں گی۔ ایسی حکومتیں دوسرے ملکوں سے خرید و فروخت کی بنیاد خالصتاً معاشی ضروریات پر رکھیں نہ کہ سیاسی بنیاد پر۔ ایسی حکومتیں اپنے ملک کی صنعت و حرفت کو تحفظ عطا کرنے کے لیے اپنے ملک کی تجارتِ درآمد کا بہت سا اجارہ خود اپنے ہاتھوں میں نہ لے لیں۔ بین اقوامی کارروائی کے ذریعے بین اقوامی کارٹلوں اور اجارہ داری کو روکنے کی کوشش کی جائے تاکہ عالم گیر تجارت محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ بنیادی صنعتی اشیا سے متعلق جو خاص خاص مسائل ہیں اُن کو بین اقوامی بحث و مباحثے اور غور و خوض کے بعد طے کیا جائے۔ اور جو کچھ بھی فیصلہ ہو اُن میں پیدا کرنے والے ملک اور استعمال کرنے والے ملک دونوں کا مساوی حصہ ہو۔ مسلسل اور مکمل

روزگار اور خوش حالی پیدا کرنے کے لیے جو ملک جو تدابیر بھی عمل میں لائے وہ اس اصول کے تحت ہونا چاہیے کہ وہ اپنے خانگی مسائل حل کرنے کے لیے ایسے طریقے نہ اختیار کرے جن سے عالم گیر تجارت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ بین اقوامی معاشی اور سماجی کونسل کے تحت ایک بین اقوامی تجارتی انجمن وجود میں لائی جائے اور اُسے "انجمن اقوام متحدہ" کا ایک حصہ بنا دیا جائے "انجمن اقوام متحدہ" عالم گیر تجارت اور روزگار کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک بین اقوامی کانفرنس کا انعقاد کرے۔

———— ✻ ————

علمی مقالہ

معاشی ماحول کا اثر سماج پر

از: ——— پروفیسر سیتارام باہری ایم۔اے ایم۔او۔ایل

انسانی زندگی کا ہر شعبہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اینٹ پتھر اور گھاس پھوس سے لے کر نازک خیالات اور روحانی قوت تک ماحول کے اثرات حاصل کرتی ہے۔ انسان اپنی تسلی اور تشفی کے لیے اپنے ماحول کو بناتا بھی ہے اور پھر بگاڑ بھی ڈالتا ہے۔ بعض اوقات وہ خود ماحول کے ہاتھوں میں بے بس بھی ہو جاتا ہے۔

جغرافیائی ماحول کا اثر

آبادی کی افزائش اچھی سطح زمین پر منحصر ہوتی ہے۔ عہدِ قدیم میں مشرقی ممالک کی گنجان آبادیاں اکثر دریاؤں کے کناروں پر یا پہاڑوں کی وادیوں میں تھیں۔ پرانے آریہ بھی دریاؤں کے توسی معامات ہی پر ڈیرے ڈالتے تھے۔ تاکہ اناج آسانی اور کفایت سے دست یاب ہو سکے اور نقل و حرکت میں بھی آسانی ہو۔ دریائے نیل، دریائے ینگ سی کیانگ اور دریائے گنگا پرانے تہذیب و تمدن کے گہوارے رہ چکے ہیں۔ انہی آبادیوں سے تجارت ہجرت اور حملے شروع ہوئے اور اس طرح طرزِ تمدن میں ردّ و بدل ہوتا رہا۔ یورپ میں ڈینیوب اور رائن نے وحشی اقوام کی نقل و حرکت کو برقرار رکھا۔ آج کل بھی بڑے بڑے شہر دریاؤں ہی کے کنارے واقع ہیں۔ مثلاً کلکتہ، رنگون، الہ آباد، لاہور، دہلی، لندن ہانگ کانگ، نیویارک وغیرہ۔

ساحلی علاقوں کا بھی تہذیب و تمدن کے بنانے بگاڑنے یا محدود کرنے میں بہت اہم حصہ ہوتا ہے۔ برطانیہ کی ساری معاشی

بہبودی کا دارومدار بحری طاقت پر ہے۔ قدرت نے اُس ملک کو ایک بے مثال جائے وقوع عطا کی ہے۔

پہاڑوں میں بسنے والے بالطبع سخت جان، غریب، قدامت پرست اور مذہبی لحاظ سے ڈھلل یقین اور بے ریا ہوتے ہیں۔ میدانی علاقے کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہوتی ہے اس لیے لوگ کاہل اور عیش پرست ہوتے ہیں۔ آبادی کی افزائش سے وہ غریب بھی ہوجاتے ہیں، جو ماحول لوگوں کو کسان، شکاری، مچھیارا، گڈریا یا کان کن بناتا ہے وہی اُن کے عادات، رسم و رواج، اخلاق، مذہب، بلکہ سارے نظام حیات میں اختلافات پیدا کرتا رہتا ہے۔

زیادہ گرمی یا سردی جسمانی یا دماغی کام کے منافی ہے۔ ۴۸° کی گرمی میں سب سے اچھا کام ہوسکتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ خودکشی یا لڑائی جھگڑے کے واقعات گرمی کے موسم میں زیادہ ہوتے ہیں اور چوری چکاری سردیوں میں۔ کئی دفعہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی قسم کی آب و ہوا میں بسنے والی دو مختلف قومیں بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ بعض دفعہ تو ان میں چنداں فرق نہیں ہوتا جیسے اٹلی اور ہندستان کے لوگوں کی عام عادت میں زیادہ نمایاں فرق نہیں ہے۔ انسانی جماعت کو اپنے ماحول کے مطابق اپنا دستور و رکام کاج بدلنا پڑتا ہے۔ کلکتہ، بمبئی، جمشید پور، سری نگر اور شملہ میں آج سے ایک سال پہلے بہت کم آبادی تھی لیکن اب وہاں کافی آبادی ہے اس لیے کہ اب سائنس نے لوگوں کو پانی، ہوا اور مٹی کی حدود سے بہت کچھ آزاد کر دیا ہے۔

یوں تو سماجی ماحول اور معاشی ماحول ایسے گڈمڈ ہوگئے ہیں کہ اُن کا فرق بہ ظاہر نظر نہیں آتا مگر درحقیقت اُن کے اثرات الگ الگ ہوتے ہیں۔ روایات، رسوم و رواج، قانون، توہمات، گفتگو کے آداب، اسلوب بیان، علوم، ایمان و ایقان یہ سب چیزیں مختلف معاشی ماحول میں مختلف شکلیں اختیار کرتی ہیں۔ ان کے اثر و رسوخ کا الگ الگ بیان بہت طویل ہوگا اس لیے اُن سے مختصراً بحث کی جائے گی۔

معاشی نظام کی اہمیت

انسان نے اپنی روزانہ زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایسا نظام بنایا ہے کہ پیداوار، تبادلہ، تقسیم اور صرفِ زر کے اصولوں پر قدرت کی قوتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اسی سے کئی مخلوط اور انقلاب پزیر ادارے وجود میں آتے ہیں جو جماعتوں، کنبوں اور شخصی زندگی کے متعلق یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ کس ڈھنگ پر رہیں، کن لوگوں کو سخت محنت کرکے پیٹ پالنا ہے اور کن لوگوں کو آرام سے رہنا ہے۔ اس معاشی نظام نے دُنیا کے قطبین کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔ یہ نظام کئی صدیوں سے قائم ہے۔

معاشی نظام انسانی جماعتوں کے تعاون اور اُن کی گوناگوں سرگرمیوں ہی سے قائم رہ سکتا ہے۔ جو لوگ باشعور ہیں وہ اُن پر عمل پیرا ہوکر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ تعاون کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔ کنبہ، گاؤں، شہر، قوم، اسی اصول کے زیر اثر ایک بڑے نظام

میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ انسان اپنے آپ کو دُنیا کی لامحدُود برادری کا ایک فرد سمجھنے لگتا ہی۔ اسی لیے تو ہندستان کا مزدُور لنکاشائر کے مزدُوروں کے لیے چائے کے پتّے چنتا ہو اور وہاں کا مزدُور اُس کے لیے کپڑا تیار کرتا ہی۔ مگر معاشی مصلحت کا تقاضا ہی کہ محض گوناگوں سرگرمیاں ہی ضروری نہیں بلکہ اُن کا ایک دُوسرے پر منحصر ہونا بھی لازمی ہی۔ ورنہ اُن کی من مانی آزادی اِس نظام کو بگاڑ کر اُن کی اپنی زندگی بھی دوبھر کر دے گی۔ اگر لنکاشائر کے مزدُور ہندُستانی چائے سستے داموں پر پینا چاہیں مگر کپڑا بہت مہنگا بیچیں یا چائے کے عوض کچھ دینے سے انکار کریں تو ہندُستانی مزدُور اُن کے لیے کب تک کام کر سکتے ہیں؟

معاشی نظام میں اگر کوئی انقلاب آجائے تو سیاسی نظام بھی اثر پزیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یوُرپ کے صنعتی انقلاب نے وہاں کے طرزِ حکومت کو بالکل بدل ڈالا۔ انسانی جماعت کی نئی تقسیم ہوئی، آبادیاں اُجاڑ ہوگئیں اور بیابان گنجان شہر بن گئے — لوگوں کے خیالات، عقائد اور رسم و رواج، عادات اطوار، خوراک اور لباس میں بھی نمایاں تبدیلی آگئی — میرا خیال ہی کہ اگر بادشاہ محمد تغلق یہ اصوُل جانتا تو دہلی کی آبادی کو جبراً دولت آباد نہ لے جاتا بلکہ وہاں ایک ایسا معاشی نظام قائم کرتا جس سے ہندُستان کے مختلف شہروں سے لوگ جوق در جوق کھنچے چلے آتے — اِسی اصوُل کا ایک عالم گیر اثر جو آج ہم دیکھ رہے ہیں وہ لوگ بھی نہیں جانتے تھے جنھوں نے اِس نئے صنعتی نظام کو قایم رکھنے کے لیے نئی نئی ایجادیں کیں، اپنی ضروریات کو پوُرا کرنے کے لیے ذرائع ڈھونڈھے، مشینوں میں اختراعیں اور ترمیمیں کیں یا نئے نئے مُلکوں میں کچّا مال خریدنے اور تیار شدہ مال بیچنے کے لیے منڈیوں کی تلاش کی — حالاں کہ انھوں نے معاشی نظام کی بنیادوں میں جو تبدیلیاں کیں اُن کا پُرانے سماجی نظام پر اثر پڑا۔ اور ایک ایسا نظام وجود میں آیا جس میں انسان کا مذہب، علم و ادب، اخلاق غرض سب کچھ نئے رنگ میں رنگ گیا۔ آج یوُرپین شاعری کی تاریخ کا بھی جب تذکرہ آتا ہی تو اِس صنعتی انقلاب کا ذکر ضروُر کرنا پڑتا ہی۔

مارکس کا نظریہ

مارکس نے بھی لکھا ہی کہ سماجی تبدیلیوں کا سب سے بڑا سبب معاشی نظام ہی۔ سماجی نظام کی بنیادیں اُن تعلقات میں پوشیدہ ہیں جو چیز بنانے والے کو چیزوں کی تیاری کی شرائط عائد کرنے والے سے ہوتے ہیں — اہل و عیال، دیر و حرم، راج پاٹ اور انسانی تمدّن کے دُوسرے سب نظام، آرٹ، لٹریچر، سائنس وغیرہ معاشی طاقتوں کے زیرِ اثر شکل پزیر ہوتے ہیں — لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ معاشی چیزیں ہی ہماری کوششوں کا منتہائے مقصوُد ہیں یہ معاشی چیزیں تو کچھ اور ضروریاتِ زندگی کو پوُرا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ فی نفسہٖ وہ چنداں مفید نہیں — لوگ تن دُرستی، تونمندی، علم و فن یا مذہب تو بلا واسطہ لطفِ حیات کے لیے چاہتے ہیں۔ اسی لیے اِن کی اہمیت معاشی چیزوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہی۔

شہری اور دیہاتی معیشت کا اثر

صنعتی ترقّی کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کی اہمیت بھی بڑھتی گئی۔ یہ تبدیلی بے شک معاشی ارتقا کے سبب ظہور پزیر ہوئی۔ ذرائع آمد و رفت کی فراوانی نے لوگوں کو بڑی تعداد

میں یک جا جمع ہوکر آسانی سے رہنا سہنا سکھا دیا۔ سائنس کی ترقی نے زراعتی نظام سے لوگوں کو ہٹا کر صنعت کی طرف متوجہ کیا۔ اب لوگوں کی ضروریاتِ زندگی جلدی جلدی پوری ہونے لگیں۔ شہر دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے اور دیہات جوں جوں غیر ضروری ہوتے گئے۔ آہستہ آہستہ سماج کا سارا ڈھانچہ بھی بدل گیا۔

دیہات میں سماجی تعلقات زیادہ تر قُربت اور ہمسایگی کی وجہ سے پنپتے ہیں۔ شہری لوگ عموماً اپنے ساتھ والے کُنبے کو بھی نہیں جانتے۔ وہاں تو وہ اپنے اپنے مذاق کی مذہبی، ادبی یا سوشل انجمنیں بنا کر رہتے ہیں۔ اسی لیے وہاں رسم و رواج کی پابندی اتنی سخت نہیں جتنی کہ دیہات میں ہوتی ہے۔ دیہات میں انفرادی زندگی ایک ناپید چیز ہے۔ وہ ایک دوسرے کے امور میں آزادانہ دخل دے سکتے ہیں اور اُن کو ایک دوسرے کی رائے کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ شہروں میں یہ باتیں نہیں، وہاں خواص اپنی من مانی کر سکتے ہیں اور اُن کو عوام کی چنداں پروا نہیں ہوتی۔

شہری زندگی سوشل تحریکوں پر زور دیتی ہے اور رسم و رواج کو کم زور کر کے فیشن پرستی کو مقبول بناتی ہے۔ عوام کو آزادیِ خیال حاصل ہونے کے باعث نئے نئے خیالات اُبھرتے رہتے ہیں اور پرانی لکیریں مٹتی رہتی ہیں۔ شہر تہذیب و تمدن کی آسائشیں تو بے شمار مہیا کر سکتا ہے لیکن وہاں بھی سماج کا ضبط ٹوٹے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کم زوروں اور ناداروں کو کوئی آسرا نہیں ملتا کیوں کہ قدرت، مذہب اور روحانیت کی اپیل یہاں کارگر نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے شہری عوام میں بے مائگی بڑھتی رہتی ہے اور اوپر کے طبقوں میں طاقت حاصل کرنے کی دُھن نفرت کا پیش خیمہ بنتی رہتی ہے۔ اس طرح فوائد اور نقصانات کی یہ کھچڑی شہر میں پکتی رہتی ہے۔

سماج ایک اور طرح سے بھی شہری زندگی کے زیرِ اثر بدلتا رہتا ہے۔ شہروں میں متحدہ عمل کے لیے کافی موقع ہوتا ہے۔ پانی کی فراہمی، بجلی، گندگی کا رفع کرنا، حفاظتِ امن، تفریح وغیرہ کئی باتیں پہلے الگ الگ ہر گھر کے نجی انتظام کے ماتحت تھیں، اب وہ ایک مشترکہ نظام کے تحت آگئی ہیں۔ نئی اجتماعی تحریکیں (مثلاً کسی بیماری کی روک تھام) زیادہ اہم ہو جاتی ہیں۔ شہر میں متعدی امراض بہت سرعت سے پھیل سکتے ہیں لہٰذا انسداد کے نئے نئے طریقوں کی جستجو ہوتی رہتی ہے تاکہ عام سماج کی ترقی ہو۔ اگر تمام اجتماعی مسائل کا سامنا سمجھ بوجھ اور اتحادِ عمل سے کیا جائے تو ایسے کئی بیش قیمت حل معلوم ہو جاتے ہیں جن سے مُلک و قوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

گنواروں کا سا خلوص، یک جہتی، اخوت اور میل ملاپ شہریوں کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ لیکن زندگی کے مختلف شعبوں کی گوناگوں مصروفیتیں اُبھر آتی ہیں جس سے نہ صرف سماج کا کام کاج ماہرین کے ہاتھوں سے سرانجام پاتا ہے بلکہ نئی نئی ترقی کی راہیں بھی نکل آتی ہیں۔ جب کوئی مقام سیاسی یا معاشی قوتوں کا اہم مرکز بن جاتا ہے جیسے بندرگاہ، تجارتی راستوں کا جنکشن یا کسی اعلا افسر کی جائے قیام، تو حکومت کی طرف سے امن و امان کا انتظام بھی مستحکم ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ یہ مقام ایک بڑا شہر بن جاتا ہے اور شہری سماج کا وجود وہاں کے رہنے والوں کو نئی شاہراہِ عمل پر ڈالے جاتا ہے۔

معاشی نظام اور عورت

عورتوں کی زندگی پر شہری ماحول کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جدید صنعتوں نے وہ تمام امور اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں جو پہلے عورتوں کو کرنے پڑتے تھے۔ کاتنا، سینا، پرونا، کھانا پکانا چکی پیسنا، کپڑے دھونا، سب کام مشینیں انجام دے رہی ہیں۔ اگر آج بھی شہر میں دیہات کا سا نظام قائم ہوجائے تو صنف نازک پھر اپنی چاردیواری میں چلی جائے گی اور وہ تمام چیزیں تیار کرنے میں مصروف ہوجائے جو جدید مشینیں انجام دے رہی ہیں لیکن ایسا ہونا ناممکن ہے۔ آج دفتروں میں، کارخانوں میں، دکانوں میں، جہازوں میں، ٹینکوں میں، جنگجو دستوں میں ہر جگہ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ اپنی روزی کما رہی ہیں۔ اب اُن کی زندگی میں ایک طوفانی انقلاب آگیا ہے۔ اُن کے عادات و اطوار، چال ڈھال، لباس، خیالات سب بدل رہے ہیں۔ اگرچہ وہ کچھ مدت پہلے رسم ورواج کی پابندی کی حامی تھیں مگر آج اُنھوں نے یہ سب قیود توڑ ڈالنے کی ٹھان لی ہے۔ اس جنگ عظیم نے اُن کی کافی حوصلہ افزائی بھی کی ہے اور آیندہ چند سالوں میں وہ کافی حقوق حاصل کرلیں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک اُن کو حسب حال ماحول نہ مل جائے وہ اچھی شہری نہیں بن سکتیں۔

معاشیات کا تعلق سماج کی نئی نئی تحریکوں سے

وہ تمام اُلجھنیں جو آج ہمیں اپنی سماجی تحریکوں میں نظر آتی ہیں، اُن کا باعث معاشی نظام کی تبدیلیاں ہیں۔ شاید دُنیا کی تاریخ میں کبھی ایسا انقلاب رونما نہیں ہوا جو اس ڈیڑھ صدی کی صنعتی ترقیوں کی وجہ سے رونما ہو رہا ہے۔ اسی لیے تو اس کو "بے قابو انقلاب" کا نام دیا گیا ہے۔ اپنے آپ کو بدلتے ہوئے ماحول کے مطابق کرلینا ایک مشکل اور طویل کام ہے۔ شہروں کے اسی نئے صنعتی ماحول سے مرد و زن ابھی پورے طور پر آشنا نہیں ہوسکے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جسمانی کوفت و ماندگی، بے حسی اور ناتوانی، حوادث اور نامراد بیماریوں کو دُور کرنے کی غرض سے ہم نئے نئے حالات کو اپنی ضروریات کی روشنی میں دیکھنے لگے ہیں — لیکن ہم ابھی تک لاشعوری طور پر اپنی دیرینہ خواہشات ہی کو پورا کرنے کے طریقے ڈھونڈھ رہے ہیں حالاں کہ ہمارے اردگرد مسلسل بے چینی اور بدامنی کی موجیں اُٹھ رہی ہیں۔

نئے ماحول میں انسانی احساسات کے اظہار کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ وہ احساسات یہ ہیں جنسی بھوک، دوستی کا جذبہ، تفریح، احساس ملکیت وغیرہ۔ آج جہاں ہم خود اپنے نفس کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور اپنے مفاد کی حصول کے لیے ہمہ تن کوشاں ہیں، وہاں ہم پورے سماج کے ردعمل کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے۔ اس قسم کے رجحانات یا تو نامعقول ہوتے ہیں یا تشنۂ تکمیل یا بہت بھڑکیلے۔ آج اس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ انسان کی تمام بنیادی ضروریات آسانی کے ساتھ پوری ہوسکیں۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ قوتِ ایجاد کی کمی کے باعث یا دماغی اور تمدنی امور کی لاعلمی کی وجہ سے ممکن ہے کئی بار ہمیں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑے لیکن ہمیں آخری کامیابی پر یقین رکھنا چاہیے۔ اور انسان کی ذاتی خواہشات اور سماجی ضروریات میں ایک روز یقیناً ہم آہنگی پیدا ہو کر رہے گی۔

———

صنعت:-

ہندستان کی صنعتی ترقّی کے چند پہلو

از: ابوسالم، ایم۔اے (علیگ)

ہندُستان کا افلاس ضرب المثل بن چکا ہی مختلف قوموں کی آمدنی کا باہمی موازنہ کیجیے تو پتا چلے گا کہ ہمارے مُلک کی قومی آمدنی کا فی کس اوسط دُنیا میں سب سے کم ہی۔ کولن کلارک نے مختلف قوموں کی آمدنی کی حقیقی قیمت کا باہمی موازنہ کرنے کے لیے ایک فارمولا وضع کیا ہی۔ اس نے مختلف قوموں کی آمدنی کی قوّتِ مزید کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہی اور اس مقصد کے لیے سب مُلکوں کی آمدنی کا ایک "بین اقوامی اکائی" کی شکل میں اندازہ لگایا ہی۔ بین اقوامی اکائی کی تعریف یوں کی گئی ہی "۳۴-۱۹۲۵ کی مروّجہ قیمتوں پر اشیا اور خدمات کی اتنی مقدار خریدی جا سکتی تھی"۔ مختلف مُلکوں کے متعلق اُن کے تخمینے یہ ہیں:-

مُلک	فی کس آمدنی بین اقوامی اکائی میں	مُلک	فی کس آمدنی بین اقوامی اکائی میں
امریکہ	۱۳۸۱	پولینڈ	۳۵۲
کینیڈا	۱۳۳۷	بلگیریا	۲۵۹
برطانیہ عظمیٰ	۱۰۶۹	مصر	۳۵۰ — ۳۰۰
ہنگری	۳۵۹	برطانوی ہندستان	۲۰۰

ممکن ہو ان تخمینوں میں کچھ کمزوریاں ہوں۔ لیکن ہندستان کی غربت اس سے اچھی طرح واضح ہوجاتی ہو۔

ہمارا ملک اس بے پناہ افلاس میں کیوں مبتلا ہو۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں اپنی معاشی زندگی پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ اور اس کے بعد دُنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے کہ آخر ہماری معاشی زندگی میں وہ کون سی خامیاں ہیں جو ہمیں دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اس قدر پس ماندہ رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں جو بات سب سے پہلے سامنے آتی ہو وہ یہ ہو کہ ہمارے ملک کی بہت بھاری اکثریت زراعت پر زندگی گزارتی ہو۔ یہ تناسب وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی گیا گھٹا نہیں۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں ہماری آبادی کے تقریباً ۶۱ فی صدی افراد کی زندگی کا دارو مدار زراعت پر تھا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں تقریباً ۷۵ فی صدی زراعت پر بسر کرتے تھے۔ حال کی معاشی تحقیقات سے اب یہ بات ثابت ہوگئی ہو کہ یہ تصور کہ کسی ملک کی قومی آمدنی کا بڑا حصہ زراعت سے حاصل ہوتا ہو اور اس لیے زراعت میں ہی آبادی کے بڑے حصے کو مشغول رکھنا چاہیے، صحیح نہیں۔ بلکہ حقیقت اس کے بالکل برخلاف ہو۔ مقامی حیثیت سے دُنیا کے پس ماندہ ملکوں پر نظر ڈالیے تو یہ حقیقت پوری طرح سامنے آجاتی ہو کہ زرعی زندگی پر غیر معمولی انحصار اور افلاس میں چولی دامن کا ساتھ ہو۔ برطانیہ اور فرانس میں تقریباً ۵۰ فی صدی آبادی ان صنعتوں میں مشغول رہتی ہو جن میں کوئی مادی پیداوار حاصل نہیں ہوتی۔ مثلاً نقل و حمل، اشیا کی تجارت، پبلک انتظامات وغیرہ۔ اس کے برخلاف ہندستان میں کولن کلارک کے خیال کے مطابق ایسے کاموں میں لگی ہوئی ہندستانی آبادی کا تناسب آبادی کے تقریباً ۱۴ فی صدی حصے پر مشتمل ہو۔ لیکن اس سلسلے میں دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہییں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے پیشوں کی جو تقسیم مردم شماری میں ملتی ہو وہ بہت سی صورتوں میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بہت سے پیشے جن کا ان میں ذکر ملتا ہو اُن کی برائے نام اہمیت ہو۔ دوسرے ان پیشوں میں مشغول رہنے والوں کی اکثریت دیہاتوں میں بستی ہو۔ اور دیہاتوں کی اُجرتوں وغیرہ کا حال جس قدر غیر تسلی بخش ہو اُس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان باتوں کا خیال کیجیے تو یہ کہنا پڑتا ہو کہ حقیقتاً ہمارے مُلک کے اس سے بھی کم افراد ان کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ قومی آمدنی میں اضافہ کیے بغیر عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ناممکن ہو اور قومی آمدنی میں اضافے کا سب سے سیدھا اور موثر طریقہ صنعتی ترقی ہو۔ تقریباً ساری دُنیا نے اب یہ بات مان لی ہو کہ قومی زندگی کا معیار بلند کرنے کے لیے صنعتی ترقی ناگزیر ہو۔ چناں چہ ہاٹ اسپرنگز کی زرعی کانفرنس کی رپوٹ میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہو کہ "زرعی کثرتِ آبادی کے مسئلے کا حقیقی حل صنعتی ترقی ہی ہو۔ اور اگر ہم معیارِ زندگی کو بلند کرنا چاہتے ہیں تو صنعتی ترقی سے کام لینا پڑے گا۔"

اوپر کی گفتگو سے یہی نتیجہ نکلتا ہو کہ افلاس کا سب سے بڑا سبب پیشوں کی یہ غلط تقسیم ہو۔ ملک کی بڑی اکثریت زراعت پر زندگی گزارتی ہو اور زراعت سے جو آمدنی ہوتی ہو وہ بہت ہی معمولی ہوتی ہو۔ قدرتاً ہمارے مُلک کے لوگ غریب ہیں لیکن

اس سے یہ مقصود نہیں کہ ہماری زرعی زندگی کی عظیم خرابیوں سے یکسر پاک ہو۔ یا یہ کہ ملک کی ترقی کے لیے محض صنعتی ترقی ہی کافی ہوگی اور زراعت کی طرف سے یکسر آنکھیں بند کرلینی چاہییں۔ مطلب یہ ہو کہ مستقبل کے متعلق ایک راہ عمل متعین کرنے میں ہمیں سب سے پہلے اس چیز کی طرف توجہ دینی چاہیے جسے ہم نے اب تک بھلا رکھا ہو۔ ہماری معاشی ترقی کے لیے زرعی ترقی اور صنعتی ترقی دونوں اہم ہیں۔ لیکن حالات میں جلد از جلد تبدیلی پیدا کرنے کے لیے صنعتی ترقی کو نسبتاً زیادہ اہمیت دینی ہوگی۔ اس سلسلے میں ہم روس کی معاشی تاریخ سے ایک سبق سیکھ سکتے ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں کمیونسٹ پارٹی کی ۱۴ویں کانگرس میں اس مسئلے پر کہ زرعی اور صنعتی ترقی میں کس کو زیادہ اہمیت دی جائے بہت اختلافِ رائے ہوا اور بہت گرما گرم بحثوں کے بعد آخر یہ طے پایا کہ صنعتی ترقی کو اولیت دی جائے۔ روس کو اپنے اس فیصلے پر پچھتانا نہیں پڑا۔

ہندستان میں ذمے دار حلقوں کا یہ مطالبہ انھی اسباب سے بہت پرانا ہو کہ ہندستان کو صنعتی ترقی کے مواقع دیئے جائیں۔ بقول پروفیسر گیان چند صنعتی ترقی کا مطالبہ ہمارے قومی مطالبے کا ایک جز رہا ہو۔ ہم "لکڑہارے اور بہشتی" بنے رہنے پر کبھی بھی راضی نہ تھے۔ ہمیں ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ برطانوی حکومت ہمیں اپنی تجارتی حکمت عملی کے تعین کا کوئی حق نہیں دیتی۔ ہماری صنعتی ترقی کی رفتار کتنی سست رہی ہو اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہو کہ کارخانوں میں کام کرنے والوں کی اوسط تعداد سنہ ۱۸۹۲ء میں ۳۱۶۰۰۰ تھی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں یہ بڑھ کر ۸۶۹۰۰۰ ہوئی۔ ذیل کی جدول کا مطالعہ بھی اس سلسلے میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس میں یہ بتایا گیا ہو کہ مختلف صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد کس طرح بڑھی یا گھٹی ہو۔

(ہزار میں)

صنعتیں	۱۹۱۱	۱۹۲۱	۱۹۳۱	۱۹۲۱-۳۱ میں فی صدی تبدیلی
کپڑے کی صنعت	۴۴۴۹	۴۰۳۱	۴۱۰۲	۱۰۸ فی صدی
غذائی صنعتیں	۲۱۳۴	۱۰۶۵۳	۱۴۷۸	(منفی) ۱۰۶۷ "
فرنیچر	۱۸	۱۲	۲۱	۵۰۰۱ "

سنہ ۱۹۱۱ء میں آبادی کا ۱۱ فی صد حصہ صنعت پیشہ تھا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں گھٹ کر دس فی صد رہ گیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ۹۰۶ فی صد مجموعی آبادی کو ذہن میں رکھیے، تو صنعتی مزدوروں کا تناسب اور بھی کم ہو۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں ۵۰۵ فی صد مزدور صنعتوں میں کام کرتے تھے۔ اور یہ تناسب ۱۹۴۱ میں گھٹ کر صرف ۴۰۲ فی صد رہ گیا۔ مجموعی حیثیت سے ہندستان کی صنعتی ترقی کی رفتار کچھ زیادہ باعثِ اطمینان نہیں تھی۔ گو یہ صحیح ہو کہ بعض مخصوص صنعتوں کی پیداوار میں بہت ہی نمایاں اضافہ ہوا۔ پچھلی جنگِ عظیم سے پہلے ہندستانی صنعتوں کی ترقی کے لیے نئے کارخانے کھولنے یا حکومت کی مدد کا سہارا دینے کی کوششوں پر وہائٹ ہال نے

پانی پھیر دیا۔ جنگ کے دوران میں بہت سی ضروری چیزوں کی درآمد بند ہوگئی تھی۔ پھر بھی نئی صنعتوں کے شروع کرنے میں ... حائل تھیں۔ بعض صنعتوں کو جو پہلے سے ہی قدم جما چکی تھیں جنگ سے تھوڑا بہت فائدہ ضرور پہنچا۔ تامین کی پالیسی کے اختیار کیے جانے کے بعد بعض صنعتوں کی ترقی کی رفتار میں نمایاں اضافہ ہوا۔ مثلاً سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں ہندستان میں کوئی ۰۰۰،۱۹۳ ٹن سیمنٹ بنتی تھی ... میں تقریباً ۴۴۹،۱۶۹،۱ ٹن۔ اسی طرح شکر کی پیداوار میں بہت نمایاں توسیع ہوئی۔ سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں ۲۴ ہزار ٹن شکر ہندستان میں بنتی تھی سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں یہ مقدار بڑھ کر ۰۰۰،۱۶۷،۱ ٹن تک پہنچ گئی۔ پگ آئرن کی پیداوار سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں محض ۰۰۰،۵۵ ٹن تھی اور سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں تقریباً ۰۰۰،۰۰،۲۰ ٹن۔

ترقی کی رفتار کے سست ہونے اور مجموعی حیثیت سے ہندستان کی صنعتوں کی ناکافی اور معمولی توسیع کے اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے اسباب بتائے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم حکومت کا غیر ہمدردانہ رویہ ہے ابھی دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں جب بیرونِ ملک سے ضروری اشیا کی درآمد میں دقتیں پیدا ہوگئی تھیں تو حکومت نے اس کی کوئی کوشش نہیں کی کہ اس خلا کو خود ہندستان میں نئی صنعتوں کے قیام سے پُر کیا جائے۔ بہت سی اہم صنعتوں کے قیام میں حکومت نے آسانیاں فراہم کرنے کی بجائے رکاوٹیں ڈالیں۔ اس سلسلے میں ہندستان میں صنعتِ طیارہ سازی کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ ہندستان کے بعض صنعتی لیڈروں نے امریکہ کے ایک فرم سے ایک اس قسم کی صنعت کے قیام کے متعلق گفتگو کی۔ اور جب ان کا آپس میں سمجھوتہ ہوگیا تو حکومت کی اجازت کی ضرورت پیش آئی۔ اور بہت کچھ دوڑ دھوپ کے بعد آخر حکومتِ ہند نے فیصلہ کر دیا کہ ہندستان میں طیارہ سازی کی صنعت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ہندستان میں یہ صنعت کھل جاتی تو بیل گاڑی کا مستقبل مشتبہ ہو جاتا۔ ہندستان میں پٹرول کی بہت کمی ہے۔ سالہا سال سے پبلک کا مطالبہ تھا کہ یو پی اور بہار میں پاور الکحل بنایا جائے۔ یو پی کی پچھلی کانگرسی وزارت نے اس مسئلے کو اٹھانا چاہا لیکن مرکزی حکومت نے اس درخواست کو رد کر دیا۔ اس نا ہمدردانہ رویے کی نفسیات کے متعلق او میلی کا کہنا ہے "ہندستان ایک صنعتی ملک ہوتا جا رہا ہے اور اپنی ضروریات اب خود پوری کرنے لگا ہے بعض صنعتوں میں ہندستان نے انگریزی پیداوار کا مقابلہ بھی شروع کر دیا ہے اور چوں کہ ہندستانی صنعتوں کی پیداوار کی قیمت برطانوی چیزوں سے کم ہوتی ہے' برطانیہ کو یہ خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ اس کے کارخانوں کی بنی ہوئی چیزوں پر ہندستانی مزدوروں کی بنائی ہوئی سستی چیزوں سے بُرا اثر پڑتا ہے۔" اگر ہندستان کی صنعتی ترقی کا خواب پورا نہ ہوا تو برطانیہ کے لیے ایک وسیع بازار محفوظ رہے گا۔ یہ رائے حال کی تمام علمی تحقیقات کے نتائج کے خلاف ہے۔ لیکن برطانوی اربابِ اقتدار معاشیات کی ریسرچ پر اعتماد کر کے اپنا یہ پُرانا نقطۂ نظر بدلنے پر شاید اب بھی تیار نہیں ہیں۔

ہندستان کی صنعتی ترقی کے سلسلے میں شکایت صرف یہی نہیں کہ رفتار بہت سست رہی ہے۔ جیسا کہ نلنی رنجن سرکار نے کہا ہے "ہندستان کی صنعتی ترقی میں بے ڈھنگے پن کے سارے آثار نمایاں ہیں۔" ملک کے بہترین مفاد کا تقاضہ کیا ہے؟ اور اس کی روشنی

ہمارے ہاں مکمل مقاصد کے تعین کے بعد سوچ سمجھ کر کوئی مناسب پالیسی اختیار کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ ممکن ہے ارباب اقتدار کی یہ خواہش رہی ہو کہ اگر ہندستان کو بالکل ہی زرعی ملک بنا کر نہیں رکھا جا سکتا تو اس کی تو کوشش ہونی ہی چاہیے کہ اس کی معاشی زندگی نوآبادیاتی معیشت کے اصولوں سے بھٹکنے نہ پائے۔ چناں چہ کہا یہ گیا کہ ملک میں جو کچھ بھی توسیع ہوئی وہ ان صنعتوں میں جو عام استعمال کی چیزیں بناتی ہیں۔ بھاری یا بنیادی صنعتوں میں مزدوروں کی جو معمولی تعداد کام کرتی ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے "یہ ثبوت ہے ہندستان پر ایک بیرونی ملک کے تسلط کا۔ یہاں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ بھاری اور بنیادی صنعتیں پھل پھول نہ سکیں۔ حالاں کہ ایسی صنعتیں ہر ملک کی معاشی زندگی کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کی غیر موجودگی بالکل ایسی ہی ہے جیسے کسی انسان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو۔ عام زمانوں میں ان کی غیر موجودگی سے ہندستان کو جو سب سے بڑا نقصان پہنچا وہ یہ تھا کہ ملک میں فنی اور مشینی مہارت کی کمی کی وجہ سے تقریباً ہر صنعت میں کارکردگی کے لحاظ سے ہندستان دوسرے ملکوں سے پیچھے رہا۔ اور پچھلی دو جنگوں کے دوران میں ملک اُن مواقع سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھا سکا جو جنگ کے باعث ہمارے ہاتھ آئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ملک کی موجودہ صنعتوں کو بھی جنگ کے دوران میں بھاری صنعتوں کی غیر موجودگی سے بڑی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی صلاحیت میں مزید توسیع نہ ہو سکی۔ بیرونی ممالک پر ہماری ان صنعتوں کو کس حد تک بھروسہ کرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 'ایسٹرن اکونومسٹ' کے ایک اندازے کے مطابق ہماری کاغذ کی صنعت کو ۷۰ فی صد بیرونی سرمایے کی ضرورت ہوگی۔ جوٹ کی تقریباً ۶۰ فی صدی اور شکر سازی کی صنعت کو ۷۵ فی صدی کی حد تک۔ کیوں کہ ان تمام صنعتوں کے لیے ضروری مشینیں ملک میں بنائی نہیں جاتیں اور ہم مجبور ہیں کہ یہ مشینیں باہر سے حاصل کریں۔ مشینوں، اشیاے اصل بلکہ معمولی حصوں (SPARE PARTS) کے لیے بیرونی ممالک کا مُنھ تکنا ہماری صنعتی ترقی کا ایک بہت ہی کمزور پہلو ہے۔

مستقبل کے متعلق صنعتی ترقی کے سلسلے میں ہم کو سب سے پہلے اس مقصد کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ جلد از جلد سیاسی غلامی ختم کر دی جائے۔ اور اس کی شکل یہی ہے کہ حکومت ان صنعتوں کے متعلق کچھ مقاصد متعین کر لے اور پھر ان مقاصد کو جلد از جلد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے الفاظ میں ملک کے صنعتی ڈھانچے کو مضبوط بنانے کے لیے منصوبہ بندی ضروری ہے۔ کیوں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ہم اپنے ذرائع سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ سرمایہ داری کے خلاف اب یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ اس کے تحت ملک کی ترقی کی رفتار بہت سست ہوتی ہے۔ چناں چہ پچھلے کئی سالوں کے دوران میں مختلف ممالک کی معاشی ترقی کی رفتار کے جو اندازے پیش کیے گئے ہیں ان سب میں متفقہ طور پر روس کے نظامِ معیشت کو اس حیثیت سے سب سے زیادہ افضل مانا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہمیں وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے

جو نتیجے کے لحاظ سے سب سے زیادہ موثر ہو۔ ہمارے ملک کی معاشی ترقی کی کوشش جلد سے جلد شروع ہونی چاہیئے کیوں کہ ہندستان افلاس اور غربت کی اس منزل پر پہنچ چکا ہے جو بالکل ہی ناقابلِ برداشت ہے۔ لیکن دوسرے ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی منصوبہ بندی کا مقصد محض پیداوار میں اضافہ کرنا نہیں ہوگا۔ گو یہ بھی بہت ہی ضروری ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی سعی کرنی ہوگی کہ تقسیمِ دولت کی ایسی شکل پیدا ہو جو ملک کے عوام کے مفاد کے لیے سب سے زیادہ مناسب اور منصفانہ ہو۔

اس سلسلے میں ایک اہم مقصد جو ہمیں پیشِ نظر رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصّوں میں معاشی وسائل اور مواقع کو کم و بیش برابر حصّوں میں تقسیم کیا جائے تاکہ ہمارے وسیع و عریض ملک کا کوئی بھی گوشہ معاشی خوش حالی کی ایک متعین حد سے گرنے نہ پائے۔ کسی صنعت کی جائے وقوع کا تعین کرنے میں بہت سی باتیں سامنے رکھنی پڑتی ہیں۔ صنعت کے اپنے نقطۂ نظر سے تو فیصلہ کن بات یہ ہوتی ہے کہ پیداوار اور تقسیمِ پیداوار کے لحاظ سے معاشی کارکردگی زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ لیکن دوسرے ملکوں کا تجربہ شاہد ہے کہ اگر اس کو واحد معیار تسلیم کر لیا جائے تو اس سے بہت سی معاشی و سماجی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جن میں خاص طور پر اہم یہ ہے کہ کسی ایک شہر یا حصّۂ ملک میں آبادی کی بھیڑ بھاڑ ہو جاتی ہے۔ اور آبادی کے مختلف حصّوں کے معیارِ زندگی میں نمایاں فرق اور امتیاز پیدا ہو جاتا ہے۔ جنگ کے نقطۂ نظر سے اس قسم کے انتظام میں بہت خامیاں ہیں۔ مغرب کی جن صنعتی قوموں نے اس انتظام کے نقصانات کا مزہ چکھا ہے وہاں اب یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ صنعتوں کی ایک خطّے وارانہ تقسیم اور تنظیم ضروری ہے۔ اس کا مقصد یہی نہیں ہونا چاہیے کہ پیداوار اور تقسیمِ پیداوار کے لحاظ سے معاشی کارکردگی میں بیش از بیش اضافہ کیا جائے بلکہ یہ بھی کہ ملک کے مختلف حصّوں میں صنعتی شغل کاری اس طرح بانٹ دی جائے کہ وہ اعلا تر سماجی، معاشی اور جنگی ضروریات بہتر سے بہتر طریقے پر پوری کر سکے۔ ان موخر الذکر مسائل کی روشنی میں اگر ہندستان کی صنعتی ترقی کے اس پہلو پر نظر ڈالیے تو یہاں بھی وہی بے تکا پن نظر آئے گا۔ ہماری صنعتی صلاحیت ملک کے مختلف حصّوں میں بہت ہی غیر مساوی طور پر بٹی ہوئی ہے۔ جنگ سے پہلے ہمارے صنعتی مزدوروں کی آدھی آبادی بنگال اور بمبئی میں اکٹھی ہوگئی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری ساری صنعتی آبادی دو شہروں کلکتہ اور بمبئی میں مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ دوسرے ممالک کا تجربہ یہ ہے کہ صنعتی ترقی سے ان ممالک میں سیکڑوں نئے شہروں کو فروغ ہوا لیکن ہندستان کا ریکارڈ اس حیثیت سے بھی بہت پیچھے ہے۔ ایسا بھی نہیں ہوا ہے کہ ان دو صوبوں میں ہی یہ آبادی کئی شہروں میں مساوی طور پر تقسیم ہوئی ہو۔ مثلاً بنگال کو لے لیجیے جو ہمارا سب سے زیادہ گنجان صوبہ ہے۔ اس کُل صوبے میں کلکتہ کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر شہر بھی نہیں۔ بنگال میں ملک کی تقریباً ۱۵ فی صدی آبادی بستی ہے لیکن وہاں کُل ہندستان کے صنعتی مزدوروں کی ۲۹ فی صدی آبادی سمٹ کر جمع ہو گئی ہے۔ اس کے برخلاف صوبۂ یو۔ پی میں جہاں ہندستان کی ۱۴ فی صدی آبادی بستی ہے صنعتی مزدوروں کی محض ۸ فی صدی آبادی بستی ہے۔ ان اعداد سے ہندستان میں صنعتی ترقی کی غیر مساوی جغرافیائی تقسیم پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس کے گہرے نتائج کے لیے ہمیں کلکتہ اور بمبئی کے بسنے والوں کی زندگی پر نظر ڈالنی چاہیے بمبئی پلان

کے مصنفوں نے ۱۰۰ مربع فٹ جگہ ایک انسان کے رہنے کے لیے ضروری قرار دی ہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں بمبئی کے صوبے کے صنعتی علاقوں میں ۲۰، ۲۷ فٹ سے زیادہ جگہ ایک آدمی کو حاصل نہ تھی۔ شولاپور کا حال اس سے بھی خراب تھا۔ وہاں اوسطاً ۱۴ فٹ جگہ ایک آدمی کے حصے میں آتی تھی۔ احمدآباد کا حال کچھ بہتر تھا جہاں ایک آدمی کو ۳۴ مربع فٹ جگہ حاصل تھی۔ اس بھیڑ بھاڑ کا ہمارے مزدوروں کی اخلاقی اور سماجی زندگی پر جو خراب اثر پڑا ہے اسے غالباً دہرانے کی ضرورت نہیں۔ مستقبل میں ہمیں بلاشبہ ان حالات سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ حکومتِ ہند نے اس اہم مسئلے کی طرف تھوڑی سی توجہ دی ہے۔ اور "بجلی کی طاقت کو خطے وارانہ بنیاد پر ترقی دینے کی کوشش کا" ارادہ ظاہر کیا ہے۔ لیکن ملک میں مختلف صنعتوں کی جگہ کے تعین کا مسئلہ محض بجلی کی ترقی کی خطے وارانہ تقسیم پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم سوال بھاری صنعتوں کے "تعینِ مقام" کا مسئلہ ہے۔ کیوں کہ انھی پر مختلف علاقوں میں دوسری صنعتوں کے انحصار کا دارومدار ہے۔ اس سلسلے میں روس کی معاشی پالیسی سبق آموز ہے۔ روسیوں نے بھاری صنعتوں کو خاص طور سے مشرقی علاقوں میں ترقی دینے کی کوشش کی۔ اس کا ایک منشا یہ تھا کہ مشرق کے پس ماندہ ممالک کو جلد از جلد صنعتی ترقی کی برکتوں سے مستفیض ہونے کا موقع ملے۔ ہندستان میں ان صنعتوں کی موجودہ جغرافیائی تقسیم بہت ہی غیر تسلی بخش ہے۔ کیمیائی صنعتوں میں کام کرنے والے نصف مزدور بنگال میں جمع ہو گئے ہیں۔ اسی طرح انجنیری صنعتوں کے آدھے مزدور بنگال میں ہیں۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ ملک کے مختلف حصوں کے ذرائع کے تفصیلی جائزے کے بعد ان اصولوں کی روشنی میں صنعتوں کے "تعینِ مقام" کی کوئی اسکیم وضع کی جائے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے بعض حلقوں میں اس مسئلے کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس نہیں کیا گیا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے دہلی میں "ہندستانی تجارتی وفاق" کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ملک کے ایک مقتدر صنعتی لیڈر مسٹر برلا نے حکومت کی اس حکمت عملی پر اعتراض کیا ہے جس کا مقصد صنعتوں کی بہتر جغرافیائی تقسیم ہے۔ ان کا اعتراض اگر موجودہ حکومت کی صلاحیت پر ہو تو بلاشبہ صحیح ہے۔ کیوں کہ صنعتوں کی جگہ کا تعین اگر من گھڑت اصولوں پر ہونے لگے تو اس سے علاج کے بجائے مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ اور اس کے لیے جس قدر واقفیت کی ضرورت ہے ابھی تک حکومتِ ہند نے ان معلومات کے اکٹھا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن یہ ہرگز صحیح نہیں ہے کہ اس سلسلے میں سماجی مقاصد کے لیے صنعتوں کی جغرافیائی تقسیم پر کسی قسم کی پابندی لگانا اصولاً غلط ہے۔ اور اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں ہو سکتی کہ عام مقابلے کے حالات میں مختلف کارخانوں کے قائم کرنے والے ہمیشہ وہی مقام چنتے ہیں جو صنعت کی معاشی کارکردگی کے لحاظ سے سب سے زیادہ موزوں ہوں۔

تقسیمِ دولت کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کا تعلق معاشرے کے افراد سے ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح باوجود صنعتی ترقی کی سست رفتاری اور کمی کے اجارہ داری اور دولت کا چند ہاتھوں میں اجتماع ہندستان میں بھی نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ ٹارف بورڈ نے سنہ ۱۹۳۲ء میں کپڑے کی صنعت کی ملکیت کے متعلق یہ بات بتائی تھی کہ ۹ برطانوی منیجنگ ایجنٹ ۲۰ ملوں کے مالک تھے جن میں

تقریباً ۹۹ ملین روپوں کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ اسی طرح ۴۳ ہندستانی ایجنٹ ۵۷ ملوں پر قابض تھے جن میں تقریباً ۹۷ ملین روپے کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ اسی طرح دوسری صنعتوں میں بھی نگرانی اور اقتدار سمٹ کر چند افراد کے ہاتھوں میں جمع ہوگیا ہے۔ جوٹ کی ۱۰۰ ملوں میں سے (جن کے مجموعی سرمایے کی مقدار ۲۳ کروڑ روپے ہے) ۵۳ ملیں جن کا مجموعی سرمایہ ۱۸ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے، ۷ منیجنگ ایجنٹس کے ہاتھ میں تھیں۔ ان میں سے چار ۳۰ ملوں کے مالک تھے۔ اسی طرح کوئلے کی کمپنیوں کی مجموعی تعداد ۲۴۷ تھی۔ ان میں تقریباً ۱۰ کروڑ روپوں کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ ان میں سے ۶۰ کمپنیاں جن کا سرمایہ تقریباً سوا چھ کروڑ روپے تھا ۱۸ فرموں کی ملکیت تھیں۔ چائے کی ۱۱۷ کمپنیوں کے مالک محض ۱۷ فرمیں ہیں ان میں سے پانچ ۴۷ کمپنیوں کے مالک تھے۔

برٹش انڈیا کارپوریشن میں جو سنہ ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی تھی تقریباً سوا کروڑ کا سرمایہ لگایا گیا ہے۔ اس کمپنی کی ملکیت میں دو اونی ملیں تھیں، ایک سوتی کپڑوں کا کارخانہ اور کوپر ایلن کمپنی، جو ہندستان میں جوتے بنانے کی سب سے بڑی کمپنیوں میں سے ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کمپنیاں اس کے زیر اقتدار تھیں۔ انڈری ویول کمپنی ۵۲ کمپنیوں کی مالک ہے جن میں ۷ کروڑ کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ ۴۴ برطانوی ٹرسٹ ۴۰۰ کمپنیوں کے مالک ہیں جن کا سرمایہ تقریباً ½ ۵۷ کروڑ ہے۔ ہندستانی کمپنیاں بھی اس دوڑ میں برابر کی شریک ہیں۔ نصف درجن ہندستانی ٹرسٹ ۵۰ کمپنیوں پر قابض ہیں۔ ان کمپنیوں میں ½ ۴۷ کروڑ کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ مغربی ہندستان میں تنہا ٹاٹا کمپنی ۲۲ کمپنیوں کی مالک ہے جن کا سرمایہ تقریباً ۳۰ کروڑ ہے۔ اور اس سلسلے کی صرف ایک کمپنی (آئرن اینڈ اسٹیل) کا سالانہ منافع اشوک مہتا کے بہ قول حکومتِ بہار کی مجموعی آمدنی کے برابر ہے۔ اور ان کمپنیوں میں اصلی اقتدار صرف چند افراد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ مثلاً جوٹ کی ۱۰۴ کمپنیوں کے کرتا دھرتا ۱۳۲ ڈائرکٹر تھے۔ ۵۰۰ اہم کمپنیوں کے کل کرتا دھرتا ۱۰۰۰ ڈائرکٹر صاحبان ہیں۔ بیرونی کمپنیوں نے چند ہندستانی سرمایے داروں کو اپنے ساتھ ملا کر "سودیشی" کا لباس پہننا شروع کر دیا ہے۔

مختصراً، واڈیا اور مرچنٹ کے بہ قول (جن کی کتاب سے اوپر کی ساری اطلاعات لی گئی ہیں) ہندستان کی صنعتی توسیع سے منافع حاصل کرنے والے گنے چنے سرمایے دار ہیں۔ مستقبل کے متعلق ایک نہایت اہم سوال یہ ہے کہ ہم اس صنعتی نظام کو باقی رکھیں گے جو دولت کی تقسیم کو اس قدر غیر مساوی بنا دیتا ہے یا اسے بدلنے کی کوشش کریں گے۔ اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اگر ہم سرمایے داری کو جوں کا توں باقی رہنے دیں تو مغربی ممالک کی طرح یہاں بھی اجارہ داریاں کارٹل اور ٹرسٹ کا پھلنا پھولنا یقینی ہے۔ موجودہ معاشی زندگی کی منطق لازماً بڑے بڑے اداروں کے قیام کی دعوت دیتی ہے۔ اور مغرب کا تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ اجاروں پر حکومت کی موثر نگرانی بہت مشکل ہے۔ بیرونی اجارہ داریوں

کو ختم کرنے کے لیے سب ہی تیار ہو جائیں گے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ہندستانی سرمایہ داری کے مستقبل کا کیا فیصلہ ہوگا۔ اس وقت کا ایسا مستقبل کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اس بات سے کچھ تشفی ہوتی ہے کہ کانگرس کی قومی تنظیمی کمیٹی نے اشتراکیت کے حق میں اپنا فیصلہ کیا ہے۔ ہندستان کی معاشی ترقی اسی صورت میں عام ہندستانیوں کے لیے مفید اور قابلِ اطمینان ہو سکتی ہے جب وہ امیروں کو اور امیر بنانے کی بجائے غریبوں کی زندگی میں خوش حالی پیدا کر سکے۔ ورنہ . . . . . بابا یہ سب کہانیاں ہیں۔

معاشی صورت حال

(۱) غذا

(۲) صوبائی بجٹ

اتحادی غذائی بورڈ اور ہندستان

از: ——— ادارہ

حیرت ہو کہ برطانیہ کے وزیر غذا نے کن اعداد و شمار کے مطابق یہ بتایا کہ "ہندستان میں آیندہ چار ہفتوں کے اندر ۱۴ لاکھ ٹن گیہوں خرچ نہیں ہوسکے گا"۔ جب کہ زیادہ قابل اعتماد ذرائع سے جو اطلاعیں موصول ہورہی ہیں وہ وزیر غذا صاحب کے اندازے کے بالکل برعکس ہیں۔ مثلاً سر سونتی راماموتی کے اندازے کے مطابق ہندستان کو دوسری فصل تک ۱۹ لاکھ ٹن چاول اور ۴۰ لاکھ ٹن گیہوں اور باجرہ، کودوں کی ضرورت ہو۔ پھر گرجا شنکر باجپئی نے یو۔ ان۔ آر۔ آر کانفرنس میں بتایا کہ ہندستان میں سال کے آخر تک ۴۰ لاکھ ٹن اجناس کی کمی رہے گی۔ ممکن ہو یہ اعداد مبالغے سے خالی نہ ہوں۔ لیکن اتحادی غذائی بورڈ کے سامنے ہندستانی غذائی وفد نے جو مطالبہ پیش کیا تھا وہ بہر حال اقل ترین قرار دیا جاسکتا ہو۔ اس مطالبے کی رو سے ہندستان کو جون تک پانچ لاکھ ٹن چاول اور [illegible] لاکھ ٹن گیہوں کی ضرورت ہو۔ لیکن اتحادی غذائی بورڈ نے صرف ۱۴ لاکھ ٹن گیہوں اور ایک لاکھ پچاس ہزار ٹن چاول دینے کا وعدہ کیا۔

پورے سال کے لیے ہندستان کا مطالبہ ۱۰ لاکھ ٹن چاول اور ۴۰ لاکھ ٹن گیہوں کا ہو۔ پہلے چھ ماہ کے لیے اتحادی [illegible] نے جو غلہ دیا ہو وہ مطالبے سے ۵۰ فی صد کم ہو۔ سنہ ۱۹۴۶ء کے بقیہ چھ ماہ کے لیے اتحادی غذائی بورڈ مئی کے آخر میں غور و خوض کرے گا۔ ہندستان کو غذائی بورڈ نے جو غلہ دینے کا وعدہ کیا ہو اس میں گیہوں اور مکئی زیادہ تر کنیڈا سے اور چاول زیادہ تر سیام سے آئے گا۔ اگر یہ

پورا غلہ ہندستان پہنچ بھی گیا تو بھی ۹ لاکھ ۵۵ ہزار ٹن کی کمی پوری کرنے کا سوال موجود رہے گا۔ یہ کمی اگر پوری ہو سکتی ہے تو ملکی ذرائع ہی سے۔ موجودہ راشن میں مزید کمی اب کسی حالت سے بھی ممکن نہیں۔ موجودہ راشن کے تحت ہندستان میں فی کس جتنا غلہ میسر ہو رہا ہے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مقابلے میں ایک تہائی ہے۔ ۱۲ آونس فی کس فی روز سے انسانی جسم میں صرف ۱۰۰۰ کیلوری حرارت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن طبی نقطۂ نظر سے محض صحت برقرار رکھنے اور امراض کے حملوں سے بچنے کے لیے فی کس روزانہ ۱۵۰۰ کیلوری کا مہیا ہونا ضروری ہے۔

ایسی صورتِ حال میں ہندستان کے فالتو پیداوار والے صوبوں کی حالت بھی امید افزا نہیں۔ حکومتِ پنجاب کی اطلاع کے مطابق پنجاب میں دو لاکھ ٹن غلے کی کمی ہے اور اس صوبے کے بارہ ضلعے اس قلت کا سامنا کر رہے ہیں۔ سندھ سے امید تھی کہ کوئی پانچ لاکھ ٹن گیہوں برآمد کیا جاسکے گا لیکن چار ماہ تک سندھ سے گیہوں کا برآمد ہونا ممکن نہیں اس لیے کہ اب تک صحیح صحیح نہیں معلوم ہوسکا ہے کہ وہاں فالتو غلہ کتنی مقدار میں موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنے والے چند مہینوں میں جو غذائی قلت کے لحاظ سے سب سے زیادہ نازک ہوں گے سندھ سے کوئی امداد نہیں حاصل کی جاسکے گی۔ یہ خیریت ہے کہ اس سال سرحدی صوبے کو دوسرے صوبوں سے غلہ منگوانے کی ضرورت نہ پڑے گی، ورنہ سرحدی صوبے کو ہر سال باہر سے ۴۵ ہزار ٹن سے لے کر ۵۰ ہزار ٹن تک غلہ منگوانا پڑتا تھا۔ جہاں تک سی۔ پی کا تعلق ہے مرکزی اسمبلی کی گزشتہ بحثوں میں اس بات کی تردید کی جاچکی ہے کہ سی۔ پی میں فالتو غلہ موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سی۔ پی سے قلت والے صوبوں کو غذائی امداد پہنچنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ مدراس اور بمبئی میں مویشیوں کے چارے سے متعلق زیادہ نازک صورتِ حال نہیں رہی اور تین ہزار ٹن چارا بمبئی میں اور اس سے بھی زیادہ چارا مدراس میں مہیا کرلیا گیا ہے۔ لیکن چاول اور گیہوں سے متعلق جن خطرات کا احساس کیا گیا تھا وہ اب ایک بھیانک حقیقت بن کر ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ جن مزید علاقوں کے متعلق تشویش ناک خبریں آرہی ہیں وہ یہ ہیں:۔ سوالک، جھیل سانبھر، کمایوں، سلہٹ، گڑھوال، الموڑا اور نینی تال۔

حکومت کیا کر رہی ہے

جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے کہ اب جب کہ اتحادی غذائی بورڈ سے مزید غلے کی امید نہیں کی جاسکتی ہمیں خود ملک کے اندر جو ذرائع اور وسائل موجود ہیں انھی سے کام لینا ہے؟۔ اسی سلسلے میں حکومت کی کوششوں اور کارروائیوں پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ ملک کے اندرونی ذرائع میں امریکی فوج کے فالتو غذائی ذخیرے کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس کا اندازہ ۳۰۰۰۰ ٹن کیا گیا ہے۔ اگر اس فالتو غذا کو ہندستان کے تمام مقامات سے یک جا جمع کیا جاسکا اور طبی جانچ کے بعد اُس میں سے قابلِ استعمال مقدار کے صحیح صحیح تعین کا کام انجام پاسکا تو کوئی ۳۰۰۰ ٹن دودھ کی بنی ہوئی اشیا، ۹۰۰ ٹن غلہ اور کوئی ۱۰۰۰ ٹن سبزیاں قحط زدہ علاقوں کے لیے فوری طور پر حاصل کی جاسکیں گی۔ صوبۂ بمبئی میں امریکی فالتو غذا کے حصول کا کام پہلے ہی شروع ہوچکا ہے۔

کانگرس کی پندرہ نکات والی غذائی تجویز کو منظور کر کے حکومت نے دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے حکومت ہند کا یہ اعلان غلط نہیں ہے کہ ہندستان سے غلے کی برآمد بالکل بند کر دی گئی ہے۔ فوج کے راشن میں جو کمی کر دی گئی ہے اُسے بھی بہ نظر استحسان دیکھا جائے گا۔ غلے کو کیڑوں مکوڑوں اور چوہے اور دوسرے کترنے والے جانوروں سے محفوظ رکھنے کے لیے مناسب انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ ہندستان میں ہر سال حشرات الارض اور چوہوں سے کوئی ۳۵ لاکھ ٹن غلہ تلف ہو جاتا ہے۔ حکومت پنجاب غلے کو حفاظت سے جمع کرنے کے لیے خاص قسم کے گودام بنوانے کا انتظام کر رہی ہے۔

جہاں تک غلے کی فراہمی کا سوال ہے موثر کارروائی کی جا رہی ہے۔ حکومت یو۔پی نے ہر ضلع میں ایک غذا اور سپلائی کمیٹی بنانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، اس قسم کی کمیٹیاں دیہاتوں میں بھی بنائی جائیں گی اور غذا کے حصول اور تقسیم کے لیے رضاکاروں کی بھرتی ہوگی۔ چور بازاری اور رشوت بازی کے خلاف موثر کارروائی کرنے کا حکومت یوپی اعلان کر چکی ہے۔ یو۔پی میں غلہ فراہم کرنے کا کام ریونیو ڈپارٹمنٹ کی بہ جائے کوآپریٹو ڈپارٹمنٹ انجام دے گا۔

حکومت پنجاب ایک ایسی تجویز پر غور کر رہی ہے جس کے تحت راست طور پر خود غلہ پیدا کرنے والے سے غلہ خرید لیا جائے گا۔ حکومت سی۔پی کے پاس پہلے صرف چاول، گیہوں اور جوار فراہم کرنے کا پروگرام تھا، لیکن اب وہ چنا فراہم کرنے کا بھی اعلان کر چکی ہے سی۔پی میں نارمل طور پر کوئی تیس ہزار سے لے کر ۴۰ ہزار ٹن تک فالتو چنا بچ جاتا ہے۔ حکومت سی۔پی قیمتوں کے مصنوعی چڑھاؤ کی بھی روک تھام کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس وقت جو جو صوبے اور ریاستیں کل ہند بنیاد پر راشن کی تخفیف کر چکی ہیں وہ یہ ہیں:۔ اجمیر، بلوچستان، بنگال، بمبئی، وسطی صوبہ، دہلی، مدراس، پنجاب، یوپی، کوچین، حیدرآباد، میسور اور ٹراونکور۔

مزید غلہ پیدا کرنے کی اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے ہندستانی فوجوں سے بھی مدد لی جا رہی ہے۔ جہاں تک شاہی بحری بیڑے کی مدد سے مچھلی کی مقدار میں اضافہ کرنے کا سوال ہے حکومت اپنی سابق روایتوں کے مطابق ٹال مٹول کر رہی ہے اور فنی وقتوں کے بہانے تراش رہی ہے۔

مزید غذا پیدا کرنے کے سلسلے میں حکومت بنگال اور حکومت یوپی کی کوششیں پورے طور پر جاری ہیں۔ حکومت مدراس نے بھی اپنے بجٹ میں ۴۰ لاکھ روپے کی مد صرف قحط دور کرنے اور غذائی پیداوار بڑھانے کے لیے نکالی ہے۔

بنگال میں ۴۳ لاکھ ایکڑ زمین میں جوٹ کی کھیتی بند کر کے غلہ پیدا کیا جا رہا ہے۔ اندازہ ہے کہ اتنی زمین میں کوئی ۱۱ لاکھ ٹن چاول پیدا ہو سکتا ہے۔ آنے والی فصل میں بنگال کی زیر کاشت زمین کے ۹۴ فی صدی حصے میں غلہ بویا جائے گا۔ اس طرح بنگال میں مجموعی طور پر تین کروڑ ۴۰ لاکھ ایکڑ زمین زیر کاشت رہے گی۔ اس سے پہلے زیر کاشت زمین کا صرف ۸۵ فی صد حصہ غلے کے لیے مخصوص تھا۔

کھاد اور آب پاشی کا انتظام کرکے زیرِ کاشت زمین کی مجموعی پیداوار میں اضافے کی کوشش جاری ہے۔ ایسے متعدد ہیں جن میں اضافے کی کوشش ہو رہی ہے جن میں بیک وقت دو فصلیں بوئے جاتے ہیں۔ کلکتہ کی تمام خالی زمینوں میں اور مضافات کے علاقوں میں سبزی کی کاشت شروع کی گئی ہے جس سے شہریوں اور فوجیوں کے لیے کافی مقدار میں سبزی مہیا ہو جاتی ہے۔

حکومت یو۔پی دیہاتوں میں گرم موسم والی فصلوں کی کاشت کی توسیع کر رہی ہے۔ یو۔پی کے تمام قصبوں میں اور اُن کے آس پاس کے علاقوں میں بڑے پیمانے پر سبزیوں کی کاشت کا انتظام ہو رہا ہے۔ کسانوں کی امداد کے لیے خاص کر اُن دیہاتوں میں جہاں دو فصلی اور سہ فصلی پیداوار کے امکانات موجود ہیں، ماہرین بھیجے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حکومتِ یو۔پی نے کچھ خاص رعایتوں کا بھی اعلان کیا ہے۔ مثلاً نہروں سے پانی کی مفت سپلائی، بیج کی مفت تقسیم، کھلی اور زرعی آلات کی لاگت قیمت پر فروخت۔ کنوئیں کھودنے کے لیے امدادی رقم وغیرہ وغیرہ۔ اُن فصلوں سے جو غلّہ یا دیگر غذائی اشیا پیدا ہوں گی انھیں براہِ راست حکومت اپنی خریدے گی۔

اس سلسلے میں دو باتیں ایسی بھی سُننے میں آئی ہیں جو تشویش ناک ہیں اور جن سے حکّام کی نااہلی کا پتا چلتا ہے۔ ایک تو یہ کہ آسام میں کوئی ایک کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ ایسی زمین ہے جس میں سرکاری حکم سے کاشت نہیں کی جاتی۔ موجودہ غذائی قلّت کے پیشِ نظر اس زمین کو زیرِ کاشت نہ لانا گویا عاقبت اندیشی کا ثبوت دینا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت جب کہ کم خوراکی اور قحط کی وجہ سے قلّت زدہ علاقوں میں غذائیت آمیز اشیا کی سخت ضرورت ہے کوئی ۴۲ لاکھ پونڈ چھلکا اُتارا ہوا مٹر جولائی تک، اس مُلک سے باہر بھیجا جا رہا ہے اور حکومت اس کی روک تھام کے لیے کچھ نہیں کر رہی ہے۔

کچھ اور غیر مُلکی ذرائع ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا اور سیام کے علاوہ بھی کچھ غیر مُلکی ذرائع ایسے ہیں جن سے غذائی اشیا کے حصول کی امید کی جا سکتی ہے، ضرورت ہے کہ حکومتِ ہند ان تمام ذرائع اور وسائل کو پورے پورے طور پر کام میں لانے کی کوشش کرے۔ یہ خبر امید افزا ہے کہ ہندستانی ریڈ کراس کے لیے آسٹریلیا کی ریڈ کراس سوسائٹی دس ہزار پونڈ کی قیمت کا سفوفی دودھ خرید رہی ہے۔ کیا یہ دودھ قحط زدہ علاقوں میں کم خوراکی کے شکار مردوں، عورتوں اور بچّوں کے لیے استعمال کیا جائے گا؟ ہندستان کے قلّت والے علاقوں کے لیے نیوزی لینڈ کی حکومت نے، حکومتِ ہند کو ۲۴۰۸۳ پونڈ شیرہ دودھ (MALTED MILK) ۱۲۱۴۰ پونڈ سفوفی دودھ اور ۲۳۰۴۲۷۶ پونڈ امریکی بسکٹ دیے ہیں

اکثر حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ روس کے پاس وافر مقدار میں فالتو اجناس موجود ہیں۔ اس کا ایک بڑا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ روس فرانس کو ۵۰۰۰۰۰ ٹن اجناس دے چکا ہے۔ اور یورپ کے دوسرے مُلکوں کی بھی غذائی امداد کر رہا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ روس میں چاول کی فصل بھی اچھی ہوئی ہے۔ مرکزی اسمبلی کے گزشتہ مباحثوں کے دوران میں ہندستان کے ناظمِ غذا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ملک معظّم کی حکومت سے استدعا کریں گے کہ وہ حکومت روس کے پاس غذائی امداد کے لیے درخواست بھیجے۔ لیکن اب تک اس کا

کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔

اس وقت اتحادی غذائی بورڈ اور یو۔ ان۔ آر۔ اے کو دنیا کے قلت زدہ علاقوں کے لیے غلہ فراہم کرنے میں جو سب سے بڑی دقت پیش آرہی ہے وہ ارجنٹائن کے غلط رویے کی وجہ سے۔ ایک طرف تو دنیا کے کروڑوں انسان بھوک اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور دوسری طرف کچھ ہی ماہ پہلے ارجنٹائن میں گیہوں انجنوں میں ایندھن کے طور پر جلایا جارہا تھا۔ اس وقت خیال کیا جاتا ہے کہ ارجنٹائن میں ۲۵ لاکھ ٹن فالتو غلہ موجود ہے جسے وہ ایسے ملکوں کو بھیج رہا ہے جہاں غذائی قلت کا نام و نشان بھی نہیں مثلاً اسپین اور پرتگال۔ یہ دونوں ملک جنگ میں شامل نہیں تھے اس لیے وہاں کی غذائی پیداوار نارمل حالت میں ہے۔ اتحادی غذائی بورڈ اور یو۔ ان۔ آر۔ اے کے بار بار استدعا کرنے کے باوجود حکومتِ ارجنٹائن ان ملکوں کو غلہ بھیجنا بند کرنے پر تیار نہیں ہے۔ اس نے یو۔ ان۔ آر۔ اے میں شامل ہونے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ فاشزم کی شکست کے بعد دنیا میں دو ہی ملک ایسے رہ گئے ہیں جہاں فاشزم اب بھی موجود ہے، اسپین اور ارجنٹائن۔ پرتگال اگرچہ فاسسٹ نہیں ہے لیکن وہاں فاشزم کے کچھ نہ کچھ رجحانات ضرور موجود ہیں۔ ان فاسسٹ ملکوں کو اس بات کی کیا پروا ہو سکتی ہے کہ دنیا کے کروڑوں انسان زندہ رہیں یا بھوک سے مرجائیں۔ حیرت ہے کہ ایسے موقع پر "مجلسِ اقوامِ متحدہ" بالکل خاموش ہے۔ کیا وہ طاقت کے زور سے ارجنٹائن کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اپنا فالتو غلہ اسپین اور پرتگال بھیجنے کی بجائے اتحادی غذائی بورڈ اور یو۔ ان۔ آر۔ اے کے حوالے کر دے تاکہ دنیا کے کروڑوں انسانوں کو موت کے پنجے سے چھڑایا جاسکے؟

جنوبی افریقہ کی انڈین نیشنل کانگریس، ہندستان کی غذائی امداد کے لیے ایک کل ملک تحریک چلا رہی ہے۔ اس بات کے پیشِ نظر کہ محاذِ جنگ سے دور رہنے کی وجہ سے جنوبی افریقہ کی غذائی پیداوار نارمل حالت میں ہوگی کیا امید کی جاسکتی ہے کہ وہاں سے کچھ غلہ ہندستان آسکے گا؟

نوشتہ ۸ را پریل سنہ ۱۹۴۶ء

———— ❊ ————

صوبائی حکومتوں کے آمد و خرچ پر ایک نظر

پہلی اپریل سے نیا مالیاتی سال شروع ہوتا ہے۔ چناں چہ اس وقت تک مرکزی حکومت کے علاوہ تمام صوبوں نے چاہے وہ ابھی تک گورنر کے راج میں ہوں یا نئی وزارتوں کے راج میں، اپنے اپنے بجٹ تیار کر لیے ہیں۔ اس سال کے بجٹ خاص طور پر اس لیے اہم ہیں کہ یہ جنگ

کے بعد کے پہلے بجٹ ہیں۔ اور لازمی طور پر نئے تعمیری زندگی کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اُن سے بہت سی امیدیں وابستہ کی جا رہی ہیں۔ مرکزی بجٹ پر "معاشیات" کی گزشتہ اشاعت میں بحث کی جا چکی ہے۔ اب ذیل کی سطور میں ہم صوبائی بجٹوں کے صرف تخمینوں سے قارئین کو واقف کرانے کی کوشش کریں گے۔

اس سے پہلے ضرورت ہے کہ جنگ کے دوران میں صوبائی آمد و خرچ کا کیا حال رہا ہے اس پر بھی ہم ایک سرسری نظر ڈال لیں۔ سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں تمام صوبوں کی مجموعی آمدنی ۷۴ء ۸۴ کروڑ روپے تھی۔ سنہ ۴۵-۱۹۴۴ء میں یہ آمدنی بڑھ کر ۷۸ء ۲۰۰ کروڑ روپے ہو گئی۔ لیکن اگر اکیلا آسام کو لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی آمدنی ۷۴ء ۴ کروڑ روپے (سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء) سے گھٹ کر سنہ ۴۵-۱۹۴۴ء میں ۵۱ء ۴ کروڑ روپے ہو گئی۔ اس عرصے میں صوبہ بمبئی کی آمدنی میں بھی ۳۴ء ۲ کروڑ روپے کی کمی واقع ہوئی۔ مدراس کی آمدنی میں ۹۰ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ یو۔پی اور پنجاب کی آمدنیاں دگنی ہو گئیں۔

ذرائع آمدنی پر الگ الگ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ مال گزاری کی آمدنی جنگ کے عرصے میں (سنہ ۱۹۳۸ تا سنہ ۱۹۴۵ء) تقریباً یکساں رہی۔ چُنگی و آب کاری، اسٹامپ، جنگلات اور رجسٹریشن کی آمدنیوں میں البتہ بہت اضافہ ہوا۔ انکم ٹیکس میں صوبوں کے جو حصے ہوتے ہیں اُن کے تحت بھی صوبوں کی آمدنیوں میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں انکم ٹیکس میں (کارپوریشن ٹیکس کو چھوڑ کر) صوبوں کے جو حصے تھے اُن کا میزان ۵۰ء ۱ کروڑ روپے ہے، جو سنہ ۴۵-۱۹۴۴ء میں ۵۶ء ۲۶ کروڑ روپے تک پہنچ گیا لیکن یہ واضح رہے کہ یہ رقم اُس مجموعی رقم کا بہت ہی چھوٹا سا حصہ ہے جو جنگ کے زمانے میں مرکزی حکومت نے آمدنیوں پر نئے نئے ٹیکس لگا کر ہر سال وصول کی۔ مرکزی حکومت کی انکم ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس کی مجموعی آمدنی میں سے، جو ۱۸۹ کروڑ روپے کے برابر ہوتی ہے، صوبوں کو صرف ۲۳ کروڑ روپے ملتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اِس لحاظ سے اب قابلِ اطمینان نہیں ہے کہ نئے تعمیری منصوبوں کو عمل میں لانے کے لیے صوبائی حکومتوں کو بڑی بڑی رقمیں درکار ہوں گی۔

یہ تو آمدنی ہوئی، اب خرچ کی طرف آئیے۔ یہاں ہمیں معلوم ہوگا کہ مرکزی حکومت کے حکم سے، صوبائی حکومتیں بنیادی اور اہم ترین شہری ضرورتوں کے لیے بھی خرچ کرنے سے انکار کرتی رہی ہیں۔ صوبائی حکومتوں نے جان بوجھ کر اخراجات میں کمی کی تاکہ جنگ کے بعد کے منصوبوں کو عمل میں لانے کے لیے فنڈ اکٹھا کیا جا سکے۔ زیادہ تر رقمیں فوجی اور غیر فوجی ضرورت کی اشیا اور خدمات مہیا کرنے میں صرف ہوئیں۔ انھی اخراجات میں راشن بندی اور امدادِ قحط سے متعلق اخراجات بھی شامل ہیں۔ اخراجات میں اضافے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ افراطِ زر کی وجہ سے چیزوں کی قیمتیں بہت چڑھ گئی ہیں۔ لیکن یہ واضح رہے کہ جنگ سے پہلے شہری امور پر صوبائی حکومتیں جتنا خرچ کرتی تھیں اُس کی بہ نسبت جنگ کے زمانے میں کم ہی خرچ ہوا، باوجود اس کے کہ اشیا کی قیمتوں میں تین گنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔

اگر اس صورت حال کی تمام خرابیوں کو یک جا جمع کیا جائے تو وہ یہ ہوں گی :- مرکزی حکومت کی آمدنی میں سے صوبوں کو بہت کم حصہ دیا گیا۔ مال گزاری کی آمدنی یکساں رہی۔ دیگر ذرائع سے جو آمدنی ہوئی وہ قیمتوں میں اضافے کے مطابق نہیں رہی جنگلات سے زائد آمدنی پیدا کرنے کے لیے بہت سے جنگلات ہی کو تباہ کر دیا گیا۔ اخراجات کا جہاں تک تعلق ہو وہ شعبے جن سے ملک کی معاشی تعمیر کا کام لیا جائے گا، ابھی تک وجود ہی میں نہیں آسکے ہیں۔ تنظیمی مشینری بالکل چوپٹ اور ناکافی ہے۔

اب صوبائی حکومتوں کے نئے سال کے بجٹوں سے متعلق ضروری تخمینے یہ ہیں :-

پنجاب :-

تخمینہ آمدنی سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	=	۲۱ کروڑ ۳۰ لاکھ
تخمینہ خرچ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	=	۲۰ کروڑ ۸۳ لاکھ
بچت		۴۷ لاکھ

انکم ٹیکس کی آمدنی میں ۷۰ لاکھ کی کمی کا اندازہ لگایا گیا ہو۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے لگان میں معافی سے آمدنی میں ۴۴ لاکھ رُپے کی کمی واقع ہوگی۔ چُنگی و آب کاری اور جنگلات کی آمدنیوں میں کمی کا اندازہ بالترتیب ۱۱ لاکھ رُپے اور ۲۰ لاکھ رُپے لگایا گیا ہو۔

اخراجات کی مد میں ۳ کروڑ ۴۳ لاکھ رُپے کے اضافے کا تخمینہ ہو۔ اس کے علاوہ ۵ کروڑ ۵ لاکھ رُپے جنگ کے بعد کے تعمیری کاموں میں لگائے جائیں گے۔ چھ کروڑ رُپے رفاہی شعبوں (BENIFICENT DEPARTMENTS) کی مد میں خرچ ہوں گے۔ جنگ کے بعد کے تعمیری منصوبوں کو عمل میں لانے کے لیے حکومت پنجاب نے پہلے پانچ سالوں کے لیے ۱۱۶ کروڑ روپیوں کا تخمینہ پیش کیا ہو جن میں سے سنہ ۱۹۴۵ء اور سنہ ۱۹۴۶ء کے درمیانی عرصے میں ۹ کروڑ ۱۴ لاکھ رُپے خرچ ہوں گے، ایک کروڑ ۸۹ لاکھ محصولات کی آمدنی میں سے اور بقیہ ۷ کروڑ ۲۵ لاکھ اصل سرمایے سے۔ دوسرے سال ۷ کروڑ ۵ لاکھ رُپے جنگ کے بعد والی اسکیموں میں لگائے جائیں گے۔ جن میں سے ایک کروڑ ۹۸ لاکھ رُپے مرکزی حکومت دے گی۔

بجٹ کی خامیوں کو مختصراً بیان کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہو کہ یہ بجٹ، موجودہ مخلوط وزارت نے نہیں تیار کیا ہو بلکہ گزشتہ یونینسٹ وزارت نے۔ لیکن حیرت ہو کہ موجودہ وزارت نے آخر کیوں نہیں اس میں ردّ و بدل کرنا پسند کیا۔ تین کروڑ ۴۴ لاکھ رُپے جو مجموعی اخراجات کا ۵ر۱۵ فی صد حصہ ہیں، پولیس کے لیے اور تین کروڑ ۶۵ لاکھ رُپے (۴ر۱۷ فی صد حصہ) جیلوں اور انصافی شعبے کے لیے وقف کرنا کچھ زیادہ عقل پسندی کا ثبوت نہیں ہو۔ موجودہ بجٹ میں پولیس اور جیل وغیرہ کے لیے جو اخراجات نکالے گئے ہیں وہ تمام گزشتہ بجٹوں کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔ کسی "قومی حکومت" کے مالیاتی پروگرام میں یہ چیز سخت حیرت انگیز

[illegible]

اس کے علاوہ حکومتِ پنجاب کے پاس، سوائے چند بجلی اسکیموں اور کچھ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے، سال آئندہ کے لیے کوئی خاص صنعتی پروگرام بھی نہیں۔ نئی ضرورتوں کے پیشِ نظر ٹیکسوں میں بھی کوئی ردّ و بدل نہیں کیا گیا ہے۔ صوبائی آمدنی میں اضافے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ طبی امداد، صحتِ عامہ اور تعلیم وغیرہ کے لیے جو مدیں نکالی گئی ہیں وہ قطعی ناکافی ہیں۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ پولیس اور جیل کے اخراجات کو بالکل گھٹا کر ان امور کے لیے زیادہ رقم نکالی جاتی۔

سندھ :-

تخمینۂ آمدنی سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	. . . .	۲۹ ، ۸۳ لاکھ
تخمینۂ خرچ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	. . . .	۱۳ ، ۸۰۰ لاکھ
بچت		۱۶ ، ۳ لاکھ

تعمیر و توسیع کے لیے ۳۵ لاکھ رُپے نکالے گئے ہیں۔ پٹرول بکری ٹیکس ایک آنے سے بڑھا کر دو آنے کر دیا گیا ہے۔ جس سے ۲۰ لاکھ رُپے کی آمدنی ہوگی۔ سرکاری ملازموں کی تنخواہوں پر اضافے کے خیال سے نظرِ ثانی کی جائے گی جس سے سرکاری اخراجات میں ۶۰ لاکھ روپوں کا اضافہ ہوگا۔ وزیرِ اعظم سندھ نے بتایا کہ حکومتِ سندھ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ رُپے نئی عمارتوں اور سڑکوں کی تعمیر میں صرف کرے گی۔ دریائے سندھ پر دو پشتے تعمیر ہوں گے۔ تعلیم اور صحتِ عامہ کے لیے بہت کم رقمیں نکالی گئی ہیں۔ یعنی دونوں ملا کر صرف ۵ لاکھ۔ زراعت پر محض ۳ ، ۱۵ لاکھ رُپے صرف کیے جائیں گے۔ غرض جنگ کے بعد کے تعمیری اور توسیعی پروگرام کے لحاظ سے سندھ کا بجٹ بہت مایوس کن ہے۔

یو۔پی

تخمینۂ آمدنی سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۸ ، ۲۰۷۰۶ لاکھ رُپے
تخمینۂ خرچ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۱ ، ۲۷۰۳ لاکھ رُپے
بچت سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۰ ، ۷ ، ۳ لاکھ رُپے

سالِ رواں کے آخر میں محفوظ سرمایے میں ۹۸۲٫۷۶ لاکھ رُپے ہوں گے۔ مرکز سے انکم ٹیکس کا جو حصّہ ملتا ہے اُس میں بھی ۲٫۴۵ کروڑ روپوں کا اضافہ ہوگا۔ آب کاری و چنگی کے ذریعے جو آمدنی ہوتی ہے اُس میں بھی اگرچہ اضافے ہی کا رجحان ہے لیکن کانگریسی حکومت کے قیام کے بعد منشیات کی خرید و فروخت کی ممانعت ہو جائے گی جس سے آمدنی بھی گھٹ جائے گی۔ ۹٫۴۴ کروڑ رُپے مختلف تعمیری و توسیعی مدوں پر صرف کیے جائیں گے۔ جنگ کے بعد کی اسکیموں کے لیے محفوظ سرمایے میں مختلف مدوں کے تحت سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء کے

کے آخر میں مندرجہ ذیل رقمیں جمع ہوں گی:-

یو۔پی سڑک فنڈ	۱۴۶ لاکھ رُپے
اسپتال فنڈ	۹۴ " "

بکری ٹیکس کا سوال فی الحال اسی طرح چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ بات تجارت پیشہ لوگوں کے خاطر کی ہے۔
یہ بجٹ اگرچہ موجودہ وزارت کا تیار کیا ہوا نہیں ہے بلکہ سرکاری مشورہ کاروں کا ہے، اس لحاظ سے قابلِ اطمینان ہے کہ ایک تو یہ کہ جنگ کے بعد کے تعمیری کاموں کے لیے کافی رقمیں جمع ہیں، دوسرے بجٹ میں تعمیر و توسیع کے لیے وافر رقمیں نکالی گئی ہیں۔ کانگرسی وزارت دوبارہ اس بجٹ کی نظرِ ثانی کا ارادہ رکھتی ہے۔

بہار:-

بہار کا بجٹ جو گورنر کے مشورے کار کا تیار کیا ہوا ہے مجموعی حیثیت سے مایوس کن ہے۔

تخمینہ مجموعی آمدنی سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء	۱۳۸۹ لاکھ رُپے
تخمینہ خرچ سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء	۱۳۸۳ " "

بجٹ میں نہ تو ٹیکس میں ردّ و بدل کا اور نہ تعمیر و توسیع کا کوئی پروگرام ہے۔ انکم ٹیکس کی آمدنی اطمینان بخش نہیں ہے۔ زائد آمدنی ٹیکس کے منسوخ ہو جانے اور جنگ کے ختم ہو جانے کی وجہ سے صنعتی مواقع کے نہ رہنے کے سبب انکم ٹیکس میں معتد بہ کمی واقع ہو گی۔ چنگی و آب کاری کی آمدنی میں سالِ رواں کے آخر میں کوئی ۳۲ لاکھ رُپے کی کمی ہو جائے گی۔ اسٹامپ اور رجسٹریشن اور جنگلات کی آمدنیوں میں بھی کمی ہی کی توقع کی گئی ہے۔ تعمیری کاموں کے لیے دو کروڑ ۶۰ لاکھ رُپے نکالے گئے ہیں۔ جن میں سے مرکزی حکومت نے ایک کروڑ ۶۰ لاکھ رُپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ تعلیم اور طبی امداد کے لیے جتنی رقموں کا تخمینہ کیا گیا ہے وہ بہت ناکافی ہیں ضرورت ہے کہ نئی کانگرسی وزارت اس بجٹ پر نظرِ ثانی کرے اور اس میں زرعی حالات درست کرنے کے لیے اخراجات کی گنجائش پیدا کرے۔

اڑیسہ:-

تخمینہ آمدنی سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء	۳۵۷۵۱۰۰۰ رُپے
تخمینہ خرچ سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء	۳۹۲۲۶۰۰۰ "
خسارہ	۳۴۷۵۰۰۰ "

سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء کی بہ نسبت سالِ رواں کی آمدنی میں ۵۰۳۹۰۰۰ روپوں کے اضافے کا تخمینہ پیش کیا گیا ہے یعنی صوبائی

[...] کے لیے ۰۰۰۶۲۳۷ رُپے اور ۰۰۰۷۵۱۳ رُپے تعمیری و ترقیاتی امور کے لیے بجٹ میں شامل کیے گئے ہیں۔

[...]ال:۔

تخمینہ آمدنی سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۴۱۱۸۸۴۰۰۰ رُپے
تخمینہ خرچ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۵۰۶۵۱۹۰۰۰ "
خسارہ	۹۵۰۳۵۰۰۰ "

یہ خسارہ باوجود اس حقیقت کے ہوا ہے کہ سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء کی آمدنی میں ابتدائی تخمینے کی بہ نسبت ۷ کروڑ رُپے کا اضافہ ہوا۔

مختلف مدوں کے تحت اخراجات کے جو تخمینے پیش کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں :۔

عارضی طبی امداد اور وبائی امراض کی روک تھام کے لیے ایک کروڑ رُپے، پانی کی فراہمی کے لیے ۷۰ لاکھ رُپے، قومی اور صوبائی شاہ راہوں کے لیے ½۶۷ لاکھ رُپے، چھوٹے پیمانے کی آب پاشی کے لیے ۶۰ لاکھ رُپے، فوجی ذخیروں کی خریداری کے لیے ۵۰ لاکھ رُپے، زائد غذا پیدا کرنے کے لیے ۴۶ لاکھ رُپے، شعبۂ امدادِ باہمی کی ازسرِ نو تنظیم کے لیے ۳۰ لاکھ رُپے، جنگ سے برخاست شدہ لوگوں کو زرعی زمینوں میں آباد کرنے کے لیے ۱۰ لاکھ رُپے۔

بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے لیے مرکز سے مالی امداد کی ضرورت ہوگی۔

آسام :۔

تخمینہ آمدنی سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۳۷۶۲۳۷۰۰۰ رُپے
تخمینہ خرچ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۳۸۱۹۰۰۰۰۰ "
سالِ گزشتہ کی بچت	۱۰۷۹۰۰۰۰ "
نئے سال کی بچت کا تخمینہ	۵۱۲۷۰۰۰ "

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس بجٹ کی کوئی اہمیت نہیں اس لیے کہ بجٹ میں نئی اسکیموں کو عمل میں لانے کا کوئی التزام نہیں ہے۔ اگرچہ آسام کے وزیرِ مالیات نے کہا ہے کہ نئی وزارت زرعی اور صنعتی منصوبوں کو عمل میں لا کر عوام کی معاشی حالت درست کرنا چاہتی ہے۔

مدراس :۔

تخمینہ آمدنی سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۴۱۴۴،۰۷ لاکھ رُپے
تخمینہ خرچ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۴۰۸۲،۳۹ " "
بچت	۶۱،۶۸ " "

انکم ٹیکس اور مال گزاری کی آمدنی میں اضافے کا تخمینہ پیش کیا گیا ہے لیکن چُنگی و آب کاری اور جنگلات کی آمدنیاں گھٹ گئی ہیں۔ تعلیم، صنعت، طبّی امداد اور صحتِ عامّہ، زراعت، آب پاشی وغیرہ کے لیے ۷۷ر۱۲ لاکھ رُپے نکالے گئے ہیں۔ غذائی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ۸۹۲ لاکھ روپوں کا تخمینہ منظور کیا گیا ہے۔ جنگ کے بعد کی تعمیر و توسیع کے امور کے لیے جو پہلے پنج سالہ منصوبۂ عمل میں شامل ہیں ۹۷ر۳۳ لاکھ روپوں کا تخمینہ پیش کیا گیا ہے۔

بمبئی:۔

تخمینہ آمدنی سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۲۰ر۳۰ کروڑ رُپے
تخمینہ خرچ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۱۵ر۳۰ کروڑ رُپے
بچت	۵ لاکھ رُپے

بکری ٹیکس سے ۵۰ر۸۲ لاکھ رُپے کی آمدنی کا تخمینہ پیش کیا گیا ہے۔ شہری غیر منتقل جائداد ٹیکس (URBAN IMMOVABLE PROPERTY TAX) جس کا دائرہ ابھی تک صرف بمبئی شہر تک محدود تھا اب پونا شہر میں بھی عائد کیا جائے گا اس سے آمدنی میں کوئی ۴ لاکھ روپوں کا اضافہ ہوگا۔

اخراجات کی خاص خاص مدیں یہ ہیں:۔ قلّت زدہ علاقوں میں آب پاشی کی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے اور زائد غذا پیدا کرنے کے لیے ۳۴۶ لاکھ رُپے، جنگ کے بعد کی تعمیری اسکیموں کے لیے ۲۵ر۲ کروڑ رُپے، سستا دودھ مہیا کرنے کے لیے ۴۰ لاکھ رُپے، تعلیم کے لیے ۲۹۴ لاکھ رُپے، صحت عامہ کے لیے ۱۷۴ لاکھ رُپے، زراعت اور امدادِ باہمی وغیرہ کے لیے ۲۲۶ لاکھ رُپے، صنعتوں کے لیے ۳۳ لاکھ رُپے، وغیرہ وغیرہ۔

سرحدی صوبہ:۔

تخمینہ آمدنی سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۲۶۳۲۹۰۰۰ رُپے
تخمینہ خرچ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء	۲۷۸۰۴۰۰۰ "
خسارہ	۱۵۴۵۰۰۰ "

انجمنِ ترقیٔ اُردو کی وضع کردہ چند معاشیاتی اصطلاحات

[C]umulative Stock	بڑھوتری حصہ
Advances	پیشگیاں
Balances	سلک، واصل باقی
Barter	جنسی مبادلہ
Board of Exchequer	مجلسِ مالیہ
Capital goods.	اشیائے اصل
Death Duty	فوتی محصول
Deflation	تفریطِ زر
Estate Duty	محصولِ جائداد
Foreign Exchange	خارجی مبادلات
Fund Reserve	محفوظ ذخیرہ
Gold Securities	سونے کے تمسکات
Indirect Tax	چھپا محصول
Inflation	افراطِ زر
Joint Stock	مشترک سرمایہ
Key Industries	بنیادی صنعتیں
Laisez faire	اصولِ غیر مداخلت
Licensing Act	قانونِ اجازہ
Market p[ri]ce.	بازاری قیمت

معاشیات

جلد ۱   مئی سنہ ۱۹۴۶ء   نمبر ۵

فہرستِ مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱-	اداریہ	اڈیٹر	۲
۲-	مالیات اور منصوبے بندی	ڈی۔ کے۔ ملہوترا۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (پنجاب یونی ورسٹی)	۶
۳-	ہندستان کی تجارتِ خارجہ	معاشی	۱۵
۴-	کوئلے کی تحقیقاتی کمیٹی	ابو سالم ایم۔ اے (علیگ)	۲۷
۵-	لندن کی نئی منصوبے بندی	ترجمہ از ادارہ	۳۳
۶-	قدر اور محنت	ط۔ ا۔ خ	۳۹
۷-	لیبر وزارت کا پہلا بجٹ	ادارہ	۴۵
۸-	غذا	"	۴۷

اداریہ

یو۔پی اور زمیں داری سسٹم

از: ——— اڈیٹر

یو۔پی کانگریس نے اپنے انتخابی منشور میں صوبے کے کسانوں سے وعدہ کیا تھا کہ زمیں داری کے نظام کو ختم کرکے اُن کی مفلسی اور پستی کی سب سے بڑی وجہ کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اب جب کہ صوبے میں کانگریسی وزارت کا قیام عمل میں آچکا ہے، کسانوں کا یہ مطالبہ بالکل حق بہ جانب ہے کہ کانگریس اپنا وہ وعدہ پورا کرے جس کی بنا پر انھوں نے اُس کے نمایندوں کو اسمبلی کے انتخابات میں ووٹ دیا تھا۔ دیکھا گیا ہے کہ کانگریس انتخابات کے موقعوں پر تو اس قسم کے وعدے کر دیتی ہے لیکن آگے چل کر سیاسی موقع بازی کے تحت اس کو عمل میں لانے سے گریز کرتی ہے یا تاخیر سے کام لیتی ہے۔ زمیں داری سسٹم کے سلسلے میں بھی ہمیں کچھ اسی قسم کا خطرہ نظر آرہا ہے۔ وزارت کے قیام سے پہلے اور اس کے ابتدائی دنوں میں زمیں داری سسٹم کے منسوخ ہونے کا جس قدر چرچا ہو رہا تھا وہ اب کچھ دھیما پڑ گیا ہے اور کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کانگریسی وزارت عارضی سیاسی مصلحت بازی کے تحت زمیں داری سسٹم کے فوری خاتمے کے سوال کو ٹالتی رہے گی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ایک بے حد المناک واقعہ ہوگا اور اس سے کانگریس پر کسانوں کا اعتماد باقی نہیں رہے گا۔

کسانوں کی معاشی حالت کو درست کرنے اور صوبے کے غذائی مسئلے کو مستقل طور پر حل کرنے کے لیے پہلا لازمی اور لابدی قدم زمیں داری کا خاتمہ کرنا ہے۔ اگر کانگریس صوبے میں مستقل طور پر اپنا اثر واقتدار قائم رکھنا چاہتی ہے تو اُسے عارضی مصلحتوں کے تحت زمیں دار طبقے کا سہارا لینے کی بجائے مستقل اور دائمی طور پر ہندو اور مسلمان کاشت کاروں کی عظیم الشان اکثریت کا اعتماد

اور بھروسہ حاصل کرنا ہوگا اور اس کے لیے زمیں داری سسٹم کا خاتمہ لازمی ہے۔ جنگ کے زمانے کی اور موجودہ غذائی دقتوں نے یہ بات ہر شخص پر واضح کر دی ہے کہ ہندستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کافی غذا فراہم کرنے کے لیے نہ صرف نئے آلاتِ پیدائش کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے بلکہ نظامِ اراضی کو بنیادی طور پر بدلنا بھی لازم ہے۔

سنہ ۱۹۳۷ء تک غیر ملکی سامراج نے زمیں دار کو زبردستی ملک کی سیاسی اور معاشی زندگی کا لیڈر بنا رکھا تھا۔ زمیں دار برطانوی سامراج کا سب سے اہم آلہ اور حربہ رہا ہے جس کے ذریعے وہ اپنا اقتدار کسان اور غریب طبقوں میں محسوس کراتا رہا ہے۔ لازمی طور پر زمیں دار کو بے لگام قسم کے مقامی اختیارات حاصل ہوگئے ہیں۔ اس چیز نے زمیں دار اور رعیت کے درمیان ایک گہری معاشی اور سماجی خلیج حائل کر دی ہے۔ یو۔ پی کا زمیں دار کسانوں سے من مانی مال گزاری وصول کرتا رہا ہے اور اُسے بیگار کے طور پر مویشیوں کی طرح استعمال کرتا رہا ہے۔ سنہ ۱۹۳۹ء کے پہلے تو وہ جب چاہتا رعیت کو زمین سے بے دخل کر سکتا تھا۔

انگریزی حکام کے لیے اس اجنبی ملک میں آسانی کے ساتھ مال گزاری وصول کرنے اور تنظیمی نگرانی کا اگر بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا تو صرف زمیں دار۔ اس لحاظ سے اب جب کہ انگریزی حکومت طاقت کے زور سے یا خود اُس کی رضامندی سے چند دنوں کی مہمان نظر آ رہی ہے زمیں داری سسٹم کی یہ افادیت بھی ختم ہوگئی ہے۔ اب خود کسانوں میں اتنا سیاسی شعور پیدا ہو چلا ہے کہ انھیں کسی زمیں دار کی سیاسی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ایسی حالت میں زمیں داری سسٹم کے مزید قیام کا مطلب ہے کہ زمیں دار کا کوئی فرض تو نہیں رہے گا لیکن اس کی مراعات اور حقوق خواہ مخواہ باقی رہیں گے۔ یہ صورتِ حال سماجی اور سیاسی انصاف کے منافی ہے۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزارت نے کسانوں کی بدحالی دور کرنے کے لیے زمیں داری کے نظام میں کچھ ردّ و بدل کرنا چاہا جس پر زمیں دار طبقہ معترض ہوا۔ لیکن اس کے باوجود سنہ ۱۹۳۷ء اور سنہ ۱۹۳۹ء کے درمیانی عرصے میں چند اصلاحیں نافذ ہو کر رہیں، اگرچہ وہ قطعی ناکافی تھیں اور ان کے ناکافی ہونے ہی سے اس بات کا پتا چل گیا کہ کانگرس پر رجعت پرست زمیں داروں اور سرمایہ دار طبقے کا اقتدار حاوی ہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں "یو پی اسٹے آف پروسی ڈنگس ایکٹ" پاس ہوا جس میں سنہ ۱۹۳۸ء میں کچھ ترمیم کی گئی۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم قانون ۲۰ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء کو یو۔ پی کی مجلسِ قانون ساز میں پیش ہوا جو "یو۔ پی ٹیننسی بل" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بل ایک سلیکٹ کمیٹی کے حوالے کیا گیا جس کی کارروائی سے پتا چلتا ہے کہ زمیں داروں کو بچانے اور ان کو مراعات دینے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔ پھر بھی زمیں داروں نے اس مسودۂ قانون میں ۲۰۰۰ ترمیمیں پیش کیں۔ مہینوں تک بحث و مباحثے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد مسودۂ قانون کونسل میں پیش ہوا۔ وہاں بھی اُسے غور و خوض کے لیے ایک سلیکٹ کمیٹی کے حوالے کیا

گیا۔ آخر کونسل کے کچھ ممبروں اور وزیرِ محصولات کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا جس کے نتیجے کے طور پر قانون آخر پاس ہو کر رہا۔ آج جب کہ صوبے کی مجلس قانون ساز میں کانگرس کی زبردست اکثریت ہے اور ہندو نشستوں پر مہاسبھائی رجعت پرستوں کا رہا سہا غلبہ بھی جاتا رہا ہے تو کانگریسی وزارت بڑی آسانی کے ساتھ اسمبلی کے مسلم لیگی ترقی پسند عناصر سے اتحاد پیدا کر کے زمیں داری کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ زمیں داری کے منسوخ کرنے کے معاملے میں مسلم لیگ کے انقلاب پسند اور ترقی خواہ عناصر سے اتحاد اور مشترک محاذ قائم کرنا اس لیے مشکل نہیں ہے کہ خود یو۔پی مسلم لیگ کونسل اکتوبر ۴۵ سنہ ء میں زمیں داری کے خاتمے کی حمایت میں ایک تجویز پاس کر چکی ہے جس کی تحریک ظہیر الحسن لاری صاحب نے کی تھی۔

اپریل کے پہلے ہفتے میں یہ خوش گوار خبر سننے میں آئی تھی کہ یو۔پی کانگرس کمیٹی نے کوئی اسکیم تیار کرنی شروع کر دی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ زمیں داری کو ختم کر کے کاشت کار اور حکومت کے درمیان راست تعلقات قائم کیے جائیں۔ غالباً کانگرس کی ضلع کمیٹیوں نے کاغذاتِ آراضی کے دفتروں سے ضروری اعداد و شمار حاصل کرنے کا کام بھی شروع کر دیا ہے۔ سنا گیا ہے کہ دو سو پچاس روپے سے لے کر پانچ ہزار روپے سالانہ تک مال گزاری دینے والے زمیں داروں کو پانچ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جو اسکیم تیار ہو رہی ہے وہ کانگریسی حکومت کے سامنے پیش کی جائے گی۔

لیکن اس سلسلے میں ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ کانگریسی وزارت ایسا نہ ہو کہ زمیں داروں کو معاوضہ دینے کے غیر منصفانہ اصول کو تسلیم کر لے اس لیے کہ ابھی تک کانگرس کے کرتا دھرتا وہی لوگ ہیں جو کسانوں کے دباؤ کے اثر سے ترقی پسندانہ رویّہ اختیار کرتے ہوئے بھی رجعت پرستوں سے اتحاد اور دوستی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر زمیں داروں کو معاوضے دیے گئے تو وہ کسانوں ہی کے جیب سے وصول کیے جائیں گے۔ ایسی حالت میں یو۔پی کے مفلس۔ قلاش اور فاقہ زدہ کسانوں کی حالت فوری طور پر کس طرح درست کی جا سکتی ہے؟

زمیں داروں کو معاوضے دینے سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ حکومت اُن اداروں کی مالی امداد کی ذمّے داری اختیار کرے جو آج زمیں داروں کی آمدنی سے چل رہے ہیں اور جن میں مسلم ادارے بھی شامل ہیں۔ جناب چودھری خلیق الزماں صاحب کے اس خیال کے ہم پورے طور پر حامی ہیں کہ زمیں داری کے خاتمے کے ساتھ ساتھ صنعتوں کو بھی قومی ملکیت بنایا جائے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر فوری طور پر صنعتوں کو قومی ملکیت نہیں بنایا جا سکتا تو زمیں داری کو برقرار رکھا جائے۔ زمیں داری کے خاتمے کے بعد ہی ملک میں وہ سماجی طاقتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو صنعتوں کو بھی قومی ملکیت بنا کر چھوڑیں گی۔ یہی معاشی طاقتوں کا فطری عمل ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر زمیں داری مسلم اتحادی جائے تو عام مسلمان خاص کر مسلمان کسان اتنے خوش حال ہو جائیں گے کہ اپنے بل بوتے پر اپنے اداروں اور انجمنوں کو چلا سکیں گے۔ انگلیوں پر گنے جانے والے چند مسلمان زمیں داروں کے مفاد کو قائم رکھنے کے لیے یو۔پی کے ۴۰ لاکھ مفلس، بدحال اور قلاش مسلم کسانوں کی زندگی بھینٹ نہیں چڑھائی جا سکتی۔

لارڈ کینز

۲۱ اپریل سنہ ۱۹۴۶ء کو اتوار کے دن لارڈ جان مینارڈ کینز باسٹھ سال کی عمر میں رحلت کر گیا۔ ایک مشہور معاشی مفکر ہونے کے علاوہ "مارڈ کینز" "بینک آف انگلینڈ" کا ڈائرکٹر اور حکومتِ برطانیہ کا معاشی مشورہ کار بھی تھا۔

پہلی عالم گیر جنگ (سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء) کے بعد سرمایہ دارانہ معاشی دُنیا میں لارڈ کینز کے نظریوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ کے بعد پیدا ہونے والے سرمایہ دارانہ دُنیا کے معاشی مسائل کے متعلق اس نے جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ سچ ثابت ہوئیں۔ سیاسی معاہدے، تاوانِ جنگ، جنگی قرضے، تعریطِ زر کی پالیسی، سونے کے معیار کا دوبارہ اجرا ــــ ان تمام مسائل کے متعلق اُس نے پُرانے طرزِ فکر کے معاشیین سے زبردست ٹکر لی اور آخر میں یعنی سنہ ۱۹۲۹ء کے عالم گیر معاشی بحران کے بعد اُن ملکوں کے معاشی حالات کے متعلق جہاں سرمایہ دارانہ نظام قائم تھا اُس کے نظریے صحیح ثابت ہوئے برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سرمایہ دار حکومتوں نے معاشی بحران کے اثرات کو دور کرنے اور معاشی خوش حالی قائم رکھنے کے لیے اس کے بتلائے ہوئے راستوں کو اختیار کیا۔ صدر روزولٹ کی نئی معاشی پالیسی جو "نیو ڈیل" (NEW DEAL) کے نام سے موسوم ہوئی لارڈ کینز ہی کے اصولوں کی مرہونِ منت تھی۔ روزولٹ کی اوّلین صدارت کے تین سالوں میں امریکہ زر سے متعلق جس نئے راستے پر گامزن ہوا وہ بھی کینز کی ابتدائی معاشیاتی تحریروں ہی سے ماخوذ تھا۔

لیکن لارڈ کینز کے معاشی نظریوں کے کردار اور اہمیت کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اُس نے کبھی بھی سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی مفروضوں سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی۔ اُس نے ہمیشہ ذاتی ملکیت اور انفرادی معاشی جد و جہد ــــ اِن دو نظریوں کو جو سرمایہ دارانہ معاشی نظام اور اس کو سہارا دینے والے معاشیاتی نظریوں کا بنیادی پتھر ہیں لازمی طور پر اپنے تمام تر معاشیاتی افکار کی بنیاد قرار دیا۔ چناں چہ اُس کے نظریوں کی اہمیت صرف سرمایہ دارانہ معیشت کے وجود تک قائم ہے اور وہ اسی کی موجودہ ضرورتوں، تقاضوں اور مسئلوں کا عارضی حل پیش کرتے ہیں لیکن ایک بار اگر ہم سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی مفروضوں سے انکار کر دیں تو پھر لارڈ کینز کے معاشیاتی نظریوں کی عملی قدر و اہمیت صاف ڈھل جاتی ہے۔ بہر حال سرمایہ دارانہ معیشت کے دائرے کے اندر اس کی حیثیت بے شک ایک جلیل القدر مفکر کی ہے۔ کینز نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ذاتی ملکیت کے رہتے ہوئے بھی سماجی نگرانی کے ذریعے معاشی بحران کو دُور کیا جا سکتا ہے اور روزگار اور خوش حالی کو قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ سرمایہ دار اور سامراجی طبقوں اور ملکوں کے لیے خاص طور پر کشش انگیز تھا چناں چہ عالم گیر معاشی بحران کے ختم ہونے کے بعد انھوں نے لارڈ کینز کے بتائے ہوئے "معاشی نسخوں" کو لبیک کہا اور نئے معاشی طرزِ عمل اور حکومتوں کے بجٹ کی تشکیل و تعمیر میں اُس کے اصولوں کو معمولی ردّ و بدل کے ساتھ تسلیم کیا۔

جب ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالم گیر جنگ چھڑی تو برطانیہ نے اور بعد میں سرمایہ دار اتحادی ملکوں نے جنگی معیشت کو سدھارنے اور اُسے مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے کینز سے پوری پوری مدد لی۔ برطانیہ نے اُس کے بتلائے ہوئے پلان ــ "جنگ کا خرچ کیسے نکالا جائے" ــ پر پورے پورے طور پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ برٹن ووڈس کے مالی نظام کی اصولی اور نظریاتی اساس کینز ہی کے معاشی نظریوں پر قائم ہے۔ لارڈ کینز کا آخری کارنامہ برطانوی امریکہ معاشی معاہدہ ہے جو دسمبر سنہ ۱۹۴۵ء کو وجود میں آیا اور جس کے تحت امریکہ نے برطانیہ کو ایک عظیم رقم قرض کے طور پر دینا منظور کیا۔ اس معاہدے کی رُو سے اشتراکی (؟) برطانیہ کو امریکہ کا عائد کردہ "آزاد تجارت" کا غیر اشتراکی نظریہ تسلیم کرنا پڑا۔ برطانیہ کے پہلے "لیبر بجٹ" کی تشکیل و تعمیر میں بھی لارڈ کینز کا خاص حصہ ہے۔ ــــ نظری معاشیات کے سلسلے میں زر، شرحِ سود اور روزگار کے متعلق اس کے نظریے خاص طور پر اہم ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی کینز کے معاشی نظریوں کی اہمیت سمجھنے کے لیے یہاں لینا ضروری ہے کہ اس نے ایک طرف تو مارشل اور اس کے مدرسے کے معاشی نظریوں کی بنیادوں پر حملہ کیا، دوسری طرف اُس نے مارکس سے بھی اپنے اختلافات کا اظہار کیا۔

مسائلِ حاضرۂ ہندستان

مالیات اور منصوبے بندی

از : ـــــــ ڈ. ک. ملہوترا۔ ام' اے۔ پی' اچ' ڈی پنجاب یونی ورسٹی

ہندستان میں مالی تنظیم کے سلسلے میں جو سب سے اہم مسئلہ ہو وہ یہ نہیں ہو' کہ فنڈ کس طرح اور کہاں سے اکٹھا کیا جائے بلکہ یہ کہ اس وقت بچت کی جو رقمیں جمع ہیں انھیں کس طرح راست استعمال کی چیزوں اور اشیائے اصل مثلاً مشینوں اور کلوں وغیرہ میں منتقل کیا جائے۔ یہ صحیح ہو کہ جنگ کے زمانے میں ہندستانیوں کی حقیقی آمدنی میں کوئی بہت زیادہ اضافہ نہیں ہو سکا، لیکن یہ ضرور ہوا ہو کہ ہندستان سے باہر زر کی شکل میں ہندستان کے بہت سے قرضے جمع ہو گئے ہیں' پھر صوبائی حکومتوں کے پاس بھی کافی بچت کی رقمیں ہیں' کاروباری اداروں اور افراد نے بھی بڑی بڑی رقمیں جمع کر لی ہیں۔ کسی زمانے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہندستان میں سرمایہ موجود ہو لیکن پھیلنے اور بڑھنے کا نام نہیں لیتا اور اس کو کاروبار' صنعت اور تجارت میں نہیں لگایا جاتا' لیکن اب یہ شکایت بے بنیاد نظر آنے لگی ہو۔ آج تو ہندستان میں حکومتوں اور کاروباری لوگوں کو اس بات کی فکر ہو کہ ہندستان کے پاس جو بچت کی رقمیں جمع ہو گئی ہیں اُن کے عوض میں غیر ملکی سکہ خاص کر ڈالر کس طرح حاصل کیا جائے تاکہ غیر ملکوں سے مناسب داموں پر اور مناسب وقت کے اندر اندر مشینیں خریدی جا سکیں۔

ہندستان میں مالیات کی از سرِ نو تنظیم کے سوال کی نوعیت سمجھنے کے لیے مندرجہ بالا باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہو۔ اب آیندہ سطور میں اس مسئلے کے اور دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ لیکن اس سے پہلے ضروری ہو کہ ہم کچھ بنیادی باتیں

اپنے ذہن میں واضح کرلیں جو معمولی ہونے کے باوجود اہمیت سے خالی نہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جنگ کے زمانے کی مالیات میں اور جنگ کے بعد والے معاشی تنظیم و تعمیر کے زمانے کی مالیات میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اور پھر دونوں میں کیا مناسبت ہوتی ہے۔ مناسبت کو لیجیے تو معلوم ہوگا کہ (۱) جنگ اور بعد از جنگ دونوں حالتوں میں سب سے پہلے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کچا مال، مشینیں اور مزدور اور کام کرنے والوں کی خدمات حاصل کرنے کے لیے زر موجود ہے یا نہیں۔ (۲) پھر دونوں حالتوں میں زر کی طلب اور حصول اپنا مقصد آپ نہیں ہوتا بلکہ اس کی حیثیت محض ایک ذریعے کی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے جنگی اور تعمیری دونوں زمانوں میں لازمی طور پر مالیات کسی نہ کسی پالیسی کے مطابق چلتی ہے۔ (۳) جنگی اور تعمیری مالیات میں تیسری اہم مناسبت یہ ہوتی ہے کہ بہت بڑے پیمانے پر کام شروع کیے جاتے ہیں۔ عظیم منصوبوں کو عمل میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جاتی ہیں۔ اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ جنگ کے زمانے میں چوں کہ تباہی بہت ہوتی ہے اس لیے اسی کے مطابق اخراجات کا پیمانہ بھی تعمیری زمانے کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔

یہ تو مناسبت کا حال ہوا۔ اب فرق ملاحظہ فرمائیے۔ (۱) تعمیری زمانے کی مالیات لازماً "تعمیری" ہوتی ہے۔ تخریب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا، چاہے فوری نتائج کے نقطۂ نظر سے دیکھیے یا آیندہ کے خیال سے۔ ہر حال میں اس کا مقصد تعمیر ہی ہوتا ہے۔ جنگ کے زمانے کی مالیات میں ظاہر ہے کہ یہ بات نہیں ہوتی۔ تعمیری زمانے کے منصوبوں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ عوام کی زندگی میں خوش حالی پیدا کی جائے۔ برخلاف اس کے جنگ کے زمانے میں تو صرف یہ فکر رہتی ہے کہ عوام کو کس طرح دشمن کے حملے سے یا محکومی سے بچایا جائے۔ تعمیری زمانے میں چوں کہ ریاست کا وجود خطرے میں نہیں ہوتا اور نہ آزادی چھن جانے کا ڈر رہتا ہے اس لیے لوگوں کے سامنے یہ سوال نہیں ہوتا کہ اگر پوری قربانی نہیں کی جائے گی تو سب کچھ ہاتھ سے چلا جائے گا۔ (۲) چناں چہ ایسی حالت میں جنگ کے زمانے کی طرح ایک تکلیف دہ قسم کی عجلت کا سامنا نہیں ہوتا اور نہ اس بات کی ضرورت رہتی ہے کہ اس عجلت کے اہم تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اشیا کا استعمال جہاں تک ممکن ہو سکے کم کیا جائے۔ (۳) تیسرا سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ جنگ کے زمانے کی مالیات کم و بیش پورے طور پر حکومت کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن تعمیری زمانے میں مالیات کی تنظیم میں حکومت کا محض تھوڑا سا حصہ ہو سکتا ہے بقیہ حصہ افراد کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ تعمیری زمانے کی مالیات کے ذرائع اور طریقۂ حصول دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھنے کے بعد آگے چل کر کسی ابہام یا الجھن کی گنجایش نہیں رہتی۔

تعمیری زمانے کی مالیات کے مندرجہ ذیل ذرائع ہیں:- (۱) تمام اخراجات کے بعد ملک کی سالانہ آمدنی کا جو حصہ بچ رہتا ہے دوسرے لفظوں میں اس سے مراد ہے سال بھر میں جتنی محنت اور خدمات صرف ہوئی ہیں اور جتنا مال پیدا ہوا ہے اُن سب کی مجموعی

قیمت بہ شرطیکہ ان میں سے کچے مال کی جو قیمت دی گئی وہ اصل فرسودگی کا بھتا وغیرہ منہا کر دیا گیا ہو۔ (۲) ملک کے اندر جمع شدہ سرمایہ۔ یہ جمع شدہ سرمایہ مختلف شکلوں میں ہو سکتا ہے، مثلاً سونا، عمارتیں، کارخانے، فنی چیزیں وغیرہ وغیرہ۔ (۳) غیر ملکوں میں جمع شدہ قرضوں کی رقمیں یا غیر ملکوں میں لگے ہوئے سرمائے۔ (۴) دوسرے ملکوں سے حاصل کیا ہوا قرضہ جو تعمیری کاموں کے لیے لیا گیا ہو۔ کسی ایسے ملک کے لیے جہاں تعمیری کام بڑے پیمانے پر ہو رہے ہوں ضروری ہے کہ ان تمام ذرائع سے زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس آمدنی کا زیادہ سے زیادہ حصہ تعمیری کاموں میں صرف کیا جائے۔ ایسی حالت میں یہ بھی ضروری ہے کہ ملک میں پیداوار زیادہ ہو اور اس کو خرچ کم کیا جائے، سرمایے کا زیادہ حصہ تعمیری کاموں میں لگایا جائے اور فوری طور پر بہت کم حصہ خرچ کیا جائے۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ تعمیری کاموں کو آگے بڑھانے کے لیے غیر ملکوں میں لگے ہوئے سرمایے اور اشیا کو فروخت کر دیا جائے۔ دوسرے ملکوں سے پچھلے قرضے وصول کیے جائیں اور قرض بھی لیے جائیں۔ اس طرح تعمیری منصوبوں کو عمل میں لانے کے لیے مختلف مالی ذرائع کو کام میں لانے کی کوشش کی جائے۔

اب ہم "طریقۂ حصول" سے بحث کریں گے۔ جہاں تک حکومت کا سوال ہے تعمیری دور میں بھی وہی طریقۂ حصول کام میں لائے جاتے ہیں جو جنگ کے زمانے میں لائے گئے یعنی ٹیکس لگانا، قرضے لینا، افراطِ زر سے کام لینا۔ تعمیری کاموں کے لیے رقمیں جمع کرنے کے لیے ان تمام طریقوں سے مجموعی یا علاحدہ علاحدہ طور پر کام لیا جا سکتا ہے۔ جنگ کے فوراً ہی بعد تعمیری کام شروع کرنے کے لیے نئے نئے ٹیکس لگانے یا پرانے ٹیکسوں کی شرح بڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ صرف اتنا کافی ہے کہ جنگ کے زمانے میں جو ٹیکس رائج کیے گئے تھے انھیں منسوخ نہ کیا جائے بلکہ جاری رکھا جائے اور ان سے پیدا ہونے والی آمدنی کو تعمیری امور میں صرف کیا جائے۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ کسی طویل جنگ کے اختتام پر مزید ٹیکس کی زیادہ گنجایش بھی نہیں ہوتی ایسی حالت میں تعمیری اخراجات کے لیے قرض لینے کا طریقہ زیادہ مناسب خیال کیا جاتا ہے۔ جہاں تک افراطِ زر کا سوال ہے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ آمدنی کے حصول کا کوئی آزاد اور خود مختار ذریعہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک قسم کا پوشیدہ ٹیکس ہے جو ایک عجیب غیر منظم اور غیر منصفانہ انداز میں لوگوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ جنگ کے زمانے میں لوگ اسے لابدی چیز سمجھ کر چاہے قبول کریں، لیکن امن کے زمانے میں اس کا جاری رکھنا کوئی بھی پسند نہ کرے گا۔

مندرجہ بالا بنیادی باتوں کی روشنی میں اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ملک کی معاشی منصوبے بندی کے لیے جو مختلف پلان پیش کیے گئے ہیں ان میں مالیات کے حصول کی کیا تجویزیں سوچی گئی ہیں۔ اب تک جتنے پلان ہمارے سامنے پیش کیے گئے ہیں وہ مختلف نقطۂ نظر اور مختلف طریقۂ فکر کے حامل ہیں، ہر پلان کی مدت بھی الگ الگ ہے۔ پھر کس سمت میں منصوبے بندی کو عمل میں لایا جائے، اس لحاظ سے بھی ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان تمام اختلافات کا اظہار ان تجویزوں میں بھی ہوا ہے جو مالی ذرائع کے

حصول کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ ذیل کے جدول سے یہ ظاہر ہوجائے گا کہ ہر پلان میں مالیات کے کن ذرائع سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہو۔

بمبئی پلان (پندرہ سالہ)

(۱) وہ دولت جو ذخیرے کی شکل میں جمع ہو	۳ ارب روپے
(۲) اسٹرلنگ تحفظات (یعنی برطانیہ پر ہندستان کا قرضہ)	۱۰ ارب روپے
(۳) تجارتی منافع	۶ ارب روپے
(۴) غیر ملکوں سے قرضہ	۷ ارب روپے
(۵) بچت کی رقمیں	۴۰ ارب روپے
(۶) تخلیق شدہ زر	۳۴ ارب روپے
میزان	ایک کھرب روپیہ

قومی پلان (دس سالہ)

(۱) محصولِ جایداد وغیرہ	۸ ارب ۱۰ کروڑ روپے
(۲) اسٹرلنگ تحفظات	۴ ارب ۵۰ کروڑ روپے
(۳) زمینوں کو قومی ملکیت میں لانے کے بعد جو آمدنی پیدا ہوگی	۹۰ کروڑ روپے
(۴) زراعت کی بچت کا وہ حصہ جو سرمایے کے طور پر لگایا جاسکے۔	۱ کھرب ۸ ارب ۱۶ کروڑ روپے
(۵) صنعتوں کی بچت کا وہ حصہ جو سرمائے کے طور پر لگایا جاسکے۔	۲۸ ارب ۴۳ کروڑ روپے
میزان	ایک کھرب ۵۰ ارب روپے

گاندھی پلان (دس سالہ)

(۱) ملک کے اندر ہی سے جو قرضے لیے جائیں	۲۰ ارب روپے
(۲) ٹیکسوں کی آمدنی	۵ ارب روپے
(۳) تخلیق شدہ زر	۱۰ ارب روپے
میزان	۳۵ ارب روپے

حکومت ہند کا پلان (پنج سالہ)

(۱) مرکزی حکومت کی بچتیں	۵ ارب روپے
(۲) مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے لیے ہوئے قرضے	۵ ارب روپے
(۳) انفرادی سرمایہ کاری کے واسطے لیے جانے والے قرضے	۵ ارب روپے
میزان =	۱۵ ارب روپے

ان پلانوں میں ذرائع آمدنی کا کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ حکومت ہند کے پلان میں اسٹرلنگ تحفظات کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے۔ لیکن گاندھی پلان کی طرح حکومتِ ہند کے پلان میں اسٹرلنگ تحفظات کو ایک ناقابلِ اعتبار ذریعہ خیال کرکے جان بوجھ کر نہیں چھوڑا گیا ہے۔ تخلیق شدہ زر پر مبنی پلان اور گاندھی پلان دونوں میں زور دیا گیا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ گاندھی پلان والے یہ کہتے ہیں کہ قومی حکومت بن جانے کے بعد تخلیق شدہ زر سے مہنگائی اور دیگر مشکل مسائل پیدا ہوسکتے ہیں اس لیے قیمتوں پر مکمل نگرانی کی ضرورت پیش آئے گی۔ قومی پلان کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ اس میں تو یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ پلان کے عمل میں آنے کے بعد صرف چار سال تک باہر سے زر کی ضرورت ہوگی، لیکن اس کے بعد خود منصوبے بندیوں سے اتنی آمدنی پیدا ہونے لگے گی کہ تمام تعمیری امور مالی امداد سے بے نیاز ہوجائیں گے اور منصوبے بندیاں اپنی کفالت آپ کرنے لگیں گی۔ یہ آمدنی زراعت اور صنعت کی ان بچتوں سے پیدا ہوگی جو سرمایے کے طور پر لگائی جائیں گی۔ صرف شروع میں البتہ اوپر سے مالی امداد کی ضرورت پیش آئے گی جس کے لیے مندرجۂ ذیل ذریعے بتلائے گئے ہیں: قومی ملکیت کے تحت لائی جانے والی زمینوں کی آمدنی۔ اسٹرلنگ تحفظات اور مختلف محصولات کی آمدنی مثلاً محصولِ جائداد، فوتی محصولات وغیرہ۔ حکومت ہند کی منصوبے بندی رپورٹ میں مرکزی بچتوں کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بچتیں اسی وقت ممکن ہیں کہ دفاعی امور میں اخراجات کم ہوجائیں، صنعتی پیدائش میں اضافہ ہو اور عام روزگار کی صورت پیدا ہو۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان تمام پلانوں میں ذریعۂ آمدنی اور طریقۂ حصول کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے جس سے ان کا آپس میں موازنہ کرنا مشکل ہوگیا ہے۔

تعمیری مالیات کی مقدار اور طریقۂ حصول کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ تمام مختلف ذرائع کے علاحدہ علاحدہ تخمینے پیش کیے جائیں۔ قومی آمدنی کیا ہے؟ ملک کے اندر اور باہر کتنا سرمایہ لگا ہوا ہے؟ غیر ملکوں سے کتنی رقم قرض کے طور پر حاصل کی جاسکتی ہے؟ ان تمام باتوں کا اندازہ لگانا منصوبے بندی کے شروع میں اور اس کے درمیانی عرصے میں بہت ضروری ہے۔ اس وقت ان میں سے بیشتر باتوں کے متعلق صحیح صحیح تخمینوں کا فقدان ہے۔ سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں برطانوی ہند کی قومی آمدنی کا اندازہ ۴۳ ارب روپے لگایا گیا ہے۔ لیکن ملک کے اندر کتنا سرمایہ مہیا ہوسکتا ہے اس کا ایک عام تخمینہ بھی ہمارے پاس موجود نہیں

ہے۔ اگرچہ یہ کہا گیا ہے کہ اس وقت ۳ ارب رُپے کے قریب ذخیرے کے طور پر لوگوں کے پاس جمع ہیں۔ ہندستان میں لگے ہوئے غیر ملکی سرمایے کے متعلق بھی کچھ اسی قسم کا اندازہ ہے۔ اس سلسلے میں ان مشینوں، کلوں اور دیگر اشیائے اصل کی بڑی اہمیت ہے جو جنگ کے دوران میں ہندستان میں لائی گئی تھیں اور جن سے اب تعمیری کام لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اُن کی قیمت کا ایک عام اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ اسٹرلنگ قرضے کی رقم ۱۵ ارب سے اوپر ہے۔ اس کا اندازہ ٹھیک ٹھیک نہیں کہ غیر ملکوں سے کتنا قرض حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ متذکرہ بالا آمدنیوں کا محض تھوڑا سا حصہ تعمیری کاموں کے لیے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندستان جیسے غریب ملک میں، خاص کر جنگ کے بھاری اخراجات کے بعد، خرچ سے جو رقم بچ رہتی ہے وہ بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ جب ملک کی ترقی و تعمیر کی اسکیمیں زیر عمل آ جائیں گی تو بچت کے سرمایے میں لازمی طور پر اضافہ ہوگا۔ اسکیمیں جتنی تیزی کے ساتھ عمل میں آئیں گی اُتنی ہی تیزی کے ساتھ سرمایے میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ چناں چہ ضروری ہے کہ ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے شروع کے چند سالوں میں جو رقمیں اکٹھا کی جائیں وہ پچھلی بچتوں سے حاصل کی جائیں اور نئے قرضوں سے، لیکن عام اور روزمرہ کے اخراجات میں کمی نہ کی جائے۔

اوپر کی سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق زیادہ تر طویل عرصے کی تعمیری اسکیموں کے مالیات سے ہے۔ اُن کے علاوہ عارضی منصوبوں کے لیے بھی مالیات کی ضرورت ہوگی۔ یہ عارضی منصوبے دو مقصد سے فوری طور پر عمل میں لائے جائیں گے، ایک موجودہ روزگار کے حالات کو برقرار رکھنا، دوسرے یکلخت سرد بازاری کے رجحانات کو آگے بڑھنے سے روکنا جو حکومت کی جنگی خریداریوں کے بند ہو جانے سے لازمی طور پر پیدا ہوں گے۔ عارضی منصوبوں کی مالیات کے ذرائع یہ ہیں :- (۱) قرضے (۲) صوبائی حکومتوں کے خاص تعمیری فنڈ (۳) انفرادی بچتیں۔ حکومت ہند سے بھی صوبائی حکومتوں کو مالی امداد دی جائے گی۔

عارضی منصوبوں سے ایک خطرہ یہ ہے کہ روزگار کے حالات کو برقرار رکھنے کی فوری اور عارضی کوششوں میں جن سے یقینی طور پر خرچ شدہ رقموں کے واپس آنے کی امید نہیں ہے کہیں بہت زیادہ سرمایہ نہ لگ جائے۔ اس لیے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ عارضی منصوبوں کے سلسلے میں تمام مالی ذرائع محض روزگار پیدا کرنے میں نہ صرف کر دیے جائیں۔ یہ ضروری نہیں کہ عارضی منصوبوں سے مستقل پیداوار اثاثے وجود میں آ جائیں لیکن اتنا ضروری ہونا چاہیے کہ عارضی منصوبے ایسے ہوں جن سے سماجی خوش حالی پیدا ہو اور قومی آمدنی میں بالواسطہ طور پر اضافہ ہو۔ عارضی منصوبے بندیوں کے سلسلے میں افراطِ زر کی حالت کو برقرار رکھنا یا اس میں اور اضافہ کرنا بہت بُرے نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

عام طور پر لوگ یہ نہیں محسوس کرتے کہ ملکی مالیات کا جو حصہ حکومت کی نگرانی میں صرف ہوگا وہ اُس حصے کے مقابلے میں بہت کم ہوگا جو انفرادی ہاتھوں میں رہے گا اور انفرادی ہی نگرانی کے تحت ملکی معیشت کے سنوارنے میں خرچ ہوگا۔ ملکی مالیات کا بڑا

حصہ اسی وقت حکومت کی نگرانی میں آسکتا ہے جب ملک میں بنیادی سیاسی اور معاشی تبدیلیاں ہوجائیں اور حکومت کے فرائض اور عمل کا دائرہ بہت وسیع ہوجائے۔ انفرادی ہاتھوں میں جو سرمایہ ہے اس کی اتنی بڑی اہمیت ہے کہ عارضی طور پر روزگار کے حالات پیدا کرنے اور کلفت سرمایہ داری کے رجحانات کو روکنے کے لیے بھی انفرادی سرمایے کو تحریک میں لانا پڑے گا۔ یہ انفرادی سرمایہ کاروباروں، کمپنیوں میں اور مالکانِ صنعت اور دوسرے افراد کے ہاتھوں میں بے کار پڑا ہوا ہے۔ یہ بڑی بڑی رقمیں موزوں اور مناسب نکاسی کا انتظار کر رہی ہیں۔ اس عظیم سرمایے کو کام میں لانے اور کاروبار میں لگانے کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہے وہ یہ ہیں:- حکومت کی طرف سے عارضی مالی تحفظ کا انتظام، جنگ کے زمانے کے کنٹرول اور پابندیوں کا ہٹ جانا، زائد منافع ٹیکس کا اٹھ جانا[1]، رسل و رسائل کی آسانی، حکومت کی طرف سے امدادی فنڈ کی منظوری، ملک کے سیاسی اور دستوری مسائل کا حل ہوجانا۔ اتنی باتیں اگر ہوجائیں تو تمام انفرادی سرمایے فوراً کارآمد ہوجائیں گے، کاروبار ترقی کرنے لگے گا اور عام روزگار کے حالات پیدا ہوں گے۔ لیکن انفرادی سرمایے کے تحریک میں آنے کے بعد خطرہ یہ رہتا ہے کہ ان کا زیادہ حصہ آپس کی مقابلے بازی میں نہ برباد ہوجائے۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ انفرادی سرمایے پہلے سے طے کیے ہوئے راستوں پر صَرف کیے جائیں۔ اور سرمایہ کاری پر نگرانی اور کنٹرول کے ذریعے خاص خاص منصوبوں کے مطابق اُن کی نکاسی کی جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انفرادی کاروبار کے حدود کا تعین کرنا بہت ضروری ہوگا تاکہ مخصوص کاروباری شعبوں اور مخصوص علاقوں میں انفرادی کاروبار ایک خاص کوٹا اور ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ سرمایہ کاری کی نگرانی کا اصول منصوبی تنظیم و تعمیر کے لیے بہت مفید ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ حکام اور افسر شاہی کے نکمے پن اور بے ایمانی کی وجہ سے یہ اصول عملی لحاظ سے کامیاب نہ ہو۔

طویل عرصے کے تعمیری اور تنظیمی منصوبوں کو عمل میں لانے کے لیے اسٹرلنگ[2] قرضوں سے سب سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اسٹرلنگ قرضے کے بعد سب سے بڑا مالی ذریعہ یہ ہے کہ غیر ملکوں سے قرضے لیے جائیں۔ موجودہ حالات میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے اگر قرض لینے کی کوشش کی جائے تو وہ لازمی طور پر ایسی شرطیں پیش کرے گا جو ہندستان کے لیے ناقابلِ قبول ہوں گی۔ اس لیے بہتر صورت یہ ہوگی کہ بین اقوامی بینک کے ذریعے قرض لینے کی کوشش کی جائے۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اگرچہ تنظیمی اور تعمیری کاموں کو شروع کرنے کے لیے غیر ملکوں سے قرض لینا ضروری ہے لیکن اسی پر بہت زیادہ یا کامل طور پر بھروسا کرنا بہت خطرناک ہوگا۔ اس لیے کہ ایسی حالت میں تمام تعمیری امور غیر ملکوں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔

---

[1] حکومت ہند نے نئے بجٹ میں اس ٹیکس کو منسوخ کردیا ہے۔

[2] "معاشیات" کی مارچ اور اپریل کی اشاعتوں میں اسٹرلنگ قرضوں پر کافی بحث کی جاچکی ہے۔

اس لیے طویل عرصے کی منصوبے بندیوں کے لیے ضروری ہے کہ خود اندرونِ ملک کے ذرائع اور وسائل پر بھروسا کیا جائے۔ اور اندرونِ ملک کا سب سے اہم ذریعہ ہے وہ گزشتہ اور موجودہ بچتیں جو پیدائش اور خرچ کی تفریق سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس وقت یہ بچتیں کم ہیں لیکن جب ایک بار منصوبوں پر عمل شروع ہو جائے گا تو اُن کی مقدار بڑھنے لگے گی۔ اور آگے چل کر مالی امداد کا ایک لامتناہی اور بیش بہا ذخیرہ ثابت ہوں گی۔

عارضی منصوبے بندی کی طرح طویل عرصے کی منصوبے بندی میں بھی مالی ذرائع کو ہمیں دو حصّوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ ایک وہ جو حکومت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور دوسرا انفرادی۔ جو عام باتیں عارضی منصوبوں کی مالیات کے متعلق کہی گئی ہیں وہی مؤخر الذکر پر بھی صادق آتی ہیں۔ لیکن یہاں پر ایک اور چیز کا اضافہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ طویل عرصے کے تعمیری اُمور کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے پورے ٹیکس نظام کی از سرِ نو تنظیم کی جائے تاکہ کچھ ایسے ذرائع آمدنی کو ٹیکس کے تحت میں لایا جا سکے جو ابھی تک اس کی زد سے محفوظ ہیں یا پورے طور پر کام میں نہیں لائے جا سکے ہیں۔ ضروریات کو ذرائع اور وسائل سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری ہوگا۔

جنگ اب ختم ہو چکی ہے اس لیے اب مرکزی حکومت کی خریداریاں کم ہوتی جائیں گی اور صوبائی حکومتوں کی خریداریاں بڑھیں گی۔ لیکن صوبائی حکومتوں کے زمانۂ جنگ والے ذرائع آمدنی اب ختم ہو جائیں گے اس لیے کہ جنگ کے بعد زرعی اشیا کی قیمتیں کم ہو جائیں گی، انکم ٹیکس میں صوبوں کے حصّے بھی کم ہو جائیں گے اور فوجی ضروریات کے لیے جنگلاتی اشیا کی فروخت بھی ختم ہو جائے گی۔ لیکن تمام صوبوں کے سامنے اس وقت پنج سالہ منصوبے بندی کا پروگرام ہے جس میں کوئی ۸ ارب ڈیڑھ کے خرچ کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ کچھ صوبوں نے تو مثلاً بنگال نے اپنے مالی ذرائع اور وسائل کا بھی صحیح صحیح اندازہ لگا لیا ہے۔ لیکن بہت سے صوبے مرکزی حکومت سے مالی امداد کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ان باتوں کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ مرکز اور صوبوں کے درمیان ذرائع آمدنی کی جو موجودہ تقسیم ہے اُس پر نظرِ ثانی کی جائے۔ اب موقع آ گیا ہے کہ ہر صوبہ اور ہر دیسی ریاست یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرے کہ تعمیر و توسیع کے پہلے پانچ سالوں میں اُس کی آمدنی کیا ہوگی اور تعمیری اخراجات برداشت کرنے کی اُس کے اندر کتنی صلاحیت موجود ہے۔ پھر نئے ٹیکسوں اور حکومت کے جاری کیے ہوئے کاروبار کی آمدنیوں کی بھی باقاعدہ تنظیم کرنے کی ضرورت ہے جس کے دو مقصد ہونے چاہییں۔ ایک تو حکومت کی آمدنی میں اضافہ کرنا اور دوسرے تمام صوبوں پر ٹیکسوں کے بوجھ کی منصفانہ انداز میں تقسیم کرنا۔ یہ اصول قائم کیا جائے کہ جو صوبہ پورے طور پر اپنے ٹیکس کے تمام ذرائع کام میں لانے کے لیے تیار نہیں ہے

---

[1] مرکزی حکومت کے سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء کے بجٹ میں ٹیکسوں میں ردّ و بدل کیا گیا ہے اور ایک تحقیقاتی کمیٹی بھی تشکیل کی گئی ہے کہ وہ پورے ٹیکس نظام کی جانچ پڑتال کرے۔

اسے مرکز سے مالی امداد نہ دی جائے۔ جہاں تک ملک کے اندر قرضے جمع کرنے کا سوال ہو یہ طریقہ زیادہ مناسب ہوگا کہ جب تک معاشی تعمیر کا کام جاری رہے پورے ملک کو ایک واحد علاقہ قرار دیا جائے۔ اور قرضے جمع کرنے کے لیے ایک خاص تنظیم وجود میں لائی جائے جس کا کام رقمیں وصول کرنے کے علاوہ صوبوں اور حکومتوں میں اُن کی مناسب تقسیم کرنا بھی ہو تقسیم کے سلسلے میں ہر صوبے کی ضروریات کا خیال رکھنا ضروری ہو۔

حکومتِ ہند نے منصوبے بندی کے لیے اخراجات کے تعین کا طریقہ بالکل اُلٹا اختیار کیا ہو۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پہلے تعمیر و توسیع کی مقدار کا اندازہ لگا لیا جاتا اُس کے بعد ضروری اخراجات کا تعین عمل میں آتا، لیکن حکومتِ ہند نے یہ کیا کہ پہلے ہی تنظیمی شعبوں میں کروڑوں روپے تقسیم کر دیے، اس کے بعد اُن شعبوں سے کہا گیا کہ ان بڑی بڑی رقموں کے خرچ کا پلان بنائیں۔ اس طور پر ہر اسکیم کے نتائج کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ حکومتِ ہند نے جو اسکیمیں بنائی ہیں وہ مالیاتی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں اور اسکیم اور اخراجات میں گہری مناسبت اور مطابقت نہیں ہو۔ یہ صحیح ہو کہ حکومت کی ہر اسکیم کو نفع یا نقصان کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا، اس لیے کہ ذاتی کاروبار اور حکومت کے کام میں بہت فرق ہوتا ہو؛ حکومت کے پیشِ نظر عام کاروباری آدمیوں کی طرح نفع و نقصان کا سوال نہیں ہوتا۔ لیکن اگر حکومت بھی اپنی اسکیموں کو اسی نظر سے دیکھے تو اچھا ہی ہوگا، بُرا نہیں ہوگا۔ حکومت کے مقصد کے مختلف ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ذرائع اور وسائل کے استعمال میں کفایت سے کام نہ لیا جائے۔ کاروباری آدمی کے لیے نقصان اٹھانے کے بعد بازار میں جگہ نہیں رہ جاتی۔ لیکن حکومت پے در پے نقصان اُٹھانے کے باوجود اپنے منصوبوں اور کاروبار کو جاری رکھ سکتی ہو اور اس کے لیے وجہِ جواز بھی موجود ہو اور وہ یہ کہ حکومت کا مقصد نفع کمانا نہیں ہوتا بلکہ پبلک کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہو۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہو کہ اگر حکومت نقصان بھی اُٹھائے تو سوچ سمجھ کر، اندھا دھند نہیں۔ ذرائع کے استعمال میں کفایت کو راہ دینا چاہیے۔ اور حکومت کے ظاہری جوش و خروش کی تہ میں مخصوص اصولوں اور طریقوں کا کارفرما رہنا ضروری ہو۔

تجارت

ہندستان کی تجارتِ خارجہ

از: ــــــــــ ہاشمی

۱۹۱۴-۱۸ء کی عالم گیر جنگ سے پہلے ہندستان برطانوی معیشت کا طفیلی تھا۔ یعنی ہندستان برطانیہ کو کچا مال دیتا تھا اور برطانیہ ہندستان کے بازاروں کو اپنے صنعتی مال و اسباب سے بھر دیتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد برطانیہ سے ہندستان میں داخل ہونے والے تجارتی مال پر پہلی مرتبہ کچھ محصول عائد کیے گئے جن کا مقصد صرف حکومتِ ہند کی آمدنی میں اضافہ کرنا تھا اور کچھ نہیں۔ اِس درمیان میں ہندستان میں کپڑے کی ملیں اور کارخانے قائم ہونے شروع ہو گئے تھے۔ چناں چہ ان کی ترقی و توسیع کو روکنے کے لیے حکومتِ ہند نے روئی پر چنگی محصول لگا دیا۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی اور ہندستان میں برطانوی معیشت کے تباہ کن نتائج اور اثرات کو ختم کرنے کے لیے احتجاجی تحریک شروع ہوئی۔ اس زمانے کے حالات کے تحت ہندستان کے لیے صرف ایک راستہ تھا اور وہ یہ کہ جہاں تک ہو سکے ہندستان کے لوگ یہیں کا بُنا ہوا کپڑا استعمال میں لائیں اور برطانوی مال کا بائیکاٹ کریں۔

۱۹۱۴-۱۸ء کی عالم گیر جنگ کے دوران میں ہندستان میں تیزی کے ساتھ صنعت و حرفت کی ترقی ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کے بعد ہندستان، دُنیا کے خاص خاص صنعتی مُلکوں میں شمار کیا جانے لگا۔ ۱۹۲۲ء میں جمیعت اقوام[1]

---

[1] مرحوم

نے باقاعدہ طور پر تسلیم کرلیا کہ ہندستان دنیا کے آٹھ صنعتی ملکوں میں سے ایک ہے۔ اسی بنا پر بین الاقوامی مزدور تنظیم کی انتظامی مجلس میں بھی ہندستان کو ایک نشست مل گئی۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد آنے والے چند سال کا زمانہ صنعتی اور تجارتی گرم بازاری کا زمانہ تھا چناں چہ اس عرصے میں ہندستان کی صنعت، زراعت اور تجارت کو اور بھی ترقی نصیب ہوئی۔ اور نہ صرف سلطنتِ برطانیہ کے ملکوں سے بلکہ جرمنی، امریکہ، جاپان اور دوسرے ملکوں سے بھی ہندستان کی تجارت بڑھنے لگی۔ جرمنی، اٹلی، جاپان، امریکہ اور فرانس آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر ہندستان پر سے برطانیہ کی سیاسی گرفت ڈھیلی پڑ جائے تو انھیں ہندستان سے بڑے پیمانے پر تجارتی منفعت حاصل ہوسکتی ہے۔ چناں چہ مالی اور تجارتی لحاظ سے برطانیہ کے ماتحت ہوتے ہوئے بھی ہندستان کو دنیا کے ملکوں سے تجارت کرنے اور اُن کے بازاروں سے فائدہ اٹھانے کے نئے نئے راستے سُجھائی دینے لگے۔ یہ حال سنہ ۱۹۲۹ء تک پورے زور شور سے قائم رہا۔ سنہ ۱۹۲۹ء سے عالم گیر معاشی بحران کی ابتدا ہوئی جس کے نتیجے کے طور پر برطانیہ سنہ ۱۹۳۱ء میں اپنے سکّے کو سونے کے معیار سے ہٹا لینے پر مجبور ہوگئی۔ ہندستان کا سکّہ یعنی روپیہ برطانوی سکّے سے بندھا ہوا تھا۔ برطانیہ نے جان بوجھ کر اس لیے یہ پالیسی روا رکھی تھی کہ ہندستان کے وسیع بازار برطانوی مال کے لیے مخصوص رہیں اور سلطنت برطانیہ کے باہر کے ملکوں سے ہندستان کی تجارت ترقی نہ کرسکے۔ چناں چہ پونڈ کے سونے کے معیار سے ہٹ جانے کے بعد ہندستان کی تجارتِ خارجہ پر تباہ کن اثرات کا پڑنا لازمی تھا۔

برطانیہ کی تباہ کن پالیسی اور اس کی معاشی غلامی کے خلاف ہندستان میں برطانوی مال کا بائیکاٹ شروع ہوا جس کے خاطر خواہ نتیجے برآمد ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۴ء سے پہلے کے مقابلے میں برطانیہ سے سوتی مال کی درآمد میں ۱۱ فی صد کی کمی ہوگئی، ریشمی مال کی درآمد میں ۲ فی صد کی اور شکر میں ۳ فی صد کی۔ لوہے کے برتنوں کی درآمد میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ معدنی تیلوں کی درآمد میں ۲ فی صد کا اضافہ ہوا۔ تفریحی اور دیگر اشیا میں ۱۰ فی صد کا۔ لوہے اور اسٹیل کی بنی ہوئی مشینوں کی آمد میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی۔ دیگر مشینوں کی درآمد دوگنی ہوگئی۔ یہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ مشینوں کی درآمد میں کمی کا نہ ہونا یا اُس میں اضافہ ہونا ہندستان کے لیے مفید تھا۔ اس لیے کہ مشینوں ہی کی مدد سے صنعت کو ترقی دے کر ہندستان کو غیر ملکی مال سے بے نیاز کیا جاسکتا تھا۔ پھر اس کے مقابلے میں سوتی اور ریشمی مال اور شکر کی درآمد کا کم ہوجانا بھی ہندستان کی صنعتی ترقی کے لیے بے حد مفید تھا۔

یہ تو درآمد کا حال ہوا اب برآمد کی طرف آئیے۔ سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی عالم گیر جنگ سے پہلے کے مقابلے میں سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء میں روئی اور جوٹ کی برآمد میں ترتیب وار ۷ فی صد اور ۲۶ فی صد کے اضافے ہوئے۔ چائے کی برآمد ۲۲ فی صد بڑھ گئی۔ مندرجۂ ذیل چیزوں کی برآمد میں کمی پیدا ہوئی:-

اناج	۱۰ فی صد

تیل کے بیج	۳ فی صد
کھال اور چمڑا	۴ "
دوسری چیزیں	۱۱ "

اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندستان اب اپنے کچے مال کا بہت سا حصہ خود ہی استعمال کرنے لگا تھا اور اب ان چیزوں کو زیادہ تعداد میں غیر ملکوں میں بھیجنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ یہ بات ہندستان کی صنعتی ترقی کے لیے صحت مندی کی نشانی تھی۔

اس دوران میں ایک اور نئی بات پیدا ہوئی جو ہندستان کی تجارت کے لیے مفید تھی۔ ہندستان کے بازاروں میں برطانیہ کی اجارہ داری آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی۔ پہلی عالم گیر جنگ سے پہلے کے مقابلے میں برطانیہ سے ہندستان کو آنے والے مال کی اوسط میں ۲۰ فی صد کی کمی ہوگئی۔ یعنی پہلی عالم گیر جنگ سے پہلے ہندستان کی پوری درآمدی تجارت کے ۶۳ فی صد حصے پر برطانیہ کا قبضہ تھا اب برطانیہ کا حصہ ۴۳ فی صد رہ گیا۔ اس کے برخلاف آسٹریلیا اور کنیڈا سے آنے والے مال میں دو فی صد کا اضافہ ہوا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ۴ فی صد زیادہ مال ہندستان کو بھیجنے لگا۔ جرمنی کی ہندستان سے برآمدی تجارت میں ۱ فی صد کا اضافہ ہوا۔ اور دوسرے ملکوں کی تجارت میں ۵ فی صد کا اور جاپان سے آنے والے مال میں تو ایک دم سے پانچ گنا اضافہ ہوگیا۔

جہاں تک ہندستان سے باہر جانے والے مال میں غیر ملکوں کے حصوں کا سوال ہے اس کے اعداد و شمار یہ ہیں۔ برطانیہ کا حصہ سنہ ۱۹۳۰ء میں تین فی صد گھٹ گیا۔ فرانس اور جرمنی کا دو فی صد۔ جاپان کے حصے میں دو فی صد کا اضافہ ہوا۔ اور امریکہ کا حصہ ۴ فی صد بڑھ گیا۔ ہندستان کی برآمدی تجارت کی یہ جغرافیائی تقسیم اس کے لیے مفید ثابت ہوئی۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے دو اہم باتیں صاف ہوجاتی ہیں:۔ ایک تو یہ کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں ہندستان کی بحری برآمدی تجارت کا صرف ۳۵ فی صد حصہ سلطنتِ برطانیہ کے ہاتھوں میں رہ گیا تھا اور بقیہ ۶۵ فی صد حصہ سلطنت برطانیہ سے باہر کے ملکوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ دوسرے ہندستان جتنا مال باہر سے منگواتا تھا اُس کا صرف ۴۳ فی صد حصہ برطانیہ اور اس کے زیرِ اقتدار ملکوں سے آتا تھا اور بقیہ ۵۷ فی صد دوسرے ملکوں سے۔

ہندستان سے برطانیہ کی یہ گھٹتی ہوئی تجارت بڑی حد تک نتیجہ تھی ہندستان کی قومی تحریک اور اس سے پیدا ہونے والے سیاسی تناؤ کا۔ سنہ ۱۹۲۹ء کے عالم گیر معاشی بحران کے بعد ہندستان میں سیاسی تحریک زور و شور پر تھی۔ اور صنعتی مزدوروں میں بھی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے گول میز کانفرنس میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ اور

دوسری گول میز کانفرنس میں ہندستان کے شامل ہونے کے باوجود برطانیہ اور ہندستان میں کوئی سیاسی سمجھوتا نہیں ہوسکا۔ برطانوی اور دوسرے غیر ملکی مال کا بڑے پیمانے پر بائیکاٹ شروع ہوا جس سے ہندستان میں صنعتوں کو اور خاص طور پر کپڑے کی صنعت کو زبردست ترقی حاصل ہوئی۔ ہندستان کی بائیکاٹ کی تحریک نے برطانیہ اور جاپان دونوں کو نقصان پہنچایا۔

۱۹۰۸ء میں ہندستان میں ۴۷ کروڑ گز سوتی کپڑے بنے گئے۔ اس کے مقابلے میں ۱۹۳۰ء میں دو ارب ۲۸ کروڑ گز کپڑے تیار ہوئے۔ لیکن حیرت کی بات ہو کہ اس عرصے میں ہندستان میں باہر سے جتنا کپڑا آتا تھا اُس میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی۔ ۱۹۰۸ء میں غیر ملکوں سے ۱ ارب ۴۲ کروڑ گز کپڑا ہندستان آیا۔ اور ۱۹۳۰ء میں ایک ارب ۹۰ کروڑ گز۔ گویا کُل ملاکر صرف ۴ کروڑ گز کپڑے کی درآمد کم ہوئی۔

۱۹۱۳ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیانی عرصے میں ہندستان کو چند خاص قسم کے سوتی کپڑے بھیجنے کے معاملے میں مقابلہ بڑھتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۰ء میں انگلستان کی حالت ان سوتی کپڑوں کے سلسلے میں بہت پتلی ہوگئی۔ اور جاپان آہستہ آہستہ ہندستان کے کپڑے کے بازاروں پر قبضہ کرتا گیا۔

برطانیہ کی پالیسی میں تبدیلی ہندستان سے اپنے تجارتی مفاد کے پیش نظر انگلستان بہت ابتدا ہی سے یہ محسوس کررہا تھا کہ ہندستان کے بازاروں کو غیر ملکوں کی دست رس سے محفوظ رکھنے کے لیے "شہنشاہی ترجیح"[1] کی پالیسی پر عمل کرنا ضروری ہو۔ اس شہنشاہی 'ترجیح' کا مطلب یہ ہو کہ ہندستان کے بازاروں میں غیر ملکوں کے مال کے مقابلے میں انگلستان کے مال کو ترجیح دی جائے اور اسی مقصد سے محصولوں میں ردّ و بدل کیا جائے ۱۹۰۷ء میں برطانیہ کے اُس زمانے کے وزیر اعظم نے نو آبادیاتی کانفرنس میں شہنشاہی ترجیح کا سوال اُٹھایا لیکن حکومت ہند کے نمایندے لارڈ انچکیپ مرحوم نے اس کی مخالفت کی اور بتایا کہ اس سے ہندستان کی دوسرے ملکوں سے تجارت خارجہ پر خراب اثر پڑے گا۔ ۱۸-۱۹۱۴ء کی عالم گیر جنگ نے اور اس کے بعد کے واقعات نے یہ واضح کردیا کہ انگلستان کی تجارت کو محفوظ کرنے کے لیے کسی نہ کسی قسم کی "شہنشاہی ترجیح" کو وجود میں لانا سخت ضروری ہو۔ ۱۹۱۶ء کی "مکینا ڈیوٹی" یا ۱۹۲۱ء کا "صنعتوں کے تحفظ کا قانون" اب برطانوی تجارت اور صنعتوں کے تحفظ کے لیے کافی نہیں تھا۔ ۱۹۳۲ء میں بالڈون کی وزارت نے "درآمدی محصولات کا قانون" پاس کیا۔ اس طرح گویا برطانیہ تیزی سے "آزاد تجارت" کی پالیسی سے کنارہ کشی اختیار کررہی تھی۔ ۱۹۲۳ء، ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۰ء میں جو شہنشاہی معاشیاتی کانفرنس منعقد ہوئیں ان میں شہنشاہی ترجیح کے اصول پر زور دیا گیا۔ اس درمیان میں حکومت ہند کو بھی اپنی مخالفت کی پالیسی

[1] IMPERIAL PREFERENEE

بدل دینے پر راضی کر لیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں ہندستان میں "اسٹیل کی صنعت کے تحفظ کا قانون" پاس کیا گیا اور ۱۹۳۰ء میں "سوتی صنعت کے تحفظ کا قانون" وجود میں آیا۔ ان دونوں قانونوں کے تحت ہندستان میں داخل ہونے والے برطانوی مال کو دیگر ملکوں کے مال کے مقابلے میں ترجیح دی گئی۔

سکوں کے سلسلے میں بھی برطانیہ کی پالیسی اب بدل چکی تھی۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہو کہ دونوں گول میز کانفرنسوں کے درمیانی عرصے میں برطانیہ نے اپنا سکہ سونے کے معیار سے ہٹا لیا تھا۔ ہندستان کا سکہ بھی چوں کہ اسٹرلنگ سے بندھا ہوا ہو اس لیے جس تجارتی فائدے کی خاطر برطانیہ نے اپنے سکے کی قیمت گھٹائی تھی اس میں ہندستان کو بھی اپنا حصہ ملا۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس سے ہندستان کی تجارتِ خارجہ کو نقصان ہی پہنچا۔ اگر ہندستان کو آزادانہ طور پر خود اپنے تجارتی مفاد کے پیشِ نظر سکے کی قیمت گھٹانے یا بڑھانے کا مجاز ہوتا تو اُسے زیادہ فائدہ حاصل ہوتا، لیکن ہندستان سیاسی غلامی کی وجہ سے "اسٹرلنگ حلقے" سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اسی درمیان میں جاپان نے بھی اپنے سکے "ین" کی قیمت گھٹا دی اور ۱۹۳۲ء میں اوٹاوا کے مقام پر شہنشاہی معاشیاتی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں آخر "شہنشاہی ترجیح" کے اصول کو پورے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔

اوٹاوا کانفرنس کے سامنے مندرجۂ ذیل مقاصد تھے:۔ (۱) سلطنتِ برطانیہ کے اندر تجارت اور محصولات کی پالیسی میں ردّ و بدل کیا جائے۔ (۲) سلطنت کے اندر جتنے سکے رائج ہیں اُن کے باہمی رشتوں کی جانچ پڑتال کی جائے اور قیمتوں کی عام سطح کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے اور سکوں کے تبادلے میں استقلال اور پائے داری لائی جائے (۳) سلطنتِ برطانیہ کے مُلکوں کے درمیان اور غیر مُلکوں سے تجارتی معاہدوں کے اصول مرتب کیے جائیں۔

اس کانفرنس میں "شہنشاہی ترجیح" کے اصول کو تسلیم کیا گیا اور محصولات وغیرہ کے قوانین میں جو تبدیلی کی گئی اُس سے ہندستان کی تجارتِ برآمد کو سراسر نقصان پہنچا۔ محصولات میں تبدیلی کرنے سے حکومتِ ہند کی آمدنی گھٹ گئی۔

اوٹاوا کانفرنس کے بعد ہی ہندستان اور انگلستان کے درمیان ۲۰ر اگست سنہ ۱۹۳۳ء کو چودہ نکات پر مشتمل ایک معاہدہ وجود میں آیا جس کا تعلق لوہے اور اسٹیل سے تھا۔ لیکن جب اوٹاوا کانفرنس کے فیصلوں نے عملی صورت اختیار کی تو بہت جلد اس معاہدے کا بے کار ہونا ثابت ہو گیا۔ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء میں مرکزی اسمبلی کے ہندستانی ممبروں نے اوٹاوا کانفرنس کے فیصلوں کی مذمت میں ایک تجویز پاس کی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہو کہ اوٹاوا کے معاہدے سے ہندستان کی تجارتِ خارجہ کو کتنا نقصان پہنچا۔

اوٹاوا کے معاہدے میں ایسے مال و اسباب کی ایک فہرست تیار کی گئی تھی جس میں برطانیہ کو ترجیح دی گئی،

سلہ یہ معاہدہ مالٹڈن چیٹرجی معاہدہ کہا جاتا ہو۔

یہی کا نتیجہ ہوا کہ سلطنتِ برطانیہ کے باہر کے ملکوں سے ہندستان کی درآمدی تجارت کو زبردست دھکا پہنچا۔ اس معاہدے کے تحت برطانوی سلطنت سے باہر کے ملکوں سے تجارت گھٹا کر ہندستان کو تو بہت کچھ قربانی کرنی پڑی لیکن اُن قربانیوں کے عوض میں اُسے سلطنتِ برطانیہ کے اندر کے ملکوں سے کوئی تجارتی فائدہ نہیں حاصل ہوا۔ اوٹاوا کے نتیجے کے طور پر جاپان نے ہندستانی روئی کا بائیکاٹ کردیا۔ اس سے جو نازک صورتِ حال پیدا ہوئی اس کو رفع کرنے کے لیے ہندستان کو جاپان کے ساتھ ایک تجارتی معاہدہ کرنا پڑا۔ پھر ہندستان نے ۱۹۳۱ء میں ترکی سے جو معاہدہ کیا تھا وہ اوٹاوا کے راضی نامے کے نتیجے کے طور پر خطرے میں پڑگیا اور ترکی نے خود اپنی طرف سے اس معاہدے کے منسوخ ہوجانے کا اعلان کردیا۔ ۱۹۳۵ء میں رومانیہ نے اپنے بازاروں میں ہندستانی مال کی برآمد بالکل بند کردی اس بنا پر کہ اب ہندستانی بازاروں میں رومانیہ کو آسانیاں نہیں حاصل رہیں۔ اوٹاوا کے راضی نامے کے تحت ہندستان کی درآمدی تجارت کا ایک بڑا حصہ برطانوی مال کے لیے مخصوص کردیا گیا۔ اس طرح دوسرے ملکوں سے ہندستان کی برآمدی تجارت کو سخت نقصان پہنچا۔ ہندستان اُس وقت عالم گیر معاشی بحران کے اثرات سے آہستہ آہستہ نکل رہا تھا لیکن اوٹاوا کے راضی نامے نے اس کی تجارتِ خارجہ کو برباد کرکے عالم گیر بحران کی تباہیوں کو رفع کرنے کے تمام مواقع ہندستان سے چھین لیے۔

اوٹاوا کانفرنس کی مثال سامنے رکھتے ہوئے فرانس نے بھی اپنے تمام نوآبادیاتی بازاروں کو خود اپنے مال کے لیے مخصوص کرلیا۔ جرمنی میں ۳۱ر جنوری ۱۹۳۳ء کو ہٹلر نے چانسلر کے عہدے پر قبضہ کرلیا اور نئی فاشسٹ جماعت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد وہاں بھی تجارتی اجارہ داری اور تجارتی کوٹا بندی کے اُصول پر عمل کیا جانے لگا۔ ۱۹۳۴ء تک جرمنی کے ساتھ ہندستان کو تجارت کرنے میں فائدہ تھا۔ لیکن ۱۹۳۴ء کے آخری تین ماہ سے پہلی بار جرمنی سے تجارت کرنے میں ہندستان کو نقصان پہنچنے لگا۔

اوٹاوا کے بعد ہندستان کی برآمدی تجارت میں جہاں تک ترجیح یافتہ مال و اسباب کا تعلق تھا انگلستان کا حصہ بڑھ گیا۔ ۱۹۳۱ء میں یعنی اوٹاوا سے پہلے انگلستان ۳۳ کروڑ رُپے کا مال ہندستان سے لے گیا اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں یعنی اوٹاوا کے بعد ۴۷ کروڑ رُپے کا۔ دوسرے ملکوں کا مجموعی حصہ اس درمیان میں ۸۷ کروڑ رُپے سے گھٹ کر ۵۸ کروڑ رُپے ہوگیا۔

غیر ترجیح یافتہ مال و اسباب کی تجارت کے سلسلے میں انگلستان کا حصہ ۱۰ کروڑ سے ۱۱ کروڑ رُپے ہوگیا۔ انگلستان کے علاوہ جو ممالک تھے اُن کے مجموعی حصے میں ۱۰ کروڑ رُپے کا اضافہ ہوا۔

یہ تو ہندستان سے باہر جانے والے مال کا حال ہوا۔ اب ہندستان کی درآمدی تجارت کی طرف آیئے۔ درآمد کے سلسلے میں اوٹاوا کے راضی نامے کے نتیجے کے طور پر ہندستان ہر سال ۳۰ لاکھ رُپے سے لے کر ۳۵ لاکھ رُپے سالانہ تک

کا نقصان اُٹھانے لگا۔ یعنی اتنی قیمت کا مال ہندُستان میں داخل ہونا بند ہوگیا۔ برآمد کی تجارت کے سلسلے میں ہندُستان کے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ سلطنتِ برطانیہ کے باہر کے بازار چھن گئے۔

۱۹۳۵ء میں ہندُستان اور برطانیہ کے درمیان ایک تجارتی راضی نامہ وجود میں آیا جو "رُنسی مین مترا" راضی نامے کے نام سے موسوم ہو۔ اس راضی نامے میں جو اصول تسلیم کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں:۔ (۱) ہندُستانی صنعتوں کو انگلستان کے مال سے اتنے زیادہ تحفظ کی ضرورت نہیں جتنا دُوسرے غیر مُلکوں کے مال سے۔ مطلب یہ تھا کہ انگلستان سے جو مال ہندُستان میں داخل ہونا چاہیے اُس پر کم محصول لگایا جائے اور دُوسرے مُلکوں کے مال پر زیادہ۔ (۲) درآمد کے محصولوں کے تعیّن میں حکومتِ ہند کی آمدنی کا خیال رکھا جائے۔ (۳) ہندُستان میں داخل ہونے والے انگلستان کے مال اور غیر مُلکوں کے مال پر محصول میں جو فرق ہو اُس میں کوئی ایسا ردّ و بدل نہ کیا جائے جس سے انگلستان کو نقصان پہنچے۔

۱۹۳۵ء کے دستور حکومتِ ہند میں اوٹاوا کے راضی نامے اور رُنسی مین مترا راضی نامے کے اصولوں کو باقاعدہ طور پر شامل کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندُستان کی آزاد تجارتِ خارجہ پر بدیشی حکومت نے جو تباہ کن پابندیاں لگادی تھیں اُن کی بنیاد اور بھی مضبوط ہوگئی۔

اُس کے بعد ۱۹۳۹ء میں ہندُستان اور برطانیہ کے درمیان ایک تجارتی راضی نامہ وجُود میں آیا جس کے ذریعے "شاہنشہی ترجیح" کے اصولوں کو اور پھیلا کر اُن مُلکوں کو بھی شامل کرلیا گیا جو محض برطانیہ کے تحفظ میں ہیں۔ تاکہ برطانیہ کے صنعتی مال کے بازار اور بھی وسیع ہوجائیں۔ ہندُستان میں آنے والے برطانیہ کے سوتی مال کو خاص مراعات دی گئیں۔ باوجود اس کے کہ برطانیہ ۳۶-۱۹۳۵ء اور ۳۷-۱۹۳۶ء کے مقابلے میں ہندُستان سے اب بہت کم روئی خرید رہی تھی لیکن ان ۔ ِعات کے تحت ہندُستان کو مجبور کیا گیا کہ لنکاشائر سے آنے والے ۲۳ کروڑ ۵۰ لاکھ گز کپڑے پر ۷½ فی صد اور ۲۵ گز کپڑے پر ۵ فی صد تخفیف محصول میں کردی جائے۔ راضی نامے کی مدد سے برطانیہ نے ہندُستان کی درآمدی تجارت پر ۶۰ اور ۷۰ فی صدی کی حد تک مزید قبضہ کرلیا۔ برطانوی پالیسی کی بدولت جب دُوسرے مُلکوں کے لیے ہندُستان کے بازار بند ہونے لگے تو انھوں نے بھی ہندُستانی مال کے لیے اپنے بازار کے دروازے بند کردیے۔ اس طرح ہندُستان کی درآمدی اور برآمدی دونوں تجارتوں کو عظیم نقصان پہنچا۔

ہندُستان اور جاپان

اوٹاوا کے راضی نامے کے بعد جب ہندُستان کے بازار جاپانی مالوں کے لیے بند ہونے لگے تو جاپان نے ہندُستانی رو[illegible] کا بائیکاٹ شروع کیا۔ اور اپنے سکّے "ین" کی قیمت گھٹادی۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہندُستان کے بازاروں میں جاپان کے سستے مال کا ایک بے پناہ سیلاب اُمڈ آیا۔ ہندُستان اور جاپان کے درمیان

تجارتی کشیدگی کو دُور کرنے کے لیے ۱۲ر جولائی ۱۹۳۴ء کو ایک تجارتی راضی نامہ وجود میں لایا گیا جس سے متعلق خاص باتیں یہ ہیں :۔ جاپانی مال پر ہندستان میں اور ہندستانی مال پر جاپان میں اتنا ہی محصول عائد کیا جائے جو دُوسرے مُلکوں کے اُنھی مال پر عائد کیا جاتا ہو۔ اس راضی نامے کے ذریعے ہندستان میں داخل ہونے والے جاپانی سوتی کپڑوں پر محصول کا تعیّن کیا گیا۔ اور ساتھ ہی ہندستان سے جاپان کو جانے والی روئی کی مقدار اور اس کے مقابلے میں جاپان سے ہندستان کو آنے والے سوتی کپڑے کی مقدار کا تعیّن کیا گیا۔ [دس لاکھ گانٹھ کچی روئی کے مقابلے میں ۳۲ کروڑ ۵۰ لاکھ گز کپڑا۔ اس میں تبدیلی کی بھی گنجایش رکھی گئی تھی]

یہ راضی نامہ ہندستان کے حق میں اس لیے ناموافق تھا کہ اس کے ذریعے ہندستان کے روئی پیدا کرنے والوں کے حق میں انصاف نہیں کیا گیا۔ دُوسرے اس راضی نامے کے تحت صرف چند ہی تجارتی اشیا کی آزادانہ درآمد کو روکنے کی کوشش کی گئی اور بقیہ چیزوں کے لیے ہندستانی بازار کے دروازے کُھلے رکھے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کپڑے وغیرہ کے علاوہ جو دُوسری جاپانی تجارتی اشیا تھیں وہ بِلا روک ٹوک ہندستان میں سستے داموں پر داخل ہوتی رہیں اور ہندستان کی مقامی اور چھوٹے اور وسطی پیمانے کی صنعتوں کو نقصان پہنچاتی رہیں۔

۱۲ر اپریل ۱۹۳۷ء کو اِس راضی نامے پر نظرِ ثانی کی گئی جس کے تحت ہندستان میں آنے والے جاپانی سوتی کپڑوں اور ان کے مقابلے میں ہندستان سے جاپان کو بھیجی جانے والی روئی کی مقدار کا تعیّن کیا گیا۔ جاپان دس لاکھ گانٹھ ہندستانی روئی حاصل کرنے کے بعد ہندستان کو ۲۸ کروڑ ۳۰ لاکھ گز کپڑا بھیج سکتا تھا۔ اس کے علاوہ جاپان سے ہندستان کو آنے والے کپڑوں کی مختلف قِسمیں مقرّر کر کے ہر قِسم کے لیے فی صد تناسب کا تعیّن کر دیا گیا۔

اِس راضی نامے میں بھی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس میں ہندستان کی وسطی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو جاپانی مال کے سیلاب سے بچانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

ہندستان اور برما کی تجارت

ہندستان سے برما کی علاحدگی کے بعد ۱۸ر مارچ ۱۹۳۷ء کو حکومتِ برطانیہ نے ایک "ٹریڈ ریگولیشن آرڈر" نافذ کیا جس میں علاحدگی کے بعد تین سال تک کے لیے ہندستان اور برما کی تجارت کے لیے کچھ خاص اصول وضع کیے گئے۔ اس آرڈر کے تحت یہ طے پایا کہ برما سے جو مال ہندستان آئے گا یا جو مال ہندستان سے برما جائے گا اُس پر وہی محصول لگایا جائے گا جو برما کی سیاسی علاحدگی سے پہلے لگایا جاتا تھا۔ کچھ خاص تجارتی اشیا کو اس قاعدے سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ یہ بھی طے پایا کہ اگر غیر ملک سے آنے والے کسی مال پر جو محصول برما میں لگایا جاتا ہو وہ اسی مال پر ہندستان میں لگائے جانے والے محصول سے کم ہو تو ایسی حالت میں اگر وہی مال برما، ہندستان کو بھیجنا چاہے تو ہندستان اس مال

پر اتنا ہی زائد محصول لگائے گا جو برما اور ہندستان کے محصولات کے فرق کی برابر ہو۔ ہندستان کے محصول میں اس سے زیادہ اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ آڈر کے تحت برما اور ہندستان پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ اگر وہ جاپان سے آنے والے سوتی مال پر محصول لگانا چاہیں تو دونوں ملکوں کے محصولات کی رقم یکساں ہونی چاہیے۔

اس آرڈر کے نافذ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ برما اور ہندستان کی تجارت بہ دستور اپنی پرانی رفتار سے جاری رہے اور اس میں کسی نوع کا خلل نہ پیدا ہو۔ ان ضابطوں کے ذریعے برما کو کچھ خاص تجارتی مراعات بھی دی گئیں جنھیں ہندستان نے بہ خوشی قبول کیا۔ لیکن ہندستان کو اس کے عوض میں برما سے کیا ملا؟ برما میں مقیم ہندستانی باشندوں کے خلاف سیاسی اور سماجی تحریک اور "چاول کنٹرول اسکیم آڈر" موخرالذکر آڈر کو حکومتِ برما نے نافذ کرکے ۲۳ کروڑ روپے کی تجارت کو، جو ہندستانیوں کے ہاتھوں میں تھی، یک سر ختم کر دیا۔ حکومتِ برما نے، ملک سے باہر چاول بھیجنے کے تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اور پشتوں سے ہندستان اور برما کے درمیان چاول کی جو تجارت ہندستانیوں کے ہاتھوں میں چلی آتی تھی وہ اچانک روک دی گئی۔ جس سے برما کے چاول کی برآمدی تجارت کا ۷۰ فی صد حصہ ہندستانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور برما میں دھان کوٹنے اور چھانٹنے کے کاروبار کا ۳۴ فی صد حصہ جسے ہندستانی چلا رہے تھے اُن کے قبضے سے چھین لیا گیا۔ اس صورتِ حال کو رفع کرنے کے لیے ۱۹۴۱ء میں ہندستان اور برما کے درمیان تجارتی بات چیت شروع ہوئی لیکن اسی درمیان میں برما میں جاپانی فوجیں گھس آئیں اور بات چیت سے کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہو سکا۔

برما اور ہندستان کے تجارتی تعلقات کا اندازہ سر ہیو اسٹیفنسن سابق گورنر برما کے ان اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے مارچ ۱۹۳۸ء میں "شاہی مرکزی ایشیائی سوسائٹی" میں تقریر کرتے ہوئے پیش کیے تھے۔ اُن اعداد و شمار کے مطابق برما کی برآمدی تجارت کا ۷۰ فی صد حصہ ہندستان کے لیے مخصوص تھا اور برما میں داخل ہونے والے مال کا ۵۰ فی صد حصہ ہندستان مہیا کرتا تھا۔ برما سے لکڑی، چاول، تیل ہندستان میں آتا تھا۔ اور ہندستان سے برما جانے والی چیزوں میں سوتی کپڑوں، دیگر سوتی مال، جوٹ کی بنی ہوئی چیزوں اور لوہے، کوئلے، اسٹیل، تمباکو، گیہوں کے آٹے اور مچھلی کی بڑی اہمیت تھی۔ جاپانی حملے سے پہلے ہر سال برما سے ۲۲ لاکھ ٹن چاول ہندستان آتا تھا۔

اب اگر ہم ہندستان کی جنگ سے پہلے کی تجارتِ خارجہ پر ایک نگاہ ڈالیں تو ہمیں مندرجۂ ذیل باتیں معلوم ہوں گی اوٹاوا کانفرنس کی پیش کی ہوئی تجویزوں کے باوجود ہندستان کی تجارتِ خارجہ میں سلطنتِ برطانیہ سے باہر کے ملکوں یعنی جرمنی، امریکہ اور جاپان کی اہمیت روز بہ روز بڑھتی گئی۔ اور ان ملکوں سے ہندستان آنے والے مال میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ لیکن جہاں تک خود ہندستان سے باہر مال کے جانے کا سوال تھا ہمیں معاملہ اُلٹا نظر آتا ہے۔ یعنی ہندستان سے زیادہ مال سلطنتِ

برطانیہ کے ملکوں میں گیا اور جرمنی، امریکہ اور جاپان میں ہندستان سے بہت کم مال بھیجا گیا۔

دوسری عالم گیر جنگ کے بعد

جنگ شروع ہونے کے بعد یورپ کے بازار ہندستان کے ہاتھ سے نکل گئے جس سے ہندستان کی برآمدی تجارت کو ۲۳ کروڑ رپے سالانہ کا نقصان ہونے لگا۔ جب جاپان لڑائی میں شامل ہوا تو ہندستان سے کوئی ۱۵ لاکھ روئی کے گانٹھوں کی سالانہ برآمد بند ہوگئی۔ برما، ملایا اور دیگر جنوبی مشرقی ایشیا کے ملکوں میں بھی ہندستانی مال کی درآمد رُک گئی۔ جاپان کے اعلانِ جنگ سے ہندستان کی تجارتِ خارجہ کو کوئی ۸۰ کروڑ رپے سالانہ کا نقصان پہنچا۔

جنگ چھڑنے کے بعد جاپان اور انگلستان سے صنعتی اور نیم صنعتی اشیا کی درآمد بہت کم ہوگئی۔ ان میں کپڑے، تفریحی اشیا اور راست استعمال کی چیزوں کی بڑی اہمیت تھی۔ ان کی درآمد بند ہوجانے کے بعد ہندستان کی پُرانی صنعتیں تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگیں اور نئی نئی صنعتیں بھی قائم ہونے لگیں۔

جنگ چھڑنے کے بعد ایک اور نئی بات یہ ہوئی کہ نئے نئے علاقوں اور ملکوں سے ہندستان کے تجارتی تعلقات قائم ہوئے مثلاً سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں "یونائیٹڈ کنگڈم کارپوریشن" کے ذریعے کوئی آٹھ کروڑ رپے کا مال ہندستان سے روس بھیجا گیا۔ سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں صرف ۱۶½ کروڑ رپے کا مال ہندستان سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ بھیجا گیا تھا لیکن سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۲۷ کروڑ کا، سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء میں ۳۱ کروڑ کا اور سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۴۵ کروڑ رپے کا ہندستانی مال وہاں بھیجا گیا۔ سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں مصر جنگ سے پہلے کے مقابلے میں چارگنا زیادہ مال ہندستان سے لے گیا۔ عرب تین گنا زیادہ، عراق آٹھ گنا، ایران دوگنا اور جاوا چارگنا۔ جنگ سے پہلے اور بعد میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے جتنی رقموں کا مال ہندستان آیا اُس کا حساب یہ ہے:۔

سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء	نو کروڑ رپے
سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء	۱۵ کروڑ رپے
سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء	۲۷ کروڑ رپے
سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء	½۴۴ کروڑ رپے

یہاں پر حکومتوں کے پاس مال کی آمد کا جو حساب ہے وہ اور قرضے پٹے کا حساب شامل نہیں کیے گئے ہیں۔

اگست سنہ ۱۹۴۱ء کے اطلانتک اعلان کے دفعہ ۴ میں درج ہے کہ جنگ کے بعد دنیا کے تمام ملکوں کو پوری دنیا کی تجارت اور خام مال تک رسائی حاصل کرنے کے یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔ ایک طرف تو یہ وعدہ ہے اور دوسری طرف اسی اعلان میں یہ بھی درج ہے

کہ اس کمل آزادی کے باوجود مخصوص حکومتوں (مثلاً برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ) کے مخصوص حلقۂ اثر کا فوراً خیال رکھا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہو کہ اگر برطانیہ چاہے تو ہندستان کی تجارتِ خارجہ کے ایک بڑے حصّے کو خود ہڑپ کرسکتی ہو اور ہندستان کو دوسرے ملکوں کی تجارت سے محروم کرسکتی ہو۔

اس کے بعد ۲۳ فروری سنہ ۱۹۴۲ء کو برطانیہ اور امریکہ میں جو باہمی امداد کا راضی نامہ ہوا اُس کے آٹھویں دفعہ کی رو سے دونوں حکومتوں نے وعدہ کیا کہ وہ بین اقوامی تجارت کی تمام رُکاوٹوں کو دور کردیں گی، محصولات میں کمی کریں گی اور کسی ملک کے تجارتی مال کے ساتھ امتیازانہ سلوک نہ روا رکھیں گی۔

۶ دسمبر سنہ ۱۹۴۵ء کو امریکہ اور برطانیہ کے درمیان جو قرضہ معاہدہ وجود میں آیا ہو اور جس کی رُو سے برطانیہ کو ریاست ہائے متحدہ نے چار ارب چالیس کروڑ ڈالر قرض دیے ہیں اس سے دُنیا کے تمام ملکوں میں آزاد تجارت کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں۔ برطانیہ کی مالی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر امریکہ نے سلطنت برطانیہ کے بازار امریکی اور دیگر ملکوں کے مال و اسباب کے لیے کھول دیے ہیں۔ ہندستان کو بھی اپنی تجارتِ خارجہ کو ترقی دینے کے زبردست مواقع ہاتھ آگئے ہیں۔ لیکن ہندستان کے راستے میں جو رُکاوٹیں حائل ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

یہ ظاہر ہو کہ تجارتِ خارجہ کے بڑھنے اور پھیلنے کا انحصار ملک کی صنعتی ترقی پر ہو صنعتوں کی توسیع و ترقی کے بغیر کسی ملک کو نہ تو باہر سے خام مال منگوانے کی ضرورت پڑتی ہو اور صنعتی مال بھیجنے کی۔ ہندستان کی صنعتی ترقی مشینوں اور اشیائے اصل (CAPITAL GOODS) کی کمی کے سبب سے خاطر خواہ طور پر نہیں ہورہی ہو۔ مشینوں کے حصول کا انحصار اس بات پر ہو کہ برطانیہ ہندستان کے تمام قرضے ڈالر یا سونے کی شکل میں ادا کردے۔ تاکہ امریکہ سے مشینیں خریدی جاسکیں۔ قرضے کی ادائگی کی پہلی قسط میں برطانیہ جو رقم ہندستان کو دے وہ اتنی ہو کہ ہندستان کی آیندہ پانچ سال کی مشینی ضروریات پوری ہوسکیں۔ قرضے کا کوئی بھی حصّہ حذف نہ کیا جائے۔

اسٹرلنگ قرضے کی ادائی کے مسئلے کے متعلق مرکزی اسمبلی نے برٹن وو ڈس کی تنظیم میں ہندستان کی غیر مشروط شمولیت کے خلاف فیصلہ کیا ہو جو بالکل بجا اور منصفانہ ہو۔

لیکن برٹن وو ڈس کے راضی نامے پر دستخط کردینے کے بعد کچھ اور بھی ایسی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، جو موجودہ حالات میں ہندستان کے لیے مفید نہیں ثابت ہوں گی۔ آزاد تجارت کے جس اصول پر برٹن وو ڈس کی تنظیم قائم ہو وہ چاہے امریکہ کے لیے مفید ہو جو صنعتی اعتبار سے دُنیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک ہو، لیکن ہندستان کے حق میں چنداں مفید نہیں ہو۔ ہندستان اگر اپنی صنعتوں کو جلد از جلد امریکہ اور برطانیہ کی سطح پر لانا چاہتا ہو تو

وہ بالکل غیر پابند اور آزاد تجارت کے اصول پر کاربند نہیں ہوسکتا۔ اپنی صنعتوں کو امریکی اور برطانوی مال و اسباب کے سیلابی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اُسے محصولات اور کروڑگیری سے کام لینا ہی پڑے گا۔ امریکہ نے آزاد تجارت کو عملی صورت دینے کے لیے حال ہی میں جو اصول مرتب کیے ہیں اور جو نومبر میں ہونے والی بین اقوامی تجارتی کانفرنس میں پیش کیے جائیں گے وہ بھی ہندستان کی تجارتِ خارجہ کے حق میں چنداں مفید نہیں ہیں۔

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

کوئلے کی تحقیقاتی کمیٹی

از: ——— ابو سالم ایم۔ اے (علیگ)

ملک کی صنعتی ترقی کے سلسلے میں کوئلے کی جو اہمیت ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ اگر ہندستان کی اس بنیادی معدنی دولت کے متعلق کوئی قومی منصوبہ یا پالیسی معین کرنا ہو تو غالباً سب سے اہم درجہ اس بات کو دیا جائے گا کہ کس طرح کوئلے کو صرف کرنے کی ایسی ترکیب نکالی جائے جو قومی مفاد کے لیے بہتر سے بہتر ہو۔ ہندستان میں پیمایش طبقات الارض کے ایک سابق ڈائرکٹر سر سیرل فاکس کی رائے میں سب سے ضروری کام یہ ہے کہ ملک کے اچھے قسم کے کوئلے کے ذخائر کو لوہا پگھلانے اور صاف کرنے کے کام کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اچھے قسم کے کوئلے کی مجموعی مقدار ۱۵۰۰ ملین ٹن ہے۔ اور تنہا سنگھ بھوم کے علاقے میں اچھے قسم کے لوہے کی مجموعی مقدار کوئی ۳۰۰۰ ملین ٹن ہے۔ ایک ٹن اچھے قسم کے لوہے کو صاف کرنے کے لیے ایک ہی ٹن کوئلے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے کوئلے کے ذخائر ایک علاقے کے لوہے کو صاف کرنے کے لیے بھی ناکافی ہیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں کوئلے کو صرف کرنے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لینا قومی مفاد کا اولین تقاضا ہے۔

لیکن ہمارے ملک کی معاشی زندگی کے ناخداؤں نے اس قومی دولت کے استعمال کے ایسے مقاصد اختیار کیے جن سے زیادہ غلط مقاصد کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ہم اپنی اس بیش قیمت قومی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹاتے رہے ہیں۔ مثلاً

۱۹۴۲ء میں ۱۳ ملین ٹن اچھے قسم کا کوئلہ نکالا گیا تھا۔ اس کا صرف ایک چوتھائی حصہ لوہا صاف کرنے کے جائز مقصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ باقی ریلوے انجنوں میں جلا کر بھاپ پیدا کرنے کے کام میں لایا گیا یا پھر اسی مقصد سے کارخانوں میں استعمال کیا گیا۔ جیسا کہ سر پدم جی پنجوالا نے کہا ہے، کوئلے کو ریلوے انجن میں جلانا اس کے استعمال کا سب سے غلط طریقہ ہے۔ کیونکہ اس طرح سے جو طاقت پیدا ہوتی ہے اس کا صرف ۴ فی صد حصہ کام میں آتا ہے اور باقی سب ضائع جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئلے کی اور دوسری صلاحیتیں بھی بالکل بے کار جاتی ہیں۔

اس لیے حکومتِ ہند کا یہ فیصلہ کہ اس غلط پالیسی پر نظرِ ثانی کی جائے اور اچھے قسم کے کوئلے کی حفاظت کی جائے بہت ہی خوش آیند ہے۔ پچھلے دسمبر میں حکومتِ ہند نے ایک کمیٹی بنائی ہے جس کے سپرد یہ کام ہے کہ کوئلے کے استعمال کے اس پہلو پر مشورہ دے۔ اس کمیٹی کا نام "ہندستانی کوئلے کی کانوں کی کمیٹی" ہے۔ اس کے سامنے جو حل طلب مسائل ہیں ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ کمیٹی کا ایک کام تو یہ ہے کہ کوئلے سے متعلق اب تک جو کمیٹیاں بن چکی ہیں ان کے مشوروں پر نظرِ ثانی کرے اور یہ بتلائے کہ ان کمیٹیوں کے جن مشوروں پر عمل کیا گیا ان میں کس حد تک کام یابی ہوئی۔ اور نیز یہ بھی بتلائے کہ ان کمیٹیوں کے جن مشوروں پر کسی وجہ سے عمل نہیں کیا جاسکا ہے یا محض جزوی طور پر عمل ہوا ہے ان کے متعلق اب حکومت کی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ کمیٹی کا دوسرا کام یہ بتانا ہے کہ کوئلے کی صنعت کے غیر فنی مسائل کو حل کرنے کے لیے کس قسم کے "معاشی اور انتظامی" اقدامات کی ضرورت ہے۔ کوئلے کی صنعت کے معاشی مسائل اور کوئلے کی قیمتوں کا استحکام۔ ان مسائل پر بھی کمیٹی کو اپنے مشورے پیش کرنے ہیں۔ یہ فہرست خاصی مکمل ہے۔

کمیٹی کی محنت سے ہم کیا جائز توقعات رکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض مقاصد آسانی سے تجویز کیے جاسکتے ہیں کوئلے کے ذخیروں کا صحیح استعمال، کوئلے کے بیچنے کے ایسے انتظامات جو باہمی مقابلے کو پابند رکھیں اور دوسرے ایسے اقدامات جو کوئلے کی صنعت کو نفع بخش بنائیں۔ مزدوروں کے ساتھ انصاف ہونا بھی ازبس ضروری ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ کمیٹی نے مسئلے کے اس پہلو پر کافی زور دیا ہے۔ کمیٹی کی رائے میں مزدوروں کی آسودگی اور خوش دلی ہر صنعت کے استحکام کے لیے ضروری ہے۔ کوئلے کی کانوں کے سامنے ایک بہت اہم سوال مزدوروں کی دست یابی کا ہے جنگ کے دوران میں کوئلے کی قلت نے جس کا سب سے بڑا سبب مزدوروں کی قلت تھا اس مسئلے کی اہمیت کو بہت نمایاں کردیا ہے۔ کوئلے کی کانوں کے مزدور عام طور پر غیر مستقل ہوتے ہیں۔ وہ کچھ عرصے کے لیے جب دیہاتوں میں زرعی کاموں سے فراغت ہو چکتی ہے اور گانو میں کام نہیں رہتا تو پاس کی کانوں میں کام کرنے چلے جاتے ہیں۔ یہ بات کانوں کے ساتھ ہی نہیں ہوتی۔ عام صورت ہی یہی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ صنعتیں جہاں پائی جاتی ہیں وہاں کے کام کرنے کے حالات اتنے غیر تشفی بخش ہیں کہ کوئی بھی آدمی ان علاقوں میں اپنے دورانِ قیام کو زیادہ

طول دینا پسند نہیں کرتا۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر ان حالات کو بہتر بنایا جاسکے تو مزدور کان کنی کو اپنا مستقل پیشہ بنانا نہیں۔ کمیٹی سے اس بات کی پوری توقع ہے کہ مزدوروں کی فلاح و بہبود کے سارے انتظامات پر پوری تفصیل سے غور کرکے مزدوروں کی بہتری کا کوئی جامع پروگرام مرتب کرے گی۔

اس سلسلے میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئلے کی کانیں مستقبل میں بھی افراد کی ملکیت ہی رہیں گی یا حکومت انھیں اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔ ایک بڑی دقت جو حائل ہے وہ ہماری موجودہ سیاسی بے چارگی ہے۔ اگر یہ حالات باقی رہے تو کوئلے کی کانوں کے حکومت کے تحت آجانے سے بھی کچھ زیادہ بھلائی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ قوم کی ملکیت کا مطالبہ کرنے والوں کے پیش نظر جو مقاصد ہیں وہ اس کے بعد بھی ممکن ہے حاصل نہ ہوں۔ مثلاً مزدوروں کے ساتھ اچھا برتاؤ، معقول اجرتیں اور دوسرے انتظامات۔ ریلوں کی مثال اس سلسلے میں کافی سبق آموز ہے۔ جنگ کے دوران میں ریلوں نے کافی منافع کمایا ہے، پھر بھی ریلوں کے کام کرنے والے مزدوروں کو آسودگی نہیں حاصل ہے۔ مستقبل کے متعلق ہر حال میں ہمیں پُر امید ہونا چاہیے۔ اس لیے اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ سیاسی حیثیت سے ہم آگے بڑھیں گے تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔ اس مفروضے کے بعد مندرجہ بالا سوال کے جواب میں اختلاف رائے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ ۱۹۳۷ء میں کوئلے کے مسائل کی تحقیقات کے لیے جو کمیٹی بنی تھی اس نے بتایا تھا کہ کوئلے کے بیچنے اور نکالنے میں آج کل کانیں بڑی حد تک صرف بے جا سے کام لیتی ہیں۔ اسی بنا پر قومی تنظیمی کمیٹی نے کوئلے کی کانوں کو قومی ملکیت بنانے کی تجویز پیش کی ہے۔ کانوں کی کارکردگی بڑھانے اور مزدوروں کے ساتھ بہتر برتاؤ کرنے کے لیے بھی یہ بات ضروری ہے۔ جنگ کے دوران میں کوئلے کی بڑھی ہوئی مانگ سے یقیناً کانوں کے مالکوں کو کافی نفع ہوا لیکن اس کے باوجود ان کان کے مالکوں نے کانوں کے پاس نہانے کی سہولتیں یا کان میں کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کے لیے دایہ گاہ بنانا خوشی سے منظور نہیں کیا۔ ان سے یہ توقع فضول ہے کہ مستقبل میں ان کی ذہنیت بدل جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ کمیٹی اس مسئلے پر اچھی طرح غور کرے گی۔

لیکن اگر کوئلے کی کانوں کو حکومت نے اپنی ملکیت میں نہ لیا تو پھر ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ان کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اپنے انفرادی منافع کی روشنی میں اپنے لیے جو چاہیں راہ عمل چن لیں۔ یا کسی ایسی قانونی ایجنسی کا تعین کیا جائے جو کوئلے کی صنعت کو قابو میں رکھے اور ساری صنعت کے لیے رہنمائی کا کام انجام دے۔ اور اگر ضرورت ہو تو کان کے مالکوں کو ایک متعینہ پالیسی پر عمل کرنے پر مجبور کرسکے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ پچھلی کمیٹیوں نے بھی اس قسم کی قانونی ایجنسی کے قیام کی سفارش کی تھی۔ گو اس ایجنسی کے فرائض کے متعلق ان کے مشورے مختلف تھے لیکن حکومت نے ان تجویزوں پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ قانون کان کنی (MINING ACT) کے تحت کچھ قوانین البتہ حکومت نے بنا دیے ہیں جن کا مقصد یہ تھا۔

کے اندر مزدوروں کی جان کی اور خود کانوں کی حفاظت ہو سکے۔ ایک اور بورڈ کا قیام بھی عمل میں آیا لیکن اس میں غالباً کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ یہ اتنی کارروائیاں کافی نہیں ہیں۔ ان کے فرائض محدود ہیں۔ جنگ کے دوران میں ایک کوئلے کے کنٹرول بورڈ کا قیام بجائے خود اس قسم کی کسی قانونی ایجنسی کے قیام کے حق میں ایک بڑی دلیل ہو۔ کسی ایسے انتظام کے بغیر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کانوں پر افراد کی ملکیت کے برقرار رہنے کی صورت میں کیوں کر انھیں ایک ہی پالیسی پر عمل کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ کمیٹی نے اگر اصلاح کے متعلق کچھ سفارشیں کیں تو ان سفارشوں پر ہر کان کے مالک سے عمل کرانے کی شکل کیا ہوگی۔ رابرٹ فورٹ نے جو برطانوی کان کنوں کی انجمن کے آزاد صدر تھے برطانوی کوئلے کی صنعت کی بعد از جنگ از سر نو تنظیم کے لیے کچھ تجویزیں پیش کی تھیں۔ ان تجویزوں میں انھوں نے مختلف کانوں کے اندرونی اختیارات کو کم کرنے پر بہت زور دیا تھا۔ اس کی رائے میں ایک مرکزی کوئلہ کمیٹی کا قیام بہت ضروری ہے جس کے ہر فیصلے کو تسلیم کرنا اور ان پر عمل کرنا ہر کان کے مالک کے لیے فرض ہو۔ یہ رائے ہمارے لیے خاصی سبق آموز ہے۔ اور ایسے وقت میں جب کہ ہر طرف بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت بنا دینے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے حکومت ہند کم سے کم اتنا تو کرے۔ ایسا انتظام کیا جائے جس کے تحت قانوناً ہر کان کے مالک کو یکساں انداز میں آگے بڑھنے پر مجبور کیا جا سکے۔

کوئلے کی صنعت کے معاشی مسائل کا جائزہ لینے کے سلسلے میں کمیٹی ہر پہلو پر غور کرے گی۔ کوئلے کی مختلف کانوں کا سائز، ملکیت اور انتظامی مسائل، مختلف کانوں کے مالی ذرائع اور اس بات کا فیصلہ کہ ان کا سرمایہ کافی ہے یا نہیں۔ یہ تمام مسائل زیر بحث آئیں گے اور یقین ہے کہ کمیٹی تمام خرابیوں اور کمزوریوں کا پتا لگا کر اصلاح کی مناسب تجویزیں پیش کرے گی۔

۱۹۱۸ء کے صنعتی کمیشن نے یہ رائے دی تھی کہ اگر ہندستان کے معدنی وسائل سے کام لینے کی شکل یہ ہوگی کہ انھیں غیر ملکی ایجنسیوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ اُن سے بالکل کام نہ لیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود ہماری معدنی دولت کے ایک خاصے بڑے حصے پر غیر ملکی سرمایے کا قبضہ ہے۔ کوئلہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہے یقیناً کمیٹی کو کوئی ایسی شکل نکالنی چاہیے کہ کوئلے پر جو غیر ملکی تسلط قائم ہے اُسے ختم کیا جا سکے۔

کوئلے کی کانوں کے خلاف بدانتظامی، سرمایے کی قلت، اور اعتبار کی کم یابی کی شکایتیں بہت پرانی ہیں۔ کمیٹی یقیناً تمام متعلقہ مسائل پر اچھی طرح غور و خوض کر کے صحیح راہِ عمل کا تعین کرے گی۔ کوئلے کی فروخت کے انتظامات بھی غیر تشفی بخش ہیں۔ اس سلسلے میں کمیٹی نے اپنے سوال ناموں میں اس تجویز پر رائے مانگی ہے کہ کوئلے کی فروخت کے لیے جو مرکزی ایجنسی بنے گی اُسے صنعت کی اپنی مرضی اور پسند کے مطابق رکھنا مفید ہوگا یا حکومت کے زیر نگرانی رکھنا۔ کسی مرکزی ایجنسی کا قیام بعض حیثیتوں سے یقیناً نفع بخش ہوگا۔ مثلاً نقل و حمل کی سہولتیں بڑھیں گی اور مختلف کانوں میں باہمی مقابلہ کم ہو جائے گا۔ لیکن اس کے قیام میں خصوصاً اگر اُسے کان کے

مالکوں کے زیرِ اقتدار رکھا گیا تو اندیشہ ہے کہ یہ اجارہ دارانہ ایجنسی ایسی شکلیں اختیار کرے جو کوئلے کے استعمال کرنے والوں کے مفاد کے خلاف ہو۔ کمیٹی کو اپنا آخری مشورہ پیش کرتے وقت اس خطرے کا خیال رکھنا چاہیے۔ کوئلے کی کانوں کو ویگن اور ریل کی دقتوں کی ہمیشہ شکایت رہی ہے۔ کمیٹی کو اس کا بھی کوئی حل نکالنا ہوگا۔ اس سلسلے میں کوئلے کی آمد و رفت پر ریلوں نے جو کرائے مقرر کر رکھے ہیں ان پر بھی غور کرنا ہوگا۔ ملک کو کمیٹی سے بجا طور پر یہ توقع ہے کہ وہ ایسی صورتیں تجویز کرے کہ اس سلسلے میں تمام جائز شکایتوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مستقبل میں کوئلے کی قیمتیں کیا ہوں گی۔ یہ بھی ایک اہم سوال ہے۔ مشینوں کے لیے طاقت کی فراہمی کا ایک اہم ذریعہ کوئلہ ہے۔ کم سے کم قیمت پر بجلی مہیا کرنا گھریلو ضرورتوں اور صنعتی ضرورتوں دونوں کے لیے یہ ایک مناسب پالیسی ہوگی۔ لیکن اس سلسلے میں پیداوار کے مصارف پر بھی سخت نگرانی قائم رکھنا ضروری ہوگا اس لیے کہ اسی پر سستی بجلی کی فراہمی کا دارومدار ہے۔ سنہ ۱۹۳۲-۱۹۳۰ء کے دوران میں کوئلے کی صنعت کو سخت کساد بازاری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لیے جنگ کے دوران میں کوئلے کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوا اسے بہت سے لوگوں نے جائز قرار دیا ہے تاکہ اس طرح صنعت کے ان نقصانات کی تلافی ہو جائے جو اس نے ماضی میں برداشت کیے ہیں۔ لیکن کوئلے کی قیمتوں کو موجودہ سطح پر نہیں قائم رکھا جا سکتا اس لیے کہ یہ ملک کے عام مفاد کے لیے مضر ہوگا۔ کوئلے کی صنعت کو خوش حال بنانے کی کوششوں سے ہر کسی کو ہمدردی ہونی چاہیے لیکن اگر اس خوش حالی کے حصول کی شرط یہ ہوئی کہ کوئلے کی قیمتوں کو جنگ کی سطح پر رکھا جائے تو ہر سمجھدار آدمی ایسی پالیسی کی مخالفت کرے گا۔ یہ قیمتیں بہت زیادہ ہیں اور ان سے ملک کی صنعتی ترقی کو بہت سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ قیمتوں کی سطح کے تعین میں ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ ملک کے اندر جو کوئلے کی قیمت ہے اس کو بیرونِ ملک کی قیمت سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔ ہمیں اس بات کی ہر ممکن کوشش کرنی ہوگی کہ ہماری صنعت کی کارکردگی دوسرے ممالک کے مقابلے میں کم نہ رہے اور اگر ہمیں غیر ملکوں سے کوئلہ برآمد کرنا ہو تو یہ بات ناگزیر ہے۔ لیکن یہاں ہمیں اس سوال کا بھی فیصلہ کرنا ہوگا کہ مستقبل میں ہندستان کوئلے کی برآمد کی اجازت دے بھی سکتا ہے یا نہیں۔ جنگ کے بعد کے چند سالوں تک تو غالباً یہ ممکن نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ان سالوں میں غالباً ہماری کانیں اتنا کوئلہ بھی مشکل سے نکال سکیں گی کہ خود ہماری ضروریات کے لیے کافی ہو۔ لیکن ویسے بھی ہندستان شاید ہی بڑے پیمانے پر کوئلے کی برآمد کی اجازت دے سکے۔ کیوں کہ بیرونِ ملک میں اگر کوئی مانگ ہوگی تو وہ ہمارے اچھے قسم کے کوئلے ہی کی ہوگی اور اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے یہ ذخائر خود ہماری اپنی ضرورت کے لیے ناکافی ہیں۔ قومی تنظیمی کمیٹی کی رائے ہے کہ بنیادی معدنیات کا برآمد کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ اگر حالات سے مجبور ہو کر ہمیں برآمد کرنا بھی پڑا تو غالباً وہ صرف اس شکل میں ہوگا کہ اس کے عوض میں ہمیں ایسی معدنیات مل جائیں جو ملک میں موجود نہیں ہیں۔ کمیٹی کو اس مسئلے پر بھی پوری طرح سوچ بچار

کے بعد کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔

آخر میں پیداوار کے مسائل کا ذکر کرنا ضروری ہو۔ ہندستانی کوئلے کی کانوں کی اس کمیٹی نے اندازہ لگایا ہو کہ آیندہ دو سالوں میں کل ہندستان کو مجموعی طور پر ۳۲ ملین ٹن کوئلے کی ضرورت ہوگی۔ کوئلے کی صنعت کی پوری تاریخ میں پیداوار کبھی اس منزل پر نہیں پہنچی ہو جنگ کے دوران میں پیداوار کی کمی ممکن ہو جنگ کے غیر معمولی حالات کی پیدا کردہ دقتوں کا نتیجہ رہی ہو۔ اور یہ امید کرنا کچھ نامناسب نہ ہوگا کہ یہ دقتیں مستقبل قریب میں ختم ہو جائیں گی لیکن اگر مستقبل کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جب روز بہ روز کوئلے کی ضرورت بڑھتی جائے گی تو ہندستانی کوئلے کی صنعت کی فنی کارکردگی بڑھانے کی کوششوں کو غالباً سب باتوں سے زیادہ اہمیت دینی پڑے گی۔ چھوٹی چھوٹی کانیں کارکردگی کے لحاظ سے بہت پیچھے ہوتی ہیں۔ ان کے لیے اچھی اور نئی نئی مشینیں استعمال کرنا بھی مشکل ہوتا ہو۔ غالباً ان دقتوں کے پیشِ نظر ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ چھوٹی چھوٹی کانوں کو ملا کر بڑا بنا دیا جائے کمیٹی من جملہ اور باتوں کے اس پہلو پر بھی توجہ دے گی۔ لیکن یہاں پھر ایک تشویش انگیز بات یہ ہو کہ کمیٹی کے سامنے دریافت طلب مسائل کی جو فہرست رکھی گئی ہو اس میں "غیر فنی" کی شرط بھی لگا دی گئی ہو۔ پرانی مشینیں اور چھوٹی چھوٹی کوئلے کی کانوں کا مسئلہ جن میں کوئلہ نکالنے کا خرچ نسبتاً زیادہ ہوتا ہو اس تعریف سے باہر سمجھا جا سکتا ہو لیکن اگر ایسا ہوا تو کمیٹی کی رپورٹ کی قیمت بہت گھٹ جائے گی کیوں کہ انھی مسائل پر بڑی حد تک کوئلے کی صنعت کی کارکردگی کا دار و مدار ہو۔ اور یہ مستقبل کا ایک بہت ہی اہم سوال ہو۔

مسائل حاضرہ (غیر ممالک)

روس کی نئی معاشی منصوبے بندی

ترجمہ از : ———— ادارہ

روس میں جو چوتھا پنج سالہ معاشی پلان پیش کیا گیا ہے اس پر ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک عمل درآمد کیا جائے گا۔

یہ پلان بنیادی باتوں کے لحاظ سے انھی رجحانات اور میلانات کا حامل ہے جو ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے تھے جب روس نے پہلی بار ارادی منصوبوں اور طویل عرصے کی ضروریات کے مطابق اپنی معاشی زندگی کی ترتیب شروع کی۔

روس کے نئے معاشی منصوبوں پر اس خیال سے نظر ڈالنا ضروری ہے کہ وہ برطانیہ اور دوسری "اشتراکی" حکومتوں کے منصوبوں سے کن باتوں کے لحاظ سے مختلف ہے اس لیے کہ ان دونوں طرز کے منصوبوں میں کئی باتوں کا اختلاف بلکہ تضاد موجود ہے۔

پہلا اختلاف تو یہ ہے کہ سوویت روس کا پلان تمام ملکوں کے منصوبوں کے مقابلے میں زیادہ بڑے پیمانے کا ہے، دوسرے اس میں تفصیلات بھی بہت کافی ہیں۔ پہلے ہی پوری آبادی کی تمام ضرورتوں کا نہایت غور و خوض کے ساتھ اندازہ لگا لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں تمام ضروری اعداد و شمار اُن لاتعداد سماجی اداروں اور انجمنوں کے ذریعے فراہم کیے گئے ہیں جو سوویت ملک میں یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مثلاً اشیا استعمال کرنے والوں کی انجمن امداد باہمی۔ مزدوروں کی انجمنیں، کارخانوں کے بریگیڈ، مقامی پنچایتیں وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ ہی معاشی پلان کے ہر حصے کو پورے سوویت معاشی نظام کے ساتھ منسلک اور مطابق کرنے کی کوشش

کی گئی ہو۔ برخلاف اس کے برطانیہ کی لیبر حکومت زیادہ سے زیادہ ملک کے صرف چند بنیادی صنعتوں پر نگرانی قائم رکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس سے آگے وہ نہیں جاتی۔ صرف کوئلے کو قومی ملکیت بنانے کا جو قانونی مسودہ پیش کیا گیا ہو اُس میں البتہ ملک کے ذخائر کا ایک غیر واضح سا تخمینہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اور ساتھ ہی کوئلے کی صنعت کی قوت پیدایش کا بھی اندازہ لگایا گیا ہو۔

یہ صحیح ہو کہ روس اور برطانیہ دونوں ملکوں میں معاشی حالات کی درستگی کے سوال کو سب سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہو اور دونوں ملکوں میں طویل عرصوں تک جاری رہنے والے منصوبے پیش کیے گئے ہیں اُن کا مقصد یہ ہو کہ جنگ کی تباہ کاریوں کے اثرات دُور ہوں اور جنگ سے پہلے کی طرح معاشی خوش حالی پیدا ہو۔ لیکن فرق یہ ہو کہ برطانیہ میں جن نقصانات کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو وہ غیر ملکی کاروبار میں نقصان اُٹھانے اور مقروض ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں لیکن روس کو جن نقصانات کا ازالہ کرنا ہو وہ جنگ کی عظیم تباہیوں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ جنگ نے راست طور پر روس کی زراعت، صنعت، عمارات اور ذرائع حمل و نقل کو تباہ و برباد کر دیا ہو۔ برطانیہ کے سامنے پروگرام یہ ہو کہ ملک کی تجارتِ برآمد کو آگے بڑھایا جائے، غیر ملکوں کے قرضے چکائے جائیں اور غذائی اشیا اور ضروری کچا مال خریدا جائے۔ لیکن روس کے سامنے یہ پروگرام ہو کہ جنگ کی وجہ سے جو عمارتیں، صنعتیں اور دیگر اشیا تباہ ہو گئی ہیں اُن کی دوبارہ تعمیر کی جائے، اور ملک کے اندر اشیا کی پیدایش بڑھا کر اور اُن کے استعمال میں اضافہ کر کے لوگوں کے معیارِ زندگی کو بلند کیا جائے۔

روس کو جنگ کی وجہ سے جو نقصانات اُٹھانے پڑے ہیں اُن کی قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں لگایا گیا ہو لیکن مولوتوف کے بیان سے ایک عام اندازہ ضرور ہو جاتا ہو۔ مولوتوف کے بیان کے مطابق ۱۷۰۰ قصبے اور ۷۰۰۰۰ گانو تباہ ہو گئے ہیں، دو کروڑ پچاس لاکھ آدمی گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔ ۴۰ لاکھ انسانوں کو روزگار مہیا کرنے والے کارخانے برباد ہو گئے ہیں۔ یہاں یہ حیرت کی بات نہیں کہ نئے پنج سالہ منصوبے میں سب سے زیادہ اہمیت انھی حالات کی درستگی کو دی گئی ہو۔ سوویٹ نے نہ صرف یہ دعوا کیا ہو کہ ان تمام نقصانات کا ازالہ کر کے ملک کی صنعت اور زراعت کو جنگ سے پہلے کی حالت پہ لے آیا جائے گا بلکہ یہ بھی دعوا کیا ہو کہ اس پانچ سال کے عرصے میں حالات جنگ سے پہلے کے مقابلے میں بھی بہتر ہو جائیں گے۔

ریاستی منصوبہ بندی کمیشن کے صدر، ووژنے سینسکی، کے خیال میں ۱۹۵۰ء میں پورے سوویت علاقے کی تمام صنعتی پیداوار ملا کر دو کھرب ۵ ارب روبل کے برابر ہوگی جو جنگ سے پہلے کی صنعتی پیداوار کے مقابلے میں ۴۸ فی صد زیادہ ہو۔ (اس تخمینے میں ۲۷-۱۹۲۶ء کی قیمتوں کا خیال رکھا گیا ہو۔) اس سلسلے میں ایک قابلِ غور بات یہ ہو کہ اگرچہ پلان میں غذائی اشیا اور دیگر راست استعمال کی اشیا میں ۱۷ فی صد سالانہ کے اضافے کا التزام کیا گیا ہو لیکن اس کے باوجود اصلی زور مشینوں وغیرہ

کی پیدائش پر دیا گیا ہو۔ اس کا مقصد یہ ہو کہ اس وقت چاہے راست استعمال کی اشیا پیدا کرنے کی بجائے مشینیں وغیرہ زیادہ بنائی جائیں مگر آگے چل کر یہ ہوگا کہ جب بہت سی مشینیں وجود میں آجائیں گی اور ذرائع پیدائش ترقی کر جائیں گے تو راست استعمال کی اشیا آج کی بہ نسبت کہیں زیادہ مقدار میں پیدا ہونے لگیں گی اور لوگوں کی موجودہ تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔ آج کی تکلیف کل کے آرام کا سبب ثابت ہوئی۔

روس میں جو منصوبہ تیار ہوا ہے اُس میں امریکہ کی طرح اس بات کا خیال رکھا گیا ہو کہ پورے طور پر مشینوں سے کام لیا جائے خاص کر لوہے اور اسٹیل اور عمارتی لکڑی اور ایندھن مثلاً کوئلے وغیرہ کی صنعتوں میں اور بھی سارا کام مشینوں کی مدد سے انجام دیا جائے۔ اِس بات پر بھی زور دیا گیا ہو کہ فی مزدور مشینی سامان میں اضافہ کیا جائے۔ روس کے سامنے مزدوروں، انجنیروں اور فنی ماہروں کی تنخواہوں میں اضافہ کر کے اور کارکنوں سے پورے آٹھ گھنٹے روزانہ کام لے کر محنت کی قوتِ پیدائش کو بڑھانے کا پروگرام ہو۔ اشیا کی پیدائش میں اضافہ کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا پروگرام کے پیش نظر مشینی آلات بنانے کی صنعت کو خاص اہمیت دی گئی ہو۔ ریاستی منصوبہ بندی کمیشن کے صدر نے جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہو کہ ۱۹۵۰ء میں مشینوں اور دیگر صنعتی سامانوں کی پیدائش دونی ہو جائے گی اور دھات صاف کرنے کے صنعتی سامان کی تعداد پہلے سے، ۳ گنی زیادہ ہو جائے گی۔ بھاری صنعتوں میں چوں کہ کام کرنے والوں کی کمی ہو اس لیے اُن کی قوتِ پیدائش میں اضافے کا انحصار نئی نئی مشینوں کے استعمال پر ہو۔ مثال کے طور پر کوئلہ کھودنے کی صنعت کے لیے نئی قسم کی مشینیں بڑے پیمانے پر بنائی جا رہی ہیں۔ اسی قسم کی ایک نئی مشین "مائننگ کمبائن" یعنی "کوئلہ کھودنے کا جتھا" کہلاتی ہو۔ یہ مشین کوئلے کھودتی اور تراشتی ہو اور پھر اس کو ڈبوں میں لا دیتی ہو۔ کچھ ایسے طاقت ور لے آنے اور لے جانے والے آلات بھی بنائے گئے ہیں جن کے ذریعے فی گھنٹہ ۸۰ ٹن کوئلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہو۔ یہ تمام نئے آلات اور مشینیں سوویت مُلک میں بڑے پیمانے پر بنائی جا رہی ہیں تاکہ اُن سے صنعتوں کی قوتِ پیدائش بڑھائی جا سکے۔ تخمینہ ہو کہ ۱۹۵۰ء تک سوویت مُلک میں کوئلے کی پیدائش ۲۵ کروڑ ٹن سالانہ تک پہنچ جائے گی۔ یہ مقدار جنگ سے پہلے کے مقابلے میں ۵۱ فی صد زیادہ ہو۔

جہاں تک تیل کی پیدائش بڑھانے کا سوال ہو پروگرام یہ ہو کہ نئے نئے تیل کے چشمے کھودے جائیں اور پرانے چشموں سے پورے پورے طور پر کام لیا جائے۔ اس سے تیل کی مقدار میں ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن کے قریب اضافہ ہوگا جو جنگ سے پہلے کے مقابلے میں ۱۴ فی صد زیادہ ہو۔ جنگ کے چار سالوں میں ۴۳ نئے تیل کے ذخیرے دریافت کیے گئے ہیں اور نئے تیل کے چشمے اور اُن کو صاف کرنے کے کارخانے تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ نئی نئی ڈرلنگ مشینیں بھی

ایجاد کی جارہی ہیں اور کچھ نئے سائینٹفک عمل اور طریقے سوچے جارہے ہیں۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں اسٹیل کی پیدایش دو کروڑ پچاس لاکھ ٹن تک پہنچ جائے گی۔ یہ مقدار جنگ سے پہلے کے مقابلے میں کوئی ۳۵ فی صد زیادہ ہوگی۔ خاص خاص دھاتوں کی پیداوار تیزی کے ساتھ بڑھنے لگے گی سنہ ۱۹۵۰ء تک میگنیشیم، سیسہ، جست، ٹنگسٹن اور رانگے کی پیداوار میں بالترتیب ۲٫۷، ۴، ۴، ۲٫۵، ۲٫۶، ۲٫۷ گنا کا اضافہ ہوگا۔ مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ان دھاتوں کا سوال ہے روس کو جنگ اور امن دونوں زمانوں کے لیے دوسرے ملکوں کی امداد و اعانت سے بے نیاز کردیا جائے۔

بھاری صنعتیں ـــــ مثلاً کوئلے، لوہے، اسٹیل اور تیل وغیرہ کی صنعتیں ـــــ سوویت معاشی نظام میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان صنعتوں میں کام کرنا چوں کہ باعثِ تکلیف ہوتا ہے اس لیے ہمیشہ مزدوروں اور کام کرنے والوں کی کمی کا سوال درپیش رہتا ہے۔ اُن کے کام کو دلچسپ اور کشش انگیز بنانے کے لیے نئے نئے طریقے سوچے جارہے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ مزدور حاصل کیے جاسکیں۔ چناں چہ سب سے پہلے تو یہ کہا گیا ہے کہ ان صنعتوں میں تنخواہیں زیادہ رکھی گئی ہیں۔ روس میں کوئلے کھودنے والے کو ۳ ہزار سے لے کر ۶ ہزار روبل تک ماہانہ دیا جاتا ہے یہ سوویت ملک میں گویا سب سے اونچی تنخواہ کے لگ بھگ ہے۔ ایک ماہ کی چھٹی تنخواہ کے ساتھ دی جاتی ہے۔ اور ۵۰ فی صد کی رعایت کے ساتھ بعض اشیا مہیا کی جاتی ہیں تاکہ کوئلے کھودنے کی صنعت میں مزدوروں کی قلت نہ رہے۔ زراعت کی ترقی کے لیے بھی کافی انتظام کیا گیا ہے۔ سوویت روس میں زراعت بالکل مشینوں سے ہوتی ہے اس لیے وہاں زراعت کی ترقی و توسیع کا انحصار صنعتی پیداوار پر ہے خاص کر مشینوں، ٹریکٹروں وغیرہ کی پیداوار پر۔ اس طرح جہاں تک زراعتی صورتِ حال کی درستگی اور بحالی کا سوال ہے روس میں صنعت کی بہ نسبت زیادہ مشکلات حائل ہیں۔ سرکاری اعداد کی رو سے جنگ میں روس کے ۱۳۷۰۰۰ ٹریکٹر اور ۴۹۰۰۰ "فصل کاٹنے والے جتھے"[1] برباد ہوئے۔ جب جرمن فوجیں آگے بڑھیں تو صنعتوں کے سامان تو آسانی کے ساتھ مغرب سے مشرقی علاقوں میں منتقل کر دیے گئے۔ لیکن زراعتی سامان بڑی تعداد میں منتقل نہیں کیے جاسکے۔ کُل ملا کر ۰۰۰ ٹریکٹر مشرقی علاقوں میں لے جائے جاسکے جنگ کے ختم ہونے کے بعد کُل ملا کر ۲۶۰۰۰ ٹریکٹر آزاد شدہ علاقوں میں بھیجے جاسکے ہیں لیکن یہ تعداد ٹریکٹروں کی اُس تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے جو جنگ سے پہلے اُن علاقوں میں مستعمل تھی۔

جنگ کے زمانے میں زراعتی دولت کو دشمن کے ہاتھوں میں پہنچنے سے روکنے کے لیے خود روس نے بڑے پیمانے پر اپنی اشیا کو تباہ و برباد کردیا تھا۔ ان باتوں کی وجہ سے پھر جنگ کے دوسرے اثرات کی وجہ سے بھی اور مویشیوں کی کمی ہوجانے کے سبب زمین کی قوتِ پیدایش گھٹ گئی ہے۔ مشینوں اور دیگر آلات و سامان کی تباہی سے زراعتی پیداوار تو کم ہو ہی گئی ہے

---

[1] ایک نئی قسم کی زراعتی مشین

اس کے علاوہ ایک اور سماجی نقصان بھی پہنچا ہے۔ اور وہ یوں کہ ٹریکٹر نہ صرف ایک فنی چیز کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ اُس کے ذریعے پنچایتی کھیتوں میں اتحاد اور وحدت بھی قائم رہتی ہے۔ اب چوں کہ بہت سے پنچایتی کھیتوں میں ٹریکٹر نہیں رہے اس لیے کسانوں نے مجبوراً انفرادی طور پر کاشت کاری شروع کر دی ہے۔ بہرحال جلد ہی ٹریکٹر کے بڑی تعداد میں مہیا ہو جانے کے بعد یہ صورتِ حال دُور ہو جائے گی۔ کسانوں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۵۰ء تک ۷ لاکھ ۲۰ ہزار ٹریکٹر تیار ہو جائیں گے۔ برقی طاقت سے بھی زراعتی حالات کی درستگی میں بڑی مدد ملے گی۔ نئے منصوبے کے تحت برقابی طاقت مہیا کرنے والے اسٹیشن تعمیر کیے جائیں گے جن کی مدد سے ٹریکٹروں کو چلایا جائے گا۔

اب سوال یہ رہ گیا کہ نئے منصوبوں کو عمل میں لانے کے لیے مالیات کا کیا بندوبست کیا گیا ہے۔ آیندہ پانچ سالوں میں سرمائے کے طور پر لگانے کے لیے ۲ کھرب ۵۰ ارب روبل کا تخمینہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اتنی عظیم رقم کی ضرورت کے باوجود نئے پلان کے تحت لوگوں پر ٹیکس بہت کم لگائے جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ اتنا بڑا سرمایہ آئے گا کہاں سے؟ کچھ تو گزشتہ سالوں کی بچت کی رقموں سے کام لیا جائے گا لیکن اصل سرمایہ اُس آمدنی سے حاصل ہوگا جو مسلسل طور پر بڑھتی اور ترقی کرتی ہوئی زراعتی اور صنعتی طاقتوں سے پیدا ہوگی۔ روس میں چوں کہ تمام مشینیں، پلینٹ، سامان، ذرائع حمل و نقل وغیرہ انفرادی سرمایہ داروں کی ملکیت میں نہیں بلکہ ریاست کی ملکیت میں ہیں اس لیے جو کچھ منافع حاصل ہوگا وہ ریاست کے خزانے میں جائے گا اور وہ منافع منصوبوں کو عمل میں لانے کے لیے صرف کیا جائے گا۔ چناں چہ سوویٹ مُلک میں اور ملکوں کے برخلاف دراصل یہ کوئی پریشان کن سوال نہیں ہے کہ منصوبوں کو چلانے کے لیے رقمیں کہاں سے لائی جائیں۔

صنعتی مال کی پیدایش کے اخراجات میں ۱۷ فی صد کی کمی، ریلوں کے حمل و نقل کے اخراجات میں ۸ فی صد کی کمی اور زرعی سامان کی پیدایش کے اخراجات میں ۱۶ فی صد کی کمی ہوگی جس سے ا کھرب ۶۰ ارب روبل کی بچت ہوگی۔ پیدایش کے اخراجات میں کمی کرنے کے لیے روس میں مختلف طریقے رائج ہیں۔ اُن میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ مزدوروں کو "قومی مزدوری فنڈ" سے تنخواہیں دی جاتی ہیں اور یہ فنڈ بجٹ کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

اس طرح تنخواہوں کا پیدایش کے اخراجات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بھاری بھاری صنعتیں (مثلاً کوئلہ کھودنے کی صنعت) اس فنڈ سے جتنی رقم لی جاتی ہے اُس سے کم ہی رقم اُن سے وصول ہوتی ہے۔ لیکن تمباکو اور عطریات کی صنعتوں کے لیے اس فنڈ سے جتنی رقم علاحدہ کی جاتی ہے اُس سے زیادہ اُن صنعتوں سے وصول ہو جاتی ہے۔ اس طرح گویا کم اہم صنعتوں کے منافع سے سرمایہ لے کر زیادہ اہم صنعتوں میں لگایا جاتا ہے۔

روس کو ایک اور فائدہ یہ ہے کہ وہاں جنگ سے بہت پہلے ہی اجارہ داری اور انفرادی ملکیتوں کا خاتمہ کر دیا گیا تھا

چناں چہ آج وہاں برطانیہ کے برخلاف یہ سوال نہیں ہے کہ صنعتوں کو قومی ملکیت بنانے کے لیے اُن کے گزشتہ مالکوں کو معاوضے کی بڑی بڑی رقمیں کہاں سے دی جائیں۔

پلان کو عمل میں لانے کے دوران میں حکام کی بے جا داخلت سے بچنے کے لیے تقسیمِ عمل سے کام لیا گیا ہے۔ اس وقت روس میں ماہر اور تربیت یافتہ مزدوروں کی کمی ہے۔ لیکن جب مشینیں بڑے پیمانے پر استعمال میں آجائیں گی تو مزدوروں کی قلت کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ صرف شروع زمانے میں البتہ ان مشینوں کو بنانے کے لیے زیادہ مزدوروں کی ضرورت ہوگی۔ یہ مسئلہ اُسی طرح حل کیا جاسکتا ہے جس طرح برطانیہ نے حل کیا ہے یعنی جنگی خدمات سے بڑے پیمانے پر لوگوں کو برخواست کیا جائے تاکہ وہ تعمیری کاموں میں لگ جائیں۔ لیکن اس طریقے کو اختیار کرنے میں روس کے سامنے ایک خاص دقت حائل ہے وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے مکانات اور جائے رہائش کی بڑی تباہی و بربادی ہوئی ہے۔ چناں چہ سپاہی جب فوجی خدمات ترک کرکے کارخانوں میں کام کرنے آئیں گے تو اُن کے قیام کے انتظام کا سوال بہت مشکل ہوگا۔

روس کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں ایک اور سوال غیرملکیوں کے لیے دِل چسپی کا حامل ہے اور وہ یہ کہ روس آیندہ سالوں میں کس حد تک غیرملکوں سے اپنے تجارتی تعلقات استوار کرے گا۔ روس نے ابھی سے کچھ بلقانی مُلکوں اور مرکزی یورپ کے مُلکوں سے تجارتی معاہدے کرلیے ہیں لیکن یہ بات ابھی تک متعین نہیں ہوسکی ہے کہ امریکہ اور برطانیہ سے روس تجارتی تعلقات قائم کرے گا یا نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ روس یہ بات پسند نہیں کرے گا کہ امریکہ سے راست استعمال کی اشیا آکر بھر جائیں۔ اور جب امریکہ میں سرد بازاری کا دور دورہ ہو تو روس کی معیشت پر بھی اس کا خراب اثر پڑے۔ البتہ یہ بات ضرور روس کے لیے مفید ہوگی کہ وہ امریکہ اور دیگر خاص خاص صنعتی مُلکوں سے مشینیں بڑے پیمانے پر منگانا شروع کرے تاکہ معاشی حالات کی ازسرِنو درستگی کے کام میں زیادہ آسانی اور سہولت پیدا ہو اور اس کا عرصہ بھی زیادہ طویل نہ ہو ساتھ ہی راست استعمال کی اشیا کی پیدایش کا زیادہ عرصے تک انتظار نہ کرنا پڑے۔

[ترجمہ از "ایسٹرن اکانومسٹ" نئی دہلی مورخہ ۲۶ راپریل ۱۹۴۶ء]

نظریاتی معاشیات

قدر اور محنت

از ـــــــــ ط ـ ا ـ خ

انسان بہت زمانے سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے اشیا پیدا کرنے پر مجبور ہے۔ اگرچہ ہر زمانے میں اشیا پیدا کرنے کے طریقے بدلتے رہے ہیں۔ قدرت نے ازل ہی سے انسان کے سامنے اپنی بیش بہا نعمتوں اور عطیوں کا دامن پھیلا رکھا ہے لیکن وہ اُن سے ہمیشہ یکساں طور پر منفعت اندوز نہیں ہوا ہے۔ پہلے اُس کی زندگی پر قدرت پورے طور پر حاوی تھی لیکن آج انسان نے بڑی حد تک قدرت کی غلامی اور محکومی سے نجات حاصل کر لی ہے اور قدرت کی طاقتوں پر اُس کے اختیارات بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

اشیا کی پیدائش کا مقصد

اشیا پیدا کرنے کے سلسلے میں پہلے اور آج کے زمانے میں فرق یہ ہے کہ پہلے لوگ اشیا ذاتی استعمال کے لیے بناتے یا پیدا کرتے تھے۔ لیکن آج وہ راست استعمال کے لیے نہیں پیدا کرتے بلکہ تبادلے کے لیے۔ جوتوں کے کسی کارخانے کا مالک جوتے اس لیے نہیں بنواتا کہ خود پہنے یا اپنے خاندان والوں کو پہنائے۔ وہ جوتے فروخت کرنے کے لیے بنواتا ہے اور اس سے جو منافع حاصل ہوتا ہے اُس سے اپنی ضروریات کی چیزیں خریدتا ہے۔ آج انھی خرید و فروخت کی اشیا کو سماج کی دولت سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ دولت کی یہی قسم ہے جو پورے سماج میں عام ہے۔ ہم اس چیز کو سماج کی دولت نہیں قرار دے سکتے جو کوئی ایک شخص خود اپنے لیے پیدا کرے اور لازماً خود ہی استعمال کرے۔ دولت کی پیدائش

کا یہ طریقہ آج محدود بلکہ معدوم ہی۔ آج دولت انھی اشیا کو کہتے ہیں جو تجارت اور تبادلے کے لیے پیدا کی جائیں۔

استعمال اور مبادلہ

وہ اشیا جو خرید و فروخت کے لیے پیدا کی جاتی ہیں یعنی اشیائے مبادلہ اُن کی دو قدریں ہوتی ہیں۔ ایک تو قدرِ استعمال اور دوسری قدرِ مبادلہ۔ یہ ہر کوئی جانتا ہو کہ چیزوں کی بجائے خود کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اُن کی قدر کا تمام تر انحصار اُن کے استعمال پر ہو۔ یعنی اگر وہ انسانی ضروریات پوری کر سکتی ہیں تو ان کی قدر ہو ورنہ وہ مٹی کے برابر ہیں۔ اشیا کی یہ قدر ہمیشہ سے موجود رہی ہو۔ لیکن قدرِ مبادلہ موجودہ عہد کی پیداوار ہو۔ قدرِ مبادلہ سے مراد ہو کسی چیز کا بیچا یا خریدا جا سکنا۔ اوپر کہا جا چکا ہو کہ آج ہر چیز خرید و فروخت یعنی مبادلے کے لیے پیدا کی جاتی ہو۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہو کہ آج جو شے کہ استعمال میں آ سکتی ہو اُس کی خرید و فروخت بھی یقینی طور پر ہوتی ہو۔ دوسرے لفظوں میں آج جس شے کی قدرِ استعمال ہوتی ہو اُس کی قدرِ مبادلہ بھی ضرور ہوتی ہو۔ تبادلہ ہی وہ ذریعہ ہو جس سے ہم کوئی چیز اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں۔ ورنہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پڑی رہے اور کبھی کسی کے استعمال میں نہ آئے۔ اس سے 'استعمال' اور 'مبادلے' کا گہرا تعلق ظاہر ہوتا ہو۔ مبادلے کے دراصل معنی ہیں چیزوں کی قدرِ استعمال کا خریدا اور بیچا جانا اس لیے کہ اگر کوئی چیز قدرِ استعمال سے عاری ہو یعنی اس کا استعمال نہیں ہو سکتا تو پھر اس کے خریدنے اور بیچنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آج سماج کی ضروریات پوری کرنے کا اگر کوئی وسیلہ ہو تو صرف ایک یعنی چیزوں کی قدرِ استعمال کی خرید و فروخت۔ موجودہ سماج میں دولت پیدا ہونے کے فوراً ہی بعد لوگوں کے استعمال میں نہیں آ جاتی بلکہ استعمال میں آنے سے پہلے اُسے متعدد ہاتھوں سے گزرنا پڑتا ہو۔ کارخانے کے مالک سے تھوک فروش کے پاس پہنچتی ہو وہاں سے خردہ فروش کے ہاتھوں میں۔ اس کے بعد کہیں جا کر وہ چیزیں ان لوگوں کے پاس پہنچتی ہیں جو انھیں بیچنے کے لیے نہیں خریدتے بلکہ استعمال کے لیے۔ اسی سلسلے کا دوسرا نام مبادلہ ہو۔ یہ مبادلہ ایک گہرا سماجی رشتہ ہو جس میں سماج کے تمام افراد منسلک اور وابستہ ہیں۔ لیکن یہ سماجی رشتہ یعنی مبادلہ کوئی فطری چیز نہیں ہو۔ ہم اسے انسانی فطرت کا اظہار نہیں قرار دے سکتے۔ مبادلہ فطری اسی وقت ہو سکتا تھا کہ ہمیشہ سے اس کا وجود ہوتا، لیکن ہم جانتے ہیں کہ موجودہ عہد سے پہلے مبادلے کا وجود نہیں تھا۔ اس لیے یہ کوئی فطری نہیں بلکہ مصنوعی چیز ہو۔

مبادلے کی شرطیں

یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دو افراد کے درمیان کب اور کیوں چیزوں کا مبادلہ ہوتا ہو۔ مبادلے کی تین شرطیں ہیں: (۱) جن چیزوں کا مبادلہ کیا جائے وہ مبادلہ کرنے والوں کی ذاتی مِلک ہوں۔ ظاہر ہو کہ مبادلہ کی جانے والی چیز اگر ہماری ذاتی مِلک نہیں ہو تو پھر اُس کو دوسرے فریق کے حوالے کر کے اُس کے بدلے کوئی اور چیز لینے کا ہمیں کوئی حق نہ ہوگا۔ (۲) اگر عمر اور بکر آپس میں اپنی چیزوں کا مبادلہ کر رہے ہیں تو یہ ضروری ہو کہ عمر کے پاس جو چیز ہو وہ بکر کے مصرف کی ہو لیکن خود عمر کے مصرف کی نہ ہو تبھی تو عمر اُس چیز کو بکر کے حوالے کرنا پسند کرے گا۔ یہی بات بکر کی چیز پر صادق آتی ہو۔

(۳) تیسری شرط مبادلے کی یہ ہے کہ جن دو چیزوں کا آپس میں مبادلہ کیا جا رہا ہے وہ بالکل ایک ہی قسم کی نہ ہوں۔ ورنہ پھر مبادلے سے فائدہ؟ ایسے مبادلے سے سوا تضیع اوقات کے اور کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوسکتا۔ مبادلہ ہمیشہ مختلف قسم کی اشیا کے درمیان ہوتا ہے۔

مبادلے کی جو پہلی شرط بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جن چیزوں کا مبادلہ کیا جائے وہ مبادلہ کرنے والوں کی ذاتی ملک ہوں۔ یہ شرط موجودہ سماج کی ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے، اور وہ ہے ذاتی ملکیت کا وجود۔ ذاتی ملکیت کے بغیر مبادلہ وجود ہی میں نہیں آسکتا۔ مبادلے اور ذاتی ملکیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی سے ایک اور اہم بات پیدا ہوتی ہے۔ سطحی طور پر ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مبادلہ چوں کہ دو "چیزوں" کے درمیان ہوتا رہا ہے اس لیے مبادلے سے صرف انھی دو چیزوں کے باہمی تعلقات ظاہر ہوتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو مبادلے سے دو "چیزوں" نہیں بلکہ دو "اشخاص" کے تعلقات ظاہر ہوتے ہیں۔ ذاتی ملکیت کا تعلق افراد اور اشخاص سے ہے اور ذاتی ملکیت ہی پر پورے نظام مبادلہ کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ پھر ذاتی ملکیت ہی سے سماج میں مختلف طبقوں اور ان طبقوں کے افراد کی حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ اس لیے مبادلے سے دراصل افراد اور اشخاص کے باہمی تعلقات کا اظہار ہوتا ہے نہ کہ محض اُن اشیا کے تعلقات کا جن کا تبادلہ کیا جائے۔ مبادلوں کی زیریں سطح میں تارِ عنکبوت کی مانند سماجی تعلقات کے پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے جال پھیلے ہیں جو ذاتی ملکیت کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔

مبادلے کی دُوسری شرط یہ پیش کی گئی ہے کہ مبادلہ کی جانے والی چیز اپنے مالک کے لیے بے مصرف ہو لیکن اُسی چیز کی دُوسرے فریق کو ضرورت ہو۔ اس سے بھی افراد ہی کے سماجی تعلقات ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی اس سے ایک ایسے سماجی نظام کا پتا چلتا ہے جس کے اندر رہ کر لوگ خود اپنے لیے اشیا نہیں پیدا کرتے بلکہ دوسروں کے لیے۔ وہ اپنی ضرورت کی چیزیں دُوسروں سے لیتے ہیں اور دُوسروں کی ضرورت کی چیزیں خود پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو پھر مبادلے کا وجود ہی نہ ہوتا۔

مبادلے کی بنیاد

اب سوال یہ ہے کہ مبادلے کی بنیاد کیا ہوتی ہے؟ کیا دو چیزوں کا اس لیے مبادلہ کیا جاتا ہے کہ دونوں کا مصرف برابر ہوتا ہے؟ کیا فریقین کو تسکین دینے کی طاقت یا صلاحیت دونوں چیزوں میں برابر ہوتی ہے؟ یعنی کیا دونوں کی قدرِ استعمال برابر ہوتی ہے؟ بالکل نہیں۔ مَیں نے بھوک کی حالت میں اپنی پنسل بیچ دی اور اس کے عوض میں مجھ کو صرف ایک روٹی ملی۔ مبادلہ تو ہوگیا لیکن اُس ایک روٹی سے میری پوری تسکین نہیں ہوئی۔ لیکن میں نے جس شخص کو پنسل دی ہے ممکن ہے اُسے پنسل سے پوری تسکین حاصل ہوگئی ہو۔ ثابت ہوا کہ جب دو چیزوں کا آپس میں تبادلہ کیا جائے تو ضروری نہیں کہ اُس وقت دونوں کی تسکین دینے کی قوت یعنی قدرِ استعمال برابر ہو۔ پھر تسکین و تشفی کا تعلق انسان کی داخلی زندگی سے ہے، اس کی اندرونی خواہشات اور جذبات سے جن کو ناپنے کے لیے کوئی خارجہ آلہ ہمارے پاس نہیں۔ کسی وقت کسی شخص کی تسکین کے لیے کتنی اشیا کی ضرورت

ہے اس کا صحیح تعین بہت مشکل ہے۔ انسانی خواہش ہر آن بدلتی رہتی ہے۔ تو پھر آخر مبادلے کی کیا بنیاد ہے؟ کیا دو چیزوں کا اس لیے مبادلہ ہوتا ہے کہ دونوں کے بنانے میں برابر محنت صرف ہوئی ہے؟ یہ بھی غلط ہے۔ آئے دن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی چیزوں کا مبادلہ ہوتا رہتا ہے جن پر یکساں نہیں بلکہ کم و بیش محنت صرف ہوئی ہے۔ البتہ ہمیں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ دونوں چیزوں کے بنانے میں محنت یقیناً صرف ہوئی ہے۔ اس لیے مبادلے کی بنیاد یہی عام انسانی محنت ہے۔ یعنی دو چیزوں کا محض اس لیے مبادلہ ہوتا ہے کہ دونوں کے بنانے میں انسانی محنت صرف ہوئی ہے۔ دُنیا کی تمام اشیائے مبادلہ میں بس یہی اک بات مشترک ہے۔ کون سی بات؟ یہی کہ وہ انسانی محنت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی تھیں۔ انسانی محنت ہی اشیا کو قدر عطا کرتی ہے اس لیے انسانی محنت ہی کا دوسرا نام قدر ہے۔ قدر اگر کوئی چیز ہے تو وہ مزدور کی محنت ہے۔

محنت

ہر قسم کی محنت کی اصل حقیقت ایک ہی ہوتی ہے، چاہے وہ دماغی محنت ہو یا جسمانی محنت، عام مزدوروں کی محنت یا تربیت یافتہ مزدوروں کی محنت۔ دونوں میں درجے کا فرق ضرور ہے لیکن دونوں کی اصلیت ایک ہی ہے۔ اس لیے کہ ہر قسم کی محنت میں انسانی قوت، یعنی دماغ، دیگر اعضا اور اعصاب کا استعمال ہوتا ہے۔ ہم جنس (HOMOGENOUS)، معمولی، یکساں اور اوسط قوت محنت ہر جان دار شے کے جسم میں موجود رہتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ اوسط محنت مختلف ملکوں اور زمانوں کے ساتھ کم یا بیش ہو سکتی ہے لیکن ایک ہی زمانے میں اور ایک ہی مقام پر وہ یکساں ہوتی ہے۔

محنت اور وقت

محنت کے استعمال کے سلسلے میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ وقت ہی سے ہم محنت کے ناپنے کا پیمانہ بنا سکتے ہیں۔ ایک مزدور نے کم محنت کی یا زیادہ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس نے کتنے گھنٹے کام کیا۔ بعض وقت ہی محنت کی اکائی یا محنت کا پیمانہ ہے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ کسی چیز کی قدر کا انحصار محنت پر ہے۔ محنت ہی کا دوسرا نام قدر ہے۔ اس لیے کہ انسانی محنت کے بغیر کوئی چیز استعمال میں آ ہی نہیں سکتی۔ لیکن کسی چیز کے بنانے میں صرف محنت ہی کا سوال نہیں پیدا ہوتا بلکہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کتنے عرصے کی محنت میں یہ چیز پیدا ہوئی۔ چناں چہ اب اگر قدر کی تعریف کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ قدر وہ "موصنہ محنت" ہے جو کسی چیز کے بنانے میں صرف ہوتا ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر قسم کی محنت سے قدر نہیں پیدا ہوتی بلکہ صرف اسی محنت سے جس سے انسان کی ضروریات پوری ہوں۔ اگر کوئی شخص سمندر کے کنارے دن رات ٹوکری میں ریت بھر بھر کر سمندر میں پھینکتا رہے تو اس کی یہ محنت قدر نہیں پیدا کر سکتی اس لیے کہ اس سے سماج کی ضروریات نہیں پوری ہو سکتیں۔

جو محنت سماج کی حاجت روائی کرتی ہے اس کی ایک اور خصوصیت ہوتی ہے۔ ایسی محنت ہمیشہ رائج طریقۂ پیدائش اور عام حالات پیدائش کے تقاضوں کے مطابق چلتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسی محنت سے سماج کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں اور قدر پیدا

ہوسکتی ہے جو اشیا پیدا کرنے کے رائج طریقوں کو کام میں لانے کے لیے ضروری ہو۔ مثلاً آج کا رائج طریقہ یہ ہے کہ مشینوں سے چیزیں پیدا کی جاتی ہیں۔ اس لیے آج اسی محنت سے سماج کی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں یا قدر پیدا ہوسکتی ہے جسے مشین ضروری قرار دے اور جو موجودہ زمانے کے دیگر حالات و شرائط پیدائش کے پیش نظر ضروری ہو۔ مثال کے طور پر آج مشین کے ذریعے ایک گز کپڑا تیار کرنے میں دس منٹ لگتے ہیں تو یہ دس منٹ کی محنت آج کے زمانے کے لحاظ سے "ضروری محنت" ہوئی۔ یہی محنت سماج کی ضرورت پوری کرسکتی ہے یا قدر پیدا کرسکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس زمانے میں کرگھے اور چرخے کے ذریعے ایک گز کپڑا تیار کرنے میں پورا ایک گھنٹہ صرف کردیتا ہے تو اس کی گویا پچاس منٹ کی محنت اکارت جاتی ہے۔ اس لیے کہ اسے معاوضہ صرف دس ہی منٹ کا ملے گا۔ وہ مجبور ہوگا کہ اپنے زیادہ عرصے کی محنت سے تیار کیا ہوا کپڑا اسی دام پر فروخت کرے جس پر کم عرصے کی محنت سے تیار کیا ہوا کپڑا فروخت ہوتا ہے یعنی ایک گھنٹے کی محنت کا کپڑا دس منٹ کی محنت کے کپڑے کے داموں پر فروخت ہوگا۔ اس طرح اس کے پچاس منٹ ضائع جائیں گے۔ یعنی ان سے سماج کو کوئی فائدہ نہ ہوگا اور نہ قدر پیدا ہوگی۔ مشین کے بنے ہوئے کپڑے کے سامنے بازار میں ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کیوں نہیں ٹھیرتے اس کو سمجھنے کے لیے مندرجہ بالا اصول کا سمجھنا ضروری ہے۔ جیسے جیسے چیزیں پیدا کرنے کے طریقوں اور آلات میں ترقی و تبدیلی ہوتی جائے گی اسی کے مطابق اس محنت کی مقدار بھی گھٹتی چلی جائے گی جو سماجی لحاظ سے ضروری ہوتی ہے۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کو اگر ہم مختصراً بیان کریں تو وہ یہ ہوگا:۔ انسان ہمیشہ سے اپنے آرام و آسائش کے لیے چیزیں پیدا کرتا اور بناتا رہا ہے۔ کسی زمانے میں چیزیں براہ راست استعمال کے لیے بنائی جاتی تھیں آج تبادلے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ قدر مبادلہ کا انحصار قدر استعمال پر ہوتا ہے اس لیے کہ جو چیز استعمال کے قابل نہیں اس کا مبادلہ نہیں ہوسکتا۔ مبادلہ چونکہ بعد کی پیداوار ہے اس لیے یہ کوئی فطری نہیں بلکہ مصنوعی چیز ہے۔ مبادلہ ذاتی ملکیت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ پھر مبادلے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر کوئی خود اپنے لیے چیزیں نہ پیدا کرے بلکہ دوسروں کے لیے۔ مبادلہ ایک سی چیزوں میں نہیں بلکہ مختلف چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ دو چیزوں میں مبادلہ اس لیے نہیں ہوتا کہ دونوں کی تسکین دینے کی قوت برابر ہوتی ہے اور اسی لیے بھی نہیں کہ دونوں کے بنانے میں برابر محنت خرچ ہوئی ہے، بلکہ دو چیزوں کا مبادلہ اس بنا پر ہوتا ہے کہ دونوں کے بنانے میں کم و بیش لیکن ایک عام انسانی محنت صرف ہوئی ہے۔ یہی محنت چیزوں کو قدر عطا کرتی ہے جو مبادلے کے ذریعے خریدی اور فروخت کی جاتی ہے۔ ہر قسم کی محنت کی اصلیت ایک ہی ہوتی ہے۔ محنت کا اندازہ وقت سے ہوتا ہے۔ کسی چیز کے بنانے میں کتنے عرصے کی محنت صرف ہوئی ہے اسی سے اس کی قدر کا تعین ہوتا ہے۔ لیکن قدر پیدا

کرنے کے لیے دو اور باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو محنت کی جائے وہ سماج کے لیے مفید ہو دوسرے وہ رائج آلاتِ پیدائش اور دیگر حالاتِ پیدائش پر مبنی ہو۔

اتنا جان لینے کے بعد اب ہم محنت سے متعلق ایک اہم بحث پر آتے ہیں۔ یہ بتایا جا چکا ہی کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہر قابلِ استعمال چیز بہ راہِ راست استعمال کے لیے نہیں پیدا کی جاتی بلکہ مبادلے کے لیے۔ ہمارے پاس جو بھی قابلِ استعمال چیز پہنچتی ہی وہ مبادلے کے ذریعے۔ کام کرنے والے کی محنت بھی ایک قابلِ استعمال چیز ہی۔ اس لیے اُس کا بھی مبادلہ ہوتا ہی مزدور اپنی محنت کا بہ راہ راست خود استعمال نہیں کرتا، اس لیے کہ اس کے پاس ذرائعِ پیدائش، یعنی آلات و مشینیں نہیں ہیں۔ وہ اپنی محنت فروخت کرتا ہی اور سرمایہ دار اس کی محنت خریدتا ہی اس طرح محنت کا مبادلہ ہوتا ہی۔ لیکن یہ بھی ہمیں معلوم ہی کہ ہر قابلِ استعمال شے کے پیدا کرنے میں محنت درکار ہوتی ہی۔ ایسی محنت جو سماجی لحاظ سے ضروری اور مفید ہو۔ تو مزدور کی محنت جیسی قابلِ استعمال شے کے پیدا کرنے میں کس قسم کی محنت صرف ہوتی ہی؟ یہ محنت (یعنی محنت پیدا کرنے والی محنت) وہی ہی جو مزدور کو محض زندہ اور توانا رکھنے کے لیے ضروری ہوتی ہی۔ یعنی مزدور کی مزدوری۔ یہ مزدوری دے کر سرمایہ دار اس کی صرف دو گھنٹے کی محنت کی قیمت ادا کرتا ہی اور بقیہ چھ گھنٹوں کی محنت کا معاوضہ خود سرمایہ دار کی جیب میں چلا جاتا ہی۔ یہی فالتو دولت یا فالتو قدر جمع ہوتے ہوتے عظیم سرمایوں کی شکل اختیار کر لیتی ہی۔

———※(※)※———

معاشی صورت حال

(۱) لیبر وزارت کا پہلا بجٹ

(۲) غذا

لیبر وزارت کا پہلا بجٹ

از : ————— ادارہ

برطانیہ کے نئے بجٹ پر نظر ڈالنے کے بعد جو سب سے ضروری بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مخصوص طور پر متوسط طبقے کے لوگوں کو فائدہ پہنچنے کی امید ہے ٹیکسوں میں جو رد و بدل کیا گیا ہے اس سے زیادہ تر اسی طبقے کے لوگ فائدہ اٹھائیں گے۔ نئے بجٹ کی رو سے ۲۵ لاکھ آدمی انکم ٹیکس کی زد سے محفوظ ہو جائیں گے کمائی آمدنی کا اضافہ شدہ بھتہ ۱۵۰ پونڈ سے نیچے کی آمدنیوں تک محدود رہے گا۔ انکم ٹیکس میں جو کمی کی گئی ہے اس سے حکومت کی آمدنی میں ۳ کروڑ ۴۰ لاکھ پونڈ کی کمی واقع ہوگی۔ متوسط طبقے کی ضروریات کے پیش نظر

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

تفریحات ٹیکس میں جو کمی کی گئی ہے اس سے بھی ایک کروڑ ۳۰ لاکھ پونڈ کا خسارہ حکومت کو برداشت کرنا ہوگا۔ ان کمیوں کو پورا کرنے کے لئے فوتی محصولات میں رد و بدل کیا گیا ہے۔ ۲۱ ہزار ۵ سو سے اوپر کی جایداد پر ۷۵ فی صد تک محصول لگایا جائے گا۔ اس سے حکومت کی آمدنی میں ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ پونڈ کا اضافہ ہوگا۔ حال آں کہ نئے انتظام کی رو سے اب ۱۰۰ پونڈ کی بجائے ۲۰۰۰ پونڈ تک کی جایداد محصولِ جایداد سے بری کر دی گئی ہے۔ کوئی ایک لاکھ ۵۰ ہزار جایدادیں محصولِ جایداد ادا کرنا بند کر دیں گی اور بقیہ ۵۰ ہزار جایدادوں میں ۳۰ ہزار جایدادیں تخفیف شدہ محصول ادا کریں گی۔ پھر بھی محصولِ جایداد کی آمدنی میں اضافہ ہی ہوگا۔ اس رد و بدل کا مقصد واضح ہے۔ وہ یہ کہ متوسط طبقے

کو اوپر کی سطح پر لایا جائے۔ خریداری ٹیکس میں جو تبدیلی کی گئی ہے اُس سے بھی متوسط طبقے ہی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ بہت سی گھریلو اشیا ٹیکس سے بری کردی گئی ہیں۔ کچھ پر ٹیکس میں کمی کی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود گزشتہ سال کی بہ نسبت اس سال اس ٹیکس کے ذریعے ۵ کروڑ پونڈ زیادہ ہی کی آمدنی ہوگی۔ اس لیے کہ اِس سال خریداریاں زیادہ بڑے پیمانے پر ہوں گی۔

اخراجات کی مد میں بھی متوسط طبقے ہی کے مفاد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ۵۰ کروڑ پونڈ اس طبقے کے فائدے کے کاموں میں صرف کیے جائیں گے۔ یہ رقم پورے اخراجات یعنی ۳ ارب ۸۸ کروڑ پونڈ کا تقریباً ⅛ حصہ ہے۔ ۵ کروڑ پونڈ دیگر کھلی جگہوں کے تفریحی اور دوسرے انتظامات قائم کرنے کے لیے زمین کی خریداری کے لیے علاحدہ کیے گئے ہیں۔ فوجیوں کی تنخواہوں اور بھتوں میں بھی اضافے کیے گئے ہیں جس سے حکومت کی آمدنی میں دو کروڑ پونڈ کی کمی واقع ہوگی۔ مزید برآں جنگی پنشنوں کے سلسلے میں بھی ایک کروڑ پونڈ سالانہ خرچ ہوں گے۔

نئے بجٹ کے ذریعے برطانوی مالیات کی بنیاد کو قرضوں پر سے ہٹا کر ٹیکسوں پر قائم کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے مالیات میں ٹیکس اور قرضے کا تناسب آدھے آدھ کا تھا اور اب اسے بالترتیب ۸۲ فی صد اور ۱۸ فی صد کر دیا گیا ہے۔

زائد منافع ٹیکس جنوری ۱۹۴۷ء سے منسوخ ہو جائے گا۔ دسمبر ۱۹۴۶ء تک ۶۰ فی صد کی شرح سے اس ٹیکس کو برقرار رکھا جائے گا۔ لیکن "قومی بچاؤ کا چندہ" کے نام سے جو ٹیکس جاری ہے اُسے قائم رکھا گیا ہے۔ یہ ایک شلنگ فی پونڈ کی شرح سے تقسیم سے پہلے منافع کی تمام رقموں پر لگایا جائے گا۔ اِس سے حکومت کو کوئی ۵ کروڑ پونڈ کی آمدنی ہوگی۔

متوسط طبقے کو فائدہ پہنچانے کے علاوہ موجودہ بجٹ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس سے اشیا کی پیدائش بڑھانے اور سرمائے کو کاروبار میں لگانے کی تحریک پیدا ہوگی۔ جہاں تک امیر طبقے کا سوال ہے غور سے دیکھا جائے تو اسے اتنا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے جتنا خوف کیا جاتا تھا۔ سوائے بنک، ذرائع رسل و رسائل اور برقی طاقت کے جنھیں پورے طور پر قومی ملکیت بنا دیا جائے گا اور تمام میدانوں میں ذاتی کاروبار کے اصول کو نہ صرف قائم رکھا گیا ہے بلکہ اور اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر بھی امیر طبقے پر پہلے کی بہ نسبت کافی بوجھ ڈالا گیا ہے۔ جو لوگ امیر ترین ہیں انھیں خاص طور پر اپنی آمدنیوں کے عظیم حصے حکومت کی آمدنی کے نذر کرنے پڑیں گے۔ محصول جائداد کی شرح کو اور بڑھانے کی تجویز ہے جس سے امیر طبقے کی آمدنی کا مزید حصہ حکومت کے پاس چلا آئے گا۔ انکم ٹیکس میں صرف ایک شلنگ فی پونڈ کی کمی کی گئی ہے۔ بالواسطہ ٹیکس اور بلا واسطہ ٹیکس معمولی ردوبدل کے باوجود بھی اُسی اونچی سطح پر قائم رہتے ہیں۔ ۴۷-۱۹۴۶ء کے لیے دفاعی اخراجات کے لیے جو رقم علاحدہ کی گئی ہے وہ مجموعی اخراجات کا ۳۴ فی صد حصہ ہے اور مجموعی آمدنی کا ۴۲ فی صد حصہ۔ جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد بھی اور بین الاقوامی امن کی حمایت میں اس قدر چرب زبانی کے باوجود دفاعی امور کے لیے اِتنی عظیم رقم دیکھ کر ہمیں دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔

بہ حیثیتِ مجموعی یہ کہا جاسکتا ہو کہ موجودہ حکومت خود کو جیمع ہیج کراشتراکی قرار دیتے ہوئے بھی برطانوی معیشت کو کافی حد تک سماجی اور ریاستی نگرانی کے تحت نہ لاسکی۔ اور اب بھی ذاتی کاروبار کے ہاتھوں میں کافی اختیار و اقتدار موجود ہو۔

اناج

امریکہ سے واپس آنے کے بعد ہندستانی غذائی وفد نے اتحادی غذائی بورڈ کی امداد کے بارے میں جو اعلان کیا اُس سے امید پیدا ہو چلی تھی کہ اب اناج کی کمی کا مسئلہ اتنا خطرناک نہیں رہا۔ سر راماسوامی مدالیر نے جتنی مقدار بتائی تھی وہ اور اندرونِ ملک کے ذرائع سے حاصل ہونے والا غلہ ـــــ بلا کر ضرورت کے لیے کافی تھا مگر بعد میں اتحادی غذائی بورڈ نے اس بات سے صاف انکار کر دیا کہ ہندستان کے لیے غلے کی کسی خاص مقدار کا تعین کیا گیا ہو۔ ٹھیک اس وقت جب کہ قلت کا زمانہ قریب آگیا تھا اتحادی غذائی بورڈ کے اِس انکار نے ہمارے درمیان ایک بم سا پھینک دیا۔ اُس کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سابق صدر مسٹر ہوور ہندستان آئے تاکہ یہاں کے حالات کا خود اپنی آنکھوں سے مطالعہ کرکے غذائی صورتِ حال کا اندازہ لگائیں۔ انھوں نے جنوبی ہند اور دیگر قلت زدہ علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد جو رپورٹ پیش کی ہو وہ صورتِ حال کا صحیح نقشہ پیش کرتی ہو۔ اس کا امریکی حکومت اور اتحادی غذائی بورڈ کے حکام پر خاطر خواہ اثر پڑا۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ قحط اگر واقعی ابھی نہیں پہنچا ہو تو اب پہنچنے والا ہی ہو۔ جنوبی ہند کے قلت زدہ علاقوں کی بدحالی پر انھوں نے خاص طور سے زور دیا۔ جہاں تک باہری امداد کا سوال ہو سابق صدر ہوور نے بتایا کہ امداد نہ صرف برِّ اعظم امریکہ سے آنی چاہیے بلکہ بحرِ ہند کے کنارے جو ممالک آباد ہیں وہاں سے بھی یعنی افریقہ، برما، سیام، آسٹریلیا وغیرہ سے۔ یہ بات امریکہ میں اب بالکل ظاہر ہو گئی ہو کہ ہندستان میں واقعی غلے کی شدید قلت ہو اور وہاں فوری طور پر امداد پہنچنا اشد ضروری ہو۔ امریکی مشرق بعید کمیٹی نے ریاست ہائے متحدہ کی حکومت کو مشورہ دیا ہو کہ جاپان کو غلہ کم بھیجا جائے صرف اتنا ہی غلہ بھیجا جائے جتنا مقیم افواج کے تحفظ کے لیے ضروری ہو۔ امریکی حکومت نے کم خوراکی کی حمایت اور غلے کی بربادی کے خلاف ایک کُل مُلک تحریک چلادی ہو تاکہ فاضل غلہ ایک جگہ فراہم کرکے قلت زدہ علاقوں میں بھیجا جاسکے۔ حکومتِ برطانیہ نے روٹی کے خرچ میں ۱۲½ فی صد کی کمی اور بارلی کے خرچ میں ۱۵ فی صد کی کمی کرنے کا انتظام کیا ہو۔ لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ امریکہ میں اب بھی یورپ کی قلت کو ہندستان کی قلت سے زیادہ شدید سمجھا جارہا ہو اور سابق صدر ہوور کی سفارشات پر ہندستان کو غلہ بھیجنے کا وعدہ کرنے کے بعد بھی اُن کی زیادہ تر توجہ یورپ ہی کی طرف مبذول ہو۔ پھر امریکہ سے جو غلہ قلت زدہ ملکوں میں بھیجا جارہا ہو اُس کی فراہمی میں بھی دقت پیش آرہی ہو۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ

کے ناظمِ زراعت نے اعلان کیا کہ امریکہ سے قلت زدہ علاقوں کو گیہوں سے لدے ہوئے ۱۲ جہاز جانے والے تھے مگر چوں کہ غلّے کی فراہمی نہیں ہو سکی اس لیے نہیں جا سکے۔ جہازوں پر جگہ کی قلت کا سوال بھی ایک رُکاوٹ بنا ہوا ہی۔

جہاں تک اندرونِ مُلک کے ذرائع اور وسائل کو پُورے طور پر کام میں لانے کا سوال ہی ہر ممکن کوشش جاری ہی۔ پنجاب میں گیہوں کی وصولی کے انتظامات مکمل کر دیے گئے ہیں جن کے تحت دو مربع زمین سے زیادہ زمین رکھنے والے کاشت کاروں کو اپنے گیہوں کا ایک خاص مقدار حکومت کے حوالے کر دینی ہی۔ ہمارا خیال ہی کہ دو مربع زمین کی حد جو قریب قریب ۵۰ ایکڑ زمین کے برابر ہوتی ہی بہت زیادہ ہی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اِس سے کم زمین رکھنے والوں سے بھی گیہوں کی وصولی لازمی کر دی جاتی۔ اس لیے کہ پچاس ایکڑ یا اس سے کچھ کم زمین رکھنے والوں کے پاس نجی استعمال کے بعد کافی غلّہ بچ رہتا ہی بہ شرطے کہ خاندان کے افراد کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ نہ ہو۔ یو، پی میں بھی اناج کی وصولی کے کچھ اسی قسم کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ ریاست حیدر آباد اور صوبہ بہار میں غلّے کی زبردستی وصولی کا پہلے ہی سے انتظام ہی۔ وسطی صوبے، مدراس، ممبئی، ٹراونکور، کوچین اور میسور میں غلّے کی فراہمی کا اجارے داری والا طریقہ رائج ہی۔

سندھ کا صوبہ غلّے کی پیداوار کے لحاظ سے بہت خوش قسمت صوبہ ہی۔ وہاں پیداوار ضروریات سے فاضل ہوتی ہی۔ وہاں ہر سال کوئی ۷۰ ہزار ٹن چنا پیدا ہوتا ہی جس میں سے . . . ۳۰ ٹن چنا بچ جاتا ہی۔ سندھ میں غلّے کے لحاظ سے صورتِ حال اس لیے اچھی ہی کہ اوّلاً تو وہاں گیہوں، چاول اور چنا تینوں قسم کے غلّے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا دُوسرے صوبوں میں شاید ہی ہوتا ہی۔ دُوسرے کئی سال سے سندھ کی حکومت نے صوبے سے غلّہ باہر بھیجنے کا سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہی۔ اس طرح افراطِ پیداوار اور بہتر انتظام دونوں باتوں نے مِل کر سندھ کی غذائی صورتِ حال کو اطمینان بخش بنا دیا ہی اور آج وہ اس پوزیشن میں ہی کہ ہندُستان کے قلت زدہ علاقوں کی امداد کرے۔ یہ بات اُمید افزا ہی کہ قلت زدہ علاقوں کی امداد کے لیے مُلک بھر کے غلّے کی برابر تقسیم کی جو پالیسی حکومتِ ہند نے بنائی تھی وہ کام یاب ہوتی نظر آ رہی ہی۔

———※(·※·)※———

معاشیات

جلد ۱ — جون سنہ ۱۹۴۶ء — نمبر ۶

فہرستِ مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱	ہندستانی سیاست کی معاشی بنیادیں	اڈیٹر	۲
۲	ہندستان کے صنعتی مزدور	ادارہ	۶
۳	ریل اور سڑک کی ہم آہنگی اور شرحوں کا تعین	ڈی۔ آر۔ گیڈگل	۱۵
۴	معاشیات کیا ہی؟	ابوسالم ایم۔ اے (علیگ)	۲۳
۵	برطانیہ اور امریکی قرضہ	ادارہ	۳۱
۶	ابنِ خلدون عہدِ متوسط کا ایک معاشی مفکر	مظہر۔ ح۔ یوسف بی۔ اے	۳۶
۷	صنعتی ترقی کے کچھ لازمی شرائط	محمد احمد بی کام	۳۹
۸	ریلوے ہڑتال؛ غذائی محاذ	ادارہ	۴۱
۹	انجمنِ ترقیِ اردو کی وضع کردہ چند معاشیاتی اصطلاحات	ادارہ	۴۴

اداریہ

ہندستانی سیاست کی معاشی بنیادیں

از: ——— اڈیٹر

یہ ایک فطری امر ہی کہ اس وقت ہم سیاسی گتھی کو سلجھائے بغیر نہ صرف معاشی لحاظ سے بلکہ زندگی کے کسی بھی میدان میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ سیاسی حل اس وقت زندگی کے تمام مسائل کی کنجی ہی۔ سماج کی زندگی جب بنیادی تبدیلیوں سے دوچار ہوتی ہی تو اس وقت ہر مسئلہ، چاہے اس کی نوعیت اور ماہیت کچھ بھی ہو، سیاسی شکل اختیار کر لیتا ہی اور اس کا حل بھی لازمی طور پر سیاسی ہو جاتا ہی۔ چناں چہ ہمارے معاشی مسائل کا حل بھی دراصل آج سیاسی ہی۔ کام یاب سیاسی حل کے بغیر ہمارے تمام معاشی مسائل جوں کے توں پڑے رہیں گے۔

آج کل عام غلطی یہ کی جاتی ہی کہ معاشی مسائل کو سیاست سے بالکل علاحدہ کر دیا جاتا ہی۔ اور اس بنیادی حقیقت سے صاف انکار کر دیا جاتا ہی کہ سیاست بنیادی معاشی طاقتوں کی پیداوار ہوتے ہوئے بھی معاشی زندگی پر اپنا ردِ عمل ثبت کر سکتی ہی اُسے متاثر کر سکتی ہی اور اس کی شکل بدل سکتی ہی۔ سیاسیات اور معاشیات کی یہ غیر فطری علاحدگی دراصل اُن نئے معاشی نظریوں کی پیداوار ہی جو سرمایہ دارانہ نظام کی گرتی ہوئی در و دیوار کو تھامنے کے لیے زمانۂ حال کے چند مغربی معاشی مفکرین نے پیش کیے ہیں۔ یہ معاشی نظریے کلاسیکی معاشیات کے مستند اور بنیادی اصولوں سے بغاوت پر مبنی ہیں۔ لالڈ

کینز مرحوم اُن نظریوں کا سب سے بڑا خالق تھا۔ چناں چہ اُس کے افکار میں سیاسیات اور معاشیات کو بالکل مصنوعی اور غیر فطری طور پر ایک دُوسرے سے علاحدہ کر دیا گیا ہے۔

ہندُستانی سیاست کی معاشی بنیادوں کو واضح کرنے کے سلسلے میں آج کل معاشی وحدت کے نعرے کو مضبوط مرکزی حکومت کی حمایت کا آلۂ کار بنالیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ طرزِ عمل نہ صرف یہ کہ غیر سائنٹی فک ہے بلکہ فرسودہ اور ایک حد تک شرارت آمیز بھی۔ خاص کر پاکستان کے معاشی امکانات سے متعلق جان متھائی اور سرپ۔ پ۔ مودی کے مشترکہ بیان اور تشریحات کے بعد اِس دلیل کی قطعی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ معاشی لحاظ سے تو نہ صرف ہندُستان بلکہ آج ساری دُنیا ایک ہو رہی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ برطانیہ اپنا اقتدارِ اعلا امریکہ کے حوالے کر دے یا امریکہ اپنی سیاسی خود مختاری کھو بیٹھے۔

معاشی طاقتوں کا ارتقا انسانی آبادی کو نہ صرف مِلاتا ہے بلکہ اس کو مختلف جماعتوں اور قوموں میں تقسیم بھی کر دیتا ہے۔ خاص کر سرمایہ دارانہ معیشت کی تو یہ بنیادی خصوصیت رہی ہے۔ یورپ عہدِ متوسط میں واحد مُلک سمجھا جاتا تھا لیکن سرمایہ دارانہ معیشت کے عروج نے اُسے بعد میں مختلف قوموں میں تقسیم کر دیا۔ سرمایہ دارانہ معیشت نے دُنیا کے تمام مُلکوں اور قوموں کو ایک دُوسرے سے قریب بھی کر دیا لیکن کس شکل میں اور کس شرط پر؟ صرف اس صورت میں کہ زیادہ ترقّی یافتہ مُلکوں نے پچھڑے ہوئے مُلکوں کو اپنا غلام بنالیا۔ یعنی سرمایہ دارانہ معیشت میں اگر قوموں اور مُلکوں کا اتّحاد ہو سکتا ہے تو صرف غلامی اور محکومی کی شرط پر۔ غالباً ہندُستان اسی غلامی اور محکومی سے نجات پانے کے لیے برطانیہ کی دولتِ مشترکہ سے باہر نکل جانا چاہتا ہے۔ ایسے موقع پر اگر انگریز کہتا ہے کہ برطانیہ کی دولتِ مشترکہ ایک معاشی وحدت ہے اس سے باہر نکلنا ٹھیک نہیں تو ہم اور آپ کیا جواب دیتے ہیں؟ یہی کہ برطانیہ اور ہندُستان معاشی ترقّی کے لحاظ سے مساوی درجے پر نہیں اس لیے ہندُستان کے برطانوی دولتِ مشترکہ کے اندر رہنے کے معنی ہیں ہندُستان کی غلامی۔ ہم برطانیہ سے اتّحاد ضرور قائم کریں گے لیکن برابری کی سطح پر، اُس وقت جب ہماری اور برطانیہ کی معاشی ترقّی یکساں سطح پر ہوگی۔

ہندُستان اِس وقت سرمایہ دارانہ معیشت کی ابتدائی منزل سے گزر رہا ہے اور اس ارتقا کی رفتار سیاسی محکومی کے باوجود کافی تیز ہے۔ اس لیے لازمی طور پر یہاں بھی بہ یک وقت "اتّحاد" اور "علاحدگی" کے رجحانات (CENTRI PETAL AND CENTRIFUGAL TENDENCIES) کام کر رہے ہیں اور ان کے درمیان تصادم کی صورت پیدا ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو ہندُستان کے اتّحاد اور "معاشی وحدت" کا نعرہ مخصوص طور پر اُس طبقے کی طرف سے لگایا جا رہا ہے جس کے ہاتھوں میں خوں خوار سرمایہ دارانہ معیشت کی باگ ڈور ہے اور جس کے خود غرضانہ معاشی مفاد کو سیاسی تقسیم سے خطرہ لاحق ہے اس لیے کہ تقسیم کے معنی یہ ہوں گے کہ اس طبقے کے استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا دائرہ

پہلے سے تنگ ہو جائے گا۔ یہ تو "اتحاد" کا رجحان (CENTRIPETAL TENDENCY) ہے جو اس وقت ہندستان کی سیاست میں کارفرما ہے۔ دوسری طرف علاحدگی کا رجحان (CENTRIFUGAL TENDENCY) بھی اتنا ہی طاقت ور ہے۔ ہندستان میں صنعتی ترقی نہ صرف علاقائی لحاظ سے بلکہ مختلف فرقوں کے لحاظ سے بھی بالکل ناہموار اور غیر مساوی رہی ہے۔ کچھ خاص فرقے اور کچھ خاص علاقے صنعتی اعتبار سے ترقی کر گئے اور کچھ خاص فرقے اور علاقے صنعتی اعتبار سے پچھڑ گئے۔ اس کے بنیادی اسباب کچھ بھی ہوں لیکن آج صورتِ حال بالکل یہی ہے۔ لازمی طور پر سرمایہ دارانہ معیشت کے تحت زراعتی علاقوں کو یہ خدشہ ہے کہ ان پر صنعتی علاقے معاشی اور سیاسی لحاظ سے چھا جائیں گے اور ان کا استحصال کریں گے جیسا کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں لازمی طور پر ہوتا ہے۔ پھر بعض فرقوں کا یہ خوف قطعی صحیح ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت اور چھوت چھات ——— چکی کے ان دو پاٹوں کے بیچ میں وہ پس کر رہ جائیں گے۔ اور ان کی معاشی اور سماجی حالت مزدور طبقے کی سی ہو کر رہ جائے گی۔ یہ بدقسمتی ہے کہ ہندستان میں معاشی طاقتیں فرقے دارانہ اختلافات سے جا ملی ہیں لیکن اس بدقسمتی کو دور کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم اس حقیقت ہی سے آنکھیں موند لیں۔

اس تاریخی حقیقت کے وجود سے انکار کرنا گویا مسئلے کی اصل جڑ تک پہنچنے سے انکار کرنا ہے۔ فرقے دارانہ معاشی اختلافات کا وجود بدقسمتی اور لعنت ضرور ہے لیکن یہ بدقسمتی اور لعنت ہمیں تاریخ سے ورثے میں ملی ہے۔ یہ ماضی کا ایک منحوس تحفہ ہے۔ لیکن ہے ضرور، اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ "ماضی" نے ہندستان میں جو تاریخی شکلیں (FORMS) پیدا کر دیں وہ "حال" میں گھسی ہوئی ہیں۔ اور آسانی سے نکلنے کا نام نہیں لے سکتیں۔ ان کو نیست و نابود کر دینا ضروری ہے لیکن اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم یکسرے سے ان کے وجود ہی سے انکار کر دیں۔ فرقے دارانہ اختلافات تاریخ کی پیدا کی ہوئی شکلیں (FORMS) اور سانچے (PATTERN) ہیں۔ چناں چہ معاشی طاقتیں ایک قدم بھی آگے بڑھتی ہیں تو لازمی طور پر انھی سانچوں میں ڈھل جاتی ہیں اور فرقے دارانہ اختلافات پہلے سے زیادہ شدید اور خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس وقت تدبر اور اعلا سیاست دانی کا اہم ترین تقاضا یہی ہے کہ فرقے دارانہ اختلافات اور معاشی طاقتوں کا یہ غیر فطری اور ناجائز اتحاد و ربط زبردستی توڑ ڈالا جائے۔ غالباً ہندو مسلم مسئلے کا آخری حل یہی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک ہرقلیسی (HERCULEAN) کام ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔

اس مقصد کے حصول کے دو طریقے ہیں۔ اگر ہم زیادہ ترقی یافتہ قومی علاقوں کے استحصال سے پچھڑے ہوئے علاقوں کو بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں ہر قومی علاقے کو نہ صرف سیاسی خود مختاری دینی بلکہ معاشی امداد بھی مہیا کرنی ہوگی۔ اور اگر ہم پچھڑے ہوئے فرقوں کو صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ فرقوں کی ہولناک گرفت سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو پھر بنیادی صنعتوں

اور آگے چل کر پورے ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانا ہوگا صرف انھی دو طریقوں پر عمل کرکے ہم فرقے وارانہ اختلافات اور معاشی طاقتوں کے ناجائز اتحاد کو ختم کرسکتے ہیں۔ جب یہ بنیادی اختلافات ختم ہوجائیں گے تو پھر وہ سماجی طاقتیں [illegible] جو رفتہ رفتہ ہندو مسلم اختلافات کی سماجی اور تہذیبی بنیادوں کو بھی ہموار کردیں گی۔ لیکن فرقے وارانہ اتحاد اور متحدہ ہندستان کے اس آخری مقصد تک پہنچنے سے پہلے ہمیں ایک مخصوص تاریخی عمل (HISTORICAL PROCESS) سے ہوکر گزرنا ہے۔ جب تک ہم اس تاریخی عمل کے اندر سے گزرنے سے انکار کرتے رہیں گے اُس وقت تک مسئلے پیچیدہ اور لاینحل ہی ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ تاریخی عمل لازمی طور پر ہمیں پکار پکار کر علاقائی خودمختاری کی دعوت دے رہا ہے۔

یہ بات البتہ صاف ہے کہ ہندستان کے قومی علاقوں کی علاحدگی اس قسم کی نہیں ہوسکتی جو یورپ کے علاقوں کے درمیان ہے۔ غالباً ملکی تحفظ کا یہ تقاضا ہوگا کہ علاحدگی کے باوجود مختلف قومی علاقوں میں معاشی اور سیاسی ربط و ضبط کا ایک پھیلا ہوا جال ہوگا۔ جمہوری مرکزی [illegible] نی تعلقات کی ایک منظم شکل ہوگی۔ مختلف قومی علاقوں کی یہ علاحدگی دائمی ہوگی یا عارضی؟ اس کا انحصار مستقبل کی معاشی طاقتوں پر ہے۔ لیکن اگر ہمیں یقین ہے کہ مستقبل کی معاشی طاقتوں کے تحت پیدائش اور صنعت اور زمین پر قومی ملکیت قائم ہوگی تو پھر ہمیں اس بات میں بھی ذرہ برابر شبہ نہیں کرنا چاہیے کہ مستقبل کی دُنیا ایسی ہوگی جس میں نہ صرف ہندستان بلکہ ساری دُنیا سیاسی لحاظ سے متحد ہوجائے گی۔

مسائل حاضرہ (ہندستان)

ہندستان کے صنعتی مزدور

از: ———— ادارہ

یہ ایک طے شدہ امر ہو کہ صنعتی ترقی کے لیے مزدوروں کی کارکردگی اور اُن کی قوتِ خرید میں اضافہ کرنا بنیادی طور پر ضروری ہو۔ یہ مقصد اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہو کہ مزدوروں کے کام کرنے اور رہنے سہنے کے حالات درست کیے جائیں۔ ان میں تعلیم اور روشن خیالی پھیلائی جائے۔ ان کی صحت کی دیکھ بھال کی جائے، اُجرتوں میں اضافہ کیا جائے، کام کرنے کے اوقات کم کردیے جائیں اور ان کو زندگی کے تفریحی مشاغل میں دل چسپی لینے کے مواقع اور سامان فراہم کیے جائیں۔ یوں تو ساری دنیا کا مزدور طبقہ مظلوم کہے جانے کا مستحق ہو لیکن ہندستان کے مزدوروں کی حالت خاص طور پر ناگفتہ بہ رہی ہو۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔ حکومت کی ناتوجہی، سرمایہ دار طبقے کا استحصال اور خود غرضی، مزدوروں کی بدنظمی اور ملک کی عام معاشی اور صنعتی پستی۔ لیکن گزشتہ جنگ کے دوران میں مزدور طبقہ کافی منظم ہو چکا ہے۔ اور اُسے اپنی اہمیت کا احساس بھی ہو چلا ہو۔ جنگ کے زمانے میں وسیع پیمانے پر جو صنعتی ترقی ہوئی ہو اس نے مزدور طبقے کی تعداد میں پہلے سے کئی گنا اضافہ کردیا ہو۔ حکومت اور صنعتی حلقوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو چلا ہو کہ مزدوروں کی بدحالی کا مطلب ہو کہ نہ تو کام میں خوبی پیدا ہوگی اور نہ لوگوں کی قوتِ خرید میں اتنا اضافہ ہوگا کہ ملک کی صنعتی اشیا خرید سکیں۔ چناں چہ اب مزدوروں کی بدحالی

کو دُور کرنا ملک کی معاشی تنظیم اور صنعتی ترقی کے پروگرام کا ایک حصّہ بن چکا ہو۔ جنگ سے پہلے بھی مزدوروں کے حالات درست کرنے کی طرف متعدد بار حکومت اور صنعتی طبقے کی توجہ دلانے کی کوشش کی گئی لیکن کوئی خاص نتیجہ نہیں برآمد ہوا۔ مثلاً ۱۹۲۹ء میں وائٹلے کمیشن نے صنعتی مزدوروں کے اندر پھیلے ہوئے امراض کو دُور کرنے کے لیے تدابیر اختیار کرنے پر زور دیا لیکن کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں "رائل کمیشن" کی رپورٹ کے بعد حکومت نے اس بات کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے کوئی معقول انتظام نہیں کیا کہ مزدوروں کے حالات درست کرنے کے لیے کمیشن نے جو سفارشیں کی ہیں ان پر عمل کیا جارہا ہی یا نہیں۔ نومبر سنہ ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر امبیدکر لیبر ممبر (حکومتِ ہند) نے مزدوروں کے "صحت بیمہ فنڈ" کے لیے مزدوروں اور مالکوں سے چندے کی فراہمی پر زور دیا۔ اور سنہ ۱۹۴۳ء میں پروفیسر اداکر کو ایک "صحت بیمہ" اسکیم تیار کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ یہ اسکیم اب حکومتِ ہند کے سامنے پیش بھی ہوچکی ہو جس میں کوئی ۲½ کروڑ روپے سالانہ کا صرفہ ہوگا۔

اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء میں دہلی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حکومتِ ہند، ریاستوں اور صوبائی حکومتوں کے نمایندوں کے ساتھ مزدوروں اور آجروں کے نمایندوں نے بھی شرکت کی۔ مزدوروں سے متعلق مسائل زیرِ بحث آئے۔ اور ایک تجویز منظور ہوئی جس میں مرکزی حکومت سے سفارش کی گئی کہ مزدوروں کے حالات کی تحقیق و تفتیش کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے پھر اُس کمیٹی کے فراہم کیے ہوئے اعداد و شمار کی بنا پر مزدوروں کے سماجی تحفظ کے لیے منصوبے بنائے جائیں۔ چناں چہ دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء میں حکومتِ ہند نے ایک تحقیقاتی کمیٹی کے تقرر کا اعلان کیا جس پر مسٹر ریگی (صدر) کے علاوہ، ڈاکٹر احمد مختار اور پروفیسر اداکر بھی شامل کیے گئے۔

فروری سنہ ۱۹۴۴ء میں یہ کمیٹی باقاعدہ طور پر وجود میں آگئی۔ اس کمیٹی نے ۳۸ صنعتوں کے مزدوروں کے حالات کی تحقیق و تفتیش کرنے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کردی ہو۔ صنعتی مزدوروں کے علاوہ رکشا مزدوروں کے حالات کی بھی تحقیقات کی گئی ہو۔

رپورٹ سے متعدد باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بیش تر صنعتوں میں مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ ہو، دوسرے مزدوروں کے فائدے کے لیے پہلے سے جو قوانین موجود ہیں اُن پر بہت کم عمل درآمد ہوتا ہو۔ اِس بات کی جانچ پڑتال کی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی ہو کہ صنعتوں کے مالک مزدوروں کے ساتھ جو سلوک روا رکھتے ہیں وہ قانون کے مطابق ہی یا اُن کے خلاف۔ مزدوروں کے لحاظ سے نہ صرف ایک صنعت کے حالات دوسری صنعت کے حالات سے مختلف پائے جاتے ہیں بلکہ ایک ہی صنعت کے مختلف کارخانوں میں بھی حالات کا فرق اور اختلاف موجود ہو۔

ذیل کی سطور میں ہم ریگی کمیٹی کی رپوٹ کی روشنی میں چند خاص صنعتوں کے مزدوروں کے حالات کا الگ الگ مطالعہ کریں گے۔

ابرق کھودنے کی صنعت

رپوٹ کے مطابق یہاں کے مزدوروں کی حالت سخت تکلیف دہ ہے۔ "قانون معادن ہند (Indian Mines Act) کی کوئی پروا نہیں کی جاتی اور مزدوروں کے ساتھ مالکوں کے سلوک کی نگرانی سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ بعض کانیں تو کوئلے کی کانوں کے برابر گہری ہیں لیکن اُن کے دہانے کو چوڑا کرنے کے لیے رُپیہ نہیں خرچ کیا جاتا۔ لفٹ وغیرہ کا انتظام نہیں ہے۔ ماحول غیر صحت مند، تاریک، نم آلود اور گندا ہے۔ ہوا کی آمد و رفت اور روشنی کا معقول انتظام نہیں ہے۔ زیادہ تر خشک ڈریلنگ کی وجہ سے بُرادہ اُڑتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے مزدور سلیکوسس کے مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کانوں کے آس پاس ملیریائی جنگل ہیں۔ اس لحاظ سے سب سے ردّی اور غیر صحت بخش حالت "کودرما" اور "نیلور" کے کانوں کی ہے۔ مزدوروں کے لیے مکانات کا انتظام چوپٹ ہے۔ طویل طویل گھنٹے کام کرنے پڑتے ہیں۔ اکثر ۶ دن میں ۹ شفٹ کے حساب سے کام لیا جاتا ہے۔ ہفتے میں تین دن مزدور دو شفٹ فی روز کے حساب سے ۱۶ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ اور بقیہ تین روز آٹھ گھنٹے روزانہ۔ مزدوری بہت کم دی جاتی ہے اور بے ایمانیاں بھی بڑے پیمانے پر کی جاتی ہیں اور وہ اس طرح کہ تنخواہوں کے حساب گڑبڑ کر دیے جاتے ہیں اور ناجائز طور پر پیسے کاٹ لیے جاتے ہیں۔ زیادہ تر مزدور مقروض رہتے ہیں۔ مزدور کو گزند پہنچنے کی صورت میں معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں مزدور عورتوں کی زچگی کے سلسلے میں جو قانون پاس ہوا تھا اُس کی قطعی پابندی نہیں کی جاتی۔ کانوں کے اندر چھت ضرورت سے زیادہ نیچی ہے۔ بے شمار بچے والی عورتیں کانوں کے اندر کام کرتی ہیں۔ کم سن لڑکوں اور لڑکیوں سے بھی کام کرایا جاتا ہے۔ چھٹیوں کے لیے کوئی ضابطہ نہیں مقرر ہے۔ یہاں تک کہ ماہانہ تنخواہ پانے والے مزدوروں کے لیے بھی نہیں۔ صوبۂ بہار کی کانوں میں مرد مزدوروں کو ۴؁ آنے روزانہ سے لے کر ۱ رُپیہ ۴؍ روزانہ تک مزدوری دی جاتی ہے، عورتوں کو ۴؁ آنے سے لے کر ۱۱ آنے روز تک اور کم سن والوں کو ۳ آنے سے ۶ آنے یومیہ تک۔

اُونی کارخانے

ریگی کمیٹی کے رپوٹ کے مطابق سنہ ۱۹۴۳ء میں ہندستان میں ۳۲ اُونی کارخانے موجود تھے اور اوسطاً ۱۸۰۰۰ آدمی اُن میں کام کر رہے تھے۔ اِس وقت بھی تک [illegible] وہی [illegible] ہے۔ پہلے تو اُونی کارخانے صرف اُن علاقوں میں تھے جہاں اُون پیدا ہوتی ہو لیکن اب ہندستان کے ہر حصے میں اُون کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ اُونی کارخانوں کے خاص خاص مرکز یہ ہیں:۔ کان پور، دھاری وال، امرتسر، بمبئی، بنگلور

اور سری نگر۔ مزدوروں کی عام حالت اور صنعتوں کے مقابلے میں اچھی ہے۔ عورتوں اور نابالغوں سے کام نہیں کرایا جاتا۔ صرف کشمیر کا ایک کارخانہ ایسا ہے جہاں نابالغوں کو بھرتی کیا جاتا ہے۔ روشنی اور ہوا کی آمد و رفت کا معقول انتظام ہے۔ دھاری وال میں تو مزدوروں کے تحفظ کے لیے بالکل نئے نئے انتظامات کیے گئے ہیں۔ عام طور سے ایک دن میں دو شفٹیں ہوتی ہیں اور کل ملا کر ہفتے میں ۵۴ گھنٹے مزدوروں سے کام لیا جاتا ہے۔ جنگ کے زمانے میں کئی اونی کارخانوں میں مزدوری میں اضافہ کیا گیا۔ مہنگائی بھتہ ۱۰ روپے سے لے کر ۳۰ روپے ماہانہ تک ملتا ہے۔ بمبئی کے اونی کارخانوں کے ستر فی صدی مزدور ۱۲ آنے سے لے کر ایک روپیہ چار آنے یومیہ تک کماتے ہیں۔ کشمیر میں ۶ر سے لے کر ۸ آنے تک اور میسور میں ۱۰ آنے یومیہ۔ کان پور اور بنگلور کے مزدوروں کو مہنگائی بھتے کے علاوہ منافع بھتہ (PROFIT BONUS) بھی ملتا ہے۔ لیکن مختلف اونی کارخانوں کے حالات میں بہت کافی فرق پایا جاتا ہے۔ کسی میں بہت اچھے انتظامات ہیں کسی میں بہت خراب۔ کوئی یکسانیت نہیں ہے۔ دھاری وال میں مزدوروں کی حالت دیگر ملوں اور کارخانوں کی بہ نسبت بہت اچھی ہے۔ لیکن تمام کارخانوں میں ایک بات مشترک ہے۔ مزدوروں کے لیے مکانات کا انتظام اچھا نہیں ہے۔ امرتسر اور کان پور میں صرف ایک تہائی مزدوروں کے لیے مکان کا انتظام کیا گیا ہے۔ بنگلور میں یہ تناسب اور بھی گھٹ جاتا ہے۔ کشمیر میں مزدوروں کے لیے جائے رہائش کا مسئلہ سب سے مشکل ہے۔ مزدوری کے لحاظ سے بھی صورتِ حال خراب ہی سمجھنا چاہیے۔ چناں چہ ریگی کمیٹی نے مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافہ کرنے کی۔ اور اُن کے کام کرنے کے حالات کو بہتر بنانے کی سفارش کی ہے۔

لوہا کھودنے کی صنعت

پورے ہندستان میں اس صنعت میں ۱۶۰۰۰ مزدور کام کرتے ہیں۔ جن میں صرف بہار میں ۱۰ ہزار مزدور ہیں۔ ایسے مزدور زیادہ ہیں جن کو اُجرت کام کے مطابق دی جاتی ہے نہ کہ دن مہینے یا ہفتے کے مطابق۔ مزدور ٹھیکے داروں کے ذریعے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ جن کا بُری طرح استحصال ہوتا ہے۔ کم مزدوری، ردّی مکانات، سخت قسم کی محنت اور مشقت، یہ ہیں وہ مصیبتیں جن کا ان مزدوروں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مزدوروں کے تحفظ کے لیے جو قانون ہیں اُن کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کی جاتی۔ کمپنیاں بلا واسطہ طور پر بھی مزدوروں کو بھرتی کرتی ہیں۔ اِن مزدوروں کی حالت کچھ اچھی ہے۔ لیکن ایسے مزدوروں کی سخت قلت محسوس کی جا رہی ہے۔ خاص کر فصل کے زمانے میں اور برسات کے مہینوں میں تو مزدور اور بھی نہیں ملتے۔

اِس صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) کاٹنے والے اور (۲) لادنے والے۔ تول اور ناپ میں خوب دھاندلی چلتی ہے۔ کاٹنے والے مزدوروں کی آمدنی مہنگائی بھتہ ملا کر فی کس یومیہ ۱۳½ آنے سے لے کر ایک روپے تک ہے۔ لادنے والوں میں عورتوں کو ۵ آنے یومیہ اور مردوں کو آٹھ آنے دیے جاتے ہیں۔ روزانہ گھنٹے

کام لیا جاتا ہے۔ لیکن ٹھیکے کے ذریعے جو مزدور بھرتی کیے جاتے ہیں اُن سے بارہ گھنٹے روزانہ کام لیا جاتا ہے۔ ٹھیکے دار ان مزدوروں کو جس قسم کے مکانات رہنے کے لیے دیتے ہیں اُن سے اچھی حالت اُن مکانوں کی ہے جو کمپنی اپنے بلا واسطہ طور پر بھرتی کیے ہوئے مزدوروں کو دیتی ہے۔ کمپنیوں کی طرف سے اسپتال، دواخانوں میں مفت علاج اور اسکولوں کا انتظام ہے۔ لیکن سوائے کچھ کمپنیوں کے مزدوروں کی دل چسپی اور فلاح و بہبود کا اور کوئی انتظام نہیں ہے۔ ایک سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ۱۵ سال سے کم کے لڑکے اور لڑکیاں بغیر طبّی جانچ کے بھرتی کرلی جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تو مزدوروں کے ساتھ جو حادثات ہوتے تھے ان کی خبر بھی نہیں دی جاتی تھی اور نہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ ریگی کمیٹی کے ممبروں نے زور دیا ہے کہ نوکری دینے والے مزدوروں کے لیے لازمی انشورنس اور مزدوری میں اضافے کی سخت ضرورت ہے۔ مزدوروں کی فلاح و بہبود اور ان کے حقوق کے لیے قانون بنانے اور ان پر عمل کرانا بھی بہت اہم ہے۔ کمیٹی کی سفارش کے مطابق ٹھیکے داروں کے ذریعے مزدوروں کو بھرتی کرنے کا طریقہ اُٹھا دینا اور ملازمتوں کو مستقل کرنا چاہیے۔

لاکھ کی صنعت

مزدوروں کی حالت بہت ردی ہے۔ اُن سے سخت مشقت کرائی جاتی ہے اور من مانا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ مزدوروں کے جائز حقوق کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ اور جس وقت جس مزدور کو کارخانہ چاہتا ہے برخاست کر دیتا ہے۔ جہاں جہاں یہ صنعت چھوٹے پیمانے پر قائم ہے وہاں یہ تمام خرابیاں بیک وقت موجود ہیں۔ اس لیے کہ ان کارخانوں کے مزدور غریب، اَن پڑھ اور غیر منظم ہیں۔ مزدوروں کے تحفظ کے لیے قانون پاس کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ اُن پر کارخانے کے حکام سے لازمی طور پر عمل کرایا جائے۔

زیادہ تر مزدوروں کو کام کے حساب سے تنخواہ دی جاتی ہے۔ مہینے یا ہفتے کے حساب سے نہیں۔ صوبہ بہار میں مزدور بہت آسانی سے مل جاتے ہیں۔ چوں کہ یہ صنعت ابھی غیر مستقل اور غیر منظم حالت میں ہے اس لیے مزدوروں کو جلد جلد بھرتی اور برخاست کرنے کا مذموم طریقہ رواج پا گیا ہے۔ مزدوروں کی غیر حاضری کی مثالیں بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ نئے مزدوروں کو کام کی تربیت دینے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ مزدوروں کی ترقی نہیں ہوتی اور نہ تنخواہ کے ساتھ فرصت دینے کا طریقہ رائج ہے۔ مرزا پور (یو۔پی) کی صنعت میں جہاں سے سب سے زیادہ تعداد میں تربیت یافتہ مزدور نکلتے ہیں اور ہندستان کے مختلف مرکزوں میں بھیجے جاتے ہیں، کُل ملا کر ۲۰۰۰ مزدور کام کرتے ہیں جن میں ۵۵ فی صدی مرد ہیں اور ۴۰،۵ فی صدی عورتیں اور ۴،۵ فی صدی نابالغ۔ یہاں مزدور تنخواہ پانے والے جمع داروں کے ذریعے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ جنھیں مزدوروں کی اُجرت سے کمیشن ملتا ہے۔ کام کے گھنٹے نہیں مقرر ہیں۔ نہ تو مزدوروں کو سہولتیں میسر ہیں اور نہ اُن کی رہائش کے لیے مکان کا انتظام ہے۔ حکومت یو۔پی نے کچھ عرصہ ہوا کہ مرزا پور میں ایک "مرکزِ فلاح" کھولا تھا۔

بہار میں قلیوں اور عورتوں کو اور جگہوں سے بھی کم مزدوری پر بھرتی کیا جاتا ہے۔ انھیں ۵ آنے سے لے کر ۲ آر روپیہ تک مزدوری دی جاتی ہے۔ وسطی صوبے میں ۴۰۰۰ مزدور اِس صنعت میں کام کرتے ہیں۔ یہاں نابالغوں کو بھرتی نہیں کیا جاتا۔ مزدوروں سے جن حالات کے اندر کام لیا جاتا ہے وہ بہت قابلِ اعتراض ہیں۔ روشنی اور ہوا کی آمد و رفت کا بہت خراب انتظام ہے۔ صرف کچھ ہی ایسے مرکز ہیں جہاں مزدوروں کو رہنے کے لیے مکان دیا گیا ہے۔

منگنیز کی صنعت

بے حساب منافعوں کے باوجود یہاں مزدوروں کو بہت کم تنخواہ دی جاتی ہے۔ ٹھیکے داروں کے ذریعے مزدور بھرتی کیے جاتے ہیں۔ مزدور غیر منظم ہیں اس لیے ان کا بہت بری طرح استحصال ہوتا ہے۔ کل ملاکر اس صنعت میں ۲۵۰۰۰ مزدور کام کرتے ہیں جن کی تقریباً آدھی تعداد عورتوں پر مشتمل ہے۔ نابالغوں کو بھرتی نہیں کیا جاتا۔ سطحِ زمین کے اوپر کی کانوں میں روزانہ ۱۰ گھنٹے کام لیا جاتا ہے اور شفٹ ایک ہی ہوتی ہے۔ زمین کے اندر کی کانوں میں دو شفٹ سے کام لیا جاتا ہے اور ہر شفٹ میں ۸ گھنٹے ہوتے ہیں۔ روشنی اور ہوا کی آمد و رفت کا انتظام چوپٹ ہے۔ خاص کر وسطی صوبے میں۔ مزدوروں کے لیے جو مکانات مہیا کیے گئے ہیں وہ بہت ردی قسم کے ہیں۔ اور صفائی کا کوئی انتظام نہیں۔ چوں کہ زیادہ تر مقامی کاشت کار ہی کام کرنے آتے ہیں اس لیے لازمی طور پر جلد جلد وہ بھرتی اور برخاست کیے جاتے ہیں اور مزدوروں کی غیر حاضری عام رواج پاگئی ہے۔

چاول کے مِلوں کے مزدور

چاول کے ملوں کے مزدوروں کی حالت سب سے ردی ہے۔ ان ملوں میں کام کا دار و مدار فصل پر ہے۔ زیادہ تر ملیں ہر سال کرائے پر اُٹھا دی جاتی ہیں اس لیے تقریباً ہر سال ان کے منتظم کار بھی بدل جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مزدوروں کو دو مالکوں سے واسطہ پڑتا ہے (۱) مل کے مالک اور (۲) مِل کو کرائے پر لینے والا سوداگر۔ چناں چہ ملازمت کے ہر وقت خطرے میں رہنے کے علاوہ آمدنی اور تحفظ بھی بالکل غیر مستقل رہتا ہے۔

چاول کے ملوں میں دو قسم کے مزدور ہوتے ہیں: (۱) ماہر اور تربیت یافتہ مزدور اور (۲) قلی۔ عورتوں کو بھی بھرتی کیا جاتا ہے۔ بنگال کی ملوں میں عورت مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ جو تنخواہ دی جاتی ہے وہ اشیا کی موجودہ قیمتوں کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ مدراس کی ملوں میں ماہانہ تنخواہ پانے والے مزدوروں کی تنخواہوں میں ۳۰ فی صدی کا اضافہ اور مرد و عورت قلیوں کی تنخواہوں میں ۷،۱۷ فی صد اور ۳۶ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ بنگال میں مرد و عورت قلیوں کے مقابلے میں ماہانہ تنخواہ پانے والے مزدوروں کی تنخواہوں میں کم اضافہ ہوا ہے۔ کبھی کبھی ماہانہ تنخواہ پانے والے مزدوروں کو بونس بھی دیا جاتا ہے۔ مزدوروں کے تحفظ سے متعلق جو قانون ہیں اُن کی بالکل پابندی نہیں کی جاتی۔ ہوا کی آمد و رفت

صفائی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ گرد اور بدبو سے فضا بھری رہتی ہے۔ مشین کے چاروں طرف گھیرا نہیں ڈالا جاتا ہے۔ آس پاس جنا گردی کی جاتی ہے۔ کام کے گھنٹے نہیں مقرر ہیں۔ ہفتے وار چھٹیاں بھی نہیں ہوتیں۔ زائد کام کے لیے نقد پیسے نہیں دیے جاتے۔ بعض اوقات تو مزدوروں کو تنخواہ دینے میں ٹال مٹول سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ نیچے سے متعلق جو قانون ہیں اُن پر عمل نہیں کیا جاتا۔ بہت سے مزدور مختلف امراض کے شکار ہیں۔ ان کے اندر کوئی تنظیم بھی نہیں ہے مزدوروں کو کرایا وصول کیے بغیر مکان نہیں دیے جاتے۔ سوائے بنگال کے ملوں کے اور کہیں بھی پانی مہیا کرنے کا انتظام نہیں ہے۔ کینٹین اور غلے کی دکانوں کا بھی کوئی انتظام نہیں ہے۔ طبی امداد کا نام و نشان بھی نہیں۔ زیادہ تر مزدور مقروض ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں کل ملا کر اس صنعت میں ۵۱۳۸۵ مزدور کام کرتے تھے۔

کاغذ کی صنعت

ریگی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق اس صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت تشفی بخش ہے۔ کاغذ کے ۲۲ کارخانوں میں کوئی ۱۹۰۰۰ مزدور کام کرتے ہیں۔ ہر سال کوئی دس ہزار ٹن کاغذ پیدا ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ کاغذ بنگال میں پیدا ہوتا ہے جہاں چار کارخانے ہیں اور ہر کارخانے میں ۸۰۰۰ آدمی کام کرتے ہیں۔ یو۔پی میں ۴ کارخانے ہیں، بمبئی میں ۸ اور بہار، اڑیسہ، پنجاب، میسور، تراونکور اور مدراس میں ایک ایک یا دو دو۔ کاغذ کے کارخانوں میں نابالغ مزدور نہیں ہیں۔ صرف لادنے اور اُتارنے کے کام کرنے والے مزدور ٹھیکیدارں کے ذریعے بھرتی کیے جاتے ہیں اور بقیہ بلا واسطہ طور پر مقرر کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں اور منظم صنعتوں کی بہ نسبت مزدوری کم دی جاتی ہے۔ ۲۹ فی صد مزدوروں کو ۸ آنے یومیہ کی بنیادی مزدوری دی جاتی ہے۔ ۱۵ فی صد ۸ آنے سے لے کر ۱۰ آنے تک پاتے ہیں؛ ۲۳ فی صد ۱۰ آنے سے لے کر ۱۲ آنے تک اور ۱۲،۴ فی صد ۱۲ آنے سے لے کر ۱۴ آنے تک۔ بنگال اور مدراس کے بہت سے کارخانوں میں پراوی ڈنٹ فنڈ کا انتظام ہے۔ اتوار کو مزدوروں کو چھٹی دی جاتی ہے۔ روشنی اور ہوا کی آمد و رفت کا اور دیگر سہولتوں کا معقول انتظام ہے۔ ۴۰ فی صد مزدوروں کو مکان دیتے ہیں۔ زیادہ تر کارخانوں میں مزدوروں کی فلاح و بہبود کی چیزیں موجود ہیں۔ مزدوروں کے بچوں کے لیے تعلیم وغیرہ کا بھی انتظام ہے۔

سیمنٹ کی صنعت

ریگی کمیٹی نے یہاں کے مزدوروں کی حالت کو بہت سراہا ہے۔ سوائے بندی ریاست کے کارخانے کے اور کہیں نابالغوں کو بھرتی نہیں کیا جاتا۔ کھودنے والے اور پیکنگ کرنے والے مزدوروں کو ٹھیکے داروں کے ذریعے بھرتی کیا جاتا ہے۔ لیکن عام مزدور راست طور پر لیے جاتے ہیں۔ روشنی اور ہوا کی آمد و رفت کا بہت معقول انتظام ہے۔ پانی اور صفائی وغیرہ کے انتظامات بھی مکمل ہیں۔ لیکن اجرتیں معیاری نہیں ہیں۔ مہنگائی بھتے میں بھی کوئی یکسانیت اور ضبط نہیں ہے۔ یہ اچھا ہے کہ بیش تر کمپنیاں منافع پونس دیتی ہیں۔ مکانات کا انتظام بھی بہت

بہتر ہے۔ مزدوروں کے لیے اسپتال کلب اور اسکول ہیں۔ پراویڈنٹ فنڈ اور خدمتی انعام (SERVICE GRATUITY) کی بھی اسکیمیں زیر غور ہیں۔

سونے کی کانیں ہندستان میں صرف ایک ہی مقام ہے جہاں سونا کھودا جاتا ہے اور وہ ہے کولر۔ یہاں کے مزدوروں کی حالت کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق تشفی بخش ہے۔ کُل ۴ کمپنیاں ہیں جو یورپی مالکوں کے ہاتھ میں ہیں۔ جن میں ۲۰ ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ اُن میں سے ۱۴ ہزار بلاواسطہ خود کمپنیاں بھرتی کرتی ہیں اور بقیہ ٹھیکے داروں کے ذریعے مقرر کیے جاتے ہیں۔ یہ البتہ ضرور ہے کہ وہ ٹھیکے والے مزدور جو کانوں کے اندر کام کرتے ہیں انھیں کمپنی تنخواہ دیتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۴۰ء کے درمیان کوئی بڑی ہڑتال نہیں ہوئی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مزدوروں کی شکایتیں زیادہ شدید نہیں رہی ہیں۔ نابالغوں اور عورتوں کو بہت کم بھرتی کیا جاتا ہے۔ کانوں کے اندر روشنی اور صفائی کا بہت اچھا انتظام ہے۔ بنیادی اُجرت ۸ آنے یومیہ سے لے کر ۱۲ آنے یومیہ تک ہے۔ لیکن مزدوروں کی مجموعی طور پر روزانہ آمدنی ایک روپے سے لے کر سوا روپے تک پہنچ جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء سے مہنگائی بھتّے کے طور پر ماہانہ ۸ روپے سے لے کر ۲۳ روپے تک دیے جاتے ہیں۔ مسلسل اور باقاعدہ حاضری پر بونس دیا جاتا ہے۔ مکانات کچھ بہت زیادہ اچھے نہیں ہیں پھر بھی غنیمت ہیں اور طبی، تعلیمی اور تفریحی سہولتیں کافی میسر ہیں۔ لیکن مزدوروں میں سی لی کوس کا مرض اور نشہ خوری کی عادت بہت پھیلی ہوئی ہے۔

ناریل کے ریشوں کی صنعت ریگی کمیٹی نے اس مخصوص صنعت کے بھی مزدوروں کے حالات کی تحقیق و تفتیش کی کی ہے۔ یہ صنعت زیادہ تر ساحلِ مالابار پر واقع ہے۔ ٹراونکور میں ۳۰ ہزار خاندانوں کا پیشہ ناریل کے ریشے اکھاڑنا ہے اور ۳۰ ہزار خاندان اُن ریشوں سے اشیا بنانے کے کام میں مصروف ہیں۔ کوچین میں کُل ملا کر ۴ ہزار آدمی اس صنعت میں کام کرتے ہیں۔ کمیٹی کو شکایت ہے کہ اِس صنعت کے مزدوروں میں مہارت اور کارکردگی نہیں پائی جاتی۔ کارخانوں میں جن حالات کے تحت مزدور کام کرتے ہیں وہ کسی طرح بھی اچھے نہیں قرار دیے جا سکتے۔ اُن مزدوروں کی تعداد زیادہ ہے جن کو کام کے حساب سے مزدوری دی جاتی ہے نہ کہ ہفتے یا مہینے کے حساب سے۔ ۲۲ فی صد مزدور ٹھیکے داروں کے ذریعے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ خاص کر عورتیں اور نابالغ لڑکے اور لڑکیاں۔ مزدوروں کا ۸۰ فی صد حصّہ مردوں پر مشتمل ہے۔ کارخانوں میں گندگی اور بھیڑ بھاڑ بہت ہوتی ہے۔ مردوں کو فی کس یومیہ ۱۲ آنے سے لے کر ۱۴ آنے تک دیے جاتے ہیں، عورتوں کو ۶ آنے سے لے کر ۸ آنے تک اور نابالغوں کو ۴ آنے سے کم۔ مہنگائی بھتّہ جو دیا جاتا ہے وہ اشیا کی قیمتوں میں اضافے کے مطابق نہیں ہے۔ کوچین کے

۷۸ فی صد حیدرآباد اور ٹراونکور کے ۶۵ فی صد مزدور مقروض ہیں۔ زائد کام کا الگ معاوضہ نہیں دیا جاتا اور نہ انعام، پنشن اور بونس وغیرہ کا رواج ہے۔ مزدوروں کو رہنے کے لیے مکانات نہیں دیے جاتے طبی امداد کا انتظام بھی اچھا نہیں ہے۔

کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ مزدوروں کی حالت کی جانچ پڑتال کرنے والے افسروں کی تعداد بڑھائی جائے، زچگی کے متعلق قوانین بنائے جائیں اور صنعت کے مالکوں کو مزدوروں سے متعلق قوانین کی پابندی کرائی جائے۔ تمام کارخانے کسی مرکزی نگرانی کے تحت لائے جائیں بلکہ اگر ضرورت ہو تو ان پر خود حکومت کی نگرانی قائم کی جائے۔

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

ریل اور سڑک کی ہم آہنگی اور شرحوں کا تعیّن

از: ـــــــــ ڈی۔ آر۔ گیڈگل

اس بعد از جنگ کے زمانے میں ذرائع حمل ونقل سے متعلق سب سے اہم مسئلہ سڑک اور ریل کے حمل ونقل کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور باربط کرنے کا مسئلہ ہے۔ اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا تعلق پورے ملک سے ہے اس سلسلے میں جو سب سے اہم بات طے کرنی ہے وہ یہ ہے کہ مسافروں اور مال کو کس طرح حمل ونقل کی مختلف ایجنسیوں مثلاً ریل، موٹر وغیرہ ـــــ میں تقسیم کیا جائے۔ یا تو یہ ایجنسیاں آپس کی رضامندی سے طے کرلیں کہ مسافروں اور مال کی کس طور پر تقسیم ہوگی یا اوپر سے اُن پر کوئی فیصلہ عائد کردیا جائے یا ایک صورت یہ ہے کہ کرایوں کی شرح کے متعلق ایسے قاعدے اور ضابطے مقرر کردیے جائیں کہ مختلف ذرائع حمل ونقل کا آپس کا مقابلہ ختم ہوجائے۔ اس کے بعد خود مسافروں اور مال پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس کو چاہیں استعمال میں لائیں۔ پہلے ہی مختلف ذرائع حمل ونقل میں مسافروں کو تقسیم کردینے میں ایک بڑی دقت یہ ہے کہ کافی اعداد وشمار اور کافی تجربات دست یاب نہیں ہیں۔ پھر یہ بھی خطرہ ہے کہ یہ تقسیم کافی عرصے تک کے لیے غیر مبدل ہوجائے گی اور فنّی ترقیوں اور ایجادوں سے ہمارے ملک کا نظام حمل ونقل پورے پورے طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔

اس کے علاوہ اور بھی بے شمار دقتیں راہ میں حائل ہیں۔ مثلاً یہ طے کرنا کہ سڑک کے ذریعے مسافروں اور مال کو کتنے فاصلوں تک کفایت کے ساتھ لے جایا جا سکتا ہے۔ ان مسائل کے کامیاب حل کا انحصار کئی باتوں پر ہے جو علاقے علاقے میں بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً ہمیں اس بات پر نظر رکھنی ہوگی کہ کسی خاص علاقے میں سڑکوں کا سسٹم اچھا ہے یا نہیں۔ کسی مخصوص حمل ونقل کی نوعیت کیا ہے؟ غرض ہر علاقے کے مقامی حالات پر پوری پوری نظر رکھنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ مثال کے طور پر پونا سے کراد تک جو ریل لائن بچھائی گئی تھی وہ آبادی کے نقطۂ خیال سے بالکل ناموزوں تھی۔ اس خطے میں سڑک اگرچہ ریل لائن کے متوازی ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے سڑک، ریل کے مقابلے میں زیادہ آرام دہ اور کفایت آمیز ہے۔ اگر ہمارے پاس کافی عرصے کے اعداد و شمار بھی ہوں تو بھی تمام مشکل مسائل اور سوالات پر مکمل اتفاقِ رائے نہیں ہو سکتا۔ ہندستان میں تو موجودہ اعداد و شمار کی بنا پر کوئی عام رائے قائم کرنا اور بھی مشکل ہے۔ اس لیے کہ موجودہ اعداد و شمار قطعاً ناکافی ہیں۔ جہاں تک مال کی آمد و رفت کا تعلق ہے ریل اور سڑک کے درمیان مقابلے بازی کا عرصہ سنہ ۱۹۴۰ء تک زیادہ طویل نہیں رہا ہے۔ سنہ ۱۹۴۰ء تک سڑک کے ذریعے کتنے مال و مسافر کی آمد و رفت ہو سکی ہے اس کے متعلق جو معلومات مہیا ہیں وہ قطعی ناکافی ہیں۔ سڑک کے جو ذرائع حمل ونقل ہیں زیادہ تر غیر منظم حالت میں رہے ہیں۔ ان کے اندر کوئی باقاعدگی نہیں رہی ہے اور نہ اُن کے پاس اعداد و شمار جمع رہے ہیں۔ ریل کے ذریعے جو تجارت ہوئی ہے اس سے متعلق اعداد و شمار کچھ اس طرح درج کیے گئے ہیں کہ اُن کے مطالعے سے اِس بات کا پتا نہیں چلتا کہ سڑکوں کے مقابلے سے ریل کا حمل ونقل کس حد تک متاثر ہوا ہے ——— سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد کے چند سالوں میں ریلوں کی مالی حالت جو خراب ہوئی تو اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ ملک میں زرعی بدحالی پھیلی ہوئی تھی۔ اُس زمانے میں جو یہ صدائے احتجاج بلند کی گئی تھی کہ سڑکوں کے مقابلے سے ریل کی مالی حالت خراب ہو رہی ہے وہ قبل از وقت تھی غرض ہندستان میں خاص خاص ذرائع حمل ونقل کے لیے مال اور مسافروں کو مخصوص کرنا ناممکن العمل ہے۔

اگر مندرجہ بالا بات ہم تسلیم کرلیں تو پھر سڑکوں کے کرائے اور ریلوں کے کرائے کے باہمی رشتے کا مسئلہ بے حد اہم ہو جاتا ہے۔ ریلوں کے کرائے کا جو نظم ہے اور اُن کے ارتقا کے جو مخصوص راستے رہے ہیں اُن سے ہر کوئی واقف ہے۔ زیادہ تر ملکوں میں ریلوں کے کرائے اس لحاظ سے مقرر کیے جاتے ہیں کہ مال اور مسافر کتنا برداشت کر سکتے ہیں۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بالائی اخراجات (OVERHEAD COSTS) کی زیادتی کی وجہ سے ریل کے کرایوں کی شرح کو "قیمت اخراجات" کے اصول پر معین کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ "قوتِ برداشت" کے اصول پر ریل کے کرائے مقرر کرنے کی صورت میں پھر ضروری ہوتا ہے کہ اشیا کی مقدار کا خیال رکھا جائے اور ایک ہی قسم کی سودوں کے

باوجود مختلف اشیا کے لیے مختلف کرائے وصول کیے جائیں۔ ریلوں کے کرائے کا نظام اس وجہ سے بھی پیچیدہ ہو گیا ہے کہ ان کو اجارہ داری حاصل ہے۔ سڑکوں کے میکانی ذرائع حمل و نقل کے اجرا سے پہلے زیادہ تر ملک کی اندرونی تجارت بیشتر ریلوں ہی کے ذریعے ہوتی تھی چاہے وہ تجارت کتنے ہی دور دراز کی ہو۔ صرف خاص خاص مقامات پر البتہ آبی ذرائع حمل و نقل نے ریل کی جگہ لے لی تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے ریلوں کی یہ اجارہ داری ختم ہو گئی۔ اس کا نتیجہ ریلوں کے کرائے کے متعدد بدلی ہوئی صورت میں بھی ظاہر ہوا۔ لیکن ریلوں کے کرائے کے نظام میں بہت زیادہ بنیادی تبدیلی نہیں ہو سکی بلکہ یہ ہوا کہ خاص کرایوں کی اہمیت پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ خاص خاص کرائے جو وجود میں آئے وہ ریلوں کی اجارہ دارانہ حیثیت کی وجہ سے اور اس وجہ سے بھی کہ کرائے کے تعین کے سلسلے میں "قوتِ برداشت" کے اصول کی پابندی کی گئی۔ سڑکوں کے ذرائع حمل و نقل سے جب ریل کا مقابلہ نہیں تھا تو اس وقت کرائے کی استثنائی اور خصوصی شرحیں اس لیے اختیار کی گئی تھیں کہ کچھ خاص اشیا کی حمل و نقل میں آسانی فراہم کی جائے۔ لیکن اس کے بعد سے وہ شرحیں اب مقابلے بازی کا آلۂ کار بن گئی ہیں — مقابلے بازی کے شروع ہو جانے کے بعد خصوصی شرحیں اپنا پرانا مفہوم کھو بیٹھی ہیں۔

جہاں تک سڑکوں کے ذرائع حمل و نقل کے "نظامِ شرح" کا تعلق ہے یہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ابھی تک کوئی باقاعدہ نظام وجود ہی میں نہیں آسکا ہے۔ بہرحال جن حالات کے تحت سڑکوں کے حمل و نقل کے کرائے وصول کیے جاتے ہیں اس کے متعلق کچھ خاص باتوں سے آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سڑکوں کے ذرائع حمل و نقل کو کبھی اجارہ نہیں حاصل رہا ہے۔ بلکہ ہمیشہ دوسرے ذرائع حمل و نقل سے مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ چناں چہ شرحوں کے تعین کے سلسلے میں انھیں اس بات کا خیال نہیں رکھنا پڑا ہے کہ مال اور مسافر کتنی شرح برداشت کر سکتے ہیں بلکہ اس بات کا کہ ان کے اپنے اخراجات سے شرح بلند ہے یا نہیں۔ اسی وجہ سے سڑکوں کے حمل و نقل میں ہر قسم کے مال سے تقریباً یکساں شرح وصول کی گئی ہے۔ برخلاف اس کے ریلیں زیادہ قیمتی مال کے لیے زیادہ شرحیں وصول کرتی رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ قیمتی مال ریلوں سے ہٹ کر سڑکوں کے ذرائع حمل و نقل کی طرف آگیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ سڑکوں کے ذرائع حمل و نقل ہمیشہ تھوڑے تھوڑے فاصلوں کے پابند رہے ہیں۔ چناں چہ زیادہ تر ایسا رہا ہے کہ خاص خاص کمپ کے لیے اور خاص خاص بھیجنے والوں کے لیے الگ الگ شرحیں رہی ہیں۔ شرحوں کی کوئی ایک عام سسٹم نہیں رہی ہے۔ پھر مال اور مسافر پہنچا کر واپسی میں خالی آنے کا خیال بھی سڑکوں کے ذرائع حمل و نقل کی شرحوں کو متاثر کرتا رہا ہے۔

سڑکوں کے ساتھ یہ بھی قصہ ہے کہ زیادہ مال بھیجنے والے اپنے مال کے حمل و نقل کا انتظام خود ہی کر لیتے ہیں۔ اس چیز نے سڑکوں کے سلسلے میں علاحدہ علاحدہ شرح رکھنا غیر ممکن [illegible] دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سڑکوں کی شرحیں باہمی مقابلے بازی کے

وقت سے باہر نہیں نکل سکی ہیں۔

آگے چل کر جو سوال سب سے زیادہ اہمیت اختیار کرے گا وہ یہ ہے کہ سڑکوں کے ذرائع حمل و نقل کے مقابلے سے ریلوں کے کرایوں کی شرحیں کس طور پر متاثر ہوں گی۔ اگر ریل کی خصوصی شرحوں (SPECIAL RATES) کا پھیلاؤ اسی طرح جاری رہا تو ریل کے کرایوں کی مختلف شرحوں میں جو موجودہ فرق اور امتیاز پایا جاتا ہے وہ آگے چل کر ختم ہو جائے گا۔ جیسے جیسے سڑکوں کے ذرائع حمل و نقل وسیع ہوتے جائیں گے ویسے ہی ویسے خصوصی شرحوں کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جائے گا۔ مختلف مال و اسباب کی شرحوں میں جو موجودہ اختلافات موجود ہیں وہ زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتے۔ اور ریلوں کے کرایوں کے تعین میں اجارہ داری کے خیال کو خیرباد کہ کر سڑکوں سے مقابلے بازی کے خیال کی پابندی کرنی ہوگی۔ اس چیز کے خلاف دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر مختلف شرحوں کے اصول کو ترک کر دیا گیا تو شرحیں زیادہ ہونے کی بجائے اور کم ہو جائیں گی جس کا اثر ریلوں کی مالی حالت پر خراب پڑے گا۔ چناں چہ سڑکوں سے مقابلہ کرنے کے سلسلے میں ریلوں کے لیے ضروری ہوگا کہ اُن مال و اسباب کی شرح میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا جائے جنھیں اس وقت کم شرح پر لے جایا جاتا ہے۔ لیکن اس تجویز کے خلاف یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ اُن مال و اسباب کے حمل و نقل پر شرح بڑھانا اس لیے غیر ممکن ہے کہ اس وقت اُن سے جو شرح وصول کی جا رہی ہے وہ ٹھیک اُن کی قوتِ برداشت کے مطابق ہے۔ مزید اضافہ ان کی قوتِ برداشت سے زیادہ ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان مال و اسباب کی شرح میں اضافہ کر دینے سے مُلک کی صنعتی اور زرعی معیشت کا توازن بگڑ جائے گا۔ چناں چہ خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ شرحوں کو برقرار رکھا جائے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ موجودہ شرحوں کو اُسی وقت برقرار رکھا جا سکتا ہے کہ سڑکوں کے حمل و نقل کا ریلوں کی شرحوں پر کوئی اثر نہ پڑنے دیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے صرف تین ذریعے ہیں۔ یا تو سڑکوں کی حمل و نقل کی توسیع کو روک دیا جائے۔ یا سڑکوں کے حمل و نقل کو ریلوں سے مقابلہ نہ کرنے دیا جائے۔ یا سڑکوں کے حمل و نقل اور ریلوں کے حمل و نقل کو ایک ہی اجارہ داری کا حصہ بنا دیا جائے تاکہ دونوں کے درمیان مقابلے بازی کی صورت نہ رہے۔ پہلی صورت تو غیر ممکن ہے۔ دوسری صورت پر سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۴۰ء کے درمیانی عرصے میں بہت غور و خوض کیا گیا لیکن متعدد اسباب کی بنا پر ناکامیابی ہوئی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ ہند اور ریلوں کے حکام تیسری صورت پر غور کر رہے ہیں۔

یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شرحوں کی موجودہ صورتِ حال کو برقرار رکھنے کی حمایت میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ موجودہ صورتِ حال کو برقرار نہ رکھنے کی صورت میں ریلوں کی مالی حالت پر خراب اثر پڑے گا۔ لیکن یہ اس لیے غلط ہے کہ اس خیال کے مؤید سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد کی ریلوں کی مالی بدحالی کو پیش نظر رکھ کر

ایسا کہتے ہیں۔ حال آں کہ وہ بدحالی دراصل نتیجہ تھی عالم گیر معاشی بحران کا۔ اُس زمانے میں سڑکوں کے ذریعے مال اور مسافروں کی آمدورفت برائے نام تھی۔ آنے والے سالوں میں، اس میں کوئی شک نہیں کہ سڑکوں کے حمل ونقل میں بردست توسیع ہوگی لیکن صاف طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا ریلوں پر خراب اثر پڑے گا یا نہیں۔ سڑکوں اور ریلوں کے درمیان محض مقابلے ہی کی صورت نہیں قائم ہو بلکہ اُن سے بڑی حد تک ایک دوسرے کو مدد بھی پہنچتی ہو۔ ہندستان میں خاص طور پر ایسا ہو اس لیے کہ یہاں بیش تر علاقوں میں ریل کی خاطر خواہ توسیع نہیں کی گئی ہو۔ جہاں ریل اور سڑک میں مقابلہ ہو بھی وہاں بھی ریلوں کے مال اور مسافروں کے محض کچھ خاص حصّے یا کچھ خاص خاص قسم کے مال و مسافر متاثر ہوئے ہیں۔

کون انکار کرسکتا ہو کہ سڑکوں کی حمل ونقل کے بڑھنے سے ریلوں کو زیادہ مسافر ملنے لگتے ہیں۔ ہندستان میں ریلوں کی توسیع یا حمل ونقل کی توسیع ابھی اپنی پوری منزلِ عروج پر نہیں پہنچ سکی ہو۔ چناں چہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہو کہ جب مُلک کی اعلیٰ پیمانے پر معاشی ترقی ہوگی تو ریلوں کو بہت زیادہ مال و مسافر ملنے لگیں گے۔ اِن باتوں سے ثابت ہوتا ہو کہ آیندہ سالوں میں اگر ریلوں اور سڑکوں کے درمیان مناسب حالات کے تحت مقابلے کی صورت رہی تو اُس سے ریلوں کی مالی حالت پر خراب اثر نہیں پڑ سکتا۔

موجودہ صورتِ حال کو برقرار رکھنے کی حمایت میں یہ بھی کہا جاتا ہو کہ اگر سڑکوں اور ریلوں کا باہمی مقابلہ ہوا تو اُس سے ریلیں اپنے نچلے درجوں کے کرایوں کی شرح میں اضافہ کرنے پر مجبور ہوں گی۔ اِس وقت صورت یہ ہو کہ اِن درجوں کے ذریعے مال اور مسافروں کی آمدورفت بہت زیادہ ہو لیکن اُس مناسبت سے ریلوں کو اُن درجوں سے آمدنی کم ہوتی ہو۔ اس لیے یہ بالکل ظاہر ہو کہ اُن درجوں کی شرحوں میں اگر اضافہ کیا گیا تو اُس سے ریلوں کی آمدنیوں میں کوئی معتدبہ اضافہ نہیں ہوگا۔

سڑکوں کے مقابلے سے یہ ہوگا کہ مختلف شرحوں کا فرق کچھ کم ہوجائے گا اور ریلوں سے شرحوں میں بہت زیادہ فرق و امتیاز پیدا کرنے کی طاقت چھن جائے گی۔ یہ بات عوام کے نقطۂ نگاہ سے مفید ہو نہ کہ نقصان دہ چناں چہ اسے سڑکوں اور ریلوں کے باہمی مقابلے کا ایک خوش گوار نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اگر اِس باہمی مقابلے بازی کو ایک مناسب حالت پر رکھا جائے تو یہ ضرور ہوگا کہ ریلیں اپنی شرحوں کو معقول بنانے اور اپنی تنظیم کو اعلا معیار پر لے جانے کی کوشش کریں گی۔ لیکن اُس سے ریلوں کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ برخلاف اس کے اگر موجودہ صورتِ حال برقرار رہی تو یہ کئی اور دیگر باتوں کے لحاظ سے کچھ اچھا نہ ہوگا۔

سڑک اور ریل کو ایک ہی اجارے کے تحت لے آنے سے یہ ہوگا کہ سڑک اور ریل کے باہمی مقابلے کے فوائد سے

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہوجانا پڑے گا۔ اجارے سے یہ ہوتا ہے کہ امتیازی شرحیں بن جاتی ہیں اور معقول حدوں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں چوں کہ خود ریلوں کا آپس میں مقابلہ تھا اس لیے وہاں اجارے کے بدترین نتائج نہیں ظاہر ہوئے، لیکن ہندستان میں ہر ریل کمپنی کو اپنے علاقے میں مکمل اجارہ حاصل رہا ہے چناں چہ یہاں من مانی طور پر شرحیں مقرر کی گئیں اور اُن کے اندر کافی بدنظمی اور بے اصولی رہی۔ ایک بے اصولی تو یہ ہے کہ ہندستان میں تیسرے درجے کے مسافروں سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے اُس سے پہلے اور دوسرے درجوں کے مسافروں کے لیے آرام و آسایش مہیا کی جاتی ہے اور تیسرے درجے کے مسافر تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ تیسرے درجے کے مسافروں کے آرام کی طرف اُس وقت سے توجہ کی جانے لگی ہے جب سے موٹروں نے ریلوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ پھر بھی اب تک تیسرے درجے کے مسافروں کو آرام اور آسانیاں نہیں حاصل ہیں۔ اگر سڑکوں اور ریلوں کا ایک متحدہ اجارہ قائم ہوگیا تو کوئی چیز ایسی نہیں رہ جائے گی جو ریل کے حکام کو شرحوں کو معقول بنانے پر آمادہ کرسکے۔ سڑکوں کے حمل ونقل میں بھی ریلوں سے کم شرح رکھنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ صرف یہ ہوگا کہ سڑکوں کے ذرائع حمل ونقل اور ریلوں کے درمیان آپس کی رضامندی سے مال اور مسافروں کی تقسیم ہوجائے گی اور دونوں جی بھر کے اُن کا استحصال کرسکیں گے۔

ریلوں کی شرحوں کو سڑکوں کے مقابلے سے بچائے رکھنے کی کوشش کرنا ملک کے آیندہ مفاد کے بھی خلاف ہے۔ ہندستانی ریلوں کے خلاف یہ پرانی شکایت ہے کہ انھوں نے ایسی شرحیں اس طرح مقرر کیں کہ تجارت اور صنعت بندرگاہوں اور کچھ اہم اندرونِ ملک کے مقامات پر مجتمع اور مرکوز ہو کر رہ گئیں اور پورے ملک میں نہیں پھیل سکیں۔ اب اِس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ صنعت وتجارت کو پورے ملک میں پھیلایا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے من جملہ اور باتوں کے یہ بھی ضروری ہے کہ ریل کی شرحوں کو کسی موزوں اور مناسب بنیاد پر قائم کیا جائے۔ بعض علاقوں کے لیے جو خاص طور پر فائدے مند شرحیں رکھی گئی ہیں اُن کو ترک کردیا جائے اور زیادہ منصفانہ شرح قائم کی جائے۔ جب ریلوں کا سڑکوں سے مقابلہ شروع ہوا تو اس قسم کی ایک ہموار شرح وجود میں آنے لگی۔ یہ بھی عام طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ اگر ملک میں موٹر کے ذریعے بڑے پیمانے پر حمل ونقل شروع ہوجائے تو اس سے پورے ملک میں صنعت اور تجارت کو پھیلنے میں مدد ملے گی۔ لیکن اگر سڑک اور ریل کا ایک متحدہ اجارہ قائم ہوگیا تو اس رجحان کے یک سر رک جانے کا اندیشہ ہے۔ ریلیں چوں کہ زیادہ منظم ہیں اس لیے لازمی طور پر اُن کے فیصلے پورے اجارے پر حاوی رہیں گے اور سڑکوں کے ذرائع حمل ونقل محض ریلوں کے طفیلی بن کر رہ جائیں گے۔

سڑک اور ریل کے متحدہ اجارے کے خلاف ایک اور اہم دلیل پیش کی جاسکتی ہے۔ اِس حقیقت سے کوئی انکار

نہیں کرسکتا کہ سڑکوں کے حمل ونقل کی توسیع و ترقی سے ملک کی چھوٹے پیمانے کی صنعت کو کافی فائدہ پہنچا ہو۔
اگر سڑک اور ریل کا متحدہ اجارہ قائم ہوگیا تو سڑکوں کے حمل ونقل سے اور اس سے ملحقہ تمام میدانوں سے چھوٹے کاروباری لوگوں کو نکل جانا پڑے گا۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ لوگ بہت ہی خاص قسم کی منفعت بخش حیثیت اختیار کرلیں گے اور لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد مزدور پیشہ ہوکر رہ جائے گی۔

اگر ریل اور سڑک کا اجارہ نہیں قائم ہوا تو سڑکوں کے حمل ونقل کی توسیع میں نظم وضبط پیدا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل کارروائیوں کی ضرورت ہوگی۔ مال واسباب کے حمل ونقل کی شرحوں کا باقاعدہ اور باضابطہ تعین کرنا ہوگا۔ شرحوں کا یہ نظام ریل کی شرحوں کے نظام سے کئی باتوں کے لحاظ سے مختلف ہوگا۔ سڑکوں کے سلسلے میں ریلوں کے برخلاف مسافر اور مال و اسباب کی قوتِ برداشت کے اصول پر شرحوں کا تعین کرنا مشکل ہے۔ سڑکوں کی شرحیں دو باتوں کے لحاظ سے ریلوں کی شرحوں سے مختلف ہوں گی (۱) ریلوں کے برخلاف سڑکوں کے حمل ونقل میں ”طویل فاصلوں کی کفایت“ کا وجود نہیں ہوتا۔ (۲) مختلف اشیا کے کرایوں میں جسامت اور قدر کے لحاظ سے زیادہ فرق نہیں رکھا جاسکتا۔ اول الذکر بات ایسی ہے جس سے سڑکوں کے حمل ونقل کے ذریعے پورے ملک میں معاشی سعی وعمل اور کاروبار کا پھیلاؤ ہوگا۔ اس کے برخلاف ریلوں کے حمل ونقل میں چوں کہ طویل مسافت میں کفایت کی صورت ہوتی ہے اس لیے کاروبار خاص خاص دور دراز مقامات پر مرکوز ہوکر رہ گئے اور پورے ملک میں اُن کا پھیلاؤ نہ ہوسکا۔ دوسرے سڑکوں کے ذریعے سستی اور جسیم اشیا کا دور دراز مقامات پر حمل ونقل نہیں ہوسکے گا۔ برخلاف اس کے ریل کے ذریعے یہ آسان ہے اور اسی سے خام مال کا دوسرے علاقوں میں منتقل ہونا آسان ہوگیا ہے جہاں اُن کا استعمال ہوتا ہے۔

اس وقت فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر علاقے کے لیے سڑکوں کے حمل ونقل کا کوئی مناسب ”نظامِ شرح“ مقرر ہوجائے۔ مختلف منطقوں کا تعین اب اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا اور نہ قومی شاہراہوں کو کسی بورڈ یا واحد افسر کی نگرانی میں رکھنا اچھے نتائج پیدا کرسکا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسافروں کے کنٹرول کی جو سسٹم ہے اس کو زیادہ تر برقرار رکھا جائے۔ اگر حمل ونقل کے علاقوں کی تقسیم ہوجائے اور کچھ خاص سڑکوں پر خاص قسم کی گاڑیوں کا چلنا روک دیا جائے تو مسافت اور فاصلے کی حدوں کا خود بہ خود تعین ہوجائے گا۔ مال واسباب کے حمل ونقل کے لیے جو لائسنس ملیں وہ ایسے علاقوں تک محدود رہیں جو کسی واحد نگرانی کے تحت ہوں۔ اس علاقے سے باہر کے لیے جو لائسنس دیے جائیں وہ کافی تحقیق وتفتیش کے بعد اور خاص خاص شرطوں پر۔ سڑکوں کے مال واسباب کے حمل ونقل کی جو کمپنیاں ہیں اُن کو آمادہ کیا جائے کہ وہ مختلف شرحوں کو ملاکر ایک منظم شرح کی بنیاد رکھیں۔ اعداد پر سے

نگرانی کے ذریعے اس شرح کی پابندی کرائی جائے۔ سڑکوں کی شرحوں میں نظم وضبط قائم کرنے کے سلسلے میں واحد رکاوٹ یہی ہو کہ واپسی سفر میں خالی آنے کا امکان رہتا ہو۔ لیکن عام طور پر یہ ہوتا ہو کہ اس قسم کی صورتِ حال کا اندازہ پہلے سے لگایا جا سکتا ہو۔ چناں چہ شرحوں کے تعین میں اگر اس بات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بہتر ہو۔ سڑکوں سے حمل و نقل کے سلسلے میں خاص خاص علاقوں کے لیے اگر لائسنس مقرر کر دیے جائیں اور شرحوں کا تعین کر کے ان پر نگرانی رکھی جائے تو یہ سب سے بہتر صورتِ حال ہوگی۔ اس کے برخلاف ریل اور سڑکوں کی شرحوں کو کسی ایک ہی متعینہ شرح میں بدل دینا نقصان اور مشکلات کا باعث ہوگا۔ قومی شاہ راہوں اور ان سے متعلقہ دیگر شاہ راہوں اور سڑکوں کے مسافروں اور مال میں شدید امتیاز کرنا بھی غلط ہوگا۔ امریکہ اور انگلستان میں بھی اسی قسم کی پالیسیوں پر عمل کیا جا رہا ہو۔

———※(※)※———

نظری معاشیات

معاشیات کیا ہی؟

از :——— ابو سالم ایم۔ اے (علیگ)

اس مقالے کا مقصد معاشیات کی ماہیت اور اہمیت جتانا ہی اس لیے ضروری ہی کہ ہم یہ جان لینے کی کوشش کریں کہ معاشیات کیا اور اس کا موضوع بحث کیا ہی؟

معاشیات کے ماہرین کی کوششوں سے پچھلے ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں معاشی کلیات کا ایسا ذخیرہ جمع ہو گیا ہو جن کی سچائی اور اہمیت ناواقف یا کج فطرت افراد کے علاوہ سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ان کلیات کے مشترک موضوع کی حقیقت کیا ہی؟ اس سوال کا کوئی متفق علیہ جواب دینا مشکل ہی۔ معاشیات کی معیاری کتابوں میں معاشیات کے بنیادی اصولوں کی تصریح و تشریح تقریباً سبھی مصنف ایک ہی طرح کرتے ہیں لیکن موضوع کی بحثوں میں اب بھی بہت ہی نمایاں اختلافات کا پتا چلتا ہی۔

یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہی جیسا کہ مل نے تقریباً ایک صدی پہلے کہا تھا "کسی علم یا فن کی تعریف کا تعین ہمیشہ اس کے وجود میں آجانے کے بعد ہی ہوتا ہی پہلے نہیں۔ کسی شہر کی فصیل جو ہمیشہ اس لیے تعمیر کی جاتی ہی کہ ان عمارتوں کا احاطہ کرے جو پہلے سے موجود ہیں نہ اس لیے کہ ان کا بھی احاطہ کرے جو بعد کو وجود میں آجائیں۔"

سود کے جواز یا عدم جواز کی بحثیں، تجارت درآمد و برآمد کے فرق کے پیدا کردہ مسائل کا مطالعہ۔ یہ ہیں وہ اولین سوالات جن کا حل دریافت کرنے کی کوششوں میں معاشیات کی بنیاد پڑی۔ چناں چہ ہمارا یہ فن اب کہیں جاکر اس منزل پر پہنچ سکا ہو کہ ہم اس کڑی کا پتا معلوم کرسکیں جو ان مختلف النوع مسائل کو ایک ہی رشتے میں منسلک کرتی ہو۔ ارتقا کی اس منزل پر پہنچنے سے معاشیات کی ماہیت کی کھوج کی کوشش کرنا ناکامی کو دعوت دینا تھا اور محض تضیعِ اوقات۔

لیکن اب جب کہ ہم نے یہ منطقی تعلق دریافت کرلیا ہو اور یہ جان لیا ہو کہ معاشیات کے بنیادی مسائل ایک ہی سوال کے مختلف پہلو ہیں اور ایک دُوسرے سے بے تعلق نہیں تو موضوع کی واضح حد بندی کی کوششیں بے کار اور بے معنی نہیں۔ اب نظری معاشیات کی مزید ترقی کے لیے یہ بات ناگزیر ہو کہ ہم اس کے مقصد کا یقین بالکل صحیح طریقے سے کرلیں۔ اب ہم جن مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں وہ محض ذہنی تجسس کے رہینِ منت نہیں۔ نظری معاشیات میں اب بھی بعض خلا ہیں، اس کے توضیحی اصول اب بھی بعض مسائل کو حل کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ ان خلاؤں کو پُر کرنا، اور ان توضیحی اصولوں کے اطلاق کے دائرے کو وسیع تر کرنے کے ذرائع ڈھونڈھنا اب ضروری ہو۔ موضوع کے تعین کی عدم موجودگی میں اس کا بڑا اندیشہ ہو کہ ہمارے ماہرینِ معاشیات ایسے مسائل میں اُلجھ جائیں گے جن کا معاشیات سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہو۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جن علمی مراکز میں اس بنیادی مسئلے کا ایک صحیح جواب حاصل ہوچکا ہو وہاں نظری معاشیات کے اہم مسائل بھی نسبتاً آسانی سے حل ہوجاتے ہیں اور پھر اگر ہم اپنے دریافت کردہ حلوں کو نتیجہ خیز طریقے پر استعمال کرنا چاہتے ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ معاشی کلیات کا عملی زندگی سے کیا رشتہ ہو تو یہ ضروری ہو کہ ہم معاشی کلیات کی اساسی حقیقت اور ان کے اطلاق کی ٹھیک ٹھیک حدیں متعین کرلیں۔

معاشیات مادی خوش حالی کے اسباب کی تشریح و توضیح کا نام ہو۔ معاشیات کی بہت ساری تعریفوں میں غالباً اسی تعریف کو قبولِ عام کی سند مل سکے گی۔ کم سے کم اینگلو سکسن ممالک میں تو اکثریت اس کی حمایت کرے گی۔ یہ عنصر پروفیسر کینن اور مارشل کی تعریفوں میں مشترک ہو۔ پیرٹو (PAIRTO) نے بھی اس تعریف کو استعمال کی عزت بخشی ہو۔ جان بیٹس (JAN BATAS) کلارک کی تعریف میں بھی یہ پہلو موجود ہو۔

بادی النظر میں یہ تعریف عملاً ہمارے عنوان کی وضاحت کے لیے کافی و شافی ہو۔ روزمرہ کی گفتگو میں "معاشی" "مادی" کا مرادف سمجھا جاتا ہو۔ "معاشی تاریخ"، "معاشی اور سیاسی مفاد کا تصادم" اور اس طرح کے بہت سے مواقع پر اس لفظ کے استعمال سے عوام یقیناً وہی مطلب لیتے ہیں جیسے ہم "مادی" کے استعمال سے بھی واضح کرسکتے ہیں اور اس لیے یہ تعریف بہ ظاہر بہت ہی معقول نظر آتی ہو۔

لیکن اس قسم کی کسی تعریف کی مقبولیت یا عدم مقبولیت کا فیصلہ ہم صرف اس طرح نہیں کرسکتے کہ آیا یہ معنی عام کے استعمال سے مناسبت رکھتی ہیں یا نہیں۔ ایسی تعریفوں کے جواز یا عدم جواز کے فیصلے کا انحصار تو صرف اس پر ہوگا کہ وہ اس علم کے اہم کلیات کے بنیادی موضوع کو ایک ساتھ بیان کرسکتی ہیں۔ اور اگر ہم اس تعریف کو اس معیار پر جانچیں تو ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ اس میں ایسی خرابیاں ہیں جنھیں ہم کسی طرح جزوی یا غیر اہم نہیں قرار دے سکتے۔

آئیے نظری معاشیات کے کسی اہم پہلو کو لے لیں اور دیکھیں ہماری یہ تعریف کس حد تک اس پہلو کا احاطہ کرلیتی ہے۔ اس بات پر ہم سب متفق ہو جائیں گے کہ اجرتوں کا مسئلہ، معاشی تفتیش کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔

اُجرت اس معاوضے کو کہتے ہیں جو ایک آقا کی نگرانی میں ایک متعین شرح پر کوئی کام کرنے کے لیے ملے۔ اس کا اطلاق صرف مزدوروں کی محنت کے معاوضے پر محدود کیا جاسکتا ہے اور عام معاشی تخیل میں اس لفظ کا اطلاق نفع کے علاوہ محنت کے معاوضے پر ہوتا ہے۔ بعض اُجرتیں ایسے کاموں کا صلہ ہوتی ہیں جن کی بابت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس خوش حالی میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً گندی نالیاں صاف کرنے والے مہتر کی اجرت۔ یہ صحیح ہے لیکن اتنی ہی صحیح یہ بات بھی ہے کہ بعض اجرتوں کو مادّی خوش حالی سے دُور کا بھی لگاؤ نہیں۔ مثلاً باجہ بجانے والوں کی محنت کا معاوضہ۔ لیکن عملی زندگی میں دونوں کام اپنی قیمت رکھتے ہیں اور دُوسری خدمات کے صلے میں یہ کام لیے اور کیے جاتے ہیں۔ اجرتوں کے تعین سے متعلق ہم جو بھی نظریہ قائم کریں اس کا اطلاق ان دونوں قسم کے کاموں پر مساوی طور سے ہونا چاہیے۔ اس نظریے کی توضیحات کسی طرح بھی ان اجرتوں تک محدود نہیں جو ان کاموں کے عوض میں دی جاتی ہیں جن سے مادّی خوش حالی میں اضافہ ہوتا ہے، خواہ ہم "معاشی خوش حالی" سے کوئی بھی چیز مراد لیں۔

اُجرتیں بعض چیزیں خریدنے کے کام میں لائی جاتی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس پہلو ... دوسرے کو اپنی زیر بحث تعریف کے لیے وجہِ جواز ڈھونڈ لیں۔ اُجرتیں کمانے والے کا کام دُوسروں کی معاشی خوش حالی میں اضا... کرنا ہو یا نہیں۔ یہ اُجرتیں خود اس کی معاشی خوش حالی میں اضافہ کرتی ہیں اور اس لیے 'نظریۂ اُجرت' ہماری زیر بحث تعریف معاشیات کے تحت میں آجاتا ہے لیکن یہ بہت ہی لچر سی دلیل ہوگی۔ اُجرت پانے والا ایک مزدور اپنی اُجرت سے روٹی بھی خرید سکتا ہے اور سنیما کا ٹکٹ بھی۔ ایک نظریۂ اجرت جو ان تمام اجرتوں کو جو "غیر مادّی" کاموں کے صلے میں ملیں یا ان پر صرف کی جائیں نظر انداز کردے تو یہ بھی ایک ناقص اور غلط حدبندی ہوگی۔

معاشیات کے موضوع کو کتنا ہی محدود کردیا جائے لیکن کسی ماہرِ معاشیات نے "اجرت" کو اس طرح قطعی محدود نہیں کیا ہے۔ پروفیسر کینن جیسے ماہر اُستادِ معاشیات نے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ کہ "معاشیات جنگ" میں دو متضاد

تصورات صحیح ہوجاتے ہیں۔ بظاہر پروفیسر کینن کی دلیل یہ ہوگی کہ معاشیات کا تعلق مادی خوش حالی کے اسباب کی دریافت سے ہے اور لڑائی ان ذرائع کو تباہ کرتی ہے۔ اس لیے لڑائی معاشیات کے موضوع کا جزو نہیں ہوسکتی مگر یہ قطعاً صحیح نہیں کہ معاشیات سے واقفیت لڑائی کے مسائل حل کرنے میں کوئی مدد نہیں کرسکتی۔ خود پروفیسر کینن نے اپنی ایک کتاب کے ذریعے یہ بات نہایت واضح طور پر ثابت کردی ہے کہ وہ لوگ جن کے ذمے لڑائی کے لیے قوم کی تنظیم کا کام کیا جاتا ہے معاشیات کی مدد کے بغیر غالباً پوری طرح کام یاب نہیں ہوسکتے۔

عہدِ حاضر کے انگریز ماہرینِ معاشیات کا اس تعریف کو قبول کرلینا یوں بھی کچھ عجیب سی بات ہے۔ تقریباً ان تمام معاشیین نے "بار آوری" (PRODUCTIVITY) کی ایک غیر مادی تعریف کی ہے۔ مگر اسمتھ نے نتیجہ خیز اور بے نتیجہ محنت میں ضرور امتیاز کیا تھا اور اس کے نزدیک بار آوری کا معیار تھا۔ کسی مادی یا مفید چیز کی تخلیق "سوسائٹی کی بعض وقیع ترین جماعتوں کی محنت گھریلو نوکروں کی محنت کی طرح بار آور نہیں ہوتی۔ اس محنت کے نتیجے کے طور پر کوئی مستقل چیز جو محنت کے اختتام کے بعد بھی باقی رہے یا کوئی خرید و فروخت کے قابل چیز وجود میں نہیں آتی . . . . مثلاً بادشاہ اور اس کا تمام وہ عملہ جو عدالت اور جنگ سے متعلق ہو بے نتیجہ کام کرنے والے ہیں۔ اس طبقے میں ہمیں بعض سنجیدہ اور اہم ترین اور غیر اہم بلکہ یقیناً حقیر کاموں کو بھی شامل کرنا پڑے گا۔ پادری، وکیل، اطبا، مصنفین، کھلاڑی، مسخرے، موسیقار، گانے اور ناچنے والے وغیرہ سب اسی زمرے میں شامل ہیں۔" عہدِ حاضر کے معاشیین نے اور پروفیسر کینن نے جن کا نام ان کی صفِ اول میں ہے۔ "بار آوری" کی اس تعریف کو قطعاً ناکافی سمجھا ہے۔ جب تک کوئی چیز آزاد یا جماعت کی طلب کا مرکز بن سکے چاہے وہ ناچنے اور گانے والوں کی محنت ہی کیوں نہ ہو، ان کے نزدیک نتیجہ خیز ہے۔ پھر بار آوری کا آخر معیار کیا ہے۔ کیا مادی خوش حالی؟ کیوں کہ نغمہ و سرود سے تاجر کا دِل سرور سے لبریز ہوجاتا ہے اور اس میں ایک نئی رُوح پھنک جاتی ہے جس کی مدد سے وہ مادی اشیا کی پیداوار کی زیادہ بہتر تنظیم کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ بہت ہی لچر سی بات ہے اس قسم کی محنت کو بار آوری صرف اِس لیے کہتے ہیں کہ لوگ اس کے لیے ایک قیمت ادا کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ کیوں کہ بعض افراد کے لیے ان محنتوں کی ایک متعین اہمیت ہوتی ہے اور اس مسئلے میں ایڈم اسمتھ کے ہم خیال اور موجودہ عہد کے معاشیین میں بہت ہی نمایاں اختلاف ہے۔ عہدِ حاضر کے ماہرینِ معاشیات اس محنت کو بھی بار آور تصور نہیں کرتے جو کوئی ایسی مادی چیز وجود میں لاتے جس کے لیے کوئی شخص کوئی قیمت ادا کرنے کو تیار نہیں۔ یہی نہیں پروفیسر فشر اور بعض دوسرے معاشیین نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ ایک مادی چیز سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے اسے بھی ہم غیر مادی استعمال کی مثال سمجھ سکتے ہیں۔ اپنے گھر سے اپنے خدمات یا گانے والے کے گیت، ان سب سے جو آسودگی حاصل ہوتی

ہے" پیدا ہوتے ہی فنا ہو جاتی ہے۔"

لیکن اگر یہ سچ ہے تو کیا یہ گم راہی نہیں کہ ہم معاشیات کو اب تک مادی خوش حالی کے اسباب کے مطالعے ہی سے متعلق سمجھتے ہیں۔ ایک گانے والے کی خدمات دولت کی ایک شکل ہیں۔ معاشیات ان خدمات کی قیمتوں کے تعین سے بحث کرتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ ایک باورچی کے کام کی اُجرت کے تعین سے قوانین یا اصولوں کا پتا لگانے کی کوشش کرتی ہے۔ معاشیات کا تعلق خواہ کسی بھی چیز سے ہو یہ قطعی ہے کہ وہ فی نفسہٖ مادی خوش حالی کے اسباب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

معاشیات کی اس تعریف کے بقا میں زیادہ تر تاریخی اسباب کو دخل ہے یہ گزشتہ اثرات کی آخری نشانی ہے۔ انگریز ماہرینِ معاشیات نے عام طور پر اصطلاحات کے مسائل سے دل چسپی نہیں لی۔ جہاں کہیں بھی انھیں تعریف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو انھوں نے اکثر و بیش تر بغیر ردّ و قدح کے کسی پرانی کتاب سے ایک تعریف اختیار کر لی ہے۔ لیکن جہاں تک پروفیسر کینن کا تعلق ہے ان کے پاس اس تعریف کے اختیار کر لینے کے اور دلائل بھی ہیں۔ آیئے ان دلائل پر ایک نظر ڈالیں۔

کسی تعریف کی بنائے منطقی کا پتا عموماً اس کے استعمال سے چلتا ہے۔ پروفیسر کینن نے "اکیلے انسان اور سوسائٹی کے ہاتھوں دولت کی بنیادی شرطوں" کے عنوان پر بحث کے سلسلے میں اس تخیل سے فائدہ اُٹھایا ہے کہ کیا چیز معاشی ہے اور کیا نہیں اور یہ واقعہ ہے محض اتفاق نہیں کہ اگر ہم معاشیات کی تفتیش اس نقطۂ نظر سے کریں تو معاشیات کی یہ "مادی" تعریف بہت ہی معقول نظر آتی ہے۔

پروفیسر کینن نے اپنی بحث کی ابتدا ایک اکیلے آدمی کے افعال کے مطالعے سے شروع کی ہے جو سوسائٹی سے بالکل الگ تھلگ زندگی گزار رہا ہے اور یہ دریافت کرنا چاہتا ہے کہ کون کون سی شرطیں دولت کا تعین کریں گی۔ یعنی کن چیزوں پر اس کی مادی خوش حالی کا دار و مدار ہوگا۔ ایسے مقصد کے حصول کے لیے ظاہر ہے انسانی افعال کی یہ دوگونہ تقسیم "معاشی" اور "غیر معاشی" افعال —— وہ افعال جو مادی خوش حالی میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں اور وہ جو "غیر مادی" خوش حالی کا سامان فراہم کرتے ہیں ایک مناسب تقسیم معلوم ہوتی ہے۔

لیکن پروفیسر کینن نے غلطی یہ کی ہے کہ انھوں نے یہ غور نہیں کیا کہ یہ تقسیم ایک ایسی سوسائٹی کے مسائل حل کرنے میں جو "مبادلہ" کی بنیادوں پر قائم ہو کس حد تک کار آمد ہو سکتی ہے۔ یہ سوال اس لیے اور بھی اہم تھا کہ معاشی کلیات عملی طور پر ایسی ہی سوسائٹی کے مسائل کے حل کرنے میں زیادہ کار آمد ہیں۔ اس کی بجائے پروفیسر کینن

نے انھوں نے اپنی توجہ ساری سوسائٹی کے لیے "دولت کی بنیادی شرطوں" کا پتا لگانے کی طرف پھیر دی ہو اور اس سوال سے تقریباً آنکھیں بند کرلیں کہ وہ سوسائٹی ذاتی ملکیت اور آزاد مبادلے کی بنیادوں پر قائم ہو یا نہیں اور یہاں بھی ان کی تعریف اگر ہم اسے غائر نظر سے نہ دیکھیں معقول معلوم ہوتی ہو۔ یعنی ہم جماعتی افعال کے سارے مجموعے کو دو حصّوں، معاشی و غیر معاشی میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ بعض مادی خوش حالی میں اضافے کے لیے ہوتے ہیں اور بعض نہیں۔

پروفیسر کینن نے "معاشی" اور "غیر معاشی" افعال کی تعریف بالترتیب متعین کی ہو یعنی وہ افعال جو مادّی خوش حالی میں اضافہ کریں اور دُوسرے جو غیر مادّی خوش حالی ہیں ان تعریفوں کو اگر ہم بھی مان لیں تو پروفیسر کینن کے خیال کے مطابق یہ کہہ سکتے ہیں کہ سوسائٹی کی دولت کی کمی یا زیادتی کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ وہ اپنے وقت کا کتنا حصّہ مادی خوش حالی کی تلاش میں اور کتنا غیر مادی خوش حالی کی تلاش میں لگاتی ہو لیکن لفظ "معاشی" کے روزمرہ کے مفہوم کے مطابق بھی اور بھی مجموعی قوم کے لیے ایک معاشی سوال باقی رہ جاتا ہو وہ یہ کہ دن اور رات کے ۲۴ گھنٹوں کو کس طرح ان دونوں مقاصد کے حصول کے لیے آپس میں تقسیم کیا جائے؟ گویا "معاشی" اور "غیر معاشی" کو ایک دُوسرے پر ترجیح دینے کا ایک معاشی مسئلہ جواب بھی باقی ہو اور نظریۂ دولت کے اہم مسائل میں ہو۔ پروفیسر کینن کی تعریف سے تقریباً خارج رہ جاتا ہو۔

کیا یہ خود اس تعریف کے ترک کردینے کے لیے کافی نہیں؟

لیکن پھر ہم کدھر جائیں؟ اس دقت کا حل کرنا بہت دُشوار نہیں۔ معاشیات کی مادی تعریف پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ہم ایک ایسے نکتے پر پہنچ گئے ہیں جس پر ہم دُوسری تعریف کی بنیاد رکھ سکتے ہیں جو ان تمام اعتراضات سے محفوظ ہوگی۔

آیئے ایک یکہ و تنہا آدمی کی مثال پر غور کریں جسے کام اور آرام کے درمیان اپنے وقت کی تقسیم کا مسئلہ حل کرنا ہو۔ ابھی ہم نے تسلیم کیا ہو کہ اس تقسیم کا ایک معاشی پہلو ہو۔ وہ کیا ہو؟

اس سوال کا جواب ان شرائط کے تعین میں مضمر ہو جو اس طرح کے تقسیم اوقات کو ضرُوری بنادیتی ہیں۔ یہ چار ہیں:

پہلی بات تو یہ کہ اس فرضی یکہ و تنہا آدمی کو کام اور آرام دونوں کی خواہش ہو۔ اس کے پاس ان دونوں مطلوب چیزوں میں سے کوئی بھی اتنی کافی مقدار میں موجود نہ ہو کہ اس کا جی بھر جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ اپنے وقت کو یا اپنی آمدنی بڑھانے میں صرف کرسکتا ہو یا زیادہ آرام میں، اور یہ فرض کیا جاسکتا ہو کہ بعض غیر معمولی مستثنیات کے علاوہ، تمام حالتوں میں اس کی طلب معزی اور آرام کی مختلف شکلوں کے لیے مختلف ہوگی۔ ظاہر ہو ایسی صورت میں چھانٹنا پڑتا ہو اور کفایت شعاری سے کام لینا پڑتا ہو۔ اس طرح وقت اور ذرائع کے استعمال کو اس کی خواہشات سے ایک گہرا تعلق ہو اور یہی معاشی پہلو ہو۔

ایک ماہرِ معاشیات کے نقطۂ نظر کے مطابق انسانی زندگی کی چار بنیادی خصوصیتیں ہیں۔ ہمارے مقاصد مختلف ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے وقت اور ذرائع دونوں ہی محدود ہیں اور ساتھ ہی دونوں کو مختلف کاموں میں لگایا جاسکتا ہے۔ اور ہماری مختلف خواہشیں مختلف اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ انسانی فطرت کو قدرت نے مختلف خواہشات اور تمناؤں کی آماجگاہ بنادیا ہے۔ یہ امیدیں اور یہ تمنائیں اسے مختلف کام کرنے کے لیے اُبھارتی رہتی ہیں، لیکن ان تمام خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ہمیں جتنے وقت اور مواقع کی ضرورت ہے۔ وہ ہمارے پاس نہیں۔ زندگی مختصر ہے اور فطرت بخیل، اس لیے ہم مجبور ہیں کہ بعض خواہشات کی تکمیل کی تمناؤں سے بھلادیں۔ ہم زندگی کے ایام مختلف کام کرنے میں لگاسکتے ہیں۔ اور دوسروں سے بھی مختلف کام لے سکتے ہیں لیکن مقاصد کی کثرت فی نفسہٖ معاشیات کے ایک طالب علم کی دلچسپی کے لیے کافی نہیں۔ اگر میں دو کام کرنا چاہتا ہوں اور میرے پاس دونوں کاموں کی انجام دہی کے لیے کافی وقت اور کافی وسائل موجود ہیں، جن کی کسی دوسرے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تو میرے طرزِ عمل میں کوئی ایسا پہلو پیدا نہیں ہوتا جو معاشیات کے موضوع کے تحت میں آجائے۔

ذرائع کی قلت بھی فی نفسہٖ معاشی سوالات پیدا نہیں کرتی، اگر آسودگی کے ذرائع مختلف خواہشات کی تکمیل کے لیے استعمال نہیں کیے جاسکتے تو کم ہوتے ہوئے بھی مقصدِ استعمال میں انتخاب کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ من وسلویٰ کا جو خوان آسمان سے آیا تھا، ممکن ہے اس کی مقدار قلیل رہی ہو لیکن اگر اس کا کسی اور چیز سے مبادلہ ممکن نہ رہا ہو، یا اس کے استعمال کو ٹالا نہ جاسکتا ہو، تو اس سے متعلق کسی ایسے عمل کا تصور نہیں کیا جاسکتا، جسے معاشیات سے کوئی تعلق ہو۔

قلیل المقدار ذرائع کی مختلف مقاصد کے حصول کے لیے استعمال ہونے کی صلاحیت بھی بہ ذاتِ خود اس کی ضامن نہیں کہ اس سے ایسے سوالات پیدا ہوسکیں جو بہ حیثیت معاشیات کے طالب علم کے ہمارے غور وفکر کا موضوع بن جائیں۔ اگر ایک انسان کے لیے تکمیل یکساں طور پر اہم ہو اور ان کی تکمیل کے لیے اس کے پاس صرف ایک ہی ذریعہ ہو تو ظاہر ہے یہاں بھی انتخاب کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن جب وقت اور ذرائع محدود ہوں اور مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہوں اور خود مقاصد کو ایک دوسرے پر فوقیت دی جاسکے تو ہمارے لیے انتخاب اور ترجیح کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا۔ اگر ہم اپنے وقت اور اپنے مادّی ذرائع کو ایک مقصد کے حصول کے لیے استعمال کریں تو پھر ہم ان کو دوسرے مقصد کے سلسلے میں استعمال نہیں کرسکتے۔ اگر مجھے بھوک بھی ہو اور نیند بھی اور میرے پاس اتنا وقت نہ ہو کہ میں دونوں خواہشات کو پورا کرلوں تو مجھے اس پر اکتفا کرنا پڑے گا کہ میں تھوڑا سا سولوں اور تھوڑا سا کھالوں۔ اگر اپنی محدود زندگی میں آپ ماہرِ ریاضیات

اور فلسفی دونوں ہی بننا چاہتے ہیں لیکن ان علموں کے حصول کی رفتار ایسی نہیں کہ آپ دونوں میں مہارتِ تامہ حاصل کرلیں تو ان دونوں میں سے ایک علم میں مہارت کی خواہش کو کسی حد تک قربان کرنا پڑے گا۔

انسان کے مقاصد کے حصول کے لیے سارے ذرائع محدود نہیں، دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جو اتنی کثیر مقدار میں موجود ہیں کہ ایک خواہش کی تکمیل کرنے میں یہ لازم نہیں ہوجاتا کہ دوسری خواہشوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں ان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ہوا اس طرح کی ایک منفعت کی چیز ہے۔ بعض خاص حالتوں کو چھوڑ کر ہوا کی ضرورت ہمارے وقت یا ذرائع کی کسی قربانی کی متقاضی نہیں ہوتی۔ سانس لینے سے یہ ضروری نہیں ہوجاتا کہ ہم ہوا کو کسی اور مقصد کے لیے استعمال نہ کرسکیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ کی خواہشیں اتنی محدود ہوں کہ ان کے لیے ہر چیز منفعت کی بن جائے اور کسی چیز کی بھی کوئی اہمیت نہ ہو۔

لیکن عام طور پر غیر محدود اور مختلف النوع مقاصد کے لیے انسانی جد وجہد وقت اور ذرائع کی عائد کردہ پابندیوں سے اس طرح بے نیاز نہیں ہوسکتی۔ ہمارے پاس وقت محدود ہے دن رات میں صرف ۲۴ گھنٹے ہوتے ہیں، ان گھنٹوں کو کن کن کاموں میں لگائیں؟ ہمیں اس کا فیصلہ کرنے میں بعض کاموں کو بعض پر ترجیح دینی پڑتی ہے۔ دوسرے لوگ جو مدد ہمیں دیتے ہیں ان کی مقدار بھی محدود ہوتی ہے۔ مختلف خواہشات کی تکمیل کے لیے مادی ذرائع محدود ہوتے ہیں۔ مختلف درجوں کے مقاصد کے حصول کے لیے ذرائع کی قلت کا سامنا انسان کو زندگی میں تقریباً ہمیشہ کرنا پڑتا ہے۔

قلیل المقدار ذرائع کے استعمال میں انسان کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے؟ یہی مرکزی سوال معاشیات کے مختلف اجزا میں ربط اور اتحاد قائم کرتا ہے۔ جن مثالوں سے ہم نے اوپر بحث کی ہے وہ سب کی سب اس تصور سے نہایت آسانی سے ہم آہنگ ہوجاتی ہیں۔ باورچیوں کی خدمات اور ناچنے والوں کی محنت دونوں ہی کی رسد ان کی طلب کے مقابلے میں محدود ہے اور دونوں ہی اپنی محنت کو دوسرے کاموں میں لگا سکتے ہیں۔ نظریۂ اُجرت پوری طرح اس تعریف کے تحت میں آجاتا ہے۔ معاشیاتِ جنگ بھی اس سے باہر نہیں۔ سوسائٹی کو لڑائی کے لیے منظم کرنے میں لازماً چیزوں اور افراد کی محنتوں کو بعض مقاصد کے حصول کی کوششوں سے آزاد کرکے دوسرے مقاصد کے حصول میں لگانا پڑتا ہے کہ اس کے بغیر کامیاب تنظیم ممکن نہیں اور یہ ایک معاشی پہلو ہے۔ معاشیات کا طالبِ علم قلیل المقدار ذرائع کے استعمال کا مطالعہ کرتا ہے۔ رسد کی قلت کے لحاظ سے اشیا کے مختلف درجے قائم کیے جاسکتے ہیں۔ ان کی رسد کی قلت کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے لیے ہم مختلف قیمتیں دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان کی طلب میں اگر کسی وجہ سے کمی ہوجائے تو یہ چیز قیمت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اسی طرح اگر ان کی رسد میں اضافہ یا کمی ہوجائے تو ان کی قیمتوں میں تبدیلیاں ہوجاتی ہیں۔ ان تبدیلیوں سے ان کی باہمی قیمتوں کے تناسب میں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ معاشیات انھی مسائل سے بحث کرتی ہے۔

(ترجمہ)

مسائلِ حاضرہ (غیر ممالک)

برطانیہ اور امریکی قرضہ

ترجمہ از : ——— ادارہ

کافی تاخیر اور بڑی مشکلات کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سینیٹ نے آخر برطانیہ کو قرضہ دینے کا معاہدہ منظور کرلیا۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ برطانیہ اور امریکہ کے درمیان یہ معاہدہ ۷، دسمبر ۱۹۴۵ء کو وجود میں آیا تھا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ معاہدہ امریکی سینیٹ میں صرف بارہ ووٹوں کی اکثریت سے پاس ہوا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مخالفت کافی زوردار تھی۔ بہرحال یہ بات سرکاری حلقوں کی امیدوں کے خلاف نہیں ہے۔ اس لیے کہ معاہدے کے پاس ہونے سے پہلے تو بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید مخالف جماعت اپنی بات منوالے اور برطانیہ امریکی قرض سے محروم رہ جائے۔ بحث کے دوران میں معاہدے کے مخالفوں نے برطانیہ کے خلاف کافی غیر دوستانہ قسم کے اعتراضات کی بوچھاڑ کی۔ لیکن یہ حقیقت بھی کم اہم نہیں کہ مخالفت جماعت کی طرف سے جتنی بھی ترمیمیں پیش کی گئیں وہ سب رد کردی گئیں۔ اور معاہدہ اپنی بالکل اصلی شکل میں منظور ہوگیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا یعنی اگر کچھ ترمیمیں منظور کرلی جاتیں تو پھر معاہدے کا منظور ہونا بالکل بے کار ثابت ہوتا۔ بات اصل یہ تھی کہ واشنگٹن کے سیاسی اور سرکاری حلقوں کے لوگ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ برطانیہ مزید رعایتیں کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

حکومت برطانیہ کے زیادہ تر ارکان اب یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ معاہدہ بہت کافی مہنگا پڑا۔ اس لیے کہ وہ ایسے وقت میں کیا گیا تھا جب برطانیہ کا معاشی مستقبل بہت اندوہ ناک نظر آرہا تھا۔ معاہدے کے وجود میں آنے کے بعد سے برطانیہ کی صنعتی حالت کچھ سدھر چلی ہی اور اُس کی ادائیگیوں کا توازن بھی سنبھل گیا ہی۔ چناں چہ اب اگر قرضے کی بات چیت نئے سرے سے شروع ہوتی تو غالباً برطانیہ اپنے موافق شرائط منظور کرانے میں کام یاب ہوجاتی۔ اگر امریکہ کی مجلس قانون ساز ترمیم منظور کرانے میں کام یاب ہوجاتی تو پھر پورا معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔ امریکی حکام اس صورتِ حال سے بچنا چاہتے تھے چناں چہ انھوں نے موجودہ معاہدے کے فائدوں سے دست بردار ہونا پسند نہ کیا اور اپنی کوششوں سے سینیٹ میں اُسے منظور کرالیا۔

اب یہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ پانچ ماہ پہلے اِس معاہدے کی شرطیں برطانیہ کے حق میں جس قدر غیر موافق نظر آرہی تھیں اتنی اب نہیں معلوم ہوتیں۔ وہ انگریز جنھوں نے دسمبر میں اس معاہدے کی مخالفت کی تھی وہ اس معاہدے کے بنیادی اصولوں کے اب بھی مخالف ہیں۔ اُن کے اعتراضات وہی ہیں جو پہلے تھے۔ یعنی سونے کے معیار کا دوبارہ اجرا جو بریٹن وڈس کا راضی نامہ منظور کرلینے کے بعد برطانیہ کے لیے لازم ہوگیا ہی۔ اسٹرلنگ حلقے کی پابندیوں کے اُٹھ جانے سے سلطنتِ برطانیہ کی اندرونی تجارت کمزور پڑ گئی ہی۔ شاہی تجارتی ترجیحات کے ٹوٹ جانے سے برطانیہ کو تجارتی نقصان پہنچا ہی۔ وغیرہ وغیرہ۔ مخالف حضرات کا یہ بھی اعتراض ہی کہ پہلے برطانیہ کی خارجی تجارت کی بنیاد دو ملکی (BILATERAL) تجارت پر قائم تھی لیکن اب وہ آزاد بین اقوامی تجارت پر قائم ہوگئی ہی۔ لیکن اب مخالفین بھی یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ مستقبل قریب میں اِن شرائط کے اثرات تباہ کن نہیں ثابت ہوں گے۔

اِس اُمید اور رجائیت کی وجہ یہ ہی کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے معاشی حالات اس پانچ ماہ کے عرصے میں کافی بدل چکے ہیں۔ برطانیہ میں لیبر وزارت بن جانے کی وجہ سے ہڑتالیں بہت کم ہوئی ہیں اور اگر ہوئی بھی ہیں تو اُن کی شدت زیادہ نہیں رہی ہی۔ برخلاف اس کے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اس عرصے میں عظیم ترین ہڑتالیں ہوئی ہیں اور کثرت کے ساتھ اِن ہڑتالوں کی وجہ سے شہری استعمال کی اشیا کی پیدائش میں رکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں۔ چناں چہ امریکہ کو جو یہ توقع تھی کہ وہ ابتدا ہی میں بہت کافی مقدار میں اشیا پیدا کرلے گا اور دُنیا کے تمام ممالک خاص کر برطانیہ اس سے بہت پیچھے چھوٹ جائے گی وہ پوری نہ ہوسکی۔ اب یہ خوف زیادہ نہیں رہا کہ برطانوی صنعتوں کے سنبھلتے سنبھلتے امریکہ دُنیا بھر کی مانگوں پر اپنا قبضہ جمالے گا لیکن آج سے چند ماہ پہلے برطانیہ کو یہ خوف بُری طرح لاحق تھا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لیے یہ بات اور بھی اہم ہی کہ وہاں صنعتی مزدوروں کی بے چینی کے ساتھ ساتھ اشیا کی قیمتوں اور مزدوریوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہی۔ لیکن اس کے برخلاف برطانیہ میں قیمتوں اور مزدوریوں کو ایک مناسب

سطح پر برقرار رکھا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۰۳ء۴ ڈالر اور ایک پونڈ کی شرح تبادلہ پر برطانیہ کا مال امریکی مال کے مقابلے میں گھاٹے میں نہیں رہے گا۔ اگر امریکہ میں اشیا کی قیمتوں اور مزدوریوں میں اسی طرح مسلسل اضافہ ہوتا رہا تو پھر ممکن ہے کہ موجودہ شرح تبادلہ پر برطانوی اسٹرلنگ کی قیمت گھٹ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو برٹین وڈس کے راضی نامے کے تحت شرح تبادلہ کو جو اس قدر بے لوچ کر دیا گیا ہے اُس سے مستقبل قریب میں برطانوی مال کو نقصان نہیں ہوگا۔ اور نہ برطانیہ کو اس بات کی کوئی خاص طور سے ضرورت پڑے گی کہ الگ الگ ملکوں سے تجارتی عہدناموں کے ذریعے یا خطہ داری بنیاد پر سکوں سے متعلق راضی نامے کر کے برطانوی مال کے لیے بازار مہیا کرے۔ کم سے کم آیندہ پانچ سال تک بالکل آزاد بین اقوامی تجارت کے ہوتے ہوئے بھی برطانوی مال امریکہ اور دیگر ملکوں کے مقابلے میں گھاٹے میں نہیں رہے گا۔

جس وقت برطانیہ اور امریکہ کے درمیان قرضے کا معاہدہ ہوا تھا اُس وقت ایسی صورتِ حال کے پیدا ہونے کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اُس وقت تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ برطانیہ قرضے کی شرائط کو منظور کر کے فوری امداد کی خاطر اپنے بین اقوامی حساب چکانے کے تمام مواقع کھو بیٹھی ہے۔ اس درمیان میں یہ بات بھی لوگوں پر واضح ہو گئی کہ آج سے پانچ ماہ پہلے امریکہ کی فوری مالی امداد کو جس قدر ضروری سمجھا جا رہا تھا وہ مبالغے سے خالی نہیں تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ کم سے کم آیندہ پانچ سال تک اس قرضے کی شرائط کے تحت برطانیہ کو بہت زیادہ قربانیاں نہیں کرنی پڑیں گی۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ مستقبل بعید میں برطانیہ کو اس معاہدے کی رُو سے فائدہ پہنچے گا یا نقصان؟ اس مسئلے پر بھی معاہدے کے مخالفین اب اس قدر پریشان نہیں نظر آتے جتنے پانچ ماہ پہلے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دسمبر میں تو حکومتِ برطانیہ نے قرضے کی بات چیت کو کامیاب بنانے کے لیے امریکی شرائط منظور کر لی تھیں لیکن اب وہ معاشی توسیع کی پالیسی کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور نہ اس معاشی طرزِ عمل سے ہاتھ دھونے کے لیے تیار ہے جس کے تحت سلطنتِ برطانیہ کے حدود کے اندر برطانوی مال کو امریکہ اور دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ترجیح حاصل رہی ہے۔ گزشتہ چند ماہ میں حکومتِ برطانیہ کے ذمہ دار لوگوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیندہ منعقد ہونے والی بین الاقوامی تجارتی کانفرنس میں شاہی ترجیح[1] کے اصول کو برقرار رکھنے کی برطانیہ پوری کوشش کرے گی۔ اور اگر وہ شاہی ترجیح کے اصول کو خیرباد کہنے کے لیے تیار بھی ہوگی تو اس شرط پر کہ امریکہ اپنے تجارتی محصولات بالکل گھٹا دینے پر راضی ہو جائے۔ زیادہ تر امکان اس بات کا ہے کہ امریکہ کے کاروباری حلقے اس کی سخت مخالفت کریں گے۔ ایسی صورت میں شاہی ترجیح کے برقرار رہنے کا امکان زیادہ ہے۔ اگرچہ اس کی حدیں پہلے سے کم ہو جائیں گی۔

---

[1] اس اصول کے تحت سلطنتِ برطانیہ کے اندرونی بازاروں میں برطانوی مال کو ترجیح حاصل ہے۔

ان تمام باتوں سے جو سب سے اہم حقیقت واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بریٹن ووڈس کے راضی ناموں اور آیندہ ہونے والے تجارتی عہدناموں سے جو بین اقوامی معاشی نظام وجود میں آئے گا وہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہے گا۔ آیندہ چند سالوں میں برطانوی تجارت غیر واجب طور پر بے لوچ شرح تبادلہ اور آزاد بین اقوامی تجارت کے زیادہ نقصانات نہیں برداشت کرے گی۔ آگے چل کر جب صورتِ حال بدلے گی تو پہلے ہی بحران میں برطانیہ دوبارہ لوچ دار شرح تبادلہ اور الگ الگ ملکوں سے تجارتی عہدنامے کرنے کے اصول پر کاربند نظر آئے گی۔ اور ایسا کرنے میں برطانیہ بالکل حق بہ جانب ہوگی۔

برطانیہ کو غیر ملکی سکے کی اتنی کافی مقدار حاصل ہو جائے گی کہ وہ اپنی بین اقوامی حالت کو سدھار سکے گی۔ دسمبر میں جب قرضے کا معاہدہ ہوا تھا تو اُس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ برطانیہ کو اتنا غیر ملکی سکہ نہیں حاصل ہو سکے گا کہ آیندہ دو سال تک اپنے تجارتی گھاٹوں کو پورا کر سکے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ کی آزادیٔ عمل خطرے میں ہے اور اُسے خود اپنے سوچے ہوئے راستوں پر چل کر اپنی معاشی دقتیں حل کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ اور یہ سب قربانیاں اسے محض عارضی امداد کی خاطر کرنی پڑ رہی ہیں۔ لیکن اس کے بعد صورتِ حال بدل گئی۔ برطانیہ کو کنیڈا سے ایک معتدبہ رقم قرضے کے طور پر حاصل ہوگئی۔ گزشتہ چند مہینوں میں برطانیہ کا تجارتی توازن بھی سنبھل گیا اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ سے جو قرضہ ملا ہے اُس سے برطانیہ کے پاس ڈالر کی کافی مقدار بچ رہے گی۔

ان امیدوں کا انحصار بہت حد تک اس بات پر ہے کہ برطانیہ پر جو اسٹرلنگ قرضے عائد ہوتے ہیں وہ کن شرائط پر طے ہوتے ہیں۔ اُمید اس بات کی ہے کہ برطانیہ ان قرضوں کی اولین ادائی میں بہت زیادہ دریا دلی اور فیاضی سے کام نہ لے گی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ چوں کہ اس وقت امریکہ سے سلطنتِ برطانیہ کے بیش تر ملکوں کی برآمد تجارت درآمد تجارت کے مقابلے میں زیادہ ہے اس لیے ان ملکوں کے پاس کم سے کم اتنے ڈالر ضرور ہوں گے کہ وہ امریکی مال و اسباب کی قیمتیں ادا کر سکیں۔ اس کے علاوہ وہ ممالک براہ طور پر امریکہ سے ڈالر قرض بھی لے سکتے ہیں۔

برطانیہ کے پاس جب ڈالر کی ایک معتدبہ مقدار بچ رہے گی تو اس سے بہت حد تک یہ عام خیال دُور ہو جائے گا کہ برطانیہ اب دنیا کی ایک عظیم طاقت نہیں رہی۔ کسی قوم کی طاقت یا کمزوری کا اندازہ اس بات سے نہیں لگایا جاسکتا کہ اس کے پاس غیر ملکی سکے حاصل کرنے کے فوری ذرائع ہیں یا نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ کے زمانے میں برطانیہ کو اپنے غیر ملکی سرمایوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور اس پر غیر ملکوں کے قرضے عائد ہوگئے۔ لیکن اُس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ برطانیہ کی قومی دولت کا اصلی اور سب سے بڑا حصہ بھی ختم ہوگیا جس کی بنیاد برطانیہ کی قوتِ پیدائش پر ہے۔ بلکہ اس وقت برطانیہ زر کے پُرانے نظریوں کو خیرباد کہہ کر اور معاشی توسیع کی پالیسی اختیار کر کے پہلی کی بہ نسبت آج کہیں زیادہ اس قابل ہے کہ اپنی اصلا

قوت، مادی ذرائع، فنی مہارت اور تنظیمی صلاحیتوں کا استعمال کر سکے۔ آج برطانیہ اپنی نوآبادیات کے وسیع و عریض قدرتی ذرائع کو بہتر طور پر استعمال میں لا سکتی ہے۔ یہ ہیں وہ حقائق و واقعات جو اس بات سے کہیں زیادہ اہم ہیں کہ برطانیہ کے پاس ڈالر کی کافی مقدار موجود ہے یا نہیں۔ لیکن چوں کہ بنیادی حقائق لوگوں کو صاف نہیں نظر آتے اور ڈالر کی فوری ضرورت کا احساس شدید ہے اس لیے ظاہر بیں حضرات غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔

بین اقوامی جنگی قرضے جب طے ہو جائیں گے تو برطانیہ دوبارہ بین اقوامی مالی دنیا میں عملی اور تعمیری حصہ لے سکنے کے قابل ہو جائے گی۔ برطانیہ کو غریب اور مفلس اور امریکہ کا دست نگر بنا کر جو پیش کیا جا رہا ہے وہ غلط ثابت ہو کر رہے گا۔

("انڈین فنانس")

تاریخی معاشیات

ابنِ خلدون عہدِ متوسط کا ایک معاشی مفکّر

از ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ منظہر۔ رح۔ یوسف۔ بی۔ اے

ابنِ خلدون جو بہ یک وقت ایک بڑا مورخ، فلسفی اور معاشی تھا ایسے زمانے میں پیدا ہوا تھا جب تمام یورپ جاگیرداری اور اسکولسٹس ازم کے جال میں جکڑا ہوا تھا۔ یہی نہیں، اس وقت تمام نہاد اسلامی ممالک کی اسلامی تہذیب بھی جس نے انسانیت کے سادہ اور پُر خلوص پیام کی وجہ سے کبھی عرب کے تپتے ہوئے ریگستان سے لے کر پیرس کے مرغزاروں تک پہنچ کر، کروڑوں انسانوں کا دل موہ لیا تھا، مائل بہ تنزل ہو چلی تھی۔

ابنِ خلدون کے اکثر معروضات کا ہمیں کما حقہٗ علم نہیں اور علم المعیشت کے نظریوں کا تو اور بھی کم ہے۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ جو شہرت ابنِ خلدون نے بحیثیت مورخ اور بہ حیثیت فلسفہ داں کے حاصل کی ہے اس سے اس کی معاشی حیثیت پس منظر میں جا گری۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جب ہم اس کی تصنیفات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے خیالات کو مستند اور اس کے نظریوں کو ناقابلِ گرفت پاتے ہیں۔ وہ آڈم سمتھ کی طرح نہیں جو باوجود اس کے کہ ایک عرصۂ دراز کے بعد پیدا ہوا اور معاشی مفروضوں میں کوئی حقیقی اضافہ نہ کر سکا۔ اس نے مابہ الامتیاز شہرت حاصل کر لی۔ برخلاف اس کے خلدون جدت پسند خلقی مفکر تھا اور علمِ معیشت کے وسیع اور دشوار گزار میدان میں دانستہ طور پر، کافی غور و خوض کے بعد اُترا تھا۔ اس نے بڑی سمجھ اور بوجھ سے معیشت کے اصولوں کو انسانی زندگی میں کارفرما ہوتے ہوئے دیکھا اور عوام الناس کو سمجھانے کی کوشش کی،

اِس سے برسوں پہلے کہ مغربی تحقیق اپنا جنم لے، نشوونما پاناتو درکنار رہا۔ وہ دراصل پیش رو ہے کن سیڈ رنٹ، مارکس، بیکومین، من اور ہابس کا اور یہ حقیقت ہے کہ بیش تر مفروضات جنھیں ہم اِن مفکروں میں کسی سے وابستہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، تقریباً اُن سب کے نقوش ہمیں ابنِ خلدون کی "پرولی جنا" میں جہاں تہاں مِل جاتے ہیں۔ بالخصوص کتاب کے باب پنجم میں جہاں اُس نے نہایت مختصر مگر جامع اور ٹھوس بحث نظری اور اطلاقی معیشت سے کی ہے۔

اپنے ہم عصر دُوسرے فلسفی اور معاشی مفکروں سے مختلف جن کا زاویۂ نگاہ اکثر و بیش تر مذہب، دینیات اور روایات سے متاثر نظر آتا ہے، ابن خلدون کی فکر کلیتاً دنیاوی (SECULLAR) ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ عرب کی تاریخ کے پسِ منظر میں نمو پاتی ہے۔ خلدون کا مطالعہ سائنسی ہے۔ وابستہ کاوش اور محنت کا محتاج اور وہ ایک ایسی روح کی رہ نمائی کرتا ہے جو بہ درجۂ اتم، استعجاب، تجسس اور یونانی (HELLINIC) خیال میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم اس کے خیالات کو ایک دُوسرے سے نمایاں اور اُن کو حدود میں متعین نہیں کرسکتے۔ وہ سب ایک دُوسرے سے ہم رشتہ معلوم ہوتے ہیں بلکہ ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں۔ لیکن اس کے باوجود یہ بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ ان کی اثاث تحلیلی مطالعے پر مبنی ہے۔ ایک روشن اور پُربصارت آنکھ سے واقعات کا جزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور اسی باعث وہ تمام مفروضات دنیا کی گوناگوں حقیقتوں کا آئینہ دار ہیں۔

دُوسرے معاشیوں کی طرح ابنِ خلدون "انسان" کا بہ طور ایک مجلسی جانور" مطالعہ شروع کرتا ہے "یہ ایک ننھا لیکن ناگزیر پُرزہ معاشرے کی مشین کا"۔ کیا علمِ معیشت کی، روز افزوں اہمیت کے باوجود آج تک ابنِ خلدون سے پانسو سال بعد بھی، کوئی مفکر ہمیں اصلِ مضمون سے اِس سے بہتر طریقے پر روشناس کراسکا ہے۔ بالخصوص "محنت" اور بڑی حد تک "آبادی" پر آج تک جو کچھ بھی لکھا گیا ہے "پرولی جنا" میں موجود ہے۔ پین (PAINE) اور رکارڈو سے چار سو سال پہلے خلدون نے محنت کے نظریۂ قدر کو پیش کیا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جب ہم اس نظریے کا مطالعہ تاریخ کی روشنی میں کرتے ہیں تو مارکس (MARX) کے خیال کا سلسلۂ نسب سینٹ سائمن (ST SIMON) تک پہنچاتے ہیں۔ درآں حالے کہ خلدون پہلا معاشی ہے جس نے محنت کی اہمیت پر زور دیا۔ مارکس کا اگر تحلیلی مطالعہ کیا جائے تو تمام تر خلدون کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جب مارکس تاریخ کی معاشی توضیح پیش کرتا ہے یا جب وہ انسان کے برتاؤ، اس کے خیالات، اُس کے کردار اور اُس کی انا کو ماحول سے متاثر بتاتا ہے۔ بالخصوص روزی کمانے کے طریقوں سے تو وہ خلدون سے بڑا متاثر معلوم ہوتا ہے۔ ابنِ خلدون تو یہاں تک کہتا ہے کہ "قومی تفریق کا اثاث بھی پیشوں کے امتیاز پر مبنی ہے"۔ معاشی اداروں مثلاً محنت کی تقسیم، مبادلہ اور زر کی جبلّی نشوونما سے، جس کے لیے ایڈم اسمتھ کو دادِ تحسین دی جاتی ہے، ساڑھے تین سو سال پہلے ہی خلدون واقف کار نظر آتا ہے۔

غلاموں کی خرید فروخت اور لازمی محنت جیسی رسموں کے خلاف ابنِ خلدون بڑی ہم آہنگی سے آواز بلند کرتا ہے: " یہ رسمیں ضمیر، تہذیب اور صحتِ عامّہ کے خلاف ہیں " اس جگہ خلدون کا افلاطون (PLATO) سے مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ جو بہ جائے غلامی کی رسم کے خلاف آواز اٹھانے کے اپنی " جمہوریہ " میں اُسے صحیح اور درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

محنت مختلف کاموں کے لیے کی جاتی ہے۔ اس طرح پیشوں کا مطالعہ ضروری ہوا۔ پیشوں میں وہ ایک کی اہمیت پر بہت زور دیتا ہے اور وہ ہے " زراعت " یہاں وہ فزیوکریٹس (PHYSIOCRATS) کا پیش رو نظر آتا ہے۔ ابنِ خلدون کو زمین کی اہمیت کے ساتھ اس امر کا بھی احساس ہے کہ اُس کی معدنیاتی زرخیزی آہستہ آہستہ کم ہوتی رہی ہے جسے برقرار رکھنے کے لیے مصنوعی ذرائع اختیار کرنا ضروری ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ آج جس چیز سے ہم مالتھس کے مشہور تناسب (RATIO) اور ملز کے " گھٹتے حاصل کا قانون "[ا] .... کے ناموں سے روشناس ہیں وہ اصل میں خلدون کا نظریہ نئے روپ میں ہونے کے سوا کچھ نہیں۔

دوسری طرف محنت کا مطالعہ آبادی کے مسئلے کو معرضِ بحث میں لے آتا ہے۔ اس جگہ وہ تجارتیت کا حامی (MERCANTILIST) زیادہ ہے اور فزیوکریسی کا کم۔ اسی وجہ سے وہ انسانوں کی " تعداد " پر زور دیتا ہے۔ یہی نہیں انسانوں کی تعداد اور اُن کی خوش حالی میں جو باہم ربط ہے وہ اُس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ لوتھر، دے لینڈ اور رودسٹون نے جن دلائل سے مالتھس کے آبادی کے مفروضے کو جھٹلانے کی کوشش کی، اُن کی طرف بھی خلدون اشارے کرتا نظر آتا ہے۔ لوتھر دینیات سے بے انتہا متاثر ہے۔ وہ لکھتا ہے " خدا ہر ذی روح کے لیے روٹی بہم پہنچاتا ہے " رودسٹون نے ایک جگہ لکھا ہے " ہر شخص جو دنیا میں آتا ہے، اپنی روٹی پیدا کرنے کے ذرائع بھی ساتھ لاتا ہے " ابنِ خلدون نے اسی بات کو چار سو سال پہلے یوں بیان کیا تھا: " انسان جب دنیا میں آتا ہے تو پیٹ کے ساتھ دو ہاتھ بھی لاتا ہے جن سے بہ خوبی ضرورت کے مطابق پیدا کر سکتا ہے " خلدون بالواسطہ محصولات (INDIRSCT TAXATION) کا بڑا مخالف تھا۔ اُس کے یہاں داغِ آفتاب[۲] والا تجارتی چکر کا نظریہ بھی ملتا ہے۔ اگرچہ محض چند اشاروں میں۔ کوئی تفصیل نہیں موجود ہے۔

ا۔ (LAW OF DIMINISHING RETURNS)

۲۔ (SUN SPOT TRADE CYCLE THEORY)

صنعت

صنعتی ترقّی کے کچھ لازمی شرائط

از :- ـــــــــــــ محمد احمد بی۔ کام

برقابی طاقت ہندوستان میں بے شمار ایسے دریا ہیں جن سے برقابی طاقت حاصل کی جاسکتی ہے۔ حکومت اور دیگر اداروں کے پاس اسکیموں اور منصوبوں کی کمی نہیں۔ حال ہی میں گورنر بنگال نے صوبجات بنگال اور بہار کے دریاؤں کی مدد سے امریکہ کے دریائے ٹینیسی کی مثال کے پیشِ نظر بڑے پیمانے پر آب پاشی کا انتظام کرنے اور برقابی طاقت پیدا کرنے کا جو پلان بنایا ہے وہ خاص طور پر اہم ہے۔ اس کے علاوہ بھی برقابی طاقت پیدا کرنے اور اسے صنعتی کام کے لیے استعمال کرنے کی متعدد اسکیمیں ہیں۔ دسمبر میں یہ امید افزا خبر موصول ہوئی کہ حکومتِ بہار کے پاس جو بجلی کی طاقت پیدا کرنے اور نہروں سے آب پاشی کرنے کی اسکیم ہے اس پر جنوری سنہ ۱۹۴۶ء سے عمل درآمد شروع ہوجائے گا اور پوری اسکیم سنہ ۱۹۴۷ء ہی کے کسی ماہ میں پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ اسکیم یہ ہے کہ بجلی کی طاقت مہیا کرنے کے لیے تیس ہزار (۳۰،۰۰۰) کیلو واٹ کا ایک پلینٹ (کارگاہ) قائم کیا جائے۔ مزید طاقت دھن باد کے سندری پلینٹ (کارگاہ) سے حاصل کی جائے۔ پورا کوئلے کی کان والا علاقہ اور ہیکا والے علاقے اس اسکیم کے تحت آجائیں گے۔ بعد میں اسے پھیلا کر شمالی اضلاع، پٹنہ، گیا اور شاہ آباد تک پہنچا دیا جائے گا۔ حال ہی میں احمد آباد میں بھی ہندوستان کے ایک عظیم ترین بجلی گھر کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سنہ ۱۹۴۷ء کے آخر تک مکمل ہوجائے گا۔ یہ نیا بجلی گھر ساٹھ ہزار کیلو واٹ تک بجلی کی طاقت پیدا کرنے کے پروگرام کے تحت قائم کیا جارہا ہے۔

ماہرین

کسی ملک کی صنعت اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہاں ماہرینِ فن کی ایک بڑی تعداد موجود نہ ہو۔ ہندستان کی مروجہ تعلیم نے تو سوائے کلرکوں کے اب تک کچھ نہیں پیدا کیا ہو۔ صنعتی، تکنیکی اور انجینری ماہرین کی ضرورت کے پیشِ نظر حکومتِ ہند نے جن کاموں کی ابتدا کی ہو وہ قطعی ناکافی ہیں۔ غیر ملکوں میں طلبہ کو بھیجنے اور خود ملک کے اندر اس قسم کی تعلیم گاہوں اور اداروں کے اجرا کے لیے جو کچھ بھی کیا گیا ہو وہ مُلک کی بڑے پیمانے پر صنعتی تنظیم کے پیشِ نظر بہت کم ہو۔ پھر جو منصوبے تیار کیے گئے ہیں ان کی ابھی تک صرف کاغذی اہمیت ہو۔ یہ سُننے میں آیا ہو کہ حکومتِ ہند، ہندُستانی ماہرینِ فن اور صنعت گروں کا ایک وفد جاپان بھیجنا چاہتی ہو تاکہ کچھ خاص صنعتوں کے متعلق اطلاعات فراہم کرے۔ اس سلسلے میں جن خاص صنعتوں کے نام پیش کیے گئے وہ یہ ہیں:۔ امونیا اور شورہ یعنی کھاد پیدا کرنے کی صنعت، مصنوعی ریشم کی صنعت، سوتی پارچہ بافی، چینی دار اشیا کی صنعت، کوزہ گری، شیشے اور اسٹیل کی رولنگ۔

گزشتہ جنوری میں یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومتِ ہند بہت سے ہندُستانی انجینیروں، فنی ماہروں اور سائنس دانوں کو جرمنی کی بڑی بڑی مشینوں اور کارخانوں کی نئی فنی ترقیاں دیکھنے کے لیے جرمنی بھیجنا چاہتی ہو۔ چار غیر سرکاری ہندُستانی حضرات جرمنی کے کارخانوں کا معائنہ کرنے کے بعد حال ہی میں لوٹے ہیں۔

سرکاری تحفظ

ہندُستان کی صنعتوں کو جہاں تک سرکاری تحفظ عطا کرنے کا سوال ہو حکومتِ ہند نے اس سلسلے میں کچھ کاموں کی ابتدا کی ہو جو ناکافی ہونے کے باوجود اہمیت سے خالی نہیں۔ حکومتِ ہند کے محکمۂ محصولات (TARIFF BOARD) نے گزشتہ دسمبر میں ایک اعلان شائع کیا جس میں تیرہ ایسی صنعتوں کے نام دیے گئے جن کے متعلق محکمہ اپنی طرف سے تحقیقات کرے گا اور ان کو مخصوص تحفظات عطا کرے گا۔ محکمۂ محصولات نے اس سلسلے میں سوالات کی ایک فہرست تیار کی ہو، وہ مالکانِ صنعت جو تحفظ چاہتے ہیں انھیں ان سوالات کا جواب دینا ہوگا۔

ہندُستان کی صنعتی ترقی کے لیے جو طویل اسکیمیں بنائی گئی ہیں اُن کے پس منظر میں دیکھا جائے تو تحفظات کی بڑی زبردست اہمیت ہو لیکن یہاں پر ایک مسئلہ یہ ہو کہ قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے ہمیں بعض صنعتوں کو پہلے تحفظات عطا کرنا ہو اور بعض کو بعد میں۔ اس بات کا تعین کرنے کے لیے کہ کن صنعتوں کو پہلے تحفظات عطا کیے جائیں اور آیا وہ قومی مفاد کے پیشِ نظر اہم ہیں یا نہیں، محض صنعت گروں سے مشورہ کرنا کافی نہیں ہو۔ اس لیے کہ ہر صنعت گر سب سے پہلے اپنی ہی صنعت کے تحفظ کا مطالبہ کرے گا چاہے وہ اہم ہو یا نہیں۔ اس سلسلے میں ہندُستان کے مختلف ایوان ہائے تجارت سے مشورہ کرنا نہایت ضروری ہو۔ امید ہو کہ ہندُستان کے صنعت گر اور ایوان ہائے تجارت قومی مفاد کا پہلے خیال کریں گے اور اپنے اپنے کارخانوں اور صنعتوں کا بعد میں۔

معاشی صورتِ حال

(۱) ریلوے ہڑتال

(۲) غذائی محاذ

ریلوے ہڑتال

از: ——— ادارہ

۲۶ مئی کو دہلی میں ریل کارکنوں کے وفاقِ مجلسِ عمل اور ریلوے بورڈ کے درمیان گفت وشنید ہوئی جس میں مجلسِ عمل نے مندرجہ ذیل مطالبات پیش کیے۔ ریلوے مزدوروں کی کم سے کم ۵۲ روپے تنخواہ مقرر کی جائے۔ ہر مزدور کی تنخواہ میں دس روپے ماہوار کا اضافہ ہو۔ سو روپے کا بونس دیا جائے۔ ۲۷ مئی کو مسٹر جوشی نے ریلوے بورڈ کی طرف سے یہ بتایا کہ ریلوے بورڈ کم سے کم ۱۶ روپے تنخواہ مقرر کر سکتا ہے اور ۸ روپے تنخواہ تک کے عام گریڈ بلائے جا سکتے ہیں۔ مجلسِ عمل نے یہ تجویزیں نامنظور کر دیں۔ ۲۹ مئی کو "مجلسِ عمل" اور ریلوے بورڈ کی مشترکہ کانفرنس ہوئی جس میں ریلوں کے چیف کمشنر مسٹر ایمرسن نے چھٹنی کے معاملے کو ثالث کے سامنے پیش کرنے سے انکار کیا۔ لیکن مجلسِ عمل نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ چھٹنی کے سوال کو بھی ثالث کے سامنے پیش کیا جائے تبھی وہ ثالث کو ماننے کے لیے تیار ہیں۔

"کل ہند ریل کارکنوں کا وفاق" حکومت کے سامنے مندرجہ ذیل مطالبات پیش کرتا ہے (۱) چھٹنی بند کی جائے (۲) تنخواہوں پر نظرِ ثانی کی جائے (۳) بھتہ دیا جائے (۴) مہنگائی بھتہ تنخواہ میں شامل کر لیا جائے۔ چھٹنی، بونس اور مہنگائی بھتہ کے مطالبات ریلوے بورڈ نے ٹھکرا دیے اور تنخواہ پر نظرِ ثانی کے مطالبے کے جواب میں یہ کہا کہ "تنخواہوں کے کمیشن" کی سفارش

کے بعد یہ معاملہ طے ہوگا۔ ریلوے بورڈ نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر ریلوے مزدور دوسرے سرکاری ملازمین سے کم تنخواہیں پاتے ہیں تو یہ معاملہ ثالث کے سپرد کر دیا جائے گا۔ لیکن ویسے ریلوے بورڈ معاملے کو ثالث کے سامنے رکھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ریلوے بورڈ نے ۲۷ جون سے شروع ہونے والی ہڑتال کو غیر قانونی بھی قرار دے دیا ہے اور اس کو روکنے کے لیے قانونِ تحفظِ ہند (DEFENCE OF INDIA ACT) کا بھی استعمال کرنا چاہتا ہے۔ مزدوروں کا کہنا ہے کہ تمام مطالبات کو یعنی چھٹنی کے مطالبات کو بھی ثالث کے سپرد کرنے کے بعد ہی ہڑتال کو غیر قانونی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن حکومت اصل مطالبوں کو نظر انداز کرکے ہمارے چند معمولی مطالبات ثالث کے سامنے رکھنا چاہتی ہے اور اس پر بھی ہڑتال کو غیر قانونی قرار دیتی ہے۔ حکومت ہند نے اپنے ایک اعلان میں بتایا ہے کہ اگر ریل مزدوروں کی مانگیں تسلیم کرلی گئیں تو مزید ۲۲ کروڑ رپوں کا صرفہ ہوگا اور اس سے ریلوں کی مالی حالت پر خراب اثر پڑے گا۔ رقم کی کمی کو پورا کرنے کے لیے تیسرے درجے کا کرایہ بڑھانا پڑے گا۔ حکومت نے یہ بھی کہا کہ وہ ریل مزدوروں کے مطالبات کے بارے میں مرکزی اسمبلی کے ممبروں کے سامنے رکھنے کے بعد ہی فیصلہ کرسکتی ہے۔ حکومت یہ عذر بھی پیش کرتی ہے کہ ملک کی غذائی صورت حال کے پیشِ نظر یہ ہڑتال خطرناک نتائج پیدا کرے گی۔ لیکن ریل مزدوروں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جہاں تک قلت زدہ علاقوں میں غلہ پہنچانے کا سوال ہے وہ ہڑتال کے دوران میں بھی یہ کام انجام دیتے رہیں گے۔ لیکن آل انڈیا مسلم لیگ پلاننگ کمیٹی کے ممبر حاتم علوی صاحب نے اپنے ایک بیان میں بتایا ہے کہ ریل مزدوروں کے مطالبات کو تسلیم کرلینے کی صورت میں تیسرے درجے کے مسافروں کا کرایہ بڑھانے کی بالکل ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ اور اس کی مثال ویسی ہی ہے جیسے ملک کی معاشی تعمیر کا صرفہ پورا کرنے کے لیے نمک پر ٹیکس لگا دیا جائے۔ سر ایڈورڈ بنتھل ممبر ریلوے نے دیوان چمن لال سے کہا کہ وہ ثالث مقرر کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن وہ ریل مزدوروں کے سامنے یہ پیش کش نہیں رکھتے جس سے مزدوروں کو خدشہ ہے کہ انھیں دھوکا دیا جا رہا ہے۔

ریل مزدوروں کی تنخواہوں کے متعلق چند ضروری اعداد و شمار کا مطالعہ یہاں پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ۱۹۳۱ء کے شاہی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ۷ لاکھ ۵۹ ہزار ریلوے مزدوروں میں سے ۴ لاکھ ۸ ہزار کو ۲۰ روپے سے کم تنخواہ ملتی ہے۔ اس صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ۲۷ مئی ۱۹۴۶ء کو ریلوے چیف کمشنر مسٹر ایمرسن نے کانفرنس میں بتایا کہ اگر ریلوے مزدوروں کی کم سے کم تنخواہ ۱۶ روپے مقرر کی گئی تو اس سے ۳ لاکھ ۵۰ ہزار مزدوروں کو فائدہ پہنچے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ۳ لاکھ ۵۰ ہزار مزدوروں کو ۱۶ روپے سے کم تنخواہ ملتی ہے۔ ۱۹۴۴ء میں معمولی ریل مزدوروں کی آمدنی مہنگائی بھتہ ملا کر ۲۳ روپے ماہانہ تھی۔ یعنی بنیادی تنخواہ ۹ روپے سے ۱۴ روپے تک تھی۔ ورک شاپ کے مزدوروں کی بنیادی تنخواہ ۲۷ روپے تھی اور مہنگائی بھتہ ملا کر ۴۰ روپے ماہانہ۔ برخلاف اس کے بمبئی کے سوتی مل کے مزدور کی تنخواہ مہنگائی بھتہ ملا کر ۷۶ روپے ماہانہ ہے۔

مزدوروں کا مطالبہ ہے کہ ریلوے بورڈ کے پاس رُپے کی کمی نہیں ہے۔ خاص کر اگر بڑے افسروں کی تنخواہیں کم کر دی جائیں زرسُودگی کے فنڈ کا استعمال کیا جائے اور سُود کی رقم کام میں لائی جائے تو بہت آسانی سے مزدوروں کے مطالبات پُورے ہو سکتے ہیں۔ اس وقت ریلوں سے مرکزی حکومت کو ۵۲ کروڑ رُپے سالانہ دیے جاتے ہیں، ریلوں کا جنگی منافع ۵۸۸ کروڑ رُپیہ ہے۔ سرکاری ریل افسروں کی سالانہ تنخواہیں مجموعی طور پر تین کروڑ رُپیہ ہے۔ اور ہر سال انگریز سرمایے داروں کو ۲۸ کروڑ رُپیہ سُود دیا جاتا ہے۔

غذائی محاذ

حال ہی میں کئی ہندُستانی لیڈروں نے مُلک کی غذائی صورتِ حال پر تقریریں کی ہیں۔ جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنگال کے وزیر اعظم کو چھوڑ کر اور تمام لیڈروں نے صورتِ حال کا ایسا نقشہ پیش کیا ہے جو تشویش ناک ہے اور جس سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ مدراس کے وزیر اعظم مسٹر ٹی۔ پرکاشم نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ اگست کے بعد مدراس کے قلت زدہ علاقوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔ مدراس کی وزارت نے یہ اعلان کیا ہے کہ جو کاشت کار اپنا غلّہ راشن کے افسروں کے حوالے کر دے گا اُسے فی من ایک رُپیہ زیادہ دیا جائے گا۔ میسور میں کوئی ۸۰۰۰ ایکڑ نئی زمین زیرِ کاشت لے آئی گئی ہے اور اس میں فصل بو دی گئی ہے۔ مسٹر راج گوپال آچاریہ کی یہ تجویز یقیناً قابلِ توجہ ہے کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ اُن زمیں داروں سے زمین لے لے جو کسی وجہ کی بنا پر کاشت نہیں کر سکتے اور اُن زمینوں میں متحدہ طور پر شعبۂ زراعت اور پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے اہتمام سے کاشت کی جائے۔ تجویز بے حد معقول ہے لیکن حکومت شاید ہی اس کو عمل میں لانے کے لیے تیار ہو۔

یو۔ پی کی وزارت نے غلّے کے حصول اور تقسیم کا جو پلان بنایا ہے وہ مکمل اور قابلِ تعریف ہے۔ مخصوص طور پر اس لیے کہ اُس میں انتظام زیادہ تر غیر سرکاری لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا اور دوسرے اس کے ذریعے پبلک کے تعاون کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کاشت کاروں کو بہت زیادہ زیرِ بار کیے بغیر غلّہ حاصل کیا جا سکے گا۔ عوامی تعاون حاصل کرنے کے لیے ضلع دار، قصباتی اور دیہی کمیٹیاں بنائی جائیں گی تقسیم کا انتظام بھی انھی کمیٹیوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ساتھ ہی کپڑے۔ کراسن تیل اور شکر کی تقسیم کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہے۔ مزید غلّہ پیدا کرنے کی اسکیم کو عمل میں لانے کے

لیے اور رشوت خوری اور چور بازاری کو ختم کرنے کے لیے موثر انتظامات کیے گئے ہیں۔

پورے ملک کی نازک غذائی صورتِ حال کے پیشِ نظر سندھ نے جو رویّہ اختیار کیا ہے وہ کچھ زیادہ مستحسن نہیں قرار دیا جا سکتا۔ سندھ نے حال ہی میں دھمکی دی ہے کہ اگر بمبئی سے کافی کپڑا سندھ نہیں بھیجا گیا تو سندھ اپنا غلّہ صوبے سے باہر نہیں جانے دے گا۔

فاقے کی موت کے اِکّے دُکّے واقعات اور دیگر خبروں سے پتا چلتا ہے کہ حالات نازک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ مثلاً گوداموں اور غلّے سے لدی گاڑیوں پر ہجوم کا حملہ۔ دُکانوں کو لوٹنے کی کوشش وغیرہ۔ سب سے خراب حالت بمبئی، مدراس کے صوبوں اور میسور، ٹراونکور، کوچین اور دکنی ریاستوں کی ہے۔

حکومتِ ہند کے غذائی سکریٹری نے ہندستان میں غذا کی درآمد پر جو اعداد و شمار دیے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:-
جنوری سے جون تک ہندستان میں ۷۹۹۶۰۰ ٹن گیہوں یا گیہوں کا بدل آیا اور ۹۱۶۰۰ ٹن چاول۔ آسٹریلیا نے ۴۴۴۰۰۰ ٹن گیہوں دیا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ۱۳۲۵۰۰ ٹن گیہوں۔ ۸۰۰۰۰۰ ٹن مکئی کے ہندستان میں آنے کا پروگرام ہے جس میں سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور آرجنٹائن الگ الگ ۴۰۰۰۰ ٹن بھیجیں گے۔ ۱۵۰۰۰ ٹن چاول سیام سے اور ۷۶۱۰۰ ٹن چاول برما سے آنا باقی ہے۔ غیر ملکوں سے جون کے ماہ میں جو غلّہ روانہ کیا جا چکا ہے وہ یہاں جولائی کے آخر میں یا اگست کے پہلے دو ہفتوں میں پہنچے گا۔

گزشتہ مئی میں مسٹر ہربرٹ ہارسین کا امریکہ جانا اور اقوامِ متحدہ کے غذائی وزیروں کی کانفرنس کا منعقد ہونا دو اہم واقعات تھے۔ مسٹر ہارسین نے اعلان کیا کہ اب غذائی تقسیم کے سلسلے میں ہندستان کو ایک علاحدہ وحدت کی حیثیت حاصل ہوگی جس سے ہندستان کی حیثیت پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جائے گی اور وہ پچھلے وعدوں کے پورا ہونے کا پُرزور مطالبہ کر سکے گا۔ مسٹر ہارسین نے دار العوام میں یہ بھی بتایا کہ ہندستان کی قلیل ترین غذائی ضرورت کا ۶۰ فی صدی حصّہ پورا ہو جائے گا۔

جاوا سے چاول آنے کی اُمید بھی اب پیدا ہو چلی ہے۔ لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن نے دہلی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات کی اور یقین دلایا کہ جاوا کا فالتو چاول کافی مقدار میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پنڈت نہرو کی تجویز پر بمبئی کے غذائی وزیر مسٹر دِنکر راؤ ڈیسائی جاوا کے لیے روانہ بھی ہو گئے ہیں۔ غلّے کے حصول کے لیے جہاز پر کپڑے روانہ کیے گئے ہیں تاکہ غلّے اور کپڑے کا آسانی سے تبادلہ ہو سکے۔ انڈونیشیا کے وزیرِ اعظم ڈاکٹر شہریار نے ہندستانی کپڑے اور اپنے ملک کے فالتو غلّے کا تبادلہ منظور کیا ہے اور اگرچہ ولندیزی حکومت نے انڈونیشیا میں فالتو غلّے کے وجود سے

انکار کیا ہے لیکن ڈاکٹر شہریار اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں اور بہر حال میں کپڑے کے عوض میں ہندستان کو غلہ بھیجنے کے لیے تیار ہیں۔

حال ہی میں انگریز امریکی کمیشن نے سیام سے ۱۲۰۰۰۰ ٹن چاول کے حصول کا جو معاملہ طے کیا ہے اُس سے بھی امید پیدا ہو چلی ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں واضح رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ غلہ پہلے اتحادی غذائی بورڈ کے حوالے کیا جائے گا۔ چناں چہ جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اتحادی غذائی بورڈ بے چارے ہندستان کو کتنا چاول "عنایت" کرے گا اس وقت تک بہت زیادہ پُر امید ہونے کی گنجائش نہیں ہے۔

بالکل تازہ خبر یہ موصول ہوئی ہے کہ امریکہ کے کچھ اہل اور مشہور و معروف حضرات ہندستان کے غذائی حالات کا معائنہ کرنے کے لیے یہاں آنا چاہتے ہیں۔ کاش صرف نام نہاد ہم دردوں کی تشریف آوری ہی سے ہندستان کا غذائی مسئلہ حل ہو جاتا تو پھر ہندستان کے کروڑوں انسانوں کو موت کے چنگل سے چھڑانے کے لیے غلّے کی بالکل ضرورت نہ پڑتی۔

(نوشتہ ۱۴ر جون سنہ ۱۹۴۶ء)

اصطلاحات

انجمنِ ترقّیِ اُردو کی وضع کردہ
چند معاشیاتی اصطلاحات

از : ———— ادارہ

Profiteer	منافع باز
Progressive tax	بڑھتا محصول
Property tax	محصولِ املاک
Prospected trade	محفوظ تجارت
Protective tariff	حفاظتی محصول
Public bank	سرکاری بنک
Public debt	سرکاری قرضہ
Public purse	سرکاری خزانہ
Quasi rent	مثل لگان

Quota	نصاب، حصہ رسدی
Quota system	نصابی طریقہ، حصہ رسدی طریقہ
Real wages	حقیقی اُجرت
Reform act	قانونِ اصلاح
Relief work	امدادی کام
Rent act	قانونِ لگان
Reserved subjectes	امورِ محفوظہ
Returns	تخمینے
Reverse councils	اُلٹی کونسل ہنڈی
Rotation of crops	فصلوں کا دور
Ruralization	دیہاتی بنانا
Scarcity	قلت
Securities	تمسکات
Serfdom	زرغلامی
Shipping	جہازرانی
Short term loan	کم مدتی قرضہ
Sinking fund	قرض ادائی ذخیرہ
Sliding of scale	بدلتا پیمانہ (اُجرت) تدریجی شرحِ (اُجرت)
Smuggling trade	چور تجارت
Social philosophy	عمرانی فلسفہ
Solvency	ساکھ داری
Specialist	ماہر خصوصی
Speculation	سٹہ

Speculator	سٹہ کار
Stadilized exchange	ٹھہرا مبادلہ
Stability of value	قدر کا ٹھیراؤ
Standardizing	معیارنا، معیاری بنانا
Standard money	مستند زر
Staple commodities	خاص پیداوار
Sterling bills	اسٹرلنگ ہنڈیاں
Sterling securities	اسٹرلنگ تمسکات
Stock exchange	صرافہ
Subscrided capital	اقراری اصل
Succession duty	جانشینی محصول
Sumptuary laws	قوانین خرچ بندی
Supply	رسد
Surplus budget	فاضل موازنہ
Sweated industries	نیم بیگار صنعتیں
Sweating bay	کھرچنی
Tariff	(۱) کروڑ گیری (۲) نرخ نامہ
Taxation	محصول بندی
Technology	علم صنعت
Temporary debt	عارضی قرضہ
Tenant in chief	مہا اسامی
Terminable annuities	میعادی سالیانے

معاشیات

جلد ۱ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء نمبر ۷

فہرست مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱-	بنگال کی غذائی صورتِ حال	اڈیٹر	۲
	لنکا کے ہندستانی		۴
	ڈاکیوں کی ہڑتال		۵
۲-	زرعی اصلاح و ترقی کے مسئلے	رضی الرحمان ایم۔اے	۶
۳-	دیہات کا مشترک انتظام	ترلوک سنگھ	۱۲
۴-	ہندستان کی ریلیں	ط۔ا۔خ	۲۰
۵-	مروج سکوں کے باہمی تعلقات	حمیدہ نقوی	۲۷
۶-	ربڑ کی پیداوار	ادارہ	۳۳
۷-	معاشی صورتِ حال	ادارہ	۳۸
۸-	'معاشیات' معاصرین کی نظر میں	ادارہ	۴۴
۹-	تبصرہ	"	۴۶
۱۰-	انجمنِ ترقی اردو کی معاشی اصطلاحات	"	۴۸

اداریہ

بنگال کی غذائی صورتِ حال

از: —— اڈیٹر

اسار مئی تک بنگال کی سرکاری خبروں اور اعلانوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ صوبے میں غذائی قلت اور قحط کا خطرہ بالکل نہیں ہی۔ لیکن جون کے مہینے میں غیر سرکاری اور دیگر معتبر ذرائع سے جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ بنگال کی غذائی صورتِ حال کا کچھ اچھا نقشہ نہیں پیش کرتیں۔ اور اب تو خود وزیرِ اعظم سہروردی کے حال کے بیان سے ظاہر ہوتا ہی کہ حالت نازک ہی اور حکومت کی پوری کوشش اور عوامی تعاون کے بغیر آنے والے قحط کے خطرے کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری جون کو چاندپور ضلع ٹی پیرا میں تقریر کرتے ہوئے بنگال کے وزیرِ اعظم نے اس بات پر سخت حیرت کا اظہار کیا کہ صرف سات روز کے اندر علاقے سے چاول غائب ہو گیا اور اس کے تین اسباب بتائے۔ آیندہ کی نفع خوری کے لیے بنیوں کی ذخیرہ اندوزی، لوگوں کا گھبراہٹ میں ضرورت سے فالتو چاول خریدنا۔ بازار میں بیوپاریوں کا چاول لانا بند کر دینا۔

حالات کے نازک ہونے کا اندازہ اِن باتوں سے بھی ہوتا ہی کہ بنگال کے متعدد اضلاع میں بھوکوں کے مظاہرے کثرت سے ہو رہے ہیں۔ ہفتے وار راشن میں مزید کمی کا اعلان کر دیا گیا ہی۔ مقامی غذائی کمیٹیوں سے غیر سرکاری لوگ اور جماعتیں تعاون کرنے سے انکار کر رہی ہیں۔ سرکاری گوداموں میں غلّے کے سڑ جانے اور خراب ہو جانے کی بھی اطلاعیں موصول ہوئی ہیں۔ بھوک سے اِکّے دُکّے لوگوں کے مرنے کی خبریں بھی آ رہی ہیں۔ سراج گنج میں شہری سپلائی کے دفتروں سے باہر غذا کے لیے عوامی مظاہرے ہوئے ہیں۔ دیہاتوں میں لوگوں کی حالت اور بھی خراب ہوتی جا رہی ہی۔

قلت بڑھتی جارہی ہے اور چور بازاری بڑے پیمانے پر ہورہی ہے۔ ایک تشویش ناک خبر یہ موصول ہوئی ہے کہ ڈھاکہ کے سرکاری گوداموں سے ایک لاکھ ٹن چاول غائب ہوگیا ہے اور ہزاروں من ایسا چاول جو انسانی غذا کے طور پر استعمال کے لائق نہیں ہے منشی گنج اور دیگر مقامات پر پبلک کے ہاتھوں فروخت کیا جارہا ہے۔ حکومت نے جو غلّہ جمع کیا ہے وہ پوری پیداوار کا بمشکل ۱۰ فی صد حصّہ ہے۔ حکومتِ بنگال کے غذائی ڈائرکٹر جنرل مسٹر چٹرجی نے جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں اُن کے مطابق حکومت کے پاس اس وقت صرف ۳ لاکھ ۶۵ ہزار ٹن چاول ہے۔ بنگال کے نو شہروں میں راشن ہے اس لیے حکومت کو ہر مہینے ۸۰ ہزار ٹن چاول کی ضرورت ہوگی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ حکومت کے پاس جو ذخیرہ ہے وہ بالکل ناکافی ہے۔ محض آیندہ پانچ ماہ کے لیے بھی حکومت کو ۳ لاکھ ٹن چاول کی ضرورت ہوگی۔ حکومت ۲½ لاکھ ٹن چاول اگر جمع نہیں کرسکی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ تر غلّہ بیوپاریوں اور زمیں داروں کے پاس پہنچ گیا ہے اور وہ نفع کی خاطر ذخیرہ اندوزی سے کام لے رہے ہیں۔

متعدد اضلاع میں قیمتیں چڑھتی ہی چلی جارہی ہیں۔ نوکھالی، فرید پور، ڈھاکہ، ٹی پے را، پبنا اور ۲۴ پرگنہ میں چاول کی قیمتیں تیس روپے من اور کہیں کہیں چالیس روپے من ہوگئی ہیں۔ دیہی علاقوں میں کہیں بھی چاول کی قیمت ۲۰ روپے من سے کم نہیں ہے۔ منشی گنج اور مداری پور تحصیلوں کے غریب کسان اور کھیت مزدور غذا کی تلاش میں گانو چھوڑ رہے ہیں۔ ان علاقوں کے نچلے متوسط طبقے کے لوگوں کو بھی چاول آسانی سے دست یاب نہیں ہورہا ہے۔ نوکھالی کی بہت سی منڈیوں میں چاول کا نام و نشان تک نہیں۔ چوبیس پرگنہ کی اطّلاع ہے کہ ۲۰ فی صدی لوگ صرف ایک وقت کھانا کھاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں بھی جون کے مہینے تک قیمتوں میں اتنا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ پوربی بنگال کی صورتِ حال زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے کہ وہاں غلّہ کم پیدا ہوا ہے۔ پچھمی بنگال میں بعض علاقوں میں غلّہ زیادہ پیدا ہوا ہے اور بعض [illegible] اگر وہاں تقسیم ہموار کردی جائے تو بہت حد تک صورتِ حال کی درستگی ہوسکتی ہے۔

اِن حالات کا مقابلہ کرنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ حکومت، عوام اور دیگر سیاسی جماعتوں کے تعاون سے نفع خوروں اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف منظّم کارروائی شروع کردے اور اُن سے جبریہ غلّے کے ذخیرے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے ساتھ ہی حکّام کو رشوت بازی سے روکنے کے لیے موثر کارروائی کرے۔ جن علاقوں میں ضرورت ہے وہاں غلّے کی فوری طور پر دوبارہ تقسیم عمل میں لائے۔ امدادی انجمنوں کو بھی اب کمربستہ ہوجانا چاہیے اور حکومت پر فرض ہے کہ ان انجمنوں کی مدد کرے۔

لنکا کے ہندستانی

اس وقت لنکا کے ربڑ اور چائے کے باغات میں کام کرنے والے ایک لاکھ ۲۰ ہزار ہندستانیوں نے ہڑتال کر رکھی ہی۔ یہ ہڑتال ۴۰۰ ہندستانی کارکنوں کے خلاف حکومتِ لنکا کی کارروائی کی مخالفت میں احتجاج کے طور پر شروع کی گئی ہی۔ اس جدوجہد کی اصل نوعیت دراصل طبقے داری ہی۔ لیکن لنکا کے ربڑ اور چائے کے باغات کے مالک اِسے قومی اور نسلی رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور اسے ہندستانیوں اور باشندگانِ لنکا کا سوال بنا دینا چاہتے ہیں۔ اِس سے انھیں یہ فائدہ ہوگا کہ وہاں کے ہندستانیوں کو خود لنکا کے لوگوں کی ہمدردی نہ حاصل ہو سکے گی اور اُن کی جدوجہد اُن کے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کمزور پڑ جائے گی۔ تعجب ہی کہ بہت سے ہندستانی اخبارات بھی لنکا کے قوم پرستوں کی اس چال کو نہیں سمجھ سکتے اور وہ بھی اس جدوجہد کو قومی رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چناں چہ "انڈین فنانس" (کلکتہ) اپنی ۲۹ جون کی اشاعت میں رقم طراز ہی کہ "یہ معاملہ مالک اور کارکن کا جھگڑا نہیں ہی بلکہ اس سے زیادہ گہرا ہی ——— یہ ہڑتال ایسے وقت ہوئی ہی جب کہ لنکا میں نئی دستوری اصلاحیں نافذ ہونے والی ہیں جن کے اندر وہاں کے ہندستانی فرقے کے حقوق کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہی ——— چناں چہ ہڑتال کی سیاسی نوعیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" پھر آگے چل کر معاصر موصوف یہ رائے دیتا ہی کہ اگر لنکا کی حکومت باتوں سے نہ مانے تو لاتوں سے کام لیا جائے اور ہندستانیوں کے حقوق کو منوا کر چھوڑا جائے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ لنکا کے ہندستانیوں کا احتجاج بالکل انصاف پر مبنی ہی، اُن کے حقوق واقعی غصب ہو رہے ہیں اور لنکا کے مالکوں اور وہاں کی حکومت کو اپنا رویہ بدلنا چاہیے۔ یہ بھی درست ہی کہ لنکا کے ہندستانی نہ صرف خود وہاں کے مالکوں کے ظلم کا شکار ہو رہے ہیں بلکہ برطانیہ بھی اُن کا استحصال کر رہی ہی لیکن ہندستانیوں کے حقوق منوانے کا جو طریقہ معاصر موصوف نے بتایا ہی اُس پر عمل کر کے کبھی بھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ وجہ صاف ظاہر ہی اگر لنکا کے ہندستانی مالکوں کے خلاف اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو صرف اِس شرط پر کہ خود لنکا کے انصاف پسند عوامی عناصر اُن کا ساتھ دیں۔ اس کے لیے ضروری ہی کہ ہم اس سوال کو قومی اور نسلی رنگ دینے کی نہ کوشش کریں۔ ورنہ لنکا کی تمام عوامی طاقتیں وہاں کے ہندستانیوں کے خلاف مشترکہ محاذ بنا لیں گی حکومت اور مالکوں کی بن آئے گی اور وہ اس طرح پھوٹ ڈال کر اپنا اُلّو سیدھا کر لیں گے۔ اور ہندستانیوں کے مطالبات کبھی نہ تسلیم کیے جائیں گے۔

ڈاکیوں کی ہڑتال

ڈاکیوں کی ہڑتال کو غیر قانونی ثابت کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے کہ مطالبوں کے بارے میں فیصلہ سُننے سے پہلے ہی ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا ہے لیکن یہ سراسر غلط ہے اور اس کا مقصد پبلک میں غلط فہمی پیدا کرنا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ ہڑتال اُن مطالبوں کے سلسلے میں شروع کی گئی ہے جو فیصلے کے لیے نہیں لیے گئے۔ اس بات کا اعلان ڈاکیوں، نچلے درجوں کے کارکنوں اور آر۔ ام۔ اس کی کُل ہند یونین کے جنرل سکریٹری مسٹر و۔ ج۔ ڈالوی کی طرف سے ہو چکا ہے۔

اس سے پہلے دو بار اور ڈاکیوں نے ہڑتال کی نوٹس دی تھی لیکن وہ واپس لے لی گئیں۔ ڈاکیوں کی تنظیم اور طاقت کے بارے میں محکمۂ ڈاک اور تار کے حکام کو غلط فہمی پیدا ہوئی۔ چناں چہ انھوں نے مفلس اور قلاش ڈاکیوں کے جائز مطالبات پر کان نہیں دھرے۔ گزشتہ مارچ میں جو 'عارضی امداد' کا اعلان کیا گیا وہ زیادہ تر محکمۂ ڈاک اور تار کے بابوؤں کے لیے تھا۔ ڈاکیوں نے صاف دیکھ لیا کہ ہڑتال کے بغیر حکام سے اپنے مطالبوں کی اہمیت نہیں تسلیم کرائی جا سکتی۔

حکام کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ڈاکیوں کی تنخواہ اور بھتے جنگ سے پہلے کے مقابلے میں تقریباً تین گنا زیادہ ہیں۔ مگر اس سلسلے میں اِس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ڈاکیوں کی موجودہ تنخواہ اور بھتے ۳ رُپے مکان کا بھتہ اور ۵ رُپے اچھے چال چلن کی تنخواہ ملا کر ہوتے ہیں۔ موخر الذکر بالکل افسروں کی خواہش اور رحم و کرم پر ہے۔ یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ ڈاکیوں کی موجودہ تنخواہ موجودہ گرانی کے بالکل مطابق ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ڈاکیوں کی ہول ناک مالی بدحالی پبلک کی آنکھوں میں صاف عیاں ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ ہڑتال میں اتنی دقتیں اور مشکلات اُٹھانے کے باوجود پبلک کی ہم دردی ڈاکیوں کے ساتھ ہے اور وہ اس افسوس ناک صورتِ حال کی اصل ذمّے داری حکام کی ہٹ دھرمی اور غلط پالیسی پر رکھتے ہیں۔ مُلک کی تمام سیاسی جماعتوں نے بھی ڈاکیوں سے اپنی ہم دردی کا اظہار کیا ہے۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ دھمکیوں کے کارگر نہیں ہونے کے بعد اب حکام کے طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا ہو رہی ہے اور وہ بالآخر نیچے آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مسائل حاضرہ (ہندوستان)

زرعی اصلاح و ترقّی کے مسئلے

از : ———— رضی الرحمٰن - ایم اے

عام لوگوں کی خوش حالی ایک سرسبز و شاداب درخت کی طرح ہے، زراعت اور کھیتی باڑی اس درخت کی جڑ ہے، صنعت اور تجارت اس کی شاخیں اور پتے ہیں، اگر جڑ کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس کے پتے جھڑ جاتے ہیں، شاخیں سوکھ جاتی ہیں، اور درخت گر جاتا ہے۔

یہ بات ایک چینی فلسفی نے صدیوں پہلے کہی تھی، مگر آج بھی اس کی صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اگر مجھے یہ بات نہ معلوم ہوتی کہ ہمارے ملک میں زمین اور اس کے مسئلوں سے لاپروائی برتی جاتی ہے تو میں یہ قول نقل کرنے کے بعد یقین کر لیتا کہ میں نے زراعتی اصلاح اور ترقی کے مسئلے بہت کھول کر بیان کر دیے ہیں۔ مگر مجھے خوف ہے کہ ایسا کرنے سے میں اپنے فرائض سے سبک دوش نہ ہو سکوں گا۔ اس لیے جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس کو بہت سے الفاظ میں پھیلا کر بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلے میں یہ بتا دوں کہ زرعی اصلاح اور ترقی کے مسئلے پیش کرتے وقت میرے سامنے ہندستان اور ہندستانی ہیں۔ اور میری تمام مثالیں اور تجویزیں اسی ملک سے ماخوذ ہیں۔ مگر عنوان میں اس بات کی صفائی اس لیے مناسب نہیں سمجھی گئی کہ عالم گیر غذائی بحران کے مدنظر ان مسائل کی ہر ملک میں اہمیت ہے، اگرچہ ماہیت ہر جگہ الگ الگ ہے۔ ہر ملک کو از سر نو سوچنا ہے کہ اس کو اپنے کھیتی باڑی کے ڈھنگ میں کیا کیا تبدیلیاں کرنی ہیں، اور معاشی نظام میں اس شعبۂ پیداوار کو

کون سی جگہ دیتی ہے!

ہندستان ایک زراعتی ملک ہے اور اس کی نوّے فی صدی آبادی کا انحصار اسی پیشے پر ہے۔ اس لیے یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ زراعت کو پوری معاشی زندگی میں کیا اہمیت دی جائے ہمارا مسئلہ تو یہ ہے کہ موجودہ پیدائشی طریقوں میں اصلاح اور ترقّی کی کیا مناسب صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ہمارا مسئلہ دوسروں سے کچھ اس لیے بھی مختلف ہے کہ یہاں ترقّی سے پہلے اصلاح کی بھی ضرورت ہے۔ جس بنیاد پر موجودہ زراعتی عمارت قائم ہے وہ اتنی کمزور اور فرسودہ ہوچکی ہے کہ اس پر مزید عمارت نہیں اُٹھائی جاسکتی۔ پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ زراعت کا موجودہ نقشہ کہاں تک کسانوں اور دوسرے ہندستانیوں کی تمام ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ ہماری سوسائٹی کی ہیئت اور ترکیب پر اس نظام کا اچھا یا بُرا کیا اثر پڑ رہا ہے؟ اس بات کی تفصیل میں جانے کی مجھے ضرورت نہیں آپ جانتے ہیں کہ افراد کی زندگی کے ہر پہلو کو معاشی سانچہ کوئی نہ کوئی شکل دیتا ہے۔ اس سانچے کو بدل دیجیے تو اس کی بنائی ہوئی شکلیں بھی پہلے سے مختلف صورت اختیار کرلیں گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ رہن سہن کے طریقے، تہذیب وتمدّن کے نقوش، سوچنے اور سمجھنے کے ڈھنگ، چیزوں سے متاثر ہونے اور ان کو متاثر کرنے کی قوتیں، میل ملاپ کے اصول، کردار کی اچھی یا بُری صلاحیتیں اور ہمارے تمام سماجی ادارے جن میں سیاست، مذہب، اخلاق اور علوم فنون بھی شامل ہیں، معاشی ماحول (ECONOMIC ENVIRONMENT) کے عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں ایسی صورت میں کسی جاری معاشی نظام سے عدم توجّہی اور لاپروائی کے یہ معنی ہیں کہ آپ اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے اثرات کو خوش آمدید کہنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔

اس بات کو تسلیم کرلینے کے بعد بھی کہ ہندستان ایک زراعتی ملک ہے اور اس وجہ سے ہماری تمام زندگی ایک خاص ڈھنگ کی ہونی چاہیے ایک سوال باقی رہتا ہے اور وہ یہ "کیا زراعتی نظام کی موجودہ شکل آخری ہے، اور اس میں اصلاح و ترقّی کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟" اس سوال کا جواب ہم چاہیں تو دو طرح سے معلوم کرسکتے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ افراد، اداروں، اور سوسائٹی کا تجزیہ کرکے یہ دیکھیں کہ کس حد تک وہ قابلِ اطمینان ہیں اور اگر نہیں تو کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے وہ صورت نہیں ہے، یہاں ہمیں اپنے معاشی ماحول کا جائزہ لینا پڑے گا اور تب جاکر یہ بات طے کریں گے۔ ایک اور طریقہ یہ ہے کہ ہم براہِ راست اپنے معاشی گوشوں کا مطالعہ کریں اور اس کی بنا پر کوئی رائے قائم کریں۔ میں اس سوال کے جواب تک آخری راستے سے پہنچنا چاہتا ہوں۔

اعداد وشمار کے ذریعے، دوسرے تمام حالات اور واقعات کو پسِ پشت ڈال کر، اگر ہم کوئی نتیجہ نکالنا چاہیں تو شاید ہمیں اپنے بلند مقامی پر خود ہی تعجب ہو، کیوں کہ ہماری زراعتی پیداوار کسی اعتبار سے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کم نہیں ہے چاول اور شکر کی پیداوار میں ہم سب سے آگے ہیں، گیہوں اور تمباکو کے سلسلے میں ہمارا نمبر تیسرا ہے۔ امریکہ کے بعد کپاس کی پیداوار میں ہندستان کا ہی نام لیا جاتا ہے، تیلوں کے بیج کی پیداوار کے اعتبار سے بھی ہماری صفِ اوّل میں جگہ ہے۔ سَن تو ہماری اجارہ داری ہے، چائے اور کافی سیکڑوں من سالانہ باہر بھیجی جاتی ہے اور اس سے ہی اس کی پیداوار کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

یہ تو تھا پیداوار کا حساب، عاملینِ پیداوار کا اندازہ لگانا ہو تو یہ سمجھیے کہ ہمارے مُلک میں ۳۶ کروڑ ایکڑ زمین زیرِ کاشت ہے تقریباً تیس کروڑ افراد کھیتی باڑی کا کام کاج کرتے ہیں۔ مویشیوں کی تعداد دنیا کی کُل تعداد کا تہائی یعنی ۲۰ کروڑ ہے۔

یہ گنتی میں نہ آنے والے اعداد و شمار کچھ دیر کے لیے ہمیں مبہوت ضرور کر دیتے ہیں، اور ہم اس بات پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں، مگر تصویر کا دُوسرا رُخ اس کے بالکل برعکس ہے۔

زیرِ کاشت زمین رقبے میں ۲۰ کروڑ صحیح، مگر اس سے جو پیداوار حاصل ہوتی ہے وہ فی ایکڑ کے حساب سے دُوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر چاول ہی کو لیجیے۔

ہندستان میں ایک ایکڑ زمین میں ۱۰ من چاول پیدا ہوتا ہے۔

چین	"	"	۱۷ من	سے اوپر	"
امریکہ	"	"	۱۸	" " "	"
مصر	"	"	۲۵	" -	"
جاپان	"	"	۲۵	" اوپر	"
اٹلی	"	"	۳۷	" " "	"

چاول ہی پر کیا موقوف یہی حال دُوسری چیزوں کا بھی ہے۔ گیہوں اور گنّے کی پیداوار میں بھی ہمیں اسی قسم کے اعداد و شمار ملتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ پیداوار کی کمی کے ساتھ ساتھ ایک اور قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ ہماری پیداوار کی قسم بھی کچھ بڑھیا نہیں ہوتی ہے۔

پیداوار کی یہ حالت ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہندستان میں کھیتی باڑی ترقی کر رہی ہے۔ ماہرین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ گزشتہ صدی کے مقابلے میں اس کو تنزّل کی طرف قدم اٹھانے پڑے ہیں۔

اس کم پیداوار کا اثر بہت دُور رس ہے۔ ایک طرف تو یہ پیشہ غیر منافع بخش بن گیا ہے دُوسری طرف ہماری کُل پیداوار بھی اتنی کم ہے کہ تقریباً ایک تہائی آبادی کو پیٹ بھر کر خوراک نہیں ملتی اور جن کو ملتی بھی ہے وہ بھی غیر متوازن اور خراب قسم کی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ہندستان بیماریوں کا گہوارہ ہے یہاں شرحِ اموات کی کثرت ہے، تن درستی اور صحت کا معیار پست ہے۔ اور کام کرنے کی صلاحیت اسی اعتبار سے کم۔ اُمنگ اور ارادے کے فقدان کی وجہ سے معیارِ زندگی بلند کرنے کی کوشش ناپید ہے، جہالت گندگی، بیماری، مفلسی اور کاہلی یہ ہیں پانچ خصوصیات جو ہماری پوری زندگی کا خمیر بن چکی ہیں۔

کسان مقروض اور انجان، سرمایہ شکستہ و پامال، طریقۂ پیداوار قدیم اور خراب، اگر پھر بھی معاشی پستی پیدا نہ ہوتی تو معجزہ ہوتا۔ زمین اچھی طرح کمائی نہ جائے، مویشی تن درست اور طاقت ور نہ ہوں، کھیت میں کھاد کبھی نہ دیا جائے۔ گوبر کے اُپلے

بنا کر اپنے فن کے کام میں لے آئیں، فصل کا انحصار باد و باراں پر ہو اور آب پاشی کا کوئی معقول انتظام نہ ہو، حکومت زراعت کی طرف سے لاپروائی برتے قیمتیں اُترتی اور چڑھتی رہیں۔ ایسی صورت میں جو کچھ بھی پیدا ہو جاتے وہ غنیمت ہے۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آخر یہ سب کیوں اور کس لیے؟ وجہ معلوم کرنا مشکل نہیں، گزشتہ سو سال میں بہت سے کمیشن بیٹھے، انھوں نے حالات کا جائزہ لیا۔ اور اپنی سفارشات حکومت اور ملک کے سامنے رکھیں۔ ان کو ہی اگر دہرا دیا جائے تو بہت کافی ہے۔ اگر الگ الگ ہر کمیشن کی رپورٹ کی ورق گردانی نہ بھی کیجیے تو صرف ۱۹۴۴ء کے قحط کمیشن کی رپورٹ پڑھ ڈالیے، تمام پہلو روشن ہو کر آپ کے سامنے آجائیں گے۔ صرف ایک لفظ میں اس المیہ کا سبب بتانے کے لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی بڑی ذمہ داری ہمارے طریقۂ پیداوار اور نظام زمین پر ہے۔ موسم اور بارش کی غیر یقینی، انسانی قوت اور تنظیم وغیرہ کو بھی اس میں دخل ہے مگر ان کی ثانوی حیثیت ہے۔

ہر کسان کے پاس اتنی کم اور تھوڑی زمین ہے کہ اس کا اور اس کے خاندان اور متعلقین کا گزر اوقات مشکل سے ہوتا ہے۔ وہ اس زمین پر جو سرمایہ لگاتا اور محنت صرف کرتا ہے اس کے مقابلے میں پیداوار اس کو نسبتاً بہت کم ملتی ہے، اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ بڑے پیمانے کے کاروبار میں لاگت کی فی عدد اوسط کم پڑتی ہے، اور چھوٹے پیمانے کے کاروبار میں زیادہ۔ قطعاتِ زمین نہ صرف چھوٹے ہوتے ہیں بلکہ بکھرے ہوئے بھی ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے لاگت اور محنت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔ اور پیداوار نسبتاً اسی حد تک کم ہوجاتی ہے۔ زمین کے زیرِ کاشت قطعات کو ان کے چھوٹے چھوٹے اور بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی وجہ سے ترقی یافتہ طریقوں سے جوتا اور بویا بھی نہیں جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو خود کاشت کار کی آمدنی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کھاد ڈالے، تن درست بیل رکھے، کنویں سینچ کر پانی دے اور کھیتوں کے اِرد گرد باڑ لگائے۔ دوسری طرف زمین کی اپنی ماہیت اور ترکیب ان طریقوں کے راستے میں رُکاوٹ بنتی ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر مان نے پونا کے ایک گانو کے متعلق اعداد و شمار جمع کرکے بتایا ہے کہ اس میں ۴۶۳ کھیت ایک ایکڑ اور ۱۱۲ کھیت چوتھائی ایکڑ سے بھی کم رقبے پر مشتمل ہیں۔ کیٹنگ کی تحقیق کے مطابق کوں کوں کی بستی میں چاول کے اوسط درجے کے کھیت کا رقبہ ۲ سے ۳ ایکڑ تک ہے اور ایک ایکڑ ۸ یا ۹ کے قریب مختلف ٹکڑوں میں منقسم ہے۔ مسٹر کالورٹ نے بھی پنجاب کے بارے میں کچھ اسی قسم کی معلومات فراہم کی ہیں۔

کھیت کے رقبے کی اس مضحکہ خیز صورت کے ماتحت بعض اوقات یہ بھی ناممکن ہوجاتا ہے کہ ہل کو آسانی کے ساتھ گھمایا جاسکے۔ ایسی حالت میں اور دوسرے آلات استعمال کرنے کا خیال تو بے محل ہی ہے۔ جب یہ عالم ہو تو بے چارہ کاشت کار کیا کر سکتا ہے۔

چھوٹے اور بکھرے ہوئے قطعات کے اسباب یہ ہیں۔ آبادی کی زیادتی، دُوسرے پیشوں کا فقدان، خاندانی زندگی کا خاتمہ، وراثت کے قانون کی موجودگی اور زمین کو ورثا میں زرخیزیت کے مطابق برابر برابر تقسیم کرنے کی خواہش۔

زمین کے اس مسئلے کو مختلف طریقوں سے حل کیا گیا ہے۔ امدادِ باہمی کی انجمنوں، حکومت کے قوانین اور پروپیگنڈے کو اس میں کافی دخل ہے۔ بمبئی اور پنجاب میں اس سلسلے میں کافی کامیابیاں بھی ہوئی ہیں۔

مگر ایک طرف تو یہ طریقے دیرپا اور دُوسری طرف محدُود ہیں، اس لیے اس چکر سے نکلنے کی صورت صرف اجتماعی فارم کا قیام ہے۔ اگر دو دو، تین تین، کاشت کار مِل جُل کر کاشت شروع کر دیں تو پیداوار کی اوسط میں ترقی ہو سکتی ہے اور اس طرح زراعت منافع بخش پیشوں میں اچھی جگہ حاصل کر سکتی ہے۔ لاگت، مزدُوری اور دُوسرے اخراجات کی بچت کی بنا پر فی ایکڑ کم خرچ آئے گا اور اس طرح کسان کو بے کار اور بے ضرورت قرض لینے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ یہاں ایک اور مشکل پیش آتی ہے اور وہ اجتماعی فارم کی وجہ سے ہونے والے بے روزگار کاشت کاروں کی ملازمت کا مسئلہ ہے، اس کو طے کرنے کے لیے ہمیں دیہی صنعتوں کو جاری کرنے اور فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

دُوسری بات جو اس سلسلے میں کہنا ضرُوری ہے وہ زمین کا نظام ہے۔ اس سے میری مراد ہندُستان میں زمین کی ملک کے قانون سے ہے۔ تقریباً ۳۰ فی صدی ایسی زمین ہے جو براہِ راست کاشت کاروں کی ملکیت ہے، اور باقی زمین ملکیت تو زمیں داروں کی ہے مگر اس کو جوتتے اور بوتے مزارعے ہیں، اور زمیں دار ان سے لگان وصول کرتے ہیں۔ یہ لگان بعض صورتوں میں کُل پیداوار کا ۵۰ اور ۶۰ فی صدی حصّہ ہوتا ہے۔ کساد بازاری کے زمانے میں خصوصاً بندوبست استمراری کی وجہ سے کسان کو لگان ادا کرنے کے لیے قرض بھی لینا پڑتا ہے۔

زمین کے اس نظام کو فوری طور پر تو بدلنا ممکن نہیں ہے، لیکن اس کو ترقی یافتہ شکل ضرور دی جا سکتی ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسان کا تعلق براہِ راست حکومت سے اس طرح قائم کر دیا جائے کہ تمام درمیانی واسطے ختم ہو جائیں اور حکومت اپنے طور پر زمیں داروں سے کوئی اطمینان بخش فیصلہ کرلے۔ اگر کاشت کار کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ زمین اس کی ہے اور اس کی زرخیزیت کو بڑھانے، فصل کو بہتر بنانے، وغیرہ سے جو منافع حاصل ہوگا، وہ اسی کا ہے، تو اس کو اس پیشے سے دِل چسپی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اب تو وہ محض اس لیے زمین جوتتا اور بوتا ہے کہ اور دُوسرے دروازے اس پر بند ہیں۔

ہمیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ طریقۂ کاشت اور نظامِ زمین میں تبدیلی کے باوجود معیارِ زندگی کا بلند ہونا یقینی نہیں ہے، اس کے لیے چند اور ضروری رُکاوٹیں دُور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے کاشت کاروں کا بال بال مقروض ہے۔ اس کی صحت خراب ہے، اس کے پاس طاقت ور مویشی نہیں ہیں، اس کو زراعت کے فن سے علمی واقفیت نہیں ہے۔

یہاں حکومت کو اپنی قوت اور اقتدار کام میں لانا چاہیے۔ پُرانا قرض کم کرنے، اور نیا قرض فراہم کرنے کے لیے انتظامات ہونے چاہییں۔ دیہات میں صحت اور تن درستی کے مدِ نظر ہسپتال اور دواخانے کھولنے چاہییں۔ مویشیوں کی پرورش اور

دیکھ بھال کی تعلیم کے علاوہ ان کے ہسپتال بھی قائم کرنے ضروری ہیں۔ فصل کی بیماریوں، بیج کی اقسام، مصنوعی کھاد کے استعمال اور اسی قسم کی ضروری تعلیم کے لیے وقتاً فوقتاً تقریریں کی جائیں۔ کم از کم ہر ہر ضلع میں ایک زراعتی تحقیقی ادارہ قائم کیا جانا ضروری ہے تاکہ اس کے تجربات عام کیے جاسکیں۔ زراعتی نمائشیں منعقد کرنے کی بھی ازحد ضرورت ہے۔ غرض اس طرف حکومت کی توجہ لامحالہ غیر محدود ہیں اور اس کو ہر امداد کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ غیر مزروعہ زمین کو مزروعہ بنا کر پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے، آب پاشی کو وسعت اور ترقی دے کر فصلوں میں تنوع اور خوبی پیدا ہوسکتی ہے۔

یہ سب کام حکومت کی مدد اور انجمن ہائے امدادِ باہمی کے ذریعے پورے کیے جانے چاہییں اگر زراعتی کاروبار کی اصلاح اور ترقی کا تفصیلی منصوبہ بنا کر اس کو عمل میں لایا جائے تو ہمارے نوے فی صدی باشندے خوش حال اور صحت مند بن سکتے ہیں ہندستان میں صنعتی اور دوسری ترقیوں کا دارومدار زرعی اصلاح اور ترقی پر ہے۔ اس طرف سے لاپروائی برتنے کا نتیجہ کبھی بھی بہتر ثابت نہیں ہوسکتا۔

ملک میں ہر معاشی منصوبہ بنانے سے پہلے زراعت کو اس میں بنیادی جگہ دینے کی ضرورت ہے۔ بمبئی کے سرمایہ داروں نے جو منصوبہ بنایا ہے اس کی زبردست خامی یہی ہے کہ اس میں زراعت کو ثانوی اور صنعت کو پہلی حیثیت دی ہے۔ یہی نہیں بلکہ زراعت کی اصلاح اور ترقی کی جو سفارشات کی ہیں وہ زمین کے مسئلوں کو مطلق حل نہیں کرتیں۔ محض اس لیے کہ ہندستان صنعت میں پیچھے ہے اور ہمیشہ سے زراعت اس کا خاص کاروبار رہی ہے صنعتی ترقی میں کوشاں ہونا اور زراعت کی خرابیوں کو دفعہ کرنا خود پہلے مقصد کے منافی ہے۔

———— ❊ ————

مسائلِ حاضرہ ہندستان

دیہات کا مشترک انتظام

از :———— ترلوک سنگھ

برما چین اور مشرق وسطیٰ کی زراعت کی ایک نہایت اہم خصوصیت یہ ہو کہ یہاں پیداوارنی کارکن کم ہو۔ اس لیے زراعت کا کام کرنے والے، لوگوں کی اکثریت، گزر اوقات کے جو لوازمات ہیں، ان کی محض کم ترین مقدار کو حاصل کر پاتی ہو اور قحط سالی اور بیماری کا شکار بہت آسانی سے ہوجاتی ہو۔ غذا کی وہ حالیہ کمی جس کی وجہ سے مُلک کے بڑے رقبے خصوصاً بنگال میں سخت مصیبت نازل ہوئی اور جس نے جنگ کے ایک نازک دور میں ہندستانی معیشت کے شیرازے کو تقریباً برباد کردیا، ہمیں متنبہ کرتی ہو کہ جب تک ہم اپنے وسائل کو تنظیم نہیں دیں گے ہم اپنی آزادی کے لیے غذا کے ان ناکافی معیاروں کو بھی قائم نہ رکھ سکیں گے جو اس وقت عام طور پر رائج ہیں۔

کاشت کو بہتر کرنے کے لیے ہر مزرعہ کے لیے جداگانہ طریقے پر چار چیزیں لازمی طور پر مہیا کرنے کی ضرورت ہو:۔

(۱) اتنا کافی رقبہ کہ اس پر اچھی طرح کام کیا جاسکے۔

(۲) تنظیم (۳) سرمایہ اور

(۴) اس سطح کی فنی واقفیت جس سے موجودہ حالات میں بیش ترین کفایت کے ساتھ کام چلایا جاسکے

ان میں اوّلین لازمی ضرورت کافی رقبہ ہو۔ دوسرے عوامل بغیر اس کے کام نہیں کر سکتے۔ اس لیے بنیادی تبدیلی جسے ہمیں کرنا ہو وہ یہ ہو کہ انتظام کے واحدے میں اور جہاں تک فنی واقفیت اجازت دے، کاشت کے واحدے میں بھی خاصی توسیع کی جائے۔ بڑے زمیں داروں کے پاس تو بڑا رقبہ موجود ہو۔ اس لیے ان کے لیے تو ایسی تدبیریں نکالنے کی ضرورت ہو کہ وہ اپنی زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے اُسے پٹے پر نہ اُٹھائیں۔ لیکن خود کاشت کرنے والے زمیں داروں اور کسانوں کا مسئلہ بہت مشکل ہو۔ یہ یقینی ہو کہ جتنی آبادی بڑھتی جائے گی اُتنے ہی کسان کے رقبے غیر نفع بخش ہوتے چلے جائیں گے، اور جب تک اس رجحان کو روکنے کی کوئی تدبیر نہیں کی جائے گی، کسان اور اس کے مزدور برابر روز بہ روز غریب ہوتے چلے جائیں گے۔

اس صورتِ حال کا علاج کرنے کے لیے مختلف تجویزیں زیرِ بحث آچکی ہیں۔ اس ملک میں ایک بڑا طبقہ ایسا ہو جو کسانوں کو زمیں داری کے حقوق دیے جانے پر بہت زور دیتا ہو۔ اگر کسانوں کو زمیں دار بنا دینے سے کام چل سکتا تو دوسرے علاجوں کو سوچنے کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن ہندستان میں آدمی اور زمین کا جو تناسب پایا جاتا ہو اور کسانوں کے قبضے میں جو رقبے ہیں وہ جس حد تک غیر نفع بخش بن چکے ہیں ان کی موجودگی میں اس قسم کی امید قائم کرنا بالکل بے بنیاد ہو۔ موجودہ خرابیوں کو دور کرنے کے لیے اشتمالِ اراضی اور جٹھائی کے حق کی بھی حمایت کی جاتی ہو۔ لیکن اشتمالِ اراضی کے کام میں اوّل تو بہت مدت صرف ہوتی ہو۔ دوسرے یہ بہ ذاتِ خود مسئلے کا کوئی حل نہیں ہو بلکہ اس کے بعد جب تک زمین میں سرمایہ لگانے کا بندوبست نہ کیا جائے اس وقت تک اس کے فائدوں کو حاصل نہیں کیا جاسکتا اور تیسرے یہ کوئی مستقل علاج نہیں بلکہ عارضی علاج ہو، کیوں کہ کسان کے جن مقبوضہ رقبوں کو اشتمالِ اراضی کے ذریعے یک جا کیا جاتا ہو وہ کسان کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کے درمیان دوبارہ برابر تقسیم ہونا شروع کر دیتے ہیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے جٹھائی وراثت کو تجویز کیا گیا ہو لیکن جب دوسرے لڑکوں کے لیے زراعت کے علاوہ کوئی اور ذریعۂ معاش موجود نہ ہو، محض بڑے لڑکے کو زمین کا وارث بنا دیا اور بقیہ اولاد کو ترکے سے محروم کر دینا انصاف کے خلاف نظر آتا ہو۔ اس لیے یہ علاج بھی مفید نہیں معلوم ہوتا

مشرقی یورپ کے کئی ملکوں میں جنگِ عظیم اوّل کے بعد بڑے زمیں داروں کے مقبوضہ رقبوں کو تقسیم کرکے چھوٹے زمیں داروں کے مقبوضہ رقبوں کو وسیع کر دیا گیا ہو۔ لیکن مشرقی یورپ میں زمین کی تقسیم میں جتنی عدمِ مساوات پائی جاتی تھی اتنی ہندستان میں نہیں پائی جاتی۔ یورپ کے برعکس ہندستان میں بڑی زمیں داریوں کی کاشت کا کام مزدوروں سے نہیں کرایا جاتا بلکہ چھوٹے کسانوں سے کرایا جاتا ہو۔ اگر بڑی زمیں داریوں کو تقسیم کرکے چھوٹے زمیں داروں کے رقبے کو بڑھایا جائے گا تو ان کسانوں کے لیے زمین کو فراہم کرنے کا مسئلہ جو اس وقت بڑے زمیں داروں کی زمینوں کو پٹے پر لے کر کاشت کر رہے ہیں پھر بھی باقی رہے گا اور ان کے مقابلے میں خود کاشت کرنے والے چھوٹے زمیں داروں کے حقوق کو ترجیح دینے سے اصل مسئلے

کاشتکاری چل سکے گا۔

اب اگر خود کاشت کرنے والے چھوٹے زمیں دار بھی ہمارے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا سرمایہ داری کے طریقے پر کاشت کرنے سے ہمارا کام چل سکے گا جس کے ذریعے کم زوروں اور نا اہلوں کو مقابلے سے خارج کیا جاسکتا ہے۔ اس کی تائید اوّل تو وہ لوگ کرتے ہیں جنھوں نے اپنے روپے سے یا تو بہ راہِ راست بڑی زمیں داریاں خریدی ہیں یا جنھوں نے پہلے روپیہ چھوٹے زمیں داروں کو قرض دیا اور پھر آہستہ آہستہ ان کی زمیں داریوں کو ہتھیا کر اپنے لیے ایک بڑی جائداد پیدا کرلی ہے اور دوسرے وہ لوگ کرتے ہیں جو یا تو صرف زراعت کے کاروبار میں روپیہ لگا کر نفع کمانا چاہتے ہیں یا صنعت کے ساتھ زراعت کے کاروبار کو بھی نفع کی خاطر چلانا چاہتے ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ رجحان ہماری زراعت پیشہ آبادی کی کثیر تعداد کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔ لیکن اگر چھوٹے پیمانے کی کاشت روز بہ روز اسی طرح غیر نفع بخش ہوتی چلی گئی تو چھوٹے زمیں داروں اور کاشت کاروں کو ان سرمایہ داروں کے لیے جگہ چھوڑنا ہی پڑے گی۔

ان حالات کو دیکھنے کے بعد ہمارا روشن خیال طبقہ اس کا علاج یہ تجویز کرتا ہے کہ زمین کو قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ لیکن قومی ملکیت کا سوال تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) ایسے چھوٹے زمیں داروں کے حقوق کو قومی ملکیت بنانا جو خود کاشت نہیں کرتے (۲) خود کاشت کرنے والے چھوٹے زمیں داروں اور کسانوں کے حقوق کو قومی ملکیت بنانا۔ (۳) بڑے زمیں داروں کی زمین کو جو بہ راہِ راست ان کے قبضے میں ہو قومی ملکیت بنانا۔

آیئے سب سے پہلے ان چھوٹے زمیں داروں کے بالاتر حقوق کے مسئلے کو لیا جائے جو اپنی زمین لگان پر اٹھاتے ہیں۔ جہاں تک زمین کے مناسب استعمال کا تعلق ہے جن لوگوں کو اہمیت حاصل ہے وہ، وہ لوگ نہیں ہیں، جنھیں زمین سے لگان وغیرہ وصول کرنے کا حق ملا ہوا ہے بلکہ در اصل وہ کسان ہیں جو بہ راہِ راست زمین پر قابض ہیں اور ان کسانوں کے فائدے کے لیے (کیوں کہ ان کی ترقی کے ساتھ زراعت کی عام ترقی بھی وابستہ ہے۔) سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ زمین پر بالاتر حقوق رکھنے والے زمیں داروں سے زمین کی اصلاح و ترقی میں مزاحم ہونے کا اختیار چھین لیا جائے۔

بنگال کے صوبے کے لیے رعیت داری نظام تجویز کرنے میں فلاؤڈ کمیشن کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ کسان یا موروثی کاشت کار کے اوپر جتنے لوگوں کو بھی زمین پر حقوق حاصل ہوں ان سب کے حقوق کو سرکار معاوضہ ادا کرکے خرید لے، اور کسانوں کا رابطہ چاہے وہ اپنی زمین پر کاشت خود کرے یا کسی شکمی کاشت کار سے کرائے بہ راہِ راست حکومت کے ساتھ قائم کردیا جائے۔ کمیشن کی یہ تجویز اس حد تک تو مناسب معلوم ہوتی ہے کہ کسان کا رابطہ بہ راہِ راست سرکار سے کردیا جائے، لیکن سرکار کو بالاتر حقوق فوراً نہ خریدنا چاہیں بلکہ درمیانی زمانے میں یہ کرنا چاہیے کہ جو لگان قانونی طور پر مقرر ہو اُسے کاشت کار بے اتصالی

طور پر خود وصول کرے، اور اس کی وصول یابی میں اس کا جو خرچ ہو، وہ سرکاری مال گزاری وضع کر کے بقیہ کو زمین کے مالکوں اور حق داروں کے درمیان تقسیم کر دیا کرے۔

اسی درمیانی زمانے میں گانو کے اندر مشترک انتظام رائج کرا دینا چاہیے۔ دیہات کا مشترک انتظام کیا ہے؟ اس کا مفہوم آگے تفصیل سے سمجھایا جائے گا۔ جب یہ مشترک انتظام رائج ہو جائے گا تو گانو کے اندر ملکیت کے حقوق کو خریدنے کی خواہش پیدا ہو جائے گی، اور اس کے پاس وسائل بھی اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس وقت سرکار کو ملکیت کے بالاتر حقوق کی خریداری کا اعلان کرنا چاہیے، اور گانو کی مشترک تنظیم کو شفع کا حق دینا چاہیے۔ اگر گانو مشترک طور پر بالاتر حقوق کو خریدنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا تو سرکار ان کی خریداری کے لیے رُپے کی فراہمی کی زحمت سے بچ جائے گی۔

کاشت نہ کرنے والے زمیں داروں کے بعد خود کاشت کرنے والے چھوٹے زمیں داروں کے حقوق کو قومی ملکیت بنانے کا مسئلہ ہے۔ اس کی حکومت کو ہرگز کوئی کوشش نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ان کی تنظیم کی بہتری کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

آخر میں بڑے زمیں داروں کی جائداد کو قومی ملکیت بنانے کا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے حکومت کو ایک طرف تو منصفانہ لگان اور اُجرتوں کا مطالبہ کرنا چاہیے اور دوسرے رقبے کی وسعت کے لحاظ سے مال گزاری کی شرح کو متزائدہ کرنا چاہیے۔ جب یہ کیا جائے گا تو یہ بڑے زمیں دار اپنی زمیں داری کی حالت کو بہتر کرنے کے لیے مجبور ہوں گے۔ ان کے لیے یہ بات البتہ لازمی کر دینا چاہیے کہ وہ اپنی فصلوں کو حکومت کے منصوبے کے ماتحت رکھیں۔

چھوٹے خود کاشت کرنے والے زمیں داروں کی تنظیم کے لیے کئی حل تجویز کیے گئے ہیں۔ ان سب میں ان کو متحد کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن اس اتحاد کی شکلیں اور مدارج مختلف ہیں۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے کھیتوں پر تو خود ہی کام کرنا چاہیے لیکن جن فصلوں کو یہ بوئیں ان کا تعین جماعت کی طرف سے کیا جائے۔ اس میں عملی دشواریاں بہت سی ہیں۔ اس لیے ایک دوسرے گروہ کی تجویز یہ ہے کہ اتحادِ عمل، کھیتی کے کام کے علاوہ اور دوسرے کاموں مثلاً قرض حاصل کرنے خریدنے اور بیچنے میں جاری کیا جائے۔ لیکن ہندستان میں امدادِ باہمی کی تحریک جس کے مقاصد میں یہ سب چیزیں شامل تھیں کچھ زیادہ کام یابی حاصل نہ کر سکی اس لیے دوسرے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اس قسم کی امدادِ باہمی کو شروع میں رواج دینے کی جگہ بعد میں رواج دیا جائے، اور اس سے پہلے امدادِ باہمی کی کاشت کو رائج کیا جائے۔

امدادِ باہمی کی کاشت کا مفہوم ابھی تک لوگوں کے ذہن میں صاف نہیں ہے۔ زراعتی تحقیقات کی شاہی کونسل نے جو یادداشت زراعت اور فلاحتِ حیوانات کی ترقی کے بارے میں ۱۹۴۴ء میں شائع کی ہے اس میں اس کی حسبِ ذیل تعریف کی گئی ہے "ہر کاشت کار کے حقوق اپنی زمین پر باقی رہیں گے، لیکن کاشت کا کام مشترک طور پر کیا جائے گا۔ خرچ ایک مشترک فنڈ سے پورا کیا جائے گا، اور اسے مجموعی آمدنی میں سے وضع کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد خالص آمدنی کو کاشت کاروں کے درمیان، ہر شخص کی زمین کے تناسب کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا"۔ جب ہم امدادِ باہمی کی کاشت

کو اس تعریف کے ساتھ اپنی دیہی معیشت میں داخل کرنا چاہتے ہیں تو یہ ہمیں اتنی مفید ثابت نہیں ہوتی جتنی کہ نظر آتی ہو اور اس سے ہمارا زیادہ کام نہیں چلتا۔ نہ تو کاشت کار کے حقوق ہی زمین پر باقی رہتے ہیں اور نہ مشترک کاموں کی تقسیم ہی ٹھیک طریقے پر ہو پاتی ہو اور نہ ان کا معاوضہ ہی قابلِ اطمینان طریقے پر دیا جاسکتا ہو۔

اس لیے ہمیں ایک زیادہ کارگزار طریقۂ پیدائش اور زیادہ منصفانہ طریقۂ تقسیم پیداوار کی ضرورت ہو۔ اس سلسلے میں دو باتوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہو۔ اول یہ کہ چوں کہ زمین کے انتظام پر نگرانی قائم کرنا دیہی تنظیمِ نو کے لیے نہایت لازمی ہو۔ اس لیے ہمیں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے جس سے کسان ہمارا ساتھ دینے کی جگہ ہمارا مخالف ہو جائے۔ دوسرے تنظیمِ نو کا کوئی طریقہ کسانوں میں اس وقت تک مقبول نہیں ہوگا جب تک کہ وہ دو تصورات کا جو دونوں ہماری دیہی معاشرت کی نفسیات کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، انکار کرتا رہے گا، یعنی :۔

(۱) ملکیت کا اصول اور

(۲) مساوی وراثت کا اصول

اس کے علاوہ جو لوگ امدادِ باہمی کی کاشت تجویز کرتے ہیں وہ صرف خود کاشت کرنے والے چھوٹے زمین والوں کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں، اور دیہات کے لاکھوں زمین کی ملکیت سے محروم مزدوروں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس لیے نیا دیہی نظام بناتے وقت ہمیں چار ضرورتوں کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے :

(۱) کارگزار جماعت

(۲) زمین کی ملکیت سے محروم مزدوروں کی بہبود

(۳) دیہی اور صنعتی معیشت میں یک جہتی اور

(۴) معاشری قدروں اور محرکوں کے نئے معیار

جو تبدیلیاں ہم چاہتے ہیں، ان کے لیے زمین پر نگرانی قائم کرنا اولین شرط ہو، سویٹ روس میں اس نگرانی کو قائم کر لیا گیا ہو۔ لیکن اگر ہم پُرامن طریقے پر تبدیلی چاہتے ہیں تو ہمیں مناسب موقع پر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ ہمیں مزرعوں کے مشترک انتظام کی ضرورت ہو جس میں زمین کے حقوق کا تو خیال رکھا جائے، لیکن جس میں ساتھ ساتھ زمین محنت اور دیگر وسائل کے بہترین استعمال کی کوشش کی جاتے اور امدادِ باہمی کا ہی وہ طریقہ ہو جسے موجودہ حالت میں سب سے زیادہ لایقِ عمل قرار دیا جاسکتا ہو۔

مشترک انتظام سے مراد ایک ایسا نظام ہو جس میں ملکیت کے حقوق کا تو احترام کیا جاتا ہو۔ لیکن جس میں مالکانِ اراضی

انتظام کے لیے اپنی زمینوں کو متحد کر لیتے ہیں۔ اس کے اصول کو سمجھانے کے لیے ایک مثال کو پیش کرنا مناسب ہوگا۔ فرض کیجیے ہمارے پاس ۶۰ ایکڑ کا ایک رقبہ ہے جس کے دس مالک ہیں جن میں سے ہر ایک کے قبضے میں علی الترتیب دو چار چھ، آٹھ یا زیادہ ایکڑ ہیں۔ فرض کیجیے ان دسوں مالکوں میں سے چار خود کاشت نہیں کرتے کیوں کہ ان میں سے دو کہیں ملازم ہیں، ایک تجارت کرتا ہے اور ایک اتنا بوڑھا ہے کہ کام نہیں کر سکتا۔ آج کل جو نظام رائج ہے، اس میں جو لوگ خود کاشت نہیں کرتے وہ اپنی زمین ذیلی کاشت کاروں کو لگان پر اُٹھا دیتے ہیں۔ لیکن یہ طریقہ چوں کہ زراعت کے لیے اچھا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے فرض کیجیے کہ ان ۶۰ ایکڑوں کو دسوں مالکوں کے مشترک نظام کے تحت لے آیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں سے صرف ۶ گانوؤں میں کام کرنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔

اب زمین کی آمدنی دو حصّوں میں تقسیم کرنا ہوگی، ایک حصّہ تو کام کی آمدنی کا ہوگا دُوسرا ملکیت کی آمدنی کا ہوگا۔ یہی وہ فرق ہے جس کے ماتحت ذیلی کاشت کار اور مالک دونوں ایک ہی زمین سے آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ آمدنی کی تقسیم یا تو نقد میں کی جائے گی یا جنس کی صورت میں۔ یہ تقسیم عموماً رواج کے مطابق ہوگی لیکن کبھی کبھی مقابلے کے مطابق بھی ہو سکے گی۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ ذیلی کاشت کار اور زمین کے مالک کے درمیان نصفا نصفی پر پیداوار کی بٹائی ہوتی ہے جو چھ آدمی ۶۰ ایکڑ رقبے کی کاشت کریں گے۔ انھیں اپنی محنت کے معاوضے میں نصف پیداوار ملے گی اور یہ چھ بقیہ چار کے ساتھ مل کر زمین کے مالک کی حیثیت سے نصف پیداوار کے حق دار ہوں گے۔ اگر سہولت کی خاطر یہ مان لیا جائے کہ ۶۰ ایکڑ کا یہ رقبہ دس ایکڑ کے چھ واحدوں میں بٹا ہوا ہے تو ہر کام کرنے والے کو اپنی زمین کی آدھی پیداوار ملے گی۔ بقیہ پیداوار کو وہ مشترک ذخیرے میں شامل کر دے گا۔ پھر اس مشترک ذخیرے میں سے مشترک مزرعہ اپنی مال گزاری ادا کرے گا۔ ان کاموں میں جو ضروری ہوں گے مشترکہ طور پر سرمایہ لگائے گا اور دُوسرے لازمی مصارف پُورا کرلے گا۔ اس کے بعد جو بچت ہوگی وہ دسوں مالکوں کے درمیان ان کے زمین کے حصّے کے مطابق تقسیم کر دی جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ زمین کے مشترک انتظام کے لیے زمین کا کس قدر رقبہ ضروری ہوگا۔ اس کا انحصار تین باتوں پر ہوگا:-

۱- سرمایہ کس قدر دست یاب ہو سکتا ہے۔

۲- انتظامی اہلیت کس پیمانے کی پائی جاتی ہے۔ اور (۳) فنی واقفیت کی کیا حالت ہے۔

ایک مزرعہ کے چلانے کے لیے کتنے سرمایے کی ضرورت ہوگی۔ اس کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ ہمارے پاس فنی واقفیت کس قسم کی ہے اور ہمارا طریقۂ کار کیا ہے۔ جدید طرز پر قوتِ محرکہ سے جو کاشت کی جاتی ہے اس کے لیے بہت زیادہ سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے انگلستان، کنیڈا، آسٹریلیا اور امریکہ میں جو منفرد کسان زمین کو پٹے پر لیتے ہیں وہ پہلے

اس بات کا اندازہ کرتے ہیں کہ کتنا سرمایہ انھیں دست یاب ہو سکے گا اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کتنی زمین انھیں حاصل کرنا ہوگی۔ لیکن جہاں معاملہ افراد کا نہ ہو بلکہ کسانوں کی جماعت کا ہو جس کی بہبودی کو سرکار نے اپنے مقاصد میں داخل کر لیا ہو تو وہاں سرمایے کی فراہمی کا سوال اس بات کا فیصلہ کرنے میں زیادہ اہمیت نہیں رکھے گا کہ مشترک تنظیم کی توسیع کتنے رقبے پر کی جائے۔

مغربی ملکوں کے منفرد کسانوں کے لیے صرف سرمایے ہی کا سوال اہمیت نہیں رکھتا بلکہ رقبے کی توسیع فیصلہ کرنے میں انتظامی قابلیت کی نوعیت کو اس سے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ انتظامی قابلیت کی ترقی مختلف اسباب کی پابند ہوتی ہے، تعلیم، تربیت روایت، تجربہ اور جماعت کی معاشی اور معاشرتی تنظیم یہ سب مجموعی اور انفرادی انتظامی قابلیت کی ترقی میں معاون یا مزاحم ہو سکتے ہیں۔ ہماری دیہی معاشرت کی خرابیاں سب پر روشن ہیں اس لیے ہمارے کسانوں کے اندر تو انتظامی قابلیت کی زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی لیکن اس معاملے میں حکومت بہت کچھ مدد کر سکتی ہے۔ یہ جس قسم کی تنظیم کو ترقی دینا چاہے گی اسی قسم کی انتظامی اہلیت کو مہیا کر سکے گی۔ چھوٹے خود کاشت کرنے والے زمینداروں کے گاؤں میں مزرعوں کے مشیر، منیجر اور ان کے تربیت یافتہ عملے کی خدمات فراہم کی جا سکتی ہیں۔ جب چند سال تک کسان مشترک انتظام کے ماتحت کام کر لیں گے تو خود ان کے اندر مناسب انتظامی اہلیت پیدا ہو جائے گی اس لیے جہاں تک انتظامی اہلیت کا تعلق ہے ہم اپنے مشترک مزرعوں کو جتنا چاہیں بڑا بنا سکتے ہیں۔

اس لیے ہمارے لیے نہ تو سرمایے کی فراہمی زیادہ اہمیت رکھتی ہے نہ انتظامی قابلیت بلکہ ہمارے لیے فنی واقفیت اور طریقۂ کار کا سوال سب سے زیادہ اہم ہے۔ طریقۂ کار ایک زبردست معاشری قوت ہے۔ اس کی تبدیلیوں سے معاشرے کی تنظیم اور اس کی قدروں میں زبردست تبدیلیاں پیدا کی جا سکتی ہیں جس معاشرے میں طریقۂ کار کی تبدیلیاں مسلسل ہوتی رہتی ہیں وہاں ذات پات کے فرق اور دوسرے معاشری امتیازات قائم نہیں رکھے جا سکتے۔ اس لیے ہمیں توقع ہے کہ طریقۂ کار کی تبدیلیوں اور مشترک انتظام کی وجہ سے گاؤں کے اندر ایک ہی کام میں لگے ہوئے لوگوں میں حیثیت، آمدنی اور کام کے حالات میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ غائب ہو جائے گا۔ اگر موجودہ طریقۂ کار کے مطابق تنظیم دی گئی تو اس کے لیے سو دو سو ایکڑ کے مزرعے مناسب رہیں گے، ان مزرعوں میں انتظام اور فروخت کی کفایتوں کو بھی حاصل کرنا ممکن ہوگا اور بیج، فصلوں، کھادوں، پودوں کی بیماریوں اور فلاحتِ حیوانات کے بارے میں جو علمی واقفیت موجود ہے۔ ان کے ذریعے جن کفایتوں کو حاصل کیا جا سکتا ہے انھیں بھی حاصل کیا جا سکے گا

زراعت میں سائنس کے رواج کے معنی عام طور پر مشین کا استعمال سمجھے جاتے ہیں لیکن دراصل اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور اس سے بڑی حد تک علاحدہ ہے۔ اگر ہم زراعت کو ترقی دینے کے لیے مشین کا استعمال کرنا چاہیں گے تو اس کے لیے سو دو سو ایکڑ کے مزرعے کافی نہیں ہوں گے بلکہ انھیں بہت زیادہ بڑا کرنا ہوگا۔ لیکن ہندستان میں، خصوصاً چھوٹے خود کاشت کرنے والے زمینداروں کے گاؤں میں، ابھی مشین کے رواج میں دیر لگے گی۔ یہاں کام کو دو منزلوں میں کرنا ہوگا۔ پہلے موجودہ طریقۂ کار کو

جاری رکھتے ہوئے صرف انتظام کو عملی اصول پر ترقی دینا ہوگی۔ جب اس کام میں کامیابی ہوگی اور مزرعے ایک مکمل معاشی وحدت کی حیثیت سے کام کرنے لگیں گے تب دوسری منزل میں جدید طریقۂ کار کو اختیار کیا جائے گا۔ اس طرح پر گانو کی معیشت کے لیے جو لوگ فاضل ثابت ہوں گے ان کی تعداد کو بھی محدود رکھا جا سکے گا اور تبدیلی کی وجہ سے ابتری یک بارگی رونما نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے چھوٹے خود کاشت کرنے والے زمین داروں کے گانو میں مشترک انتظام کا رقبہ کُل گانو کو قرار دینا ہی زیادہ موزوں ہوگا۔ گانو کے اس رقبے کو پانچ، سات یا دس مزرعوں میں جن کا رقبہ سو سو، دو دو سو ایکڑ ہوگا تقسیم کیا جا سکے گا اور اس طرح مختلف ذاتی قبائلی اور مذہبی اختلافات کو بھی جو گانو میں موجود ہیں، چھوٹے پیمانے پر حل کیا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ گانو ان غیر زراعتی پیشوں کے لیے بھی ہمت کی ان لوگوں کے لیے ضرورت ہوگی جو زراعت کے کام میں فاضل سمجھ کر علاحدہ کیے جائیں گے ایک موزوں واحدہ ثابت ہوگا۔

———

ہندستان کی ریلیں

از:- ط۔ا۔خ

جنگ کے دوران میں ہندستانی ریلوں کی آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران کے اعداد و شمار کا موازنہ اور مقابلہ کیا جائے۔

جنگ سے پہلے ریل کی مالی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی تھی۔ ریل کے محفوظ خزانے تقریباً خالی ہوچکے تھے۔ سود کی رقموں کی ادائگی کے لیے فرسودگی کے فنڈ سے ۳۱ر۴۴ کروڑ رُپے نکالے جاچکے تھے۔ آمدنی ناکافی تھی۔ ریلوں کی طرف سے حکومت کے محاصل میں رُپیہ آنا بند ہوگیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں حکومت کی طرف سے ریلوں پر ۳۶¼ کروڑ رُپے بہ طور محصول باقی آرہے تھے۔

لیکن جنگ کے شروع ہونے کے بعد ریل کی آمد و رفت دفعتاً بڑھنی شروع ہوئی۔ سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء سے اس آمد و رفت میں حیرت انگیز اضافہ ہونے لگا۔ سنہ ۱۹۴۱ء ہی کے دسمبر میں جاپان نے اتحادی طاقتوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ چناں چہ اس اضافے کے دو اسباب تھے۔ (۱) جاپان کے خلاف جنگ میں ہندستان کو فوجی مستقر بنایا گیا اور فوجی نقل و حرکت کے لیے ریلوں کا کثرت سے استعمال شروع ہوا (۲) بحری جہاز سے آمد و رفت اور نقل و حمل میں بہت کمی ہوگئی، چناں چہ ریلوں کا استعمال بڑھ گیا۔

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں ریلوں کی مجموعی آمدنی ۱۰۲ر۷۳ کروڑ رُپے تھی۔ سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء میں ۱۳۵ر۱۷ کروڑ۔ اور سنہ ۱۹۴۴-۴۵ء میں ۲۱۴ر۳۰

کروڑ۔ اخراجات کی مد میں ۳۹-۱۹۳۸ء میں ۷۷ر۵۴ر۵ کروڑ روپے، ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۵۴ر۳۲ر۶ کروڑ روپے آتے ہیں۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ریلوے محصولات ۴۴ر۴۳ کروڑ روپے تک پہنچے، ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۵۲ر۵۶ کروڑ روپے اور ۴۵-۱۹۴۴ء میں ۸۲ر۶۹ کروڑ روپے تک۔
۴۰-۱۹۳۹ء سے لے کر ۴۵-۱۹۴۴ء تک مجموعی آمدنی، اخراجات اور محصولات کی آمدنی میں بالترتیب ۶ر۱۰۸ فی صد، ۷ر۱۴۴ فی صد اور ۹ر۸۱۵ فی صد کا اضافہ ہوا۔

۴۶-۱۹۴۵ء کے متعلق مندرجہ ذیل اعداد و شمار ہیں، یہ اندازے وہ ہیں جو مرکزی اسمبلی کے گزشتہ مباحث میں نظرثانی کے بعد قائم کیے گئے ہیں۔ مجموعی آمدنی ۲۲۵ کروڑ روپے کے قریب جو تمام سال سے زیادہ ہے۔ اخراجات ۱۴۹ر۹۱ کروڑ روپے کے قریب (۳۹-۱۹۳۸ء کے مقابلے میں ۸۷ر۱ فی صد کا اضافہ) اخراجات میں بہت زیادہ اضافے کی وجہ سے محصولات کی آمدنی ۴۴ر۷۷ کروڑ روپے (۴۵-۱۹۴۴ء) سے گھٹ کر ۴۳ر۵۹ کروڑ روپے ہو گئی ہے۔ اس رقم میں سے ۳۲ کروڑ روپے تو بجٹ کی رو سے سرکاری محصولات (BUDGETED-CONTRIBUTION) میں داخل کیے جائیں گے۔ سود کی رقم منہا کرنے کے بعد صرف ۷ لاکھ روپے باقی بچتے ہیں جو ریل کے محفوظ خزانے میں داخل کیے جائیں گے۔

نئے سال (۴۷-۱۹۴۶ء) کے لیے جو بجٹ تیار کیا گیا ہے اس کے اندازے کے مطابق فوجی نقل و حرکت کی آمدنی اور پارسلوں کی آمدنی میں ۴۸ کروڑ روپے کی کمی واقع ہوگی۔ مجموعی آمدنی کا اندازہ ۱۷۰ کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔ اخراجات ۱۲۵ر۴۷ کروڑ روپے، دیگر مدوں کے تحت مزید ۱۸ر۴۲ کروڑ روپوں کی کمی ہوگی۔ محصولات ۴۶ر۳۹ کروڑ روپے۔ سود کی ادائیگی کے بعد ۲۲ر۱۰ کروڑ روپے۔ سرکاری محصولات میں صرف ۳۶ر۷ کروڑ روپے۔ ۳ کروڑ بہتری فنڈ میں اور ۸۶ر۱ کروڑ روپے ریلوں کے محفوظ خزانے میں۔
اوپر کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوگا کہ ریلوں کی آمدنی میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کے اخراجات میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے، چناں چہ غلط نہ ہوگا اگر اخراجات کا علاحدہ مطالعہ کیا جائے۔

۳۹-۱۹۳۸ء میں اخراجات کی مد میں ۱۰۰ر۵۱ کروڑ روپے آئے، ۴۶-۱۹۴۵ء کے اندازے سے ظاہر ہوگا کہ اس میں ۸۷ر۱ فی صد کا اضافہ ہوا یعنی اخراجات ۱۴۹ر۹۱ کروڑ روپے تک پہنچ گئے۔ اخراجات کی مدوں میں سب سے زیادہ اہمیت ریل کے اسٹاف کو حاصل ہے۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں اسٹاف پر ۳۵ر۰۹ کروڑ روپے خرچ ہوئے اور ۴۶-۱۹۴۵ء میں ۷۵ر۱۱ کروڑ روپے۔ اس کے بعد ایندھن کا نمبر آتا ہے۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں ایندھن پر ۷ر۵۷ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ اور ۴۶-۱۹۴۵ء میں ۲۰ر۵۸ کروڑ روپے۔ ان مدوں کے تحت اخراجات میں کمی کا انحصار اشیا کی قیمتوں اور تنخواہوں کی کمی پر ہے۔ نئے سال (۴۷-۱۹۴۶ء) کے لیے جو پروگرام بنایا گیا ہے اس میں ۴۸ر۴۲ کروڑ روپے کا مجموعی اندازہ لگایا گیا ہے جن میں سے دو کروڑ روپے نئی لائنوں کی پیمائش اور ٹوٹی ہوئی لائنوں کی از سر نو تعمیر میں صرف ہوں گے اور بقیہ رقم ڈبوں، مشینوں، سڑکوں کے ذرائع نقل و حمل اور شاخوں

کی خرید وغیرہ میں صرف ہوگی۔

یہ ظاہر ہی کہ جنگ کے دوران میں ریلوں کے جو اخراجات بڑھ گئے ہیں اُن میں کمی ہونے کی کوئی خاص امید نہیں ہی۔ اس لیے کہ حکومت کے پیشِ نظر ریلوں کی عظیم توسیع و ترقی کا پروگرام ہی۔

جنگ کے دوران میں ہندستانی ریلوں کی مالی حالت کے سنبھل جانے کی وجہ سے حکومت کے جو محصولات ریلوں پر باقی آتے تھے وہ سب ادا ہو گئے ہیں۔ اور جنگ سے پہلے فرسودگی کے فنڈ سے ریلوں نے جو ۳۱٫۴۴ کروڑ روپے قرض لیے تھے وہ بھی واپس کر دیے گئے ہیں۔ امید کی جاتی ہی کہ اپریل سنہ ۱۹۴۶ء تک فرسودگی کے فنڈ میں ۹۲٫۷ کروڑ روپے جمع اور ریلوں کے محفوظ خزانے میں ۲۹٫۱ کروڑ روپے جمع ہوں گے۔ گزشتہ سال قاعدوں میں تبدیلی کر کے تقریباً ۵۶ کروڑ روپے جن سے جنگ کے زمانے کی بڑھی ہوئی قیمتوں پر ڈبے خریدے گئے تھے اُنھیں فرسودگی کے فنڈ سے حاصل کرنے کی بجائے ریلوں کے روزمرہ کے اخراجات کی مد میں شامل کر لیا گیا ہی۔ اس طرح فرسودگی کا فنڈ گویا محفوظ رہا اور اس پر کوئی بار نہ آیا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہوا ہی کہ موجودہ مزید اخراجات پورے کرنے کے لیے ریلوں کے محفوظ خزانے میں سے تقریباً ۱ کروڑ روپے واپس لے لیے گئے ہیں۔

مجموعی طور پر جنگ کے دوران میں ۵۸٫۴۳ کروڑ روپے ریلوں کی آمدنی سے سرکاری محصولات میں آئے ہیں۔ ریلوں کے فرسودگی فنڈ میں ۶۱٫۰۰ کروڑ روپے اور ریلوں کے محفوظ خزانے میں ۲۹٫۰۵ کروڑ روپے جمع ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دفاعی (STRATEGIC) لائنوں پر ریلوں کو ۶٫۱۰ کروڑ روپوں کا نقصان بھی ہوا ہی۔

ہندستانی ریلوں کی مالی حالت کا جو امید افزا نقشہ پیش کیا گیا ہی اُس کا یہ مطلب نہیں کہ مستقبل بہت اطمینان بخش اور تمام خطرات سے خالی ہی۔ اس سلسلے میں چند خاص باتیں قابلِ غور ہیں۔ مثلاً ریلوں کے فرسودگی فنڈ جس میں اس وقت کوئی ۹۳ کروڑ روپے جمع ہیں۔ اس کی تنظیم سائنٹفک بنیادوں پر نہیں کی گئی ہی۔ اس فنڈ کے متعلق جو تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا اُسے دفعتاً یہ کہہ کر بند کر دیا گیا کہ کافی اعداد و شمار مہیا نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہی کہ اس وقت صحیح صحیح یہ بتانا بہت مشکل ہی کہ اس فنڈ کے تحت کتنی رقم ہی۔

اس فنڈ کو پہلے کی طرح مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے محض یہی کافی نہیں ہی کہ جنگ سے پہلے اس میں سے جتنی رقم نکالی گئی تھی وہ واپس کر دی جائے۔ اس فنڈ کا اب تک کوئی تعین نہیں ہو سکا ہی اور نہ یہ بات طے پا سکی ہی کہ کس حساب سے اس میں رقم جمع کی جائے۔ اب تک یہ ہوتا رہا ہی کہ موقع کی مناسبت سے اس میں رقمیں جمع کی جاتی رہی ہیں کسی خاص اصول کی پابندی نہیں کی گئی ہی۔ اگر یہ غور کیا جائے کہ جنگ کے زمانے میں ریلوں کے سامان اور عمارتوں پر کتنا بوجھ پڑا ہی تو ہمیں معلوم

ہوجائے گا کہ یہ فنڈ آئندہ کی ضروریات کے لیے قطعی ناکافی ہے۔

اِس بات کا احساس رکھنا بھی ضروری ہے کہ دورانِ جنگ میں ریلوں کی آمدنی میں جو اتنا زبردست اضافہ ہوا ہے وہ افراطِ زر والے جنگی اخراجات کی وجہ سے۔

ریلوں کے محفوظ خزانے میں جو ۹۴ کروڑ روپے جمع ہیں وہ بھی آیندہ کی ضروریات کے لیے کافی نہیں ہیں۔

جنگ کے بند ہو جانے کی وجہ سے ریلوں کے محصولات میں معتد بہ کمی بھی ہو گئی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ نئے سال میں کم سے کم ۴۸ کروڑ روپوں کی آمدنی گھٹ جائے گی۔ اس سے یہ ہوگا کہ بجٹ کی رقم ۴۳ کروڑ روپے سے گھٹ کر ۱۲ کروڑ روپے ہو جائے گی۔ ۱۹۴۶-۴۷ء کے ابتدائی دنوں میں فرسودگی فنڈ کی رقم ۱۲۰٫۰۱ کروڑ روپے ہوگی، اس میں اضافہ ہونے کی بجائے سال کے آخر میں صرف ۹۸٫۸۳ کروڑ روپے ہوں گے۔

ایسی حالت میں ریلوں کی آمدنی پر مطالبات بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ ریلوں کے اسٹاف کے اضافۂ تنخواہ کے مطالبوں کے علاوہ پبلک کا مطالبہ یہ ہے کہ ریلوں کو زیادہ آرام دہ بنایا جائے جس کے لیے کافی رقم لگانے کی ضرورت ہے۔

اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ ریلوں کی آمدنی میں جو اضافہ ہوا ہے وہ جنگ کی وجہ سے۔ موجودہ اضافے کا صرف آٹھ فی صد حصہ ریلوں کے کرائے میں اضافے کا مرہونِ منت ہے جو سنہ ۱۹۴۲ء سے عمل میں ہے۔

سالِ گزشتہ کے مقابلے میں اب مال و اسباب کی نقل و حرکت اور پارسلوں کی آمدنی میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ مسافروں کی آمد و رفت میں اضافہ بھی ہوا ہے۔ اونچے درجوں میں ۲۵ فی صد کا اضافہ ہوا ہے اور تیسرے درجے کی آمد و رفت میں ۱۴ فی صد کا۔ آیندہ مسافروں کی تعداد میں کمی نہیں بلکہ اضافے ہی کی امید ہے۔ جہاں تک مال کی آمد و رفت کا سوال ہے اس کا انحصار تجارت اور صنعت کی ترقی پر ہے۔

دورانِ جنگ میں ریلوں کے سامان کا بھی ضرورت سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔ چناں چہ جنگ کے بعد اُن کی مرمت کرنے یا نئے سامان لگانے میں بہت بڑی رقم کی ضرورت ہوگی۔ ریلوں کے بہت سے ورک شاپ کو جنگ کے زمانے میں جنگی آلات و سامان پیدا کرنے کے کام میں لگا دیا گیا تھا اور اُن سے بہت زیادہ کام لیا گیا۔ پلوں وغیرہ کی مرمت کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔ ڈبوں کو تو اور بھی ضرورت سے زیادہ استعمال کیا گیا۔ جنگ سے پہلے کی بہ نسبت جنگ کے دوران میں مسافر گاڑیوں پر ۴۵ فی صد زیادہ بوجھ لادا گیا اور مال گاڑیوں پر ۸½ فی صد زیادہ۔ انجنوں کو شیڈ میں جانے سے پہلے دگنے سے زیادہ فاصلے طے کرنے پڑے۔ ۲۹ فی صد انجن اپنی مقررہ عمر یعنی پینتیس سال سے تجاوز کر گئے ہیں اور اُن کی بجائے اب نئے انجن خریدنا ضروری ہے۔ گیارہ فی صد کرنے چالیس سال سے کام میں لائے جا رہے ہیں۔ چناں چہ چودہ سو نئے انجنوں اور پچاس ہزار نئے ڈبوں کا آرڈر

پھر بھی اس میں مزید اضافے کی ضرورت ہے۔

اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ آمدنی میں تو کمی ہوگی لیکن ریلوں کے اخراجات میں جلد کمی نہیں ہوگی۔ موجودہ تنخواہوں اور عارضی بھتّوں میں اس وقت تک کمی نہیں ہوگی جب تک اشیا کی قیمتیں کم نہ ہو جائیں۔ ممکن ہے آگے چل کر ریلوں کو جہازوں اور سڑکوں کے ذرائع حمل ونقل سے مقابلہ بھی کرنا پڑے۔ اس سے ریلوں کی آمدنی میں کمی ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہرحال اس کا ابھی کوئی فوری خطرہ نہیں ہے۔ ریلوں کے سامنے ۸۰۰۰ میل نئی لائنوں کی تعمیر کا پروگرام بھی ہے۔ اس میں ۴۰۰ کروڑ روپوں کے خرچ کا اندازہ لگایا گیا ہے اور یہ کام سات سال میں جاکر مکمل ہوگا۔

ریلوں کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے گزشتہ سال حکومتِ ہند کے ممبر حمل ونقل سر ایڈورڈ بینتھل نے کرائے میں اضافے کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن اس وقت یہ تجویز رد کردی گئی اور اس وقت کے حالات میں یہ غلط بھی نہ تھا کیوں کہ مسافروں اور عام تجارت وصنعت کے لیے ہندستان کی ریلیں بہت کم آسانیاں فراہم کررہی تھیں۔ لیکن اس وقت جب کہ ریلوں کی مجموعی آمدنی گھٹنا شروع ہوئی ہے کرایہ بڑھانے کا سوال کچھ زیادہ بے محل نہیں معلوم ہوگا۔ اگرچہ فی الحال کرایہ بڑھانے کی کوئی تجویز نہیں ہے لیکن آیندہ ضروریات کے تحت اس کا امکان ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کرائے میں اضافے کا تعلق بہت سی دیگر باتوں سے بھی ہے۔ اگر تجارت زوروں پر رہی، از سرِ نو معاشی تعمیر کے سلسلے میں حکومت کے اخراجات بھی اتنے ہی رہے اور فوجی اشیا کی پیدائش کی جگہ امن کے زمانے کی اشیا کی پیدائش نے لے لی تو اسی حساب سے ریلوں کے کرائے میں اضافے کیے جاسکتے ہیں۔ بہ شرطے کہ اوّل الذکر باتوں کے سلسلے میں حکومت نے اپنی نااہلی کا ثبوت نہ دیا۔

ریلوں کی شرحوں کی اصلاح کے لیے کچھ دنوں سے چند تجویزیں زیر غور ہیں۔ اور ٹیلیس کوپ کلاس ریٹ کو اختیار کرنے کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ اگرچہ ایسا کرنا کئی باتوں کے لحاظ سے اچھا ہوگا لیکن اس سلسلے میں ایک اہم بات کا خیال رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس سے ملک کے اندرونی حصّوں میں گھریلو صنعتوں پر ناموافق اثر پڑنے کا اندیشہ ہے اور چوں کہ منصوبے بندی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خطہ وار بنیادوں پر ملک کی معاشی ترقی عمل میں لائی جاتے اس لیے اس نئے سسٹم کو اختیار کرنے سے پہلے اس کے متعلق تمام نتائج پر غور کرلینا لازمی ہے۔

بے جا نہ ہوگا اگر یہاں پر کچھ مفید تجویزیں بھی پیش کردی جائیں جن پر عمل کرکے ہندستانی ریلوں کی مالی حالت درست کی جاسکتی ہے اور اس کی بہتر توسیع اور تنظیم کرکے مسافروں کو بھی آرام پہنچایا جاسکتا ہے۔

ریلوں کی مالی حالت درست کرنے کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ حکومت اور ریلوں کے درمیان محصولات کے سلسلے میں جو راضی نامہ ہوا تھا اس پر نظرِ ثانی کی جاتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریلوں کی آمدنی کے ایک معقول

حصّے کا حکومت کے خزانے میں داخل ہونا ضروری ہو لیکن اس وقت حکومت کو جو رقم دی جا رہی ہو وہ بہت زیادہ ہو جس سے نقصان یہ ہو کہ ریلوں کے اسٹاف اور مسافروں کے مطالبوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری اخراجات برداشت کرنے سے ریلیں انکار کر رہی ہیں۔ جنگ کے دوران میں مندرجہ ذیل رقمیں ریلوں کی آمدنی سے نکال کر حکومت کے خزانے میں داخل کی گئی ہیں۔

(۱) گزشتہ قرضوں کی ادائیگی	۳۶ ½ کروڑ رُپے
(۲) سنہ ۴۴-۱۹۴۳ء تک	۹۰ کروڑ رُپے
(۳) گزشتہ دو سال میں	۶۴ کروڑ رُپے

سنہ ۱۹۴۳ء میں مرکزی اسمبلی میں تجویز پاس کر کے سنہ ۱۹۲۴ء کے راضی نامے کو بدل دیا گیا اور یہ طے پایا کہ سنہ ۱۹۴۳ء کی ریلوں کی بچت کی رقموں کا ۷۵ فی صد حصّہ حکومت کو بطور محصول دیا جائے اور ۲۵ فی صد حصّہ ریلوں کے محفوظ خزانے میں داخل کیا جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ آیندہ سالوں میں حکومت اور ریلوں کی ضروریات کے مطابق بجٹ کی رقموں کی تقسیم کی جائے گی۔ لیکن دراصل دیکھا جائے تو اب تک اس تقسیم کے لیے کسی صحیح اور مناسب بنیاد کا تعین نہیں ہوسکا ہو۔ حکومت نے ہمیشہ بڑی بڑی رقمیں ہتھیانے کی کوشش کی ہو۔

حکومت ہند کے شعبۂ نقل وحمل کی طرف سے ایک "اصلاحی فنڈ" کے قیام کی تجویز پیش کی گئی ہو جو ۱۵ کروڑ رپوں پر مشتمل ہوگا۔ ۱۲ کروڑ رُپے تو ریلوں کے محفوظ خزانے سے لیے جائیں گے اور تین کروڑ رُپے نئے سال کی بچت کی رقموں سے اس قسم کے فنڈ کے قیام کی تجویز جنگ سے پہلے ڈکنسن اور راؤ نے پیش کی تھی لیکن ان کی تجویز اور موجودہ تجویز میں کئی اہم باتوں کا فرق ہو۔ موخرالذکر میں پہلی خرابی تو یہ ہو کہ اس بات کا تعین نہیں کیا گیا ہو کہ آیندہ اس فنڈ میں کس اصول پر رقمیں جمع کی جائیں گی۔ دوسری خرابی یہ ہو کہ زیادہ رقم ——— دو کروڑ پچاس لاکھ رُپے ——— ریلوں کے اسٹاف کو آرام و آسایش کے لیے صرف کی جائے گی اور صرف ½ ۷۲ لاکھ رُپے مسافروں کی تکالیف دور کرنے کے لیے لگائے جائیں گے۔

بعض حلقوں میں تو خیال ظاہر کیا جا رہا ہو کہ اس فنڈ کا قیام ہی کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہو کہ اس وقت ریلوں کے محفوظ خزانے میں اتنی کافی رقم نہیں ہو کہ اس میں سے "بہتری فنڈ" کے لیے رُپے نکالے جائیں۔ وج ووڈ کمیٹی نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ریلوں کے محفوظ خزانے میں ۵۰ کروڑ رُپوں کا جمع رہنا ضروری ہو لیکن اس وقت صرف ۲۹.۵ کروڑ رُپے ہیں۔ اندازہ یہ ہو کہ اگر اس رقم سے ۱۲ کروڑ رُپے نکال کر "بہتری فنڈ" میں لگا دیے گئے تو سال کے آخر میں یعنی دیگر مدوں کے تحت اخراجات کے بعد محفوظ خزانے میں صرف ۱۱.۷ کروڑ رُپے رہ جائیں گے۔ یہ بات اس حقیقت کے پیش نظر تشویشناک ہوگی کہ اب ریلوں کی آمدنی میں برابر کمی ہی ہوتی چلی جائے گی۔ ان باتوں پر غور کرتے ہوئے بعض حلقوں میں یہ مناسب

خیال کیا جا رہا ہے کہ فی الحال اس فنڈ کا قیام روک دیا جائے

حکومت نے ہندستان میں انجن سازی کی صنعت کے اجرا کی تجویز پیش کی ہے۔ لیکن ڈر یہ ہے کہ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد ہندستان میں تل کے ڈبے بنانے کی جو تجویز پیش ہوئی تھی اور اس کا جو حشر ہوا وہی موجودہ تجویز کا بھی نہ ہو۔

سنہ ۱۹۲۴ء ہی میں تحقیق وتفتیش کے بعد یہ رپورٹ موصول ہوئی تھی کہ ہندستان میں انجن سازی کی صنعت کا جاری ہونا ضروری ہے لیکن اس کام کے لیے حکومت نے سنہ یرم کے ورک شاپ کو کھیں کو خستہ مال جاکر ٹاٹا کے حوالے کیا۔ کچرا پالا کے ورک شاپوں میں چھوٹی پٹری کے انجن بہت آسانی کے ساتھ بن سکتے ہیں لیکن دورانِ جنگ میں حکومت نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ریلوں کی "مستقل مالیاتی کمیٹی" نے یہ مشورہ دیا ہے کہ ۲۰ لاکھ ڈالر انجن سازی کے لیے ضروری مشینوں کی خرید کے واسطے منظور کیے جائیں۔ ریلوں سے متعلق حکومت کی دیگر تعمیری اسکیموں میں تیس ہزار میل نئی لائنوں کے بڑھانے کی تجویز بھی ہے۔ ریلوں کو بجلی مہیا کرنے اور اس کے لیے ایک ری سرچ کا انتظام کرنے کا بھی پروگرام ہے۔ تیسرے درجے کے مسافروں کے لیے زیادہ آرام وآسائش مہیا کی جائے گی اور انٹر کے درجوں میں پنکھے کا انتظام کیا جائے گا۔ ضرورت ہے کہ مسافروں کو زیادہ آرام پہنچانے کا پروگرام جلد از جلد عمل میں لایا جائے۔ اس سے ریلوں کو بھی فائدہ ہوگا اور وہ اس طرح کہ ریلوں کے دوسرے ذرائع حمل ونقل سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور طاقت بڑھ جائے گی۔

حکومت کے پیشِ نظر ریلوں کو سڑکوں کے ذرائع حمل ونقل سے ملا دینے کا پروگرام بھی ہے۔ اس پر گزشتہ مہینوں میں کافی بحث وتمحیص ہو چکی ہے اور تمام موافق وناموافق رائے اور مشورے اب حکومت کی مقرر کردہ "انتخابی کمیٹی" کے رپورٹ میں آچکے ہیں۔

آخر میں ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ ریلوں کی نئی توسیع وترقی کو ملک کی صنعتی وتجارتی ضروریات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ ہندستان کی ریل لائنوں کا بیشتر فی صد حصہ دفاعی لائنوں پر مشتمل ہے۔ زیادہ لائنوں کی تعمیر ملک کی تجارت کو فروغ دینے کے لیے نہیں کی گئی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ ہندستان میں تجارتی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر نئی لائنوں کی تعمیر کی جائے۔

نظری معاشیات

مروّج سکّوں کے باہمی تعلقات

اقتباس از ایمائل برنس ——————— مترجمہ حمیدہ نقوی

ہر ملک کی اپنی ایک معیاری اکائی ہوتی ہے جس کے ذریعے ان اشیا کی جن کی خرید و فروخت ہوتی ہے قدرِ مبادلہ مقرر کی جاتی ہے۔ ملک کے اندر کے تمام لین دین کا حساب اسی اکائی کے ذریعے طے ہوتا ہے اور ملک کے تمام مروّج سکّے اور نوٹ اسی اکائی کی نسبت میں ظاہر کیے جاتے ہیں۔

مگر مختلف ممالک کے باشندوں میں بھی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رہتا ہے جو اپنے ذر کے لیے جدا جدا معیاری اکائیاں استعمال کرتے ہیں۔ اگر کسی کاشت کار نے ریاست ہائے متحدہ میں گیہوں کی کاشت کی ہے اور انگلستان کے کسی پنساری کے ہاتھ اپنا گیہوں بیچنا چاہے تو وہ اس کی ادائگی ڈالروں میں چاہے گا۔ لیکن پنساری انگلستان میں اسی آٹے کو پونڈ کے عوض میں بیچےگا چناں چہ کوئی ایسی ترکیب ہونی چاہیے جس سے پنساری آٹے کے عوض میں ملے ہوئے پونڈ کو ریاست ہائے متحدہ کے ڈالروں میں تبدیل کر سکے۔ اس قسم کے لین دین کے واسطے مبادلے کی شرح مقرر ہونی چاہیے۔ "مبادلے کی شرح" ایک ایسی اصطلاح ہے جو خاص طور سے غیر ملکی مروّج سکّوں کے مبادلے میں استعمال ہوتا ہے۔

جب تک اہم تجارتی ممالک کی معیاری اکائی سونے کے ایک مقررہ وزن کے برابر رہی اُس وقت تک زر کا مبادلہ معیاری اکائی کے تناسب سونے کے وزن کے برابر تھا۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ کے سونے کے ڈالر کا معیاری وزن انگلستان

کے سونے کے ساورن کے پانچویں حصّے سے تھوڑا زیادہ تھا۔ سونے کے وزن کے لحاظ سے پانچ ڈالر ایک پونڈ سے کچھ زیادہ تھا یعنی ۸۶ء۴ ڈالر ایک پونڈ سونے کے وزن کے برابر تھا۔

چناں چہ اگر پنساری کو ۸۶ء۴ ڈالر کاشت کار کو ادا کرنے ہوں تو وہ ۱۰۰ پونڈ کے سونے کے ساورن ریاست ہائے متحدہ بھیج کر ادا کر سکتا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سونا شاذ و نادر ہی ایک مُلک سے دوسرے مُلک کو بھیجا جاتا تھا۔ کیوں کہ برطانوی پنساری کے لیے بیمہ اور چونگی کی وجہ سے گیہوں کی قیمت زیادہ پڑ جاتی تھی۔ اس کے لیے انگلستان ہی کے کسی امریکی بینک سے ۴۸۶ ڈالر کا چک خرید کر کاشت کار یا اس کے ایجنٹ کے پاس بھیج دینا آسان تھا اور انگلستان میں ان سیاحوں کے علاوہ جن کے پاس امریکی ڈالر کے نوٹ ہیں امریکی ڈالر فروخت کرنے والوں کا پانا بھی آسان تھا۔ کیوں کہ جس وقت کاشت کار کا گیہوں امریکہ سے انگلستان آیا تو ساتھ ہی انگلستان کا بنا ہوا کپڑا اور مشین بھی بحرِ اوقیانوس کے اس پار ریاست ہائے متحدہ میں کسی خریدار کے پاس پہنچ جاتی لہٰذا خرید و فروخت کا ایک مسلسل سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اور جب تک دونوں جانب کی فروخت میں سونے کے وزن کی قیمت برابر تھی نتیجہ حسب ذیل تھا:-

ریاست ہائے متحدہ کا کاشت کار برطانیہ کے پنساری سے ۴۸۶ ڈالر لینا چاہتا تھا۔

انگلستان سے درآمد کیے ہوئے کپڑے کی فروخت سے ریاست ہائے متحدہ کے ایک درآمدی تاجر کے پاس ۴۸۶ ڈالر آئے لیکن وہ برطانیہ کے برآمدی تاجر کا ۱۰۰ پونڈ کا قرض ادا کرنا چاہتا تھا۔

آمدنی کے بعد پنساری کے پاس برطانیہ میں ۱۰۰ پونڈ تھے۔ لیکن وہ ریاست ہائے متحدہ کے کاشت کو ۴۸۶ پونڈ بھیجنا چاہتا تھا۔

کپڑوں کے انگریز برآمدی تاجر کو ریاست ہائے متحدہ کے درآمدی تاجر سے ۱۰۰ پونڈ لینے تھے۔

ان میں ہر ایک کو مطمئن کرنے کے لیے صرف یہ ضروری تھا کہ ریاست ہائے متحدہ کا درآمدی تاجر ۴۸۶ ڈالر کاشت کار کو دے دے اور انگلستان کا پنساری کپڑوں کے برآمدی تاجر کو ۱۰۰ پونڈ دے دے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا براہِ راست لین دین نہیں ہوتا۔ پنساری یا سوداگر جسے بھی غیر مُلکی سکّوں میں رقم بھیجنی ہوتی ہے وہ اپنے مُلک کے کسی بینک نے دوسرے مُلک کے بینک پر چک کی صورت میں خرید لیتا ہے لیکن بینک اِسے اس قسم کے چک صرف اسی بِنا پر مہیّا کر سکتے ہیں کہ اس طرح کے لین دین ہر وقت دونوں طرف سے ہوتے رہتے ہیں۔ اور بنک کے نظام میں بہ حیثیتِ مجموعی وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں رقمیں علاحدہ کر لیتے ہیں۔

عام طور سے کسی دو ممالک کے درمیان اشیا کی درآمد اور برآمد کا اگر سونے کے وزن میں اندازہ لگائیں تو بہت نمایاں فرق معلوم

ہوگا۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کے درمیان اشیا کی آمد و رفت کے علاوہ بہت سے ایسے کاروبار بھی ہوتے ہیں جن میں غیر ملکی سکّوں کی صورت میں ادائگی کرنی پڑتی ہو۔ اس کی سب سے آسان مثال سیاحوں کا دوسرے ملکوں میں سفر کرنا ہے۔ ایک انگریز سیّاح کا زر لندن میں پونڈ کی شکل میں ہو، لیکن اسے معلوم ہو کہ ریاست ہائے متحدہ میں اسے ہوٹل کے، اور دیگر اخراجات ڈالر میں اداکرنے پڑیں گے، چناں چہ اسے اپنے کچھ پونڈ ڈالر میں تبدیل کروانے پڑیں گے۔ ایک امریکی سیّاح جو انگلستان سفر کی طرف سے جاتا ہو اس کا زر ڈالر کی صورت میں ہو، اور اُس میں سے کچھ ڈالر کو اسے پونڈ کی شکل میں تبدیل کرانا پڑے گا تاکہ انگلستان میں وہ اپنے مصارف کی ادائگی کرسکے۔ یا اگر کوئی انگریز پونڈ کی صورت میں اپنا زر ریاست ہائے متحدہ میں سود پر لگانا چاہتا ہو تو اسے پونڈ کو ڈالر میں بدلوانا پڑے گا۔ یہی اس صورت میں بھی ہوتا ہو جب ریاست ہائے متحدہ کا کوئی شخص انگلستان میں اپنے ڈالر کو پونڈ کی شکل میں سود پر لگانا چاہتا ہو۔ اور جب میعاد پر انگریز کو ریاست ہائے متحدہ میں سود پر لگائی ہوئی رقم پر سود ملنے کا وقت آئے گا تو اسے سود بھی ڈالر کی صورت میں ملے گا جسے اسے پونڈ کی شکل میں بدلوانا پڑے گا تاکہ وہ انگلستان میں صرف کرسکے۔ یا اگر کسی انگریز کا اسٹیمر ممالک متحدہ سے اشیا لے جا رہا ہو تو اسے سب محصول ڈالر میں وصول ہوں گے اور اگرچہ بندرگاہ کے تمام مصارف ڈالر ہی میں ادا کیے جائیں گے مگر آخر میں اصل باقی کو پونڈ میں تبدیل کرکے انگریز جہاز کے مالک کے پاس بھیجنا پڑے گا۔ مختلف نوعیتوں کی بے شمار لین دین کی یہ صرف چند مثالیں ہیں ایسے کاروبار "غیر مرئی در آمد بر آمد" کے نام سے موسوم ہیں جو بذاتِ خود اشیا کی تجارت سے جُدا ہوتی ہیں۔ وہ مبادلے جو خصوصاً اشیا کے ہوتے ہیں، اور جن کا سلسلہ ہر وقت، برابر مختلف ممالک کے درمیان جاری رہتا ہو جس کے باعث دیگر ممالک کے سکّوں سے کسی مُلک کے سکّے کو تبدیل کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہو، غیر مرئی در آمد بر آمد سے جُدا ہیں۔

جب دو مُلکوں کی معیاری اکائی سونے کی ہو یعنی جب ان کے یہاں کے زر کی معیاری اکائی سونے کے ایک خاص وزن کے مطابق ہو، تب بھی ہمیشہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دونوں مُلکوں کے مروّج سکّوں کے درمیانی مبادلے کا حقیقی نرخ وہی ہو جو دونوں کی معیاری اکائی کے متناسب سونے کے وزن کے لحاظ سے ان کا نرخ پڑتا ہو۔ مثال کے طور پر ۸۶ر۴ ڈالر ایک پونڈ کے برابر ہو لیکن اس وقت تک دونوں میں کوئی حقیقی مبادلہ نہیں ہو سکتا جب تک ایسے لوگ نہ ملیں جن کے پاس ڈالر ہوں اور وہ پونڈ چاہتے ہوں اور جن کے پاس پونڈ ہوں اور انھیں ڈالر کی ضرورت ہو۔ مگر اس کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ کسی خاص دِن یا مہینے میں ریاست ہائے متحدہ کے باشندے انگلستان میں اپنا قرض ادا کرنے کے لیے جتنے پونڈ چاہیں گے وہ انگلستان کے باشندوں کے ریاست ہائے متحدہ میں قرض چکانے کے لیے درکار شدہ ڈالر کا ۸۶ر۴ گنا ہو اور لازمی طور پر برابر۔ اور مبادلے کی حقیقی شرح مبادلے کی مساوی شرح کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہے جو رسد اور طلب کے مطابق طے ہوتی ہو بالکل اسی طرح جیسے کسی چیز کے اصلی دام اس کے حقیقی قدر کے گرد گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ اگر کسی دن انگریز در آمدی تاجروں کو

ریاست ہائے متحدہ میں اپنا حساب چکانے کے لیے جتنے ڈالر کی ضرورت ہو وہ اُس رقم سے زائد ہو جائے جو ریاست ہائے کے درآمدی تاجروں کو انگلستان میں اپنا حساب صاف کرنے کے واسطے پونڈ کی شکل میں درکار ہو، تب اس صورت میں ڈالر کی مانگ رسد سے بڑھ جائے گی لہٰذا برطانوی درآمدی تاجر کو ۸۶ر۴ ڈالر کے بدلے ایک پونڈ سے زیادہ ادا کرنا پڑے گا۔ یا بہ الفاظ دیگر ایک پونڈ کے بدلے اسے صرف ۸۰ر۴ ڈالر ملیں گے۔

جب سونے کا معیار رائج تھا تو اس قسم کا گھٹنا بڑھنا اس امر کے باعث محدود رہتا تھا کہ آخری صورت میں برطانوی درآمدی تاجر ریاست ہائے متحدہ میں اپنا قرض ادا کرنے کے واسطے سونا بھیج سکتا تھا جس کے عوض اسے مبادلے کے مساوی نرخ ملتے یعنی ۸۶ر۴ ڈالر۔ دراصل سونا اس وقت بھیجا جاتا تھا جب برطانیہ سے قرض کی زیادتی کی وجہ سے مبادلے کا نرخ اس قدر گر جاتا کہ برطانوی درآمدی تاجر کو سونے کی جہاز رانی کا بیمہ اور محصول ادا کرنے کے بعد بھی سونے کی ادائگی سستی پڑتی۔

جب برطانیہ سے امریکہ کی درآمدی اشیا میں متناسب زیادتی نہ ہوتی۔ سال کی کچھ خاص فصلوں کے دوران میں ریاست ہائے متحدہ سے بڑی مقدار میں روئی اور گیہوں برطانیہ میں درآمد ہوتے۔ ایسی فصلوں کے زمانے میں مبادلے کا نرخ ہمیشہ برطانیہ کے خلاف رہتا۔ یعنی ۸۶ر۴ ڈالر کی ادائگی کے لیے ایک پونڈ تین پنس درکار ہوتے یا جس طرح برطانیہ میں کہا جاتا تھا کہ برطانوی درآمدی تاجر کو ایک پونڈ کے عوض ۸۰ر۴ ڈالر ملتے، مگر مبادلے کے نرخ میں کبھی شدید یا مستقل قسم کا گھٹاؤ بڑھاؤ نہیں ہوا کیوں کہ دونوں طرف کی رقمِ ادائگی کا میزان تقریباً برابر رہتا، (سونے کے وزن میں) اور وقتی گھٹاؤ بڑھاؤ سونے کے تبادلے کے ذریعے طے ہو جاتا۔

ایک اور بات قابلِ غور ہے کہ مندرجہ بالا مثالیں صرف دو ممالک کے آپس کے لین دین کی ہیں۔ اگرچہ عملی طور پر تمام ملکوں کی ادائگی کے واصل باقی پیشِ نظر لائے گئے ہیں۔ برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ اور فرانس ان تین ممالک کی مثال اگر پیش کی جائے تو صورتِ حال یہ ہوگی:۔

برطانیہ کو ریاست ہائے متحدہ کے قرض کی ادائگی کے لیے ڈالر کے واصل باقی کی ضرورت ہو مگر اس کے پاس فرینک فاضل ہو جو اُسے فرانس سے تجارت کے دوران میں حاصل ہوئے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ کو فرانس کا قرض چکانے کے لیے فرینک درکار ہیں مگر اس کے پاس پونڈ کی افراط ہو جو برطانیہ سے کاروبار کے دوران میں حاصل ہوئے ہیں۔

فرانس کو برطانیہ کے قرض کی ادائگی کے لیے پونڈ درکار ہیں مگر اس کے پاس فاضل ڈالر ہیں جو ریاست ہائے متحدہ سے تجارت کے دوران میں حاصل ہوئے ہیں۔

ایسی صورت میں برطانیہ اپنے فاضل فرینک فرانس کے فاضل ڈالر سے بدل سکتا ہے، جس سے وہ ریاست ہائے

متحدہ کا قرض ادا کر دے گی، ریاست ہائے متحدہ اپنے فاضل پونڈ فرانس کے ہاتھ فروخت کر کے فرینک خرید کر سکتا ہو اور فرانس کا حساب چکا سکتا ہو۔ فرانس کے پاس پونڈ ہو جائیں گے جس سے وہ برطانیہ کا حساب صاف کر سکتا ہو۔ دنیا کے تمام ممالک کے درمیان یہ سلسلہ جاری کیا جا سکتا ہو بہ شرطیکہ ہر ملک کا قرض اور فاضل زر کا مجموعہ برابر ہو۔ اس سے کوئی بحث نہیں ہوگی کہ کسی خاص ملک کے سکے کا دیگر ممالک کے سکوں سے کیا تعلق کیوں کہ قرض کی زیادتی دوسرے ممالک کے ذریعے ادا ہو سکتی ہو۔

اور اگر دو ممالک میں تجارت کا بہت زبردست واصل باقی ہو تب بھی کوئی دقت نہ ہوگی۔ مثلاً برطانیہ کا فاضل برآمد ریاست ہائے متحدہ میں ہو اور وہاں وہ سود پر لگا دیا گیا ہو۔ عام طور سے ہر ملک کی صنعتی ترقی کے زمانے میں ایسا ہوتا ہو۔ برطانیہ نے صنعتی عروج میں دنیا کی رہبری کی۔ چناں چہ اس کی مشینوں اور اشیائے اصل کے لیے ہر ملک میں بہ آسانی بازار مل گئے۔ یہ اشیا ریاست ہائے متحدہ میں ایک طرح سے فروخت تو کی جاتیں جیسے وہاں کی کسی ریل کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دی جاتیں۔ مگر (اس کے باوجود) برطانوی برآمدی تاجر یا انگریز سرمایہ دار یہ نہیں چاہتے کہ ریاست ہائے متحدہ میں ادا کیے ہوئے ڈالر پونڈ کی شکل میں انگلستان بھیج دیے جائیں۔ بلکہ وہ ان ڈالر کو ریاست ہائے متحدہ ہی میں رکھ کر وہاں کی کمپنیوں میں حصّے خرید لیتے۔ چناں چہ برطانیہ نے اس زمانے میں امریکہ اور دیگر ممالک میں کافی مقدار میں اشیا برآمد کیں جن کی قیمت غیر ملکوں سے درآمد شدہ اشیا کی قیمت سے کہیں زیادہ تھی مگر اس کے باوجود مبادلے میں کسی قسم کی دقت نہیں ہوئی۔ پہلی جنگ کے بعد اسی قسم کی حالت جرمنی میں پیدا ہو گئی تھی جب وہاں کی برآمد درآمد سے کہیں زیادہ ہو گئی۔ مگر واصل باقی یا تو بیلنس ہو جاتا یا دوسرے ملکوں سے زائد ہو جانے پر جرمنی میں سود پر لگا دیا جاتا۔ خصوصاً ریاست ہائے متحدہ کی تو بڑی بڑی رقمیں جرمنی میں سود پر لگا دی جاتیں۔ مبادلے کے نقطۂ نظر سے جرمنی میں فروخت کی ہوئی اشیا سے حاصل کیے ہوئے مارک کو ڈالر سے بدل دیتے جو سود پر لگانے والے جرمنی روانہ کرنا چاہتے۔ بالفاظ دیگر ریاست ہائے متحدہ کا سود پر لگانے والا وہیں کے برآمدی تاجر سے اشیا برائے برآمد خرید کر جرمنی میں ان کے فروخت سے حاصل کیے ہوئے مارک کا حق دار بن جاتا اور انھی مارک سے وہ جرمنی کی کمپنیوں میں حصّے خریدتا۔

یہ سود پر لگانے کا طریقہ محض تبادلے کی دقتوں سے بچنے کی غرض سے نہیں اختیار کیا جاتا۔ لیکن یہ سمجھنا ضروری ہو کہ خواہ وقتی ہی طور پر ہو مگر ان دشواریوں کو برآمدی اشیا کی قیمت نہ طلب کر کے کس طرح دور کرنا ممکن ہو۔ چاہے وہ ادائگی نہ طلب کرنے کی شکل محض ایک عوضی ہی ہو یا اپنی ملکیت کا زر اس ملک کو قرض دیا جائے جو قرض دار ہو۔ عملی طور پر بے شک یہ کاروبار عموماً دو شخصوں کے درمیان انجام پاتا ہو۔ ایک شخص اشیا برآمد کرتا ہو دوسرا سود پر زر لگاتا ہو مگر بینک اپنی حیثیت سے ان دونوں کے لین دین کو قریب تر کر دیتا ہو۔

پہلی جنگِ عظیم سے قبل کئی سال تک تمام اہم تجارتی ممالک میں سکے بالکل غیر گئے تھے یعنی خاص وزن کے سونے کے

سکوں سے ان کا تعلق بہلا نہیں تھا۔ اسی وجہ سے ایک یا دوسری طرف سے قرض کی عارضی زیادتی کے باعث تھوڑے بہت گھٹاؤ بڑھاؤ کے باوجود ان ملکوں کے سکوں کا آپس میں بڑھا ہوا تعلق قائم رہا۔ ملکی تجارت اور مختلف ممالک کی درمیانی تجارت میں بہت کم فرق تھا، اگرچہ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ برآمد کرنے والا جس سکے میں فروخت کرتا ہے بالآخر اشیا اسی سکے میں نہیں بلکہ دوسرے سکوں میں بکتی ہیں مگر ایک سے دوسرے سکے کا تبادلہ اس قدر آسان اور محفوظ تھا کہ اس بات کی اہمیت لامحالہ کم ہوگئی تھی، مگر جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد لوگوں کو محسوس ہوا کہ مبادلہ اور سکوں کے نظام پر کوئی بہت بڑی بلا نازل ہوگئی ہے۔ ٹھیراؤ اور حفاظت کی بجائے بہت ہی شدید قسم کا مستقل گھٹاؤ بڑھاؤ اور خطرہ پیدا ہوگیا۔ کم و بیش خود بہ خود حرکت کرنے والے مبادلے آزادی سے کام کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے عائد کیے ہوئے کنٹرول اور پابندی کا شکار ہوگئے اور بعض بعض اوقات پر تو تبادلہ تقریباً بالکل غیر ممکن ہوگیا۔

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قدروں کے معیار اور جداگانہ ممالک کی معیاری اکائیوں کے درمیان تعلق قائم کرنے کا اب کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اب از سر نو نئے قوانین اور اصول عمل پذیر ہیں۔ اس کے باوجود، جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے یہ نئے قوانین زر کی مخصوص بنیادی اور عملی پہلوؤں پر کوئی اثر نہیں ڈالتے۔

مسائلِ حاضرہ (غیر ممالک)

ربڑ کی پیداوار

ترجمہ از:———— ادارہ

جاپان کی شکست کے بعد مغربی ملکوں کے لیے مشرق بعید کے ربڑ پیدا کرنے والے علاقوں کا دروازہ کھل گیا ہے۔ آج سے کچھ پہلے دُنیا کے قدرتی ربڑ کا کوئی ۹/۱۰ حصہ مشرق بعید ہی سے حاصل کیا جاتا تھا۔ بقیہ ۱/۱۰ حصہ زیادہ تر لنکا سے اور کچھ لاطینی امریکہ خاص کر برازیل اور مرکزی افریقہ سے آتا تھا۔ جنگ سے پہلے کے پانچ سال میں دُنیا کی مجموعی ربڑ کی پیداوار کوئی ۱۰ لاکھ ٹن سالانہ تھی۔ جنگ کے دوران میں اُن ملکوں کی ربڑ کی پیداوار جہاں متحدہ اقوام کی رسائی ہو سکتی تھی، ۲۰ لاکھ ٹن سالانہ تک بڑھائی گئی۔ اس ربڑ کی قیمت لازماً جنگ سے پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ جب مشرق بعید سے بڑی مقدار میں ربڑ مہیا ہونے لگے گا تو دورانِ جنگ کے مقابلے میں ربڑ کی قیمت بہت گھٹ جائے گی جس وقت جاپان لڑائی میں شامل ہوا تھا اُس وقت برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پاس کافی مقدار میں قدرتی ربڑ کے ذخیرے جمع تھے۔ لیکن اب یہ ذخیرے قریب قریب ختم ہو چکے ہیں اور موجودہ سپلائی کافی نہیں ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کیمیائی ربڑ کے پلانٹ تعمیر کیے گئے ہیں جو ۱۲ لاکھ ٹن سالانہ کے حساب سے کیمیائی ربڑ پیدا کر سکتے ہیں اگرچہ فی الحال اُن پلانٹوں سے صرف ۸ لاکھ ٹن سالانہ کے حساب سے ربڑ پیدا کیا جا رہا ہے۔ جنگ سے پہلے پوری دُنیا میں کوئی ۹ لاکھ ٹن قدرتی ربڑ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ فنی ترقیوں کے

باوجود کیمیائی ربڑ قدرتی ربڑ کا اچھا نعم البدل نہیں ثابت ہو سکا ہے۔ محض کچھ خاص ضرورتوں میں کیمیائی ربڑ قدرتی ربڑ کے مقابلے میں یکساں طور پر مفید پایا گیا ہے۔ مثلاً کچھ خاص قسم کے ٹائروں میں قدرتی ربڑ کے ساتھ کیمیائی ربڑ کی آمیزش ضروری سمجھی جاتی ہے۔

چوں کہ کیمیائی ربڑ میں فنی خرابیاں پائی جاتی ہیں اور پھر اُس کے دام بھی زیادہ ہوتے ہیں اس لیے قدرتی ربڑ کی فوری ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ آنے والے چند سال میں ربڑ کی سپلائی آج کی بہ نسبت بہت بڑھ جائے گی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ قدرتی ربڑ کی برآمد تین چار سال کے اندر ۱۵ لاکھ ٹن سالانہ تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ اگر ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنی کیمیائی ربڑ کی پیداوار کو جنگ کے زمانے کی طرح اپنی پوری رفتار پر قائم رکھنے کا فیصلہ کیا تو روس اور جرمنی کی کیمیائی ربڑ کی پیداوار کو چھوڑ کر دنیا کی مجموعی ربڑ کی پیداوار (کیمیائی اور قدرتی دونوں) ۲۷ لاکھ ٹن سالانہ ہوگی۔ جنگ سے پہلے زیادہ سے زیادہ گیارہ لاکھ ٹن ربڑ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ اگرچہ اس وقت ربڑ کی بہت سی ایسی مانگیں پڑی ہوئی ہیں جن کو پورا نہیں کیا گیا ہے اور برآمد شروع ہوتے ہی اُن مانگوں کا ربڑ کی مقدار پر شدید حملہ ہوگا۔ پھر ربڑ کے عام خرچ کے بڑھنے کی بھی امید کی جا سکتی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تین چار سال کے اندر اندر ربڑ کا خرچ ربڑ کی سپلائی کے برابر ہو جائے گا۔ اس لیے کہ مندرجہ بالا اعداد کی بنا پر دیکھا جائے تو دنیا میں خرچ سے کہیں زیادہ ربڑ کے پیدا ہونے کی امید ہے۔ اس لحاظ سے بیش تر صنعتوں سے زیادہ ربڑ کی صنعت کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ کچھ عرصے کی قلت کے بعد مستقل طور پر ربڑ کی افراط ہو جائے گی اور فالتو ربڑ پیدا ہونے لگے گا۔

فوری ضرورت یہ ہے کہ مشرق بعید کے آزاد شدہ مُلکوں سے خاص کر ملایا اور جزائر شرق الہند سے ربڑ کی برآمد کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس ضرورت کے پورا ہونے کا انحصار تین باتوں پر ہے۔ ایک تو یہ کہ ربڑ کے درختوں کی موجودہ حالت کیا ہے اور ضروری سامان مہیا ہیں یا نہیں۔ کتنے مزدور مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ آلات اور غذائی اشیا اور کپڑے وغیرہ ربڑ والے مُلکوں میں مہیا کیے جائیں وغیرہ۔

جو تھوڑی بہت اطلاعات موصول ہوئی ہیں اُن کی بنا پر یہ معلوم ہوا ہے کہ ربڑ کے سلسلے میں جنگ کی تباہ کاریاں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ ملایا میں تھوڑے سے علاقوں میں ربڑ کے درخت اُکھاڑ کر پھینک دیے گئے ہیں اور اُن کی جگہ پر دیگر چیزیں کاشت کی جانے لگی ہیں۔ ایندھن مہیا کرنے کے لیے بھی ربڑ کے درخت کاٹے گئے ہیں۔ چوں کہ جاپانی اپنی ضروریات کے تحت ربڑ کی مجموعی پیداوار کا محض تھوڑا سا ہی حصہ استعمال کر سکتے تھے اس لیے زیادہ تر باغات خاص کر یورپین باغات کو تباہ نہیں کیا گیا ہے۔ صرف یہ کہ اُن کی خبر نہیں لی گئی اور وہاں بہت سے جنگلات اُگ آئے ہیں۔ اس طرح کافی صفائی کرنے کی ضرورت ہے۔ چوں کہ ایک عرصے تک ربڑ کے درختوں سے کام نہیں لیا گیا اس لیے عارضی طور پر ان سے ربڑ بہت زیادہ

مقدار میں حاصل کیا جاسکے گا۔ مجموعی حیثیت سے باغات ایسی حالت میں ہیں کہ ربڑ کی سپلائی تیزی کے ساتھ بڑھائی جاسکتی ہے۔ یہی حال جزائر شرق الہند کے باغات کا ہے۔

ابھی یہ بتانا مشکل ہے کہ ربڑ کتنی مقدار میں مہیا ہوسکے گا۔ جنگ سے پہلے ملایا کے ربڑ کے باغات میں زیادہ تر ہندستانی مزدور کام کرتے تھے۔ اس کے بعد چینی مزدوروں کا نمبر آتا تھا۔ جاپانیوں نے جب قبضہ کیا تو زیادہ تر مزدور وہیں رہ گئے لیکن اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ بے شمار ہندستانی مزدوروں کو جاپانیوں نے اپنے مزدور گروہوں میں بھرتی کرلیا اور انھیں سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر کے کام میں لگادیا۔ کچھ مزدور زراعت میں لگ گئے۔ جو مزدور ربڑ کے باغات میں رہ گئے اُن کی حالت یقیناً بہت خراب رہی ہوگی۔ باہر سے مزدوروں کی آمد غالباً بہت کم ہوگئی ہے اور جو مزدور ربڑ کے باغات میں کام کرتے رہے اُن کی صحت مفلسی اور بھوک کی وجہ سے یقیناً بہت گر چکی ہوگی۔ خود ملایا کے مزدور البتہ کچھ زیادہ منتشر نہیں ہوئے۔ غرض ملایا میں ربڑ کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے سب سے پہلے کافی مزدوروں کے مہیا کرنے کا سوال ہے۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جسے حل نہ کیا جاسکے۔ خاص کر اگر ہندستان سے مزدور بُلائے جائیں تو یہ مشکل آسانی سے دُور ہوسکتی ہے۔ کچھ اطلاعات ایسی آئی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ جزائر شرق الہند میں مزدوروں کا مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ بہرحال عارضی طور پر ربڑ کی برآمد میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں مزدوروں کی کمی ایک اہم دقت پیدا کرے گی۔

تیسری رُکاوٹ جو راہ میں حائل ہے، یہ ہے کہ سامان و غذا اور دیگر راست استعمال کی اشیا کا ربڑ پیدا کرنے والے علاقوں میں پہنچایا جانا ضروری ہے۔ دُوسرے پیشوں سے مزدوروں کو ہٹا کر ربڑ کی صنعت میں لگانے کے لیے اِن اشیا کا کافی مقدار میں مہیا ہونا ضروری ہے۔ ربڑ پیدا کرنے والے علاقوں میں غذا کی سپلائی کا کیا حال ہے اس کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ کافی غلہ درآمد کرنے کی ضرورت ہے۔ برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے کپڑے اور دیگر صنعتی اشیا کا اُن علاقوں میں بھیجا جانا ضروری ہوگا۔ لیکن چوں کہ اِن اشیا کی اس وقت عام کمی پائی جاتی ہے اس لیے اُس کا اثر اُن علاقوں سے ربڑ کی برآمد پر پڑنا لازمی ہے۔

مشرق بعید کے ملکوں کے بارے میں دورانِ جنگ میں تفصیلی معلومات نہیں حاصل تھیں لیکن جو کچھ معلوم تھا اُس کی بِنا پر لندن میں کچھ پلان بنائے گئے تھے جن کا مقصد ربڑ کی پیداوار کو بڑھانا اور اس کی از سرِ نو درستگی کرنا تھا۔ اس صنعت کے مالکوں نے منتظم کاروں اور مزدوروں کی قلت اور راست استعمال کی کمی کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا کہ اس صنعت کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے اجتماعی طریقے اختیار کیے جائیں۔ "ربڑ پیدا کرنے والوں کی انجمن" نے اس مقصد سے ایک اجتماعی تنظیم وجود میں لانے کی تجویز پیش کی۔ اس انجمن میں صرف ربڑ اسٹیٹ کے مالکان شامل تھے۔ اور قائم شدہ اجتماعی

تنظیم کا نام " ملایا کے ربڑ اسٹیٹ کے مالکوں کی کمپنی " رکھا گیا۔ اس کے حوالے تین کام کیے گئے۔ (۱) جو اشیا اور مزدور اور منتظم کار دست یاب ہو سکتے ہیں اُن کی ربڑ اسٹیٹوں میں مناسب طور پر تقسیم کرنا۔ (۲) پیداوار پر پوری توجہ صرف کر کے اُن سے پُورے پُورے طور پر کام لینا۔ (۳) جو مالکان پیداوار بڑھانے کے لیے اپنے سامان اور مزدور و منتظم کار کمپنی کے حوالے کر دیں اُن کو معاوضہ دینا۔ اس اسکیم کو حکومت کی رضامندی بھی حاصل ہوگئی ہے لیکن اس کے تحت صرف سو ایکڑ یا اُس سے زیادہ کے اسٹیٹ آتے ہیں۔ سو ایکڑ سے کم کے اسٹیٹوں کی حالت دوبارہ بحال کرنے کی ذمّے داری حکومت نے اپنے سر لی ہے۔

ملایا یا جزائر شرق الہند سے آیندہ کتنا مزید ربڑ باہر بھیجا جاسکے گا اس کے متعلق تفصیلی اندازہ لگانے کے لیے ہمارے پاس اعداد و شمار نہیں ہیں لیکن حالات بتاتے ہیں کہ وہاں سے ربڑ کی برآمد میں مسلسل اضافہ ہی ہوگا پہلے تو وہ ذخیرے برآمد کیے جائیں گے جو پہلے سے موجود ہیں اور جس کے متعلق غیر سرکاری اندازہ یہ ہے کہ ایک لاکھ سے لے کر دو لاکھ ٹن ربڑ اس وقت حاصل کیا جاسکتا ہے۔ چند مہینوں کے اندر اندر نئے پیدا کیے ہوئے ربڑ بھی برآمد کیے جاسکیں گے فوراً ہی تو یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ جنگ سے پہلے کی مقدار میں ربڑ پیدا ہونے لگے گا لیکن سال بھر کے اندر یا اس سے کم عرصے میں بھی ربڑ کی برآمد کو بڑھا کر قدرتی ربڑ کی کمی کو دور کیا جاسکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ربڑ کی پیدائش اور اس کی برآمد میں تیز رفتاری پیدا کرنے کے لیے خاص توجہ کی ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ربڑ کی صنعت کے متعلق ایک عام مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور یہ مسئلہ اس جنگ کے زمانے میں پیدا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ اب کیمیائی ربڑ کی پیدائش سے دُنیا میں ربڑ کی فالتو پیداوار ہونے لگے گی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے اب تک کیمیائی ربڑ کی پیدائش سے متعلق اپنی پالیسی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ بہرحال وہ پالیسی جو کچھ بھی ہو لیکن قدرتی ربڑ کے پیدا کرنے والے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اب ہر سال بارہ لاکھ ٹن کیمیائی ربڑ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ پھر وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ کیمیائی ربڑ کی پیدائش کے اخراجات کے بہت کم ہو جانے کا امکان ہے۔ عام استعمال کے کیمیائی ربڑ کی خوبی میں بھی اضافہ ہونے کی امید ہے۔ اگر قدرتی ربڑ پیدا کرنے والوں نے اس طرف توجہ نہیں کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عارضی طور پر انھیں خوب منافع ہوگا لیکن آگے چل کر ان کے منافع کے ذرائع ختم ہو جائیں گے چناں چہ اس سلسلے میں ایک ہی معقول پالیسی اختیار کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ قدرتی ربڑ پیدا کرنے کے اخراجات کم کیے جائیں۔ کیمیائی ربڑ کی پیدائش سے پہلے قدرتی ربڑ کو جو اجارہ حاصل تھا وہ اب باقی نہ رہا۔ مستقبل میں قدرتی ربڑ کی زیادہ مانگ ہوگی یا کیمیائی ربڑ کی، اس کا انحصار قیمت پر ہے اور اس کے بہتر استعمال۔

ماہرین کا خیال ہو کہ قدرتی ربڑ کی صنعت میں ابھی تک پیدائش کے اخراجات کے کم ہونے کی بڑی گنجایش ہو۔ اس سلسلے میں چار طریقوں سے اخراجات کم کیے جا سکتے ہیں۔ پیدائش کے فنی اخراجات میں کمی کرنا ابتدائی پروسسینگ (PROCESSING) کے خرچ کو گھٹانا انتظام میں اجتماعیت اور مرکزیت قائم کرنا اور سرمائے میں بھی اجتماعیت اور مرکزیت قائم کرنا۔

گزشتہ چند سال میں پیدائش کے فن میں کافی ترقی ہوئی ہو اس کو اختیار کرکے پیدائش کے اخراجات گھٹائے جا سکتے ہیں لیکن اس کا ابھی تک بہت کم استعمال کیا گیا ہو۔ موجودہ درختوں میں سے زیادہ تر درخت وہی ہیں جو پہلے پہل لگائے گئے تھے ۱۹۴۰ء کے اخیر میں دُنیا کے نو خاص ربڑ پیدا کرنے والے مُلکوں میں ۹ء۸ ملین ایکڑ زمین میں ربڑ کے درخت موجود تھے ۱۹۳۹ء میں صرف پانچ لاکھ پینتالیس ہزار ایکڑ زمین میں دوبارہ درخت لگائے گئے۔ ربڑ کے پروسسینگ میں بھی نئے طریقے اختیار کرکے بہت کفایت کی جا سکتی ہو۔ دوسرے یہ کہ ربڑ جب ایک مُلک سے دوسرے ملک میں بھیجا جائے تو رقیق مادے کی شکل میں — اس سے بھی کفایت ہو سکتی ہو۔

مالی اور انتظامی امور میں بھی بہتر طریقہ اختیار کرکے کفایت پیدا کی جا سکتی ہو۔ یہ ہر کسی کو معلوم ہو کہ ربڑ کی کاشت بالکل غیر منظم طور پر مختلف شکلیں اور مختلف سائز اختیار کر چکی ہو اب تک یہ چیز کچھ لابدی سی تھی لیکن انتظام کے نقطۂ خیال سے دیکھا جائے تو یہ کوئی اچھی صورتِ حال نہیں ہو۔ چھوٹے چھوٹے باغات اور مختلف اسٹیٹوں کو مِلا کر بڑے بڑے اسٹیٹ اور باغات قائم کرنا ضروری ہو گیا ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ربڑ کی پوری صنعت کو متعدد بڑے بڑے اسٹیٹوں میں تقسیم کر دیا جائے کچھ متوسط سائز کے باغات بھی کافی کارکردگی کے حامل رہے ہیں لیکن بہر حال چھوٹے چھوٹے باغات کو مِلا کر نئی گروہ بندی کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر مالی لحاظ سے بھی مرکزیت اور اجتماعیت قائم کرنے کی ضرورت ہو۔ اور وہ اس طرح ہو سکتا ہو کہ بہت سے ڈائرکٹروں اور بورڈوں کو ہٹا کر چند بورڈ رکھے جائیں۔

("دی اکانومسٹ")

معاشی صورتِ حال

۱۔ تھوریم
۲۔ مشرق وسطیٰ سے ہندستان کی تجارت
۳۔ بندرگاہوں کی تعمیر
۴۔ تھوڑی غذا اور زیادہ غذائیت
۵۔ جرمنی اور جاپان میں کپڑے کی صنعت

تھوریم | جوہری بم کی ایجاد کے بعد سے تھوریم کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہو۔ اور اسی لحاظ سے ریاست ٹراونکور کے معدنی پوزیشن کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوگیا ہو جہاں سنہ ۱۹۳۶ء میں دنیا بھر کے تھوریم کا ۸۸ فی صدی حصّہ نکالا گیا تھا۔ اِس وقت دنیا بھر میں سب سے زیادہ تھوریم ریاست ٹراونکور ہی میں نکالا جاتا ہو۔ یہ معدنی شو جوہری طاقت کے تجربات میں ایک اہم ترکیبی جُز کا کام دیتی ہو جب سے ریاست ٹراونکور میں مونے زائٹ (MONAZITE) (یعنی تھوریم دینے والی معدنی شو) کی دریافت ہوئی ہو تبھی سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اس کی خریدار ہو لیکن اب اس معدنی شو کی قدر و قیمت پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی ہو چناں چہ اس سلسلے میں دو خبریں سُننے میں آئی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ ملک معظم کی حکومت، ٹراونکور کی حکومت پر دباؤ ڈال رہی ہو کہ تھوریم کو ہمارے حوالے کرنے کے لیے کوئی معاملہ طے کرلو۔ دوسری خبر یہ ہو کہ برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ کے درمیان ٹراونکور کے تھوریم کے بارے میں کوئی سمجھوتہ ہوگیا ہو۔ معاملہ طے کرنے میں ریاست ہائے متحدہ کا کوئی کاروباری آدمی ہو جو پیش پیش رہا ہو اور اسی کے ذریعے ریاست ہائے متحدہ نے برازیل کے تھوریم کا معاملہ طے کیا تھا جو تھوریم کی پیداوار کے لحاظ سے دنیا میں دوسرے نمبر پر ہو۔

ہندستانی حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہو کہ چوں کہ ابھی یہاں جوہری بموں کے تیار ہونے کا کوئی امکان نہیں ہو اس لیے اگر تھوریم غیر ملکوں میں بھیجا جائے تو کوئی ہرج کی بات نہیں ۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہو کہ یہ معدنی شو

ایسے حلقوں میں نہ پہنچ جائے جن سے یہ خطرہ ہو کہ وہ اُسے ہندستان کے خلاف یا بین الاقوامی امن و امان میں خلل پیدا کرنے کے لیے استعمال کریں گے۔ ہمارا خیال ہو کہ بین اقوامی امن و امان کے نقطۂ نظر سے اگر تھوریم کی برآمد پر پابندی لگائی جائے تو سب سے پہلے اُسے امریکہ اور برطانیہ ہی کے ہاتھوں میں پڑنے سے روکنے کی کوشش کی جائے۔ ہندستانی حلقوں میں اس بات کی بھی خواہش ظاہر کی جارہی ہو کہ ایسا نہ ہو برطانیہ اور امریکہ کے سیاسی دباؤ میں آکر ٹراونکور کی ریاست کم معاوضے پر معاملہ طے کرلے۔ اگر ایسا ہوا تو بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی۔ چناں چہ معاملہ طے کرنے میں اِس بات کا خیال رکھنا ضروری ہو۔

مشرقِ وسطیٰ سے ہندستان کی تجارت

مسٹر جے۔ اے۔ رحیم (آئی۔ سی۔ ایس) حکومتِ ہند کے تجارتی کمشنر (مقیم اسکندریا) نے حال ہی میں شعبۂ تجارت کے سامنے جو رپورٹ پیش کی ہو اُس سے اندازہ ہوتا ہو کہ مشرقِ وسطیٰ ہندستانی تجارتی مال کے لیے بہت بڑے بازار کا کام دے سکتا ہو۔ جاپان، جرمنی اور اٹلی کے زوال کے بعد مشرقِ وسطیٰ کی تجارتی دنیا میں جو خلا پیدا ہوگیا ہو اُس کو پُر کرنے کے لیے ہندستان ہی سب سے زیادہ موزوں ہو۔ اس لیے کہ ہندستان صنعتی ہونے کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ سے قریب بھی ہو۔ مشرقِ وسطیٰ میں اس وقت صرفی اشیا (CONSUMER GOODS) کی بڑی کمی محسوس کی جارہی ہو۔ جوٹ کی بنی ہوئی اشیا کی مانگ عام ہو۔ مصر میں جوٹ کی بنی ہوئی چیزوں کے بغیر روئی کو اوٹنے کے کارخانوں تک نہیں لے جایا جاسکتا اور نہ پھر وہاں سے دوسرے ملکوں میں بھیجنے کے لیے روئی کے پشتارے باندھے جاسکتے ہیں۔ ہندستان اس لیے دوسرے ملکوں کو جوٹ بھیجنے سے معذور ہو کہ غلّے کی کمی کے سبب جوٹ کی بجائے غذائی اشیا کی کاشت ہونے لگی ہو۔

مشرقِ وسطیٰ میں جن ہندستانی اشیا کی خاص ضرورت ہو اور جن کے لیے وہاں وسیع بازار پیدا ہوگئے ہیں وہ یہ ہیں:۔ چائے، کافی، اصلی ریشم اور مصنوعی ریشم کے کپڑے اور دیگر چیزیں، سوتی کپڑے، سیمنٹ، لوہے اور اسٹیل کی بنی ہوئی چیزیں، کاٹھ، چمڑے کی بنی ہوئی چیزیں، لوہے کے برتن، شیشے کے برتن، پارچون اور کاغذ کی چیزیں، صابن، آرائش و زیبائش کے سامان، عطریات وغیرہ، کھیل کے سامان، بجلی کی چیزیں، وغیرہ وغیرہ۔

کاٹھ کی ضرورت ترکی کو چھوڑ کر مشرقِ وسطیٰ کے تمام ملکوں میں ہو۔ مصر میں چمڑے کی بنی ہوئی چیزوں کی مانگ ہو۔ فلسطین میں بھی ان چیزوں کی مانگ یقینی طور پر بڑھے گی۔ مصر کے سگریٹ کے کارخانوں کو ہندستان کے تمباکو کی حاجت ہو۔

جہاں تک سوتی کپڑوں کا تعلق ہو ہندستان اس وقت خود اپنی ضروریات پوری نہیں کرسکتا چناں چہ مشرقِ وسطیٰ میں سوتی مال کے بھیجے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سیمنٹ بھی ہندستان کی اپنی نئی تعمیری ضروریات کے پیشِ نظر باہر نہیں بھیجا جاسکتا۔

غرض اِس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں ہندستانی صنعتی اور تجارتی مال کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے لیکن ہندستان کی صنعتی ترقی کے رُکے ہوئے ہونے کی وجہ سے مال اُن مُلکوں میں نہیں بھیجا جاسکتا۔ بہرحال موجودہ عارضی صورتِ حال کے دُور ہونے کے بعد یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے بازار ہندستان کے لیے بہت مفید اور وسیع ثابت ہوں گے۔ بعض معاشیاتی حلقوں کی رائے میں ہندستان کو دُوسرے مُلکوں کے مقابلے سے خوف نہیں کھانا چاہیے اس لیے کہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں ہمیشہ مختلف اور متعدد مُلکوں کے صنعتی اور تجارتی مال کی کھپت ہوتی رہی ہے۔ چناں چہ دُوسرے مُلکوں کے مقابلے کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ ہندستان اُن بازاروں سے محروم ہوجائے گا۔ مانگیں اتنی زیادہ ہیں کہ دُوسرے مُلکوں کے مقابلے کے باوجود ہندستانی مال کے لیے کافی گنجایش رہے گی۔ لیکن اِس سلسلے میں دو تین باتوں کا خیال کرنا بے حد ضروری ہے اور وہ یہ کہ مقابلے کی صورت میں ہندستانی مال کی جُملہ خوبیوں میں اضافہ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ برآمد کی جانے والی تجارتی اشیا کو چھانٹ کر مختلف درجوں میں تقسیم کرنا لازمی ہوگا اور پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ مال کی پیکنگ کی طرف خاص خیال رکھنا ہوگا۔ باہر جانے والے ہندستانی مال کے خلاف دو شکایتیں بہت عام ہیں۔ ایک تو یہ کہ مال کو چھانٹا نہیں جاتا اور یونھی بھیج دیا جاتا ہے ـــــ دُوسرے پیکنگ اچھی نہیں ہوتی۔ ان دو اہم خرابیوں کو دُور کیے بغیر غیر مُلکی بازاروں میں ترقی یافتہ مُلکوں کے مال سے ہندستان کے لیے مقابلہ کرنا دُشوار ہوجائے گا۔

بندرگاہوں کی تعمیر

جنگی نقل و حمل کے شعبے کی طرف سے جو بین شعبے جاتی کمیٹی مقرر ہوئی تھی اس نے حال ہی میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جنگ کے زمانے میں ہندستان کی بندرگاہوں کی جو ترقی و توسیع ہوئی ہے وہ بعد از جنگ کے پہلے پانچ سال کی غیر مُلکی تجارت کا بوجھ برداشت کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ نقل و حمل کی پالیسی کمیٹی کی سفارش کے مطابق ایک (ٹیکنیکل) بندرگاہ کمیٹی بنائی گئی ہے جو ہندستان کی بندرگاہوں کی توسیع و ترقی کے مسئلے پر غور کرے گی۔ یہ کمیٹی اس بات کی تحقیقات کرے گی کہ ہندستان کے مشرقی ساحل پر کسی محفوظ "عمیق سمندری" (DEEP-SEA) بندرگاہ کی ضرورت ہے یا نہیں جس میں بڑے بڑے جہاز قیام کرسکیں۔ یہ کمیٹی یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کرے گی کہ کچھ چھوٹی بندرگاہوں کی توسیع کرکے انھیں بڑی بندرگاہیں بنایا جاسکتا ہے یا نہیں۔ یہ کمیٹی چھوٹی بندرگاہوں کی توسیع کرکے اُن کو جہازوں کی ساحلی آمد و رفت کا بار برداشت کرنے کے قابل بنانے کے لیے کچھ تجویزیں بھی پیش کرے گی۔

نئی بندرگاہوں کی تعمیر یا پُرانی بندرگاہوں کی تعمیر کا سوال اُس وقت تک صاف نہیں ہوسکتا جب تک حکومت

ہندملک میں بعد از جنگ کی صنعتوں کے خطہ وار قیام سے متعلق آخری فیصلوں پر نہ پہنچ جائے۔ اس وقت اگر کلکتہ اور چٹاگانگ کو علاحدہ کر کے دیکھا جائے جو بالکل مشرقی کونے پر واقع ہیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہندستان کے مشرقی ساحل کی ضرورتیں مدراس اور وزیگاپٹم کی صرف دو بندرگاہوں سے پوری نہیں ہوسکتیں۔ مدراس کی بندرگاہ کی بیش از بیش گنجائش (CAPACITY) اس میں کوئی شک نہیں کہ بیس لاکھ ٹن سالانہ ہے لیکن توسیع کی دقتوں اور سمندری طوفانوں کی وجہ سے مدراس سے زیادہ وزیگاپٹم توسیع و ترقی کے امکانات ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ وزیگاپٹم کی سالانہ گنجائش ۹ لاکھ ٹن ہے۔ لیکن اس وقت گہرائی کے کم ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے بحری جہاز بندرگاہ کے اندر نہیں داخل ہوسکتے۔ بندرگاہ کمیٹی نے یہ رائے دی ہے کہ اس بندرگاہ کی اتنی توسیع کی جائے کہ اس کے اندر کم سے کم ۶۰۰ فٹ لمبے اور ۳۰ فٹ تک کے ڈرافٹ والے جہاز داخل ہوسکیں۔ وزیگاپٹم میں اس وقت جہازوں کی مرمت کی تمام آسانیاں فراہم ہیں۔ چناں چہ مستقبل میں یہ بندرگاہ اس کام کا ایک اہم مرکز بن سکتی ہے۔

جہاں تک ہندستان کے مغربی ساحل کا تعلق ہے وہاں کوئی بھی بندرگاہ اتنی بڑی نہیں ہے کہ ۸۰ فٹ ڈرافٹ والے جہازوں کو اپنے اندر لے سکے۔ کراچی اور بمبئی کے درمیان خلیج کچھ میں ایک بڑی بندرگاہ کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اور زیادہ قرینہ اس بات کا ہے کہ اس کے لیے 'سی کا' (SIKA) کے مقام کا انتخاب کیا جائے گا۔ بھٹکل کی چھوٹی بندرگاہ میں توسیع و ترقی کی بہترین گنجائش ہے۔ اگر اس کو ترقی دے کر ایک بڑی بندرگاہ بنا دیا گیا تو میسوڑ کے لیے ایک اچھا خاصا سمندری دریچہ بن جائے گا۔

ہندستان کی بندرگاہوں کے سلسلے میں صحیح قسم کا بعد از جنگ پلان بنانے میں ایک اہم دقت یہ ہے کہ ہمارے پاس کافی اعداد و شمار جمع نہیں ہیں۔ بندرگاہوں کے شعبۂ انتظامیہ سے جو رپورٹیں موصول ہوتی ہیں۔ اُن میں ساحلی اور غیر ملکی آمد و رفت میں کوئی فرق نہیں بتایا جاتا اور تجارتی اشیا کے متعلق تفصیلات کی بھی بڑی کمی ہے۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے ہر بندرگاہ سے کتنے وزن کے جہاز اور تجارتی اشیا گزرتی ہیں اُس وقت تک کسی بندرگاہ سے متعلق صحیح پالیسی کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ چناں چہ بندرگاہ کمیٹی کا دوسرا اہم فریضہ یہ ہوگا کہ کوئی ایسی مجلسِ انتظامیہ وجود میں لائے جو تمام ضروری اعداد و شمار اکٹھا کر سکے۔

کم غذا اور زیادہ غذائیت

غذائی اشیا کی تھوڑی سی مقدار کو زیادہ سے زیادہ صحت بخش اور غذائیت آمیز بنانے کے لیے میجر ب۔ ن۔ خاں صاحب نے کچھ مفید ترکیبیں بتائی ہیں جن کا تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ غذائی کمی کے اِس زمانے میں اگر وہ ترکیبیں کام میں لائی جائیں تو واقعی کم مقدار میں غذا کھا کر بھی انسان اپنی صحت

برقرار رکھ سکتا ہو۔ مسٹر ب۔ ن۔ خاں نے یہ بتایا کہ دال، گوشت اور اناج کو عام طور سے جیسے پکایا جاتا ہو وہ غلط نہیں ہو۔ اس لیے کہ اس طرح پکانے میں پروٹینز، چربی اور کاربو ہائڈریٹ کے جو مفید اور صحت بخش اجزا پائے جاتے ہیں وہ برباد نہیں ہوتے۔ لیکن سبزیوں کو اُبالنے کے دوران میں پروٹین کے کچھ اجزا تلف ہو جاتے ہیں خاص کر اگر اس میں نمک ڈال دیا جائے۔ غذائی اشیا کو دھو کر پکانے میں کافی معدنی اجزا اور حیاتین 'ب' ضائع ہو جاتی ہو تلنے سے اشیا کی غذائیت میں کوئی زیادہ فرق نہیں پیدا ہوتا۔ پکاتے وقت برتن یا ہانڈی کو اوپر سے ڈھک دینا چاہیے۔ خمیر اُٹھانے کا سفوف استعمال کرنے سے حیاتین 'ب' ضائع ہو جاتی ہو۔ ہانڈی میں پانی اتنی ہی مقدار میں ڈالا جائے جتنے کی ضرورت ہو، اُس سے زیادہ نہیں سبزی اور اناج کو بہت زیادہ چھیل کر اور دھو پھٹک کر پکانے سے اس کے اصلی غذائیت والے اجزا تلف ہو جاتے ہیں۔ حال آں کہ قبض کو روکنے کے لیے غذا میں اُن اجزا کا موجود ہونا ضروری ہو۔ ملوں میں آٹا پیسنے اور میدہ چھاننے سے بھی غذائیت ختم ہو جاتی ہو۔

جرمنی اور جاپان میں کپڑے کی صنعت

شکست خوردہ دشمن ممالک سے تاوان کی وصولی کے لیے جو منصوبے بنائے جا رہے ہیں اُن میں اس بات پر خاص زور دیا جا رہا ہو کہ اُن ملکوں میں کپڑے کی صنعت کو جلد بحال کیا جائے۔ برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ خاص طور پر اس میں دل چسپی لے رہی ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ میں بہت زیادہ فالتو روئی جمع ہو گئی ہو جس کا اندازہ ۲۵ لاکھ ٹن ہو۔ اور انگلستان میں فالتو اون موجود ہو۔ چناں چہ یہ دونوں ملک دیکھ رہے ہیں کہ اگر جاپان اور جرمنی میں کپڑے کی صنعت چل پڑے تو اُن کے فالتو روئی اور اون کی کھپت ہو جائے گی۔ لیکن اس سے یہ بھی خطرہ ہو کہ جاپان اور جرمنی کی کپڑے کی صنعت کا برطانیہ اور امریکہ کی کپڑے کی صنعت سے مقابلہ شروع ہو جائے گا۔ بہرحال اس مقابلے سے بچنا غیر ممکن ہو۔ اس لیے کہ جاپان اور جرمنی میں کپڑے کی صنعت دوبارہ بحال ہو کر رہے گی۔

اتحادی ممالک جرمنی اور جاپان سے یہ مطالبہ کریں گے کہ تاوانِ جنگ کی ادائگی کپڑوں کی شکل میں ہونی چاہیے۔ چناں چہ کپڑے کی صنعت کو ترقی دینے کے لیے جرمنی اور جاپان میں جن ضروری اشیا اور سامان کی ضرورت ہوگی غالباً اُن کے اخراجات بھی اتحادی ممالک برداشت کریں گے۔ اس سے اُن کا ایک اور مقصد حل ہوگا اور وہ یہ کہ کپڑے کی عالم گیر قلت کو دُور کرنے میں مدد ملے گی۔ لیکن جرمنی اور جاپان سے جلد ہی کپڑے کی سپلائی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے ابھی کافی عرصہ درکار ہو ابھی تو اُن ملکوں میں سوال یہ درپیش ہو کہ مشین، پلانٹ، مشین کے چھوٹے حصّے، ایندھن اور خام مواد جن کا جنگ کے دوران میں اتنا بھاری نقصان ہوا ہو، کہاں سے لائے جائیں۔ ان چیزوں کو مہیا کیے بغیر جرمنی اور جاپان میں کپڑے کی

صنعت ترقی نہیں کرسکتی۔ اِس وقت محض تھوڑے سے کارخانے کپڑے کی صنعت میں لگائے جاسکتے ہیں۔ بہرحال یہ بڑی بات ہی کہ برطانیہ اور امریکہ کی مدد سے وہاں کپڑے کی صنعت کی حالت درست کرنے کا کام شروع ہونے والا ہی۔ ریاست ہائے متحدہ نے روئی کی اتنی مقدار جرمنی میں بھیجنے کی پیش کش کی ہی جس سے جرمنی کے چاروں حصّوں میں کپڑے کے کارخانے پوری طرح مصروف رکھے جاسکیں۔ چناں چہ جرمنی کے امریکی حصّے میں ۱۰ ہزار ٹن روئی بھیجی جاچکی ہی۔ اس روئی کی قیمت جرمنی اس طرح ادا کرے گا کہ اس سے جتنا کپڑا اور مال بنے گا اُس کا ۴۰ فی صد حصّہ ریاست ہائے متحدہ کے حوالے کردے گا۔ جاپان کے لیے بھی کچھ اسی قسم کا پلان زیر تجویز ہی۔ امید کی جاتی ہی کہ نومبر کے آخر تک جاپان سے ۱۴ کروڑ ۴۰ لاکھ پونڈ سوت برآمد کیا جاسکے گا۔ سنہ ۱۹۴۶ء کے پروگرام کے مطابق سال بھر میں کُل ملاکر ۳ کروڑ پونڈ سوت، ۹ لاکھ پونڈ موزے اور بنیائن وغیرہ، اور ۳۵ کروڑ مربع گز کپڑا برآمد کیا جائے گا۔

ریاست ہائے متحدہ دوسرے مُلکوں میں بھی روئی بھیج رہی ہی مثلاً فن لینڈ، ہالینڈ، اٹلی، چین، زیکوسلاویکیہ جس کی مجموعی قیمت ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ ڈالر ہوگی۔ ان تمام کاروبار کی مالی کفالت کا انتظام "برآمد۔ درآمد" بینک کے ذریعے ہورہا ہی۔ اور جو قرضے دیے جاتے ہیں اُن پر ۲½ فی صد سود لگایا جاتا ہی۔ معاشی حلقوں کی رائے میں جرمنی اور جاپان میں کپڑے کی صنعت کی ترقی کا خراب اثر اگر پڑے گا تو صرف ہندستان پر اور برازیل پر۔ جنگ کے دوران میں ہندستان اور برازیل کی کپڑے کی صنعت نے کافی ترقی کرلی ہی اور وہ منافع کا ذریعہ بھی ثابت ہوئی ہی، لیکن اب صورتِ حال کا بدلنا لابدی سا ہوگیا ہی۔ ریاست ہائے متحدہ کو فائدہ پہنچنے کی امید ہی اس لیے کہ اُس کی فالتو روئی کی کھپت ہوجائے گی۔

اقتباسات

"معاشیات" معاصرین کی نظر میں

از ——— ادارہ

رسالہ "جامعہ" جامعہ ملیہ دہلی — "رسالے کی زبان عام طور پر سادہ سلیس اور عام فہم ہوتی ہے اور مضمون کا معیار بلند ہوتا ہے۔ اپنے مضامین اور اپنے طرزِ تحریر دونوں کے لحاظ سے اِس رسالے نے اُردو صحافت کے لیے ایک نئے راستے کی داغ بیل ڈالی ہے۔" فروری سنہ ۱۹۴۶ء

ہفتہ وار "نیا زمانہ" بمبئی — "اُردو زبان میں اِس موضوع پر یہ پہلا رسالہ ہے ——— انجمن ترقیٔ اُردو نے یہ رسالہ جاری کرکے ایک بہت بڑی کمی پوری کی ہے ——— پرچہ ——— یقیناً اپنی کوشش میں کامیاب ہے۔" ۱۳ر مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور — "——— اردو زبان میں اپنی طرز کا یہ پہلا رسالہ ہے ——— انجمن ترقیٔ اُردو مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے اُردو زبان کی ایک بڑی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ——— یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ بعض مضامین کی زبان بہت عام فہم ہے اور خشک مضمون کو بھی اِس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ مطالعہ طبیعت پر گراں نہیں گزرتا۔" ۸ر فروری سنہ ۱۹۴۶ء

"رہنمائے تعلیم" لاہور — "——— ایک ایسے رسالے کی اُردو میں اشد ضرورت تھی جس میں اِس علم کے دقیق

معاشیات کے) عام مسائل عام فہم زبان میں سلاست کے ساتھ بیان کیے جائیں۔ خوشی کی بات ہو کہ سب سے پہلے اس ضرورت کا احساس انجمن ترقی اُردو کو ہوا۔ اس رسالے کا اجرا اسی احساس کا نتیجہ ہو۔ ہم تمام ناظرین سے اس رسالے کی خریداری کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔ اس کا مطالعہ یقیناً آپ کی معلومات میں بیش بہا اضافے کا باعث ہوگا

جون ۱۹۴۶ء

INVESTMENT AND FINANCE
اِنوسٹ منٹ اینڈ فنانس (ہفتہ وار انگریزی) دہلی

"اُردو میں ایک معاشیاتی رسالہ جاری کرکے انجمن ترقی اُردو نے ملک کی ایک اہم خدمت انجام دی ہو ـــــــ اِس رسالے میں ہندستان اور بین اقوامی دنیا کے موجودہ مسائل کے معاشی پہلوؤں پر متوازن، غیر متعصبانہ اور غیر جماعتی انداز میں بحث کی جاتی ہو۔" (ترجمہ) ۳ مارچ ۱۹۴۶ء

THE INDIAN P. E. N
دی انڈین۔پی۔ای۔اِن بمبئی (انگریزی)

"انجمنِ ترقی اُردو مبارک باد کی مستحق ہو کہ اس نے دہلی سے ۱۹۴۶ء کی ابتدا سے "معاشیات" نام کا ایک نیا اُردو رسالہ جاری کیا ہو جس کا موضوع علمِ معاشیات ہو۔ پہلی دو اشاعتیں (جو نظر کے سامنے ہیں) اُن میں نہایت ذہانت کے ساتھ موجودہ معاشی مسائل پر تبصرے، بحث و مباحثے اور اعداد و شمار جمع کیے گئے ہیں۔" (ترجمہ) یکم مئی ۱۹۴۶ء

تبصرہ

از: ———— ادارہ

پاکستان اور اچھوت — مصنفہ چودھری افضل حق (احرار)۔ حجم ۱۰۴ صفحات مطبوعہ مکتبۂ اردو، لاہور۔ قیمت ایک روپیہ ۴ آنے (عہ)

مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ دراصل کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ مجلسی اور اقتصادی مسئلہ ہے۔ ہندو مسلم اختلافات کی اصل بنیاد ہندو سماجی نظام یعنی چھوت چھات پر قائم ہے اور اسی چیز نے مسلمانوں اور شودروں کے لیے معاشی دقتیں بھی پیدا کردی ہیں۔ گویا مصنف کی نظر میں بنیادی سبب چھوت چھات ہے اور معاشی نابرابری محض اسی کی ایک پیداوار ہے۔ پتا نہیں مصنف کا خیال زیادہ سائنٹفک ہے یا یہ خیال کہ خود چھوت چھات ہی ایک مخصوص معاشی نظام کی پیداوار ہے جسے قرنوں اور صدیوں کے سکوت و جمود نے مذہبی درجہ بخش دیا ہے۔ اس لیے معاشی نظام کو بدلنے سے پہلے چھوت کو ختم کرنے کی کوشش گھوڑے کے آگے گاڑی رکھنے کے مرادف ہے۔ کیا ہم ہزاروں تحریکیں قائم کر کے بھی اُس وقت تک چھوت کا خاتمہ کرسکتے ہیں جب تک اشیا کی پیدائش اور اُس کی تقسیم کا ایک ایسا نظام نہ قائم ہوجائے جس میں چھوت ہر شخص کے نجی معاشی مفاد سے ٹکرانے لگے۔ بہ ہر حال مصنف کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ اگر ہندستان سے ہندو سماجی نظام یعنی چھوت اٹھ جائے اور معاشی مساوات[1] قائم ہوجائے تو پاکستان کی قطعی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن ساتھ ہی مصنف کا یہ خیال بھی ہے کہ

[1] کمیونزم ؟

عارضی طور پر یعنی جب تک مندرجہ بالا مقاصد حاصل نہیں ہوتے اس وقت تک مسلمانوں کے تحفظ کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک وفاق کافی ہوگا جس میں مرکز کو صرف چند اختیارات حاصل ہوں گے۔ مصنف کے پورے استدلال میں اس سائنٹفک حقیقت کی کوئی جھلک نہیں نظر آتی کہ ہندو مسلم مسئلے کا اصلی اور بنیادی حل یہ ہے کہ اسے ہندستان کی مختلف قوموں کی آزادی اور حق خود اختیاری کا مسئلہ بن کر پیش کیا جائے جنھیں مرکز سے منسلک رہنے یا اس سے علاحدگی حاصل کر لینے کا پورا پورا اختیار حاصل ہو۔ یہ ہے وہ سیاسی حل جس سے بحیثیتِ مجموعی ہندستان کی غلامی دور ہو سکتی ہے جس کے بعد ہی معاشی اور اس کے بعد مجلسی اور سماجی انقلابات کے بھی امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ سیاسی انقلاب تمام اصلاحات کی کنجی ہے۔ تاریخ کا سائنٹفک مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ جب تک سیاسی انقلاب نہیں ہوتا اس وقت تک نہ تو کوئی معاشی اصلاح عمل میں آسکتی ہے اور نہ سماجی اور مجلسی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس سیاسی انقلاب کی ضرورت کو مدتوں سے جمع ہوتے ہوئے معاشی اسباب ہی پیدا کرتے ہیں۔

بہرحال کتاب کا ہر لفظ فاضل مصنف کے خلوص و رواداری، دور اندیشی اور سچی قومی ہمدردی کا آئینہ دار ہے۔ اس کا مطالعہ ہر اُس شخص کے لیے ناگزیر ہے جو ملک کے سب سے اہم مسئلے یعنی ہندو مسلم مسئلے سے دلچسپی ہے اور آج کون ہے جس کو دلچسپی نہیں؟

اصطلاحات

انجمنِ ترقّیٔ اُردو کی معاشی اصطلاحات

Abatement	تخفیف ۔ گھٹاؤ
Accommodaiton	غیر کفالتی قرضہ
Acreage	ایکڑی رقبہ
Annuity	سالیانہ
Bargaining	سودا، معاملہ
Bearer bond	حاملی تمسک
Benevolences	محصول، جبری نذرانے، جبری قرضے
Cash balances	نقدی فاضلات، نقدی بچت
Chain balances	شاخ داری دکانیں، شاخ داری سٹور
Debit	دین
Debt, floating	عارضی قرضہ
Economic rent	معاشی لگان
Ejectment	بے دخلی
Famine relief	امداد قحط
Fertility	زرخیزی
Gross interest	خام سود
Gross profits	خام منافع

معاشیات

جلد ۱ — اگست سنہ ۱۹۴۶ء — نمبر ۸

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مصنف	صفحہ
۱	جنوبی افریقہ کے ہندستانی	اڈیٹر	۲
۲	یوپی وزارت کی لیبر پالیسی	"	۴
۳	تصنیع صنائع کا مسئلہ	بشیر الدین احمد جامعہ عثمانیہ	۶
۴	ہندستان میں زندگی کا معیار	پ۔س۔ ملہوترا	۵
۵	سرمایہ دارانہ معیشت	مظہر ح۔ یوسف بی۔ اے (علیگ)	۲۶
۶	صنعتی پستی اور مزدور	ابوسالم ایم۔ اے علیگ	۳۳
۷	ہندستان کی غذائی صورت حال	محمد عبدالقادر ریڈر جامعہ عثمانیہ	۴۰
۸	مدراس بجٹ	ادارہ	۴۴
۹	بنگال بجٹ	"	۴۵
۱۰	کپڑا بننے کی مشینیں	"	۴۵
۱۱	تبصرہ	"	۴۷
۱۲	انجمن ترقی اردو کی وضع کردہ معاشیاتی اصطلاحات	"	۴۸

اداریہ

جنوبی افریقہ کے ہندستانی

از : ——————— اڈیٹر

اسی برس ہوئے کہ جنوبی افریقہ میں ہندستانی جاکر آباد ہونے لگے ۔ وہ شروع شروع میں مزدور کی حیثیت سے وہاں گئے تھے اور جنوبی افریقہ کے سرمایہ داروں کے اصرار پر۔ اس لیے کہ اُن کے کارخانوں میں ہندستان کے سستے مزدوروں کی مانگ تھی۔ ابتداً حکومتِ ہند، ہندستانی مزدوروں کو وہاں بھیجنے پر رضامند نہ ہوئی اس لیے کہ نٹال ایک بے حد پست حال اور پچھڑا ہوا علاقہ تھا اور وہاں ہندستانی مزدوروں کو طرح طرح کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا، لیکن جب نٹال کی حکومت نے ہندستانی مزدوروں پر دس ہزار پونڈ صرف کرنے کا اعلان کیا تو جنوبی افریقہ میں اُن کی آمد شروع ہو گئی ۔ ہندستانی مزدوروں کا پہلا قافلہ سنہ ۱۸۶۰ء میں جنوبی افریقہ پہنچا تھا۔ آج وہاں ہندستانیوں کی تعداد کوئی ڈھائی لاکھ ہے۔ ان میں زیادہ تر تامل ناڈ، گجرات، کے لوگ ہیں اور خوجے اور میمن بیوپاری۔

جب تک ہندستانی مزدوروں سے جنوبی افریقہ کے سفید فام سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچتا رہا اُن کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ ان پر کوئی پابندی نہ تھی اور مجلسِ قانون ساز اور شہری کونسلوں میں انھیں رائے دہندگی کا بھی حق حاصل تھا۔ لیکن جب یہ دور ختم ہو گیا تو ہندستانیوں پر مظالم شروع ہو گئے ۔ جنوبی افریقہ کے سفید فاموں کے معاشی مفادات نسلی امتیاز اور نسلی بغض و نفرت سے جا ملے جیسا کہ ہمیشہ ایسی صورت میں ہوتا ہے۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں نٹال میں انگریزوں اور ہندستانیوں میں فسادات ہوئے ۔ اس کے بعد ہندستانیوں کے خلاف جنوبی افریقہ کی حکومت مستقل اور مسلسل طور پر امتیازی سلوک کرنے لگی اور آہستہ آہستہ

ہندستانی اپنے تمام سیاسی حقوق کھو بیٹھے۔ افریقہ کی مجلسِ قانون ساز کے انتخابات میں راے دہندگی کے حق سے انھیں محروم کر دیا گیا۔ دیگر شہری حقوق بھی اُن سے چھین لیے گئے اور وقفے وقفے سے ان پر نئی نئی پابندیاں عائد کی جانے لگیں۔ اسکول، کالج، ریل گاڑی، سرکاری ملازمت ——— ہر جگہ اُن سے امتیازانہ سلوک کیا جانے لگا۔ جن نئے قانون سنہ ۴۶ء کے خلاف آج جنوبی افریقہ کے ہندستانی جد و جہد کر رہے ہیں اس کی رو سے اُن کی رہائش اور تجارت چند خاص علاقوں تک محدود کر دی گئی ہے۔ اس سے باہر وہ نہ تو گھر بنا سکتے ہیں، نہ زمین خرید سکتے ہیں اور نہ تجارت کر سکتے ہیں۔ جہاں تک راے دہندگی کا سوال ہے نئے قانون کے تحت وہ کسی یورپی کو ہی منتخب کر سکتے ہیں، ہندستانی کو نہیں۔ ہندستانیوں کے ان یورپی "نمایندوں" کی تعداد تین رکھی گئی ہے۔

ہندستانی اسی زمانے سے اپنے حقوق کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں جب اُن پر پابندیاں عائد کی جانے لگیں بیسیں صدی کے اوائل میں "جنوبی افریقی ہندستانی کانگرس" کی بنیاد ڈالی گئی اور دو شاخیں ایک نٹال میں اور دوسری ٹرانسوال میں قائم کی گئیں۔ اس زمانے میں گاندھی جی کی رہ نمائی میں جد و جہد شروع ہوئی جس کا نتیجہ خاطر خواہ تو نہیں نکلا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ مفید ضرور ثابت ہوا۔

جنوبی افریقہ کی کانگریس میں اِس وقت دو گروہ ہیں۔ مصالحت پسندوں کا گروہ انگریزوں سے میل جول قائم رکھنا چاہتا ہے اور تھوڑی بہت آزادی کو قائم رکھنے کے لیے کچھ پابندیوں کو قبول کرنے کے لیے بھی تیار ہے۔ مگر دوسرا گروہ جس کی عوام میں شنوائی زیادہ ہے اس پالیسی کا مخالف ہے۔ یہ گروہ جنوبی افریقہ کے سیاہ فام اصلی باشندوں کے ساتھ متحدہ محاذ قائم کر کے انگریزی سامراج کے خلاف دست آزما ہونا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر نائکر اور ڈاکٹر دادو اسی گروہ میں شامل ہیں۔ ۱۳ جون سے جو تحریک شروع کی گئی ہے اور جس نے پُرامن ستیہ گرہ کی شکل اختیار کی ہے اس کی رہ نمائی انھی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ جنوبی افریقہ کی اس تحریک کو اب وہاں کے اصلی باشندوں کی سیاسی جماعتوں کی ہم دردی بھی حاصل ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر زوما اور موزر کوٹانی جیسے رہ نما بھی ہندستانیوں کا عملی طور پر ساتھ دے رہے ہیں۔ ہندستانیوں کے ہم دردوں میں کچھ جمہوریت پسند اور انصاف خواہ انگریز اور یورپی بھی شامل ہیں۔

اور اگر سچ پوچھیے تو جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کی تحریک اسی وقت کام یاب ہو سکتی ہے کہ وہاں کے سیاہ فام باشندوں اور ان کے سیاسی رہ نماؤں کے علاوہ جمہوریت پسند یورپی باشندے بھی ساتھ دیں۔ اس تحریک کو قومی اور نسلی رنگ دینا نہ صرف اصولاً غلط ہوگا بلکہ سیاسی مصلحت کے بھی خلاف ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ فاشیت پسند جنرل اسمٹس اور اس کی پالیسی کو چلانے والے

اس وقت نسلی تعصب اور ہندستانیوں کے خلاف حیوانی قسم کی نفرت سے سرشار ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بھی انھی کی طرح فاشیت کے بربری اصول یعنی نسلی تعصب کو اپنی شمع راہ بنالیں۔ تو پھر ہمارے اور اُن کے درمیان فرق کیا رہا۔ جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کی تحریکِ آزادی دراصل جنوبی افریقہ کے تمام ستائے ہوئے باشندوں کی تحریکِ آزادی کا ایک حصہ ہے اور وہ اُسی وقت کام یاب ہو سکتی ہے، جب وہاں کے تمام ستائے ہوئے باشندے انگریز اور یورپی استحصال کرنے والوں سے نجات حاصل کرلیں۔ انھی اصولوں پر چل کر ہندستانی اپنی جدوجہد میں کام یاب ہو سکتے ہیں۔

اس وقت جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کے ساتھ ہمارے مُلک کی تمام سیاسی جماعتوں کی ہم دردی شامل ہے۔ حکومتِ ہند نے بھی تجارتی سلسلہ منقطع کر کے ایک صحیح قدم اُٹھایا ہے۔ لیکن وہ کافی نہیں ہے اس لیے کہ یہ تجارت کچھ اتنی زیادہ نہیں تھی کہ جنوبی افریقہ کے سفید فام حاکموں کو کچھ بہت زیادہ نقصان پہنچے۔

حکومتِ ہند نے اپنے دو احکام کے ذریعے جنوبی افریقہ سے تجارتی سلسلہ بند کیا ہے۔ اُن کی رُو سے ایسے تمام مال واسباب کی درآمد ہندستان میں بند کر دی گئی ہے جو جنوبی افریقہ سے چلے ہوں یا وہاں پیدا کیے یا بنائے گئے ہوں چاہے وہ براہِ راست طور پر دُنیا کے کسی بھی حصے سے ہندستان میں بھیجے جارہے ہوں۔ اس حکم سے مسافروں کے ذاتی اسباب بری ہیں اور ایسے مال بھی جو برطانوی ہند میں پہلی اگست سے پہلے آچکے ہیں یا جن کی پوری قیمت ۱۷ جولائی کو یا اس سے پہلے ادا کر دی گئی۔ پھر برطانوی ہند سے مُلکی اور غیر مُلکی دونوں قسم کے مال کا جنوبی افریقہ جانا بند کر دیا گیا ہے۔ ایسے مال بھی ہندستان سے باہر نہیں بھیجے جاسکتے جو بظاہر تو کسی اور بندرگاہ کو جارہے ہوں لیکن آخر میں ان کی منزلِ مقصود جنوبی افریقہ ہو۔

یو۔پی وزارت کی لیبر پالیسی

یو۔پی کے لیبر وزیر آنریبل ڈاکٹر کاٹجو نے ایک پریس نوٹ کے ذریعے صوبے کے مزدور مسئلے کے متعلق جس پالیسی کا اعلان کیا ہے اس کی خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

سب سے پہلے تو وزارت نے یہ اعلان کیا کہ مزدوری، کام کے گھنٹے، مزدوروں کے لیے رہائشی مکانات کا انتظام اور چھٹی کے مسائل ہمارے حیطۂ اقتدار سے خارج ہیں اُن کا تعلق پورے ہندستان سے ہے۔ چناں چہ ہم اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتے۔ حال آں کہ یہی وہ مسائل ہیں جو مزدور طبقے کو براہِ راست طور پر متاثر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کاٹجو نے اس بات پر زور دیا کہ صنعت کے سلسلے میں صوبائی مقابلے بازی کی وجہ سے ہم مزدوروں کے ساتھ رعایت نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ مقابلے میں

بازی لے جانے کے لیے ضروری ہے کہ کم سے کم اخراجات پر زیادہ سے زیادہ اشیا پیدا کی جائیں۔ اگر مزدوروں کی اُجرت میں اضافہ کیا گیا تو پھر یہ مقصد کیسے حاصل ہو سکے گا۔ لیبر وزیر نے ریاستوں کی صنعتی ترقی کا بھی واسطہ دیتے ہوئے کہا کہ وہاں اجرتیں کم دی جاتی ہیں چناں چہ اگر یہاں مزدوری میں اضافہ کیا گیا تو یو۔پی ریاستوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گا، چاہے یو۔پی کے مزدوروں کا معیارِ زندگی کتنا ہی پست ہو۔ اس کے بعد وعدوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جن کا تعلق خطرے کے بیمے، تقسیمِ منافع کی اسکیم اور علاج کے انتظامات سے ہے۔ ہڑتال کے سلسلے میں آنریبل وزیر نے نہایت سخت قسم کا رویہ اختیار کیا اور کہا سیاسی مقصد سے کی جانے والی ہڑتال، اچانک ہڑتال اور ایسی ہڑتال جو زبردستی شرائط منوانے کے لیے کی جائے غلط ہے اور اس کی مخالفت کرنی چاہیے۔

اس نئی پالیسی کے اعلان کے بعد کانگریسی لیڈروں کے حلقے میں بھی ناراضگی اور پریشانی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

اس صورتِ حال کا ایک قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ ایک طرف یو۔پی کی وزارت جب زمیں داری کا خاتمہ کرنے بیٹھتی ہے تو اشتراکیت کے بلند و عمیق نعرے لگاتی ہے، اور جب یو۔پی کے صنعتی مالکوں اور پدم پت سنگھانیوں کے مفاد کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اس کی ساری اشتراکیت بازی ڈھل ڈھلا کر صاف ہو جاتی ہے۔ آخر یہ تضاد کیوں؟ مسلم لیگ نے تو سرمایہ داری کے مکمل استیصال کا مطالبہ پیش کیا تھا لیکن آپ تو صوبے کے مزدور طبقے کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی بھی مخالفت کر رہے ہیں۔ اور پھر اشتراکیت کے نعرے!

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

تحصیرِ صنائع کا مسئلہ

از : ——— بشیرالدین احمد جامعہ عثمانیہ

تحصیرِ صنائع کا مطلب تحصیرِ صنائع سے مراد صنعتوں کا ایسے علاقوں میں مرکوز ہو جانا ہے جو اس کے لیے موزوں ہیں، جہاں صنعت خوب پھل پھول سکتی ہے، جہاں اُسے کفایاتِ داخلی کے علاوہ کفایاتِ خارجی بھی حاصل ہو سکیں۔ اسے تقسیمِ عمل کی ایک ترقی یافتہ شکل کہنی چاہیے۔ تقسیمِ عمل کے تحت کام کو مختلف چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کرکے ہر مزدور کے سپرد ایک حصّہ کر دیا جاتا۔ جس طرح بعض مزدور قسم اول کی دستی گھڑیاں یا کسی اور چیز کے بنانے میں مشاق ہوتے ہیں بالکل اُسی طرح بعض علاقے بعض خاص اشیا کی تیاری میں دوسروں سے بازی لے جاتے ہیں۔ یہی علاقائی تقسیمِ عمل (TERRITORIAL DIVISION OF LABOUR.) تحصیرِ صنائع ہے۔ یہ علاقائی تقسیمِ عمل جغرافیائی، ارضیاتی، آب و ہوائی یا سیاسی وجوہات کی بنا پر ہوا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر لنکا شہر ہی کو لیجیے۔ یہ برسوں سے سوتی صنعت کا مسکن رہا ہے، اس کے باشندے اس صنعت میں خوب مشّاق ہیں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض علاقوں میں بامہارت مزدور آکر بس گئے اور ان علاقوں میں اُس صنعت کا رواج ہوگیا جیسے مشرقی اینگلیا اور یارک شر میں فلے مش اور ہیگو ناٹ فن کار بس گئے یا جیسے اورنگ آباد کے ایک علاقے پیٹن کے طلائی قور اور پگڑیوں کے صنّاع اپنا بوریا بندھنا اُٹھا، بمبئی، احمد آباد اور پونا چلتے بنے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ

احمد آباد سوتی مصنوعات، کشمیر اونی مصنوعات، بنگال جوٹ کی اشیا اور یو پی اور بہار شکر کے لیے مشہور ہیں۔ یہ صنعتیں ان علاقوں سے کچھ اس طرح وابستہ ہیں کہ ان علاقوں کا نام لیتے ہی ذہن ان کی مصنوعات کی طرف منتقل ہو جاتا ہی۔ تحصیر صنائع کی رُو سے ہر علاقہ اپنے آپ کو اُس شی یا اشیا کی پیدائش کے لیے وقف کر دیتا ہی جس میں اُسے بیش ترین اضافی فوائد حاصل ہوں۔

اسباب اب ہم اُن اسباب کی چھان بین کریں گے جن کی بنا پر صنعتوں کی تحصیر ہوتی ہی۔ بعض مقامات کے صنعتوں کی جنم بھومی ہو جانے کے اسباب اُتنے ہی زیادہ اور مختلف ہیں جتنی کہ خود صنعتیں لیکن بعض ایسے نمایاں اسباب ہیں جنھیں ضبطِ تحریر میں لایا جا سکتا ہی۔ کسی بستی میں صنعت کے قیام میں آجر اوّلاً معاشی اُمور سے متاثر ہوتا ہی۔ اس کے آگے مصارف کا سوال اہم رہتا ہی۔ وہ اسی روشنی میں جانچ پڑتال کرتا ہی۔ تحصیر صنائع کے یہ پانچ اسباب ہو سکتے ہیں (۱) خام اشیا (۲) موزوں محنت (۳) جگہ (۴) بازار سے قربت (۵) مالیہ۔

(۱) خام اشیا۔ صنعتوں کے قیام میں خام اشیا کا مسئلہ بڑی ہی اہمیت رکھتا ہی۔ بعض صنعتوں کا تو ایسی جگہوں پر قائم کرنا ضروری ہوتا ہی جہاں اُن کے وسائل رسد موجود ہوں مثلاً استخراجی صنعتیں اور بھاری صنعتیں۔ بعض مرتبہ دھاتی صنعتیں ایندھن کے قریب ہوتی ہیں۔ خام اشیا کی نوعیت اور ان کی قیمت کا جائے وقوع پر اثر پڑتا ہی۔ اگر کسی صنعت کو مختلف خام اشیا کی ضرورت ہو تو اس کے لیے وہی مقام موزوں ہو سکتا ہی جہاں سب اشیا مجموعی طور پر کم سے کم قیمت پر ملیں۔ اسی طرح اُن مصنوعات کے لیے بندرگاہ سے قربت ہی سستی ہوگی جنھیں خام اشیا سمندر پار سے درآمد کرنی ہوں۔ بعض صنعتوں کو مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے مختلف خام اشیا چاہییں، اُن کے لیے ہر منزل پر علاحدہ جائے وقوع ہی مناسب ہو سکتی ہی۔

(۲) محنت۔ محنت پر کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے غور کیا جانا چاہیے۔ صنعت اور محنت کے اضافی نتائج کو علاحدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں میکانیت کی ترقی نے مہارتِ مخصوصہ کی اہمیت کو گھٹا دیا ہے اس سے قبل صنعتوں میں اس کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ سے بامہارت اور نیم بامہارت محنت کی طلب بڑھ گئی ہی۔ ایک اور فائدہ میکانیت سے یہ ہوا کہ محنت کی یہ خصوصیت کہ وہ ایک مقامی عامل ہی گھٹ گئی۔ محنت آسانی سے منتقل ہونے لگی۔ تحصیر صنائع پر مزدوروں کے اداروں یا مزدور سبھاؤں کا بھی اثر پڑتا ہی۔ مغربی ممالک میں یہ اثر قابلِ نظر انداز نہی لیکن ہندستان جیسے پست مُلک میں بعض مخصوص بستیوں میں یہ عامل تقیقی رنگ لاتا ہی کیوں کہ اس مُلک میں مزدور سبھا تحریک ابھی گہوارے میں ہی۔ ایک چیز یہ بھی ہی کہ ایک علاقے میں جب صنعت مرکوز ہو جائے تو اس کی بدولت مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہی جو بجائے خود آیندہ قائم ہونے والی صنعتوں کے لیے مقناطیس کا اثر رکھتا ہی۔

(۳) جائے وقوع ۔ جائے وقوع کے سلسلے میں بستی کی طبعی خصوصیات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ یعنی وہاں کی آب و ہوا اور گندگی کے باہر پھینکنے کی سہولتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جائے وقوع پر بعض خاص صنعتوں کی صورت میں موجودہ مہلک صنعتوں کا بھی اثر پڑتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں تیار کرنے والے کارخانوں کا اچھی اور صحت بخش فضا میں رہنا ضروری ہے۔ اگر وہ کسی ایسے مقام پر ہوں جہاں چمنیوں کے دھوئیں سے ساری فضا مکدر ہو جاتی ہے تو یہ بہت برا ہوگا۔ اسی طرح بعض صنعتوں کا دوسری صنعتوں مثلاً پٹرولیم صاف کرنے کی اور آتش گیر اشیا کی، کے قریب ہونا اُن کے لئے مضرت رساں ثابت ہوگا۔ گیاس اور برقی رسدانی، ڈرینیج، پیلے اور ٹیلیفون کی سہولتوں سے بھی جگہ کے انتخاب پر اثر متاثر ہوگا۔ ایسی جگہ جہاں ریل جاتی ہو، اور سڑک کی وہاں تک رسائی ہو مقامی ٹیکس اور محاصل کے اختلافات بھی جگہ کی موزونیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

(۴) بازار سے قربت۔ بازار سے قربت ہمیشہ صنعتوں کے قائم کرنے میں اثر انداز رہی ہے۔ ہلکی صنعتیں بالعموم گنجان علاقوں ہی میں قائم ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بازار صَرف قریب تھا۔ موجودہ زمانے میں اس کی اہمیت کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ پس فروخت خدمات جن کے بغیر پیسہ حاصل کرنے کی توقع صارفین رکھتے ہوں یا نہیں، بڑھتی جارہی ہیں۔ جس کا نتیجہ ہے کہ اکثر صورتوں میں بیرونِ کارخانہ نہیں بلکہ صارف تک پہنچنے کے مصارف کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب ہی یہ نکلا کہ کارخانے دار بازار کے قرب وجوار میں کارخانہ لگائے یا پھر سروس ڈپو قائم کرے۔

اگلے دنوں میں صنعتیں شاہی دربار یا کسی فیشن کے مرکز کے قریب جمع ہو جاتی تھیں۔ ایسی مصنوعات کی تیاری کے لیے جو شخصی مذاق اور ضروریات کی تکمیل کرتی تھیں کسی بازار کا وجود ہی بہ جائے خود کافی تھا۔ بعینہٖ آج کل صنعتیں بڑے شہروں کے نواح میں کھچی چلی جاتی ہیں۔ سریع الزوال اشیا کی صنعتیں بالعموم بازار کے نزدیک پائی جاتی ہیں۔

(۵) مالیہ۔ تحصیرِ صنائع میں مالیے کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ بعض خاص بستیوں میں پس انداختہ کی مقدار اور اُن سے جتنی رقم صنعت میں لگانے سے حاصل ہو سکتی ہے اور مالی اداروں کی موجودگی یا عدم موجودگی وہ عوامل ہیں جن سے صنعت کی تحصیر پر اثر پڑتا ہے۔ چوں کہ پس انداختہ کا انحصار کسی خطّے کی صنعتی ترقی پر ہے اس لیے اس کا امکان ہے کہ ایک پس ماندہ خطّے کو بڑھتی ہوئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے۔ نئی قائم ہونے والی صنعتوں پر مالی اور بنک کاری کی سہولتوں کا بھی کافی اثر پڑتا ہے۔ صنعتوں کے بعض بڑے تجارتی علاقوں میں مرکوز ہو جانے کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ وہاں طویل المیعاد اور قلیل المیعاد قرضے حاصل کرنے کی سہولتیں ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ متذکرہ بالا پانچ اسباب یا اُن میں سے کسی ایک کی بنا پر تحصیرِ عمل میں آئے۔ ہو سکتا ہے کہ صنعت کا قیام آجر کے غلط تخیّل کا نتیجہ ہو۔ اٹکل پر صنعت قائم کر دی گئی۔ اور بعد میں فوائد معلوم ہوئے۔ اوپر ذکر کیئے ہوئے امور میں سب سے اہم امر بازاروں اور خام اشیا کے درمیان حمل و نقل کا ہے۔ اس میں صرف شرح کا مسئلہ ہی نہیں بلکہ بالیقین اور غیر منقطع خدمت اور دوسری قابلِ فراہمی سہولتیں بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتیں بندرگاہوں یا بڑے تجارتی شہروں میں قائم ہوتی ہیں۔ ان سے کفایاتِ خارجی ملنے کی وجہ سے اور نئی صنعتیں قائم ہونے لگتی ہیں۔ ایسا بھی ہے کہ کسی مخصوص خطّے میں صنعت کی ترقی بجائے خود سبب اور نتیجہ ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ حکومت کا مسلک، نقل و حمل کی شرحیں، محاصل مسلک، حکومت کی امداد تحصیرِ صنائع کو متاثر کریں گے۔

ہندستان کی صورتِ حالات

کارخانوں کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ تحصیرِ صنائع کے اسباب اور مسائل منظرِ عام پر آنے لگے۔ جدید طرز پر صنعتوں کے قیام سے پہلے صنعتیں وہیں قائم ہوتی تھیں جہاں مہارتِ مخصوصہ دستیاب ہوتی۔ جدید صنعتیں جب سے قائم ہونے لگیں ان کا ارتکاز تجارتی مراکز اور بندرگاہوں یا کوئلے کے خطوں یا معدنی خطوں ہی میں ہونے لگا۔ بمبئی، کلکتہ، کان پور، اور جمشید پور یہ وہ علاقے ہیں جہاں صنعتیں کثرت سے مرکوز ہیں۔

ان علاقوں میں صنعت کے قائم ہو جانے کے معقول معاشی وجوہ ہیں۔ بمبئی اور کلکتہ بندرگاہوں سے قریب تھے۔ یہاں منیجنگ ایجنٹس تھے جو صنعتوں کی مالی امداد کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتے تھے۔ بندرگاہ کی وجہ سے اشیا کے لانے لے جانے میں بہت فوائد حاصل تھے۔ آبادی بھی زیادہ تھی اس لیے بازار بھی ہاتھ آسکتا تھا۔ آبادی کی کثرت کے ساتھ محنت کی بہتات بھی ضروری ہے۔ نقل و حمل کی سہولتوں، محنت کی بہتات، وسیع بازار، خارجی کفایات اور مالیے کی سہولتوں کی بنا پر کلکتہ اور بمبئی صنعتی جدوجہد کے مرکز ہو گئے۔ کلکتے کے لیے ایک اور سہولت یہ تھی کہ کوئلے کی کان اُس کے قریب تھی۔ مختارانِ انتظامی (منیجنگ ایجنٹس) کے دفاتر بھی یہیں پر واقع تھے۔ ایسی صنعتیں جن کی تحصیر کا باعث خام اشیا تھے، وہ بھی اُمورِ فروخت و مالیہ و انتظامیہ کی حد تک کلکتہ سے وابستہ تھے۔

حال تک بمبئی سوتی صنعت کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اگرچہ کہ وہ خام اشیا سے قریب نہ تھا لیکن اور دوسرے اسباب تھے جنھوں نے اُسے سوتی صنعت کا بڑا مرکز بنا دیا تھا۔ اس کے وجوہ یہ ہیں کہ بمبئی خام اشیا کی فراہمی کا مرکز ہے۔ خام اشیا اور بازار کے خصوص میں اُسے نقل و حمل میں سہولت حاصل ہے، محنت کی کثرت ہے، مختارانِ انتظامی کا مرکز ہے۔ ریل کی طرح بھی سازگار تھی۔ بحری نقل و حمل کی وجہ سے اُسے بڑی سہولتیں مل گئی تھیں۔ اس کا مال چین اور ہانگ کانگ

کے بازاروں میں جاتا تھا۔ بقیہ ہندستان میں بھی اب نسبتاً ترقی ہوگئی ہو۔ انتشار کے رجحانات کا پیدا ہونا، مبیئ میں زمین کی قدر، لگان اور مصارف محنت کا بڑھ جانا، داخلی بازار کو خارجی بازار پر اہمیت دینا اور ریلوے کے مسلک میں تبدیلی ہونا وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے حالات نے پلٹا کھایا۔ کلکتہ میں ساحل ہگلی پر جوٹ کے کارخانوں کے قائم ہونے کے وجوہ یہ ہیں کہ جوٹ کی پیداوار میں بنگال کو اجارہ حاصل ہو، کلکتہ تک ارزاں آبی راستے ہیں، کوئلے سے قربت ہو اور کلکتہ میں بہ کثرت مختارانِ انتظامی ہیں اور فولاد کی صنعتوں کو کچے لوہے کوئلے اور چونے کا پتھر متاثر کرتے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ میں فولاد کی صنعت خام اشیا سے بہت دور واقع ہو۔

جنگ سے پہلے بڑے صنعتی علاقوں میں تحصیرِ صنائع کے رجحان میں کمی ہوتی رہی۔ اس کے اسباب مختلف ہیں۔ پہلا سبب یہ کہ زمین کی قدر، لگان اور اُجرت بڑھتی جارہی تھی۔ دوسرا یہ کہ بازار کی اہمیت بھی ایک عامل کی حیثیت سے زیادہ ہوتی جارہی ہو۔ تیسرا یہ کہ ذرائع نقل وحمل میں ترقی سے نقل وحمل کے تعلقات وسیع ہوگئے تھے ریلوں کی شرح بھی انتشار میں معاون ثابت ہوئی۔ چوتھا یہ کہ مالی اور بنک کاری کی سہولتیں بڑھ گئیں۔ آخری سبب یہ ہو کہ ریاستوں کی طرف صنعتیں کھنچی جارہی تھیں۔ ریاستی حکومتوں کی امداد کی اور برطانوی ہند کے اعلا محصول سے بچنے کی توقع حوصلہ افزا تھی۔

اگرچہ مندرجہ بالا اسباب سے انتشار کو مدد ملتی ہو لیکن صنعتی جدوجہد سنہ ۱۹۳۹ء تک بھی ناہموار رہی۔ ممکن تھا کہ جنگ اس رجحان کو شدید کردیتی لیکن بڑے صنعتی مراکز کو انتشار کے نقصانات کے ساتھ ساتھ چند فوائد بھی حاصل تھے سرمایہ اور بامہارت محنت کی فراہمی، محکمۂ رسد کے دفاتر کا اُن علاقوں میں واقع ہونا، مالی اور بنکی سہولتوں اور محکمۂ رسد سے حاصل کیے ہوئے فرمایشات پر بھاری منافع کی وجہ سے وہ ان نقصانات پر غالب آسکے اور ارتکاز کا رجحان شدید ہوگیا۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں صوبۂ بنگال اور مبیئ میں ۵۲ فی صد صنعتی مزدور تھے درآں حالیکہ ان دونوں صوبوں کی آبادی کل آبادی کا ۱۵ اور ۵ فی صد تھی۔ اس کے برعکس یوپی، مدراس اور بہار میں جہاں جملہ آبادی کا ۱۴، ۱۳ اور ۹ فی صد ہو، صنعتی مزدوروں کا فی صد ۸، ۱۰ اور ۵ ہو۔ صنعتی مزدور خود کل آبادی کا ایک فی صد ہیں۔ غور کرنے کا مقام ہو کہ یہ تقسیم کس درجہ ناہموار ہی۔ اس صنعتی ارتکاز سے صنعتی جدوجہد کی ناہموار تقسیم کا اُتنا ہی ثبوت ملتا ہو جتنا کہ مختلف حصّوں میں معیارِ زندگی کے اختلاف کا۔

بڑے صنعتی ارتکاز مبیئ، ۲۴ پرگنہ، ہوڑا، احمد آباد اور کان پور جیسے مراکز میں پائے جاتے ہیں جو پہلے سے دشوار مسائل پیدا کررہے ہیں اور رہایش نقل وحمل وغیرہ جیسے مشکل اور پیچیدہ مسائل سے دوچار ہیں۔ ہندستان ایسے وسیع مُلک میں نو بڑے صنعتی شہر ہیں جیسے احمد آباد، مبیئ، پونا، شولاپور، کلکتہ، ہوڑا، مدراس، کویمبٹور، کان پور، لکھنؤ، آگرہ،

بنارس، ٹاٹا نگر، جبل پور، جمشید پور، دہلی، لاہور، امرت سر اور کراچی۔

حکومت کے معاشی مشیر کے دفتر کی پیش کردہ رپورٹ (LOCATION OF INDUSTRY IN INDIA) کے اعداد و شمار دیکھنے سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۳۹ء میں بنگال اور بمبئی کے صنعتی ارتکاز میں کمی ہو رہی تھی۔ دوسرے علاقے جن میں برطانوی صوبے اور دیسی ریاستیں شامل ہیں، صنعت کاری کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ بعض علاقوں میں صنعتی آبادی کا حصہ ان کی اپنی آبادی کے اعتبار سے، بہت حقیر تھا۔ بہرحال صنعتی مزدوروں اور مجموعی آبادی کی تقسیم کے جدول دیکھنے سے دو چیزیں روشنی میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ صنعتی ترقی کے اعتبار سے مختلف خطوں میں وسیع اختلافات پائے جاتے ہیں، صنعتوں کے انتشار کا رجحان ہے جس کا مقصدِ اصلی اُن اختلافات کو مٹا دینا ہے۔

بہتر ہوگا کہ اس موقع پر صنعتی ارتکاز کی برائیوں کا ایک اچٹتا سا جائزہ لیا جائے۔ کسی خاص علاقے میں جب بعض خاص صنعتیں ترقی کر جاتی ہیں اور وہ وہاں کی معاشی زندگی کا اہم جزو بن جاتی ہیں تو کساد بازاری رونما ہونے پر اس صنعت کے مزدوروں کی حالت بڑی زبوں اور تباہ ہو جاتی ہے۔ ان میں بے روزگاری شدت سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری صنعتیں چوں کہ نہیں ہوتیں اس لیے وہ کسی اور جگہ منتقل نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ کسی اور مقام پر جانا چاہیں تو نقلِ مقام کی دقتیں مانع ہوتی ہیں۔ اس کے ثبوت میں ایک مثال لنکاشر سے ملتی ہے۔ دوسرے یہ کہ آمد و رفت میں کثرت پیدا ہو جاتی ہے، شہری زندگی کے نقصانات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ عام اور طفلی اموات کی شرح زیادہ ہو جاتی ہے۔ بعض صنعتوں سے تنفسی امراض پیدا ہونے کا ڈر رہتا ہے۔ مزدوروں کی جھونپڑیاں ایسی ہوتی ہیں کہ کوئی مہذب معاشرت اُن کو گوارا نہیں کر سکتی۔ ایک کمرے میں ۴، ۵ لوگ رہنے لگ جاتے ہیں۔ بالغ مردوں کو ایسے ماحول میں گزارنا پڑتا ہے جو ان کی صحت کے لیے ناسازگار ہے۔ مردوں اور عورتوں کی تعداد کے فرق سے سماجی خرابیاں ترقی کر جاتی ہیں۔ قابلِ لحاظ فوجی امور کے اعتبار سے بھی صنعتی ارتکاز نامناسب ہے۔ چناں چہ روس نے اپنی صنعتیں کوہ یورال کے پیچھے قائم کیں۔ ایسا ہی خیال اس جنگ کے دوران میں برطانیہ میں پیدا ہوا۔ ایک اور چیز یہ ہے کہ خاص فرقے اُس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ اگر بنک کاری میں چیٹیرس، ملتانی اور مارواڑی ہیں تو صنعتی میدان میں پارسی، گجراتی اور مارواڑی ہیں۔ ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس صنعتی ترقی کی ریل پیل میں جو ممالک پیچھے رہ گئے وہ ویسے ہی ہیں۔ دوسرے ترقی یافتہ علاقوں کی صنعتی برتری اُن کی ترقی کے لیے سدِّ راہ ثابت ہوتی ہے، تاہم ان کی گوناگوں دقتیں ہیں۔ اسی طرح کے کئی اور مسائل ہیں جن کی بنا پر یہ پس افتادہ ممالک آگے نہیں بڑھ سکتے۔

اصلاحی تدابیر

تعمیرِ صنائع کی طرف اس سے قبل بھی لوگوں کی توجہ مبذول رہی۔ منفرد مصنفین نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی۔ بحث عام قسم کی تھی۔ اس میں حقائق نہیں تھے بلکہ نظریے تھے۔ حکومت

کی شائع کردہ رپورٹ ہی اس موضوع پر سب سے پہلی مکمل بحث ہی جس میں حقائق و واقعات کا حوالہ دیا ہوا ہی۔ اب یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر چکا ہی۔ منصوبے بندی کا دارومدار بھی صحیح اور معقول قسم کی تحصیرِ صنائع پر ہی۔

اس سلسلے میں ایک پیش بندی یہ کی جانی چاہیے کہ ملک کے صنعتی امکانات اور مختلف خطوں کی موجودہ صنعتوں کا مکمل اور تفصیلی جائزہ لیا جائے تحصیرِ صنائع کے مناسب انتظام کے لیے بہت کافی اعداد و شمار مہیا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لیے ہر منفرد خطے کے معاشی وسائل، عوامل پیدائش، معاشی اور سماجی زندگی کے بنیادی طرز، زراعت، گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی موجودہ حالت اور امکانات کے عمیق مطالعے کی ضرورت ہوگی۔ پیدائش اور آبادی کا تفصیلی شمار بھی ضروری ہوگا لیکن صنعتی جائے وقوع کا انتظام کرنے کے لیے یہ چیزیں ناکافی ہوں گی۔ جائے وقوع کا انتظام صنعتوں اور علاقوں کے مکمل علم کے بعد کیا جاسکتا ہی جہاں یہ قائم کی جانے والی ہیں۔ کیوں کہ جائے وقوع پر اثر ڈالنے والے عوامل مختلف صنعتوں کے لیے مختلف ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہی کہ حکومت کو تحصیرِ صنائع میں مثبت یا منفی حصہ ادا کرنا پڑے گا۔ اگر حکومت راست رہنمائی کرتی ہی تو وہ خود صنعتوں کو ملکیت میں لے گی اور ان پر نگرانی رکھے گی یا ہر صنعت کی ہموار تقسیم کا یقین دلانے کے لیے مصارفِ پیدائش میں مالی مدد دے گی۔ اگر اس کا کام منفی نگرانی ہی اور غرض یہ ہی کہ صنعتی شہروں کی گنجانی اور خطہ وار عدم مساوات آمدنی کو روکیں تو اسے معاشی پس منظر پیدا کرنا پڑے گا اور صنعتوں کے انتشار کے لیے معاشی محرک بھی پیدا کرنے پڑیں گے۔ حکومت کو داخلی شوارع، وسائل قوت، مقامی محاصل اور اجرتوں وغیرہ پر بھی اپنے اثر کو کام میں لانا پڑے گا۔ خانگی جدوجہد اور حکومت کی نگرانی دونوں میں ایک توازن پیدا کرنا ہی۔

ایسی صورت میں جب کہ ایک خاص خطے میں صنعتیں قائم کی جا رہی ہیں، صنعتی جائے وقوع کا مسئلہ بالکلیہ آجر پر نہیں چھوڑ دینا چاہیے بلکہ حکومت کے ارباب اقتدار کو بھی اس میں دخل ہو۔ حکومت کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ ایسے علاقوں میں صنعت کے قیام کو روکے جہاں پہلے سے کثیر الآبادی اور گنجانی ہی۔ حکومت کو یہ بھی حق حاصل رہے کہ وہ بعض علاقوں میں برق کشی اور مقناطیسی قوت پیدا کر کے صنعتوں کو مائل کرنے کی غرض سے ان کی ترقی پر روپیہ صرف کرے۔ اگر حکومت یہ صراحت کردے کہ فلاں فلاں علاقوں میں صنعت قائم کرنے پر اجازت دی جائے گی تو پھر اس سے بڑے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ معاشی مشیر حکومتِ ہند اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستان ایسے ملک میں حکومت کے لیے یہ بہت خطرناک ثابت ہوگا کہ وہ منفرد کاروبار کے جائے وقوع کے تعین کا حق اپنے ہاتھ میں رکھے۔ اگر ہندوستان کو مطلوبہ صنعتی ترقی حاصل کرنا ہی ہی تو کاروباری نقطۂ نظر سے صنعت کا کامیاب اہتمام کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہی۔"

ہندستان کی موجودہ صورتِ حال کے اعتبار سے صنعت کا انتشار ضروری ہوگیا ہو۔ اور بعض ایسے عوامل ہیں جو ہندستان میں انتشار کی موافقت میں ہیں مثلاً بارلو کمیشن کی تحقیقات کا یہ نتیجہ کہ قدرتی عوامل کی عدم موجودگی میں بازار کی قربت میں صنعتیں قائم کی جاتی ہیں ہندستان جیسے وسیع ملک میں صادق آتا ہو۔ برقی قوت کے ملک کے طول وعرض میں پھیل جانے کے بعد انتشار کا رجحان قوی سے قوی تر ہوتا جائے گا کیوں کہ کوئلے سے ہم بے پروا ہو جائیں گے اس طرح ہماری بڑی کمزوری رفع ہوگی۔ ملک میں خام اشیا کا پھیلا ہونا بھی انتشار کے رجحان کی تقویت کا باعث ہو۔

انتشار سے خطے وار ترقی کا مسئلہ اُٹھ بیٹھتا ہو۔ جب سے وادیٔ ٹینسی کا تجربہ کامیاب ہوا، قومی وسائل کی ترقی کے لیے خطے وار لامرکزیت کی طرف لوگ متوجہ ہوئے۔ بمبئی کے منصوبے اور محکمۂ تنظیم مابعدِ جنگ کی دوسری رپورٹ ہر دو میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔ بمبئی کے منصوبے میں موجودہ سیاسی حدبندیوں ہی کو ترقی کے لیے مناسب سمجھا گیا ہو۔ برخلاف اس کے موخرالذکر رپورٹ ترتیب دینے والوں کی یہ رائے ہو کہ موجودہ مصنوعی سیاسی حدود کے اعتبار سے صنعت کو ترقی نہیں دی جاسکتی بلکہ خام اشیا، بازار اور دیگر جغرافی اُمور پر اس کا انحصار ہونا چاہیے۔ ترقی جغرافی وحدتوں کے اعتبار سے ہو۔ اس کمیٹی نے اپنی دوسری رپورٹ میں یہ رائے ظاہر کی ہو کہ تمام صوبے اور ریاستیں اپنے علاحدہ علاحدہ پلان بنائیں، اور ان سب کو یکجا کر کے ایک عام پلان تیار کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی کمیٹی نے یہ بھی تسلیم کیا ہو کہ ہندستان کے بعض خاص خطے خود اپنے لیے منصوبے تیار کریں گے۔ یہ منصوبے خطے وار اساس پر ہوں گے۔

خطے وار نظام میں بڑی خوبیاں ہیں۔ انتظام اور منصوبے بندی دونوں کے مسائل بہ آسانی حل ہوسکیں گے یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ موزوں خطے کیسے مقرر کیے جائیں۔ اس کا انحصار قدرتی وسائل کی تقسیم یا کسی بڑے معاشی عامل پر ہو۔ مسٹر بینینتھل کے خیال کے مطابق یہ خطے بس اتنے وسیع ہوں کہ ان پر نگرانی ہوسکے اور وہ قابلِ عمل وسعت کے ہوں یعنی یہ طبعی اور اقتصادی حالت کے مطابق ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سلسلے میں صوبائی حدبندیوں سے گزر جانا پڑے گا۔ یہ سب خطے مل کر ملک کی ہمہ جہتی معاشی ترقی کے لیے مشترکہ مساعی کریں گے اور ان کے سارے کام کسی ایک "صنعتی قومی مجلس" یا ایسے ہی کسی ادارے کے تابع ہوں گے۔ معاشی خطوں کی ایک اسکیم پروفیسر کوبلینڈ نے پیش کی تھی۔ اس اسکیم کے تحت ملک کو چار بڑے بڑے دریائی میدانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو:۔

(۱) دریائے سندھ کا میدان

(۲) گنگا اور جمنا کا میدان

(۳) دریائے برہم پتر کا میدان

(۴) دکن کی سطح مرتفع

اس پر بعض معاشیین نے سخت تنقید کی ہے اور اس کو سیاسی رنگ میں دیکھا ہے کیوں کہ پروفیسر کوپلینڈ کے اس خیال سے پاکستان کے لیے وجہ جواز پیدا ہو جاتی ہے۔ خطے وار تقسیم کی یہی ایک اسکیم تھی جو منظر عام پر آئی۔

بہرحال اب تک ہندستان میں صنعتی ترقی ناہموار اور غیر منصفانہ رہی ہے اس کی وجہ ہمارا ایندھن کے لیے بنگال اور بہار کے کوئلے پر انحصار ہے۔ اور باوجود بازار کی سہولت اور خام اشیا کے، ہمیں بعض علاقوں میں ایندھن نہ مل سکنے کی وجہ سے صنعتیں قائم کرنے کے خیال سے باز رہنا پڑتا ہے۔ حکومت ہند نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ مابعد جنگ منصوبے بندی میں برقی قوت کو کافی ترقی دے گی کیوں کہ یہی ساری صنعتی ترقی کا سرچشمہ ہے۔ وہ دن گئے جب کہ صنعت کے محض اجتماع کو بڑھی ہوئی دولت اور خوش حالی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اب ضرورت ہے کہ صنعتیں اٹکل پر نہیں بلکہ بڑی سوجھ بوجھ کے بعد موزوں مقامات پر قائم کی جائیں۔ جب تک معاشی ترقی ملک میں ہمہ گیر نہ ہو وہ چند علاقوں تک محدود ہی رہے گی، اس سرزمین کے بسنے والوں کو خوش حالی نہ صرف ہاتھ نہیں آئے گی بلکہ مواقع اور آمدنی کی عدم مساوات شدید سے شدید تر ہوتی جائے گی۔

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

ہندستان میں زندگی کا معیار

قومی اور بینِ اقوامی حالات کی روشنی میں

از: ——— پ۔ س۔ ملہوترا

اگر ہندستان کے معاشی مسئلے کو ہم سب سے بہتر طریقے سے بیان کرنا چاہیں تو ہم یوں کہیں گے کہ یہاں کا معاشی مسئلہ لوگوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا مسئلہ ہے۔ ہر ملک کا معیارِ زندگی وہاں کے معاشی حالات کا پرتو ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ ہندستان کا معیارِ زندگی پست ہے، دراصل ہندستانیوں کی غربت کو بیان کرنے کا ایک علمی طریقہ ہے اور زیادہ سہولت آمیز بھی۔ ملک کا معیارِ زندگی کیوں اتنا پست ہے؟ اس کے اسباب جاننے کے لیے ہمیں ہندستان کی معاشی زندگی کی پوری عمارت پر نظر ڈالنی ہے۔ اور اس کو بہ غور سمجھنا ہے۔ اس طرح اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ ملک کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے کون سے طریقے اختیار کیے جائیں تو ہمیں ہندستان کی عام معاشی ترقی کے وسیع تر مسئلے سے بحث کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ چناں چہ ہندستان کی معاشی توسیع و ترقی کے لیے جتنے منصوبے بنائے گئے ہیں وہ سب اسی معیارِ زندگی کو بلند تر کرنے کے مسئلے سے بحث کرتے ہیں۔

یہاں پران اعتراضات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا جو کچھ حلقوں کی طرف سے اس نظریے کے خلاف پیش کیے جا رہے ہیں کہ معیارِ زندگی کو اگر بلند کیا جا سکتا ہے تو انسانی ضروریات میں اضافہ کر کے۔ تمدن کی کہانی انسانی ضروریات کی کہانی ہے جن میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا رہا

ہے۔ انھی بڑھتی ہوئی ضروریات کی تسکین کے لیے انسان نے جو جدوجہد کی ہے اور جو کامرانیاں حاصل کی ہیں اُن سے تمدن کی تاریخ بنی ہے۔ چناں چہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی انسان کو متمدن بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ضروریاتِ زندگی بڑھا دی جائیں۔ لیکن اس کے برخلاف ہندستان میں قناعت ہی کو سب سے بڑی دولت سمجھا جاتا رہا ہے۔ موجودہ ہندستان میں مہاتما گاندھی اس بات کے قائل ہیں کہ ضروریاتِ زندگی کا اضافہ اور ان کی تسکین کے لیے مشین کا استعمال کرکے دُنیا کو ایک قدم بھی منزلِ ترقی کی طرف نہیں لے جایا جاسکتا۔

ہندستان میں جو حالات پائے جاتے ہیں ان کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بدحالی کی اصل وجہ انسانی ضروریات کا زیادہ ہونا نہیں بلکہ قلیل ہونا ہے۔ یہاں تو انسان کی معمولی اور ابتدائی ضروریات بھی نہیں پوری ہوسکتیں۔ ڈاکٹر مارشل نے معیارِ زندگی کی جو تعریف کی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ معیارِ زندگی کے بلند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ذہانت اور علم اس کی قوتِ توانائی اور اس کی خودداری میں اضافہ ہو۔ وہ اپنے اخراجات میں زیادہ سوچ بچار سے کام لے۔ ایسی غذا نہ کھائے جو ہماری بھوک اور ہوس کی کیف کی تو تسکین کرتی ہے لیکن جس سے طاقت نہیں پیدا ہوتی۔ اور ایسی باتوں سے احتراز کرے جو طبی اور اخلاقی لحاظ سے غلط ہوں ہمیں ڈاکٹر مارشل کے اس نظریے سے اتفاق ہے۔ اس طرح فضول خرچی اور بلند معیارِ زندگی میں جو فرق ہے وہ نمایاں ہوجاتا ہے۔

ہندستان کا معیارِ زندگی کیا ہے؟

اندازہ لگایا گیا ہے کہ جنگ سے پہلے جو قیمتیں رائج تھیں ان کے لحاظ سے ادنا ترین معیارِ زندگی برقرار رکھنے کے لیے فی کس ۴۷ روپے ۔۔۔ سالانہ آمدنی کا ہونا ضروری ہے۔ اس ادنا ترین معیارِ زندگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی کم سے کم تمام ابتدائی ضروریات پوری ہوجائیں یعنی انسان کو غذا، کپڑا، مکان، طبی امداد اور تعلیم، اتنی چیزیں حاصل ہوجائیں۔ لیکن سنہ ۱۹۳۱ء اور سنہ ۱۹۳۲ء میں ہندستان کی فی کس آمدنی [illegible] روپے سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندستان میں لوگوں کی ابتدائی ضروریات بھی پوری نہیں ہوسکتی تھیں۔

ہندستان کے مختلف علاقوں میں جو غذائی سروے کیا گیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ایک اوسط درجے کے آدمی کو جو غذا میسر ہے، وہ مقدار اور صفت دونوں لحاظ سے ناقص ہے۔ ایک بالغ آدمی کو ہندستان میں ۲۶۰۰ کیلوری[1] روزانہ ملنی چاہیے۔ اگر ہم اس بات کا خیال رکھیں کہ پکانے کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ غذا ضائع ہوجاتی ہے۔ اور کھانے کے بعد جھوٹا بھی بچ جاتا ہے، تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں فی کس روزانہ ۲۸۰۰ کیلوری کی ضرورت ہے۔ لیکن بمبئی پلان کے مطابق اس وقت ہندستان میں جو غذائی

---

[1] کیلوری اُس حرارت کو کہتے ہیں جو کھانے سے انسانی جسم میں پیدا ہوتی ہے۔

اشیا مہیا ہیں اگر ان کی مساوی تقسیم کا انتظام کیا جائے تو بھی ہر کسی کو ۲۸۰۰ کیلوری نہیں مہیا ہو سکتی۔ تحقیقات سے یہ پتا چلا ہے کہ جنوبی ہند کے کچھ گاؤں میں فی کس روزانہ صرف ۱۷۰۰ کیلوری میسر ہے۔ شہر مدراس کے مضافات میں جو غریب طبقے کے لوگ آباد ہیں انھیں صرف ۱۸۰۰ کیلوری ملتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء کے سروے کے مطابق ضلع مدراس کے ۶۰ فی صدی گھروں میں لوگوں کو فی کس ۲۴۰۰ کیلوری سے بھی کم حاصل تھی۔

جہاں تک غذائیت کا سوال ہے۔ ہندوستانی کھانے متوازن غذا کے اصولوں پر مبنی نہیں ہیں۔ ہر بالغ مرد کو غلے کے علاوہ مندرجہ ذیل چیزوں کی روزانہ ضرورت ہوتی ہے۔ دودھ آٹھ آونس، دال تین آونس، بغیر پتوں والی ترکاریاں ۶ آونس، سبز پتوں والی ترکاریاں ۲ سے لے کر ۴ آونس، پھل دو آونس، چکنائی اور تیل دو آونس، یہ باتیں کونور کی نیوٹریشن ریسرچ لیباریٹری" کی تحقیقات سے معلوم ہوئی ہیں۔ اس ادارے کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر و۔ ر۔ ایکرائڈ نے ہندوستانی کھانوں کی غذائیت کے متعلق کہا ہے کہ "متوازن غذا جس سے کیلوری، پروٹین، وٹامن اور دیگر اجزا مناسب اور تشفی بخش مقدار میں حاصل ہو سکتے ہیں اس کی قیمت کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ جنگ سے پہلے اتنی غذا کی ماہانہ قیمت فی کس ۴ روپے سے لے کر ۵ روپے تک تھی۔ اور پورے ایک خاندان کے لیے جو چار مرد افراد پر مشتمل ہو ۱۶ روپے سے لے کر ۲۴ روپے ماہانہ تک۔ اتنے ہی افراد کے خاندان کو غیر متوازن غذا یعنی خراب غذا کے حصول کے لیے ماہانہ ۱۰ روپے خرچ کرنے پڑتے تھے۔ جنگ سے پہلے کی آمدنیوں سے اگر ان اعداد و شمار کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو جو غذا میسر تھی وہ اس معیار سے بہت گری ہوئی تھی۔"

اس حالت کی درستگی کا صرف ایک طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ ہندوستان میں فی کس آمدنی میں اضافہ کیا جائے۔ انڈین میڈیکل سروس کے سابق ڈائرکٹر جنرل سر جان میگانے مندرجہ ذیل سطور میں اسی مسئلے کی دکھتی ہوئی رگ پکڑی ہے: "لوگوں سے یہ کہنا کہ خوب دودھ پیو اور خوب پھل اور ترکاریاں کھاؤ اس وقت تک بالکل بے معنی ہے جب تک ہم انھیں یہ نہ بتائیں کہ عام اور روزمرہ کی غذا کے علاوہ انھیں یہ اشیا کس طرح حاصل ہو سکتی ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جنھیں اپنی بھوک کو تسکین دینے لیے کافی چاول اور دیگر سستی غذائیں بھی میسر نہیں ہیں۔ اب ایسے لوگوں کو خرچیلی غذائیں کھانے کا مشورہ دینا بالکل بے معنی ہے۔ اس کی مثال ویسی ہی ہوگی جیسے فرانس کی ملکہ میری نے پیرس کے قلاش لوگوں کو جو روٹی کا مطالبہ کر رہے تھے یہ رائے دی تھی کہ اگر تمھارے پاس روٹی نہیں ہے تو کیک کیوں نہیں کھاتے ہو؟"

اوپر کی سطروں میں جس غذائی بدحالی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس کا اثر ہندوستانیوں کی صحت اور تن درستی سے ظاہر ہے۔ یہاں ہر ہزار آدمی پر ۳۳ پیدا ہوتے ہیں اور ۲۱،۸ مر جاتے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی متمدن ملک میں شرح پیدائش اور شرح اموات اتنی زیادہ نہیں ہے۔ پھر یہاں بچوں کی موت بھی سب سے زیادہ ہے۔ یعنی ہر ہزار بچوں میں ۱۶۷ مر جاتے ہیں۔ اس طرح اس ملک میں

انسانی زندگی اور انسانی قوت اور توانائی کی عظیم بربادی ہوتی ہو۔ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۶ء میں طبی تحقیقات کی کل ہند کانفرنس نے جو اعداد و شمار پیش کیے تھے اُن سے معلوم ہوا ہو کہ ۵۰٫۰۶ لاکھ لوگ ایسی بیماریوں سے مرجاتے ہیں جن کی آسانی سے روک تھام کی جاسکتی ہو۔ اس کی وجہ لوگوں کی جہالت ہو جو انھیں ان بیماریوں کے بچنے کے طریقوں سے ناواقف رکھتی ہو۔ ایک اور اہم سبب یہ ہو کہ ایسے ضروری طبی وسائل نہیں مہیا ہیں جن سے بیماریوں کی روک تھام کی جاسکے۔

۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں ہندستان میں فی کس ۵ر۱۵ گز سوتی کپڑا استعمال میں آتا تھا۔ حالاں کہ لوگوں کی کپڑے کی مناسب ضرورت پوری کرنے کے لیے فی کس ۳۰ گز کپڑا ہونا چاہیے۔

جہاں تک مکانات کا سوال ہو۔ دیہی اور صنعتی دونوں علاقوں میں حالت بہت ردی ہو۔ یہاں پر مسئلہ یہ ہو کہ ایسے موزوں اور مناسب مکانات تعمیر کرائے جائیں جو مندرجہ ذیل شرطوں پر پورے اُتریں۔ جائے وقوع مناسب ہو۔ مکان کا طرز اچھا ہو۔ روشنی اور صاف ہوا کی آمد و رفت ممکن ہو۔ رات کی روشنی کا انتظام ہو۔ مکان کو ضرورت کے مطابق گرم رکھا جاسکے۔ کوڑوں اور ردی اشیا کے پھینکنے کا معقول انتظام ہو۔ اور پانی کی سپلائی کا انتظام کیا جاسکے۔ اسی قسم کے مکانات کی تعمیر کے بعد یہ عام شکایت دور ہو سکتی ہو کہ ہندوستان کے مزدوروں کو مکان میں نہیں بلکہ گودام میں رکھا جاتا ہو۔

یہاں پانچ سال سے اوپر کی عمر کے لوگوں میں صرف ۶ر۱۴ فی صدی خواندگی پائی جاتی ہو۔ جب تک ہندستان کی عظیم اکثریت ان پڑھ رہے گی، اس وقت تک یہاں کی غربت کو دور نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ناخواندگی دور کرنے کے اخراجات زیادہ تر حکومت ہی کو برداشت کرنے پڑیں گے لیکن جہاں تک تعلیم کے اتفاقی اخراجات کا تعلق ہو اُن سے افراد کو چھٹکارا نہیں مل سکتا۔

کمترین معیارِ زندگی کے لیے کتنی آمدنی درکار ہو

اگر ہندستان میں فی کس آمدنی ۶۵ رُپے سے بڑھاکر ۱۳۰ رُپے سالانہ کردی جائے؟ اور اشیا کی قیمتیں جنگ سے پہلے کی سطح پر آجائیں تو ایک ایسا معیارِ زندگی حاصل کیا جاسکتا ہو جس میں ہر فرد کی ادنا ترین ضرورتیں پوری ہو جائیں گی اور ہر فرد کچھ نہ کچھ پس انداز بھی کرے گا۔

مادی اور تہذیبی خوش حالی کے بنیادی یعنی ادنا ترین معیار کو قائم رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت ہوگی:

(۱) متوازن اور صحت بخش غذا۔

(۲) موسمی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی کپڑے۔

(۳) فی کس ۱۰۰ مربع فیٹ جگہ رہنے کے لیے۔

(۴) ہر اسکول جانے کے قابل بچے کے لیے مفت اور جبری تعلیم۔

(۵) طبی آسانیاں، ہسپتال کے اندر بھی مریضوں کے رہنے اور علاج کا انتظام۔ اور ہسپتال کے باہر رہنے والوں کے لیے بھی دواؤں اور علاج کا بندوبست۔ حاملہ عورتوں کے لیے زچہ خانوں کا انتظام۔

(۶) تمام آدمیوں کے لیے روشنی، حمل، نقل، ڈاک بنک اور انشورنس کی آسانیاں۔

(۷) تفریحی سامان اور آسانیاں۔

ہندستان دُنیا کے دوسرے مُلکوں کے مقابلے میں معاشی ترقی کے لحاظ سے کس قدر پیچھے ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔ جن میں ہندستان اور دُنیا کے کچھ دوسرے مُلکوں کی فی کس قومی آمدنیوں کا موازنہ کیا گیا ہے:-

مُلک	سالانہ فی کس آمدنی (رُپیوں میں)
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۱۴۰۶ رُپے
کنیڈا	۱۰۳۸ رُپے
انگلستان	۹۸۰ رُپے
آسٹریلیا	۷۹۲ رُپے
فرانس	۴۲۱ رُپے
جرمنی	۴۰۳ رُپے
جاپان	۲۱۸ رُپے
ہندستان	۶۵ رُپے

مُلک کو غربت اور مفلسی کے دلدل سے نکالنے کے لیے مُلک کی فی کس قومی آمدنی کو کم سے کم وقت میں بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔

ہندستان کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے مسئلے کا بین الاقوامی پہلو

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مُلک کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا سوال محض ایک اندرونی اور قومی سوال ہے لیکن حقیقتاً

ایسا نہیں ہو۔ انگلستان جیسے ملک کے لیے اس سوال کا بین اقوامی پہلو اس کے قومی پہلو سے کسی طرح کم اہم نہیں ہو۔ انگلستان کو جس مصیبت کا سامنا ہو وہ یہ ہو کہ برآمدی تجارت کی توسیع کے بغیر اس جنگ کے بعد کے زمانے میں جنگ سے پہلے کے معیارِ زندگی کو برقرار رکھنا غیر ممکن ہو۔ اِس لیے کہ جنگ کے دوران میں انگلستان نے اپنے غیر ملکی سرمایے کا بیشتر حصہ رہن کر دیا یا بیچ دیا ہو لیکن ہندستان جیسے ملک کے لیے جس کا رقبہ بھی بہت بڑا ہو۔ اور جس کے ذرائع بھی وسیع ہیں، معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے مسئلے کا بین اقوامی پہلو کچھ مختلف قسم کا واقع ہوا ہو۔ ہندستان کو اپنی خوش حالی سب سے پہلے خود اندرونِ ملک کی معاشی ترقی میں تلاش کرنی ہو۔ ہندستان ابھی تک محکوم رہا ہو۔ چناں چہ ہندستان کی سیاسی حیثیت اس کی معاشی توسیع و ترقی کی راہ میں حائل ہو، حکمراں قوم کا معاشی مفاد اور اس کی پالیسی ہندستان کے معاشی مفاد سے متصادم ہوتی ہو اور اس کی معاشی ترقی کو روک دیتی ہو۔ سر اردشیر دلال نے گزشتہ سال کے ایک بیان میں یہ بات صاف کر دی ہو کہ ہندستان کی سیاسی محکومی یقیناً معاشی ترقی کی راہ میں حائل ہو۔

معاشی لحاظ سے پچھڑے ہوئے ملکوں کی امداد کرنا ترقی یافتہ ملکوں کا فرض ہو۔ یوجین اسٹیلی اپنی تصنیف "عالم گیر معاشی توسیع و ترقی" کے صفحہ دس پر لکھتا ہو "صنعتی لحاظ سے جو ممالک ترقی یافتہ ہیں، ان کا مفاد امن و امان سے وابستہ ہو۔ اب جب کہ دنیا میں غربت کوئی ضروری چیز نہیں رہی اور جہاں کچھ لوگوں کے پاس بہت سی دولت جمع ہوگئی ہو، پچھڑے ہوئے غریب علاقوں کی موجودگی ممکن ہو دنیا کے امن و امان کے لیے ایک خطرہ بن جائے۔ غریب ملکوں کے پاس فوجی حفاظت کے ذرائع نہیں ہوتے۔ چناں چہ ہمیشہ ان پر طاقت ور ملک دانت گڑائے رکھتے ہیں۔ یہ عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہو کہ جب تک دنیا کی قومیں کسی با اثر سیاسی تنظیم کے ذریعے اشتراکِ عمل اور تعاون سے کام نہ لیں گی، اس وقت تک امن میں پائے داری نہیں آسکتی لیکن دنیا کے مختلف ملکوں کا معیارِ زندگی اس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہو کہ اس قسم کے تعاون اور اشتراکِ عمل کا حاصل کرنا بہت مشکل ہوگیا ہو۔ اس کے علاوہ تعلیم کی کمی بھی جو کئی پیدائش کی سہیلی ہو قوموں کے باہمی تعاون کو مشکل بناتی ہو۔"

ڈاکٹر سر۔ ٹی۔ گری گوری اپنی کتاب "مشرق میں صنعتی توسیع و ترقی اور مغرب پر اس کا اثر" میں کہتا ہو۔ کہ مشرق کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا واحد طریقہ یہ ہو کہ صنعتی توسیع و ترقی سے کام لیا جائے۔ دنیا کے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں کا فرض ہو کہ کم ترقی یافتہ ملکوں کی صنعتی ترقی میں ہاتھ بٹائیں۔ اس لحاظ سے انھیں خود اپنی معیشت کو بھی ایک نئی صورتِ حال کے مطابق بنانا ہوگا۔

جو ممالک صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ہیں وہ پچھڑی ہوئی قوموں کی صنعتی ترقی کے خلاف یہ اعتراضات پیش کرتے ہیں۔ (۱) اگر دیگر مقامات پر معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کی گئی تو صنعتی ملکوں کا معیارِ زندگی گھٹ جائے گا (۲) پچھڑے ہوئے

ملکوں میں مزدوروں کی تنخواہیں بہت کم ہوتی ہیں۔ چناں چہ جب وہاں صنعتی ترقی شروع ہوگی۔ تو وہ ممالک کم اخراجات سے مال پیدا کرنا شروع کریں گے، اور صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک، جہاں مزدوروں کو زیادہ تنخواہیں دی جاتی ہیں ان ملکوں کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ (۳) غریب ملکوں نے اگر صنعت و حرفت اختیار کرلی تو اس سے صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں کی بیرونی تجارت پر خراب اثر پڑے گا۔

یہ لنگڑی دلیلیں ہرگز ایسی نہیں ہیں کہ ان سے متاثر ہوکر دُنیا کی ترقی یافتہ قومیں اپنے ہم سایہ غریب ملکوں کو بہ دستور مفلسی میں مبتلا رکھنے کی کوشش کریں۔ اِس لیے کہ اس پالیسی کا انجام خود انھی کے حق میں بُرا ثابت ہوگا۔ معیارِ زندگی کے اس قدر پست ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہو کہ اشیا کی پیدائش ناکافی ہو۔ اور اس کے وسائل اور ذرائع ناقص۔ اگر کم ترقی یافتہ ملکوں میں فنی مہارت پیدا ہوجائے۔ چیزیں پیدا کرنے کے زیادہ اچھے سامان مہیا ہوجائیں اور وہاں اشیا کی پیدائش زیادہ ہونے لگے۔ تو ان ملکوں میں اشیا کی کھپت بھی زیادہ ہونے لگے گی۔ اور زیادہ ترقی یافتہ ملکوں کے مال وہاں پہلے سے زیادہ بڑی مقدار میں فروخت ہونے لگیں گے جہاں تک اس خوف کا تعلق ہو کہ سستے مزدوروں والے ممالک بڑے بڑے صنعتی ممالک سے مقابلہ شروع کردیں گے اُسے بہت آسانی سے دُور کیا جاسکتا ہو۔ ترقی یافتہ ملکوں کو چاہیے کہ اپنی صنعتوں میں ایک قسم کی لچک قائم کرنے کی کوشش کریں ایسی نئی نئی صنعتوں کو اپنے وہاں جاری کرنے کی کوشش کریں جن میں منافع کی زیادہ امید ہو۔ اور ایسی صنعتوں سے چمٹے رہنے کی عادت چھوڑ دیں جن میں منافع کے امکانات ختم ہورہے ہیں۔ نئے ملکوں سے جو یہ خطرہ لاحق ہو کہ ان کی صنعتی ترقی دوسرے ممالک کی بیرونی تجارت پر اثرانداز ہوگی اسے بھی دُور کیا جاسکتا ہو اور وہ اس طرح کہ ترقی یافتہ ممالک صنعتی لچکاؤ اور بہاؤ کی پالیسی اختیار کریں۔ بین اقوامی تجارت کو کوئی ٹھیری ہوئی اور جامد چیز سمجھ لینا غلط ہو۔ یہ طریقہ غلط ہو کہ جو کچھ موجود ہو اسی میں حصہ لگانے کی کوشش کی جائے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جو چیزیں موجود ہیں ان کے علاوہ بہت سی اور چیزیں پیدا کی جائیں۔ تاکہ بہت سے ممالک بڑھتی اور پھیلتی ہوئی بیرونی تجارت اور خوش حالی سے فائدہ اٹھاسکیں۔ اور ایک کے فائدے سے دوسرے کو نقصان نہ پہنچے۔ اس سلسلے میں جاپان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مثال سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ جاپان پہلے صنعتی لحاظ سے ایک پچھڑا ہوا ملک تھا بعد میں اس نے ترقی کے منازل طے کیے اور صنعت و حرفت کا مالک بن بیٹھا۔ برخلاف اس کے امریکہ بہت پہلے سے ایک بڑا صنعتی ملک تھا لیکن جاپان کی صنعتی ترقی نے امریکہ کی بیرونی تجارت پر کوئی خراب اثر نہیں ڈالا۔ سنہ ۱۸۷۳ء میں ۸۰۰،۰۰۰ ڈالر کے مال و اسباب امریکہ سے جاپان کو گئے اور سنہ ۱۹۱۳ء میں ۵۸،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر کے۔ سنہ ۱۸۷۳ء میں ۹،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر کے جاپانی مال ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں داخل ہوئے، اور سنہ ۱۹۱۳ء میں یہ مقدار بڑھ کر ۹۲،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر تک پہنچ گئی، اور سنہ ۱۹۳۰ء میں ۲۰۴،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر تک۔

معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے مسئلے کا قومی پہلو

اگر کوئی ملک اپنا معیارِ زندگی بلند کرنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے اپنی ہی کوششوں پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس سلسلے میں بین اقوامی تعاون بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے ضروری یہ بات ہے کہ اشیا کا معیار بلند کیا جائے، کارکردگی میں اضافہ کیا جائے اور اشیا کی مجموعی پیداوار بڑھائی جائے۔ ہندستان میں معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے ترقی کے ایک مکمل پروگرام پر عمل درآمد کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر مقصد حاصل ہو سکتا ہے تو اسی قسم کے مکمل منصوبے سے۔ لندن کے مشہور معاشی رسالے 'اکانومسٹ' کی رائے میں انگلستان میں پیدائشِ اشیا کی فی کس سالانہ شرح کو ½۱ فی صدی سے بڑھا کر ½۲ فی صدی تک لے جانے کی ضرورت ہے تبھی انگلستان اس قابل ہو سکے گا کہ اس بعد از جنگ کے زمانے میں امریکہ جیسے دولت مند ملک کے دوش بہ دوش چل سکے۔ انگلستان میں اشیا کی پیدائش ضرور کم ہو گئی ہے، اور فنی طریقے بھی کچھ پرانے ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک کم ترقی یافتہ ملک ہے۔ لیکن ہندستان میں یقیناً اشیا کی پیدائش غیر ترقی یافتہ حالت میں پڑی رہی ہے۔ اور ضرورت کے مطابق یہاں چیزیں نہیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کی ترقی کو عرصے سے روک رکھا گیا ہے۔ چناں چہ اس وقت ہندستان کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اشیا کی پیدائش کو پوری تیز رفتاری کے ساتھ بڑھایا جائے۔

دوسرے ملکوں میں فی ایکڑ جتنا اناج پیدا ہوتا ہے۔ اس سے اگر ہندستان کا مقابلہ کیا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھا جائے کہ ہندستان کے کاشت کار کو اپنی پیداوار کا کتنا کم حصہ ملتا ہے تو ہندستان کی زراعت خسارے والی معیشت کا نقشہ پیش کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ ہندستان میں زراعتی حالت کو بہتر بنانے کے لیے نظامِ آراضی اور کاشت کاری کے طریقوں کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی زرعی خرید و فروخت کے طریقوں کا بدلنا بھی اشد ضروری ہے۔ زراعت کو صنعتی طریقوں پر چلایا جائے۔ زرعی پیداوار کو بازار میں خرید و فروخت کے لیے لانے سے پہلے اس کو سڑنے اور گلنے سے محفوظ رکھنے کے طریقے کام میں لائے جائیں۔ صنعتی توسیع و ترقی کو فوری طور پر پوری سرگرمی اور تن دہی کے ساتھ عمل میں لایا جائے۔ ایسا کرنا نہ صرف ہندستان کے معاشی حالات کو بہتر بنانے کے لیے بلکہ زراعت سے فالتو لوگوں کو ہٹا کر صنعتی کاموں میں لگانے کے لیے بھی ضروری ہے۔ جس کے بغیر خود زرعی ترقی کا پروگرام کام یاب نہیں ہو سکتا۔ چناں چہ کاشت کاری کے طریقوں کو جدید اور سائنٹی فک بنانے کے علاوہ بڑے پیمانے، چھوٹے پیمانے اور کاٹیج صنعتوں کو بھی ترقی دینے کی سخت ضرورت ہے۔

مالتھس نے کہا ہے کہ "اگر پیداوار کی صحیح اور مناسب تقسیم کا انتظام نہ ہو تو لوگوں میں چیزیں پیدا کرنے کی خواہش اور ارادہ

کا برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہی۔ ہندستان کی زراعت میں اسی چیز کی بڑی کمی ہو۔ ہماری زراعتی حالت اس لیے بھی ردّی ہو کہ کسان کو اپنی محنت کا معقول معاوضہ نہیں ملتا۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۹ء کے پنجاب کے کھیتوں سے متعلق جو اعداد و شمار ملتے ہیں ان سے پتا چلتا ہی کہ فی ایکڑ پیداوار میں جو لاگت آتی ہی اس کا بیس فی صدی سے لے کر ۴۳ فی صدی حصہ صرف مال گزاری کی وجہ سے ہوتا ہی۔ بٹائی زمینوں کی مجموعی آمدنی کا ½ حصہ زمیں دار کا ہوتا ہی۔ جہاں نہریں ہیں وہاں زمیں دار اس سے بھی زیادہ ہتھیا لیتا ہی، یعنی ۷۷ فی صدی تک۔ زراعت کو ترقی دینے کا کسانوں میں اس لیے جذبہ نہیں پیدا ہوتا ہی کہ کسانوں سے بہت زیادہ مال گزاری وصول کی جاتی ہی، اور وہ مقروض اور مفلس و قلاش ہیں۔ کاٹیج صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا زیادہ نفع بیچ کے لوگ ہضم کر جاتے ہیں۔ اور بڑی بڑی صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو اتنی تنخواہیں نہیں دی جاتیں کہ صنعتی علاقوں میں اپنے بال بچّوں کے ساتھ رہ سکیں۔ ان حالات کے اندر جی لگا کر کام کرنے کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔ چناں چہ ضرورت ہی کہ دولت کی اس طرح تقسیم کی جائے کہ قومی آمدنی کا زیادہ حصہ غریب طبقوں تک پہنچ سکے۔ ملک کے عام معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا یہ ایک اہم طریقہ ہمارے سامنے ہی جس کو عمل میں لانے کی ضرورت ہی۔

بمبئی پلان کے نام سے جو معاشی منصوبہ بنایا گیا ہی اس میں یہ تسلیم کیا گیا ہی کہ عام معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے نہ صرف اشیا کی پیداوار بڑھانے بلکہ پیداوار کی مناسب اور مساوی تقسیم کا انتظام کرنے کی بھی ضرورت ہی۔ مندرجۂ ذیل اعداد سے ہندستان میں آمدنیوں کا فرق ظاہر ہو سکتا ہی۔ شہروں میں فی کس اوسط آمدنی ۱۶۶ رُپے کے قریب ہی اور دیہاتوں میں ۵۱ رُپے، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق شہر کی مجموعی آمدنی کا آدھا حصہ شہر میں کام کرنے والوں کے دس فی صدی کے ہاتھوں میں تھا۔ اور جن لوگوں کی آمدنی ۲۰۰۰ رُپے سالانہ سے زیادہ تھی، ان کی مجموعی تعداد کے ۳۸ فی صدی کے ہاتھوں میں اس طبقے کی مجموعی آمدنی کا صرف ۱۷ فی صد حصہ تھا۔ اور ایک فی صد سے بھی کم لوگ مجموعی آمدنی کے ۱۰ فی صد حصّے پر قابض تھے۔

سماجی تحفّظ کی جو اسکیمیں بنائی گئی ہیں ان میں اس بات کی کوشش کی گئی ہو کہ ہر فرد کو ابتدائی ضروریات کی فکر سے بے نیاز کر کے آمدنی کی موجودہ تقسیم جو بہت زیادہ غیر مساوی ہی بدل دیا جائے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہو کہ ہم ان اسکیموں کو یہ سمجھ کر نہ چلائیں کہ غریب مزدور طبقے کی موجودہ بے اطمینانی اس سے ختم ہو جائے گی اور بس۔ ان اسکیموں کے ذریعے دراصل ہمیں مزدور طبقے کی بے اطمینانی اور بے چینی کے اصلی اسباب سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر صحتِ عامہ کی دیکھ بھال کرنے، گاؤں کی صفائی کا انتظام کرنے اور بجلی گیس اور ذرائع آمد و رفت مہیا کرنے کی ذمّے داری حکومت لے لے تو اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ نقد کی شکل میں فی کس جو آمدنی ہوگی اسے مزید اعانت اور مدد ملے گی۔ اس طرح کہ لوگ ان ضروری چیزوں کے لیے جو پیسے خرچ کرتے ہیں وہ بچ جائیں گے۔ ان خدمات کے علاوہ بڑی بڑی آمدنیوں پر ٹیکس عائد کرنا

بھی ضروری ہوگا۔ تب کہیں جا کر دولت کی کم وبیش مساوی تقسیم وجود میں آئے گی اور عام معیارِ زندگی بلند ہوگا۔

دولت کو زیادہ سے زیادہ لوگوں میں پھیلانے کا ایک طریقہ یہ ہو کہ چھوٹے پیمانے کی صنعت اور کاٹیج صنعتوں کو مزید ترقی دی جائے۔

جس معاشی نظام میں اشیا تبادلے کے لیے پیدا کی جاتی ہیں (مثلاً موجودہ معاشی نظام میں) وہاں اشیا کی شرحِ تبادلہ بڑی حد تک تبادلہ کرنے والوں کی آمدنیوں پر اثر ڈالتی ہو۔ یہ ایک بالکل فطری امر ہو۔ اس طرح خرید و فروخت اور قیمت کا اثر تبادلہ کرنے والوں کے معیارِ زندگی پر پڑتا ہو۔ ایسا نہ صرف بین اقوامی تجارت میں ہوتا ہو، بلکہ ہر ملک کی اندرونی تجارت میں بھی۔ اس اصول کے پس منظر میں یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہو کہ شہر کے صنعت ساز، دیہات کے خام اشیا پیدا کرنے والوں سے قیمتیں طے کرنے میں فائدے میں رہتے ہیں اور دیہات والے گھاٹے میں۔

اب ہندستان کی تجارتِ خارجہ کی طرف آیئے تو معلوم ہوگا کہ اس سے بھی ہندستان کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی ہو۔ اس لیے کہ روزگار حاصل کرنے کے تمام مواقع اس تجارتِ خارجہ کے ذریعے ہمیشہ غیر ملکوں کو ہی حاصل ہوتے رہے ہیں۔ اگر ملک کے اندر ہی کچے مال کو صنعتی چیزوں میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو اس سے ملک میں روزگار پیدا ہوتا ہو۔ لیکن اگر ملک کا کچا مال دوسرے ملک میں بھیجا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو کہ ملک کو فائدہ نہیں ہو رہا ہو۔ اگر ہم اپنے ہی ملک کا کچا مال دوسرے ملک میں بھیجیں اور اس کچے مال کی بنی ہوئی صنعتی چیزیں منگوائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم دوسرے ملک کے مزدوروں کے لیے روزگار مہیا کر رہے ہیں۔ اور اپنے ملک کے مزدوروں سے روزگار چھین رہے ہیں۔ ملک کا نظامِ پیدائش اگر کچا مال پیدا کرنے تک محدود ہو تو منافع کم ہوگا۔ لیکن اگر اس کے تحت صنعتی چیزیں پیدا کرنے کا بھی انتظام ہو تو ملک کو زیادہ منافع کی امید ہو۔ اگر کچے مال سے لے کر صنعتی چیزوں تک سب ملک کے اندر ہی تیار ہوتی ہیں تو ملک کی مجموعی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہو۔ لیکن اگر نظامِ پیدائش کو اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ایک ملک صرف کچا مال پیدا کرے اور دوسرا ملک صنعتی چیزیں تیار کرے تو ان دونوں ملکوں کی آمدنی میں بہت بڑا فرق پیدا ہو جائے گا۔

ہندستان آج جس معاشی مسئلے سے دوچار ہو۔ اس کا یہ بالکل تقاضا نہیں کہ ہم دوسرے ملکوں سے سستی صنعتی چیزیں منگائیں۔ ہمارے ملک کا معاشی مسئلہ یہ ہو کہ ملک کے ترقی کرتے ہوئے قدرتی ذرائع کے مطابق یہاں رہنے سہنے کا معیار اونچا ہو اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہو کہ یہاں غیر ملکوں سے راست استعمال کی صنعتی اشیا کا آنا بند ہو جائے۔ اگر ہم یہاں کے آیندہ پھیلنے اور بڑھنے والے معاشی ذرائع پر نظر رکھیں تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ ہندستان میں رہنے سہنے کے معیار کو اونچا کرنے کے تمام سامان موجود ہیں۔ اوپر جو باتیں کہی گئی ہیں ان کا مطلب یہ نہیں ہو کہ بین اقوامی تجارت سے ہندستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

لیکن شرط یہ ہے کہ تبادلے کی شرح نفع بخش ہو۔ تب ہی بین اقوامی تجارت سے ہندستان کے معیارِ زندگی کو اونچا کرنے میں مدد ملے گی۔

معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے سلسلے میں ایک اور چیز کا تذکرہ ضروری ہے۔ اگر مناسب طریقے سے لوگ اشیا کا خرچ کریں تو اس سے معیارِ زندگی کو اونچا کرنے میں مدد ملے گی۔ رُپے کے مناسب خرچ سے روزگار کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور غیر مناسب خرچ سے محدود ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر پی۔ جے۔ ٹامس نے کہا ہے کہ "ہم نے اس طرح رُپیہ خرچ کیا کہ اس سے روزگار کا دائرہ محدود ہوگیا اور اگر ہم نے رُپیہ بچایا بھی تو اس طرح کہ روزگار پہلے سے بھی زیادہ محدود ہوگیا" ہندستان میں دولت مند لوگوں کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ سونا، چاندی، بیش قیمت پتھر اور قیمتی لباس میں خرچ ہوتا رہا ہے اس سے یہاں کے ایک چھوٹے سے طبقے کو فائدہ پہنچا ہے۔ جس کا کام یہ ہے کہ رُپیہ جمع کرے اور اس کو خرچ نہ کرے۔ دولت ایک چھوٹے سے دائرے کے باہر نہیں جاسکتی ہے۔ اگر دولت سماج کے وسیع دائرے میں پہنچنا شروع ہو تو اس سے ہر قسم کے مزدوروں کو روزگار مہیا ہوسکتا ہے۔ معیارِ زندگی یہاں اتنا پست ہے کہ پیشہ ور طبقوں کو کام نہیں ملتا۔ جن لوگوں نے بڑی بڑی رقمیں جمع کر رکھی ہیں اور کاروبار میں نہیں لگاتے ان سے سماج کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ لیکن اگر بچت کی رقموں کو مناسب طریقے سے کاروبار میں لگایا جائے تو اس سے روزگار کی بہتات ہوتی ہے اور بہت سے لوگوں کو کام ملتا ہے۔

اوپر لکھی ہوئی باتوں سے ہم یہ نتیجے نکالتے ہیں۔ معیارِ زندگی کا اتنا پست ہونا ہمارے مُلک کے لیے قابلِ نفرت ہے اور ایک لعنت بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ملک کی قدرتی اور دماغی صلاحیتوں اور ذریعوں کو ترقی کرنے سے روکا جارہا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی جیسے کوئی خود کو اچھی چیزوں سے زبردستی محروم رکھنے کی کوشش کرے۔ ہندستان کی اس عالت سے بین اقوامی جھگڑے اور فساد پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کی معاشی بدحالی پر جمعیتِ اقوام کی رپوٹ سے پتا چلتا ہے کہ ملکوں اور قوموں کے درمیان معیارِ زندگی اور آمدنی کا بہت فرق پایا جاتا ہے اور یہی چیز موجودہ سماجی نظام اور بین اقوامی امن و صلح کے لیے خطرے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد اس خطرے کو دُور کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کو دُور کردینا ضروری ہے۔ چناں چہ کم ترقی یافتہ یا پچھڑے ہوئے مُلکوں کی معاشی ترقی سے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ اس لیے کہ انھیں امن اور چین نصیب ہوگا اور وہ جنگ سے محفوظ رہیں گے۔ چناں چہ ضروری ہے کہ وہ پچھڑے ہوئے مُلکوں کی معاشی ترقی میں ہاتھ بٹائیں۔

نظری معاشیات

سرمائے دارانہ معیشت

از:———— مظہر ح۔ یوسف۔ بی۔ اے (علیگ)

لینن نے علم المعیشت کی تعریف اس طرح کی ہی " یہ وہ علم ہی جو تاریخ کے پس منظر میں مسلسل بدلتے ہوئے سماجی پیداواری نظاموں کا مطالعہ کرتا ہی" مارکس خود "سرمایہ" کے ابتدایے میں لکھتا ہی " . . . . . . میری اس تصنیف کا واحد اور اصلی مقصد موجودہ سرمائے دارانہ نظام کے معاشی قانونِ حرکت کو ظاہر کرنا ہی" دراصل کسی خاص پیداواری نظام کے اندر جو خاص تعلقات ہوا کرتے ہیں اُن کا مطالعہ ہی اور اُن کی ترقی اور زوال کے اسباب کی جانچ ہی مارکس کی معاشی تعلیمات کا نچوڑ ہی۔

سرمائے داری کے محافظ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرمائے داری کا نظام دوامی ہی، اُس کے قوانین دوامی ہیں، اُس کے پیداواری تعلقات دوامی ہیں جنھیں کسی طرح نہیں بدلا جاسکتا۔ اس پردے میں جو مطلب پوشیدہ ہی وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہی۔ وہ مزدوروں کو یہ یقین دِلانا چاہتے ہیں کہ یہ نظام، یہ سرمائے داری یہ نوکرشاہی دوامی ہی، ہمیشہ سے ہی اور ہمیشہ رہے گی۔ اُس کے خلاف آواز اُٹھانا بےکار ہی اور اسے ختم کردینے کے منصوبے بےسود۔ وہ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انسانیت کی بقا کا انحصار بھی اسی سرمائے دارانہ نظام پر ہی۔ سرمائے داری کی موت خود انسانیت کی موت ہوگی۔

لیکن اس بات میں کتنا جھوٹ ہی یہ مارکسی تعلیمات بے نقاب کرتی ہیں۔ مارکسی نظریے کی روشنی میں جب ہم اس مسئلے کا

مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہو کہ کس طرح ماسبق نظام کے کھنڈروں پر موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد رکھی گئی ہو کس طرح آہستہ آہستہ یہ پروان چڑھا ہو اور کس طرح اب خود اس کے اندرونی تنازعات اور تفرقات اسے فنا کی طرف کشاں کشاں لیے جارہے ہیں جس کے بعد ایک بڑا سماجی انقلاب لابدی ہوجائے گا جس میں پرولتاریت کی نمو مزدور اور کسان کی فتح ہوگی۔

انسانیت کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہو کہ ہزاروں سال تک انسان اس زمین پر اس حالت میں رہا ہو جب وہ سرمایے اور سرمایہ داری کے ناموں تک سے ناآشنا تھا۔ کیا یہ اس بات کا بیّن ثبوت نہیں کہ جو قوانین ہم اس نظام میں دیکھتے ہیں وہ نہ تو دوامی ہیں اور نہ ضروری۔ برخلاف اس کے یہ پیداواری تعلقات، یہ مفروضے، یہ قوانین سرمایہ داری کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں اور اسی کے ساتھ ختم ہوجائیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہو کہ علم المعیشت کو صرف سرمایہ دارانہ سماجی نظام کے مطالعے تک محدود کردینا ناسمجھی ہو۔ تاریخ اس کے لیے مشعلِ راہ ہو جس کی روشنی میں علم المعیشت ماضی، حال اور مستقبل کے پیداواری نظاموں کا مطالعہ کرتا ہو۔ چناں چہ اگر اس نظام کے بعد اشتراکیت کا دور آتا ہو جس کی ہیئت، مفروضے اور قوانین سرمایہ داری سے بالکل مختلف ہوں گے تو علم المعیشت اس کا بھی مطالعہ کرے گا۔ اینگلز نے ایک جگہ اس پر روشنی ڈالی ہو۔ "معاشیات اپنے وسیع معنوں میں وہ علم ہو جو تمام اُن قوانین کا مطالعہ کرتا ہو جو مجلسی پیداواری نظام پر کسی نہ کسی شکل میں اثرانداز ہوسکتے ہیں۔" چناں چہ اس تعریف کے پیشِ نظر تمام پیداواری نظام جو ازل سے ابد تک ہوسکتے ہیں، ایک مربوط، مسلسل اور غیر مختتم سلسلہ نظر آتے ہیں جن کا مطالعہ علم المعیشت کا اوّلین فریضہ ہو۔

سرمایہ دارانہ نظام کی دو خصوصیات ہیں اور مارکس کے نزدیک یہی اُس کی فنا کا باعث ہوں گی۔ پہلی یہ کہ اس نظام میں "اشیا" لوگوں کی ضرورتوں کا علم حاصل کیے بغیر پیدا کی جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ نہ صرف محنت کی پیداوار بلکہ خود محنت دوسری اشیا کی طرح ایک تجارتی شو بن جاتی ہو جسے خریدا اور فروخت کیا جاسکتا ہو۔

سرمایہ دار ممالک میں پیداوار کسی خاص منصوبے بندی کے تحت نہیں کی جاتی۔ تمام کارخانے اور فیکٹریاں سرمایہ داروں کی ملکیت ہوتے ہیں۔ وہ سب مختلف اشیا بازار میں بیچنے اور نفع حاصل کرنے کے لیے پیدا کرتے ہیں۔ لیکن کوئی انھیں یہ نہیں بتاتا کہ انھیں ایک خاص وقت میں کون سی شو پیدا کرنی چاہیے اور کس معیار کی۔ کارخانے کے مالکان حسب منشا پیداوار کو کم اور زیادہ کرسکتے ہیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ بیشتر آبادی کو ضروریاتِ زندگی مہیا ہیں یا نہیں۔ اُن سب کو بس ایک چیز سے غرض ہوا کرتی ہو اور وہ ہو نفع، اُن کا ذاتی مفاد! اگر کسی کام میں نفع کی امید ہو تو خواہ وہ کتنا ہی مضر کیوں نہ ہو، تن دہی سے اُس کام کو شروع کردیتے ہیں۔

پیداواری انتشار اور منصوبے بندی کا فقدان سرمایہ دارانہ نظام کے ضروری عناصر ہیں۔ چناں چہ کسی خاص تنظیم کے نہ ہونے اور نفع خوروں کی اس مسلسل تگ ودو کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کی ضرورتوں سے کہیں زیادہ اشیا پیدا ہو جاتی ہیں اور اسی اعتبار سے مزدوروں کی قوتِ خرید کم ہو جاتی ہے۔ بازار میں چیزیں ہونے کے باوجود لوگ خریدنے سے محروم رہتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ پیداوار کا نتیجہ فروخت کے گرنے، بازاروں کے عنقا ہونے، کارخانوں کے بند ہو جانے اور پیداوار کے کم ہو جانے کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ بڑی مقداروں میں چیزیں پڑی رہ جاتی ہیں۔ دُکانوں اور گوداموں میں بڑے بڑے انبار نظر آتے ہیں۔ خام مال، صنعتی اشیا، زراعتی پیداوار "بازار" پر اثر ڈالنا شروع کرتے ہیں۔ اِن مہلک اثرات سے بچنے کی خاطر اور قیمتوں کو گرنے سے روکنے کے لیے سرمایہ دار گوداموں میں آگ لگاکر یا سمندر میں ڈبوکر اشیا کو ضائع کر دیتے ہیں۔ ان حربوں سے وہ کچھ عرصے تک قیمتوں کو چڑھائے رکھتے ہیں لیکن بالآخر انھیں اِس "آشوب" کے سامنے جھکنا پڑتا ہے اور بازار کی قیمتیں گر جاتی ہیں۔ پیداوار کی مقدار کم ہو جاتی ہے جس کے نتائج اور بھی زیادہ مخدوش ثابت ہوتے ہیں۔ بے کار مزدوروں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے۔ لاگتی قیمتیں چڑھنا شروع کر دیتی ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اکثر وبیش تر سرمایہ دارانہ نظام ٹوٹ جاتا ہے۔ بڑے بڑے سرمایہ دار دیوالیہ ہو جاتے ہیں اور ایک مہلک آشوب اپنے قدم جمالیتا ہے۔ ہزاروں مزدور کارخانوں سے نکال دیے جاتے ہیں۔ بے کاری کے ساتھ فقیروں، ڈاکہ زنوں اور طوائفوں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے۔ جو مزدور اور کاری گر کارخانوں میں باقی رہتے ہیں اُن کی اُجرتوں میں کٹوتی کی جاتی ہے جس کی وجہ سے اُن کی قوتِ خرید جو اشیا کی گرانی سے پہلے ہی کم ہو چکی ہے اور بھی کم ہو جاتی ہے۔

اِس "آشوب" کا حل سرمایہ دار تجارتی انجمنوں (CARTELS) اجارہ داریوں اور سامراج میں ڈھونڈتے ہیں۔ چناں چہ نوآبادیات کی تلاش شروع ہوتی ہے "دُنیا کے غیر متمدن" خطّے ڈھونڈے جاتے ہیں یعنی ایسے ملک جہاں صنعتی پیداوار بلند سطح پر نہ پہنچ چکی ہو، جہاں سے سرمایہ دار خام مال سستے داموں خرید سکیں اور اپنی مصنوعات وہاں جاکر فروخت کر سکیں۔

یورپی سرمایہ دار ہمیشہ اس میں پیش پیش رہے ہیں۔ وہ اپنی مصنوعات اپنی مقبوضہ نوآبادیات اور دُوسرے "غیر متمدن" خطّوں میں لے جاتے ہیں۔ دوگنی اور سہ گنی قیمتیں حاصل کرتے ہیں اور وہاں سے کم قیمت پر خام مال لے آتے ہیں۔ مقتدر قوموں نے خصوصاً برطانیہ اور فرانس نے بڑے بڑے ملکوں کو نوآبادیات کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ برطانوی سرمایہ دار بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں: "ہماری سلطنت پر سورج چوبیس گھنٹے چمکتا رہتا ہے"۔ ۱۹۱۳ء اور ۱۸۹۱ء سے پہلے ہی یہ شہنشاہیت پرست سرمایہ دار تمام غیر ترقی یافتہ ممالک کے آپس میں بخرے کر چکے ہیں۔ زیادہ تر حصّے پرانے آزمودہ کار شکاری فرانس اور برطانیہ کے حصّے میں آئے۔ جرمنی، اٹلی اور جاپان چوں کہ دیر میں

اس نوآبادیاتی دسترخوان پر آئے تھے، اس لیے انھیں صرف ٹکڑوں پر قناعت کرنا پڑی۔ لیکن اس تفریق نے ان سرمایہ دار ممالک کے درمیان کش مکش کو اور بھی فروغ دیا۔ مزید علاقوں کے حصول کی صرف ایک ہی صورت رہ گئی تھی —" جنگ ! " —— چناں چہ ہم نے دیکھا کہ ۱۹۱۴ء کے بعد سے آج تک وہ کش مکش جاری ہے۔

بدیسی بازاروں کو یہ سرمایہ دار اس طرح حاصل کرتے ہیں کہ وہاں بہت سا تجارتی مال لے جاکر بھر دیتے ہیں۔ اس کو زائد ڈھلین (DUMPING) کہتے ہیں۔ اِس سے اُس ملک کا قومی پیداواری نظام جو بیشتر اپنے ابتدائی منازل میں ہوتا ہے، درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس سے دو فائدے اور ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ اپنی پیداوار میں کمی کیے بغیر اپنے ملک میں قیمتیں زیادہ رکھی جا سکتی ہیں۔ دوسرے بڑے پیمانے پر پیدا کرنے میں جو بچت ہوتی ہے وہ بھی نفع کے طور پر حاصل ہوتی ہے۔ زائد ڈھلین کی مثالیں ہمیں بہ آسانی مل سکتی ہیں۔ لڑائی سے پہلے جرمنی میں لوہے اور فولاد کے اجارے دار کارخانے ہر مہینے اخباروں میں جو قیمتوں کی فہرست دیا کرتے تھے اُس میں ہر چیز کی دو قیمتیں ہوتی تھیں، ایک " قومی بازار" کے لیے، دوسری تقریباً پہلی سے تہائی " بدیسی بازاروں " کے لیے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ محکوم اور پست اقوام کے سرمایہ دار حاکم قوم کے سرمایہ داروں سے ساز باز کر کے خود ہی اپنے بھائیوں کو لوٹتے ہیں ——— لیکن مارکس کے نزدیک یہ صرف اسی وقت تک ممکن ہے جب تک اُن محکوم قوموں میں جماعتی شعور اور سیاسی بیداری نہیں ہوتی۔ سرمایہ داروں کی یہ لوٹ کھسوٹ عوام الناس کو ہوشیار کر دیتی ہے۔ جوں جوں سرمایہ دار زیادہ مال دار ہوتے جاتے ہیں، مزدوروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ سرمایہ داروں کی غاصبانہ ذہنیت کا احساس اور سیاسی شعور بڑا محرک ثابت ہوتا ہے اور ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ!

شہنشاہیت سرمایہ دار اجارے داروں کے استحصال کی گویا معراج ہوتی ہے جس کے بعد اُس کا زوال ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ لینن نے ایک جگہ لکھا ہے " . . . . . . شہنشاہیت سرمایہ داری کی ترقی کا وہ انتہائی عروج ہوتا ہے جس کے بعد اُس کی پستی لابُدی ہو جاتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں سرمایہ 'قومی حدود' سے تجاوز کر چکا ہے۔ اُس نے تجارتی مقابلے کی جگہ اجارے داریاں قائم کر دی ہیں اور اس طرح اُن تمام اندرونی اور خارجی عناصر کو خود ہی پروان چڑھایا ہے جو اشتراکیت کے ارتقا کے ضامن ہوتے ہیں۔"

لیکن مارکسی نظریے کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت محنت اور سرمایہ کے تنازع کی تشریح ہے۔ سرمایہ داری میں محنت دوسری اشیا کی طرح خود ایک " شے " بن جاتی ہے جسے سرمایہ دار بہ آسانی خرید سکتا ہے۔ محنتی قوت کی تعریف مارکس نے یوں کی ہے کہ " محنت یا مزدور کی اہلیت سے ہمیں وہ تمام ذہنی اور جسمانی قابلیتوں کا مجموعہ مراد لینا چاہیے جو کوئی انسان کسی طرح کی قدر پیدا کرنے کے کام میں لاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں محنت، انسان کے کام کرنے کی قوت کو کہتے

ہیں"۔ مارکس کے نزدیک ساری مشکل یہ ہی کہ سرمایہ دار اپنے رُپے سے محنتی قوت خریدتا ہی لیکن اس کی جگہ وہ خود محنت (مزدور) پر قابض ہوجاتا ہی۔

سرمایہ داری نظام میں محنتی قوت ایک شی بن جاتی ہی جسے خریدا بھی جاسکتا ہی اور بیچا بھی۔ پھر بھی یہ کہنا کہ ایسا ہمیشہ سے رہا ہی غلط ہی۔ ایک معمولی کسان یا مزدور کو فرض کر لیجیے جو اپنی زمین کے چھوٹے سے قطعے پر کاشت کرتا ہی یا اپنی دکان میں کام کرتا ہی۔ بعد میں وہ اپنی پیداوار کو فروخت کرتا ہی لیکن اپنی محنتی قوت کو نہیں۔ وہ اس قوت کو خود کام میں لاتا ہی۔ لیکن یہ اسی وقت تک ممکن ہی جب تک وہ اُس زمین اور اُس دُکان کا مالک ہی۔ اب ذرا اُس مزدور سے اُس کے اوزار چھین لیجیے، اُس کاشت کار کی زمین غضب کر لیجیے۔ پھر اُس کے پاس سوائے اس بات کے کہ بھوک اور فاقے سے بچنے کی خاطر کسی کارخانے میں نوکر ہوجائے کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

اس طرح سرمایہ داری کے ارتقا کے لیے یہ ضروری ہی کہ ایک جانب سوسائٹی کے چند مٹھی بھر افراد ہوں جن کے قبضے میں تمام پیداواری ذرائع ہوں اور دوسری جانب مزدوروں کی ایک بڑی فوج ہو جو سرمایہ داروں کے ہاتھوں اپنی محنت فروخت کریں لیکن اس کی قیمت کون مقرر کرتا ہی؟ یہاں پر مارکس اپنا نظریۂ قدر پیش کرتا ہی جسے ہم نظریۂ محنت کہہ سکتے ہیں۔ مارکس کے نزدیک ہر "شے" کی قدر وہ محنت متعین کرتی ہی جو اس کے حصول میں صرف کی گئی ہو۔ محنت سے اس کی مراد عام انسانی استعدادِ محنت ہی۔ پھر آخر اس وقتِ محنت کی قدر کس طرح مقرر کی جائے؟ یہ تو ظاہر ہی کہ ایک انسان صرف اُسی وقت کام کرسکتا ہی جب وہ معاشی فکروں سے آزاد ہو، اُسے ضروریاتِ زندگی بہ آسانی مہیا ہوں۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہی کہ وقتِ محنت کی قدر اُس کی ضروریاتِ زندگی ہیں لیکن سرمایہ داری میں روٹی، کپڑا اور مکان سب اشیا ہیں اور انھیں بھی پیدا ہی کیا جاتا ہی جس میں پھر انسانی محنت کی ضرورت ہوتی ہی۔ چناں چہ مارکس "سرمایہ" میں لکھتا ہی۔" ایک معمولی مزدور کی عام ضروریاتِ زندگی ہی اس کے وقتِ محنت کی قدر کو متعین کرتی ہیں۔ وقتِ محنت کی یہی قدر سرمایہ دار اجرتوں کی شکل میں دیا کرتے ہیں"۔

کسی چیز کی قیمت بالعموم اصلی قدر سے متعین ہوا کرتی ہی، پھر بھی روزمرہ کی زندگی میں بازاری قیمت اصلی قدر سے اکثر کم و بیش ہوتی ہی۔ تاہم وقتِ محنت کی قدر دوسری اشیا سے مختلف اکثر و بیشتر اصلی قدر سے کم ہوتی ہی یعنی بیشتر حالات میں مزدور کو اُس کی اصلی قیمت سے کم اُجرت ملتی ہی۔ لیکن یہ کمی کیوں معرضِ وجود میں آتی ہی، اس کا حل ہمیں مارکس کی "قدرِ زائد" کی توضیح میں ملتا ہی۔ قدرِ زائد دراصل اُس محنت کی پیداوار ہوتی ہی جس کی اُجرت سرمایہ دار مزدور کو نہیں دیتا اور جسے ہم محنتِ زائد سے منسوب کرتے ہیں۔ ہوتا یوں ہی کہ جس طرح پیداواری نظام میں سرمایہ دار عمارت، قوت اور مشین استعمال کرتا ہی بعینہٖ وہ مزدور کو بھی استعمال کرتا ہی چناں چہ دوسرے اجزا کی طرح مزدور کو بھی سرمایہ دار صرف اتنی ہی اُجرت دیتا ہی جس سے وہ

بمشکل اپنا پیٹ بھر سکے۔ یہ اُجرت اُس قدر سے بے حد کم ہوتی ہے جو وہ اپنی محنت سے پیدا کرتا ہے۔ مارکس نے خود بتایا ہے "وقتِ محنت کی قدر اور اُس وقت کے دوران میں پیدا شدہ قدر قطعی مختلف چیزیں ہیں جن کا فرق جاننا بے حد ضروری ہے۔" چنانچہ اگر مزدور کُل ۱۰ گھنٹے کام کرتا ہے تو اس میں سے ۵ گھنٹے میں وہ اپنے پیٹ کے لائق پیدا کر لیتا ہے، دوسرے نصف حصے میں وہ سرمایے دار کے لیے قدرِ زائد پیدا کرتا ہے۔"

سرمایے داروں کا یہ کہنا کہ قدرِ زائد تو سرمایے کی پیداوار ہے اور مزدوروں کی محنت سے اُس کا کوئی تعلق نہیں بالکل غلط ہے۔ سرمایہ قدرِ زائد کا خالق ہرگز نہیں۔ اُس کی خالق تو وہ محنتِ زائد ہی ہے جو غریب مزدوروں اور کسانوں سے بیگار کے طور پر وصول کی جاتی ہے۔ دُنیا میں جہاں کہیں بھی جماعتی تفریق موجود ہے، جہاں بھی دو جماعتیں موجود ہیں، ایک سرمایے دار جاہ طلب نفع خور سرمایے داروں کی اور دوسری طرف غریب اور مجبور مزدوروں کی وہاں مزدوروں سے زائد محنت لی جاتی ہے، سرمایے دار اُسے اپنا حق سمجھتے ہیں۔ سرمایے دارانہ نظام کی زائد محنت کی یہ پیاس کبھی نہیں بجھتی۔ اور نہ کبھی بجھ سکتی ہے۔ یہ بڑھتی ہی جا رہی ہے کیوں کہ ہر سرمایے دار دوسرے سے بڑھ کر نفع حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس قدرِ زائد کو بڑھانے کی سرمایے دار کے پاس بے شمار چالیں ہوتی ہیں۔ ہم دراصل محنت کو دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک سماجی ضروری محنت جو قدر پیدا کرتی ہے وہ مزدور کو اُجرت کی شکل میں واپس مل جاتی ہے۔ لیکن محنتِ زائد کی پیداوار قدرِ زائد ہوتی ہے جو سرمایے دار غصب کر لیتا ہے۔ بالعموم قدرِ زائد دو طرح سے بڑھائی جا سکتی ہے۔

اگر کسی کارخانے میں مزدوروں کو دن میں ۱۲ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے جس میں سے ۶ گھنٹے سماجی ضروری محنت ہوتی ہے اور ۶ گھنٹے محنتِ زائد۔ تو اوقاتِ محنت کو بڑھا کر بہ آسانی قدرِ زائد میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر مزدور سے ۱۴ گھنٹے کام لیا جائے تو ۶ گھنٹے تو ضروری محنت ہوگی لیکن محنتِ زائد میں یقیناً ۲ گھنٹے کا اضافہ ہو جائے گا۔ بلا شبہ قدرِ زائد بھی بڑھ جائے گی۔ (مطلق قدرِ زائد)

ایک دوسرا طریقہ ضروری اوقات کو کم کرنا ہے۔ فرض کیجیے سرمایے دار زیادہ بہتر مشین استعمال کرتا ہے یا کسی اور فنی اصلاح کے ذریعے ضروری اوقات ۶ کی جگہ صرف ۴ گھنٹے رہ جاتے ہیں۔ چوں کہ اب بھی مجموعی محنت ۱۲ گھنٹے رہتی ہے لہٰذا محنتِ زائد ۸ گھنٹے ہو جائے گی جس میں پیدا کی ہوئی قدر یقیناً پہلے سے زیادہ ہوگی۔ (اضافی قدرِ زائد)

ہوتا یوں ہے کہ شروع میں ایک سرمایے دار کسی خاص صنعت میں فنی اصلاح کر کے قدرِ زائد زیادہ حاصل کر لیتا ہے، لیکن بہت جلد دوسرے سرمایے دار اُس کی نقل کرتے ہیں اور جلد ہی تمام سرمایے دار ایک ہی سطح پر پہنچ جاتے ہیں۔ سرمایے دارانہ نظام میں فنی اصلاح کی محرک صرف یہ قدرِ زائد کی طمع ہوتی ہے۔ نفع کی یہ دوڑ مسلسل جاری ہے۔ لاکھوں مزدوروں

کی جیب کاٹ کر ایک ایک سرمایہ دار موٹی اسامی ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کی آپس کی دوڑ چھوٹے سرمایہ داروں کو ختم کرتی رہتی ہے۔ متوسط طبقے کے افراد آہستہ آہستہ پس کر عوام الناس میں ملتے جاتے ہیں۔ مزدوروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ تعداد کے ساتھ ہی اُن کی قوت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے جب سارے روپہلی بندھنیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اُجرتی غلامی مزدوروں میں سیاسی اور معاشی شعور پیدا کر دیتی ہے۔ مزدور اور سرمایہ دار میں جنگ ہوتی ہے، سرمایہ داری کا نظام فنا ہو جاتا ہے اور اشتراکی نظام اس کی جگہ لے لیتا ہے اور لینن کے اعلان کے مطابق مارکسی علم المعیشت اس نئے نظام کا خیر مقدم کر کے، اُس کا معاشی مطالعہ شروع کر دیتا ہے۔

صنعتی پستی اور مزدور

از : ——— ابو سالم ام۔ اے (علیگ)

ہماری صنعتی تاریخ کی یہ ایک مشہور بات ہے کہ انگلستان میں صنعتی انقلاب کے بعد سے انگریزی حکومت نے منظم طور پر ہندستانی صنعتوں کی تباہی کی کوشش کی۔ صنعتی انقلاب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کا مفاد یہ تھا کہ ہندستان سے زیادہ سے زیادہ سامان زیادہ سے زیادہ قیمت پر بیرونی ممالک کو برآمد کیا جائے تاکہ اس طرح زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جا سکے۔ صنعتی انقلاب کے بعد انگلستان میں جو طبقہ برسر اقتدار آیا وہ مل مالکوں اور کارخانے داروں کا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے برعکس ان کا فائدہ اس میں تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مہنگے داموں پر اپنا بنایا ہوا زیادہ سے زیادہ سامان ہندستان اور دوسرے ممالک کو بھیجیں۔ اب سے پہلے انگلستان اپنی ضرورت کی چیزیں خود نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی ضرورتیں کہیں اور سے پوری ہوں۔ لیکن اس انقلاب کے بعد وہ نہ صرف اپنی ضرورتیں پوری کرنے لگا بلکہ اب اسے مال باہر بھیجنے کی بھی ضرورت پیش آئی۔ صنعتوں کے لیے خام پیداوار کی بھی ضرورت تھی، اس کی نظر انتخاب ہندستان پر پڑی۔

چنانچہ صنعتی انقلاب کے بعد انگریز کارخانے داروں کا سب سے پہلا اور سب سے اہم کام قدرتاً یہ قرار پایا کہ ہندستان میں [illegible] اشیاء کی پیداوار کا سلسلہ ختم کر دیا جائے کیونکہ اگر ہندستان میں بھی یہ چیزیں بنتی رہتیں تو انگریزی سامان کی کھپت سکتی [illegible] وہ کیسے [illegible] نہیں ہو سکتا۔ [illegible] اس سے نتائج کا ہندستان کی بیرونی تجارت کے [illegible]

اصلی اندازہ ہوتا ہے۔ ہندستانی پارچہ باف انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے تک بہت کافی مقدار میں کپڑا برآمد کرتے تھے لیکن ۱۸۱۴ء ... درمیان برآمدی تجارت سوا ملین گز سے گھٹ کر محض تین لاکھ گز رہ گئی۔ یہی نہیں اب پالسہ پلٹ چکا تھا اور اب خود انگلستان بہت کافی مقدار میں کپڑا برآمد کرنے لگا تھا۔ چناں چہ اسی دوران میں انگریزی کپڑے کی برآمد میں ۵۰ گنا اضافہ ہوا۔

اس حکمت عملی کے طفیل نصف صدی کے اندر اندر ہندستان میں غیر زرعی صنعتوں کی کمر ٹوٹ گئی اور ہندستان جو اس وقت غیر زرعی اشیا کی پیداوار کا (مثلاً پارچہ بافی) دنیا میں شاید سب سے بڑا مرکز تھا محض ایک پس ماندہ زرعی ملک بن کر رہ گیا۔ مشینی صنعتوں کی آمد سے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی تباہی تو ایک حد تک ناگزیر تھی۔ کیوں کہ کثیر مقدار میں جب چیزیں بنتی ہیں تو مصارف کم ہو جاتے ہیں۔ مشینی صنعتوں کی بنی ہوئی چیزیں ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں سستی ہوتی ہیں۔ مشینی صنعتوں کی آمد ہر جگہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی موت کا پیام لائی۔ لیکن ہمارے ملک کو دوگنی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزی مشینوں کے بنے ہوئے سامان کی بھرمار نے ہماری اپنی صنعتوں کو فنا کر دیا۔ اس طرح جو لوگ بے کار ہوئے ان کے لیے کسی نئے روزگار کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ انگریزی حکومت نے اس بات کی کوئی کوشش نہیں کی کہ خود ہندستان میں مشینوں سے چیزیں بننے لگیں۔ اس کے برعکس اس کی پوری کوشش یہ رہی کہ ہر ممکن طریقے سے اس تبدیلی کو روکا جائے۔ چناں چہ ہمارے شہروں اور دیہاتوں کے بسنے والے صناع جنھیں انگریزی مشینوں نے بے کار کر دیا تھا روزی کی تلاش میں اس بات پر مجبور ہو گئے کہ پھر گانو کا راستہ لیں۔ زراعت ہی روزی کے حصول کا واحد ذریعہ رہ گیا۔ اور زمین کی حالت یوں بھی کچھ بہت اچھی یا قابل اطمینان نہیں تھی۔ کھیتی کرنے والے مشکل سے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ کھیتی کرنے والوں کی اس کثرت نے زراعت سے روزی حاصل کرنا اور بھی دشوار بنا دیا۔ اس طرح انگریزی حکومت کی پالیسی نے ایک طرف تو ہندستان کی صنعتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسری طرف ایسے حالات پیدا کر دیے کہ زراعت بھی جس پر اب آبادی کے اور بھی بڑے حصے کا دار و مدار تھا پھل پھول نہ سکی۔

ہندستان کو اس طرح ایک پڑا زرعی ملک بنائے رکھنے کی پالیسی حکومت کی مستقل پالیسی رہی ہے۔ تاکہ یہاں سے خام پیداوار حاصل کی جائے اور یہ ملک انگریزی سامان کے لیے ایک بڑی منڈی بن سکے۔ ۱۹۱۲ء میں ایک تقریر میں سر پیٹرک پلے فیر نے پچھلے سو سال ہی کی اس انگریزی حکمت عملی کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہندستان کو ایک زرعی ملک رہنا چاہیے جہاں بھاری مقدار میں اور کافی قیمت کی فصلیں پیدا کی جائیں۔" اس پالیسی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ہندستانی کاریگر جو اب سے پہلے پارچہ بافی اور اسی طرح کے دوسرے کاموں سے اپنی روزی حاصل کرتے تھے، اپنا پیٹ پالنے کے لیے زراعت

کا سہارا لینے پر مجبور ہوئے تھے۔ سو سال پہلے ہندستان کی صرف نصف آبادی زرعی کاموں میں مشغول تھی، لیکن انیسویں صدی کے اختتام پر تقریباً دو تہائی آبادی کے لیے زراعت کے علاوہ اور کوئی سہارا نہیں رہ گیا۔ اور آج تقریباً تین چوتھائی ہندستانی کھیتی باڑی میں لگے ہوئے ہیں۔

انیسویں صدی کے ہندستان کی معاشی تاریخ میں دو رجحانات نظر آتے ہیں۔ ایک تو ہندستانی صنعتوں کی تباہی لیکن اس دوران میں ہندستان میں کان کنی جاری تھی (کیوں کہ اس سے انگریزی حکومت کی اس خواہش پر کوئی نامناسب اثر نہیں پڑتا تھا کہ ہندستان میں مشینی صنعتیں فروغ نہ پائیں) دوسرا رجحان اس کے بالکل برخلاف تھا۔ ہندستان سے خام پیداوار حاصل کرنے اور انگریزی سامان ہندوستان کے اندرونی حصے میں پہنچانے کے لیے بھی تھوڑی بہت صنعتی ترقی ناگزیر تھی۔ اس سلسلے میں ساری کوششیں اسی مقصد میں صرف کی گئیں کہ صنعتی سرمایے داری کے لیے استحصال کی نئی راہیں اور نئے ذرائع پیدا ہو جائیں۔ چناں چہ ریلوں کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات ملکی ترقی کے مرادف تھی۔ مارکس نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا "مجھے معلوم ہے انگریز ہندستان کو ریلوں کا تحفہ دینے والے ہیں ان کا منشا یہ ہے کہ اپنی صنعتوں کے لیے کم خرچ پر روئی اور دوسری خام پیداواریں حاصل کریں۔ لیکن اتنے وسیع و عریض ملک میں ریلوں کا ایک جال بچھانا اس وقت تک ممکن نہیں ہوگا جب تک ملک میں وہ دوسری صنعتیں بھی شروع نہ کی جائیں جو ریلوں کی روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہیں . . . . ریلوں کی آمد ہندستان میں صنعتی ترقی کا نقطہ آغاز ثابت ہوگی۔"

یہ پیشین گوئی ایک حد تک صحیح ثابت ہوئی۔ لیکن زیادہ نمایاں پہلا ہی رجحان رہا اور وہ تھا ہندستانی صنعتوں کی تباہی کا رجحان۔ صنعتی ترقی کی رفتار بہت ہی مدھم تھی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں موجودہ مشینی صنعتوں میں کام کرنے والوں کی تعداد حسب ذیل تھی۔ ان صنعتوں میں کارخانے بھی شامل ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی صنعتیں اس سے الگ ہیں۔

کارخانوں میں	تقریباً ۵ لاکھ افراد
کانوں میں	" ایک لاکھ "
ریلوں میں	" ساڑھے تین لاکھ "

مجموعی طور پر ایسے کارخانوں میں جو زمانۂ حال کی صنعتی سرمایے داری کے اصولوں پر کام کرتے تھے صرف ۱۰ لاکھ افراد کام کرتے ہوں گے۔ اگر ہم مختلف صنعتی پیشوں کا جائزہ لیں اور صرف ایسے کارخانوں کو سامنے رکھیں جن میں ۵۰ یا ۵۰ سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں تو صنعتی مزدوروں کی یہ پیشہ وارانہ تقسیم ہوتی ہے۔ اگر ہم تیل کے کارخانوں کو الگ کر کے دیکھیں تو معلوم ہوگا

کہ ۱۹۱۱ء اوسط اور بڑے پیمانے کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی آدھی آبادی کپڑے کے کارخانوں
میں کام کرنے والوں پر مشتمل تھی۔ لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں صرف ۱۰ فی صدی کام کرتے تھے۔ آئیے اس سلسلے میں
پھر انگلستان کی صنعتی تاریخ پر ایک سبق آموز نظر ڈال لیں۔ انیسویں صدی کے ابتدائی ایام میں صنعتی مزدوروں میں کپڑے کے
کارخانوں میں کام کرنے والوں کی اکثریت تھی۔ لیکن وہاں اس وقت بھی لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں کام کرنے والوں کی
تعداد اتنی کم نہ تھی۔ ان کارخانوں سے برطانوی کپڑے کی ملوں کو مشینیں مہیا ہوتی تھیں۔ ساتھ ہی برِ اعظم کے دوسرے
ممالک کو بھی ضروری مشینیں برآمد کی جاتی تھیں۔ اس کے برخلاف ہندستان میں سنہ ۱۹۰۱ء تک ایسی مشینیں بنانے
کے کارخانے مفقود تھے جن سے دوسری عام استعمال کی چیزیں بنائی جاسکیں۔ آج بھی اس لحاظ سے ہماری معاشی زندگی
میں خلا ہے۔ ہماری صنعتی زندگی اس انداز سے تعمیر ہوئی ہے کہ ہمیں مشینوں کے لیے تمام تر درآمد پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔
اور ایسی چیزیں زیادہ تر انگلستان ہی سے آتی ہیں۔ ہندستان میں سنہ ۱۹۰۱ء تک صنعتوں کو اس غلامی سے آزاد کرنے کی کوئی
کوشش شروع نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ ہماری معاشی زندگی کی قسمت کے مالک، انگریزوں نے اس بات کی پوری احتیاط
برتی تھی کہ اس طرح کی کوئی غلطی ہونے نہ پائے۔ آج بھی حالات کچھ بہتر نہیں ہیں۔

بیسویں صدی میں کارخانوں، کانوں اور ریلوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد میں بہت کافی اضافہ ہوا ہے۔
سنہ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ کارخانوں میں کام کرنے والوں کی تعداد ۱۶ لاکھ تھی، اور کانوں میں ۲ لاکھ ۷۰ ہزار اور ریلوں میں ۷ لاکھ
افراد کام کر رہے تھے۔ صنعتی مشغولیت کی جو اعداد پیچھے دی گئی ہیں ان سے مقابلہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سنہ ۱۹۰۱ء کے مقابلے میں
کارخانوں میں کام کرنے والوں کی تعداد میں تقریباً تین گنے کا اضافہ ہوا ہے۔ کانوں میں کام کرنے والوں کی تعداد ڈھائی گنی ہو گئی
ہے۔ ریلوں کے مزدوروں کی تعداد دُگنی ہو گئی ہے۔ لیکن مختلف صنعتوں میں ان کی تقسیم کیوں کر ہوئی ہے؟ سنہ ۱۹۳۶ء میں ایسے
مزدوروں کی مجموعی تعداد ۱۶٫۵۰٫۰۰۰ تھی۔ اس میں ۹ لاکھ کپڑے کے کارخانوں میں کام کرنے والے ہیں۔ انجنیری اور
دھات کے کارخانوں کے مزدوروں کی تعداد محض ڈھائی لاکھ تھی اور دوسرے مزدوروں کی تعداد ۵ لاکھ۔ ان میں نصف
سے زیادہ اب بھی وہ مزدور ہیں جو کپڑے کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ اور اگر ریلوں کے کارخانوں اور حکومت،
میونسپلٹیوں وغیرہ کے ملازموں کو الگ کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں کام کرنے والوں کا تناسب اب بھی
دس فی صدی سے زیادہ نہیں ہے یعنی وہی جو پہلے تھا۔ ان اعداد سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کارخانوں میں کام کرنے والوں کی تعداد
میں اضافے کے باوجود ہندستانی صنعتوں کا بنیادی نقشہ سنہ ۱۹۰۱ء سے مختلف نہیں ہے۔ یہ صنعتی ڈھانچہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ
ہمیں معاشی لحاظ سے کوئی آزادی حاصل نہیں ہے۔ لیکن یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ خود ہماری صنعتی ترقی ہماری صلاحیتوں سے

کہیں کم ہے۔ ہماری آبادی کا بہت ہی معمولی سا حصہ کارخانوں میں کام کرکے اپنا پیٹ پالتا ہے۔

ان مزدوروں کی زندگی کیوں کر گزرتی ہے؟ سب سے پہلے تو ان کی اجرتوں کے مسئلے پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ ذیل کا اشاریہ جس میں سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۳۸ء کے اعداد کا مقابلہ کیا گیا ہے اس سلسلے میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(سنہ ۱۹۰۰ء = ۱۰۰)

	سوتی کپڑوں کے کارخانے	جوٹ کے کارخانے	ریلیں	کانیں
سنہ ۱۹۰۰-۰۹ء	۱۰۶	۱۰۶	۱۰۹	۱۱۹
سنہ ۱۹۱۰-۱۹ء	۱۴۴	۱۲۸	۱۳۹	۱۶۶
سنہ ۱۹۲۰-۲۹ء	۲۷۳	۱۹۴	۲۴۵	۲۵۵
سنہ ۱۹۳۰-۳۸ء	۲۴۳	۱۴۸	۲۸۶	۱۹۱

اس اشاریے سے پتا چلے گا کہ پہلی جنگِ عظیم کے ختم ہونے تک تمام صنعتوں میں اُجرتیں بڑھتی رہیں۔ اُجرتوں میں اضافے کی رفتار بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ کانوں میں کام کرنے والوں کی اُجرتیں شاید مستثنیٰ سمجھی جاسکتی ہیں۔ جنگ کے دوران میں سوتی کپڑے کے کارخانوں اور کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی اُجرتوں میں عام اوسط سے زیادہ اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۲۹ء تک عام کساد بازاری کی آفت کے نزول سے پہلے اُجرت کے لحاظ سے صنعتوں کے دو گروپ بن گئے تھے۔ ایک میں تو سوتی کپڑوں کے کارخانے اور کانیں تھیں جن میں اجرتیں اوسط سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ دوسرے ریلیں بھی اس گروپ میں کافی ممتاز تھیں۔ ریل مزدوروں کی اُجرتوں میں جنگ کے بعد کافی اضافہ ہوا تھا۔ پھر جوٹ اور دوسرے کارخانے تھے۔ جہاں مزدوروں کی مروجہ اُجرتوں میں پہلے تین پیشوں کے مقابلے میں بہت کم اضافے ہوئے تھے۔

مزدور کے لیے اُجرتیں صرف اس لیے اہمیت رکھتی ہیں کہ اُن سے اُسے قوتِ خرید حاصل ہوتی ہے۔ اس قوتِ خرید سے وہ اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس لیے معیارِ زندگی کے تعین کے لیے اجرتوں کو مروجہ قیمتوں کے ساتھ رکھ کر دیکھنا چاہیے۔ اس سلسلے کے اعداد ذیل کے اشاریے میں دیے گئے ہیں۔

(سنہ ۱۹۰۰ء = ۱۰۰)

	اُجرتیں (روپوں کی شکل میں)	مصارفِ زندگی	حقیقی اُجرتیں
سنہ ۱۹۰۰-۰۹ء	۱۰۷	۹۷	۱۱۱
سنہ ۱۹۱۰-۱۹ء	۱۳۵	۱۴۳	۹۸

سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء	۲۱۱	۲۰۷	۱۰۳
سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء	۱۸۴	۱۴۳	۱۲۹

پہلی جنگِ عظیم تک نقد اجرتوں میں تو اضافہ ہوتا رہا لیکن حقیقی اجرتوں کی رفتار بالکل مختلف رہی ہو۔ اکثر سال بہ سال ان میں بڑی نمایاں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مجموعی حیثیت سے ان کا رُخ نیچے کی طرف رہا ہو۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اور اس جنگ کے فوراً بعد نقد اُجرتیں بڑھتی رہیں لیکن حقیقی اُجرتوں میں خاصی کمی آگئی۔ جنگِ عظیم کے کچھ سال بعد پہلا ردِ عمل تو یہ ہوا کہ حقیقی اجرتوں میں کچھ اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد بھی حقیقی اُجرتیں بڑھتی رہیں اور ان میں نمایاں اضافہ ہوا لیکن یہ اعداد گمراہ کن ہیں۔ کیوں کہ اُجرتوں کے متعلق یہ اعداد مجموعی اعداد پر مبنی ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ عیسوی کے بعد بے روزگاری اور کام کی قلت سے جو نقصان ہوا تھا وہ اس میں شامل نہیں ہو۔ اگر ان باتوں کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تو شاید یہی نتیجہ نکلتا کہ سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں اُجرتیں سنہ ۱۸۹۰-۱۹۰۰ء کے مقابلے میں بہت کم تھیں۔ اُجرتوں کی ادائگی میں ہندستان میں بہت سی بے قاعدگیاں بھی رائج ہیں۔ ہندستان کے بہت سے حصّوں میں مزدوروں کو اپنی اُجرت کا ایک معمولی حصّہ ہی نقد کی صورت میں ملتا ہو باقی اُجرت کے بدلے انھیں ٹکٹ ملتا ہو جس سے وہ کارخانے کی دُکان سے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے ہیں۔ جب معاشی کساد بازاری کا زمانہ ہوتا ہو تو کارخانے دار ایک طرف تو اجرت میں کمی کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف مِل کی دُکان کی چیزوں کی قیمتیں بڑھا دیتے ہیں۔ اس سے پہلے جُرمانوں کا بھی بہت رواج تھا۔ سنہ ۱۹۳۶ء کے ایک قانون سے جرمانے کی رقم محدود کر دی گئی ہو۔ اس قانون سے مزدوروں کو تھوڑی بہت مدد ضرور ملی ہو لیکن مزدوروں سے متعلق ہندستان میں جو قوانین بنے ہیں ان پر کچھ بہت سختی سے پابندی نہیں ہوتی۔

اُجرتوں کا ذکر ختم کرنے سے پہلے ڈاکٹر گنگولی کے ایک تخمینے کا ذکر کرنا کچھ نامناسب نہ ہوگا۔ انھوں نے اندازہ لگایا ہو کہ جنگ سے پہلے ایک آزاد مزدور کے گھر میں مختلف غذاؤں کی جو مقدار خرچ ہوتی تھی وہ حسبِ ذیل تھی۔ اس کے مقابلے میں ہندستانی قیدیوں کو جو غذا ملتی تھی وہ بھی درج ذیل ہو :-

بمبئی کے کپڑے کے کارخانے	مدراس	بمبئی کے سزایافتہ قیدی	
		قید باشقت	
۱۰۵۴	۱۰۳۷	۱۰۸۷	۱۰۶۹

اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس مُلک کے آزاد مزدوروں کے مقابلے میں یہاں کے قیدی زیادہ اچھی حالت میں زندگی گزارتے ہیں۔

اجرتوں کے ناکافی ہونے کا پورا اندازہ ہوچکا ہوگا۔ اور جب مناسب غذا کے لیے پیسے دست یاب نہ ہوتے ہوں تو قرض سے بچنا کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ ہمارے سبھی صنعتی شہروں میں بسنے والے مزدور قرض کا شکار ہوتے ہیں۔ اور اس کی بنا پر انھیں طرح طرح کی پریشانیاں اور مصیبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔

غذا کے بعد اب رہنے کے مکانوں کا حال سُنیے بین الاقوامی مزدور آفس کی ایک رپوٹ کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں۔ "ہندستانی مزدوروں کی اکثریت ایسے مکانات میں رہتی ہے جن کی حالت ناقابلِ بیان ہے۔ مکانات ایک دوسرے سے بہت قریب بنائے جاتے ہیں۔ ان کے درمیان سڑکوں تک کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہوتی۔ زیادہ تر بستیوں میں روشنی یا ہوا کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ مکان میں آنے جانے کا ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا دروازہ جس میں داخل ہونے کے لیے بسا اوقات آپ کو بالکل جُھک جانا پڑے گا۔ پینے کے پانی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ مکانوں سے گندے پانی کی نکاسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ اس گندے ماحول میں زندگی گزارنے سے جو نقصانات ہوتے ہیں ان کی تفصیل بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایک اور مصیبت یہ ہے کہ ان مکانوں میں بھیڑ سی لگی ہوتی ہے۔ مکانوں کی بہت بڑی تعداد میں ایک ہی کمرہ ہوتا ہے۔ سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں ۹۷ فی صدی خاندان انھی ایک کمرے والے مکانوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں بمبئی میں ایسے خاندانوں کا تناسب ۸۹ فی صدی تھا۔ جنگ کی ضرورتوں سے شہروں کی آبادی میں اور بھی اضافہ ہوا ہے۔ اور یہ حالات بد سے بدتر ہوگئے ہیں۔

ہندستانی مزدور کی زندگی مختصراً یوں بیان کی جاسکتی ہے۔ وہ پیٹ بھر کھانا نہیں حاصل کرسکتا۔ جانوروں کی سی حالت میں زندگی کے دن کاٹتا ہے۔ بلاشبہ وہ دنیا کی سب سے مظلوم مخلوق ہے۔ (تلخیص)

ہندستان کی غذائی صورتِ حال

پچھلے تین ماہ کے حالات پر ایک نظر

از: ——— محمد عبدالقادر، ریڈر، جامعۂ عثمانیہ

آج کل ساری دنیا اور بالخصوص ہندستان کے لیے جو اہم مسئلہ تشویش کا باعث بنا ہوا ہے وہ غذائی صورتِ حال سے متعلق ہے۔ ہمارے لیے قحطِ بنگال کی یاد ہنوز تازہ ہے اور جن دردناک حالات کے تحت وہاں لاکھوں جانیں تلف ہوئیں اُن سے خاص و عام واقف ہیں لیکن تھوڑے ہی وقفے کے بعد پھر سے مُلک میں ایک دُوسرے قحط کے پیدا ہو جانے کا امکان ہمارے لیے تر[illegible] کا سبب بنا ہوا ہے۔

یوں تو یورپ کے خاص خاص علاقے، نیز ایشیائی ممالک مثلاً ملایا، ہند چینی، جنوبی چین یہ سب غذائی قلت کے شکار ہیں لیکن مجھے خاص طور پر ہندستان کا ذکر کرنا ہے۔

اب یہاں بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس غذائی قلت کے کیا اسباب ہیں۔ ہم اس سے واقف ہیں کہ زمین پر کام کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد جنگ میں شریک ہوگئی تھی اور اس طرح دورانِ جنگ میں زرعی کاروبار انجام دینے والوں کی کمی کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس کے علاوہ مویشی، کھاد اور زرعی آلات کی کمی کی وجہ سے ان کی قیمتوں میں حیرت انگیز اضافہ ہونے لگا

تھا۔ ان حالات کے تحت ہندوستان کی زرعی پیداوار بری طرح متاثر ہوتی گئی۔ قلت غذا کا ایک اور اہم سبب [illegible] ہے۔ برما جہاں سے ہمیں چاول کی قابلِ لحاظ تعداد ملتی تھی خود اس کی معیشت درہم برہم ہوجانے کی وجہ سے ان چاولوں کی قلت محسوس ہونے لگی۔ چناں چہ امریکہ کے سررشتۂ زراعت کی رپوٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے علاقے جن کے چاول کا ہندوستان محتاج تھا وہ خود چاول کے لیے دوسروں کے محتاج ہوگئے ہیں۔ اب رہے وہ مقامات جہاں سے ہندوستان کے لیے اجناس مہیا کیے جاسکتے تھے یہ ہیں، اول تو ایسے نازک زمانے میں جب کہ ہر ملک کو اپنی اپنی فکر پڑی ہے اور آیندہ کے خوف سے جو کچھ بھی بن پڑے ذخیرہ کیا جارہا ہو، ایک ملک کو دوسرے کی امداد پر آمادہ کرنا بڑا ہی دشوار کام ہے۔ اگر بہ فرضِ محال فاضل پیداوار رکھنے والے ملکوں کو اس پر تیار بھی کرلیا جائے تو حمل ونقل کی دقتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ دور کیوں جائیے قحطِ بنگال کے زمانے میں کنیڈا نے ایک لاکھ ٹن گیہوں کا وعدہ کیا لیکن جہازوں کی کمی کی وجہ سے وہ ہندوستان کو صرف ایک ہزار ٹن گیہوں برآمد کرسکا۔ آج کل جب کہ زیادہ سے زیادہ ذرائع حمل ونقل کو برخاست شدہ سپاہیوں کو لانے لے جانے میں استعمال کیا جارہا ہو اشیائے خورد ونوش کے لیے حمل ونقل کی سہولتیں فراہم کرنا ایک دشوار کام ہے۔ ان اسباب کے علاوہ اور بھی کچھ ایسے اسباب جن کی نوعیت قدرتی رہی ہے، ہندوستان کے بعض بعض علاقوں میں غذا کی قلت کا باعث بنے ہوئے ہیں[1]۔

حکومت ان تمام حالات سے غافل نہیں ہے۔ لارڈ ویول نے اس خصوص میں غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کیا۔ جیسے ہی ہندوستان میں قحط کا خطرہ پیدا ہوا، وائسرائے نے ہوائی جہاز کے ذریعے جنوبی ہند کے علاقوں کا دورہ کیا اور حالات کا معائنہ کرنے کے بعد بنگلور میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں بمبئی، مدراس اور میسور کے نمایندوں سے تبادلۂ خیال کیا۔ مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کو تعاون کی دعوت دی۔ چناں چہ مسٹر جناح نے وائسرائے سے ملاقات کے بعد یہ وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے کی حد تک سیاسی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے غذائی صورتِ حال کو بہتر بنانے میں ممکن امداد دیں گے۔ اسی سلسلے میں گاندھی جی نے بیوپاری طبقے اور حکام کے درمیان اشتراکِ عمل، ذخیرہ اندوزی اور نفع اندوزی کی روک تھام، غذائی پیداوار کی مقدار میں اضافہ اور غذا کے استعمال میں انتہائی کفایت پر زور دیا۔

ایک غذائی وفد انگلستان اور امریکہ کو بھجوایا گیا جس کی صدارت کے فرائض سر رامامی مدلیار نے انجام دیے۔ سر مدلیار نے انگلستان کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ اپنے اثر کو استعمال کرے اور مشترک غذائی بورڈ (COMBINED FOOD BOARD) کے ذریعے ہندوستان کے لیے زیادہ سے زیادہ مقدار میں غذا برآمد کرائے۔ سر مدلیار نے کنیڈا کے کاشت کاروں کو مخاطب کیا اور

[1] اگر ہم غذا کی واقعی قلت اور مصنوعی قلت کے درمیان فرق محسوس کرتے ہیں تو قلت کے اسباب کے سلسلے میں شہریوں کی ناجائز ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور حکام کی رشوت خوری کا بھی تذکرہ کرنا ہوگا۔ — ایڈیٹر

درخواست کی کہ ہندستان کی زیادہ سے زیادہ مدد کریں۔ امریکہ میں بھی انھوں نے اپنی تقاریر اور بیانات کے ذریعے اس ملک کی عملی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

وفد کے صدر سر راماسوامی نے ہندستان کی غذائی ضروریات کا صحیح اندازہ پیش کیا یعنی سنہ ۱۹۴۶ء کی حد تک ۱۰ لاکھ ٹن چاول اور ۳۰ لاکھ ٹن گیہوں، مکئی اور دیگر اجناس کی فراہمی کی درخواست کی۔ یہ بھی کہا گیا کہ سنہ ۱۹۴۶ء کی پہلی ششماہی ختم ہونے کے لیے یعنی جون تک مطلوبہ مقدار میں سے ۵ لاکھ ٹن چاول اور ۲۰ لاکھ ٹن گیہوں وغیرہ کی درآمد سے یہاں کی غذائی صورتِ حال کو بہتر بنانے میں بڑی مدد ملے گی۔ وفد کی ابتدائی جدوجہد کا نتیجہ کچھ زیادہ ہمت افزا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ مشترک غذائی بورڈ نے ہندستان کے مطالبے کا حق بہ جانب ہونا محسوس کیا اور ہمیں بالآخر ایک لاکھ ۴۵ ہزار ٹن چاول اور ۱۴ لاکھ ٹن گیہوں اور دیگر اجناس ہندستان کے لیے مختص کیے جانے کی اطلاع ملی۔ اور یہ خیال کیا گیا کہ گو غذائی وفد کو اپنی مہم میں سو فی صدی کامیابی نہ رہی لیکن تاہم جس مقدار کا وعدہ ہوا تھا اس کی منتقلی کا انتظام ہوجائے تو یہاں کی صورتِ حال کے بہتر بنانے میں ایک حد تک ہمیں مدد مل سکے گی چناں چہ حکومتِ ہند کے محکمۂ غذا کے سابق رکن سر جے۔ پی۔ سری واستوا نے یہ کہا کہ ۱۵ لاکھ ٹن اجناس کی درآمد اور راشن بندی کے مروجہ انتظامات کے ذریعے ہم اگست تک کام چلا سکیں گے۔

غذائی وفد کی کوششوں کی بدولت جس مقدار کا وعدہ ہوا اس میں مزید اضافے کی امیدیں یوں بھی ہونے لگیں کہ کچھ ہی عرصے کے بعد یعنی ۲۰ مئی کو واشنگٹن میں ایک بین اقوامی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہو چکا تھا۔ جس میں اقوامِ متحدہ کے غذائی محکموں کے وفود اور ادارۂ امداد و بحالی (UNRRA) اور مشترک غذائی بورڈ کے نمایندوں کو بھی دعوت دی گئی تھی تاکہ دنیا کی موجودہ غذائی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے، سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء کے متوقع حالات کا اندازہ کیا جا سکے اور موجودہ رسد کی بہترین تقسیم کے طریقوں اور پیداوار کے بڑھانے کی تدبیروں پر غور ہو سکے۔

غذائی صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے حکومتِ ہند کی مزید کوششیں جاری رہیں۔ فروری سے مونگ پھلی کی برآمد کو قطعاً بند کر دیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ خود اندرونِ ملک مونگ پھلی کا استعمال غذا کے طور پر ہو سکے۔ حکومت کی یہ کوشش بھی جاری رہی کہ گیہوں استعمال کرنے والے صوبے اپنے یہاں کی چاول کی پیداوار زیادہ سے زیادہ مقدار میں ان صوبوں کو برآمد کریں جہاں کہ زیادہ تر چاول استعمال کیا جاتا ہے۔

غذائی بورڈ نے جس مقدار میں امداد کرنے کا وعدہ کیا اس کی اطلاع سر راماسوامی مدلیار نے جب ہندستان واپس ہو کے پہنچائی تو ملک بھر میں اطمینان محسوس ہونے لگا اور اسے خاطر خواہ مقدار تصور کیا گیا۔ لیکن بعد میں بورڈ نے اس سے صریح انکار کیا کہ ہندستان کے لیے کسی خاص مقدار کا تعین کیا گیا تھا۔ اس انکار سے ملک میں ایک بے اطمینانی کی کیفیت پھیل گئی لیکن بہت ہی

جلد امریکہ کے سابق صدر مسٹر ہوور نے ہندستان اور بالخصوص یہاں کے قحط زدہ علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد اور امریکہ واپس پہنچ کر وہاں اپنی رپوٹ پیش کی تو غذائی بورڈ پر اس کا بہت ہی اچھا اثر پڑا۔ ہوور نے ہندستان کے لیے امداد کے مسئلے پر بہت ہی زور دیا اور یہ بھی واضح کیا کہ ہندستان کو نہ صرف امریکہ بلکہ دوسرے مقامات مثلاً برما، سیام، آسٹریلیا وغیرہ سے بھی مدد ہونی چاہیے۔ سر گرجا شنکر باجپائی اور ان کے مشیر ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ نے بھی ہندستان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور ہندستان کی ضروریات کا اندازہ مشترکہ غذائی بورڈ کے سامنے پیش کیا۔ اب دنیا کے غذائی مسائل پر غور و فکر کرنے اور صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ایک بین اقوامی غذائی کونسل (INTERNATIONAL EMERGENCY FOOD COUNCIL) کا قیام ہو چکا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کونسل کو ہندستان کے لیے واجبی اور معقول امداد دینے میں کسی قسم کا تامل نہیں ہوگا۔

یہاں یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت تک ہندستان کو کس قدر بیرونی مدد مل سکی ہے۔ جولائی کے اوائل میں سر جے۔ پی سری واستوا رکنِ اغذیہ نے اپنے عہدے سے سبک دوشی کے موقع پر غذائی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ ۱۹۴۶ء کے آغاز سے ہم باہر سے ۵۳۳۰۰۰ ٹن گیہوں اور گیہوں کی پیداوار اور ۳۰۰۰۰ ٹن چاول حاصل کر سکے ہیں۔ نیز ۱۵۰۰۰ ٹن اجناس پہنچنے کے قریب ہے اور ۳۴۲۰۰۰ ٹن جہازوں پر لادے جانے والے ہیں۔

امریکہ سے ابھی حال میں ایک غیر سرکاری وفد پروفیسر شولٹز (SCHULTZ) کی صدارت میں ہندستان کے حالاتِ قحط کی تحقیق کرنے اور یہاں کے چشم دید حالات امریکہ تک پہنچانے کی غرض سے آیا ہوا ہے۔ اس وفد سے ہماری بہت کچھ توقعات وابستہ ہیں اور ہمیں امید ہے کہ اس وفد کی رپوٹ ہمارے لیے مزید امریکی امداد کے بہم پہنچانے میں موثر اور مفید ثابت ہوگی۔ ایک اور ذریعے سے ہمیں امداد کے قرائن معلوم ہوتے ہیں۔ اس ماہ کے آخر میں ایک وفد دیوان چمن لال کی صدارت میں ارجنٹائن جانے والا ہے تاکہ اس ملک کو بھی اس امر پر آمادہ کرے کہ وہ ہندستان کو غذائی اجناس برآمد کرے۔

لیکن ہمیں محض اغیار کی امداد کے بھروسے پر قانع نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ اپنے طور پر بھی غذا کی صورتِ حال کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ راتب (راشن) میں تخفیف ایک موثر طریقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جب بعض کے لیے پیٹ بھر کر کھانے اور اکثر فاقہ کشی کی دو ہی صورتیں باقی رہ جائیں تو عقل مندی اور ہمدردی کا یہی تقاضا ہے کہ جو پیٹ بھر کر کھایا کرتے تھے وہ اپنے حصے میں سے کچھ کم کر دیں تاکہ فاقہ کشوں کو بھی کھانا میسر ہو۔ اجناس کی کمی کی تلافی یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ دوسری اشیائے خوردنی مثلاً آلو، رتالو، پتے دار ترکاریاں اور مونگ پھلی وغیرہ استعمال ہوں۔ اسی سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پھولوں کی کاشت کے بجائے پھلوں اور ترکاریوں کی کاشت کی جائے۔ ایک اور تدبیر جو پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ غیر مزروعہ زمین کی کاشت جدید طریقے سے کی جائے اور اس سلسلے میں برخاست شدہ سپاہیوں کی مدد لی جائے۔ (غذائی مسئلے کو حل کرنے کے لیے بعض حلقوں کی یہ بھی

چاہیے کہ کم از کم فالتو زمینیں یا بعض حصے بنجر کر کے کسانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ راج گوپال آچاریہ نے حکومت کی طرف سے کچھ اجتماعی کاشت کی مثالیں قائم کرنے کا بھی مشورہ دیا ہے۔ (ایڈیٹر)

اب رہا فاضل پیداوار والے علاقوں سے امداد کا سوال: ہندستان کا کوئی حصہ یا دنیا کا کوئی حصہ جہاں کہ پیداوار فاضل ہوا اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتا۔ اس کا فریضہ ہے کہ وہ دوسرے مصیبت زدہ علاقوں کی مدد کرے۔ اس سلسلے میں ذرائع حمل و نقل کو زیادہ سے زیادہ کام میں لانا چاہیے۔ بنگال کے قحط کی ایک اہم وجہ ذرائع حمل و نقل کی کمی رہی ہے اب موجودہ حالات کے تحت اشیاے خوردنی اور اجناس کے حمل و نقل کے لیے زیادہ سے زیادہ واگن مہیا کیے جانے چاہییں۔

(نوشتہ ۹ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء)

مدراس بجٹ

از: ——— ادارہ

مدراس کے وزیر مالیات سری پرکاشم نے اگست کے پہلے ہفتے میں سنہ ۱۹۴۶ء سنہ ۴۷ء کے لیے جو بجٹ پیش کیا ہے، اس میں خاص خاص باتیں یہ ہیں:-

دیہی تنظیم و تعمیر اور کھادی کی پیداوار کے لیے ۳ کروڑ روپے کے اخراجات منظور کیے گئے ہیں۔ پروگرام یہ ہے کہ کپڑے اور غذا کے لحاظ سے ہر ضلع خود کفیل ہو جائے۔ ہریجنوں کی حالت درست کرنے کے لیے اور شراب نوشی بند کرنے کے لیے ایک کروڑ روپے منظور کیے گئے ہیں۔ موخرالذکر سے حکومت کی آمدنی میں ڈھائی کروڑ روپوں کی کمی واقع ہوگی۔ شراب کی ممانعت کا دائرہ فی الحال ابھی چار ضلعوں تک محدود رہے گا۔

آمدنی کا تخمینہ ۵۷۴۲۹۲۰۰ روپے ہے، اور اخراجات کا اندازہ ۵۷۴۴۷۷۰۰۰ اس طرح ۱۵۰۰۰ روپے کی برائے نام بچت ہوتی ہے۔ بجٹ میں توازن قائم کرنے کے لیے محفوظ فنڈ سے ۹۴۰۰۰۰ روپے لینے پڑے، اس لیے کہ اخراجات آمدنی کے مقابلے میں ۹۰۰۰۰۰ کے قریب بڑھ رہے تھے۔ اخراجات کے زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ غذائی بحران کے سلسلے میں بڑی بڑی امدادی رقمیں صرف کی گئی ہیں۔ اور غیر ملکوں سے غلہ منگانے کے بھاری اخراجات برداشت کرنے پڑے ہیں۔

امداد قحط کے لیے ۵۰۰۰۰۰ روپے علاحدہ کیے گئے ہیں۔ صوبے کے خاص خاص علاقوں میں لازمی ابتدائی

تعلیم جاری کرنے کے لیے ۰۰۰۰۰ ۲۲ رُپے جیلوں کی حالت درست کرنے کے لیے ۰۰۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ رُپے اور عدالتی امور کو انتظامی امور سے علاحدہ کرنے کے لیے ۲۰۰۰۰ رُپوں کے اخراجات کا تخمینہ پیش کیا گیا ہو۔ جہاں تک خاص خاص اور جاری اخراجات کا تعلق ہو، کچھ بحالی کی اسکیموں کو اور دریائے تنگا بھدرا والے منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے اخراجات کا تخمینہ بڑھا کر ۰۰ ۴۹۸۴ ۲۴ رُپے کر دیا گیا ہو۔

بنگال بجٹ

چند تبدیلیوں کو چھوڑ کر اگر دیکھا جائے تو بنگال کا بجٹ وہی ہو جو آج سے تین ماہ پہلے پیش کیا گیا تھا۔ نئی وزارت نے اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی ہو۔ سوائے اس کے کہ پٹرول کے ٹیکس میں ½ ۵ آنے فی گیلن کا اضافہ کر دیا گیا ہو۔ ۰۰۰۰۰ ۵۳ رُپے سرکاری ملازمت کی تنخواہوں میں اضافہ کرنے کے لیے منظور کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اور دو چار باتیں ہیں۔

مجموعی آمدنی کا تخمینہ ½ ۴۴ کروڑ رُپے ہو اور اخراجات کا تخمینہ ۰۰۰۰۰ ۵۲ رُپے۔ گزشتہ سال کے مقابلے میں حکومت کی آمدنی میں ۰۰۰۰۰ ۵ رُپے کی کمی ہوئی ہو۔ جن میں ½ ۲ کروڑ کی کمی تو اس لیے ہوئی ہو کہ فوجیوں کی مراجعتِ وطن اور فوجی کاموں میں لگے ہوئے مزدوروں کے برخاست ہو جانے کی وجہ سے اکسائز میں کمی ہو گئی ہو۔ عام اخراجات میں ½ ۲ کروڑ روپوں کا اضافہ نظر آتا ہو۔ اخراجات میں اضافے کی ایک وجہ یہ ہو کہ کشتی سازی کے پروگرام میں ½ ۱ کروڑ کا نقصان ہوا ہو۔ سالِ رواں میں ۰۰۰۰۰ ۱ لاکھ کے خسارے کا اندازہ لگایا گیا ہو۔ اس خسارے کو اگر پورا کیا جا سکتا ہو تو صرف مرکزی حکومت کی امداد سے۔ یہ رقم اس ۰۰۰۰۰۰ ۱۲ کروڑ کی رقم کے علاوہ ہوگی۔ جو مرکزی حکومت سے توسیع و تعمیر کے سلسلے میں ملنے والی ہو۔

کپڑا بُننے کی مشینیں

یہ سب کو معلوم ہو کہ ہندستان اپنی صنعتی ترقی کے لیے غیر ملکوں سے مشینوں اور کلوں کا محتاج ہو۔ اس لیے کہ خود ہندستان میں وہ مشینیں اور کلیں نہیں بنائی جاتیں۔ یہ بات ہندستان کی صنعتی ترقی کے راستے میں بڑی

تمکان ظاہر ہو۔ لوگوں کے ذہن میں اس بات کی اہمیت بڑھتی جارہی ہو کہ خود ہندستان میں اب مشینوں کی صنعت کھلنی چاہیے۔ حکومتِ ہند کے نمایندے مسٹر بھارت رام حال ہی میں جاپان گئے تھے۔ انھوں نے جاپان کی کپڑے کی صنعت کا اچھی طرح مطالعہ کرنے اور جائزہ لینے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ خود ہندستان میں کپڑے بُننے کی مشین بننی چاہیے۔ اس کے بغیر ہندستان کی کپڑے کی صنعت خاطر خواہ ترقی نہیں کرسکتی۔ جاپان نے جنگ سے پہلے کپڑے کی صنعت میں جو اتنا نام پیدا کیا اس کی وجہ یہی تھی کہ وہاں بہت جلد کپڑے بُننے کی مشینیں بنائی جانے لگیں۔ تب ہی وہ ملک کپڑے کی صنعت کے سلسلے میں دُنیا میں چوتھا درجہ حاصل کرسکا۔ اس سے پہلے جاپان بھی امریکہ اور برطانیہ سے کپڑے بننے کی مشینیں منگواتا رہا۔ اور یہ دونوں ملک اس سے من مانے دام وصول کرتے رہے۔ جب تک یہ صورتِ حال رہی جاپان کی کپڑے کی صنعت زیادہ ترقی نہیں کرسکی۔ لیکن جونہی وہاں مشینیں بننی شروع ہوگئیں۔ وہ بہت آسانی کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ کا مقابلہ کرنے لگا۔ نہ صرف کپڑے کی مشینیں بلکہ دیگر صنعتی مشینیں بھی جاپان نے خود بنانی شروع کیں۔ ہندستان کو بھی آج اسی چیز کی ضرورت ہے۔ اگر ہندستان کو باہر سے مشینیں ملتی بھی ہیں تو بھاری قیمت پر۔ چناں چہ ابتدائی دقتوں اور خامیوں کے باوجود ضرورت ہے کہ ہندستان میں مشینیں بہت جلد بننی شروع ہوجائیں۔

تبصرہ

سوشلزم، فریڈرک اینگلز کی جرمن تصنیف کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ۔ مترجم جناب باری صاحب۔ شائع کردہ مکتبۂ اُردو لاہور۔ حجم ۱۰۴ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ ۴ر

مارکس اور اینگلز سے پہلے اشتراکیت ایک تخیلی شی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور اُسے چند فلسفیوں کی ناقابلِ حصول آرزو، دُنیلے خواب، خوش خیالی اور نہ جانے کن کن چیزوں سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اور واقعہ بھی یہی تھا کہ مارکس اور اینگلز سے پہلے اشتراکیت اور اشتراکی سماج اور حکومت کا جو نقشہ افلاطون، سرٹامس مور اور کچھ فرانسیسی سیاسی فلسفیوں نے پیش کیا تھا وہ محض خیالی تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ مادی اور سماجی حالات ہی نہیں پیدا ہوئے تھے کہ حقیقی اشتراکیت کی طرف لوگوں کا ذہن جاتا یا اس کی کوئی مادی شکل نگاہوں میں واضح ہوتی۔ چناں چہ ان فلسفیوں کی اشتراکیت دراصل اُس ردِ عمل کا نتیجہ تھی جو سماجی نظام، معاشی نابرابری اور انسانی اکثریت کے مصائب کے احساس نے اُن کے دل و دماغ میں پیدا کیا تھا وہ اس دُکھ بھری دنیا سے بھاگ کر اپنی کسی خیالی دُنیا میں پناہ لینا چاہتے تھے۔ سرٹامس مور کی اشتراکیت اس کی سب سے اچھی یا بُری مثال ہی۔ لیکن مارکس اور اینگلز کا اشتراکی تصور ایک ایسے عہد کے مادی اور سماجی حالات نے پیدا کیا ہی۔ جب دولت کی پیدائش کا نظام واقعی اور فطری طور پر ہمیں اشتراکیت کی طرف لے جا رہا ہی۔ یہ اشتراکیت خواب یا خوش خیالی نہیں ہی بلکہ ہمارے موجودہ سماج کے بنیادی میلانات و رجحانات کا ایک فطری نتیجہ۔ اینگلز نے اپنی اس تصنیف میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہی۔ باری صاحب کا ترجمہ بہت صاف ستھرا اور سلیس ہی اور معمولی اُردو داں کو بھی سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ موجودہ سائنٹی فک اشتراکیت کو سمجھنے کے لیے سماجیات کے ہر طالب علم کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہی۔

انجمنِ ترقیٔ اُردو کی وضع کردہ اصطلاحات

Open shop	"کھلا کارخانہ"
Open union	"کھلی سبھا"
Optional money	اختیاری زر
Order bond	فرمایشی تمسک
Out-clearing book	خارجی چکوتی کا کھاتہ
Out-put	مقدار (کام یا پیداوار)
Over capitalisation	فائد اصل بندی
Over-investments	بیش سرمایہ کاری
Over-issue	بیش اجرائی
Over-population	کثرتِ آبادی
Over-production	کثرتِ پیدائش
Over-seas-investments	سمندر پار سرمایہ کاری
Pain economy	تنگ معیشی
Panic	ہلچل، سراسیمگی
Paper money	زرِ کاغذی
Paper currency reserve	ذخیرہ زرِ کاغذی
Parallel standard	متوازی معیار
Parity of exchange	مبادلے کی برابری
Par value	قدرِ مساوی

معاشیات

جلد ۱ ستمبر ۱۹۴۶ء نمبر ۹

فہرستِ مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱۔	عالم گیر تجارتی کانفرنس اور ہندستان	اڈیٹر	۲
۲۔	ہندستان میں غذائی راشن بندی	رابندر ناتھ چٹرجی پروفیسر معاشیات چٹاگانگ کالج	۶
۳۔	زمیں داری کا مسئلہ	سریش چندر ماتھر ام۔ اے، ری سرچ اسکالر دہلی یونی ورسٹی	۱۷
۴۔	مشرقی یورپ میں زرعی انقلاب	خلیق احمد نقوی	۲۵
۵۔	ہندستان میں فضائی نقل و حمل	ام۔ سی۔ شکلا کمرشیل کالج دہلی	۳۰
۶۔	معاشی صورتِ حال، تاوانِ جنگ، مصنوعی ربڑ ۔۔۔	ادارہ	۳۸
۷۔	تبصرے	ادارہ	۴۷

اداریہ

عالمگیر تجارتی کانفرنس اور ہندستان

از :—————— اڈیٹر

ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے عالمگیر تجارت کی توسیع و ترقی کے لیے اور دُنیا بھر سے بے روزگاری کا قلع قمع کرنے اور روزگار پیدا کرنے کے مقصد سے چند تجویزیں تیار کی ہیں جو بہت جلد ایک بین اقوامی کانفرنس میں بحث و مباحثے اور غور و خوض کے لیے پیش کی جائیں گی۔ ہندستان کو بھی اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ کانفرنس کا دائرۂ عمل دو باتوں تک محدود ہوگا:۔ ایک تو بین اقوامی تجارت کے اصول مرتب کرنا، دوسرے ایک بین اقوامی مجلسِ تجارت قائم کرنا۔ ریاست ہائے متحدہ کی شائع کردہ تجویزیں حال ہی میں ہندستان کے "ماہرینِ معاشیات کی مشاورتی کمیٹی" کے سامنے غور و خوض اور رائے زنی کے لیے پیش کی گئی تھیں۔ کمیٹی نے بحث و مباحثے کے بعد ۱۲ اور ۱۳ اگست سنہ ۱۹۴۶ء کو اپنی چھٹی نشست میں یہ فیصلہ کیا کہ ایک "تجارت اور محصولات کی سب کمیٹی" بنائی جائے جو ان تجویزوں کے متعلق گزشتہ بحث و مباحثے کی روشنی

چناں چہ سب کمیٹی نے اپنی رپوٹ مرتب کرلی ہے جس میں بڑی وضاحت کے ساتھ ہندستان کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے اور ہندستان کے مخصوص معاشی حالات کی روشنی میں امریکی تجویزوں پر رائے قائم کی گئی ہے۔ یقین ہے کہ اس مخصوص مسئلے پر ہندستان کا طرزِ عمل سب کمیٹی کی پیش کردہ تجویزوں ہی پر مبنی ہوگا۔

قبل اس کے کہ سب کمیٹی کی تجویزوں کی یہاں تشریح کی جائے خود امریکی تجویزوں کے پس منظر پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں سرمایہ دارانہ دُنیا میں جو معاشی بحران رونما ہوا جس نے بین اقوامی آزاد تجارت کو زبردست دھکا پہنچایا

تمام سرمایہ دار ملکوں نے مخصوص طور پر برطانیہ نے محصولات اور دیگر ذریعوں سے اپنے سیاسی علاقوں کو صرف اپنے صنعتی مال کے لیے مخصوص کر لیا۔ اس صورتِ حال سے سب سے زیادہ امریکہ کی تجارتِ خارجہ کو نقصان پہنچا۔ ۱۹۳۳ء میں امریکہ اپنی اندرونی معاشی اور صنعتی حالت کو کچھ سنبھال لینے کے بعد اپنی بین اقوامی تجارت کو دوبارہ بحال کرنے کی طرف متوجہ ہوا اور مختلف ملکوں سے محصولات کے سلسلے میں گفت و شنید شروع کی۔ ۱۹۳۴ء میں امریکی مجلس قانون ساز نے "دوطرفہ تجارتی عہدناموں کا قانون" (RECIPROCAL TRADE AGREEMENTS ACT) پاس کیا جس کی رُو سے امریکی حکومت کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ الگ الگ ملکوں سے عہدناموں کے ذریعے تجارتی محصولات میں کمی کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن تجربے سے ثابت ہوگیا کہ یہ طریقہ کچھ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہے۔ یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ بجائے اس کے کہ ہر ملک سے الگ الگ معاہدہ کیا جائے کئی ممالک بہ یک وقت ایک دوسرے سے اس بات کا عہد کریں کہ وہ ایک دوسرے کے مال پر پابندی نہ لگائیں گے اور محصول نہ بٹھائیں گے ظاہر ہے کہ یہ صورت زیادہ مفید تھی۔ اتنے میں جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کے دوران میں امریکہ کے سرمایہ دار برابر اس کوشش میں مصروف رہے کہ امریکہ کی معاشی برتری سے فائدہ اٹھا کر جنگ کے بعد تمام سرمایہ دار ملکوں سے مخصوص طور پر برطانیہ سے محصول کی پابندی اُٹھانے کا وعدہ کرالیا جائے۔ اس وقت دنیا کی جو معاشی صورتِ حال ہے اور امریکہ کا سرمایہ دارانہ پیدائشِ اشیا کا نظام جس منزل پر ہے اُس میں آزاد تجارت امریکہ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگی اور وہ اپنی صنعتی برتری کی وجہ سے ساری دُنیا کے بازاروں پر تیزی سے قبضہ کرلے گا۔

۱۱ر مارچ ۱۹۴۱ء کو امریکہ کی مجلس قانون ساز میں حکومتِ برطانیہ کی جنگی امداد کا ایک قانون پاس ہوا۔ پھر ۱۲ر اگست ۱۹۴۱ء کو صدر روزولٹ اور چرچل نے اپنے متحدہ اعلان میں کچھ معاشی اغراض و مقاصد کا اعلان کیا۔ اعلان اطلانتک کے دفعہ ۴ میں یہ کہا گیا کہ جنگ کے بعد تمام ملکوں کو مساوی طور پر دنیا کی تجارت اور دُنیا کے کچے مال سے فائدہ اُٹھانے کا حق ہوگا۔ ۲۳ر فروری ۱۹۴۲ء کو برطانیہ اور امریکہ کے درمیان ایک باہمی امداد و اعانت کا معاہدہ ہوا جس کے دفعہ ۷ میں یہ درج ہے کہ امریکی امداد کے عوض میں برطانیہ، امریکہ کو جو رعایتیں دے گی اُن کے تعین میں ایسی شرطیں تسلیم کی جائیں گی جن سے امریکہ اور برطانیہ دونوں کو معاشی فائدے حاصل ہوں گے اور پھر ساری دنیا کی معاشی حالت کی درستگی میں مدد ملے گی۔ ان مقاصد کو حل کرنے کے لیے یعنی دُنیا کی پیدائشِ اشیا بڑھانے، روزگار میں اضافہ کرنے اور اشیا کے صرف و تبادلے کی توسیع کرنے کے لیے برطانیہ اور امریکہ مل جل کر کام کریں گے۔ دنیا کے دوسرے ہم خیال ملکوں کے لیے بھی تعاون اور اشتراکِ عمل کا دروازہ کھلا رہے گا۔ بین اقوامی تجارت میں کسی ملک کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھنے کا قاعدہ اٹھا دیا جائے گا۔ تجارتی محصولات میں کمی کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ آزادی کے ساتھ ایک ملک کا مال دوسرے ملک

میں جاسکے۔

اب ہم امریکی تجویزوں کے متعلق "تجارت اور محصولات کی ذیلی کیٹی" نے جو رائے قائم کی ہے اس کا مطالعہ کریں گے۔ سب سے پہلے کمیٹی نے یہ بتایا ہے کہ ہندستان کے لیے اس وقت سب سے موزوں تجارتی پالیسی کیا ہو سکتی ہے یعنی ایسی پالیسی جس سے ہندستان کی موجودہ ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ اس کے بعد اس کی روشنی میں اس نے امریکی تجویزوں کا جائزہ لیا ہے۔

کمیٹی کی نظر میں ہندستان کی تجارتی پالیسی کی بنیاد دو باتوں پر رکھی جانی چاہیے۔ ایک تو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہندستان اپنے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے عن قریب عظیم معاشی تعمیر و توسیع کے دور میں قدم رکھنے والا ہے اس لیے اس کی کچھ اپنی ضرورتیں ہیں جو کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ دوسرے ہندستان کو عالم گیر معیشت میں بھی اپنے لیے ایک جگہ بنانی ہے تاکہ وہ دوسرے ملکوں کے ساتھ تعاون کر کے دنیا کی تجارت اور روزگار کی حالت درست کرنے میں مدد دے سکے۔ کمیٹی کی نظر میں ان دو بہ ظاہر متضاد باتوں کے درمیان در اصل کوئی تضاد نہیں ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہندستان اُسی وقت دنیا کی معاشی حالت درست کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے کہ خود ہندستان کے عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو اور اُن کی معاشی بدحالی دور ہو۔ موخر الذکر کو عملی صورت دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہندستان اپنی تجارتِ خارجہ پر نگرانی اور کنٹرول سے کام لے۔ لیکن امریکی تجویزیں ہندستان کی اس بنیادی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتیں۔ در اصل وہ تجویزیں امریکہ اور برطانیہ جیسے ملکوں کے لیے موزوں ہیں جو صنعتی ترقی کی بلند منزل پر پہنچ چکے ہیں نہ کہ ہندستان جیسے پچھڑے ہوئے اور بدحال ملک کے لیے جو کسی صورت سے بھی امریکہ اور برطانیہ کا تجارتی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ چناں چہ ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کے مقابلے سے بچنے کے لیے ہندستان کے لیے ضروری ہوگا کہ غیر ملکی مال کی درآمد اور اپنی برآمد پر اپنی ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے نگرانی قائم رکھے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندستان بین اقوامی تجارتی کانفرنس میں شرکت کرنے سے یک سرے سے انکار ہی کر دے بلکہ اس کے برخلاف کافی ایسے اسباب موجود ہیں جن کی بنا پر ہندستان کے لیے ضروری ہوگا کہ تجارتی کانفرنس میں شرکت کرے اور دُنیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ تعاون سے کام لے۔ مگر ایسا چند ضروری شرطوں ہی پر ہو سکتا ہے یہ شرطیں کیا ہیں اُن کا تذکرہ آگے آئے گا۔

وہ اسباب جن کی بنا پر ہندستان کے لیے بین اقوامی تجارتی کانفرنس میں حصّہ لینا ضروری ہے یہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندستان اس وقت مقروض ملک ہونے کی بجائے قرض دار ملک ہے۔ چناں چہ ہندستان چاہتا ہے کہ بین اقوامی تجارت کی ترقی اور توسیع ہو اور تمام ملکوں کے مال بلا کسی رکاوٹ اور امتیاز کے ایک ملک سے دوسرے ملک میں داخل ہونے لگیں۔ اس سے

ہندستان اپنا قرض جلدی وصول کر سکے گا۔ پھر اس وقت ہندستان کو مشینوں اور کلوں کی سخت ضرورت ہے جس کے بغیر اُس کی صنعتی ترقی نہیں ہو سکتی۔ مشینیں اور کلیں باہر سے خریدنے کے لیے نہ صرف دوسرے ملکوں کے تعاون اور ہمدردی کی ضرورت ہے بلکہ آزاد تجارت کا جاری ہونا بھی ضروری ہے تاکہ ہندستان ایک ملک میں اپنا مال بیچ کر اس رقم سے دوسرے ملک سے مشینیں اور کلیں خرید سکے۔ خود ہندستان کے پاس تجارتی توسیع اور ترقی کا ایک پروگرام ہے۔ جو اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک دنیا کے دوسرے ملکوں میں روزگار کی حالت درست نہ ہو۔ غرض آزاد تجارت کئی باتوں کے لحاظ سے ہندستان کے لیے مفید ہے، اس لیے ہندستان کو بین اقوامی تجارتی کانفرنس میں ضرور شریک ہونا چاہیے۔ تاکہ وہاں وہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کر سکے اور آزاد تجارت کے ساتھ ساتھ اپنی کچھ خاص شرطیں منوانے کی کوشش کرے۔

جہاں تک امریکی تجویزوں کا تعلق ہے وہ ذیلی کمیٹی کی رائے میں ہندستان اور دیگر پچھڑے ہوئے ملکوں کی ضرورتوں کو پورے طور سے تسلیم نہیں کرتیں۔ دوسرے، یہ تجویزیں ہمیں یہ تو بتاتی ہیں کہ کیا نہیں کرنا چاہئے لیکن یہ نہیں بتاتیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ وہ یہ نہیں بتاتیں کہ پست حال ملکوں کی حالت درست کرنے کے لیے ترقی یافتہ ملکوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اور ان پر کیا فرض عائد ہوتا ہے، مثلاً ترقی یافتہ ملکوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ پچھڑے ہوئے ملکوں کو مشینیں اور کلیں مہیا کریں اور پست حال ملکوں کی معاشی اور صنعتی ترقی کا خیال کرتے ہوئے اپنی معیشت میں تبدیلی کریں تاکہ دونوں کے معاشی سعی و عمل میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا ہو۔ ذیلی کمیٹی کی رائے میں بین اقوامی معاشی تعاون کی بنیاد صرف اس بات پر قائم ہو سکتی ہے کہ ترقی یافتہ ملک پست حال ملکوں کی مدد کریں۔ اس وقت دنیا کے تمام ملک معاشی ترقی کی ایک ہی سطح پر نہیں ہیں، ایسی حالت میں آزاد تجارت سے تمام ملکوں کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ یہ ہوگا کہ ترقی یافتہ ملک پچھڑے ہوئے ملکوں پر چھا جائیں گے اور یہ بھی ہوگا کہ جو ملک اس وقت کچا مال پیدا کر رہے ہیں وہ ہمیشہ کچا مال پیدا کرتے رہیں گے اور جن ملکوں میں صنعتی مال زیادہ پیدا ہوتا ہے وہ بدستور زراعتی ملکوں کا استحصال کرتے رہیں گے، پچھڑے ہوئے ملک اپنے تمام معاشی ذرائع اور امکانات کو کام میں نہیں لا سکیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ جنگ سے پہلے بین اقوامی تجارت پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں، ان سے بہت خراب نتیجے برآمد ہوئے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ خود آزاد تجارت کا بند ہو جانا نتیجہ تھا کسی اور بنیادی خرابی کا۔ چناں چہ گزشتہ جنگ سے پہلے جو معاشی بدحالی پھیلی ہوئی تھی اس کی اصل ذمے داری تجارتی پابندیوں پر نہیں عائد ہوتی بلکہ معاشی خرابیوں پر۔ تجارتی پابندی بہ جائے خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ (باقی صفحہ ۴۴ پر دیکھیے)

ہندستان میں غذا کی راشن بندی

از : ـــــــــــ رابندر ناتھ چٹرجی، پروفیسر معاشیات، چٹ گانو کالج

راشن بندی کا تعلق عہدِ حاضر کی جنگی معیشت سے ہے جس میں ملک کے تمام ذرائع اور پورے معاشی نظام کو جنگی ضروریات کے لیے وقف کر دیا جاتا ہے۔ یورپ کے ملکوں میں تو سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء ہی کی جنگ میں راشن بندی ہو چکی تھی، لیکن صرف اُن ملکوں میں جو جنگ میں شریک تھے، بقیہ ملک اس سے محفوظ تھے۔ دوسری عالم گیر جنگ کے چھڑنے سے پہلے ہی یورپ کے ملکوں نے اپنے اپنے راشن بندی کے پلان تیار کر لیے تھے۔ اس پلان کی تیاری میں ان کو پہلی عالم گیر جنگ کی راشن بندی کے تجربوں سے بڑی مدد ملی۔ پہلی عالم گیر جنگ میں ہندستان میں راشن بندی کی ضرورت نہیں پیش آئی تھی، چناں چہ جب دوسری جنگ چھڑی تو لوگوں کا ذہن اُس طرف نہیں گیا۔ گزشتہ تجربوں کی یاد کچھ اتنی مضبوط تھی کہ یہاں راشن بندی کی کوئی تیاری نہیں ہوئی۔ اگرچہ اس صورتِ حال کے اور بھی اسباب تھے لیکن اُن میں سے ایک سبب یہ بھی تھا۔

جنگ کے شعلوں نے مشرقِ بعید کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جاپانی فوجیں تیزی سے آگے بڑھنے لگیں پھر بھی نئی دہلی کے شاہی ایوانوں پر خوابِ گراں طاری رہا اور حکومت کے اربابِ بست و کشاد ملک کے غذائی مسائل کو پہلی جنگِ عظیم کی عینک سے دیکھتے رہے۔

ہندستان میں غذا کی راشن بندی کے تصور کو سنہ ۱۹۴۲ء کے آخری مہینوں میں حقیقی شکل دینے کی کوشش کی گئی جب حکومتِ ہند نے صوبائی حکومتوں کو مشورہ دیا کہ خاص خاص شہروں میں گیہوں کی راشن بندی کی تیاری کی جائے۔ ۱۹۴۳ء کے شروع میں یہ بالکل ظاہر ہو گیا کہ ہندستان میں محض گیہوں کی قلت کا سامنا نہیں ہو بلکہ تمام خاص خاص اناج کی کمی محسوس کی جا رہی ہو۔ چناں چہ مرکزی حکومت نے تمام خاص خاص اناج کی راشن بندی کے احکام صادر کیے۔ باقاعدہ اور باضابطہ راشن بندی سب سے پہلے سنہ ۱۹۴۳ء کے شروع میں بمبئی شہر میں کی گئی اور پھر بعد میں بمبئی کے مضافات میں۔ بمبئی میں جب راشن بندی کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھا گیا تو پورے ہندستان کے شہروں اور قصبوں میں اس کے قیام کا راستہ کھل گیا۔ سنہ ۱۹۴۴ء کے شروع میں کلکتہ اور اس کے مضافات میں راشن بندی ہو گئی۔ اس پورے علاقے میں چالیس لاکھ سے زیادہ لوگ آباد ہیں۔ اس وقت ہندستان کے ہر اہم شہر میں کسی نہ کسی قسم کی راشن بندی یا تو ہو گئی ہو یا اس کی تیاری کی جا رہی ہو۔ حکومتِ ہند نے اپنی جنگی غذائی پالیسی کو "غذائی اجناس کی پالیسی کمیٹی" کے مشوروں کے مطابق ڈھالا ہو۔ اس کمیٹی نے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ غذائی راشن بندی صرف خاص خاص شہری علاقوں ہی تک محدود رکھی جائے۔ حکومت اب بھی اسی بنیادی پالیسی پر کاربند ہو لیکن حالات مجبور کر رہے ہیں کہ اس میں کچھ رد و بدل کیا جائے۔ چناں چہ پورے صوبہ بمبئی میں ان دیہاتیوں کے لیے بھی راشن کی تھوڑی بہت آسانیاں مہیا کی گئی ہیں جو یا تو غلہ بالکل نہیں پیدا کرتے یا جو ناکافی غلہ پیدا کرتے ہیں۔ ضلع مالابار کے دیہاتوں میں پوری راشن بندی ہو۔ وزیگاپٹم کے ضلع میں بھی یہی تجربہ کیا جا رہا ہو۔ ٹراونکور اور کوچین کی ریاستوں میں پوری آبادی کو مکمل راشن بندی کے تحت لے آیا گیا ہو۔

ہندستان کی کتنی آبادی راشن بندی سے فائدہ اٹھاتی ہو اس سے متعلق ہمارے پاس تازہ اعداد و شمار نہیں ہیں۔ سنہ ۱۹۴۵ء کے شروع میں سر جے۔ پی۔ سری واستو نے مرکزی اسمبلی میں بتایا تھا کہ کوئی ۵ کروڑ آبادی کسی نہ کسی راشن بندی کے تحت آ گئی ہو۔ یہ بہ آسانی کہا جا سکتا ہو کہ گزشتہ چند مہینوں میں اس تعداد میں کوئی تیس چالیس لاکھ کا اور اضافہ ہوا ہو۔

اوپر کی باتوں سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ ہندستان میں غذا کی راشن بندی ابھی زیادہ تر شہروں ہی تک محدود ہو لیکن یہاں یورپ کی طرح مکمل راشن بندی سے کام نہیں لیا گیا ہو۔ یہاں تمام غذائی اشیا کی راشن بندی نہیں کی گئی ہو بلکہ زیادہ تر صرف اناج کی۔ برطانیہ اور ہندستان کی راشن بندی کے طریقوں میں سطحی مماثلت ضرور پائی جاتی ہو لیکن دونوں میں بنیادی باتوں کا فرق ہو۔ مماثلت اس لحاظ سے پائی جاتی ہو کہ دونوں ملکوں میں راشن بندی صرف چند چیزوں تک محدود ہو۔ یہ ضرور ہو کہ ہندستان میں راشن کی ہوئی چیزوں کی تعداد برطانیہ کے مقابلے میں کم ہو لیکن دونوں ملکوں میں تمام اشیا کی راشن بندی نہیں کی گئی ہو۔ دونوں ملکوں میں لوگ اپنی کمی ایسی چیزوں سے پوری کر سکتے ہیں جن کی راشن بندی نہیں

کی گئی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ بہت سے لوگ غربت کی وجہ سے واقعی ایسا نہ کرسکتے ہوں لیکن بہرحال انھیں اس کا اختیار ضرور حاصل ہے۔ دونوں ملکوں میں فی کس راشن بندی کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں کسی فرق یا امتیاز سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ بہرحال جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے یہ مماثلت محض سطحی ہے۔ اب ہم بنیادی فرق کی طرف آئیں گے۔

برطانیہ میں غذائی راشن بندی پوری آبادی کے لیے ہے لیکن ہندستان میں زیادہ تر شہری آبادی کے لیے۔ ہندستان کی زیادہ تر آبادی ابھی تک گانو میں رہتی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندستان میں راشن بندی سے آبادی کے محض ایک تھوڑے سے حصے کو فائدہ پہنچا ہے۔ اگر اب تک صرف ۵ کروڑ آبادی راشن بندی کے تحت لائی گئی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندستان کی مجموعی آبادی کا ⅞ حصہ راشن بندی کے فائدوں سے محروم ہے۔

دیہی علاقوں میں راشن کا انتظام نہ کرنے کی خاص وجہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ دیہات کے لوگ خود غلہ پیدا کرتے ہیں، اس کے علاوہ تمام دیہاتوں میں راشن کا انتظام کرنے میں تنظیمی دقتیں بھی حائل ہیں۔ اتنے آدمی بھی نہیں ملیں گے کہ راشن کا کام سنبھال سکیں۔ راشن کے لیے غلہ حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ پہلے تو بلا کسی جبر اور دباؤ کے حکومت غلہ خریدتی ہے، اور جہاں یہ چیز کامیاب نہیں ہوتی وہاں احکاماً غلہ حاصل کیا جاتا ہے۔ موخرالذکر صورت میں حکومت کے اعلان کے مطابق غلے کی صرف وہ مقدار حاصل کی جاسکتی ہے جو غلہ پیدا کرنے والے کے پاس ضرورت سے فالتو ہو۔ لیکن اکثر شکایتیں سننے میں آئی ہیں کہ وہ لوگ جو غلہ وصول کرنے جاتے ہیں، چاہے وہ چھوٹے موٹے سرکاری افسر ہوں یا حکومت کے تاجر ایجنٹ کے ملازمین ——— وہ ان ہدایتوں کی پروا نہیں کرتے اور رعیت سے اس کی اپنی ضرورت کا غلہ بھی چھین لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی خیال میں رکھنی چاہیے کہ گاؤں کے رہنے والے تمام لوگ غلہ نہیں پیدا کرتے۔ ہر گاؤں میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو غلہ بالکل نہیں پیدا کرتے اور کچھ ایسے جو ناکافی پیدا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ زرعی مزدور بھی ہوتے ہیں جن کے اپنے کھیت نہیں ہوتے بلکہ جو دوسروں کے کھیت میں کام کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اگر تمام شہروں اور دیہاتوں میں مکمل راشن بندی کردی جائے تو یہ تمام گڑبڑی ختم ہوجائے اور حکومت کو غلے کی وصولی میں بھی بڑی آسانی ہوجائے۔ گزشتہ چھ سال میں ڈینیوب اور بلقان کی ریاستوں میں زرعی اور دیہی آبادی کو بھی بڑے پیمانے پر راشن بندی کے تحت لایا گیا ہے۔ ہندستان کی حکومت کو اس چیز سے سبق سیکھنا چاہیے، اس لیے کہ جنگ کے زمانے میں جنوبی مشرقی یورپ اور ہندستان کے حالات میں زبردست مماثلت رہی ہے۔ ہندستان کے لیے بہترین پالیسی یہ ہوگی کہ پوری آبادی کو راشن بندی کے تحت لے آیا جائے اور راشن بندی کو صرف شہری آبادی

تک محدود رکھنے کی پالیسی ترک کر دی جائے۔

ہندستان میں غذائی راشن بندی زیادہ تر اناج سے تعلق رکھتی ہے۔ چاول، گیہوں کی بنی ہوئی اشیا اور باجرا۔۔۔ زیادہ تر ایسی چیزیں جو ہندستان کے رہنے والوں کی خاص غذا ہونے کی حیثیت رکھتی ہیں خاص طور پر راشن کے تحت لائی گئی ہیں۔ صرف چینی، نمک اور سرسوں کا تیل ایسی چیزیں ہیں جو اناج نہیں ہیں لیکن پھر بھی راشن بندی کی اسکیم میں شامل ہیں۔ لیکن برطانیہ میں یہ ہے کہ عام استعمال کی غذائیں یعنی روٹی، اناج اور آلو راشن سے باہر ہیں، اور کم اور امدادی قیمتوں پر دست یاب ہیں۔ برطانیہ میں راشن بندی کا زیادہ تر تعلق ان غذاؤں سے ہے:۔ پروٹین والی غذائیں، گوشت، گوشت کی بنی ہوئی چیزیں، چکناہٹ، شکر اور مربا، رقیق دودھ، پنیر وغیرہ۔ ان صحت بخش غذاؤں کا جتنا ذخیرہ دست یاب ہوتا ہے اسے مساوی طور پر پوری آبادی میں تقسیم کیا جاتا ہے اور اتنی مقدار میں تقسیم کیا جاتا ہے کہ اس سے لوگوں کی اوسط جسمانی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ ان اشیا کی قیمتیں حکومت کی امدادی اسکیم کے ذریعے بہت کم رکھی گئی ہیں۔ یہ ہے برطانیہ کی راشن بندی کا بنیادی نظام۔ اس بنیادی اسکیم کے اوپر چند خاص خاص اسکیمیں کھڑی کی گئی ہیں، جن سے مختلف طبقے کے لوگوں کی غذائی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، مثلاً اجتماعی طور پر کھلانے کا طریقہ کام میں لایا گیا ہے، جیسے کارخانوں کے مزدوروں کے لیے صنعتی رسد خانہ کھول دیا گیا ہے۔ اسی طرح بچوں کے لیے اسکولوں میں رسد خانے موجود ہیں اور رستوران میں عام پبلک کے لیے کھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ان اسکیموں کے تحت صنعتی مزدوروں، اسکول کے بچوں اور عام پبلک کو ایک وقت خاص طور سے تیار کیا ہوا متوازن قسم کا کھانا کھلایا جاتا ہے، اور اس کھانے کی قیمت بھی خاص طور سے کم رکھی گئی ہے۔ یہ اسکیمیں زیادہ تر حکومت کی چلائی ہوئی ہیں۔ بہت کم عمر کے بچوں، ان کی ماؤں، اور حاملہ عورتوں کے لیے صحت بخش غذاؤں کی تقسیم کا خاص طور سے انتظام کیا گیا ہے۔ انھیں اسپیشل راشن کارڈ کے ذریعے انڈا، پھلوں کا رس اور دودھ دیا جاتا ہے۔ صحت کو محفوظ رکھنے والی غذائیں خاص طور پر ان لوگوں کو دی جاتی ہیں جنھیں ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی غذائیں جن کی سپلائی ذرا غیر مستقل سی رہتی ہے ان کی تقسیم کا علاحدہ انتظام ہے۔ جیسے مچھلی، ڈبے والا گوشت اور سیم۔ ان کارروائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ میں جنگ کے زمانے میں نہ صرف غذائی دقتوں کو حل کر لیا گیا بلکہ عام کھانے کی غذائیت میں بھی اضافہ ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ چند سال میں انگریزوں کی اوسط تن درستی اور جسمانی حالت میں کافی ترقی ہوئی ہے، باوجود اس کے کہ انھیں تاریخ کی سب سے ہولناک جنگ کی وجہ سے زبردست اعصابی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔

ہندستان میں راشن بندی کا جو انتظام ہے وہ بظاہر تو برطانوی طرز کا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس میں

برطانوی راشن بندی کی خوبیاں نہیں پائی جاتیں۔ ہندستان میں سب سے پہلی خرابی تو یہ ہو کہ آبادی کے محض ایک چھوٹے سے حصّے کو راشن کے ذریعے غذا دی جاتی ہو۔ برطانیہ میں عام استعمال کی خاص خاص غذائیں راشن کے تحت نہیں لائی گئی ہیں لیکن ہندستان میں انھی غذائی اشیا کی راشن بندی کی گئی ہو۔ برطانیہ میں تمام غذاؤں کی قیمت، چاہے وہ راشن کے اندر ہوں یا راشن سے باہر، جان بوجھ کر کم رکھی گئی ہو اور اس کے کم رکھنے کے لئے حکومت برطانیہ پندرہ کروڑ پونڈ سالانہ بطور امدادی رقم کے خرچ کرتی ہو۔ ہندستان میں راشن والی غذاؤں کی قیمت بھی آج جنگ سے پہلے کے مقابلے میں تین گنی اور ان چیزوں کی قیمت کا پوچھنا ہی کیا جن کی راشن بندی نہیں کی گئی۔ ان کی قیمت جنگ سے پہلے کے مقابلے میں پانچ سو فی صدی سے لے کر آٹھ سو فی صدی تک زیادہ ہو۔ برطانیہ میں بھاری کام کرنے والے مزدوروں، بچّوں اور عام پبلک کی خاص خاص غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے خاص خاص اسکیمیں ہیں۔ لیکن ہندستان میں اس سلسلے میں تقریباً کچھ نہیں کیا گیا ہو۔ یہاں تمام بالغوں کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانک دیا گیا ہو۔ کچھ کوئلے کی کانوں اور کاشتی کاروبار (PLANTATIONS) کے مزدوروں کو بعض اوقات مزید راشن دینے کا انتظام ضرور کیا گیا ہو، لیکن تمام بھاری کام کرنے والے مزدوروں کو مزید راشن مہیا کرنے کا کوئی عام اصول نہیں مقرر کیا گیا ہو۔ برطانیہ میں بچّوں اور ان کی ماؤں اور حاملہ عورتوں کی غذائی ضرورتوں کا خاص لحاظ کیا جاتا ہے، لیکن ہندستان میں دو سال سے کم عمر کے بچّوں کو راشن بالکل نہیں دیا جاتا سوائے شکر کے۔ صحت کو محفوظ رکھنے والی خاص خاص غذاؤں کو (خاص کر دودھ کو) جن کی سپلائی بھی کم ہو، ضرورت مند لوگوں یعنی بچّوں اور ماؤں کے لیے محفوظ نہیں کیا گیا ہو۔ انگلستان میں یہ کیا گیا ہو اور پوری کامیابی کے ساتھ۔ اس سلسلے میں بمبئی شہر میں البتہ کچھ کیا گیا ہو۔ لیکن وہ واحد مثال ہو۔ بمبئی شہر میں ہوٹل اور رستوران والوں کو تازہ دودھ استعمال کرنے کی اجازت نہیں اور بچّوں اور بچّے والی ماؤں کو الگ راشن کارڈ دیا گیا ہو جس کے تحت انھیں روزانہ آدھا پونڈ دودھ خاص طور پر کم کی ہوئی قیمت پر مل سکتا ہو۔ بمبئی کی اسکیم ایسی ہو کہ ہر جگہ اس کی پابندی کی جاسکتی ہو۔ اس اسکیم میں صرف اتنی خرابی ہو کہ مقدار بہت کم رکھی گئی ہو۔

اوپر لکھی ہوئی باتوں سے یہ صاف ظاہر ہوگیا ہوگا کہ ہندستان میں غذا کی راشن بندی کچھ بہت اچھے اصولوں پر نہیں قائم ہو۔ برطانوی راشن بندی بلکہ یورپ کے ملکوں کی راشن بندی کے مقابلے میں بھی یہاں کا معیار بہت گھٹیا ہو۔ یہاں کے حکام نے جب راشن بندی کی اسکیمیں تیار کیں تو ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ یہاں زیادہ تر لوگ غلّہ کھاتے ہیں۔ جہاں تک غریب عوام کا تعلق ہو یہ مفروضہ یقیناً ایک افسوس ناک حقیقت ہونے کی حیثیت رکھتا ہو۔ لیکن متوسط طبقے اور اوپری طبقے کے لوگوں پر یہ مفروضہ صادق نہیں آتا۔ اور گزشتہ جنگ اور اس کے ہولناک نتائج کا سب سے زیادہ شکار اسی متوسط طبقے کے

لوگ ہوئے ہیں۔ جہاں تک امیر طبقے کے لوگوں کا تعلق ہے ان کی زندگی پر جنگ کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ تو جتنی مقدار میں چاہتے ہر چیز خرید سکتے تھے، اس لیے کہ یہاں گوشت، مچھلی، انڈا، دودھ، تازہ ترکاری، پھل، مکھن وغیرہ کو جان بوجھکر راشن بندی یا کنٹرول کی اسکیم سے باہر رکھا گیا ہے۔ بنگال میں البتہ ہفتے میں دو روز گوشت کا استعمال روک دیا جاتا ہے۔ گوشت کے کنٹرول کی یہی ایک واحد مثال ہے۔ دنیا بھر میں صرف ہندستان ہی ایسا ملک ہے جہاں امیروں کو من مانے طور پر اور نامحدود مقدار میں ہر چیز خریدنے، کھانے اور برباد کرنے کا حق حاصل ہے۔ یورپ میں راشن بندی نے مختلف معاشی گروہوں کی خوراک اور غذا کو مساوی اور ہم وار کر دیا۔ لیکن ہندستان میں راشن بندی سے یہ اشتراکی رجحان نہیں پیدا ہو سکا۔ اور مختلف طبقوں کی خوراک کو ہم وار نہیں بنایا جا سکا۔

محض اناج کی راشن بندی بھی ہندستان میں پورے طور پر کام یاب نہیں ہو سکی ہے۔ راشن کی ہوتی چیزوں کی قیمت اس کی مقدار اور معیار سب کے متعلق عام شکایت پائی جاتی ہے۔ شروع شروع میں تو چاول اور گیہوں کے ساتھ بالو، پسی ہوئی اینٹ اور کنکری وغیرہ ملی ہوتی تھی۔ حکام چاول کی مختلف قسموں میں امتیاز بھی نہیں روا رکھتے تھے۔ لوگوں کو اس بات کا اختیار نہیں ہوتا تھا کہ اپنی خواہش کے مطابق جس قسم کا چاول چاہیں خریدیں۔ جو عمدہ چاول کھانے کے عادی ہوتے تھے وہ مجبور تھے کہ راشن کی دکان میں جو مل جائے وہ لے لیں چاہے وہ اچھا ہو یا خراب۔ بچوں کے لیے اور لاچار مجبور لوگوں کے لیے یہ صورتِ حال خاص طور سے تکلیف دہ تھی اس لیے کہ ان کا کمزور معدہ خراب چاول یا غلے کا عادی نہیں تھا۔ بہ ہر حال اب راشن میں اناج اچھا ملنے لگا ہے اور کئی مقامات پر مثلاً بمبئی اور کلکتہ میں مختلف قسم کے چاول مہیا ہونے لگے ہیں جن کی قیمتوں میں بھی بہت فرق پایا جاتا ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ فائدہ ہوا ہے کہ لوگوں کو اپنی خواہش کے مطابق انتخاب کی آزادی رہتی ہے اور دوسری طرف حکومت معمولی قسم کا چاول بہت کم قیمت پر فروخت کر سکتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ "معمولی" قسم کا چاول اگر فروخت کیا جا سکتا ہے تو صرف ایسی قیمت پر جو عام طور سے مال کے ذخیروں کو جلد از جلد اونے پونے بیچ دینے کے لیے مقرر کی جاتی ہے۔

جہاں تک راشن کی مقدار کا سوال ہے حکومت کی پالیسی یہ رہی ہے کہ فی بالغ شخص ایک پونڈ اناج دیا جائے۔ کم غلہ پیدا کرنے والے اور زیادہ غلہ پیدا کرنے والے ـــــ دونوں قسم کے علاقوں میں یہی مقدار رکھی گئی ہے۔ عام لوگوں کے لیے فی کس ایک پونڈ غلہ کافی ہو تو ہو لیکن زیادہ جسمانی محنت کرنے والے کے لیے یقیناً یہ مقدار ناکافی ہے چاہے وہ کارخانے میں کام کرتا ہو یا کھیت میں یا گھر میں۔ چوں کہ یہاں برطانیہ کی طرح اجتماعی طور پر کھلانے کا انتظام نہیں ہے اس لیے یورپ کے دوسرے ملکوں کی مثال کے پیشِ نظر لوگوں کو ضرورت کے مطابق مختلف مقداروں میں راشن مہیا کیا جائے تو زیادہ مناسب

ہے۔ یہ تو جو کچھ کہا گیا ہے وہ حکومت کی مقررکردہ پالیسی کے بارے میں ہے۔ لیکن اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ واقعی لوگوں کو کتنا غلہ ملتا ہے تو صورت حال اور بھی لرزہ ناک نظر آئے گی۔ دراصل لوگوں کو راشن سے جس مقدار میں غلہ مل رہا ہے اس کا انحصار اس بات پر رہا ہے کہ سرکاری ذخیروں میں کتنا غلہ جمع ہے۔ یہ مقدار مقام اور وقت کے لحاظ سے بدلتی رہی ہے۔ مختلف علاقوں کے راشن کی مقدار میں کتنا فرق رہا ہے اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل جدول سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ جدول سر ٹ ب۔ رسین ڈائی، سی، ایس، کے اس بیان سے تیار کیا گیا ہے جو انھوں نے ۳۰ر نومبر ۱۹۴۴ء کو کونسل آف اسٹیٹ میں دیا تھا۔

ہفتے وار راشن

صوبے	خاص خاص شہر	زیادہ سے زیادہ کتنا چاول دیا جاسکتا ہے	گیہوں	شکر
بنگال	کلکتہ	۵ پونڈ	۷ پونڈ	۱۲ آونس
	چٹ گانو	۴ پونڈ	۳ پونڈ	۴ آونس
آسام	شیلانگ	۶ پونڈ	۲ پونڈ	۸ آونس سے لے کر ۱ پونڈ تک
بہار	پٹنہ	۶ پونڈ چاول یا گیہوں	×	۱۰ آونس
اڑیسہ	کٹک	۵½ پونڈ	۲ پونڈ	۱۰½ آونس
پنجاب	لاہور	×	۷ پونڈ	۹ آونس
سندھ	کراچی	۸ پونڈ چاول یا گیہوں	×	۸ آونس
یو۔ پی	۲۹ شہروں اور قصبوں میں	مغربی اضلاع میں ۸ ر ۳ پونڈ مشرقی اضلاع میں ۴ ر ۵ پونڈ	۴ ر ۵ پونڈ	×
سرحدی صوبہ	پشاور	مجموعی مقدار ۸ پونڈ	×	۸ آونس
سی پی اور برار	ناگ پور	چاول اور گیہوں ملا کر ۷ پونڈ	×	×
مدراس	مدراس شہر	۷ ر ۷ پونڈ چاول اور گیہوں	×	×
	ضلع مالابار	۵۵ ر ۴ پونڈ	۹۱ ر پونڈ	×
بمبئی	بمبئی شہر	۴ ر ۳ پونڈ	۱۴ ر ۴ پونڈ	۱۲ آونس
	پونا	۵ ر ۱ پونڈ	۱۰ ر ۴ پونڈ	۱۰ آونس
دہلی	نئی دہلی	۰ ر ۴ پونڈ	۱۴ ر ۷ پونڈ	۱۰ آونس

یہاں پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا لازمی ہو کہ گزشتہ چند مہینوں میں مختلف مقامات کے راشن کی مقدار کا فرق بہت کم ہوگیا ہو۔ ایک پونڈ فی کس کے راشن کو عمل میں لانے کے لئے چلی کہ کافی مقدار میں چاول نہیں مہیا ہو سکا ہو اس لیے مدراس میں اور دکن کے کچھ اور علاقوں میں گیہوں کو عام اور مقبول کرنے کی بعض دلچسپ کوششیں کی گئی ہیں۔ گیہوں اعلیٰ قیمتوں پر فروخت کیا گیا ہو۔ اور مدراس، کوچین اور ٹراونکور میں مظاہروں کے ذریعے پبلک کو بتایا گیا ہو کہ گیہوں کو کس طرح پکا کر کھانے کے کام میں لایا جاتا ہو۔ حکام نے یہ امید ظاہر کی ہو کہ اگر پبلک کو نئی قسم کی غذاؤں کا عادی بنا دیا گیا تو فی بالغ ایک پونڈ کا ہمہ دار راشن قائم کیا جاسکے گا یہی نہیں بلکہ لوگوں کو جنگ سے پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ متوازن غذا میسر ہو سکے گی۔

یہ اناج کے راشن کے متعلق ہوا۔ شکر کے راشن کی حالت اور بھی اطمینان بخش نہیں ہو۔ یہ تو ظاہر ہو کہ شکر، اناج کی طرح ہر گاؤں میں نہیں پیدا کی جاتی۔ اس کا مطلب یہ ہو کہ دیہی علاقوں میں شکر کی راشن بندی کا انتظام ہونا چاہیے تھا۔ ایسے علاقوں کے لوگ جہاں راشن بندی نہیں ہو اور دیہاتوں کے رہنے والے غذائی کمیٹیوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں جن کی اجازت کے بغیر انھیں شکر کا کوٹا نہیں مل سکتا۔ ان کمیٹیوں کو شکر کی جو مقدار دی جاتی ہو وہ بھی ناکافی ہوتی ہو۔ پھر چونکہ یہاں افراد کی ضرورت کے مطابق راشن دینے کا طریقہ نہیں رائج ہو اس لیے با اثر لوگ اپنے اپنے علاقوں کے کوٹے کا زیادہ حصہ خود ہتھیا لیتے ہیں۔

اگر ہندستان میں راشن کی مقدار زیادہ نہیں ہو، اور راشن بندی صرف چند ایسی خاص چیزوں تک محدود ہو جو عام لوگوں کے استعمال میں آتی ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ یہاں راشن کی مجموعی مقدار کا کافی حصہ لوگوں تک پہنچتا ہوگا۔ لیکن صورتِ حال یہاں پر بھی اطمینان بخش نہیں ہو۔ اگست سنہ ۱۹۴۴ء تک کے اعداد و شمار سے اس سلسلے میں جو اندازہ ہوا ہو وہ یہ ہو:-

۶۰ فی صد حصہ اناج کے راشن کا لے جایا گیا

۶۴ " " چاول " " "

۸۰ " " شکر " " "

برخلاف اس کے انگلستان میں راشن کی مجموعی مقدار کا وہ حصہ جو لوگوں تک پہنچ جاتا ہو اس کا تناسب ہندستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو۔ برطانیہ کے ماہرِ غذا سر ہنری فرنچ نے جنھیں حکومتِ ہند کے محکمۂ غذا نے ہندستان بلایا تھا، دونوں ملکوں کی اس صورتِ حال کا مقابلہ کرتے ہوئے بتایا کہ ہندستان میں ایسا اس لیے ہو کہ راشن بندی صرف چند چیزوں تک محدود ہو اور لوگوں کو اختیار رہتا ہو کہ وہ راشن کے علاوہ باہر سے چیزیں خرید کر اپنی کمی پوری کریں۔ لیکن

برطانیہ میں راشن بندی کا دائرہ بہت وسیع ہی اور لوگوں کو راشن سے باہر خریدنے کی بہت کم ضرورت پیش آتی ہی۔ لیکن برطانیہ کے ماہرِ غذا نے جو وجہ بتائی ہی وہ کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں معلوم ہوتی۔ چند خاص اور ضروری باتیں اُن کی نظر میں نہیں آسکی ہیں جن کی تشریح ضروری ہی۔ پہلی بات تو یہ ہی کہ عام استعمال کی ضروری غذائیں جن کی ہندستان میں راشن بندی کی گئی ہی برطانیہ میں راشن سے خارج ہیں۔ دوسری بات یہ ہی کہ برطانیہ میں چوں کہ اجتماعی رسد خانے موجود ہیں اس لیے اُن سے یہ امید کرنی چاہیے کہ وہ راشن سے کم غذا لیں گے۔ لیکن ان دونوں باتوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ میں لوگ راشن سے بہت لیتے ہیں اور ہندستان میں کم۔ دوسری طرف ہندستان میں جن چیزوں کی راشن بندی نہیں کی گئی ہو اُن کے دام اتنے زیادہ ہیں کہ معمولی آدمی انھیں زیادہ استعمال میں نہیں لاسکتا، اور پھر وہ استعمال میں لائے ہی کیوں جب کہ اُس کی زیادہ تر غذا اناج ہوتی ہی۔ اس بات کو خود سرکاری حلقوں میں تسلیم کیا جاتا ہی۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ کے مقابلے میں ہندستان میں لوگ راشن سے کم لے جاتے ہیں۔ آخر بات کیا ہی؟ ہمارے خیال میں وجہ یہ ہی کہ برطانیہ میں دورانِ جنگ میں غذا کی قیمت جنگ سے پہلے کے مقابلے میں صرف ۲۰ فی صد زیادہ ہوئی، لیکن اس کے برخلاف ہندستان میں اُن غذائی اشیا کے دام بھی جنگ کے پہلے کے مقابلے میں ۳۰۰ فی صدی زیادہ ہیں جن کی راشن بندی کی گئی ہی۔ یہ صحیح ہی کہ اس جنگ کے زمانے میں ہندستان کی مجموعی "آمدنی زر" میں بھی اضافہ ہوا ہی، لیکن یہاں پر اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ اس مزید آمدنی کی تقسیم بڑی ناہموار اور غیر مساوی رہی ہی۔ زیادہ لوگوں کی آمدنی میں بہت تھوڑا اضافہ ہوا ہی اور کم لوگوں کی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہی۔ جو لوگ ایک مقررہ آمدنی رکھتے تھے جیسے کم تنخواہ پانے والے سرکاری ملازمین (جنھیں زیادہ سے زیادہ ½ ۷ فی صدی مہنگائی بھتہ دیا جاتا ہی) ان لوگوں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چناں چہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہاں راشن سے لے جانے کا فی صد تناسب برطانیہ کی بہ نسبت اتنا کم رہا ہی۔ اگر کم آمدنی والے لوگوں کو امدادی قیمتوں پر راشن دینے کا انتظام کیا جاتا تو نتیجہ بالکل برخلاف ہوتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ جب امدادی قیمتوں پر راشن مہیا کرنے کا سوال پیدا ہوا تو مالی دقتوں کا بہانہ کیا گیا۔ حال آں کہ یہی بہانہ جنگی امور کو جاری رکھنے کے لیے بالکل نہیں پیش کیا جاتا۔ ہندستان میں برطانیہ کی راشن بندی کی اسکیم پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس کی بہ جائے حکومت "قیمتوں کی مشورہ کار کمیٹی" کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرتی رہی اور ملک کے مختلف بازاروں میں اناج کی قیمت کو ہموار کرنے کے لیے علاقائی اور صوبائی بنیاد پر قیمتوں کا کنٹرول کرتی رہی۔ ان کارروائیوں سے یہ ضرور فائدہ ہوا ہی کہ سنہ ۱۹۴۳ء کے مقابلے میں اناج کی قیمت بہت کم ہوگئی ہی لیکن موجودہ افراطِ زر کی صورت میں قیمتوں کے کم ہونے کی بھی ایک حد ہوتی ہی جس سے نیچے وہ نہیں جاسکتیں۔ حکومت کے لیے واحد راستہ یہ ہی کہ رعیت سے مناسب داموں پر براہِ راست غلہ حاصل کرے اور راشن سے خریدنے والوں کے ہاتھ نقصان اٹھا کر کم قیمت پر فروخت کرے۔

غلے کی قیمت اتنی ہی رکھی جائے جو جنگ سے پہلے کی آمدنیوں کے مطابق تھی۔ یورپ میں عام آبادی کی صحت اور ہمت کو برقرار رکھنے کے لئے بھی اتنا ہی خرچ کیا گیا جتنا فوجی امور میں۔ ہندستان ہی میں غیر عام آبادی کے لیے اتنا گھٹیا سٹیار کیوں رکھا گیا؟

ہندستان میں راشن بندی میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہو کہ جنگ کے شروع میں راشن بندی کی تیاری نہیں کی گئی تھی۔ اور دوسری وجہ ملک کا طول و عرض اور آبادی کی زیادتی ہو۔ اتنی بڑی آبادی کو راشن بندی کے ذریعے غذا فراہم کرنا ہمارے سامنے ایک بے حد پیچیدہ اور عظیم مسئلہ پیش کرتا ہو۔ پھر یہ آبادی وسیع و عریض علاقوں میں پھیلی ہوئی ہو، اور ان کی غذائیں بھی مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً پنجاب میں لوگ جو کھاتے ہیں وہ مدراس میں نہیں کھاتے۔ سائنٹیفک قسم کی راشن بندی قائم کرنے میں ایک اور دقت یہ ہو۔ کہ یہاں غذائی ٹکنالوجی ترقی یافتہ صورت میں موجود نہیں ہو، مثلاً ایسی غذائیں جو جلد خراب ہو جاتی ہیں (جیسے دودھ، ترکاریاں، مچھلی، انڈے وغیرہ) ان کو حفاظت سے رکھنے کا انتظام نہیں ہو۔ اگر ہم راشن بندی کی کسی عام اسکیم میں ان غذائی اشیا کو شامل کرنا چاہتے ہیں تو اُن کو حفاظت سے رکھنے کا طریقہ معلوم کرنا ضروری ہو۔ اس صورتِ حال سے ہم یہ سبق لیتے ہیں کہ ہندستان کی زرعی، صنعتی اور تنظیمی پستی کا ہمارے راشن بندی کے نظام پر بھی بہت خراب اثر پڑا ہو۔ راشن بندی کی دقتوں سے ہم نے جو تجربہ حاصل کیا ہو وہ یہ ہو کہ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں سے صنعتی اور سیاسی ہمسری کے بغیر ہندستان اپنی آیندہ غذائی دقتوں اور مشکلات کا حل نہیں کرسکتا۔ قحط اور بدغذائی (MALNUTRITION) کا نام و نشان ہندستان سے مٹانے کے لیے ضروری ہو کہ یہاں صحیح قسم کی غذائیں زیادہ پیدا کی جائیں اور ان کو حفاظت سے رکھنے کے طریقے معلوم کیے جائیں۔

راشن بندی کے سلسلے میں ہندستان کا تجربہ کچھ تلخ سا رہا ہو۔ یہی وجہ ہو کہ یہاں لوگ بے چینی کے ساتھ راشن بندی کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ موجودہ راشن بندی سے عام پبلک کی بے اطمینانی بالکل فطری ہو، لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ یہاں غذائی راشن بندی کا اصل مقصد صرف یہ رہا ہو کہ قحط کا مقابلہ کیا جائے جس نے بنگال اور دوسرے مقامات پر سیکڑوں اور ہزاروں انسانوں کی جان لے لی ہو۔ اگر صرف قحط کو روکنے کے خیال سے دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ہندستان میں راشن بندی تھوڑی بہت کامیاب ضرور رہی ہو مگر لیکن افسوس کی بات یہ ہو کہ اس پر پہلے سے عمل نہیں کیا گیا۔ راشن بندی اس وقت شروع ہوئی جب قحط کی آفت سر پر نازل ہو چکی تھی لیکن اگر ہندستان میں جنگ کے زمانے کی غذائی راشن بندی کے مقاصد محدود ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں موزوں اور مناسب راشن بندی کے تمام امکانات ختم ہو گئے ہیں۔ امن کے زمانے میں بھی یہاں راشن بندی سے بڑا کام لیا جاسکتا ہو اور اس کے ذریعے لوگوں کو غذائیت آمیز اور متوازن خوراک مہیا کی جاسکتی ہو۔ مکمل روزگار کا انحصار من جملہ

اِن باتوں کے اس پر بھی ہے کہ لوگوں کے اندر روزمرہ کے کھانوں کے علاوہ مزید غذائیت آمیز چیزیں کھانے کا میلان پیدا ہو۔ ہندستان جیسے غریب ملک میں غذا کا معیار بلند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت امدادی رقم سے غذا کی فراہمی کا انتظام کرے۔ "دُہری خوراک کی پالیسی" (DUAL CONSUMPTION POLICY) کو عمل میں لانے کے لیے راشن بندی کے علاوہ اور طریقے بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ امید ہے کہ جیسے ہی برما سے چاول کی درآمد شروع ہو جائے گی اور لوگوں کو عام طور سے چاول دست یاب ہونے لگے گا ویسے ہی اناج کی راشن بندی کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر راشن بندی کی موجودہ تنظیم پوری کی پوری ختم کر دی گئی تو یقیناً یہ ایک افسوس ناک بات ہوگی۔ ہماری رائے ہے کہ ہندستان کے فاقہ زدہ عوام کو غذا مہیا کرنے کے لیے طویل عرصے کا کوئی پلان جب بنایا جائے تو اس میں راشن بندی کے اشتراکی اور تخلیقی پہلوؤں کو ضرور کام میں لایا جائے۔

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

زمیں داری کا مسئلہ

از :ـــــــ سریش چندر ماتھر ایم۔ اے، ری سرچ سکالر دہلی یونی ورسٹی

ہندستان میں زمین کا لگان وصول کرنے کا جو قدیم طریقہ تھا وہ بعد میں آنے والے ہندو راجاؤں اور مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ برقرار رکھا گیا۔ عام طور پر لگان وصول کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ ہر کھیت سے اناج کا کچھ حصہ لے لیا جاتا تھا۔ بادشاہ کا کاشت کار سے براہِ راست تعلق ہوتا تھا۔ حکمراں اور کاشت کار کے بیچ میں کوئی تیسرا طبقہ نہیں تھا۔ لگان کی وصولی کے لیے ہر گانو میں ایک اگوا ہوتا تھا اور اس کی مدد کے لیے محاسب رکھے جاتے تھے۔ کئی گانو کو ملا کر ایک اعلا افسر ہوتا تھا جس کو نائک کہتے تھے۔ اُس زمانے میں پرگنے کو دیش کہتے تھے۔ اور دیش کے حاکم کو دیش مکھ اور دیش پانڈے۔

جب مسلمانوں نے ہندستان کو فتح کیا تو انھوں نے لگان کے اس طریقے کو قائم رکھا۔ نام البتہ ضرور بدل گئے لیکن نظام تقریباً وہی رہا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں بعد میں آنے والی تبدیلیوں کے لیے فضا تیار ہونے لگی۔ مغلوں کے زمانے میں اناج کی شکل میں لگان دینے کا طریقہ اُٹھ گیا اور مال گزاری زر کی شکل میں وصول کی جانے لگی۔ مغل حکومت کے زوال کے ساتھ اہم تبدیلیاں ہونے لگیں۔ زمیں داروں کی شکل میں ایک وسطی طبقہ پیدا ہونے لگا جن شکلوں میں یہ طبقہ پیدا ہوا وہ یہ تھیں :۔

(۱) راجا اپنے درباریوں، اپنے منظورِ نظر لوگوں اور شاہی خاندان کے چھوٹے افراد کو زمینیں عطا کرنے لگے۔ (۲)
(۲) جب پرانے راجا کے سرداروں کی جائداد تقسیم ہونے لگی تو ان کی بڑی بڑی زمین داریاں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئیں۔ (۳) سرکاری حکام نے جن کو لگان کی وصولی کا کام دیا گیا تھا زمینیں ہتھیالیں۔ (۴) لوگوں نے زمینیں خریدیں۔ یہ حال کے زمانے میں ہوا۔ (۵) فاتحین نے شروع میں جو زمینیں اپنے قبضے میں کیں ان سے ایک خاص طبقے اور کچھ خاص بڑے بڑے خاندانوں کا عروج ہوا جن کے پاس بڑی بڑی زمین داریاں ہوگئیں مثلاً پنجاب میں ایسا ہی ہوا۔
مرکزی حکومت کے ٹوٹنے اور بکھر جانے کے بعد صوبوں کے حاکم خود مختار ہوگئے۔ یہ صوبائی حکمراں اپنی اپنی خود مختاری کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیشہ جنگ و جدال کرتے رہے۔ اس جد وجہد کو جاری رکھنے کے لیے اخراجات کا سوال تھا، چناں چہ انھوں نے لگان کی وصولی کے لیے مقامی ایجنٹ مقرر کیے ان ایجنٹوں کو ان کی خدمات کے عوض میں زمینیں دی گئیں اور لگان معاف کر دیا گیا۔ لیکن زمانے کے امتداد کے ساتھ یہ ایجنٹ ٹھیکے دار ہوگئے، جنھیں زمین ایک مقررہ رقم کے عوض میں کچھ عرصے کے لیے دی جانے لگی۔ ۱۷۶۵ء تک یہ نظام ترقی کر کے ایسی منزل پر پہنچ گیا جب کہ یہ ایجنٹ بہت حد تک زمیں دار بن گئے۔

انگریزوں نے زمیں داری کے نظام کو کیوں ایک دائمی حیثیت دے دی اس کی تین وجہیں ہیں:-

(۱) ان کی حکومت کو ہندستان میں سہارا دینے کے لیے خود ہندستانیوں کے کسی طاقت ور اور مضبوط طبقے کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے زمیں دار طبقہ سب سے موزوں تھا۔

(۲) انگریزوں کے سامنے مالک اور رعیت والے نظام کے علاوہ نظامِ آراضی کی اور کوئی مثال نہیں تھی۔ یہ نظام خود ان کے ملک میں رائج تھا۔ چناں چہ انھوں نے مغلیہ زوال کے وقت کے نظامِ آراضی کو بالکل بدل تو نہیں دیا لیکن خود اپنے ملک کا زمینی ملکیت والا نظام اوپر سے جڑ دیا۔ اس طرح ہندستان کی تاریخ میں پہلی بار زمیں داری کے نظام کو یعنی ایک بیچ والے طبقے کو تسلیم کیا گیا۔

(۳) ایسٹ انڈیا کمپنی کو تنظیمی امور چلانے کے لیے اور نئے مقبوضات حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی رقموں کی ضرورت ہوئی۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کرنے کے فوراً ہی بعد انگریزوں کو یہ مسئلہ پیش آیا تھا۔ محاصل کی مسلسل آمد کا انتظام کرنے کے لیے اس زمانے کی تنظیمی مشینری کو قائم رکھا گیا، لیکن حکومت کے دیسی ایجنٹوں پر کنٹرول رکھنا بڑا مشکل معلوم ہوا۔ اس کے علاوہ اس انتظام سے محصولات کی بڑھتی ہوئی ضرورت نہیں پوری ہو رہی تھی۔ ہیسٹنگز نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ زمیں داریوں کو نیلام کروانا شروع کیا۔ سب سے زیادہ بولی بولنے والے کو زمیں داری دے دی جاتی تھی۔

لیکن یہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد بھی حکومت کے محصولات میں کمی ہی رہی۔ ۱۷۸۹ء میں کارنوالس نے زمیں داروں کے ساتھ دائمی بندوبست کا طریقہ اختیار کیا۔ اس طرح زمیں داروں کے مطالبات کو دائمی حیثیت بخش دی گئی۔ اس سے خرابیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا محصول کی وصولی میں کمپنی بہت سختی برتتی تھی، اس کا اثر زمیں داروں کے رویے پر بھی پڑا یعنی وہ بھی مال گزاری کی وصولی میں بہت سختی کرنے لگے۔ بہار اور بنگال کے بعد مدراس کی باری آئی۔ اور انگریزی حکومت نے اپنی مرضی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ۱۸۰۱ء میں شمالی سرکار کے علاقے میں دائمی بندوبست قائم کردیا۔ یہاں بھی وہی بُرے نتائج پیدا ہوئے جو بہار اور بنگال میں پیدا ہوئے تھے۔ زمین داری کے علاوہ بھی ہندستان میں دو قسم کے لگان کی وصولی کے طریقے رائج ہوئے۔

دوسری قسمیں

منرو نے یہ تجویز پیش کی کہ رعیت سے براہِ راست تعلق ہونا چاہیے تاکہ محصولات کی آمدنی میں تسلسل قائم رہے۔ چناں چہ ۱۸۱۲ء میں مدراس کے نئے علاقے میں رعیت واری سسٹم قائم کی گئی۔ اس سسٹم کا اصول یہ ہے کہ ریاست اور رعیت کے مابین راست تعلقات قائم رہیں۔ لیکن یہ سسٹم بھی عمل میں آنے کے بعد کارآمد اور مفید نہیں ثابت ہوئی۔ جس طرح زمیں دار زمین کی کاشت میں راست طور پر حصہ نہیں لیتے تھے اسی طرح حکومت کو بھی اس کام سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ حالات سے مجبور ہو کر حکومت نے زمین کا لگان بڑھادیا، اور اس کی وصولی میں جبر وسختی سے کام لینا شروع کیا۔ اس طرح ہندستان کی زرعی معیشت کی حالت دن بہ دن خراب ہی ہوتی چلی گئی۔

اس کے بعد ایک اور پلان عمل میں لایا گیا جسے محل واری سسٹم کہتے ہیں۔ اس سسٹم کے تحت حکومت اور گانو کے مابین زمین اور لگان کا بندوبست ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ زمیں دار اور رعیت واری دونوں کی خوبیاں یک جا کردی جائیں۔

زمیں داری کی خوبی یہ ہے کہ مسلسل اور مستقل طور پر لگان وصول ہوتا رہتا ہے، اور رعیت واری کی خوبی یہ ہے کہ رعیت اور حکومت میں راست تعلقات قائم رہتے ہیں۔ لیکن اس محل واری سسٹم میں بھی وہ خرابی قائم رہی جس کی وجہ سے رعیت واری اور زمیں داری ناکام یاب ثابت ہو چکی ہے۔ یعنی زمین کی کاشت میں حکومت کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ معلومات کے لیے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ محل واری سسٹم کی چار قسمیں ہیں:۔ (۱) زمیں داری خاص (۲) زمیں داری مشترکہ (۳) پٹی داری (۴) بھائی چاری۔

اوپر لگان کی جو تین قسمیں بتائی گئی ہیں یعنی زمیں داری، رعیت واری اور محل واری، یہی ہندستان کی زرعی

معیشت کی بنیاد ہیں۔

زمیں داری سسٹم کو منسوخ کرنے سے کیا مطلب ہے؟

یہ جان لینا ضروری ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ زمیں داری اُٹھا دی جائے تو ہمارا کیا مطلب ہوتا ہے:-

(۱) یا تو زمیں داری کو اُٹھا دیا جائے یا محل واری کو یا دونوں کو اُٹھا دیا جائے۔

(۲) ان لوگوں سے زمین کے حقوقِ ملکیت چھین لیے جائیں جو خود کاشت نہیں کرتے۔

(۳) یا زمین کی ذاتی ملکیت ختم کر دی جائے۔

سوال یہ ہے کہ ان تینوں میں سے ہم کیا چاہتے ہیں؟ اس وقت جو اس سے مطلب لیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ بنگال، بہار اور مُلک کے دُوسرے علاقوں میں زمین کی ملکیت کا جو طریقہ ہے اُسے اُٹھا دیا جائے۔ ان صوبوں اور علاقوں میں سرکاری لگان عائد کرنے کے لیے جو وحدت تسلیم کی گئی ہے وہ زمیں دار کی زمیں داری ہے۔ زمیں داری اُٹھانے کا اس وقت مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اُن گانووں میں محل داری سسٹم بھی اُٹھا دی جائے جو زمیں داروں کی ملکیت میں ہیں، چاہے وہ ایک زمیں دار کی ملکیت میں ہوں یا چند زمیں داروں کی۔ لیکن زمیں داری اٹھانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُن لوگوں کی زمینیں بھی چھین لی جائیں جن کے پاس رعیت واری یا محل واری سسٹم کے تحت زمین ہے، اور اسے یا تو خود کاشت کرتے ہیں یا دُوسرے کسانوں کو ٹھیکے یا بٹائی کے تحت کاشت کرنے کے لیے دے دیتے ہیں۔ عام معنوں میں زمیں داری اُٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ کاشت کار کو اپنی زمین کے حقوقِ ملکیت حاصل ہو جائیں۔ زمیں داری اُٹھانے کے ایک اور معنی ہو سکتے ہیں، یعنی یہ کہ زمین پر ذاتی ملکیت ہی ختم کر دی جائے۔ اس کے تحت یہ ہوتا ہے کہ زمین پر پورے گانو یا ریاست کے حقوقِ ملکیت ہوتے ہیں۔ اور زمین حقیقی جوتنے اور بونے والوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے اس کے بعد کاشت کار چاہیں تو الگ الگ کاشت کریں یا پنچایتی طور پر۔

زمیں داری اُٹھانے کے جو پہلے دو معنی بتائے گئے ہیں ان کو ہم زیادہ سے زیادہ زرعی اصلاح کہہ سکتے ہیں، لیکن زمیں داری اُٹھانے کا جو تیسرا مطلب بتایا گیا ہے وہ انقلاب کے مرادف ہے۔ اس سے پُورے زرعی سماج میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ اور زرعی معیشت کا ڈھانچہ تمام و کمال بدل جاتا ہے۔ لیکن آج کل زمیں داری اُٹھانے کا جو مطلب لیا جا رہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ زمین پر ان لوگوں کے حقوقِ ملکیت ختم کر دیے جائیں جو خود کاشت نہیں کرتے۔

زمیں داری اُٹھا دینے سے کیا نتائج برآمد ہوں گے؟

جب زمین پر سے ان لوگوں کے حقوقِ ملکیت ختم کر دیے جائیں گے جو خود کاشت نہیں کرتے تو کاشت کار اپنی اپنی زمین کے مالک ہو جائیں گے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسانوں کے قبضۂ زمین میں استحکام اور استقلال پیدا ہوگا، زمیں داروں

کی آمدنی ختم ہو جائے گی، زمیں دار طبقے کے مفاد باقی نہیں رہیں گے اور جمہوریت کی بنیادیں مضبوط ہوں گی۔ آئیے ان میں سے ہر چیز کو الگ الگ دیکھیں۔

پیداوار پر کیا اثر ہوگا؟

چوں کہ زمیں داری کے تحت کاشت کار کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ زمین ہمیشہ میرے قبضے میں رہے گی اس لیے وہ زیرِ کاشت زمین کی حالت درست کرنے اور کاشت کاری کے بہتر طریقے اختیار کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ وہ زیرِ کاشت زمین میں سرمایہ نہیں لگاتا اس لیے کہ اسے یہ احساس رہتا ہے کہ یہ زمین میری نہیں ہے۔ وہ کاشت کاری کے معمولی طریقے اختیار کرکے زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، بغیر اس بات کا خیال کیے کہ اس سے زمین کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن زمیں داری اُٹھا دینے کے بعد جب وہ اپنی زمین کا مالک ہو جائے گا تو اسے اپنی زمین سے زیادہ دل چسپی پیدا ہوگی۔ اور وہ اُس سے بدسلوکی ترک کر دے گا۔ زمیں داری کے اُٹھ جانے کے بعد کاشت کاروں کے قبضۂ زمین میں استحکام پیدا ہوگا اور کھیتوں کا رقبہ بھی بڑھ جائے گا۔ اس سے پیداوار بڑھے گی اور مختلف اور متعدد فصلیں پیدا کی جا سکیں گی۔

آمدنی کی تقسیم پر اثر

اب ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ زمیں داری سے مُلک کی ترقّی اور خوش حالی میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ زمیں داروں کے پاس مُلک کی بہت بڑی آمدنی صرف اس لیے چلی جاتی ہے کہ انھیں زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہوتے ہیں حال آں کہ ان سے مُلک یا قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ جب زمیں داری اُٹھ جائے گی تو مُلک کی بہت بڑی آمدنی ان لوگوں کے پاس جانے لگے گی جو کھیت جوتتے اور بوتے ہیں۔ اس طرح آمدنی کی تقسیم میں انصاف پیدا ہوگا اور کاشت کاروں کا معیارِ زندگی بلند ہوگا۔

سماجی اور سیاسی فائدے

انگریزی حکومت نے زمیں دار طبقے کو اس لیے برقرار رکھا تاکہ تجارت پیشہ طبقے کے ہاتھوں میں سیاسی طاقت نہ چلی جائے۔ موجودہ نظام میں معمولی سے معمولی تبدیلی بھی زمیں دار طبقے کے مفاد کے خلاف ہے۔ لیکن موجودہ صورتِ حالات میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ چناں چہ تبدیلی چاہنے والوں یعنی سیاسی پارٹیوں کو زمیں دار طبقے سے حمایت کی کوئی امید نہیں۔ ملک کی سیاسی جماعتیں اپنی پالیسی کو عمل میں لانے کے لیے اور اپنے جمہوری اور دستوری مقاصد کی تکمیل کے لیے کاشت کاروں کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ تبدیلیاں عوام کی غربت کو دور کرنے کے لیے کافی ہیں؟ ہندستان میں کاشت کاروں کی غربت کی وجہ یہ ہے کہ محنت کے باوجود کافی پیدا نہیں ہوتا یعنی یہاں کی محنت پیدا آور نہیں ہے۔ کسانوں کے پاس

فی کس سرمایے کی کمی ہے۔ ہندستان کے کاشت کاری کے نظام کے ناکارہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ آبادی کا بہت بڑا حصہ غذا پیدا کرنے کے کام میں لگا ہوا ہے اور پھر بھی غذا کافی نہیں پیدا ہوتی ہے۔ کسی ملک کی کاشت کاری اسی وقت اچھی اور اعلا کہلاتی ہے کہ کم لوگ اس کام میں لگے ہوں لیکن پیداوار کافی ہوتی ہے۔ پھر ہندستان میں کھیت بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں لوگ سرمایہ کاشت کاری میں نہیں لگاتے۔ سرمایہ ہوتا بھی ہے بہت قلیل۔ اگر کھیت چھوٹے چھوٹے ہوں، سرمایہ ناکافی ہو اور محنت کرنے والے بہت سے ہوں تو ایسی حالت میں کاشت کاری کے قدیم طریقوں ہی سے کام چل سکتا ہے۔ زیادہ تر کاشت کار خود اپنی خوراک کے لیے غلّہ پیدا کرتے ہیں۔ وہ بازار میں فروخت ہونے والی اور نفع لانے والی فصلیں نہیں پیدا کرتے۔ ہندستان میں کاشت کاروں کی فی کس آمدنی بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ کھیتوں کا سائز بڑا ہو، اور کوئی ایسا ادارہ ہو جو سستے طور پر کسانوں کو سرمایہ مہیا کر سکے۔ کاشت کاروں کے قبضۂ زمین میں استحکام کا نہ ہونا خوش حالی کی راہ میں ایک رُکاوٹ ضرور ہے لیکن یہی ایک رُکاوٹ نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جو ترقّی کی راہ میں حائل ہیں۔ زمیں داری کے اُٹھ جانے سے یہ ایک رُکاوٹ ضرور دُور ہو جائے گی لیکن اس سے کسانوں کی حالت کچھ بہت اچھی نہیں ہو جائے گی۔ تاوقتیکہ دُوسری رُکاوٹیں بھی دور نہ کر دی جائیں۔ اگر دُوسری رکاوٹیں بھی دُور نہ کی گئیں تو ممکن ہے کہ رومانیہ کی طرح ہندستان میں بھی زمیں داری کے اُٹھ جانے کے بعد مجموعی پیداوار کم ہو جائے۔ اگرچہ فصلوں کی تقسیم اچھی ہو جائے گی لیکن مجموعی پیداوار کا گھٹ جانا بڑی تشویش ناک بات ہوگی۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ زمیں داری کے اُٹھ جانے کے بعد آمدنی کی تقسیم مساوی ہو جائے گی یا نہیں، ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس سے زرعی مزدوروں اور کاشت کاروں کی رعیتوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، حال آں کہ یہ لوگ کاشت کار آبادی کے چالیس یا پچاس فی صد حصّہ ہیں۔ دراصل زمین کی ازسرِنو تقسیم کا سوال ایک بے حد پیچیدہ مسئلہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ ہندستان میں زمیں داری کے اُٹھ جانے کے بعد کاشت کاروں کو اپنی اپنی زمینوں پر حقوقِ ملکیت ضرور حاصل ہو جائیں گے، لیکن اس صورت میں اُن کھیتی کرنے والوں کا کوئی انتظام نہیں ہوتا جن کے پاس زمین نہیں ہے اور جو دوسروں کے کھیت میں کام کر کے اپنا گزارہ کرتے ہیں۔ پھر بنگال میں اور مُلک کے دُوسرے علاقوں میں جاگیرداری نظام کی متعدد تہیں پائی جاتی ہیں یعنی زمیں دار، اس کے نیچے کاشت کار اور پھر اس کے نیچے کاشت کار ہوتے ہیں اور اودھ میں یہ طریقہ پایا جاتا ہے کہ بعض اوقات زمیں دار اپنی زمین کا خود ہی مالک بھی ہے اور خود ہی کاشت کار بھی۔ ایسی حالت میں یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ زمین کا حقیقی جوتنے اور بونے والا کون ہے۔

پھر زمیں داری اُٹھانے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ زمیں داروں کو معاوضہ بھی دیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ

کاشت کاروں پر سے بوجھ ہٹا کر ٹیکس دینے والوں پر رکھ دیا جائے گا۔ معاوضہ دینے کی بات کئی مسئلے پیدا کرتی ہے۔ شلاً زمیں داروں کو معاوضہ کیوں دیا جائے؟ کتنا معاوضہ دیا جائے۔ رقم کہاں سے لائی جائے؟

ان سوالات کا تعلق تقسیمِ آمدنی کے مسئلے سے بھی ہے۔ آمدنی کی سب سے مساویانہ اور منصفانہ تقسیم اُسی وقت ہو سکتی ہے کہ زمیں داروں کو معاوضہ بالکل نہ دیا جائے۔ انھیں جتنا بھی زیادہ معاوضہ دیا جائے گا اتنا ہی نئے کاشت کاروں اور ٹیکس ادا کرنے والوں پر بوجھ زیادہ پڑے گا۔ فلاؤڈ کمیشن نے اپنی رپوٹ میں رائے دی ہے کہ زمیں داروں کو معاوضے کے طور پر بیس سال کی مال گزاری دی جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ادائگی کی صورت کیا ہوگی؟ غالباً سرکاری بانڈ کے ذریعے؟ لیکن بانڈ کی ادائیگی کے لیے حکومت رُپے کہاں سے لائے گی؟ اُس کی دو صورتیں ہیں:۔ حکومت ٹیکس لگائے گی یا ایک مقررہ سالانہ رقم کاشت کاروں سے وصول کر کے زمیں داروں کو دے گی۔ ممکن ہے دونوں طریقے اختیار کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ یہ سالانہ رقم اُس وقت تک زمیں داروں کو دی جاتی رہے گی جب تک بانڈ کی مدت ختم نہ ہو جائے۔ آج کل ٹیکس زیادہ تر بالواسطہ (INDIRECT) ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کاشت کاروں پر بھی ٹیکس کا بوجھ پڑے گا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زمیں داروں کو جو معاوضہ ملے گا اُس کا زیادہ حصہ خود کاشت کاروں ہی کی جیب سے برآمد کیا جائے گا۔

ہماری دیہی غربت زیادہ تر اس وجہ سے نہیں ہے کہ آمدنی کی تقسیم غیر مساوی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ پیداوار کم ہوتی ہے۔ اگر زمین تمام کاشت کاروں میں برابر برابر تقسیم کر دی جائے تو بھی فی کس آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ نہیں ہوگا، تا وقتے کہ زرعی معیشت کا پورا ڈھانچہ نہ بدل دیا جائے۔ زمیں داری کے اُٹھا دینے سے تقسیمِ آمدنی کچھ مساویانہ ضرور ہو جائے گی لیکن اتنی مساویانہ نہیں ہوگی کہ کاشت کاروں کی حالت بہت اچھی ہو جائے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ زمیں دار معاوضے کی رقم سے پھر زمینیں خریدنا شروع کر دیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے سے اُن کو کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ رومانیہ میں کچھ اسی طرح ہوا تھا۔ کوزا کے زمانے میں وہاں زمین کی از سرِ نو تقسیم کے بعد بھی کسان بدستور اپنے پہلے مالکوں کے غلام بنے رہے اور اُن کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ رومانیہ کی مثال سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ محض یہ قانون بنا دینا کافی نہیں ہے کہ کاشت کاروں کی زمین چھینی نہیں جا سکتی، تا وقتے کہ کاشت کاری کے لیے اور غلے کی حمل و نقل کے لیے مالی امداد فراہم کرنے کا کوئی موزوں اور معقول ذریعہ نہ پیدا کیا جائے۔ ہندستان میں بھی یہی ہوگا کہ کاشت کار اپنی رُپے کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ساہوکاروں کے دستِ نگر رہیں گے۔ یہ ساہوکار کون ہوں گے؟ وہی زمیں دار جو پہلے اُن کے حاکم بنے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین پھر بڑے بڑے مالکوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔

زمیں داری اُٹھانے کے سیاسی نتیجے

زمیں داری اُٹھا دینے سے اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑے بڑے جاگیر دار اور زمیں دار ختم ہو جائیں گے اور ترقّی کے راستے میں جو سب سے پہلی رُکاوٹ ہی وہ دُور ہو جائے گی لیکن چھوٹے زمیں داروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جائے گا جو انفرادی طور پر کم زور ہونے کے باوجود جماعتی اور طبقاتی حیثیت سے بہت طاقت ور اور مضبوط ہوگا۔ ان چھوٹے زمیں داروں کی حیثیت وہی ہوگی جو روس کے کولیک طبقے (KULAKS) کی تھی۔ یہ طبقہ سیاسی لحاظ سے ناقابلِ اعتماد ہوگا۔ حال حال تک (اور پنجاب میں ابھی تک) یہی طبقہ حکومتِ برطانیہ کا خاص تکیہ اور سہارا بنا ہوا تھا۔ آج وہ طبقہ کانگرس کے ساتھ ہی، اس لیے کہ وہ دیکھ رہا ہی کہ کانگرس کے ذریعے متوسط طبقے کے ہاتھوں میں اختیارات آ رہے ہیں لیکن کل یہی طبقہ مزید اصلاحوں اور انقلابوں کا دشمن بن جائے گا، اس لیے کہ مزید اصلاحوں کے معنی یہ ہوں گے کہ متوسط طبقے کے ہاتھوں سے اختیارات نکل کر زرعی اور صنعتی مزدوروں اور چھوٹے چھوٹے کسانوں کے ہاتھوں میں آ جائیں۔ اگر کانگرس متوسط طبقے کو دبانے کی کوشش کرے گی تو وہ کانگرس کا مخالف بن جائے گا۔ اگر ملک میں انقلاب ہوا تو وہ طبقہ انقلاب کی بھی مخالفت کرے گا۔ غرض زمیں داری کے اُٹھ جانے کے بعد بھی ہندستان میں جو طبقاتی مدارج پائے جاتے ہیں وہ کم و بیش قائم رہیں گے۔ بلکہ ممکن ہی اس سے صنعتی مزدوروں کی طاقت کم زور ہو جائے۔

اگر کاشت کاروں کی حکومت ہندستان میں قائم ہو بھی گئی تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ حکومت کاشت کاروں کے فائدے کے لیے کام کرے۔ زمیں داری اُٹھ جانے سے ہندستان میں کمین پن (SERFDOM) کا نظام ختم نہیں ہوگا بلکہ ایک نئی شکل اختیار کرے گا۔ غریب طبقہ زمیں داروں کی محکومی سے نکل کر مل مالکوں اور کارخانے داروں کی محکومی میں آ جائے گا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ محض زمیں داری اُٹھا دینے سے مُلک کے اصل مسئلے حل نہیں ہو سکتے اور نہ کسانوں کا معیارِ زندگی بلند ہو سکتا ہی۔ اس مقصد کو حل کرنے کے لیے ذاتی ملکیت کا خاتمہ اور پنچایتی کھیتی کا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہی۔ موجودہ غذائی دقتوں نے ثابت کر دیا ہی کہ اب اتنی اہم باتیں کاشت کاروں کی من مانی خواہش پر نہیں چھوڑی جا سکتیں کہ کیا چیز پیدا کی جائے، کس طرح پیدا کی جائے اور کتنی پیدا کی جائے۔ قوم کو ضروری مقدار میں غذا فراہم کرنے کے لیے ضروری ہی کہ ان باتوں کو ریاست خود اپنے قبضہ و اختیار میں لے لے۔

ــلہ جو ایک ناممکن سی بات ہی۔ ایڈیٹر

مسائل حاضرہ (غیر ممالک)

مشرقی یورپ میں زرعی انقلاب

از: ــــــــ خلیق احمد نقوی

آج کل مشرقی یورپ میں ایک زبردست اور شاندار زرعی انقلاب ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک کے لیے اس زرعی انقلاب کے مطالعے کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ ہمیں بھی اسی قسم کے مسائل کو حل کرنا ہے۔ مشرقی یورپ کی طرح ہمارا ملک بھی زراعتی ملک ہے۔ آبادی کا زیادہ تر حصہ زراعت ہی سے اپنی روزی کماتا ہے ـــ ایسی زراعت سے جس میں زمیں داری نظام کا تسلط ہے۔ ان اعداد و شمار کو دیکھیے:۔

ملک	فی صدی آبادی جو زراعت سے روزی حاصل کرتی ہے
یوگوسلادیا	۷۶٫۲
ہنگری	۵۰٫۸
رومانیہ	۷۸٫۰
پولینڈ	۶۳٫۰
ہندستان	۷۵٫۰

آبادی کی اتنی بڑی تعداد جب زراعت کا سہارا لیتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسانوں کے پاس بہت چھوٹے چھوٹے

کھیت ہوتے ہیں اور ایک بہت بڑی تعداد کے پاس بالکل زمین نہیں ہوتی۔ زراعت کی ترقی رُک جاتی ہے اور غریبی پھیلتی ہے۔
آبادی کا اتنا بڑا حصّہ زراعت کا سہارا لینے پر اس لیے مجبور ہے کہ مُلک میں صنعت کی ترقی نہیں ہوئی۔ غیر ملکی سرمایہ کبھی نہیں چاہتا کہ اس کی نوآبادی یا نیم غلام مُلک میں صنعتوں کی ترقی ہو۔ اسے ان ممالک سے خام اجناس ملتی ہیں، اس کا زائد سرمایہ کھپتا ہے اور اس کی بنائی ہوئی اجناس بکتی ہیں۔ اگر صنعتوں کی ترقی ہوگئی تو یہ تینوں مقاصد فوت ہو جائیں گے۔ ہندستان کی طرح مشرقی یورپ کے ممالک میں بھی غیر ملکی سرمایہ بڑی بڑی صنعتوں پر قابض تھا۔ یوگوسلاوی صنعتیں تقریباً پوری طرح غیر ملکی سرمایے داروں کے قبضے میں تھیں۔ ۱۳ کروڑ غیر ملکی سرمایے میں سے ۴½ کروڑ برطانیہ کا تھا اور ۴½ کروڑ فرانس کا۔ رومانیہ کی سب سے بڑی صنعت یعنی تیل میں لگے ہوئے ۳۲½ کروڑ سرمایے کا ۹۹ فی صدی حصّہ برطانیہ اور ہالینڈ کا تھا۔ تیل کے علاوہ دھات کی صنعت میں ۲ کروڑ رُپے لگے ہوئے تھے۔ ہنگری میں بھی برطانیہ اور امریکہ کا ۷۴ کروڑ رُپے کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔

ان حالات کا نتیجہ یہ تھا کہ جنگ سے پہلے مشرقی یورپ معاشی تباہی کا شکار تھا۔ ہر طرف غریبی اور بے کاری پھیلی ہوئی تھی۔ اگر ان ممالک کو ترقی کرنا ہے تو انھیں زمیں داری نظام ختم کرنا چاہیے اور غیر مُلکی سرمایے کے قبضے سے باہر نکلنا چاہیے۔ مشرقی یورپ کی معاشی بدحالی دُور کرنے کا اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔

جرمنی کی شکست کے بعد ان مُلکوں نے اپنی نئی جمہوری حکومتوں کے ذریعے سب سے پہلے زمیں داری ہی کے خاتمے کے کام میں ہاتھ لگایا۔ یہی زمیں دار تھے جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور تھی۔ وہ سامراجی طاقتوں کی مدد سے اپنے مُلک کے عوام کو دبا کر رکھنا چاہتے تھے، انھی نے جرمنوں سے سازباز کی اور اپنا ملک ان کے سپرد کر دیا۔ اگر ان ممالک کے عوام ہمیشہ کے لیے غیر مُلکی سرمایے اور سامراجی ملکوں کے پنجے سے نکلنا چاہتے تھے اور عوام کو غریبی اور بھوک سے نجات دِلانا چاہتے تھے تو ان کے لیے زمیں داروں کی طاقت کو ختم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

اور انھوں نے یہی کیا۔

مشرقی یورپ کے تمام ممالک —— یوگوسلاویا، ہنگری، رومانیہ، پولینڈ، مشرقی پرشا —— میں یک قلم زمیں داری کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ان مُلکوں کے قوانین کی تفصیلات میں فرق ہے، مگر بنیادی مقصد ایک ہی تھا —— مُلک میں کوئی طاقت باقی نہ رہے جو غیر ممالک سے سازباز کرے، جو عوام کو غریبی کی زندگی گزارنے پر مجبور کرے۔ وہ ایسی حالت نہ پیدا کر سکے کہ کسی غریب سے پوچھا جائے کہ تمھاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے تو وہ جواب دے "کاش مجھے آلو کے ساتھ کھانے کے لیے تھوڑا سا نمک مل جاتا۔ بغیر نمک کے آلو کھانا بہت مشکل ہے!"

جرمنی کے چنگل سے آزاد ہونے کے بعد سال بھر کے اندر اندر ان ممالک میں زرعی اصلاحات تیزی سے شروع ہوگئیں

زمین داری ختم کر دی گئی اور بڑی بڑی جائدادوں کے ٹکڑے کر کے ان کو بے زمین مزدوروں اور چھوٹے کسانوں میں بانٹ دیا گیا۔ آیئے دیکھیں کہ مختلف ممالک میں یہ کام کس طرح سرانجام ہوا۔

ہنگری مشرقی یورپ کے ممالک میں سب سے زیادہ خراب حالت ہنگری کی تھی۔ زمین داروں کی آدھی فی صدی آبادی کے قبضے میں ملک کی چالیس فی صدی زمین تھی۔ ملک کی ۸۰ لاکھ آبادی میں سے ۱۳ لاکھ بے زمین مزدور تھے، ۶ لاکھ حکومت کے نوکر اور ۱۳ لاکھ چھوٹے کاشت کار جن کی آمدنی ۲۰۰ روپے سالانہ سے کم تھی۔ ۴۰ لاکھ آبادی کا دارومدار زراعت پر تھا اور صرف ۱ لاکھ ۸۰ ہزار افراد کے پاس اتنی زمین تھی کہ پیٹ بھر کر کھا سکیں۔

اِن حالات میں نئی حکومت نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔

اس حکومت نے زرعی اصلاح کے قوانین بنانے میں کافی جلدی سے کام لیا۔ ۲۹۰ ایکڑ سے زیادہ کی سب ذاتی جائدادیں اور ۱۵۰ ایکڑ سے زیادہ کی گرجوں وغیرہ کی زمینیں ضبط کر لیں۔ ۱۵۰۰ ایکڑ سے زیادہ کی جائدادیں بلا معاوضہ ضبط کی گئیں اور اس سے کم کی جائدادوں کا معاوضہ دیا گیا۔

اس طرح ضبط کی ہوئی زمین کو بے زمین اور غریب کسانوں کے خاندانوں میں بانٹ دیا گیا۔ ۵۸ لاکھ ایکڑ زمین ۷ لاکھ خاندانوں یعنی تقریباً ۳۵ لاکھ نفوس میں بٹ گئی۔ اوسطاً ہر خاندان کو ۸ ایکڑ زمین ملی۔ اس کے علاوہ زرعی امدادِ باہمی کی انجمنیں قائم کی گئی ہیں تاکہ غریب کسانوں کو اپنے پانو پر کھڑے ہونے میں مدد دیں۔

رومانیہ اس ملک میں ۳۰-۱۹۱۸ء میں کچھ زرعی اصلاحات ہوئی تھیں۔ لیکن ان اصلاحات کے باوجود ایک فی صدی سے کم زمین داروں اور کاشت کاروں کے پاس باقی کُل آبادی کی آدھی سے زیادہ زمین تھی۔

نئی اصلاحات کی رُو سے ۱۲۵ ایکڑ سے زیادہ کی جائدادوں کو بے زمین مزدوروں اور ان چھوٹے کسانوں میں بانٹ دیا گیا جن کے پاس ۱۲½ ایکڑ سے کم زمین تھی۔ اس طرح ۲۰۵۰۰ ایکڑ سے زیادہ کی ۵۰۰ جائدادیں ستمبر ۴۵ء کے اختتام تک بٹ گئیں۔ اس سے ۹ لاکھ سے زیادہ خاندانوں کا فائدہ ہوا جن کے پاس ½ ۱۲ سے لے کر ۱۲ ایکڑ تک کے کھیت ہیں۔ اب تک ایک کروڑ تین لاکھ ایکڑ زمین بٹ چکی ہے۔ زمین کو انصاف سے بانٹنے کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا جس میں ہر علاقے کے بزنگ، زراعت کے ماہر اور ان لوگوں کے نمائندے شامل ہیں جنھیں زمین ملنے والی ہوتی ہے۔

صرف یہی نہیں، بلکہ اِن کسانوں کو مویشی بھی دیے گئے ہیں۔ زرعی مشینیں حکومت کی طرف سے سستے کرائے پر دی جائیں گی۔ انجمنِ امدادِ باہمی کو فروغ دیا جا رہا ہے اور ۳۰ لاکھ لائی (رومانیہ کا سکّہ) کا قرضہ کسانوں کو دیا جائے گا تاکہ وہ اپنی نئی کاشت ٹھیک سے چلا سکیں۔ زمین بیچنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے مہاجن قرض دے کر زمین نہیں کر سکتا۔ کسانوں

کو زمین کی قیمت کے طور پر ایک سال کی پیداوار دینی پڑے گی۔ کسان اس قیمت کو دس یا بیس سال کی قسطوں میں ادا کرسکتا ہے۔

پولینڈ اس ملک میں جنگ سے پہلے حالت یہ تھی کہ ایک فی صدی آبادی کے پاس ملک کی آدھی سے زیادہ زمین تھی۔ تہائی سے زیادہ کھیت پانچ ایکڑ سے کم تھے۔

نئی زرعی اصلاح کے ماتحت ۸۳۲۲ بڑی جائدادیں جن کا مجموعی رقبہ ۴۰ لاکھ ایکڑ تھا تقریباً ۳ لاکھ بے زمین مزدوروں اور چھوٹے کسانوں کے خاندانوں میں بانٹ دی گئیں۔ مشرقی پرشا اور اوڈر ندی کے مشرق کا علاقہ چوں کہ اب پولینڈ میں شامل ہوگیا ہے اس لیے وہاں کی زمینیں بھی بنٹ گئی ہیں۔ لیکن ابھی وہاں کے اعداد و شمار موصول نہیں ہوئے ہیں۔

ہنگری اور رومانیہ کی طرح یہاں بھی باہمی امداد کی انجمنیں بہت بڑی تعداد میں قائم کی گئی ہیں۔ ۱۹۴۵ء کے وسط تک سات ہزار انجمنیں بن چکی تھیں جن کے بیس لاکھ ممبر تھے۔ یہ انجمنیں کسانوں کو زراعت کے آلات اور مکان اور کھیت کی عمارتیں بنانے کے لیے قرضے دیں گی۔ اس طرح آزاد کیے ہوئے کسان سود خواروں کے چنگل سے بچ سکیں گے۔

یوگوسلاویا مارشل ٹیٹو کی حکومت نے یوگوسلاویا میں زرعی اصلاحیں اس اعلان کی بنیاد پر جاری کیں: "زمین اس کی ہوگی جو اسے جوتے گا"۔

۱۱۰ ایکڑ سے زیادہ کی تمام جائدادیں اور ۶۰ سے لے کر ۸۰ ایکڑ تک کی وہ زمینیں جنھیں مالک خود نہیں جوتتے ضبط کرلی گئیں۔ بینکوں، تاجروں اور گرجاؤں کی زمینیں بھی ضبط ہوگئیں۔ گرجاؤں اور دوسرے مذہبی اداروں کو بارہ ایکڑ تک کی زمین انھیں چلانے یا رفاہِ عام پر خرچ کرنے کے لیے چھوڑ دی گئی۔ ان میں سے جن کی تاریخی اہمیت ہے ان کے لیے پچاس ایکڑ تک چھوڑی گئی ہے۔

ایک خاص قانون کے ذریعے زمین کی خرید و فروخت ناجائز قرار دی گئی ہے۔ زمین بلا معاوضہ ضبط ہوئی ہے جن زمین داروں نے جرمنی سے ساز باز نہیں کیا تھا انھیں ایک سال کی پیداوار کے برابر معاوضہ ملا ہے۔

یہاں بھی امدادِ باہمی کی انجمنیں قائم کی گئی ہیں تاکہ کسانوں کو ٹریکٹر، ہل، بیج اور کھاد وغیرہ مل سکے۔

نئی اصلاحات کے قوانین کے ماتحت اگر کچھ انجمنِ امدادِ باہمی کے ممبر چاہیں تو حکومت سے کہہ سکتے ہیں کہ زمین بجائے فرداً فرداً دینے کے اس انجمن کو دے دی جائے۔

مشرقی جرمنی جنگ سے پہلے تین ہزار جنکر (JUNKER) یعنی بہت بڑے زمیں دار خاندانوں کے پاس اتنی ہی زمین تھی جتنی بیس لاکھ چھوٹے کسان خاندانوں کے پاس تھی۔

ہٹلر کے زمانے میں جو "زرعی اصلاحیں" ہوئی تھیں ان کے ماتحت چھوٹے کسانوں کے تیس لاکھ ایکڑ کھیت ان زمیں داروں کے قبضے میں آگئے تھے۔

جرمنی کا وہ علاقہ جو روس کے انتظام میں ہے، بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ پچاس لاکھ ایکڑ زمین ۴۵ء۷ بڑے زمینداروں سے چھین کر چھوٹے کسانوں اور بے زمین مزدوروں کے خاندانوں کو دے دی گئی ہیں۔

گرجاؤں، اسکولوں، اسپتالوں، امدادِ باہمی کی انجمنوں، میونسپلٹیوں اور سائنسی اداروں کی زمینیں چھوڑ دی گئی ہیں۔

زمین کا بٹوارہ چھوٹے کسانوں اور زرعی مزدوروں کے چنے ہوئے پانچ یا سات ممبروں کی زرعی اصلاح کی تحصیلی کمیٹیاں کرتی ہیں۔ اس طرح کمیٹیاں بنانے سے یہ فائدہ ہے کہ امیر کاشت کار اپنی معلومات اور تعلیم سے غلط فائدہ اٹھا کر غریب کسانوں اور مزدوروں کو دھوکا دے کر زمین پر قابض نہ ہو سکیں گے۔

زمین کی قیمت ایک سال کی رائی کی اوسط پیداوار کی سرکاری قیمت مقرر ہوئی ہے جو دس یا بیس سال کی قسطوں میں ادا کی جا سکتی ہے۔

چوں کہ بہت سے کھیتوں کے جانور اور مشینیں کم ہو گئی ہیں اس لیے کسانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ امدادِ باہمی کی انجمنیں بنائیں تاکہ ریاست کی دی ہوئی جدید ترین زرعی مشینوں کو مل جل کر استعمال کر سکیں۔ اس سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ امیر کاشت کار غریب کسانوں کی مشینوں، جانوروں اور دوسری چیزوں کی کمی کا فائدہ اٹھا کر ان کی زمین پر قبضہ نہ کر سکیں گے۔ امدادِ باہمی کی انجمنیں زرعی مشینیں اور اوزار کا قرضہ دے کر سود خواروں سے اپنے ممبروں کو بچا سکیں گی۔

چیکوسلاواکیا جنگ سے پہلے یہاں حالت یہ تھی کہ ملک کی دو فی صدی آبادی کے پاس ستر فی صدی آبادی سے زیادہ زمین تھی۔ جون ۱۹۴۵ء میں زرعی اصلاحیں شروع ہوئیں۔ تقریباً ۲۰ لاکھ ایکڑ زمین پر قبضہ کیا گیا جسے بے زمین مزدوروں اور غریب کسانوں میں بانٹ دیا گیا۔ ہر خاندان کو ۲۸ سے ۵ء۷ ۳ ایکڑ تک زمین دی گئی۔

ان زرعی اصلاحات کے کیا نتائج ہوں گے؟ کس حد تک زراعت کی ترقی ہوگی؟ کس حد تک کسانوں کی خوش حالی سے صنعتوں کی ترقی ہوگی اور یہ بنیادی طور پر زراعتی ممالک صنعتی ممالک ہو جائیں گے؟ ان سوالات کا جواب ابھی تفصیل سے نہیں نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان سے مشرقی یورپ کے ممالک اپنی معاشی زندگی کے نئے دور میں داخل ہوتے ہیں۔

نقل وحمل

ہندستان میں فضائی نقل وحمل

از : ———— ام۔ سی۔ شکلا۔ کمرشیل کالج دہلی

دُنیا کی معاشی ترقی اور تجارت اور کاروبار کا پھیلاؤ اسی وقت شروع ہوا جب مال اور مسافروں اور خطوط و پیغامات کی آمدو رفت کے سستے اور آسان ذریعے دریافت ہوئے۔ اگر نقل وحمل کے ذریعے ہمارے پاس نہ ہوں تو مشین کی مدد سے جو اتنے بڑے پیمانے پر چیزیں بنائی اور پیدا کی جارہی ہیں وہ سب بے کار جائیں اور صنعت اور تجارت بند کرنا پڑے۔ بڑے پیمانے پر چیزیں پیدا کرنے میں جو اتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے تو زیادہ تر اس وجہ سے نہیں کہ ہم بہت کم لاگت پر بہت زیادہ چیزیں پیدا کرسکتے ہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ ہم ان چیزوں کو سستے داموں پر اور آسانی کے ساتھ دنیا بھر کے گاہکوں تک، پہنچا سکتے ہیں۔ بڑی مقدار میں چیزیں بنانے سے آخر کیا فائدہ اگر ان کو ایسی جگہوں پر نہ پہنچایا جاسکا جہاں ان کی ضرورت ہے۔ کسی چیز کی افادیت اور اہمیت بہت حد تک اس بات پر منحصر ہے کہ وہ ہمارے پاس کس شکل میں پہنچی ہے، اور پھر اس کا انحصار وقت اور مقام پر بھی ہے۔ ایک چیز ایک خاص وقت یا ایک خاص مقام پر ہمارے لیے مفید ہے لیکن وہی چیز کسی دوسرے وقت یا کسی دوسرے مقام پر قطعاً غیر مفید ہوسکتی ہے، مثلاً اگر دہلی شہر میں آلو کافی مقدار میں موجود ہے تو یہاں مزید آلو بھیجنا مفید نہیں ہوگا۔ کسی شہر میں عید سے کچھ پہلے کپڑوں کی درآمد سخت ضروری ہے لیکن عید کے بعد کپڑے کی افادیت اور اہمیت کم ہوجائے گی۔ کسی چیز کو وقت پر اور صحیح مقام پر پہنچانا جہاں اس کی

ضرورت ہو ذرائع نقل وحمل ہی کا کام ہو۔ ایک چیز ہو جس کی افادیت الہ آباد میں کم ہو لیکن دہلی میں زیادہ ہو چنانچہ اُسے الہ آباد سے ہٹا کر دہلی لے آنا سستے اور آسان ذرائع نقل وحمل کے بغیر ناممکن ہو۔ اس طرح دُوری اور فاصلے کی وجہ سے اگر کسی چیز کی افادیت خطرے میں ہو تو اُسے ذرائع نقل وحمل کی مدد سے دُور کیا جاسکتا ہو۔

قدیم ترین زمانے میں تجارتی نقل وحمل خشکی اور دریا کے راستے سے ہوتی تھی۔ اور جدید ترین ذریعہ نقل وحمل اور ذریعہ رسل ورسائل ہوائی جہاز ہو۔ ۱۹۱۴ء-۱۸ء کی جنگِ عظیم میں ہوائی جہاز کے ذریعے نقل وحمل کی ابتدا ہوئی۔ اور ۱۹۳۹ء کی جنگ سے پہلے پہلے ہوائی جہاز نقل وحمل کا ایک اہم ذریعہ بن گیا۔ دُوسری عالم گیر جنگ سے پہلے "ایر شپ" کو تجارتی نقل وحمل کے کام میں لانے کی کوشش کی گئی، لیکن جنگ کے دوران میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ کئی انجنوں والی بڑی بڑی ہوائی مشینیں "ایرشپ" کے مقابلے میں زیادہ کارآمد اور مفید ہوتی ہیں۔ اس میں حفاظت زیادہ ہوتی ہو، مال واسباب زیادہ لادا جاسکتا ہو، اور رفتار بھی تیز ہوتی ہو، اور اس کے چلانے اُتارنے وغیرہ میں بھی زیادہ آسانیاں ہیں۔ غرض ہوائی نقل وحمل نے اب ایک مستقل حیثیت اختیار کرلی ہو، اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا اس کی اہمیت بھی بڑھتی جائے گی۔

ہوائی جہاز میں جگہ کم ہوتی ہو اور اس پر سامان بھی کم وزن کا لادا جاسکتا ہو۔ دُوسری سواریوں کے مقابلے میں اس کا کرایہ کافی زیادہ ہو۔ اگرچہ دُوسری سواریوں کے مقابلے میں ہوائی جہاز کو مسافت طے کرنے میں بہت کم اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ کچھ خاص قسم کے مال واسباب لانے اور لے جانے کا ہوائی جہاز بہت باکفایت ذریعہ ہو۔ ہوائی جہاز کے ذریعے مال کی آمد ورفت میں بڑی حفاظت بھی رہتی ہو۔ جہاز، سڑک یا ریل گاڑی سے اگر مال بھیجیے تو اسے لازمی طور پر متعدد ہاتھوں سے گزرنا پڑتا ہو۔ اس طرح مال کے غلط جگہ پڑجانے اور چوری جانے کا کافی خطرہ رہتا ہو۔ لیکن ہوائی جہاز کے ذریعے مال کو براہ راست منزلِ مقصود تک پہنچایا جاسکتا ہو، اور مال دورانِ مسافت میں زیادہ تر لوگوں کی دست رس سے باہر رہتا ہو۔ اس لحاظ سے ہوائی جہاز زیادہ قیمت کی چھوٹی چھوٹی اشیا کی نقل وحمل کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہو، جیسے سونا یا جواہرات وغیرہ ریل اور دوسرے ذریعوں سے اگر ان چیزوں کو بھیجا جائے اور بہت خاص قسم کی حفاظت سے کام نہ لیا جائے تو ان کے چوری جانے یا گم ہوجانے کا خطرہ رہتا ہو۔ ہوائی جہاز سے ان چیزوں کے بھیجنے میں کرائے کی زیادتی کا بھی احساس نہیں ہوتا۔

ہوائی جہاز رفتار کے لحاظ سے بھی تمام دوسرے ذرائع نقل وحمل سے بازی لے گیا ہو۔ ہوائی جہاز کے ساتھ نصرف یہ خوبی ہو کہ وہ جہاز، ریل گاڑی، لاری یا کشتی کے مقابلے میں بہت تیز ہوتا ہو اور یہ چیزیں کبھی بھی اتنی رفتار حاصل نہیں

کر سکتیں بلکہ اس میں ایک اور خوبی یہ ہوتی ہے کہ تاخیر کے درمیانی اسباب نہیں رہتے۔ یعنی ہوائی جہاز کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے کسی پیچ دار راستے سے جائے۔ ہوائی جہاز ناک کی سیدھ جہاں چاہے پہنچ سکتا ہے۔ پانی کے جہاز کی طرح اسے کسی سمندر کی تلاش نہیں ہوتی۔ پانی کے جہاز سے مال بھیجنے میں اس طرح بھی دیر ہوتی ہے کہ اسے جہاز سے اُتار کر خشکی پر لانا پڑتا ہے اور پھر خشکی کی سواریاں اسے دوسرے مقامات پر پہنچاتی ہیں۔ ہوائی جہاز کے ذریعے مال ایک مقام سے دوسرے مقام پر ناک کی سیدھ پہنچایا جا سکتا ہے۔ غرض جب مال کو ہمیں جلد از جلد کسی مقام پر پہنچانا ہو اور کرائے کا زیادہ ہونا غیر اہم معلوم ہو تو ایسے موقعوں پر ہوائی جہاز بہترین ذریعہ ہے۔ ہوائی جہاز میں یہ بھی آسانی ہے کہ ہوائی راستے بلا کسی دقت اور پیچیدگی کے فوراً بدلے جا سکتے ہیں اور ہوائی جہاز کی آمد و رفت پر کنٹرول رکھنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ ایک دقت البتہ ضرور ہے اور وہ یہ کہ ہوائی جہاز کو موسمی حالات کی پابندی کرنی پڑتی ہے اس لیے اس میں ریل وغیرہ کی طرح ہمیشہ وقت کی پابندی اور تسلسل نہیں قائم رکھا جا سکتا۔ بہرحال گزشتہ چند برسوں میں زمینی نظم و تنظیم کافی ترقی یافتہ ہوگئی ہے۔ اچھے ہوائی اسٹیشن تعمیر ہوگئے ہیں، ناگہانی موقعوں پر ہوائی جہاز کو اُتارنے کے لیے گراؤنڈ بن گئے ہیں، موسم سے متعلق اطلاعات ہر وقت اور ہر گھڑی مہیا ہوتی رہتی ہیں، وائرلس کے ذریعے ہدایت کاری کا کافی انتظام ہے، ریڈیو سے رسل و رسائل کا سلسلہ جاری رہتا ہے، راستے کا تعین آسان ہوگیا ہے اور ہوائی اسٹیشنوں پر روشنی وغیرہ کا کافی انتظام رہتا ہے۔

نقل و حمل کے دوسرے ذریعوں کی طرح ہوائی نقل و حمل کو بھی آمدنی کا ذریعہ بننا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہوائی راستے تجارتی اہمیت کے مقامات سے ہو کر گزریں۔ ہوائی راستہ جتنا مختصر ہوگا اتنی ہی ہوائی جہاز کی تیز رفتاری کی افادیت اور اہمیت کم ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ ہوائی نقل و حمل کے لیے ناموزوں ہے۔ لیکن امریکہ، سودیت یونین، ہندوستان اور چین جو وسیع و عریض خطوں میں پھیلے ہوئے ہیں ہوا بازی کے لیے بہت موزوں ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مال و اسباب کی آمد و رفت کا جہاں تک تعلق ہے ہوائی جہاز دوسرے ذرائع نقل و حمل کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ابھی کچھ دنوں تک ہوائی جہاز زیادہ تر ڈاک لانے اور لے جانے کے کام آتا رہے گا یا مسافر اس کے ذریعے سفر کریں گے اور زیادہ قیمت والی چھوٹی اشیا کی آمد و رفت ہو سکے گی۔ ڈاک لانے اور لے جانے کے لحاظ سے ہوائی جہاز یقیناً دوسرے تمام ذرائع نقل و حمل کے مقابلے میں سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوگا، اس طرح ریڈیو اور کیبل سے بھی اس کا مقابلہ ہوگا۔ پرائیویٹ مسافر بھی بہت زیادہ ہوائی جہاز کا استعمال کرنے لگیں گے۔ آرام اور آسائش کے ساتھ سفر کرنے کے دل دادہ مسافر سپر لائنر کو چھوڑ کر تیز رفتار ہوائی جہاز کی طرف متوجہ ہوں گے۔ چوں کہ سپر لائنر سرکاری مالی امداد کے بغیر استعمال نہیں کیے جا سکتے اور

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی اہمیت بھی دیرپا نہیں ہے اس لیے بہت ممکن ہے کہ جہازراں کمپنیاں ہوائی جہاز بھی چلانا شروع کر دیں۔

چوں کہ ہوائی جہاز کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے اس لیے وہ بین اقوامی سفر کے لیے بہت موزوں ہے، لیکن موجودہ بین اقوامی قوانین کے تحت ہوائی سفر اور ہوائی نقل وحمل کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جنگ سے پہلے یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ ہر ریاست کو اپنے علاقے کی بالائی فضاؤں پر پورا پورا اختیار و اقتدار حاصل ہے۔ اس سلسلے میں دنیا کی مختلف حکومتوں کے درمیان دو راضی نامے بھی ہوئے تھے۔ ایک تو انٹرنیشنل کنونشن آف پیرس (۱۹۱۹ء) اور دوسرا انٹرنیشنل کنونشن آف ہوانا (۱۹۲۸ء) دنیا کی زیادہ تر ریاستوں نے ان راضی ناموں پر اپنے دستخط ثبت کیے جن میں سے ایک ہندستان بھی تھا۔ ان راضی ناموں کی رو سے ہر دستخط کرنے والی ریاست نے دوسری دستخط کرنے والی ریاستوں کے ہوائی جہازوں کو اپنے فضائی علاقے میں کچھ عام مراعات دینا منظور کیا۔ ان ریاستوں نے یہ بھی منظور کیا کہ ہوائی جہازوں اور ہوابازوں کو لائسنس دینے کے معاملے میں اور ہوائی نقل وحمل کے سلسلے میں کچھ ایسے عام قاعدے اور معیار تسلیم کیے جائیں جن کی پابندی تمام ریاستوں کے لیے یکساں ہوں۔ لیکن ان راضی ناموں کے ذریعے باقاعدہ یہ حق نہیں قائم ہوا کہ بین اقوامی فضائی نقل وحمل کے راستے دوسری ریاستوں کے فضائی علاقے سے گزارے جا سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تھا تو دو ریاستوں کے آپس کے معاہدوں کے ذریعے۔ بعد از جنگ کے زمانے میں بین اقوامی ہوائی نقل وحمل کو جاری کرنے کے لیے کیا کیا جائے اس پر دنیا کی مختلف قوموں کے درمیان آپس میں بحث ومباحثہ ہوا۔ ۱۹۴۴ء کے نومبر اور دسمبر میں شکاگو میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دنیا کی ۵۴ قوموں نے شرکت کی اور ایک راضی نامے کی رو سے ان ریاستوں نے یہ منظور کیا کہ ہر ریاست کا ہوائی جہاز دوسری ریاست کے فضائی علاقے سے گزر سکتا ہے، اور ہر ریاست کے ہوائی جہاز کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ دوسری ریاست کے فضائی علاقے سے گزر رہا ہے اور اُسے پٹرول لینے یا مشین درست کرنے کی ضرورت ہے تو وہ زمین پر اُتر سکتا ہے۔ تسلیم کیا گیا کہ ملک کا اندرونی ہوائی نقل وحمل پورے طور پر اُسی ملک کا ہوگا، اور ہر ملک کی اندرونی فضائی نقل وحمل (جسے انگریزی میں کابوٹیج (CABOTAGE) کہتے ہیں) اس ملک کی اپنی قومی ضروریات کے لیے مخصوص ہوگی۔ یہ راضی نامہ ہوابازی اور ہوائی جہاز کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا میں پہلی بار ہر تجارتی ہوائی جہاز کو یہ آزادی حاصل ہوئی ہے کہ وہ تجارت اور کاروبار کے سلسلے میں جہاں چاہے جا سکتا ہے۔

ہندستان ہوائی نقل وحمل کی توسیع وترقی کے لیے بے حد موزوں ہے۔ بین اقوامی دنیا میں ہندستان کی حیثیت

سب [illegible] اور عجیب واقع ہوئی ہے۔ ہندستان کا محلِ وقوع کچھ ایسا ہے کہ دُنیا کے بہت سے ہوائی راستوں کو یہاں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ ہندستان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اِن ہوائی جہاز کی ضروریات کو پُورا کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور اُن ہوائی راستوں کے ذریعے جو نقل وحمل اور آمد ورفت ہوتی ہے اُس میں خود بھی حصّہ لے۔ بین اقوامی ہوائی راستوں کی گزرگاہ ہونے کے علاوہ ہندستان اتنا وسیع وعریض مُلک ہے کہ خود مُلک کے اندر ہوائی نقل وحمل کی توسیع وترقی کی بڑی گنجائش ہے۔ یہاں کے تجارتی مرکز ایک دُوسرے سے اس قدر دُور واقع ہوئے ہیں کہ ہوائی نقل وحمل کا ذریعہ اگر اختیار کیا جائے تو وقت کی بڑی بچت ہو سکتی ہے۔ یہ بات شاید تعجب انگیز معلوم ہو کہ دنیا میں سب سے پہلی سرکاری ہوائی ڈاک ۱۹۱۱ء کی الہ آباد کی نمائش کے سلسلے میں ہندستان ہی میں لے جائی گئی تھی۔ پہلی عالمگیر جنگ میں پہلی بار یہ بات ظاہر ہوئی کہ ہوائی جہاز کے ذریعے مغرب کو مشرقِ بعید سے ملانے کے لیے جو ہوائی راستے بنیں گے وہ ہندُستان سے ہو کر گزریں گے۔ اس طرح بین اقوامی فضائی نقل وحمل کے سلسلے میں ہندُستان کی اہمیت بالکل واضح ہو گئی ہے۔ ۱۹۱۹ء کے پیرس کنونشن کی رُو سے حکومتِ ہند نے بین اقوامی نقل وحمل کے لیے زمینی نظم وانتظام اور موسمی اطلاعات ومعلومات مہیّا کرنے کی ذمّے داری قبول کی۔ ۱۹۲۶ء میں ہندُستانی ایر بورڈ نے حکومتِ ہند کو مشورہ دیا کہ ہندُستان میں ہوائی جہاز کے اُترنے کے لیے خود اپنے اخراجات سے گراؤنڈ بنوائے اور وائرلس اور موسمی اطلاعات ومعلومات سے متعلق آسانیاں مہیّا کرے۔ بورڈ نے یہ بھی رائے دی کہ شروع میں چند سال تک مُلک کی اندرونی ہوائی نقل وحمل کو مالی امداد مہیّا کرے حکومتِ ہند نے ان مشوروں کو قبول کیا اور آگے چل کر اسی کے مطابق اپنا فضائی منصوبہ بنایا۔ دُوسری جنگِ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے ہندُستان کی اندرونی ہوائی سروسیں اور یہاں سے ہو کر گزرنے والی سروسیں مندرجہ ذیل تھیں۔

(۱) مُلکی سروس:۔

ٹاٹا اینڈ سنز لمیٹڈ۔ (ا) کراچی — احمد آباد — بمبئی — حیدر آباد — مدراس — ترچناپلی — کولمبو — [ہفتے میں پانچ بار]

(ب) دہلی — گوالیار — بھوپال — اندور — بمبئی — ہفتے میں ایک بار۔

(ج) بمبئی — گوا — کنانور — ٹرِیوِنڈرم — ترچناپالی — ہفتے میں ایک بار

انڈین نیشنل ایرویز لمیٹڈ۔ (ا) کراچی — جیکب آباد — ملتان — لاہور — ہفتے میں پانچ بار

(ب) دہلی — لاہور — ہفتے میں دو بار

ایر سروس آف انڈیا — بمبئی — بھاؤنگر — راج کوٹ — جام نگر — پوربندر — ہفتے میں پانچ بار

(۲) بی۔او۔اے۔سی (حدودِ سلطنتِ برطانیہ کی ہوائی سروس)

زمینی ہوائی سروس (LAND PLANES SERVICE) لنڈن — کیویو — کراچی — جودھپور — کان پور — الہ آباد — کلکتہ — ہفتے میں دو بار

فلائنگ بورڈ سروسیں:- لنڈن — کراچی — اودے پور — گوالیار — الہ آباد — کلکتہ — رنگون — آسٹریلیا — ہفتے میں دو بار

(۳) غیر ملکی ہوائی سروس

ہالینڈ — کراچی — جودھپور — الہ آباد — رنگون — بٹاویا — ہفتے میں دو بار

فرانس — پیرس — کراچی — جودھپور — الہ آباد — کلکتہ — رنگون — سی گاؤ — ہفتے میں دو بار

جرمنی — برلن — کراچی — کلکتہ — رنگون — ٹوکیو — ہفتے میں ایک بار

جب سنہ ۱۹۳۹ء کے ستمبر میں جنگ کا اعلان ہوا تو ہوائی سروسوں میں بہت کمی کردی گئی، ہوائی ڈاک کی مجوزہ اسکیم کو بھی ترک کردیا گیا اور لوگوں کو ہوائی جہاز سے ڈاک بھیجنے سے روکنے کے لیے بہت زیادہ سرچارج لگا دیا گیا۔ ملک کی جو اندرونی ہوائی سروسیں تھیں ان کو جنگ کی ضرورتوں کے مطابق بنانے کی کوشش کی گئی۔ بعد از جنگ کی سول ہوابازی کے سلسلے میں حکومتِ ہند نے جو تجویزیں حال ہی میں بنائی ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ ہندستان کی "سماجی، تجارتی اور صنعتی ترقی کے لیے" ہوائی سروسوں کی ایک ایسی سسٹم تعمیر کی جائے جو موجودہ زمانے کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔ یہ سسٹم ملک کے خاص خاص تجارتی اور سرکاری مرکزوں کو ملائے گی اور پھر پورے ہندستان کو خاص خاص ہم سائے ملکوں سے باضبط کرے گی۔ ہندستان کی اندرونِ ملک کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کئی دوسری ہوائی سروسیں بھی کھولی جائیں گی۔ ان کے کھولنے میں مقامی لوگوں اور غیر سرکاری افراد کا ہاتھ ہوگا۔ لیکن یہ امید کی جاتی ہے کہ آگے چل کر وہ سروسیں بھی قومی حیثیت اختیار کرلیں گی۔ حکومتِ ہند کی پالیسی یہ ہے کہ ہندستان میں سول ہوابازی کو فروغ دینے کے لیے ہندستان ہی کا سرمایہ لگایا جائے اور اس کے منتظمین بھی ہندستانی ہی ہوں۔ حکومتِ ہند ہندستانیوں کو اس مخصوص لائن میں ٹریننگ

دینا چاہتی ہے اور ان کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت جو سروسیں جاری ہیں وہ بحال رکھی جائیں گی۔ اس لیے کہ حکومت پورے ہندستان کی ہوائی سروس کا کسی ایک کمپنی یا جماعت کو اجارہ دینا نہیں چاہتی۔ حکومتِ ہند کی پالیسی یہ ہے کہ پرائیویٹ افراد کی بنائی ہوئی بڑی بڑی فضائی سروسیں کام کریں لیکن ان پر لائسنسنگ بورڈ کے بنائے ہوئے قاعدوں کے ذریعے حکومت کی نگرانی قائم رہے۔ حکومت ہند کا یہ بھی خیال ہے کہ تمام ہوائی سروسیں پانچ سال کے بعد منافع کمانے لگیں گی۔ چناں چہ حکومت صرف اسی درمیانی عرصے تک کے لیے پرائیویٹ ہوائی سروسوں کو مالی امداد دینا چاہتی ہے۔ اس لیے کہ اس وقت انھیں نقصان اُٹھانا پڑ رہا ہے۔

حکومت نے ہندستان اور اس کے اردگرد کے ملکوں کے لیے مندرجہ ذیل ہوائی سروس کا پلان بنایا ہے۔

(۱) بین اقوامی ہوائی سروس (برطانوی دولت مشترکہ اور غیر ملکی)

(الف) یورپ اور افریقہ —— کراچی —— کلکتہ —— آسٹریلیا اور چین

(ب) یورپ اور افریقہ —— کراچی —— بمبئی —— کولمبو —— ملایا —— آسٹریلیا

(۲) ہندستانی ٹرنک ہوائی سروسیں —— (کم سے کم ایک بار واپسی سروس روزانہ کا انتظام کیا گیا ہے)

راستے:۔ (۱) کراچی —— بمبئی —— مدراس —— کولمبو۔ (۲) کلکتہ —— الہ آباد —— کان پور —— دہلی —— لاہور پشاور —— کابل۔ (۳) دہلی —— ناگ پور —— حیدرآباد —— مدراس۔ (۴) کلکتہ —— کٹک —— وزی گاپٹم —— مدراس —— کولمبو۔ (۵) بمبئی —— ناگ پور —— کلکتہ۔ (۶) کراچی —— جودھ پور —— دہلی۔ (۷) بمبئی —— احمد آباد —— دہلی۔ (۸) بمبئی —— اندور —— بھوپال —— کان پور —— لکھنؤ۔ (۹) کلکتہ —— اکیاب —— نیانگ یانگ —— رنگون

(۳) —— ٹرنک ہوائی سروسوں کو ایک دُوسرے سے مِلانے کے لیے مندرجہ ذیل ہوائی سروسیں جاری کی جائیں گی:۔

(۱۰) کراچی —— کوئٹہ —— لاہور۔ (۱۱) مدراس —— بنگلور —— کوچین —— ٹری ونڈرم

ان کے علاوہ مقامی ہوائی سروسیں کھولی جائیں گی:۔

(۱) احمد آباد اور بمبئی (کاٹھیاوار کی ریاستیں۔ (۲) حیدرآباد —— بمبئی۔ (۳) حیدرآباد و بنگلور (۴) لاہور —— سری نگر

اوپر جو پلان پیش کیا گیا ہے وہ ہمارے سامنے محض ایک بنیادی ڈھانچہ پیش کرتا ہے سرکاری خرچ پر مزید توسیع و ترقی کی کمی شدید ہے۔ جتنی مقامی ہوائی سروسیں ہیں وہ مقامی اور غیر سرکاری افراد کے ہاتھوں میں چھوڑ دی جائیں گی اور گراونڈ کی تعمیر اور تنظیم

میں حکومت ان کی مدد کرے گی :۔ (۲) اور (۳) کی ہوائی سروسیں ۱۱۰۲۲ میلوں کو گھیرتی ہیں۔ ۴ ایک واپسی سروس روزانہ کے حساب سے سال بھر میں ۱۷۰۰۰۰۰۰ ٹن میل طے کیے جاسکیں گے۔ تجویز یہ ہے کہ ۳۹ ڈوگلا ڈی سی ۳ ہوائی جہازوں کا ایک بیڑا رکھا جائے۔ ہر ہوائی جہاز میں ۱۲ مسافر آسکیں گے یا ۱/۲ ٹن کا بوجھ لادا جاسکے گا۔ ہر ہوائی جہاز اوسطاً سال بھر میں ۱۷۰۰ گھنٹے اڑے گا۔ اس بیڑے کو قائم کرنے کے لیے جو سرمایہ لگایا جائے گا اس کا اندازہ ۱۵۰۰۰۰۰۰ روپیہ ہے۔ کوئی ۷۰ کرو کی ضرورت پیش آئے گی اور ہر کرو میں ایک ہوائی کمانڈر ایک سیکنڈ پائلٹ ایک ریڈیو آپریٹر اور اسٹی واڈ کی ضرورت ہوگی۔ ان کے علاوہ ۵۰۰ انجینیروں کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس سروس کو چلانے میں اندازاً ۲۷۹۰۰۰۰۰ روپوں کا سرمایہ درکار ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ پانچویں سال میں اس خرچ میں ۱۱۰۰۰۰۰ روپے کی کمی ہوجائے گی۔ شروع سال میں مجموعی ٹرافک کی آمدنی ۱۲۵۰۰۰۰۰ روپے ہوگی اور پانچویں سال میں یہ رقم بڑھ کر ۲۴۰۰۰۰۰۰ روپے تک پہنچ جائے گی۔ اس تخمینے کی بنیاد پر ۱۴۴۰۰۰۰۰ روپے حکومت کو پہلے سال میں خرچ کرنے پڑیں گے جو پانچویں سال گھٹ کر ۱۸۰۰۰۰۰ روپے ہوجائیں گے۔ اس بات کے پیش نظر کہ ہوائی سروس کی توسیع سے ملک کو بہت فائدہ پہنچنے والا ہے اتنے زیادہ اخراجات برداشت کرنا غلط نہیں ہے۔ حکومت پٹرول پر بھی ٹکس لگاکر ۳۵۰۰۰۰۰ روپے وصول کرے گی۔ ٹکس کی شرح ۱۵ آنے فی گیلن ہوگی یا اگر ۱۰ آنے فی گیلن ہوگی تو حکومت کو ۲۲۳۰۰۰۰۰ روپے مل جائیں گے۔

ہندستان میں ہوائی توسیع و ترقی کا انحصار بہت حد تک اس بات پر بھی ہے کہ یہاں بالکل نئے طرز کی ہوائی جہاز سازی کی صنعت قائم کی جائے۔ محض ہوائی جہاز کی مرمت کا کام سیکھ لینا کافی نہیں ہوگا، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندستان میں باقاعدہ ہوائی جہاز کی مشینیں بنانے کی صنعت کھولی جائے۔ حال ہی میں ایک ہوائی مشن آئی ہے جو یہاں ہوائی جہاز سازی کا کارخانہ کھولنے کے امکانات پر غور و خوض کرے گی۔

معاشی صورت حال

۱۔ تاوانِ جنگ
۲۔ مصنوعی ربڑ
۳۔ اشیائے اصل
۴۔ ہندستان اور ایران
۵۔ رُپے کی قیمت
۶۔ غذائی صورتِ حال
۷۔ ہندستان اور سیام
۸۔ مشرقِ وسطیٰ سے تجارت
۹۔ سود خواری

جاپان سے تاوانِ جنگ کی وصولی

خیال کیا جاتا ہے کہ جاپان سے تاوانِ جنگ کے سلسلے میں اتحادی اقوام کو مندرجہ ذیل صنعتی سامان دست یاب ہوں گے۔ مشینوں کے اوزار جہاز سازی کے کارخانے، فولادی اوزار اور سامان، کوئلے سے چلنے والے بجلی کے پلینٹ، میگنیشیم پلینٹ اور کچھ دیگر کیمیائی پلینٹ۔ اس سے پہلے گزشتہ جنوری میں جاپان کے ۳۹۰ ہوائی جہاز سازی کے کارخانے اسلحہ خانے اور فنی تجربہ گاہیں اتحادیوں نے ضبط کرلی تھیں۔ عارضی مشورہ اتحادیوں کو یہ دیا گیا ہو کہ جاپان سے اہم صنعتی اشیا ہٹالی جائیں اور جاپان کی مشینی اوزار پیدا کرنے کی آدھی قوت چھین لی جائے۔ ۲۰ جہاز سازی کے کارخانوں کے سامان ہٹا لیے جائیں۔ کوئلہ جلانے والے آدھے بجلی کے پلینٹ، ۲۰ کاسٹک سوڈا کے کارخانے، المونیم اور میگنیشیم پیدا کرنے کے تمام سامان اور کارخانے چھین لیے جائیں۔ ان سامانوں کی ایک فہرست امریکی نگرانی میں تیار کی جائے گی اور اُسے واشنگٹن "مشرق بعید کی کمیشن" کے پاس بھیجا جائے گا۔ جو قومیں جاپان سے تاوانِ جنگ کا مطالبہ کریں گی اُن کو اس فہرست سے مدد ملے گی۔

یہ ظاہر ہی کہ اتنے صنعتی سامان کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد جاپان کی صنعتی قوت پیدائش بہت گھٹ جائے گی۔

قدرتی ربڑ اور مصنوعی ربڑ

'معاشیات' کی جولائی کی اشاعت میں ربڑ کی پیداوار پر ایک تفصیلی مضمون شائع ہو چکا ہی جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ کس طرح دورانِ جنگ میں قدرتی ربڑ کے نہ ملنے کی وجہ سے کیمیائی ربڑ کی صنعت میں بہت اضافہ ہوا ہی۔ کیمیائی ربڑ زیادہ تر امریکہ میں پیدا کیا گیا ہی۔ ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیانی عرصے میں امریکہ میں کیمیائی ربڑ کی پیدائش بہت بڑھ گئی ہی۔ بعض ماہرین نے اندازہ لگایا ہی کہ امریکہ میں صنعتی ضروریات کے لیے ربڑ کی جتنی مانگ ہی اس کا صرف ۱/۳ حصہ قدرتی ربڑ پورا کرتا ہی اور بقیہ ضرورتیں کیمیائی یعنی مصنوعی ربڑ سے پوری کی جاتی ہیں۔

اب تک کیمیائی ربڑ کی پیداوار نے قدرتی ربڑ کی قیمت پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہی۔ اس کی وجہ یہ ہی کہ جنگ کے زمانے میں ربڑ کی جتنی مانگ تھی وہ اب پوری ہو رہی ہی۔ اُس مضمون میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ یہ چیز عارضی ہی اور بہت جلد وہ وقت آئے گا جب جنگ کی پیدا کردہ صورتِ حال ختم ہو جائے گی اور قدرتی ربڑ کی قیمت مصنوعی اور کیمیائی ربڑ کی موجودگی سے متاثر ہونے لگے گی۔ اب معاصر "انڈین فنانس" سے یہ معلوم ہوا ہی کہ یوکرین میں ربڑ پیدا کرنے کے تجربے ہو رہے ہیں۔ اس سے امید ہے کہ سوویت یونین میں قدرتی ربڑ کی کاشت میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوگا۔ زراعتی سائنس دانوں نے بتایا ہی کہ وہاں جو نیا پلینٹ چالو ہوا ہی اُس سے فی ایکڑ اتنا ہی ربڑ پیدا ہوگا جتنا استوائی علاقے (مثلاً ملایا وغیرہ) کے ربڑ کے درخت پیدا کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہی کہ آگے چل کر اُس سے بھی زیادہ پیدا ہونے لگے گا۔ جنگ کے زمانے میں اُسی پلینٹ سے روس کی ربڑ کی ضرورتیں پوری ہوئیں۔ چناں چہ چوتھے پنج سالہ معاشی منصوبے میں اُسے بڑی اہمیت دی گئی ہی۔ اب تک روس میں جتنا ربڑ پیدا ہو تا رہا ہو اُس کا دُنیا کے ربڑ کی قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ لیکن اگر وہاں کے نئے پلینٹ نے وہ تمام امیدیں پوری کر دیں جو اس سے وابستہ کی جا رہی ہیں تو روس کا یقیناً دنیا کے بڑے بڑے ربڑ پیدا کرنے والے ملکوں میں شمار ہونے لگے گا۔

اشیائے اصل اور سوئزرلینڈ

سر راماسوامی مودالیر نے حال ہی میں اپنے دورانِ سیاحت میں سوئزرلینڈ کے متعلق ایک بڑی اہم بات معلوم کی ہو اور وہ یہ ہی کہ سوئزرلینڈ آج اس قابل ہی کہ ہندستان کو اشیائے اصل[1] بھیج سکے۔ برطانیہ اور بلجیم کے بعد سوئزرلینڈ ہی کو صنعتی لحاظ سے یورپ کا سب سے ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہی۔ دوسری عالم گیر جنگ میں چوں کہ وہ شریک نہیں تھا اس لیے اس کی قوتِ پیدائش اور صنعتی سامان تباہیوں سے محفوظ رہے۔ پتا نہیں جنگ کے دوران میں سوئزرلینڈ میں نئی صنعتیں قائم ہو سکی ہیں یا نہیں، لیکن

---

[1] یعنی مشینیں، کلیں وغیرہ

بہرحال جنگ سے پہلے کے متعلق ہمیں اچھی طرح معلوم ہو کہ وہاں سے اشیائے اصل کی برآمد نہیں ہوتی تھی۔ سر راما سوامی مودالیر نے جو اطلاع دی ہو اس میں یہ نہیں بتایا ہو کہ کس قسم کی مشینیں وہاں سے مل سکتی ہیں اور کتنی تعداد میں۔ ضرورت ہو کہ ان باتوں کی تحقیقات کی جائے۔ سر مودالیر کے اس انکشاف سے یہ محسوس ہوتا ہو کہ ہندستان، برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ بہت سے اور ملکوں سے بھی اشیائے اصل منگا سکتا ہو۔ سوئڈن اور بلجیم سے بھی کافی مدد مل سکتی ہو۔

ہندستان اور ایران کی تجارت

دوسری عالم گیر جنگ میں جاپان کے شریک ہونے کے بعد سے ہندستان اور ایران کی تجارت کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہو۔ برما سے تیل کی آمد بند ہوگئی تو کراسن تیل اور پٹرول ایران ہی سے آنے لگا جس کے نتیجے کے طور پر ہندستان اور ایران کے تجارتی تعلقات پہلے کی بہ نسبت زیادہ وسیع اور مضبوط ہوگئے۔ ۲۲ر دسمبر سنہ ۱۹۴۵ء سے لے کر ۳۰ر جنوری سنہ ۱۹۴۶ء تک ہندستان ور ایران کے درمیان جن چیزوں کی تجارت ہوئی ہو اُن پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ایران نے جس قدر مچھلی اور ہمپ تیل باہر سے منگوایا ہو وہ سب ہندستان سے۔ چائے، خشک اور تازہ پھل، مسالے، تیل کے بیج، صنعتی اور طبّی اہمیت کے بیج اور گھاس، دانے دار شکر اور گندھی ہوئی شکر، بکرے اور بھیڑ کی کھال، سوتی کپڑے، سوت اور سلے ہوئے کپڑے اور لباس، شیشے کی بنی ہوئی چیزیں، دھات کی بنی ہوئی چیزیں، وغیرہ ہندستان سے بڑی مقدار میں ایران کو گئی ہیں۔ گوند اور دیگر پودوں کے رب اور عرق، سیمنٹ، عطریات، کیمیائی رال، ٹائر، روئی، پتھر اور دیگر معدنیات کی بنی ہوئی چیزیں، لوہے اور اسٹیل کے اوزار، بجلی کی مشینیں، اور ان کے حصّے یہ چیزیں بھی ہندستان نے کافی مقدار میں ایران کو بھیجی ہیں۔ پستہ، زعفران، سُرخ گلاب، صنعتی اور کیمیائی اہمیت کے بیج اور گھاس، ہینگ اور جنگلی بادام کا گوند، سب سے زیادہ مقدار میں ایران سے ہندستان ہی کو آیا ہو۔ بادام، زیرے کے بیج، کچا چمڑا، گوند، اون اور قالین وغیرہ بھی ہندستان نے ایران سے کافی منگائے ہیں۔

رُپے کی قیمت گھٹادی جائے

قومی منصوبے بندی کمیٹی کی ذیلی مجلس نے ہندستان کی غیر ملکی تجارت پر جو رپوٹ پیش کی ہو اُس میں یہ رائے دی ہو کہ رُپے کی قیمت گھٹادی جائے۔ کمیٹی کا خیال ہو کہ ہندستان کی معیشت کا دوسرے مُلکوں کی معیشت سے جو مقابلہ ہوگا اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہو کہ رُپے کی قیمت کچھ گھٹادی جائے۔ اگر شرحِ مبادلہ غیر معمولی طور پر زیادہ رہی تو ڈر ہو کہ ہندستان کے اسٹرلنگ تمسکات اونے پونے نہ خرچ ہوجائیں جیسا کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہوا تھا۔ اس سے

ہندستان کی تجارت اور صنعت پر تفریطِ زر کے خراب اثرات پڑیں گے۔

غذائی صورتِ حال ہندستان اور مشرقِ بعید کے ملکوں میں دُوسری فصل کی کٹائی سے پہلے کا مختصر سا عرصہ یوں بھی بہت نازک ہوتا ہے، اور موجودہ مُلکی اور بین اقوامی غذائی کمی کے ہوتے ہوئے تو اور بھی ایسا ہی۔ بہرحال اِس وقت غذائی کمی کو پُورا کرنے کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں، اُن سے امید ہے کہ یہ مشکل زمانہ بخیر و خوبی گزر جائے گا۔ گزشتہ ماہ میں انڈونیشیا سے چاول حاصل کرنے کی جو کوشش کی گئی وہ اس سلسلے میں خاص طور پر اہم ہے۔ غالباً جولائی کے اخیر ہفتے میں ڈاکٹر شہریار نے ظاہر کیا کہ انڈونیشیا کپڑے کے عوض ہندستان کو چاول دے سکتا ہے۔ پھر اس کے بعد ڈاکٹر شہریار کے اغوا کر لیے جانے کی خبر آئی، جس سے امید کچھ کم ہوگئی۔ لیکن حکومتِ ہند کے نمایندے مسٹر پنجابی کے جاوا پہنچنے پر ڈاکٹر شہریار چھوڑ دیے گئے۔ گفت و شنید کے بعد ڈاکٹر شہریار اور مسٹر پنجابی کے درمیان ایک راضی نامہ ہوا۔ جس کی رُو سے انڈونیشیا نے ہندستان کو ۰۰،۷ ٹن دھان دینا منظور کیا۔ قیمت ۔ اُڑیڈ ۴ پائی فی ۲۷۰ پونڈ مقرر کی گئی۔ ہندستان نے اس چاول کے عوض میں انڈونیشیا کو سوت، زرعی آلے اور اوزار، موٹر ٹائر، ٹیوب، اور برتن وغیرہ بھیجنا منظور کیا۔ اُس کے بعد ہی یہ اطلاع موصول ہوئی کہ جاوا سے چاول سے لدا ہوا پہلا جہاز ہندستان پہنچ چکا ہے۔

لیکن اِس خبر نے ملک میں کافی مایوسی پھیلادی کہ ولندیزی حکومت نے اِس راضی نامے کی اشاعت کو قبل از وقت قرار دیا ہے۔ اور یہ احساس ہونے لگا کہ شاید انڈونیشیا سے چاول آنے میں بہت دیر لگے۔ اس کے بعد مسٹر پنجابی کو ہٹا کر ان کی جگہ پر ایک فوجی افسر مقرر کیا گیا اور اُسے اختیار دیا گیا کہ گفت و شنید کو جلد سے جلد مکمل کر کے چاول ہندستان بھجوانے کی کوشش کرے۔

بنکاک میں بھی ایک چاول کمیٹی کا قیام عمل میں آیا ہے جس کے ذمّے یہ کام ہے کہ سیام سے چاول جہاز پر لدوا کر جلد از جلد ملایا کو روانہ کرے۔

مُلک کی مجموعی غذائی صورتِ حال کے سنبھل جانے کی اس لیے بھی امید پیدا ہو چلی ہے کہ پنجاب اور سندھ نے مرکزی حکومت کو ۰۰۰،۱۵ ٹن گیہوں قرض کے طور پر دینا منظور کیا ہے۔ گزشتہ ماہ اگست میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ۰۰۰،۸ ٹن غلّہ ہندستان بھیجنے کا اعلان کیا۔ بین اقوامی عارضی غذائی کونسل (International Emergency food council.) نے جون ۱۹۴۶ء سے لے کر دسمبر ۱۹۴۶ء تک کے لیے ۰۰۰،۲۷ ٹن چاول ہندستان بھیجنے کا مشورہ دیا۔ یہ خبر جو برما کی مجلس قانون ساز کے ایک ممبر نے دی کافی تشویش ناک

تھی کہ برما کے جنوبی ضلعوں میں آسام کے سرحدی علاقوں سے غیر قانونی طور پر کافی بڑی مقدار میں چاول جا رہا ہو۔ چناں چہ حکومت آسام نے صوبے سے باہر غلے کی برآمد کو روکنے کے لیے احکام جاری کیے۔

متحدہ اقوام کی غذائی اور زرعی تنظیم کی دوسری نشست جو کوپن ہیگن میں منعقد ہوگی اس میں شرکت کے لیے ہندستان کا غذائی وفد روانہ کیا جائے گا۔ جس کی سرداری سر جے۔ پی سری واستو کریں گے۔

دنیا بھر کی غذائی پیداوار کے متعلق برطانیہ کی غذائی وزارت نے ایک قرطاس ابیض شائع کیا ہو جس سے پتا چلتا ہو کہ صورت حال کچھ اطمینان بخش نہیں ہو۔ صدر ٹرومین کے قحط عارضی کمیٹی کے صدر مسٹر چسٹر سی ڈیوس کے اندازے سے بھی پتا چلتا ہو کہ ۱۹۴۷ء کی عالم گیر غذائی صورت حال کو سنبھالنے کے لیے امریکہ میں جو اس وقت کارروائیاں کی جا رہی ہیں انھیں جاری رکھنا پڑے گا اور غذا کے ذخیرے کو حفاظت سے رکھنے کے طریقے آیندہ سال بھی کام میں لانے پڑیں گے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شعبۂ زراعت نے وہاں کی فصل کے بارے میں کچھ اندازے لگائے ہیں جن سے پتا چلتا ہو کہ ۱۹۴۶ء میں امریکہ میں کل ملا کر ایک ارب دو ہزار بوشل گیہوں اور تین ارب تیس کروڑ بوشل مکئی پیدا ہوگی۔ گیہوں کی جو مقدار بتائی گئی ہو وہ پہلی جون ۱۹۴۶ء کے تخمینے سے ...... ۵ ۷ بوشل زیادہ ہو۔ جہاں تک مکئی کا تعلق ہو اس کی پیداوار بھی زیادہ ہی رہے گی۔ گزشتہ سال تین ارب ایک کروڑ چوراسی لاکھ دس ہزار بوشل مکئی پیدا ہوئی تھی۔ اس طرح اس سال مکئی کی پیداوار زیادہ ہوگی۔ ۱۹۴۲ء کو چھوڑ کر اگر دیکھا جائے تو ان اندازوں کے مطابق اس سال امریکہ میں گزشتہ سات سال کے اندر سب سے زیادہ مقدار میں غلہ پیدا ہوگا۔

کنیڈا میں غلے کی پیداوار بھی اچھی معلوم ہوتی ہو۔ اس بات کا اندازہ اس سے ہوتا ہو کہ جہاں برطانیہ میں گزشتہ چند ماہ میں غذا کی خوراک میں کمی کرنے کی کوشش کی گئی ہو، وہاں کنیڈا میں پہلے سے جو تھوڑی بہت پابندیاں موجود تھیں وہ بھی اٹھا دی گئی ہیں۔ کنیڈا میں حال ہی میں ایک سرکاری حکم کو اٹھا دینے کا اعلان کیا گیا ہو جو پہلے سے نافذ تھا۔ اس منسوخ شدہ حکم کی رو سے ملکی خرچ کے لیے گیہوں کی جو مقدار مقرر تھی اس میں دس فی صدی کی کمی کر دی گئی تھی، اس کے باوجود کنیڈا نے دنیا کے قلت زدہ ملکوں کو پہلے سے بھی زیادہ غلہ دینے کا وعدہ کیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہو کہ وہاں فصل کی حالت بہت اچھی ہو۔

ہندستان اور سیام کے درمیان قرضے کا معاہدہ

چوتھی ستمبر ۱۹۴۶ء کو ہندستان اور سیام کے سرکاری نمایندوں نے ایک قرضے کے معاہدے پر دستخط کیے جس سے متعلق خاص خاص باتیں یہ ہیں:-

(۱) حکومتِ ہند، حکومتِ سیام کو ۵ کروڑ رُپے قرض دے گی۔ حکومتِ سیام یہ رقم یکم اگست سنہ ۱۹۴۶ء سے لے کر ۳۱ جولائی سنہ ۱۹۴۷ء تک کے درمیانی عرصے میں جب چاہے حاصل کرسکتی ہے۔

(۲) یہ قرضہ اس مقصد سے دیا گیا ہے کہ سیام ہندستان سے مال وغیرہ کی خریداری کرسکے، تاکہ سیام کی معاشی حالت بہت جلد درست ہو جائے۔

(۳) حکومتِ سیام اپنے سرکاری بنک کو ہدایت کرے گی کہ وہ ریزرو بنک آف انڈیا میں اپنا اکونٹ کھول لے۔ حکومتِ سیام کو جیسے جیسے رُپے کی ضرورت ہوگی وہ حکومتِ ہند کے محکمۂ مالیات سے مطالبہ کرے گی، اور حکومتِ ہند مطلوبہ رقم ریزرو بنک آف انڈیا میں حکومتِ سیام کے اکونٹ میں جمع کرتی جائے گی۔ حکومتِ ہند یہ قرضہ پانچ پانچ لاکھ کے بلاک میں ادا کرے گی۔ ۳۱ جولائی سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد حکومتِ سیام کسی رقم کا مطالبہ نہیں کرسکتی۔

(۴) ۳۱ جولائی سنہ ۱۹۴۷ء تک حکومتِ سیام جتنی رقم ہندستان سے وصول کرے گی اس کی واپسی ادائیگی قسط وار تین فی صد سالانہ شرحِ سود پر ہوگی۔ ہر سال حکومتِ سیام، حکومتِ ہند کو ۴۴ لاکھ رُپے ادا کرے گی۔ ادائیگی کا سال پہلی اگست سنہ ۱۹۴۷ء سے شروع ہوگا۔ ہر قسط کے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ سود کی پوری رقم اس میں شامل ہے۔ سود نکالنے کے بعد اُس قسط میں جو رقم بچے گی وہ زرِ اصل شمار کی جائے گی۔ جو اُس سال واجب الادا ہوگا۔ ۳۱ جولائی سنہ ۱۹۴۷ء تک جتنا سود حکومتِ سیام کے لیے واجب الادا ہوگا اُس کا شمار اس رقم کے مطابق کیا جائے گا جو بنک آف سیام کے اکونٹ میں ریزرو بنک آف انڈیا کی طرف سے جمع کی جائے گی۔ سود کی رقم انھی تاریخوں سے جمع ہونا شروع ہو جائے گی جن تاریخوں کو حکومتِ سیام کو ریزرو بنک آف انڈیا سے رُپے ملیں گے۔ اُس کے بعد جو سال آئیں گے اُن میں یہ ہوگا کہ ہر سال کی پہلی اگست کو زرِ اصل جتنا باقی ہو اُس کے ساتھ سود کی رقم شمار کی جائے گی۔ پہلی اگست سنہ ۱۹۵۱ء کے بعد حکومتِ سیام قرضے کی ادائیگی زیادہ تیزی اور جلدی کے ساتھ کرنے لگے گی۔

(۵) زرِ اصل اور سود کی سالانہ قسط وار ادائیگی ہر سال کی پہلی اگست کو ہوگی، اور وہ اس طرح کہ بنک آف سیام کے اکونٹ سے رقم نکال کر ریزرو بنک آف انڈیا میں حکومتِ ہند کا جو اکونٹ ہے اس میں جمع ہو جائے گی۔

(۶) حکومتِ سیام، حکومتِ ہند سے مشورہ کرکے خریداری سے متعلق اپنی پالیسی کا تعین کرے گی، جس کا تعلق ان خریداریوں سے ہوگا جو حکومتِ سیام ہندستان میں، سرکاری ذریعوں سے نہیں بلکہ دیگر ذریعوں سے، کرنے والی ہے۔

مشرقِ وسطیٰ سے ہندستان کی تجارت

اسکندریا میں مقیم ہندستان کے تجارتی کمشنر نے جو ماہانہ رپورٹ بھیجی ہے اُس سے ہندستان اور مشرقِ وسطیٰ کی تجارت کے بارے میں کچھ خاص باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں مصر نے ہندستان کو ۲۷۴۷۸۶۵۲ پونڈ کا مال بھیجا، جس میں ۷۵ فی صد مال کچی روئی پر مشتمل تھا۔ ۱۹۴۵ء ہی میں ہندستان سے مصر کو ۲۹۳۰۱۵۳ پونڈ کا مال گیا، جس میں زیادہ تر جوٹ کی بنی ہوئی چیزیں، تمباکو اور سگار، سوتی کپڑے اور سوت اور چائے تھی۔ ۱۹۴۴ء کے اعداد سے اگر اس کا مقابلہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہندستان سے جتنی قیمت کا مال مصر کو جاتا تھا اس میں ۵ لاکھ پونڈ کی کمی ہوگئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندستان سے راست استعمال کی اشیا زیادہ بھیجی جائیں، جیسے چمڑے کی بنی ہوئی چیزیں، مسالے اور جوٹ کی بنی ہوئی چیزیں۔ گزشتہ تین مہینوں کے اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ سوڈان میں غیر ملکوں سے جتنا مال داخل ہوا اُس کا ۳۶ فی صد حصہ ہندستان سے گیا تھا۔ اس سے سوڈان اور ہندستان کی باہمی تجارت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ سوڈان نے جتنی دیا سلائیاں اور جتنے سوت اور جتنی بوریاں منگوائیں وہ سب ہندستان سے۔ سوڈان میں اس وقت کینوس جوتوں کی بڑی مانگ ہے۔ اور ہندستان آسانی کے ساتھ یہ چیز سپلائی کرسکتا ہے۔ سوڈان نے ہندستان کو جو مال بھیجا ہے اس میں بنولے نکالی ہوئی روئی کی سب سے زیادہ اہمیت ہے جو ہندستان کی کپڑے کی صنعت کے لیے بہت ضروری ہے۔ فلسطین کو ہندستان زیادہ تر چھلکے اُتاری ہوئی موم پھلی بھیجتا رہا ہے، اور وہاں سے تراشے ہوئے ہیرے منگواتا رہا ہے۔

ناجائز سود خواری

بمبئی کی وزارت نے ناجائز سود خواری کے خلاف ایک قانونی مسودہ تیار کیا ہے جو اسمبلی میں عنقریب پیش کیا جانے والا ہے۔ اس کا مقصد ناجائز سود خواری کا ختم کرنا ہے۔ اس سے متعلق خاص خاص باتیں یہ ہیں :۔ ہر مہاجن کو ایک لائسنس حاصل کرنا پڑے گا اور ہر سال اس کی تجدید بھی کرانی پڑے گی۔ خاص خاص سرکاری ہدایتوں کے بموجب اسے بہی کھاتہ رکھنا پڑے گا، اور اپنے ہر قرض خواہ کو سالانہ حساب سمجھانا اور بتانا پڑے گا۔ ایک رجسٹرار جنرل کے زیرِ نگرانی لائسنس کے کنٹرول کا محکمہ قائم ہوگا۔ جس کے افسروں کو سول کورٹ کے اختیارات ہوں گے۔ اُن اختیارات کا تعلق اس بات سے ہوگا کہ قرض خواہ اور مہاجن دونوں عدالت میں حاضر ہوں تاکہ ان کے معاہدے کی عدالتی تحقیق کی جائے اس سلسلے میں انھیں ضروری کاغذات بھی عدالت کے سامنے حاضر کرنے ہوں گے۔ عدالت کو اختیار ہوگا کہ کسی مہاجن کا لائسنس ضبط کرے یا معطل کردے۔ قانونی مسودے میں اس بات کی بھی سخت ممانعت کی گئی ہے اور اس کے لیے سزا مقرر کی گئی ہے کہ مقروض کو قرض خواہ کسی طرح پریشان اور تنگ نہ کرے۔ مثلاً مقروض کے مکان یا جہاں وہ کام کرتا

ہو اس کے گرد چکر کاٹنا ، اُس کا پیچھا کرنا اور اس کو تشدد کی دھمکی دینا ، اِن سب باتوں کی سختی سے مخالفت کی گئی ہو۔ کسی خاص علاقے میں زیادہ سے زیادہ کتنی شرح سُود وصول کی جا سکتی ہو اس کے بھی مقرر کرنے کا خیال ہو۔ دھوکے بازی اور پوشیدہ طور پر معاملات طے کرنے کے خلاف بھی اس قانونی مسودے میں کارروائی کی گئی ہو۔

عالمگیر تجارتی کانفرنس اور ہندستان

(بقیہ صفحہ ۵)

اگر اُسے تعمیری مقصد سے استعمال کیا جائے تو دنیا کے معاشی ذرائع کو ترقی دینے میں اُس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کی بنا پر ذیلی کمیٹی کی رائے ہے کہ کروڑگیری اور تجارتی محصولات کے سلسلے میں امریکی تجویزیں ہندستان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ یہ مطالبہ بالکل غلط ہے کہ دنیا کا ہر ملک اپنے درآمدی محصولات میں کمی کر دے اور بغیر اپنی مخصوص معاشی حیثیت کا خیال کیے محصولات کے سلسلے میں تمام ملکوں سے بالکل یکساں طرزِ عمل اختیار کرکے ترجیحات کے طریقے کو خیرباد کہہ دے۔

بین اقوامی تجارت کے سلسلے میں جہاں تک مقداری پابندیوں (QUANTITATIVE RESTRICTIONS) کا سوال ہے، ذیلی کمیٹی کی رائے ہے کہ انھیں جہاں تک ممکن ہو سکے زیادہ کام میں لانے کی کوشش نہ کی جائے، لیکن اگر ان سے موزوں اور مناسب انداز میں کام لیا جائے اور تعمیری مقاصد کے تحت، تو اس سے پیداوار بڑھانے اور روزگار مہیا کرنے کے کام میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

آخر میں ذیلی کمیٹی نے بین اقوامی مجلسِ تجارت کے انتظامی بورڈ کی ممبری کے سوال سے بحث کی ہے۔ امریکی تجویز یہ ہے کہ مستقل ممبری، معاشی لحاظ سے جو اہم ممالک ہیں، انھی کو دی جائے۔ ذیلی کمیٹی کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں نہ صرف کسی ملک کی تجارتِ خارجہ، مجموعی قومی آمدنی اور آبادی کا خیال کیا جائے، بلکہ کچھ اور خاص باتوں کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے اس کے وسیع اور عظیم معاشی ذرائع و وسائل کو پیشِ نظر رکھنا اور ایشیا کی قوموں میں جو اسے سرداری حاصل ہے اُسے ملحوظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ بین اقوامی تنظیم کے سلسلے میں ہندستان کے بارے میں محض اس کی موجودہ حیثیت کا خیال کرکے کوئی فیصلہ نہ کیا جائے، بلکہ یہ خیال کیا جائے کہ ہندستان کے معاشی ذرائع بہت وسیع ہیں چناں چہ یہ مطالبہ بالکل صحیح ہے کہ انتظامیہ بورڈ میں ہندستان کو مستقل نشست دی جائے۔

ہماری رائے میں ذیلی کمیٹی کی یہ تجویزیں بالکل صحیح اور درست ہیں اور ہر وہ شخص جو ہندستان کی معاشی ترقی کو برطانیہ اور امریکہ کے سرمایہ دارانہ حرص و آز کا شکار بنتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا اُسے ان تجویزوں کی پوری پوری حمایت کرنی چاہیے۔

تبصرے

سماج کا ارتقا

مصنفہ کلیم اللہ صاحب، حجم ۲۸۸ صفحات، چھپائی وغیرہ بہت نفیس اور اعلا، مجلد، دیدہ زیب گردپوش، قیمت ۴ رُپے۔ ملنے کا پتا:۔ سنگم پبلشرز لمیٹڈ، میک لوڈ روڈ، لاہور

عہدِ وحشت اور بربریت سے لے کر اس وقت تک انسانی سماج نے ارتقا کی جتنی منزلیں طے کی ہیں اُن کا ایک مجمل لیکن جامع تذکرہ جس میں سماج کے معاشی، سیاسی اور تہذیبی تینوں ارتقا شامل ہیں۔ یہ نہ صرف تذکرہ ہی بلکہ اُن بنیادی طاقتوں کا تجزیہ بھی ہے جنھوں نے اب تک سماج کو ترقی کی طرف بڑھایا ہے۔ اس طرح کتاب پڑھ کر ہمیں نہ صرف یہ محسوس ہوتا ہے کہ سماج مسلسل آگے ہی بڑھتا رہا ہے بلکہ ہم یہ بھی جان لیتے ہیں کہ سماج کیوں اور کس طرح آگے بڑھتا رہا ہے۔ ہمیں انسانی سماج کی حرکت اور اس کے محرک دونوں کا پتا چلتا ہے۔ سماجی ارتقا کی تشریح کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ جدید اور سائنسی ہے یعنی سماجی ارتقا کا راز انسان کی مادی جدوجہد میں تلاش کیا گیا ہے جو اس کے پورے اوپری ڈھانچے ——— سیاست، کلچر اور آرٹ ——— کو متعین کرتی ہے۔ چناں چہ کتاب میں عنوانات کی جو ترتیب رکھی گئی ہے اس سے یہ سائنسی طریقۂ تشریح بالکل واضح ہے۔ انسانی سماج کے مختلف ادوار بدلتے ہوئے معاشی نظام کے مطابق مقرر کیے گئے ہیں۔ ہر دَور کے پہلے پیدائشِ اشیا اور اس کی تقسیم کا جو نظام ہوتا ہے اس کا اور اس کی پیدا کردہ معاشی طاقتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو اس دَور کو وجود میں لاتی ہیں۔ پھر اُس معاشی نظام کے اوپری ڈھانچے یعنی اُس کے سیاسی نظام کا ذکر آتا ہے۔ پھر اُس زمانے کے پیدا کردہ مخصوص طرزِ فکر، ادب وفنون اور فلسفہ و مذہب سے بحث کی گئی ہے۔

عہدِ وحشت اور بربریت کے قبیلائی اور غلامی کے نظام کے بعد جاگیرداری نظام آتا ہے۔ جاگیرداری نظام سے تجارتی سرمایہ داری پیدا ہوتی ہے اور تجارتی سرمایہ داری صنعتی سرمایہ داری کو جنم دیتی ہے۔ سرمایہ داری ترقی کر کے اجارہ داری اور مالیاتی سرمایہ داری کے درجے کو پہنچتی ہے، سامراج اور فاشیت وجود میں آتی ہے۔ لیکن دنیا کے ایک خطے میں سرمایہ داری نظام کی ہی پیدا کردہ مزدور طاقت ذاتی ملکیت اور سرمایہ داری کا تختہ اُلٹ دیتی ہے اور انسانی تاریخ میں پہلی بار اشتراکی سماج وجود میں آنا شروع ہوتا ہے۔ کتاب کا خاتمہ سوویت یونین کی معاشی، سیاسی اور تہذیبی خصوصیات کے بیان پر ختم ہوتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اُردو میں یہ تصنیف ایک بے حد اہم تصنیف ہے اور اس موضوع پر کسی جامع لیکن مختصر کتاب کی مدتوں سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ یہ ایک طبع زاد تصنیف ہے۔ اُردو داں قارئین کو اس کے مطالعے سے سماجی علوم

سے ان بنیادی اور اہم اصولوں سے واقفیت ہو جائے گی اور سماجی مسائل پر سوچنے کا سائنسی انداز پیدا ہوگا۔ زبان معلوم ہوتا ہے جان کر صاف، سلیس اور آسان رکھی گئی ہے جو کتاب کی افادیت کو اور بڑھا دیتی ہے۔

کہیں کہیں بعض ترجموں سے ہمیں اختلاف ہے۔ مثلاً مونوگیمی (MONOGAMY) کا ترجمہ یک زوجگی نہیں بلکہ یک ازدواجی زیادہ مکمل اور درست ہے۔ پھر صفحہ ۲۱ پر "آزاد جنسی تعلقات" (PROMISCUITY) اور گروہی شادی (GROUP MARRIAGE) کو ایک ہی چیز قرار دیا گیا ہے، حال آں کہ وہ دونوں انسان کے جنسی تعلقات کی دو مختلف منزلیں ہیں۔ "آزاد جنسی تعلقات" انسٹی ٹیوشن ہونے کی حیثیت نہیں رکھتا، لیکن "گروہی شادی" ایک مستقل اور باقاعدہ و باضابطہ انسٹی ٹیوشن ہے چاہے ایک شادی کے دائرے میں ہزاروں، لاکھوں مرد و عورت کیوں نہ شامل ہوں۔ دوسرے انگریزی کی جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے اُن کو ذہن میں ٹھیک سے ہضم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ چناں چہ کئی مقامات پر بعض جملے اور مکمل کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

نسوانی دُنیا یہ ایک ماہ وار زنانہ رسالہ ہے جو لاہور سے محترمہ عائشہ صدیقہ صاحبہ کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ حجم ۴۸ صفحات۔ سرورق کے نقوش بہت سادہ اور فن کارانہ ہیں جو طبیعت میں سکون پیدا کرتے ہیں۔ سرورق پر جس جھکی جھکی پلکوں والی لڑکی کا شریف چہرہ بنایا گیا ہے وہ غالباً ادارہ "نسوانی دنیا" کے ذہن میں آئیڈیل عورت کا جو تصوّر ہے اُسے ظاہر کرتا ہے۔ اس انقلابی عہد میں ہندستانی عورت کی سماجی زندگی کے کیا مسائل ہیں ان پر غور کرنا، ہندستانی عورت کے دُکھ، درد، مصائب، اس کے غم و خوشی، تکلیف و راحت کی ترجمانی کرنا اس کا مطمح نظر ہے۔ یہ رسالہ ہندستانی عورت کو ایک نئی آزادی اور خودداری کا پیغام اور اپنے حقوق کے لیے لڑنے کی دعوت دیتا ہے۔ چناں چہ یہ ان تمام زنانہ رسالوں سے مختلف ہے جو کشیدہ کاری سکھلاتے ہیں۔ مغربی تہذیب کو گالیاں دیتے ہیں اور فلم ایکٹرسوں کی نیم عریاں تصویریں چھاپتے ہیں۔ سالانہ چندہ چھ رُپے۔ ملنے کا پتا:۔ چابک سواراں اسٹریٹ۔ لاہور۔

معاشیات

جلد ۱ — اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء — نمبر ۱۰

فہرستِ مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱ -	ہندو مسلم فساد	اڈیٹر	۲
	کپڑے کی قلت	"	۵
۲ -	نمک کا محصول	برج نرائن پروفیسر پنجاب یونی ورسٹی	۶
۳ -	بین اقوامی زر فنڈ	نعیمہ سلطان بیگم بی۔ اے	۱۰
۴ -	قومی آمدنی کیا ہے	خلیق احمد نقوی	۱۷
۵ -	شکر سازی کی صنعت	ابو سالم ایم اے (علیگ)	۲۲
۶ -	ہندستان میں بندوبست آراضی کا ارتقا	حمیدہ سراج ایم۔ اے، بی۔ ٹی (علیگ)	۲۹
۷ -	معاشی صورتِ حال	ادارہ	۳۸
۸ -	تبصرے	"	۴۶
۹ -	انجمنِ ترقیِ اردو کی وضع کردہ چند معاشیاتی اصطلاحات		۴۸

اداریہ

ہندو مسلم فساد

از : ——— اڈیٹر

ہماری نظر میں ہندو مسلم فساد سے زیادہ گندی، گھناؤنی اور بدشکل چیز دنیا میں کوئی نہیں۔ ہندو مسلم فساد کی خبر سُن کر ہمارے دل میں جو جذبہ پیدا ہوتا ہی وہ نفرت، کراہیت اور ایک عظیم صدمے اور اذیت کے احساس سے پُر ہوتا ہی۔ ہندو مسلم فساد پیمانہ ہی اِس بات کا کہ ہماری پبلک زندگی ذلت اور پستی کی کتنی عمیق کھائی میں گر چکی ہی۔ ہندو مسلم فساد ایک بوسیدہ اور سڑے گلے نظام کی بدترین پیداوار ہی جو ہماری سماجی زندگی میں اپنی عفونت پھیلا رہی ہی۔ فسادات کے دوران میں ہر انسان، چاہے وہ مسلمان ہو یا ہندو، جانور سے بھی بدتر ہو جاتا ہی۔ فساد ہماری بہیمانہ فطرت اور سرشت کو دفعتًا اوپر کی سطح پر لے آتا ہی اور ہم ہزاروں سال کے تہذیبی اور تمدنی ارتقا سے دفعتًا عاری ہو کر دوبارہ اُس پست سطح پر پہنچ جاتے ہیں جب انسان بہیمیت کی منزل سے نکل کر انسانی منزل میں داخل ہو رہا تھا۔ فساد صرف ہماری پست ترین اور رکیک ترین سرشت کو اُبھار سکتا ہی۔ قومی جنگ یا طبقے وار کش مکش کے برخلاف ہندو مسلم فساد ہمارے اعلا جذبات اور اخلاقی جرأت کو نہیں اُبھارتا۔ وہ صرف ہماری بہیمیت کو ہماری انسانیت پر مسلط کر سکتا ہی اور بس۔ ہندو مسلم فساد معاشرتی زندگی کی اولین بنیاد پر حملہ کرتا ہی اور اُس پر کاری ضرب رسید کرتا ہی۔ پورے سماجی نظام کا ڈھانچہ جس اولین تجربا بنیادی [illegible] [illegible] وہ ہی انفرادی زندگی کا تحفظ۔ انفرادی زندگی کے تحفظ اور بقا ہی کے لیے انسان بہیمیت کے دور میں ہی ساتھ مل کر رہنے [illegible] اور ساتھ مل کر رہنے میں جو چیز حائل تھی .... اُسے خیرباد کہہ دیا تھا۔ ہندو مسلم فساد انفرادی

تحفظ کی اوّلین بنیاد پر حملہ کر کے پورے انسانی نظام کو متزلزل کر دیتا ہے۔ چناں چہ ہندو مسلم فساد تمدن کی براہِ راست نفی ہے۔ ہندو مسلم فساد ہمارا سب سے بڑا سیاسی اور سماجی دشمن ہے جس کا سر کچل ڈالنا ہمارا اوّلین فرض ہے۔ اگر ہم نے آج اس کو ختم نہیں کر دیا تو کل وہ ہمیں ختم کر ڈالے گا۔

ہم نے کچھ ایسا محسوس کیا ہے کہ آج سے چند سال پہلے جو فسادات ہوتے تھے اُن میں اور آج کل کے فسادات میں نوعیت کا فرق ہے۔ اس فرق کا تعلق نہ صرف اس بات سے ہے کہ اب فساد میں حصہ لینے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے بلکہ اس بات سے بھی کہ فسادات کی پُشت پر ایک نئی نفسیات کام کر رہی ہے۔ یہ نئی نفسیات ایک منفی پیداوار ہے ہماری شکست خوردگی، احساسِ پستی اور جھنجھلاہٹ کی جو بہ جائے خود ایسی غلط سیاسی پالیسیوں کا نتیجہ ہے جن کا ناکام اور نامراد ہونا ایک لازمی امر تھا۔ اس نفسیات کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ آج ہندو یہ سمجھتا ہے کہ آزادی کے راستے میں مسلمان حائل ہے اس لیے اس کو ختم کر دینا لازمی ہے اور مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان اور آزادی کا حصول ہندو کو ختم کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ سراسر غلط تصوّر عوام کی نفسیات کا ایک اہم حصہ بنتا چلا جا رہا ہے۔ یہ شاونیت (CHAUVINISM) کی ایک نہایت خطرناک اور بدترین قسم ہے جس کا انجام سوائے تباہی و بربادی اور دائمی غلامی کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ مُلک کی موجودہ سیاسی صورتِ حال اس نفسیات کو ختم کرنے کی بہ جائے اُسے اور آگے بڑھا رہی ہے۔ سیاسی رہنما باوجود اپنی ایمان داری اور خلوص کے اُس پر قابو نہیں پا سکتے اور وہ فسادات کے موقعوں پر خود کو بے دست و پا پاتے ہیں۔ وہ ایک ایسی چیز پر قابو نہیں پا سکتے جو اُن غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے جن کا اعلان کرتے وقت وہ نتائج کا شعور نہیں رکھتے تھے۔ وہ خود اپنا تضاد نہیں محسوس کر سکتے۔ عوام جلد از جلد اپنی معاشی اور سیاسی بہتری کے خواہاں ہیں۔ وہ تبدیلیوں کے لیے بے چین ہیں لیکن غلط پالیسیوں نے اُن کی معاشی اور سیاسی بہتری کے راستے روک رکھے ہیں، چناں چہ جدوجہد اور کش مکش کا جو جذبہ جائز طور پر اُن کے اندر پایا جاتا ہے اُس کا رُخ لازمی طور پر ایک دوسرے کے خلاف پھر گیا ہے۔ وہ شکست خوردگی اور جھنجھلاہٹ میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھنے لگے ہیں۔ جھنجھلاہٹ اور غصّے کے موڈ میں اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

ہندو چوں کہ مسلمان کو اور مسلمان ہندو کو آزادی کی راہ میں حائل محسوس کرتا ہے اس لیے دونوں کے ذہن میں فساد کے لیے ایک وجہِ جواز پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ وہ فساد کو ایک اچھی چیز سمجھنے لگے ہیں یا کم سے کم ایک ایسی ناگوار چیز جس کا انجام دینا ضروری ہے۔ منطقی طور پر انھوں نے اُس پوری بہیمیت کو بھی ذہنی طور پر قبول کر لیا ہے جو ہندو مسلم فسادات سے لازماً وابستہ ہوتی ہے اور جسے کسی طرح بھی جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ہندو اور مسلم عوام کے ذہن میں فسادات کی بہیمیت کے لیے

وجہ جواز ... چلی جا رہی ہے۔ وہ فساد کے ساتھ ساتھ اس کی حیوانی فطرت کو بھی اچھی چیز یا کم سے کم ایک ناگوار لیکن ضروری چیز کی حیثیت سے تسلیم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اب ان کے ذہن میں عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کرنا، اُن کی چھاتیاں کاٹ لینا، بچوں کے سینے میں کیل ٹھونک کر اُن کو دیوار سے لٹکا دینا، بوڑھوں کو قتل کر دینا، زندوں کو دہکتی آگ میں ڈال دینا، پیچھے سے اگر کسی کو بے خبری کی حالت میں چھرا بھونک دینا ——— یہ تمام چیزیں اب کراہیت نہیں پیدا کرتیں بلکہ وہ اُن کو آزادی کی جدوجہد کا ایک حصہ سمجھنے لگے ہیں۔ اس طرح آج کل ہندو مسلم عوام ایک بہت بڑے پیمانے پر انسانی خصوصیات سے عاری ہونے کے نفسیاتی عمل (PROCESS OF DEHUMANISATION) سے گزر رہے ہیں۔ آج ہماری پوری آبادی تیزی کے ساتھ "گنڈا" ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ آج ہمارے بہت سے لیڈر بھی ذہنی اعتبار سے "گنڈا" ہو گئے ہیں۔ یہ ہے اُن ہندو مسلم فسادات کی نوعیت جو آج کل رونما ہوئے ہیں، یہی چیز آج کل کے فسادات کو آج سے چند سال پہلے کے ہندو مسلم فسادات سے علاحدہ کرتی ہے۔

یہ تو ہندو مسلم فسادات کی غیر انسانی اور سیاسی نوعیت کا تذکرہ ہوا۔ اب ہم ان تباہیوں کا تذکرہ کریں گے جو فسادات کی وجہ سے مُلک کی تجارت وصنعت پر نازل ہوئی ہیں۔ معاصر "انوسٹ منٹ اینڈ فنانس" نے اس سلسلے میں چند اہم باتوں کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو کافی اہم ہیں۔ آتش زدگی اور لوٹ مار سے جو کروڑوں روپوں کا نقصان ہوا اُس سے قطع نظر تجارت اور صنعت میں جو خلل پیدا ہوا ہے وہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ بمبئی اور کلکتہ مُلک کے سب سے اہم تجارتی اور صنعتی مرکز ہیں اور وہیں سب سے ہولناک فسادات رونما ہوئے ہیں۔ کلکتہ میں دو ہفتوں تک اسٹاک ایکسچینج کا کاروبار بالکل بند رہا اور بمبئی میں چھ روز تک جس سے حکومت اور کمپنی کے حصے داروں کو شدید نقصان پہنچا۔ اس کا بُرا اثر صنعتوں کی ترقی کی رفتار پر پڑا ہے اور سرمایے کے اجتماع کا عمل بہت حد تک رُک گیا ہے۔ فسادات سے مُلک میں اشیا کی پیدائش کی رفتار بھی کم ہو گئی ہے۔ اس لیے کہ کارخانوں میں شفٹوں کو گھٹانا پڑا اور کام کے گھنٹے بھی کم کر دیے گئے۔ کلکتہ کی بارہ جوٹ ملیں دو ہفتے تک بالکل بند رہیں۔ احمد آباد اور دیگر صنعتی شہروں میں بھی جہاں فسادات ہوئے کچھ اسی قسم کی صورتِ حال رہی۔ پیدائشِ اشیا کی کمی کا اثر لوگوں کی آمدنی اور ان کی قوتِ خرید پر پڑنا لازمی ہے۔ کلکتہ سے بہت بڑی تعداد میں مزدور کام چھوڑ کر اپنے اپنے گاؤں چلے گئے۔ اس سے کارخانوں میں قوتِ محنت کی کمی پڑ گئی اور اشیا کی پیدائش کی رفتار بہت گھٹ گئی۔ مراسلت کو تجارت اور کاروبار کی جان کہا گیا ہے لیکن فرقے وارانہ فسادات کے دوران میں کلکتہ میں پورے طور سے اور بمبئی میں ایک حد تک مراسلت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا جس سے کاروبار کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ فسادات سے برآمدی تجارت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ کلکتہ ہی کے ذریعے بنگال اور آسام کی دریائی تجارت کا سلسلہ باہری دنیا سے ملحق ہے۔ لیکن فسادات کے دوران میں کلکتہ کی بندرگاہ پر مال کا لادنا یا اُتارا جانا بالکل بند رہا جس سے اُس تجارت

شدید نقصانات پہنچے۔ ہندستان اور برطانیہ کے درمیان تجارت کا جو سلسلہ ہے اس میں بھی کافی خلل واقع ہوا ہے۔ کلکتہ کے فسادات کے دنوں میں ہندستان اور برطانیہ کے درمیان تجارتی مراسلات کا سلسلہ تقریباً بالکل منقطع ہوگیا تھا۔ کلکتہ اور بمبئی میں فسادات کے دوران میں اور اس کے بعد قیمتوں میں جو اُتار چڑھاؤ ہوا ہے اُسے بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لوٹ اور آتش زدگی کے خوف سے نہ تو دُکان دار کافی مال دُکانوں میں لاتے ہیں اور نہ خریدار اشیا کی خرید کے لیے آزادی کے ساتھ بازاروں میں گھومتے ہیں۔ تجارت اور کاروبار کی بنیاد امن اور اعتماد پر قائم ہے لیکن فسادات نے امن اور اعتماد کی نفسیاتی بنیاد کو ختم کردیا ہے۔ مزدوروں کی تحریک پر اس کا بہت خراب اثر پڑا ہے۔ اگرچہ کلکتہ اور بمبئی کے مزدور علاقوں کے بڑے حصے فسادات سے علاحدہ اور محفوظ رہے ہیں لیکن دوسرے صنعتی مرکزوں اور شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات نے مزدوروں کے اتحاد کو توڑکر اُن کی تحریک کو کمزور کردیا ہے اور ان کی طاقت مالکوں کی طاقت کے مقابلے میں گھٹ گئی ہے۔

یہ ہیں ہندو مسلم فسادات کی تہذیبی، سیاسی اور معاشی تباہ کاریاں۔

کپڑے کی قلت

حکومتِ ہند نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کپڑے کی قیمتوں میں فی الحال اضافہ نہ کیا جائے، اور اس مسئلے پر مزید غور و خوض کیا جائے۔ کپڑے کی پیدائش کو بڑھانے کے لیے حکومت نے مِل مالکوں کو رائے دی ہے کہ جہاں تک ممکن ہوسکے تین شفٹوں میں کام کرایا جائے۔ اس کے لیے احمد آباد کی کپڑے کی ملوں کے لیے ۲۰ ہزار ٹن مزید کوئلہ ہر مہینے مہیا کیا جائے گا۔ تین شفٹوں کے اختیار کرنے میں جو دقت حائل ہے وہ ہے کوئلہ، روئی اور ماہر مزدوروں کی کمی۔ مزدوروں کے لیے غذا، جائے رہائش اور ذرائع نقل و حمل بھی ٹھیک طور سے نہیں مہیا کیے جاتے جس کا اثر پیدائش پر پڑتا ہے۔ یہ بھی طے ہوا ہے کہ مرکزی صنعتوں اور سپلائی کے محکمے کی طرف سے ایک وفد امریکہ اور انگلستان بھیجا جائے جس کا کام یہ ہوگا کہ نئی قائم کی جانے والی ملوں کے لیے مشینیں اور پُرانی ملوں کے لیے پُرزے اور مِل اسٹور حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ وفد اس بات کی بھی تحقیق و تفتیش کرے گا کہ ہندستان میں کپڑا بُننے کی مشینیں بنانے کی صنعت کہاں تک ترقی کرسکتی ہے اور اس کے قیام کے امکانات کیا ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ کپڑے کی پیدائش کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے حکومتِ ہند نے جو کارروائیاں کی ہیں وہ صحیح اور درست ہیں لیکن جہاں تک عوام تک کپڑے کے پہنچنے کا سوال ہے یہ کافی نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کپڑے کی چور بازاری کو ختم کیے بغیر کپڑے کی مناسب تقسیم کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ لیکن سب سے اہم دقت

(باقی صفحہ ۱۱۲ پر دیکھیے)

مسائل حاضرہ (ہندستان)

نمک کا محصول

از: ——— برج نرائن پروفیسر پنجاب یونی ورسٹی

۲ ستمبر کو عارضی حکومت کی تشکیل ہوئی۔ اگلے ہی دن پنڈت جواہر لال نہرو نائب صدر عارضی حکومت کے نام گاندھی جی کی ہدایات شائع ہوئیں۔ ان ہدایات کو عارضی حکومت کے نام اگر حکم نامہ کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ گاندھی جی نے ۲ ستمبر کو پراتھنا کے بعد تقریر کرتے ہوئے کہا ——— "عارضی حکومت کے اراکین کو 'نمک ستیاگرہ' کے واقعات یاد رکھنے چاہییں، اور ان کا سب سے مقدم فرض اس محصول کی برطرفی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ نمک غریبوں کے لیے پانی اور ہوا کی طرح مفت ملنے لگے۔" اس تقریر کے دوران میں مہاتما جی نے محصول بندی کا ایک نیا معیار بھی وضع فرمایا ہے "کسی محصول کا اندازہ کرنے میں اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں اس سے غریب اور محنت کش طبقے پر تو چوٹ نہیں پڑتی؟" سب سے پہلے ہمیں اس معیار کو پرکھنا ہے۔ ہم اسے بلا تامل قبول نہیں کر سکتے۔ تمام لوگ حکومت سے استفادہ کرتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے غریب سے غریب شخص کو بھی حکومت کے اخراجات کا بار محصول کی صورت میں اٹھانا پڑتا ہے۔ دوسرے محصول بندی کے نظام کو ہمیں مجموعی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ جماعت کے مختلف طبقوں پر اجتماعی محصول بندی کے نظام کا بار انفرادی محصولات سے زیادہ اہم ہے۔ کسی ایک محصول کو آدرش بنانا غیر ممکن ہے۔

محصولات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بلاواسطہ محصولات (DIRECT TAXES) یا بالواسطہ (INDIRECT TAXES)

مثال کے طور پر آمدنی کا محصول براہ راست محصول ہے۔ اس کا بار وہی شخص اُٹھاتا ہے جس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے ہم اسے کسی دوسرے شخص کو منتقل نہیں کرسکتے۔ لگان بھی اسی طرح براہِ راست محصول ہے۔ زمین داروں کے لیے یہ آمدنی کے محصول کا بدل ہے۔ اس محصول کا اطلاق براہِ راست زمین دار پر ہوتا ہے جو اسے زیادہ مہنگی اجناس کی صورت میں خریداروں کو منتقل نہیں کرسکتا۔ بالواسطہ محصولات کی صورت میں معاملہ برعکس ہے۔ نمک کا محصول بھی انھی محصولات میں سے ایک ہے۔ یہ محصول بیوپاریوں سے وصول کیا جاتا ہے جو اسے نمک کی قیمت کا ایک جز بنادیتے ہیں۔ نمک کا محصول ہی وہ واحد محصول نہیں جو غریبوں پر اثرانداز ہوتا ہے۔ غریب آدمی کھانڈ بھی ضرور استعمال کرتے ہوں گے، جس میں کھانڈ کا محصول شامل ہوتا ہے۔ دیاسلائی کا استعمال تو ہر طبقے کے لیے ناگزیر ہے۔ دیاسلائی کی قیمت کا ایک اہم جُز دیاسلائی پر محصول ہوتا ہے۔ بہت سے غریب لوگ سینما کو بھی ضروریاتِ زندگی میں سے سمجھتے ہیں۔ ٹکٹوں کی شرح ادا کرتے وقت تفریحی محصول کا بھی اُن پر اطلاق ہوتا ہے۔ غریب طبقے کا ایک اہم حصّہ شہروں میں رہتا ہے اور بجلی استعمال کرتا ہے۔ بجلی کی اشیا پر درآمد کا محصول ادا کیا جاتا ہے جو ان کی قیمت کا ایک حصّہ بن جاتا ہے۔ بہت سے غریب افراد لاریوں کا سفر کرتے ہیں ان لاریوں پر بھی درآمد کے وقت محصول ادا کیا جاتا ہے جو ان کی شرح میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ بہت سی مشینیں غیر ملکوں سے منگائی جاتی ہیں جن پر درآمد کے محصولات ادا کیے جاتے ہیں، اور ان کی محصولات کی زد بالآخر ان اشیا کے خریداروں پر پڑتی ہے جو ان مشینوں سے بنائی جاتی ہیں۔ یہ خیال کرنا غلط نہ ہوگا کہ ان اشیا کے خریداروں میں بہت سے لوگ غریب بھی ہوتے ہوں گے۔ جوں جوں دولت کی تقسیم مساوی بنیادوں پر ہوتی جائے گی غریب اور محنت کش طبقہ زیادہ سے زیادہ آرام و آسایش کی چیزیں خریدے گا، اور جن اشیا کو ہم آج سامانِ عشرت سمجھتے ہیں کل وہ غریبوں کی ضروریاتِ زندگی میں سے ہوں گی۔

ظاہر ہے کہ اگر گاندھی جی کے معیار کو تسلیم کرلیا جائے تو نمک کے محصول کے علاوہ بہت سے دوسرے بالواسطہ محصولات بھی اُٹھا دینے پڑیں گے، اور اس طرح ایک بہت پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ درحقیقت مہاتما جی کا معیار ناممکن العمل ہے۔ محصول بندی کا ایک مناسب معیار یہ ہے کہ محصول کو محصول دہندہ کی قوتِ ادائیگی کے مطابق رکھا جائے۔ اصلاحی طور پر اسے "اصول انصاف" (PRINCIPLE OF EQUITY) کہا جاتا ہے۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ مجموعی طور پر کوئی محصول کسی طبقے پر بُری طرح اثرانداز تو نہیں ہو رہا ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا نمک کا محصول منتقمانہ ہے؟ کیا محنت کش غریب طبقہ اس کا بار اُٹھانے کے ناقابل ہے؟ نمک صنعتی طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ مگر یہاں ہمیں صرف اس نمک سے غرض ہے جسے عوام استعمال کرتے ہیں یا گاندھی جی کے الفاظ میں "غریب آدمی کا نمک"۔

[illegible] (جیسے یہی نمک کا محصول ہٹائے جانے کا منشا ہی) اس کی مانگ میں اضافہ نہیں کرے گی۔ [illegible] آج نمک کی قیمت ایک پیسہ کم ہوجائے تو ہم ایک سیر کی جگہ دو سیر نمک خریدنے لگیں۔ فی کس نمک [illegible] کی اوسط کیا ہی؟ مثال کے طور پر ہمارے گھر میں ایک سیر نمک فی مہینہ استعمال ہوتا ہی جس کی قیمت چھ پیسے ہیں۔ ممکن ہی آپ زیادہ نمک استعمال کرتے ہوں۔ فرض کیجیے اوسطاً ایک شخص آدھ سیر نمک ایک مہینے میں استعمال کرتا ہی جس کی قیمت تین پیسے ہوئی۔ اب اگر نمک ہوا اور پانی کی طرح مفت بھی دستیاب ہونے لگے تو ایک غریب آدمی زیادہ سے زیادہ تین پیسے ماہوار بچا سکے گا۔

نمک کا قانون بہت دیر سے زیرِ بحث ہی۔ ۲۵-۱۹۲۴ء میں محصولات کے متعلق ایک تحقیقاتی کمیٹی نے اس سلسلے میں چھان بین کی۔ جارج پلاؤڈن (GEORGE PLOWDEN) نے (جو ۱۸۵۶ء میں نمک کے محصول کے متعلق تحقیقات کے لیے مقرر کیے گئے تھے) ان الفاظ میں اس پر تبصرہ کیا ہی :-

"نمک کے محصول کے مناسب یا نامناسب ہونے کے سلسلے میں بحث کرتے ہوئے ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہی۔ وہ یہ کہ کیا عوام پر کسی قسم کا بلا واسطہ یا بالواسطہ محصول کا اطلاق جائز بھی ہی یا نہیں۔"

اس سوال کا جواب سر جوزیا سٹیمپ (SIR JOSIAH STAMP) نے، جو مالیات کے ماہر ہیں، یوں دیا ہی :-

"سب سے مقدم چیز یہ ہی کہ کیا محصول کسی مخصوص طبقے پر غیر ضروری طور سے اثر انداز ہو رہا ہی۔ اور کیا اس کی موجودگی عوام کی مادی ترقی میں حائل ہی۔ اگر محصول لوگوں کی معاشرتی فلاح و بہبودی میں رکاوٹ ثابت ہو رہا ہو اور ان کے معیارِ زندگی پر بُرا اثر ڈالتا ہو تو اسے راستے سے ہٹا دینا چاہیے۔ ورنہ نہیں۔"

(رپورٹ محصولات کی تحقیقاتی کمیٹی ۲۵-۱۹۲۴ء صفحہ ۱۲۴)

ظاہر ہی کہ اگر نمک مفت بھی ملنے لگے تو ایک غریب شخص کی قوتِ خرید میں محض ۳ پیسے فی مہینے کا اضافہ ہوگا۔ نمک کا محصول ہٹنے سے اس کی قوتِ خرید میں ایک پیسہ ماہانہ کا اضافہ ہوگا۔ کیا یہ اضافہ قابلِ توجہ ہی؟ آج کی دنیا میں ایک یا دو پیسوں کی قوتِ خرید ہی کیا ہی۔

نمک کا محصول ہٹنے سے مرکزی مالیے کو شدید نقصان اُٹھانا پڑے گا اور اس کے ساتھ ہی عوام کی قوتِ خرید میں بھی [illegible] اضافہ نہ ہوگا۔ مہاتما جی کا مطالبہ دلائل و براہین سے زیادہ جذبات پر مبنی ہی۔ ان کی واحد دلیل یہی ہی کہ چونکہ آزادی کی [illegible] نمک کے سلسلے میں ستیاگرہ سے شروع ہوئی تھی اس لیے نمک کا محصول فی الفور ختم کر دینا چاہیے۔ اس سوال کا [illegible] رُخ بھی ہی۔ موجودہ عارضی حکومت کانگریس کی حکومت ہی۔ اسے بعض اوقات قومی حکومت کا لقب دیا جاتا

ہو جو کسی طرح بھی صحیح نہیں ۔ قومی حکومت اسی وقت معرضِ وجود میں آسکتی جب تمام جماعتیں یا کم از کم معتبر سیاسی جماعتیں مرکز میں تعاون پر آمادہ ہوں ۔ ہمیں یہ امر تسلیم کر لینا چاہیے کہ مسلم لیگ بھی کچھ افراد کی نمایندہ ہو ۔ یہ امر بھی مسلّم ہو کہ کانگریس مسلم لیگ کی نمایندگی نہیں کرتی ۔ مرکز میں نیشنلسٹ مسلمان کانگریس کے زاویۂ نگاہ کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ کیا اس عارضی حکومت کو یہ اختیار ہو کہ وہ محض گاندھی جی کی خوش نودی کے لیے مُلک کے تمام افراد کی نمایندہ نہ ہوتے ہوئے بھی مُلک کے محصول بندی کے نظام کو تبدیل کرے ؟ مسلم لیگ کے نزدیک 'نمک ستیاگرہ' کی چنداں اہمیت نہیں ۔ مُلک میں بعض ایسے غیر لیگی بھی ہیں جو 'نمک ستیاگرہ' کو آزادی کی جنگ تصور نہیں کرتے اور اسے محض ایک ڈھونگ سمجھتے ہیں ۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مالیاتی خسارے کو بہ ہر حال پورا کرنا ہوگا ۔ اگر آج ہم نمک کا محصول ہٹائیں گے تو کل کسی دوسرے محصول کو اس کی جگہ لینی ہوگی ۔ کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم بڑی سیاسی جماعتوں کے مشورے کے بغیر محصول بندی میں ایسی تبدیلیاں روا رکھیں جو ہندستان کے عوام پر یکساں اثر انداز ہوں گی ۔

نمک کے محصول کو قائم رکھنے کے لیے بہت سی دلیلیں موجود ہیں ۔ اس کے برعکس اس کی برطرفی کے لیے جذباتی باتوں کے سوا اور کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی ۔ بہ ہر صورت اگر نمک پر سے محصول ہٹانا ہی ہو تو ہمیں اُس وقت کا انتظار کرنا چاہیے ۔ جب صحیح معنوں میں قومی حکومت مرکز میں قائم ہو جائے گی ۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہو کہ ملک میں بہت سی آئینی تبدیلیوں کی امید کی جا رہی ہو ۔ جن کے زیرِ اثر ممکن ہو محصول بندی مرکزی حکومت کے تحت ہی نہ رہے ۔ صوبائی گروپوں کا توڑنا —— یا —— کم زور مرکز کے حقوق میں اضافہ کرنا عارضی حکومت کے حلقۂ اقتدار سے باہر ہو ۔ وزارتی مشن کی تجاویز کے مطابق مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر تمام شعبے مرکز کے دائرۂ عمل میں نہیں آسکتے ۔ موجودہ صورت میں مرکز کا حلقۂ عمل دفاع ، بین الاقوامی مسائل اور وسائلِ نقل و حمل تک محدود ہو ۔ اس امکان کے پیشِ نظر محصول بندی کے موجودہ نظام میں فوری تبدیلیاں کرنا مناسب نہیں ۔ ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب تمام آئینی مسائل طے ہو چکیں گے ۔ نمک پر سے محصول ہٹانا آخر موت اور زندگی کا سوال تو ہو نہیں کہ التوا جائز نہ رکھا جائے ۔

———— ✕ ————

بین اقوامی زر فنڈ

از: ——— نعیمہ سلطان بیگم بی۔ اے

[تعارف:۔ نعیمہ سلطان صاحبہ دہلی یونی ورسٹی کی ایک بہت ذہین طالب علم ہیں۔ سالِ رواں کے امتحان میں فرسٹ کلاس حاصل کرنے کے بعد اب وہ ایم۔ اے کے آخری سال کی تکمیل کر رہی ہیں: "معاشیات" ان کا مضمون ہے اور وہ یونی ورسٹی میں اس مضمون کی سب سے اچھی طالب علم سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہے۔ حلقۂ معاشیات اُن کا خیر مقدم کرتا ہے۔]

چھ سال کی ہول ناک جنگ کے بعد دُنیا اب پھر امن اور سکون کی طرف جا رہی ہے۔ اِس وقت ہر ملک کے پاس بعد از جنگ کی معاشی تعمیر و توسیع کی اسکیم ہے جسے وہ عمل میں لانا چاہتا ہے لیکن کوئی بھی مُلک دوسرے مُلکوں سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا چناں چہ ہر ملک کی اسکیم کو عمل میں لانے کے لیے بین اقوامی تعاون اور اشتراکِ عمل کی ضرورت ہے۔ بین اقوامی تعاون کے سلسلے میں ہمیں بہت سے مسائل حل کرنے ہیں، جن میں سے ایک زر کی از سرِ نو تنظیم کا مسئلہ ہے۔ بین اقوامی تجارت اور سرمایہ کاری کو منظم اور منضبط کرنے کے سلسلے میں بین اقوامی زر کی بڑی اہمیت ہے اور چوں کہ بین اقوامی تجارت ہر قوم کے معیارِ زندگی پر اثر ڈالتی ہے اس لیے بین اقوامی سکوں کے تبادلے سے اور اُس کے قاعدوں اور شرائط سے تمام مُلکوں کے مفاد گہرے طور پر وابستہ ہیں۔

جولائی ۱۹۴۴ء میں بریٹن ووڈس کے مقام پر تمام اتحادی قوموں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں بین اقوامی زر فنڈ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کام کو سرانجام دینے کے لیے اُسے وجود میں لایا گیا ہے اُس سے متعلق تمام اختیارات اور ذرائع اُسے مہیا کیے گئے ہیں۔ اس فنڈ کا ایک مقصد یہ ہے کہ بین اقوامی تبادلۂ زر میں استحکام اور استقلال پیدا کیا جائے یعنی ایک ملک کے زر کی قیمت کو دوسرے مُلک کے زر کی قیمت کے مقابلے میں بہت زیادہ گرنے یا چڑھنے سے روکا جائے

اس لیے کہ اس سے سکوں کی قیمت غیر یقینی ہو جاتی ہو اور تاجر دوسرے ملکوں سے عام اور پُرامن طریقے سے خرید و فروخت نہیں کر سکتے۔ ایسی صورتِ حال میں سٹے بازوں کی بھی بن آتی ہو جس سے اور بھی زر کی قیمت کے سلسلے میں اعتبار اور یقین نہیں رہتا۔

فنڈ کا ایک اور مقصد یہ ہو کہ مختلف ملکوں میں سکوں کی قیمت گھٹانے کا جو مقابلہ ہوتا ہو اُسے روکا جائے۔ کوئی ملک غیر ملکی خریدار کے لیے اپنے سکّے کی قیمت نہ گھٹائے، اس لیے کہ ایسی حالت میں یہ ہوتا ہو کہ اپنے سکّے کی قیمت کو گھٹانے والا ملک دوسرے ملک کے اُتنے ہی یا اُس سے کم زر کے تبادلے میں اپنا زر زیادہ دیتا ہو۔ اس طرح مصنوعی طور پر دوسرے ملک کے بازاروں میں سکّے کی قیمت گھٹانے والے ملک کے مال کی قیمت کم ہو جاتی ہو اور وہ زیادہ بکتا ہو۔ اپنے ملک کے مال کو زیادہ تعداد اور مقدار میں بیچنے کے لیے جب بہت سے ملک یہ مصنوعی طریقہ اختیار کرتے ہیں اور ان کا آپس میں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع ہوتا ہو تو اس کا نتیجہ بہت خراب نکلتا ہو۔ یعنی سکوں کی قیمتوں کے گھٹنے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہو اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو مال و اسباب اور خدمات کی آمد و رفت آسانی کے ساتھ اور بلا کسی رکاوٹ کے نہیں ہو سکتی۔

فنڈ کا ایک مقصد یہ بھی ہو کہ متعدد ملکوں کے درمیان مال و اسباب کی قیمتوں کی ادائیگی کی ہمّت افزائی کر کے بین اقوامی تجارت کی توسیع و ترقی میں مدد دے، اور اس طرح فنڈ کے ممبروں کی غیر ملکی تجارت میں قرض اور دین کا جو بہت زیادہ فرق ہو اس کو ختم کرنے کی کوشش کرے۔

فنڈ ۸ ارب ۸۰ کروڑ ڈالر کے سرمایے سے اپنا کام شروع کرے گا۔ اس میں سے ۲ ارب ۷۵ کروڑ ڈالر ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے آئیں گے، ۱ ارب ۳۰ کروڑ ڈالر برطانیہ سے، ۱ ارب ۲۰ کروڑ ڈالر سوویت یونین سے، ۵۵ کروڑ ڈالر چین سے، ۴۵ کروڑ ڈالر فرانس سے اور ۴۰ کروڑ ڈالر ہندستان سے۔ ہر ملک اپنے کوٹے کا چوتھائی حصہ سونے کی شکل میں ادا کرے گا اور بقیہ اپنے رائج سکّے کی شکل میں۔ ہر ممبر ملک کے سکّے کی شرح تبادلہ سونے اور ڈالر میں ظاہر کی جائے گی۔ ہر ملک کو اختیار ہوگا کہ اپنے سکّے کی شرح تبادلہ دس فی صدی تک گھٹا سکتا ہو۔ لیکن اگر وہ اپنے بنیادی عدم توازن کو دُور کرنے کے لیے مزید دس فی صدی گھٹانا چاہتا ہو تو اسے فنڈ کے دوسرے ممبر ملکوں سے اجازت لینی پڑے گی۔ فنڈ کا خاص کام یہ ہوگا کہ فنڈ میں شامل ملکوں کے سکّے خریدے اور ایک دوسرے کے ہاتھ بیچے اس شرط کے ساتھ کہ کسی ملک کا وہ سکّہ جو فنڈ کے پاس ہو اُس ملک کے کوٹے کے ۲۰۰ فی صدی سے زیادہ نہ ہو۔

اگر ایسی صورت پیدا ہو کہ جس غیر ملکی سکّے کا مطالبہ کیا جا رہا ہو وہ کافی مقدار میں فنڈ کے پاس موجود نہیں ہو تو فنڈ یہ اعلان کر دے گا کہ وہ مخصوص سکّہ ناکافی ہو۔ پھر وہ اُس ناکافی سکّے کو ضرورت مند ممبر ملکوں میں منصفانہ طور پر تقسیم کر دے گا اور جن ملکوں کو کمی کا سامنا ہو ان کو حق ہوگا کہ توازن کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے تبادلے اور تجارت پر پابندیاں عائد کریں۔

فنڈ کی اسکیم یہ ہے کہ اصل بین الاقوامی زر اور پُرانے معیار طلا کے درمیان ایک قسم کا سمجھوتہ پیدا کیا جائے یہ فنڈ گویا اس شاہ راہ کی ایک درمیانی منزل ہے جو ہمیں اُس بین الاقوامی زر کی طرف لے جاتی ہے، جو قوموں کے اجتماعی خلوص اور رضامندی کی بنیاد پر قائم ہوگا۔

اس فنڈ کا انتظام گورنروں کے ایک بورڈ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ یہ بورڈ پانچ سال کے لیے فنڈ کے ممبر ملکوں کے ذریعے مقرر ہوگا۔ روس، فرانس، امریکہ، برطانیہ اور چین کو ڈائرکٹروں کے بورڈ میں دائمی نشستیں دی گئی ہیں۔ دوسرے ممبر ملک اگر دائمی نشست حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں ووٹ کے ذریعے نشست دی جائے گی۔ دوسرے ممبروں کے لیے الکشن میں حصہ لینا ضروری ہوگا۔ ہر ممبر ملک کو ۲۵۰ ووٹ دینے کا حق ہوگا۔ اس کے بعد اپنے کوٹے کے ہر ایک لاکھ ڈالر کے حساب سے اس کو مزید ووٹ حاصل ہوں گے۔

جہاں تک فنڈ میں دُنیا کے مُلکوں کی نمایندگی کا سوال ہے شروع شروع میں اس میں ۴۴ ملک شامل تھے یعنی وہی مُلک جن کے نمایندے بریٹن ووڈس کانفرنس میں موجود تھے۔ اس طرح اُس وقت جو ملک غیر جانب دار تھے یا جن کے خلاف جنگ جاری تھی وہ نہیں شامل تھے جیسے ترکی اور اسپین اور جرمنی اور جاپان وغیرہ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب تک دنیا کی تمام معاشی وحدتیں فنڈ کے دائرے میں نہ آجائیں گی اُس وقت تک اُسے پوُرے طور پر نمایندہ انجمن نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کے سب سے بڑے پانچ مُلکوں میں روس نے شامل ہونے سے انکار کر دیا، اور اگرچہ اسکیم کے تحت ان ملکوں کو بھی فنڈ میں شامل ہونے کی اجازت ہے جو کانفرنس میں موجود نہیں تھے لیکن خرابی یہ ہے کہ فنڈ نے کسی مُلک کے داخلے کے لیے صاف صاف شرطیں نہیں بنائی ہیں۔ بہتر ہوتا کہ داخلے کی شرطیں بالکل متعین اور طے کر لی جاتیں تاکہ اس میں زیادہ سے زیادہ مُلک شریک ہو سکتے۔

اس اسکیم کا وجود میں آنا گویا ڈالر ڈپلومیسی کی فتح ہے۔ یہ ادارہ امریکہ اور برطانیہ کے زیر اثر اور زیر قابو ہے، ہر قوم کے ووٹ دینے کی طاقت اور فنڈ کے امور انتظامیہ میں اس کا حصہ اُس کے کوٹے کے مطابق ہے۔ امریکہ کا کوٹا برطانیہ اور روس کے متحدہ کوٹے سے بھی زیادہ ہے۔ ساتھ ہی امریکہ کا کوٹا برطانیہ اور اس کے مقبوضات اور ہندستان کے متحدہ کوٹے سے زیادہ ہے، حال آں کہ ہندستان اور چین کی آبادی ملا کر تقریباً پوُری دنیا کی آبادی کے نصف کے برابر ہے۔ ووٹ دینے کے حق کو کوٹے کی کمی وبیشی سے ملا دیا گیا ہے یہ ٹھیک نہیں، اس لیے کہ بین الاقوامی فنڈ کوئی جوائنٹ اسٹاک بنک یا تجارتی کارپوریشن تو ہے نہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ انصاف اور مساوات کے اصول کا زیادہ خیال کیا جاتا۔ ووٹوں کی غیر مساوی تقسیم کی وجہ سے تینوں بڑی طاقتوں کو بہت زیادہ اختیارات مل جاتے ہیں، ایسی صورتِ حال میں وہ فنڈ کی اکثریت کی خواہش کو ٹھکرا سکتے

ہیں اور ایسی تجویزوں کو بھی رد کر سکتے ہیں جنھیں بقیہ ملکوں کی حمایت اور تائید حاصل ہے۔

اب ہم ہندستان کے بین اقوامی زرفنڈ میں شریک ہونے کے مسئلے سے بحث کریں گے۔ ہندستان کی رائے عامہ یہ تسلیم کرتی ہے کہ زرفنڈ میں شریک ہونا مفید ہے لیکن کچھ شرطوں کے ساتھ۔ برٹین ووڈس کانفرنس میں ہندستان کے نمایندوں نے وہ شرطیں تسلیم کرانے کی کوشش کی لیکن ناکامیابی ہوئی۔ ہندستان کے نمایندوں نے یہ سوال اٹھایا کہ ہندستان کا اسٹرلنگ قرضہ جو برطانیہ پر عائد ہوتا ہے اُسے بین اقوامی زرفنڈ کے حیطۂ اختیار میں لایا جائے لیکن برطانیہ کی طرف سے یہ اعتراضات پیش کئے گئے کہ اسٹرلنگ قرضے کی رقم ۱۲ ارب ڈالر ہے لیکن فنڈ اپنا کام صرف ۸ ارب ڈالر سے شروع کرے گا اس لیے فنڈ کا اسٹرلنگ قرضے کے سوال سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ ہندستانی نمایندے نے سمجھوتے کے لیے بعد میں یہ مطالبہ پیش کیا کہ اگر پورا اسٹرلنگ قرضہ نہیں تو اس کا کچھ حصہ ضرور بین اقوامی زرفنڈ کے حیطۂ اختیار میں لایا جائے مگر خود لارڈ کینز[1] کی مخالفت نے اس تجویز کو بھی مسترد کرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان کا اسٹرلنگ قرضہ صرف ہندستان اور برطانیہ کا معاملہ ہو کر رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال میں ہندستان گھاٹے میں رہے گا اس لیے کہ برطانیہ سے کسی بھی گفت و شنید میں ہندستان کو اپنی سیاسی اور معاشی محکومی کی وجہ سے لازمی طور پر دبنا پڑے گا۔ ہندستان کے لیے چندے کا جو کوٹا مقرر کیا گیا ہے اس میں بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ پھر کوٹے کی رقم کے لحاظ سے ووٹ کا حق عطا کیا جانا بھی ہندستان کے حق میں مفید نہیں ہے۔ ہندستان کو شروع میں چھٹی پوزیشن دی گئی اس کا بھی ہندستان کی رائے عامہ پر خراب اثر پڑا۔ اب بہرحال اس سلسلے میں صورتِ حال مختلف ہے۔ اس لیے کہ روس کے شامل ہونے سے انکار کے بعد ہندستان پانچویں پوزیشن میں ہے۔ مارچ میں زرفنڈ کے ڈائرکٹروں کے بورڈ میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں اُن کی رو سے اگر روس شامل ہو گیا تو بھی ہندستان کی پوزیشن بورڈ میں برقرار رہے گی اس لیے کہ ڈائرکٹروں کی تعداد بڑھا کر ۱۳ کر دی جائے گی۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہندستان کے معاشی اور مالیاتی حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ بین اقوامی زرفنڈ میں شریک ہونا ہندستان کے لیے آگے چل کر مفید ہوگا۔ اس سلسلے میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں وہ یہ ہیں۔ فنڈ کی رکنیت سے ہندستان کی معاشی پالیسی کی آزادی خطرے میں نہیں پڑتی اور اپنے غیر ملکی مبادلے میں بھی وہ بدستور خود مختار رہتا ہے۔ پھر زرفنڈ میں شامل ہونے سے ہندستان کو زر اور مبادلے کے بین اقوامی مسائل کے طے کرنے میں حصہ لینے کا موقع ملے گا، ہندستان ڈالر قرضہ حاصل کر سکے گا اور اسے اسٹرلنگ قرضے کو ڈالر کی شکل میں وصول کرنے کا موقع دست یاب ہوگا۔ زرفنڈ کی رکنیت ایسی صورت میں بھی ہندستان کے کام آسکتی ہے کہ آگے چل کر اُسے بین اقوامی تجارت میں گھاٹے کا سامنا ہو۔ اسٹرلنگ

---

[1] لارڈ کینز کا گزشتہ مارچ میں انتقال ہو گیا۔

قرضے کے سلسلے میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگرچہ اُسے بین اقوامی زر فنڈ کے حیطۂ اختیار میں نہیں لایا گیا ہے لیکن اس کی بنا پر فنڈ میں شرکت سے انکار کرنا غلط ہے۔ اسٹرلنگ قرضے کی وصولی کے لیے بھی ہندستان کی جدوجہد جاری رہے گی۔ اور ہندستان بین اقوامی زر فنڈ میں شریک ہو کر بھی اپنے مفاد کو آگے بڑھانے کی کوشش کرے گا۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے ہندستان کی طرف سے زر فنڈ میں شمولیت کا اعلان کر دیا اس لیے کہ امریکی اعلان کے مطابق ۳۱ر دسمبر کے بعد ہندستان زر فنڈ کا بلا واسطہ رکن نہیں بن سکتا تھا۔ بالواسطہ رکنیت کی صورت میں ہندستان کے کچھ خاص فائدوں سے محروم ہو جانے کا ڈر تھا۔ بہرحال ہندستان کو یہ اختیار رہا کہ وہ جب چاہے زر فنڈ سے علاحدگی اختیار کرے۔ لیکن جب ۲۸ر جنوری ۱۹۴۶ء کو نئی مرکزی اسمبلی میں وزیر مالیات نے یہ سوال اُٹھایا کہ مرکزی اسمبلی حکومتِ ہند کی اس حکمت عملی کی تصدیق کرے تو اسمبلی نے حکومت ہند کی گزشتہ کارروائی کی سخت مذمت کی اس لیے کہ سابق وزیر مالیات سر جیریمی رائسمین کے وعدے کے باوجود فنڈ کی رکنیت کا اعلان کرنے سے پہلے مرکزی اسمبلی سے مشورہ نہیں لیا گیا اور اُسے اکتوبر ۱۹۴۵ء میں برخاست کر دیا گیا۔ اسمبلی نے سر آرچی بالڈ اے، رولینڈز کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی کہ اس مسئلے پر غور و خوض کر کے اپنے فیصلے سے مطلع کرے۔ ۲۶ر فروری ۱۹۴۶ء کو کمیٹی نے اپنی رائے پیش کر دی۔ کمیٹی کا فیصلہ مختصر طور پر یہ ہے: کمیٹی وزیر مالیات ہند کے اس بیان کی پوری پوری تائید کرتی ہے کہ ہندستان پر ۷ر دسمبر ۱۹۴۵ء کے اینگلو امریکی قرضہ معاہدے سے کوئی پابندی نہیں عائد ہوتی۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ زر فنڈ اور بینک میں شریک ہونے سے ہندستان کو فائدہ ہوگا یا نقصان اس کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ اسٹرلنگ قرضے کے سلسلے میں ہندستان اور برطانیہ کے مابین کیا بات طے پاتی ہے۔ کمیٹی کی رائے ہے کہ اگر برطانیہ اور ہندستان کے درمیان اسٹرلنگ قرضے کی گفت و شنید میں تاخیر کی گئی تو ہندستان کو فنڈ سے علاحدگی اختیار کرنی پڑے گی اس لیے کہ ممکن ہے رکنیت برقرار رکھنے سے ہندستان پر ایسی ذمے داریاں عائد ہوں جن کا نباہنا اسٹرلنگ قرضے کی وصولی کے بغیر ناممکن ہو۔ پھر اگر اسٹرلنگ قرضے کی وصولی کے سلسلے میں برطانیہ کی تجویزیں ہندستان کے لیے ناقابلِ قبول ثابت ہوں گی تو بھی اُسے زر فنڈ سے علاحدگی اختیار کرنی پڑے گی۔ کمیٹی نے اس بات پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا کہ اسٹرلنگ قرضے کی تنسیخ کے خوف کو دُور کرنے کے لیے حکومت برطانیہ نے ایک باقاعدہ اعلان کرنا مناسب سمجھا اور اس سے متعلق گفت و شنید کے لیے تاریخ کا تعین کیا۔ وزیر مالیات ہند نے بھی اس بات کا یقین دلایا کہ ریزرو بینک آف انڈیا کے دفعہ ۴۰ اور ۴۱ کی اب ترمیم کر دی جائے گی جن کے تحت ریزرو بینک ابھی تک رُپے کے نوٹ الشیوع کرتا رہا ہے اور اُن کے

عوض میں اسٹرلنگ جمع ہوتا رہا ہو۔ کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی کہ کمیٹی کے عوض خوض کے بغیر حکومت ہند زر فنڈ کے سلسلے میں کسی قسم کی مالی ذمے داری نہ قبول کرے۔ کمیٹی نے اس بات پر زور دیا کہ ریزرو بینک کے دفعات کی جلد از جلد ترمیم کرکے حکومت اسٹرلنگ کا اضافہ فوراً روک دے۔

غرض زر فنڈ میں ہندستان کے شریک رہنے کا انحصار اس بات پر ہو کہ آیا اسٹرلنگ قرضے کے سلسلے میں ہندستان اور برطانیہ کے درمیان کوئی ایسا سمجھوتا ہوتا ہو یا نہیں جو اوّل الذکر کے لیے قابل قبول ہو۔ ہندستان کے لیے اس میں شامل ہونا ضروری ہو تاکہ وہ اپنے جائز حقوق کے لیے لڑ سکے۔ تعاون نہ کرنے کی پالیسی مفید نہیں ہو لیکن فنڈ میں شامل ہونے سے ہندستان اپنے بہت سے موجودہ مسئلے حل کر سکتا ہو۔ بعد از جنگ کی معاشی توسیع و ترقی کے لیے بین اقوامی بنک سے اُسے غیر ملکی سکوں کی شکل میں سرمایہ مل سکتا ہو۔ ایک بار جب بریٹن ووڈس کی تجویز عمل میں کامیابی کے ساتھ آجائے گی تو آج جو غیر ملکی زر کی اتنی رکاوٹیں ہیں وہ دُور ہو جائیں گی۔

اگر ہم فنڈ میں شریک ہو جائیں تو ہندستانی سکے یعنی رُپے کا سونے سے تعلق قائم ہو جائے گا۔ آج کل رُپیہ اسٹرلنگ سے وابستہ ہو اور دونوں کے درمیان مصنوعی طور پر ایک شلنگ ۶ پنس شرح تبادلہ رکھی گئی ہو۔ اس طرح اسٹرلنگ کا غیر مستحکم ہونا خود ہماری معیشت میں بالکل غیر ضروری طور پر بے ثباتی اور بے استقلالی پیدا کرتا ہو۔ رُپے اور اسٹرلنگ کا یہ تعلق ہمارے لیے بدقسمتی کا باعث ہو، لیکن اگر ہم بین اقوامی زر فنڈ میں شریک ہو جائیں تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس کے بعد رُپے کی قیمت سونے کی نسبت سے ظاہر ہوگی۔ اس کے علاوہ ہندستان مدت سے رُپے کی قیمت گھٹانے کے لیے احتجاج کرتا رہا ہو اور اس بات کے حق میں زبردست رائے پائی جاتی ہو کہ اسٹرلنگ سے رُپے کی نسبت ایک شلنگ ۶ پنس کی بجائے ایک شلنگ ۴ پنس رکھی جائے۔ بین اقوامی زر فنڈ میں شریک ہو جانے کے بعد ہندستان کو موقع ملے گا کہ ایک شلنگ ۴ پنس شرح منوانے کی کوشش کرے اور اگر مناسب طریقے سے اس بات کی کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ فنڈ ہندستان کو رُپے کی شرح تبادلہ گھٹانے کے موقع سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دے ۔ تمام وہ ممالک جن سے ہندستان کا تعلق ہو فنڈ میں شامل ہو گئے ہیں۔ چناں چہ ہندستان کا نہ شامل ہونا مناسب نہیں ہوگا۔

ہندستان ہمیشہ سے ایک معقول بین اقوامی تنظیم کا حامی رہا ہو —————— ایسی تنظیم جس کی بنیاد انصاف پر قائم ہو اور جس سے سب کو فائدہ پہنچنے کی امید ہو، جس سے کم زور قوموں پر طاقت ور قوموں کی لوٹ کھسوٹ اور استحصال ختم ہو جائے اور کم زور قوموں کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ بین الاقوامی زندگی میں مساوات کے اصول کو اور بھی زیادہ اہمیت دی جاتی ۔ عالم گیر جنگ عظیم کے پیغمبروں کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ خوش حالی کوئی محدود چیز نہیں ہے کہ اس کی تقسیم سے اس کے گھٹ جانے یا ختم ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو۔ خوش حالی تو ایسی چیز ہے کہ جتنا ہی زیادہ دوسری قومیں اس سے متمتع اور منفعت اندوز ہوں گی اتنا ہی ہر قوم کو خوش حالی نصیب ہوگی ۔ ہر قوم کی معاشی زندگی عالم گیر معیشت سے بندھی اور گتھی ہوئی ہے، چناں چہ کوئی بھی قوم ساری دنیا سے علاحدگی کی پالیسی نہیں اختیار کر سکتی —— بین اقوامی تعاون اور اشتراکِ عمل کی ایسی پالیسی جو انصاف اور مساوات پر مبنی ہو اور جس میں غیر ترقی یافتہ قوموں کے مفاد کا خیال رکھا گیا ہو —— ایسی ہی پالیسی دنیا میں کام یاب و کام ران ہو سکتی ہے۔

——— ❋ ———

نظری معاشیات

قومی آمدنی کیا ہی؟

از : ——— خلیق احمد نقوی

اس مضمون میں ہم قومی آمدنی کے مفہوم کو سمجھانے کی کوشش کریں گے ۔ آج کل قومی آمدنی کی تعریف اور اس کا تخمینہ اور اندازہ کرنے کے مسئلے کو بہت اہمیت دی جارہی ہی ۔ خوش حالی کی معاشیات (ECONOMICS OF WELFARE) کی اہمیت بڑھنے سے معاشیین اس مسئلے میں بہت دلچسپی لینے لگے ہیں ۔ قومی آمدنی کیا ہی؟ کسی ملک کی قومی آمدنی کتنی ہی؟ اسے معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہی؟ کھانے، کپڑے اور مکانات وغیرہ کے کس حصّے کو قومی آمدنی میں شامل کیا جائے؟ اس مضمون میں انھی سوالوں کا جواب دیا جائے گا ۔ اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہی کہ کسی ملک کی خوش حالی کا دار و مدار اس ملک کی قومی آمدنی پر ہی ۔ اگر ہندستان کی قومی آمدنی کم ہی (اور اس کی تقسیم کا طریقہ غلط اور نامنصفانہ ہی) تو ہم کبھی خوش حال نہیں رہ سکتے ۔ ظاہر ہی کہ جب قومی آمدنی کو اتنی اہمیت حاصل ہی تو ہمیں اس کے مفہوم کو وضاحت سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔

شاید آپ کہیں کہ اس میں کیا رکھا ہی ۔ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہی کہ آمدنی کیا ہی ۔ آمدنی کے مفہوم پر بحث کرنا تو بال کی کھال نکالنا ہی ۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ روزمرہ کی بات چیت میں جب ہم آمدنی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہمارا مطلب زرِ والی آمدنی سے ہوتا ہی ۔ کسی کی آمدنی سو روپے ماہوار ہی، کسی کی پانچ سو روپے ماہوار ۔ لیکن اس زرِ والی آمدنی کی بہت کم اہمیت ہی ۔ یہ ایک مثال سے آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہی ۔ جنگ سے پہلے عام طور پر مزدوروں کو آٹھ آنے روز اجرت ملتی تھی ۔ آج کل ان کی اجرت ایک روپیہ

ملا ڈیڑھ روپیہ روز ہو۔ کیا اس کا یہ مطلب ہو کہ وہ پہلے سے زیادہ خوش حال ہیں؟ ہرگز نہیں۔ چوں کہ غلہ، کپڑے اور دوسری ضروریات
زندگی کی قیمت تقریباً چار سو فی صدی بڑھ گئی ہو اس لیے جنگ سے پہلے جتنی چیزیں آٹھ آنے میں خریدی جاسکتی تھیں اُن سے
بہت کم آج کل ڈیڑھ روپے میں خریدی جاسکتی ہیں۔ مختصر یہ کہ کسی شخص کی زروالی آمدنی کی اہمیت بہت کم ہو۔ جو بات اہم ہو وہ یہ کہ
آخر اس زروالی آمدنی سے کتنی چیزیں خریدی جاسکتی ہیں۔ معاشیات کی اصطلاحی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ زروالی آمدنی اہم نہیں
ہو بلکہ اصل آمدنی۔

اب سوال یہ ہو کہ اصل آمدنی کیا ہو؟ مارشل نے اس کا جواب یوں دیا ہو "ملک کی محنت اور سرمایہ مل کر قدرتی وسائل کے
ذریعے سال بھر میں جو اجناس، مادی یا غیر مادی اور جو ہر طرح کی خدمتیں پیدا کرتا ہو اُن کی مجموعی شکل کو ہم اصل قومی آمدنی یا ملک
کی آمدنی یا قومی مقسوم کہتے ہیں۔" فشر کا نظریہ اس سے کچھ مختلف ہو۔ اس کا خیال ہو کہ قومی مقسوم ہم صرف ان اشیا اور خدمات
کو کہہ سکتے ہیں جو سال بھر میں صرف ہوں۔ لیکن زیادہ تر معاشیین، جن میں خوش حالی کی معاشیات کی روح رواں پروفیسر پیگو
بھی شامل ہیں، مارشل سے متفق ہیں اور کسی خاص عرصے میں کسی ملک میں جتنی اشیا اور خدمات پیدا ہوتی ہیں ان کی خالص شکل
کو اس ملک کی قومی آمدنی تسلیم کرتے ہیں۔

لفظ 'خالص' کی یہ اہمیت ہو کہ ہم اصل آمدنی معلوم کرتے وقت کسی چیز کو دوبارہ نہ شمار کریں۔ مثلاً آپ زراعتی صنعت کی اصل
آمدنی کا شمار کر رہے ہیں، ممکن ہو آپ سال بھر کے پیدا کیے ہوئے گیہوں، جو، بھوسا، دودھ، گوشت اور دوسری چیزوں
کا شمار کرلیں۔ اس میں غلطی یہ ہو کہ بہت سا بھوسا، کربی اور جو وغیرہ ان جانوروں نے کھایا ہو جن سے آپ کو گوشت اور دودھ
ملا ہو۔ جب آپ نے گوشت اور دودھ کا شمار کرلیا تو آپ کو ان چیزوں کا شمار نہ کرنا چاہیے جنھیں کھا کر یہ جانور آپ کو دودھ اور
گوشت دینے کے قابل ہوئے۔ اسی طرح اگر آپ سال بھر میں پیدا کی ہوئی ڈبل روٹیاں، بسکٹ اور کیک شمار کریں تو آپ کو اس
گیہوں کا شمار نہ کرنا چاہیے جس سے یہ بسکٹ وغیرہ بنے ہیں۔ 'خالص' لفظ کی یہی اہمیت ہو۔ ایک صنعت سے پیدا کی ہوئی سال بھر
کی خام پیداوار اصل آمدنی میں شامل نہیں ہوتی، اُس میں سے وہ حصہ گھٹا دینا چاہیے جو اس صنعت کو دوسری صنعتوں سے ملا ہو۔

اس بات کی ایک اور اہمیت ہو جسے ہم اکثر بھول جاتے ہیں۔ یہ تو ہر شخص کی سمجھ میں آجاتا ہو کہ بسکٹ میں جو گیہوں استعمال ہوا
ہو وہ بسکٹ کا ہی حصہ ہو کیوں کہ یہ گیہوں بسکٹ میں شامل رہتا ہو۔ لیکن اکثر ایک صنعت کی پیداوار دوسری صنعت میں کس طرح
استعمال ہوتی ہو اس کا سمجھنا اتنا آسان نہیں ہو۔ آپ ملک کے کپڑے کی پیداوار کو لیجیے۔ ظاہر ہو کہ سوت کا استعمال کپڑے بنانے
میں اسی طرح ہوا جیسے گیہوں کا بسکٹ میں۔ لیکن کیا ہمیں اس مشین کو بھول جانا چاہیے جو اس کپڑے کے بنانے میں استعمال ہوئی؟
ہر سال کپڑے بنانے میں مشین گھستی ہو۔ استعمال کی ہوئی مشین بھی کپڑے میں اسی طرح شامل ہو جس طرح سوت۔ مان لیجیے کہ

ایک سال میں ایک ہزار مشینیں گھس گئیں۔ دوبارہ شمار کے خطرے سے بچنے کے لیے ہمیں اس سال کی پیداکی ہوئی مشینوں میں سے ایک ہزار مشینیں گھٹا دینی چاہییں تاکہ خالص آمدنی معلوم ہوسکے۔

اسی بات کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہو کہ خام پیداوار میں سے سرمایے کو قائم رکھ کر جو کچھ باقی بچتا ہو وہ خالص اصل آمدنی ہو۔ اگر (ا) مشینیں، (ب) خام اجناس اور (ج) دوسری اشیا سال کے شروع میں موجود تھیں تو سال کے آخر کی پیداوار میں سے ان تینوں مقداروں کو گھٹا کر اصل قومی آمدنی معلوم کی جاسکتی ہو۔ جتنے سرمایے سے کاروبار شروع ہوا تھا اسے قائم رہنا چاہیے۔ یہاں اس سے غرض نہیں ہو کہ اگلے سال اُسی سرمایے سے کاروبار شروع ہوگا یا اس میں کمی بیشی ہوگی۔ مقصد صرف یہ ہو کہ سال کے سرمایے کو آمدنی میں نہیں شامل کرلینا چاہیے۔

یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہیے۔ اگر کسی بیرونی حادثے مثلاً زلزلے یا دشمن کے حملے سے کچھ مشینیں تباہ ہوجائیں تو اسے ہم نقصان سرمایہ (CAPITAL LOSS) کہتے ہیں۔ اس نقصان کو خالص قومی آمدنی سے نہ گھٹانا چاہیے ورنہ عجیب و غریب نتائج نکلیں گے۔ جس سال زلزلہ آئے گا یا جنگ تو ہم کہیں گے کہ اس سال آمدنی نفی ہوئی ہو! ہاں ان نقصانات کو ضرور شامل کرنا چاہیے جو ذرائع پیداوار کو تیار رکھنے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اکثر مشینوں کے بے کار پڑے رہنے کی وجہ سے ان میں زنگ لگ جاتا ہو، کارخانے کی چھت گرنے سے مشین خراب ہوجاتی ہو یا آگ لگ جاتی ہو۔ ان نقصانات کو سرمایے میں اس لیے نہیں شامل کیا جاتا کہ استعمال کرنے کے لیے مشینیں تیار رکھنے میں یہ حادثات لازمی ہیں، چاہے ہم انھیں استعمال کر رہے ہوں یا نہ کر رہے ہوں۔ حادثے کے ان نقصانات کو خام آمدنی میں سے گھٹا کر خالص اصل آمدنی معلوم کرنی چاہیے۔ اسی طرح اگر کسی علاقے میں ہر تیسرے مہینے باقاعدگی سے زلزلہ آتا ہو تو یہ نقصان بھی قیمت پیدایش کا حصہ ہوگا اور اسے کل آمدنی میں سے گھٹانا پڑے گا۔

اس سلسلے میں ایک اور بات اہم ہو۔ مزدوروں کی محنت کو قائم رکھنے کے لیے غذا اور کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہو۔ اس سے مزدوروں کی خرچ کی ہوئی قوتِ محنت پھر واپس آجاتی ہو۔ کیا ہم اسے بھی کل آمدنی سے اسی طرح گھٹا دیں جیسے ہم مشین کے گھسنے کی مقدار کو کل آمدنی میں سے گھٹا دیتے ہیں؟ یہ گھٹا دینے سے تو مجموعی آمدنی بہت کم رہ جائے گی۔ عام طور پر معاشیین اسے نہیں گھٹاتے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہو کہ انسان کی محنت کے استعمال ہونے اور اُسے پھر سے پیدا کرنے کے لیے غذا کی جو ضرورت ہوتی ہو وہ ایک بالکل مختلف چیز ہو۔ یہ محنت پیدایش کے وسیلے کی طرح نہیں استعمال ہوتی بلکہ استعمال کرنے کے لیے تیار رکھی گئی ہو۔ اگر ہم اس خرچ کا بھی شمار کرنا چاہیں تو نقصانِ سرمایے میں شمار کرنا چاہیے کیوں کہ اس کا آمدنی سے کوئی تعلق نہیں۔ پروفیسر پگو کا خیال ہو کہ لوگ جو غذا وغیرہ استعمال کرتے ہیں، اُسے خالص آمدنی جوڑتے وقت خام

آمدنی سے نہیں گھٹانا چاہیے اگرچہ وہ نقصان سے بچاتا ہے۔ دوسرا نظریہ (جو میرے خیال میں زیادہ صحیح ہے) یہ ہے کہ مزدوروں کی محنت کسی پیدا کی ہوئی شے کا اسی طرح ایک حصہ ہے جیسے خام جنس یا گھِسی ہوئی مشین۔ جب کپڑا پیدا ہوتا ہے تو اس میں روئی مشین اور محنت تینوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اگر ہم محنت کو نہ گھٹائیں گے تو ہم دوبارہ شمار کی غلطی کے مرتکب ہوں گے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اب تک جو آمدنی معلوم کرنے کا طریقہ ہے وہ پہلے نظریے کے مطابق ہے۔

ایک اور بات غور طلب ہے۔ جب بہترین قسم کی مشینیں ایجاد ہو جاتی ہیں تو فرسودہ مشینیں بے کار ہو جاتی ہیں یا فیشن بدل جانے سے ایک خاص قسم کی مشینوں کی پیدا کی ہوئی چیزوں کی مانگ ختم ہو جاتی ہے اور ان کا استعمال ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں مشینیں گھستی نہیں ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ مسلّم موجود ہیں لیکن ان کی قدر کم ہو گئی ہے۔ یہی بات کان اور ان کے ذخیروں کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ یہ ذخیرہ ان کا چالو سرمایہ ہے۔ جب سرمایے کا ایک حصہ تبدیل نہیں ہوتا مگر اس کی قدر گر جاتی ہے تو کیا ہمیں کُل آمدنی سے یہ حصہ نکال کر مجموعی آمدنی معلوم کرنی چاہیے؟ اصولی طریقے پر تو ہمیں اس وقت تک مشینوں کو مکمل سمجھنا چاہیے جب تک کہ وہ جسمانی طریقے سے سالم رہیں اور فرسودہ مشینوں کو کُل آمدنی سے اس وقت گھٹانا چاہیے جب وہ بالکل مستعمل نہ رہیں۔ ہم انھیں صرف اس وقت ختم شدہ مان سکتے ہیں جب ان کا استعمال ختم ہو جائے۔ معاشیین میں اس بارے میں کافی اختلاف ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جس بات میں آسانی محسوس ہو وہی کرنی چاہیے۔

آمدنی کی تعریف کے بارے میں ایک بات اور یاد رکھنی چاہیے۔ ہم نے اصل آمدنی ان خالص اشیا اور خدمات کو بتایا ہے جو کسی خاص عرصے میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس میں ذرا تبدیلی کی ضرورت ہے۔ رواج یہ ہو گیا ہے کہ ہم سب اشیا اور خدمات کے مجموعے کو نہیں بلکہ صرف اس کے ایک حصے کو شامل کرتے ہیں ——— صرف وہ حصہ جس کی ادائیگی زر سے ہوتی ہے یا جسے زر کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہم ان خدمات کو چھوڑ دیتے ہیں جو ایک خاندان کے لوگ یا دوست ایک دوسرے کے لیے مفت کرتے ہیں یا کسی فرد کے کپڑے یا کرسیاں میزیں اس کی خدمت کرتی ہیں اور اسی قسم کی دوسری خدمتیں بھی شامل نہیں ہوتیں۔ اگر ہم ان چیزوں کو بھی شامل کر لیں تو اصل آمدنی زر والی آمدنی سے بہت زیادہ ہو جائے گی۔ لیکن ہم آسانی کے لیے خالص زر والی آمدنی کو خالص اصل آمدنی کے برابر رکھ کر یہ کہتے ہیں کہ خالص زر والی آمدنی خالص اصل آمدنی کی قدر یا قیمت ہے۔

اس مضمون میں قومی آمدنی کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اور اس کی تعریف کے سلسلے میں جو باتیں پیدا کی گئی ہیں، ممکن ہے آپ انھیں سمع خراشی سمجھیں لیکن اگر سارے ملک کی خوش حالی کا معیار معلوم کرنا ہے تو اس قسم کی تشریح کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر ہم اپنے ملک کو خوش حال بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ملک کی قومی آمدنی کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہیے۔

صنعت:

شکر سازی کی صنعت

از: ——— ابوسالم، ایم۔اے (علیگ)

سر آر دیشر دلال سابق پلاننگ ممبر نے ۱۹۴۵ء کے وسط میں مختلف صنعتوں کے مسائل کی چھان بین کے لیے کچھ صنعتی پینل مقرر کیے تھے۔ ان کا کام یہ طے پایا تھا کہ وہ مختلف صنعتوں کی ترقی اور توسیع کا ایک پروگرام بنائیں۔ صنعتوں کے مسائل کی کماحقہ تحقیق و تفتیش کے لیے غالباً یہ ضروری سمجھا گیا تھا کہ ان کمیٹیوں میں ایسے نمایندوں کی اکثریت ہو جو اس مخصوص صنعت سے اچھی طرح واقف ہوں اور عملی تجربہ رکھتے ہوں۔ اسی اصول پر ان میں ایسے لوگوں کی اکثریت رکھی گئی تھی جن کا مفاد پہلے ہی سے ان صنعتوں سے وابستہ تھا۔ یہ بات ایک حد تک صحیح بھی تھی کہ صنعتوں کے اندرونی مسائل اور دقتوں سے باہر کے لوگوں کے لیے پوری واقفیت حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن اس انتظام سے ایک خطرے کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا وہ یہ کہ ایسے لوگوں کے اپنے مخصوص مفاد بھی ہو سکتے تھے، اور یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ان کے شخصی یا طبقے وارانہ مفاد اور ملک کے وسیع تر قومی مفاد میں تصادم کی صورت میں وہ اپنے طبقے وارانہ مفاد کو، شعوری یا غیر شعوری طور پر ترجیح دے سکتے تھے اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ برطانوی حکومت نے اپنی ان صنعتوں کی از سرِ نو تعمیر کے لیے پروگرام بنانے یا تجویز یا مرتب کرنے کے لیے جو کمیٹیاں بنائی تھیں ان میں مالکوں اور مزدوروں کی مساوی تعداد رکھی تھی اور ساتھ ہی اتنے ہی آزاد لوگ بھی کمیٹی میں رکھے گئے تھے۔ یہ طرزِ عمل بھی اعتراض سے بری نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں اس بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے کہ مالکوں اور مزدوروں کے متضاد مفاد کو ہم آہنگ کرنے میں آزاد ممبروں کے رہتے ہوئے بھی غلط فیصلے کیے جائیں جن سے

اصل اور بنیادی مسئلے نہ حل ہوسکیں۔ دراصل یہ دونوں طریقے اس لیے اختیار کیے گئے کہ حکومت کے مکمل اقتدار اور بالکل آزاد ذاتی ملکیت کے درمیان کوئی سمجھوتے کا راستہ نکالا جائے اور نتائج نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حکومت ان میں سے کسی بھی صورت میں آخری فیصلے کرنے کے تکلیف دہ فرض سے سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ ملک کے وسیع تر قومی مفاد کا پورا پورا خیال رکھنے کے لیے حکومت کو ان دونوں قسم کی کمیٹیوں کی سفارشات پر کڑی نگرانی رکھنی ہوگی اور ان کی پوری چھان بین کرنی ہوگی۔

سر آر دیشیر نے جو پینل مقرر کیے تھے ان میں سے ایک کے ذمے شکر سازی کی صنعت کے مسائل کی چھان بین اور ایک پنج سالہ پروگرام مرتب کرنے کا کام سپرد کیا گیا تھا۔ شکر سازی کی صنعت ہندستان کی دوسری سب سے بڑی صنعت ہے۔ اس سے کم و بیش ۲۵ لاکھ افراد کو بہ راہ راست اور اتنے ہی آدمیوں کو بالواسطہ روزی نصیب ہوتی ہے۔ ہمارے موجودہ شکر کے کارخانوں میں کم و بیش ۳۳ کروڑ کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ شکر اور گڑ کی جو مقدار ملک میں پیدا ہوتی ہے اس کی سالانہ قیمت ایک سو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ ان وجوہ سے اس کی اہمیت پر زور دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پھر اس لحاظ سے بھی کہ شکر غذا کا ایک اہم جز ہے اور ملک کے لیے اگر صحت بخش اور متوازن غذا کی فراہمی کی اسکیم بنائی جائے تو ناگزیر طور پر اس اسکیم میں شکر کی پیداوار کو نمایاں جگہ دینی پڑے گی، اس صنعت کے لیے نئے حالات کے مطابق توسیع و ترقی کا ایک پروگرام مرتب کرنا بہت ضروری تھا۔ شکر کی غذائی اہمیت کے باوجود یہ تعجب کی بات ہے کہ ملک میں صحت بخش غذا کے مسائل کی تحقیق کرنے والے اداروں نے یہ اندازہ لگانے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے کہ اس نقطۂ نظر سے ملک کو کتنی شکر کی ضرورت ہوگی؟ موجودہ پیداوار اس مقصد کے لیے کافی ہے یا نہیں اور اگر مزید رسد ضروری ہے تو اس کی مقدار کتنی ہونی چاہیے؟ چوں کہ ہمارے پاس یہ تخمینے موجود نہیں ہیں اس لیے ہمارے لیے ایک ہی راستہ ہے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہندستان کی پوزیشن کیا ہے؟ ہندستان دنیا میں شکر سازی کے لحاظ سے اہم ترین ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں شکر کا فی کس خرچ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ مثلاً انگلستان میں شکر کا فی کس خرچ ۱۰۷ پونڈ ہے، آسٹریلیا میں ۱۱۶ پونڈ اور امریکہ میں ۹۷ پونڈ۔ اس کے مقابلے میں ہندستان میں فی کس خرچ محض ۲۴ پونڈ ہے (اس میں گڑ کا استعمال بھی شامل ہے)۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کے اندر ابھی ہندستان میں شکر سازی کی صنعت کے پھیلنے اور بڑھنے کی بہت گنجائش ہے ہندستانی عوام کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ابھی شکر کی پیداوار میں بہت کافی اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ملک کے بعض حلقوں کا یہ خیال ہے کہ چھ سات سال میں اگر شکر کی پیداوار دوگنی اور تین گنی بھی ہوگئی تو بھی ملک کی ضروریات کے پیش نظر اس بڑھی ہوئی پیداوار کے فروخت ہونے میں کوئی ناقابلِ عبور رکاوٹ نہیں پیش آئے گی۔ ایسا سوچنے میں

بہت سے وہ لوگ بھی شامل ہیں جو شکر سازی کی صنعت سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ پینل نے جنگ سے پہلے کی پیداوار پر [illegible] اضافہ تجویز کیا ہے۔ اگر اول الذکر اندازہ مبالغہ آمیز ہے تو ثانی الذکر تجویز بہت ناکافی۔ جنگ کے دوران میں شکر کی مانگ جنگ سے پہلے کے مقابلے میں کم سے کم تو ۵۰ فی صدی بڑھ گئی ہے۔ حکومت کے ایک ذمّے دار افسر نے اپنے ایک بیان میں بتایا ہے کہ شہروں میں مزدوروں کی مانگ میں ۷۰ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے اور ان اندازوں کی صحت پر کسی شبہے کا اظہار نہیں کیا گیا ہے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ۲۵ فی صدی کا اضافہ تجویز کرنے میں پینل نے قلت کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے بہتات کو نہیں۔ اس تجویز کے ناکافی ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۳-۴۴ء میں شکر کی پیداوار ۱۲،۱۶،۴۸،۰۰ ٹن تھی۔ پینل کی تجویز کے مطابق آیندہ پانچ سال کے بعد یہ پیداوار بڑھ کر محض ۱۶ لاکھ ٹن ہوگی۔ اور اس پیداوار سے ہم اپنے شہروں کی آبادی کے لیے ۲۴ پونڈ فی کس اور باقی آبادی کے لیے محض ۶ پونڈ فی کس شکر فراہم کرسکیں گے! یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ شہر کی تعریف میں کم سے کم آبادی کی قید ۲۰۰۰ ہے اور ہمارے ملک کی آبادی کی بھاری اکثریت اس سے بھی چھوٹے قصبوں اور گاؤں میں رہتی ہے۔ پینل کی اس تجویز پر ایک حلقے میں سخت اعتراضات کیے گئے اور شکر ہے کہ ان اعتراضات کی ایک حد تک شنوائی بھی ہوگئی۔ حکومت ہند نے آیندہ پانچ سال کے لیے شکر کی پیداوار میں ۱۸ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن کا اضافہ تجویز کیا ہے۔

لیکن اس پروگرام پر عمل کرنے کی موجودہ رفتار ہمت شکن حد تک سست ہے۔ حکومت نے ابھی ۱۶ لاکھ ٹن کے اضافے کے لیے نئے کارخانے قائم کرنے کی اجازت دی ہے۔ ۲۵۰۰۰۰ ٹن کے لیے مزید ۲۵ کارخانوں کے قیام پر ابھی غور و فکر سے آگے بڑھنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔ لیکن پیداوار میں اضافے کی ایک صورت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ ملوں کی قوت پیدائش میں اضافہ کیا جائے۔ پینل نے تجویز کیا ہے کہ وہ ملیں جن کی موجودہ قوت پیدائش ۸۰۰ ٹن روزانہ سے کم ہے اپنی پیداوار (؟) بڑھائیں۔ یہ تسلیم کر لینے کے باوجود کہ ۸۰۰ ٹن سے کم صلاحیت رکھنے والی ملوں کا پیدائش کا صرفہ بہت زیادہ ہوگا پینل کے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ان ملوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی کارکردگی میں اضافے کی خاطر جلد از جلد اصلاح کریں۔ موجودہ حالات میں چھوٹے سائز کی ملوں کی تعداد بہت کافی ہے۔ اگر ان کی قوت پیدائش میں ضروری اضافہ ہو جائے تو شکر کی پیداوار میں ۲ لاکھ ٹن کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ ان ملوں کی راہ میں نہ معلوم وہ کون سی ناقابل حل دقتیں ہیں جن کی بنا پر پینل اس بات پر مطمئن ہوگیا ہے کہ ان میں سے صرف ۵۰ ہی فی صدی اپنے کارخانوں کی صلاحیت میں اضافہ کریں۔ معاشیات کے اصولوں کے مطابق قیمتوں کا تعین بہت زیادہ اخراجات پیدائش رکھنے والے کارخانوں سے ہوتا ہے۔ اگر ایسی ملوں کو ارادۃً باقی رکھا گیا تو اس سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ زیادہ اونچی قیمتیں رکھ کر زیادہ نفع کمانے کا مقصد کام کر رہا ہے۔ نیتوں سے قطع نظر بھی یہ تجویز بہت قابل اعتراض ہے۔ شکر سازی کی صنعت کو بہت کافی عرصے سے حفاظتی محصولوں کا سہارا ملا ہوا ہے۔ یہ سہارا آیندہ بھی ملے گا۔ یہ

ضروری بھی ہے۔ لیکن عوام پر جب اس حفاظتی محصول کا بوجھ لگایا جائے تو اس بات کا بھی خیال رکھا جانے کہ آخر وہ بڑھی ہوئی قیمتیں کب تک ادا اور برداشت کرتے رہیں گے۔ حفاظتی محصولوں کے سہارے سے فائدہ اٹھا کر ملوں کو اپنے مصارف پیداوار کو زیادہ سے زیادہ گھٹانا چاہیے تاکہ وہ کم سے کم ملک کے اندر غیر ملکی مال کے مقابلے میں اپنا مال کم داموں پر فروخت کر سکیں۔ خود پینل کی رائے میں ہم ابھی ترقی کی اس منزل پر نہیں پہنچ سکے ہیں کہ اپنی شکر سازی کی صنعت سے بھی یہ توقع کر سکیں۔ پھر آخر یہ تجویز کس بنیاد پر جائز کہی جاسکتی ہے؟ اس سلسلے میں برسبیل تذکرہ ایک اور اہم سوال سے بھی بحث کر لینا مناسب ہوگا۔ ہندستان کی معاشی ترقی کے لیے اور اس کے بعد بھی ہمیں بیرونی سکوں کی ضرورت پڑے گی۔ موجودہ جنگ سے پہلے ہم یہ بیرونی سکے جن چیزوں کی برآمد سے حاصل کرتے تھے جنگ کے دوران میں ان کی مقدار پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ اگر ہماری اہم ترین برآمدی اشیا کے لیے غیر ملکوں میں جو مانگ کی کمی ہے وہ برقرار رہی تو ضرورت ہے کہ ہم ان اشیا کا بدل تلاش کریں، اور دوسرے ممالک کو ایسی اشیا فراہم کریں جن کی مانگ زیادہ ہو تاکہ اس طرح ہماری اپنی درآمدی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ شکر بدل بن سکتی ہے۔ جنگ کے دوران میں جاوا وغیرہ کے جاپانی چنگل میں پھنس جانے کے بعد مشرق قریب اور مشرقی افریقہ وغیرہ ملکوں میں ہندستان سے شکر جانے لگی تھی۔ اگر ہم یہ بازار جنگ کے بعد بھی اپنے قابو میں رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں غیر ملکی شکر سازی کی صنعتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ اس حیثیت سے بھی شکر سازی کی صنعت کی کارکردگی میں اضافہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن پینل صنعت کی موجودہ حالت پر شاکر ہو گیا ہے۔ اس کے نزدیک ہماری صنعتی کارکردگی مستقبل قریب میں غیر ملکی صنعت کی ہم پلہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے برآمدی تجارت میں شکر سے آس لگانا فضول ہے۔ چناں چہ اسی خیال کے پیش نظر پینل نے برآمدی تجارت کے لیے جو مقدار مقرر کی ہے وہ محض ۵ ہزار ٹن ہے حال آں کہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں ہندستان سے ۹۲ ہزار ٹن شکر برآمد کی گئی تھی۔ یہ قلیل مقدار بھی دراصل بیرونی تجارت میں حصہ لینے کی خاطر نہیں رکھی گئی ہے بلکہ اس خیال سے کہ آیندہ کسی سال اگر اتفاقی طور پر کچھ شکر فاضل پیدا ہو جائے تو اسے برآمد کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اس سلسلے میں ایک راہ عمل تجویز کی گئی ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ پینل نے تجویز کیا ہے کہ شکر پر ایک معمولی سا ٹیکس لگایا جائے تاکہ اس سے برآمد کرنے والی ملوں کے نقصانات کی تلافی ہو سکے۔ اس لیے کہ بیرونی ملوں سے کارگزاری میں پیچھے ہونے کی وجہ سے یہ نقصان یقیناً ہوگا۔

پیداوار کی مقدار کا تعین اور کارگزاری کے اضافے کے علاوہ کچھ اور بھی اہم مسائل ہیں جن سے پینل نے اپنی رپورٹ میں بحث کی ہے۔ حکومت نے پینل کے ذمے یہ معلوم کرنے کا بھی کام دیا تھا کہ آیا موجودہ حالات میں شکر سازی کی صنعت کسی ایک ہی علاقے میں بہت زیادہ پھیل گئی ہے اور اگر ایسا ہی ہے تو کیا اس رجحان کو بدلنے کی ضرورت ہے؟ یہ مسئلہ بہت

اہم یہ ہے اب سے پہلے صنعتوں کے جغرافیائی محلِ وقوع کا سوال صنعتوں کے بانیوں کا انفرادی معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ خیال یہ تھا کہ ذاتی منافع کا خیال ان سے خود بہترین مقام کے انتخاب کرائے گا۔ لیکن کا نقطۂ نظر اس سے مختلف ہے۔ اب یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ یہ سوال کہ کون سی صنعت کہاں شروع ہو محض ذاتی طور پر چند افراد کے مفاد کا سوال نہیں ہے۔ معاشی زندگی کے اور مسائل کی طرح یہاں بھی انفرادی اور سماجی مفاد میں تضاد ہو سکتا ہے اور ایسی صورت میں سماجی مفاد کی حفاظت کے لیے ریاست کی مداخلت ضروری ہے۔ ہمیں صنعتوں کے محلِ وقوع کا تعین کرنے میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ طاقت اور معاشی دولت کی جغرافیائی تقسیم بھی منصفانہ ہو۔ اس لیے ضرورت یہ ہے کہ صنعتوں کا ایک مناسب حصہ ہر صوبے کے ہاتھ آئے۔ افسوس یہ ہے کہ پینل نے اپنے اس کام کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا۔ رپوٹ میں ایک پرانی بات دہرائی گئی ہے کہ شکر سازی کی صنعت یو پی اور بہار میں مرکوز ہے۔ لیکن سوال یہ نہیں تھا۔ شکر سازی کی صنعت سے جسے تھوڑی بہت بھی واقفیت ہوگی وہ اس حقیقت یا واقعے سے بے خبر نہیں ہوگا۔ سوال تو یہ تھا کہ کیا قوم و ملک کے وسیع تر مفاد کے پیشِ نظر یو پی اور بہار میں شکر سازی کی صنعت کا اس طرح مرکوز ہو جانا مناسب ہے؟ اگر نہیں تو اس رجحان کو بدل دینے کے لیے کتنی سماجی محنت جائز ہے؟ یعنی ملک کے معاشی ذرائع کا کتنا حصہ اس صنعت کو دوسرے علاقوں میں پھیلانے کے لیے استعمال کرنا مناسب ہوگا۔ پینل نے ان سوالات سے کما حقہٗ بحث نہیں کی ہے، اس نے اتنا کہہ دینا کافی سمجھا کہ صنعتوں کو مختلف صوبوں میں "پھیلانے" کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس فیصلے کے پیشِ نظر انھوں نے تجویز کیا ہے کہ نئے کارخانوں کے قیام کے وقت یو پی اور بہار کو مزید کارخانے قائم کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ لیکن انھوں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی تجویز کیا ہے کہ اگر نئے علاقے دو سال کے اندر اندر کارخانے کھولنے کی اجازت سے فائدہ نہ اٹھا سکیں تو پھر یو پی اور بہار کو نئے کارخانے کھولنے کی اجازت دے دینی چاہیے، کیوں کہ ان صوبوں میں ابھی اس صنعت کی توسیع کے امکانات بہت کافی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس فیصلے پر عمل نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ پینل کی رائے اس معاملے میں قطعی اور فیصلہ کن نہیں سمجھی جا سکتی۔ انھوں نے اس مسئلے کے سارے پہلو سامنے نہیں رکھے ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی تجویزوں پر نظرِ ثانی کی جائے اور سارے متعلقہ مسائل کی پوری چھان بین کے بعد کوئی ایسی راہِ عمل اختیار کی جائے جو ملک کے مفاد کے لیے سب سے مناسب ہو۔

اوپر ہم نے صنعتی کارگزاری کے معاملے میں پینل کی تجویزوں کے ناکافی ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن شکر سازی کی صنعت کے زرعی مسائل کا جہاں تک تعلق ہے ان کے سلسلے میں پینل پر وہ الزام صادق نہیں آتا۔ شکر سازی کے مجموعی مصارف میں ۵۲ فی صدی گنے کے مصارف کا حصہ ہوتا ہے، اسی لیے اس صنعت کے متعلق لکھنے والوں نے

ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہو کہ گنے کی کاشت کے مصارف کو کم کرنا چاہیے ، ساتھ ہی گنے کو بہتر بنانے کی بھی کوشش ہونی چاہیے ۔ پینل نے سستی چینی کی فراہمی پر زور دیا ہو اس لیے اس کے لیے بھی زرعی مسائل پر غور کرنا ناگزیر تھا ۔ باوجود اس ضرورت کے احساس کے جس کی تاریخ کافی پرانی ہو گنے کی کاشت کو بہتر بنانے کی جو کوششیں اب تک کی گئی ہیں وہ اطمینان بخش نہیں ہیں ۔ گنے کے زیرِ کاشت جتنی زمین ہو اس کے تقریباً ایک چوتھائی حصے پر بھی اچھے گنے نہیں بوئے جاتے ۔ اسی طرح گنے میں کا جز بھی اور ممالک کے مقابلے میں کم ہوتا ہو۔ چناں چہ یہاں شکر کا تناسب جاوا وغیرہ کے مقابلے میں کم ہو۔ گنے کی فی ایکڑ پیداوار بھی ابھی بڑھائی جاسکتی ہو ۔ اس لیے بجا طور پر یہ سفارش کی گئی ہو کہ مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں اور ہندستانی گنے کی کمیٹی کے باہمی تعاون سے اس رفتار کو تیز تر کرنا چاہیے ۔ ری سرچ کی اہمیت سے انکار کیے بغیر یہ کہا جاسکتا ہو کہ ہمارے ملک کی یہ بھی ایک بدقسمتی ہو ۔ ہمارے ہاں زرعی ری سرچ کے بڑے بڑے ادارے ہیں لیکن ان کی تحقیق اور ان کی تحقیق کے نتائج کسان کے کھیت تک پہنچنے نہیں پاتے ، اس لیے پینل کا یہ فیصلہ بھی قابلِ تعریف ہو کہ کوئی ایسا انتظام کیا جائے جس کے تحت گنے کی کاشت کرنے والوں کو ان کے اپنے کھیت پر جا کر مناسب ہدایتیں دی جاسکیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر مناسب مقامات پر نمونے کے فارم کھولے جائیں جہاں کم و بیش انھی حالات کے ماتحت جن سے معمولی کسان کو سابقہ پڑتا ہو یا کم سے کم انھی سہولتوں کے ساتھ جو کسان کو بھی بہم پہنچائی جاسکتی ہیں ، گنے کی کاشت کے بہتر نتائج کسان اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس کی مثال سے فائدہ اٹھائیں گے ۔

گنے کی رسد کا ایک اور پہلو بھی ہو ، شکر کی ملوں کو ضروری مقدار میں گنا باقاعدگی کے ساتھ ملتا رہے ۔ اس بات کا انتظام کرنا ضروری ہو ۔ بعض حلقوں میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہو کہ ملوں کو خود گنے کی کاشت کا حق دے دینا چاہیے ۔ ممکن ہو صنعت کے اپنے نقطۂ نظر سے یہ بات بہت نفع بخش ہو لیکن ہم اس سوال کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ کسانوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے گنا ایک اہم نقدی لانے والی پیداوار ہو ۔ اس لیے ہم اس رائے کی حمایت نہیں کر سکتے ۔ لیکن اس کے ساتھ گنے کی باقاعدہ رسد کا ہر ممکن انتظام کرنا بھی ضروری ہو ۔

صنعتی کارگزاری کے نقطۂ نظر سے ابھی ایک اور سوال باقی رہ جاتا ہو اور وہ ہو ہماری موجودہ ملوں کا سامان ۔ اس سوال کے متعلق پینل نے تقریباً سکوت اختیار کر لیا ہو ۔ رپوٹ میں کہا گیا ہو کہ نئی مشینوں کی خرید اور پرانی مشینوں کو الگ کرنے کا کام جنگ کی وجہ سے بالکل بھلا دیا گیا ہو ۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا ہو کہ اس کام کے لیے کتنی رقم کی ضرورت ہوگی اور نہ یہ اندازہ لگایا گیا ہو کہ موجودہ کارخانوں کے سامان کا کتنا حصہ پرانا اور بے کار ہو چکا ہو اور کتنے عرصے میں یہ کام پورا ہو جانا چاہیے ؟

پٹیل کی رائے میں شکر سازی کی صنعت پر حکومت کے انتظام یا ملکیت کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ سوال پٹیل کے فیصلہ کرنے کا نہیں تھا۔ اس کا دارومدار حکومت کی معاشی پالیسی پر ہی کہ ہم سرمایہ دارانہ نظام کو باقی رکھنا بلکہ فروغ دینا چاہتے ہیں یا اپنی معاشی زندگی کی اشتراکیت کی بنیادوں پر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان بڑے سوالوں سے یہاں بحث کرنا ممکن نہیں۔ مگر چند واضح مقاصد کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہی۔ یہ مقاصد اتنے اہم ہیں کہ اوپر ان کا ذکر کر چکنے کے بعد بھی ہم ان کو یہاں پر دُہرا سکتے ہیں۔ حکومت کا فرض ہی کہ وہ شکر کی صنعت کو اس بات پر مجبور کرے کہ کم سے کم داموں پر ملک کو ضرورت بھر شکر مہیا کرے۔ پٹیل کی تجویزوں پر ہم ایک نظر ڈال چکے ہیں۔ ہم نے دیکھ لیا ہی کہ اس معاملے میں انھوں نے کوئی اطمینان بخش پروگرام مرتب نہیں کیا ہی۔ اس لیے ضرورت ہی کہ حکومت خود اس خامی کو پورا کرے۔ سستے داموں پر شکر کی فراہمی کے سلسلے میں اس بات کی بھی ضرورت ہوگی کہ شکر کی فروخت کے موجودہ انتظام پر بھی ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی جائے اور پھر اس سلسلے میں کوئی بہتر اور زیادہ اطمینان بخش انتظام کیا جائے۔

مگر ان مسائل کا فیصلہ جلد ہونا چاہیے۔ ہم اپنی موجودہ معاشی پسماندگی کے حالات میں کچھوے کی چال نہیں چل سکتے۔ ملک کے سیاسی حالات میں جو تبدیلی ہوئی ہی اس سے ہم یہی توقع کر سکتے ہیں کہ کم از کم اس سلسلے میں ہماری رفتار تیز ہو سکے گی۔ دوسری نئی صنعتوں کے قیام میں ایک بڑی دقت جس سے ملک کو دوچار ہونا پڑ رہا ہی۔ یہ ہی کہ اشیائے اصل (CAPITAL GOODS) کی کمی ہی۔ شکر سازی کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے جن مشینوں کی ضرورت ہی وہ بہ آسانی خود ہندستان میں بن سکتی ہیں۔ ضرورت ہی کہ اس اہم کام کی طرف جلد از جلد توجہ کی جائے۔

———— ✻ ————

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

ہندستان میں بندوبست آراضی کا ارتقا

از : ——— حمیدہ سراج ایم - اے - بی - ٹی (علیگ)

کسی زرعی ملک کی صحیح معاشی تنظیم کے سلسلے میں بندوبست آراضی (LAND SETTLEMENT) کا مسئلہ اہم ترین حیثیت رکھتا ہی۔ ہر ملک میں سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ معاشی نظام کی کمزوریوں کا احساس پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ ہندستان کا جمود بھی ٹوٹ رہا ہی اور اگر ایک طرف ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برطانوی سامراج کے خلاف آگ لگی ہوئی ہی تو دوسری طرف ملک کی ان اندرونی قوتوں کے خلاف جو عوام کی فلاح و بہبودی کی راہ میں حائل ہیں صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہی۔ یہ خیال کہ زمین کی قوتِ پیدائش کی کمی کی وجہ اور کسان طبقے کی خستہ حالی و مفلسی کی ذمہ داری بہت حد تک ہمارے ناقص بندوبست اراضی پر ہی، پختہ سے پختہ تر ہوتا جا رہا ہی۔ پرانے بندوبستِ آراضی کو بدلنے کے سلسلے میں موجودہ صوبجاتی حکومتوں کی قراردادیں بیک وقت اسی کا اعلان و اقرار ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم ان حکومتوں کی کارروائیوں پر نگاہِ تنقید ڈالیں اور ان کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کوئی رائے قائم کریں سمجھ داری کا تقاضہ یہ ہی کہ ہم ان حالات و ضروریات پر ایک نظر ڈالیں جن سے اثر پزیر ہو کر یہ نظام وجود میں آیا اور دیکھیں کہ کس طرح یہ ہماری معاشی زندگی پر اثر انداز ہوا۔ ذیل کے سطور میں ہم قدیم زمانے سے لے کر اس وقت تک کے بندوبستِ آراضی کا جو نظام رہا ہی اس پر ایک اجمالی نگاہ ڈالیں گے۔

ہندستان کی تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ زراعت یہاں کا قدیم ترین اور مقدس ترین پیشہ ہی۔ قدیم ہند کے گاؤں میں

رہنے والے باشندے کھیتی باڑی کرکے اپنا پیٹ پالتے تھے یہی اُن کا اصل اور خاص پیشہ تھا۔ زمین پر ذاتی ملکیت کا تصوّر یا زمین کو خرید و فروخت کی چیز سمجھنے کا خیال ان لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ہوا اور پانی کی طرح زمین کو بھی قدرت کا ایک ایسا عطیہ سمجھا جاتا تھا جس کی حق دار ساری مخلوق یکساں طور پر تھی۔ یعنی زمین لین دین کی چیز نہیں تھی بلکہ ایک سماجی ملکیت۔

حکم راں کا اولین فرض کاشت کار اور زراعت کی حفاظت تھا۔ اس ادائگیِ فرض کے عوض کاشت کار اپنی پیداوار کا ایک چھٹا حصہ حکم راں کو دیتا تھا یہ حصہ 'دلی' کہلاتا تھا۔ زمین پر اپنی ذاتی ملکیت کا احساس اس وقت تک حکمراں کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا۔

ویدک عہد کے بعد برہما کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ سماج کے مختلف شعبوں میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ انسان کی زندگی نے پیچیدگیاں اختیار کرنی شروع کر دیں۔ لیکن جہاں تک کاشت کار اور اس کی مزروعہ زمین کا تعلق ہے کسی قسم کے ردّ و بدل کا پتا نہیں چلتا۔ اس عہد کے مذہبی لٹریچر میں ایک جگہ ذکر ہے کہ حکم رانِ وقت نے اپنے کسی منظورِ نظر مصاحب کو زمین تحفتاً دینے کا ارادہ کیا۔ زمین سے آواز آئی "میری تقسیم کا حق کسی فانی انسان کو نہیں"۔ سینیالے بھی اشلوک کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے " حکم رانی سے مراد رعیت کی حفاظت ہے نہ کہ زمین پر ملکی حقوق"۔ منو کے الفاظ بھی انھی عقائد کی تائید کرتے ہیں۔ "کھیت کا جائز حق دار وہ ہے جو اسے بوتا جوتتا ہے"۔ یہ تھا ہندستان کے ابتدائی معاشی نظام کا نقشہ۔

زمانے نے کروٹ بدلی۔ زندگی کے پیچ و خم اور مشکل پسند انسانوں کے ہتھ کنڈوں سے تنگ آکر جمہوریت نے اپنی جگہ بادشاہت کو دے دی۔ حکم رانی کے عہدے نے موروثی صورت اختیار کی۔ زندگی نے سادگی سے کنارہ کشی اختیار کی، نئے نئے پیشوں، صنعت اور حرفت کا وجود ہوا۔ لیکن یہ تبدیلیاں دستورِ اراضی کے بنیادی اصولوں کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں۔ اور سماجی تبدیلیوں کا اثر نہیں پڑا۔ حکومت اور کاشت کار کے رشتے میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں پیدا ہوئی۔ کیوں کہ یہ احساس کہ تبدیلی عوام کی آسودگی کے منافی ہوگی کارفرما تھا۔ کاشت کاروں کی خوش حالی کا ثبوت میگس تھینس یوں دیتا ہے۔ " ہندستان کے باشندے قحط کے نام سے نابلد ہیں۔ اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا اگر امدادِ قحط کے اس تصوّر کا ذکر کر دیا جائے جس پر اس وقت کی حکومت عمل پیرا تھی۔ شاما شاستری نے کوتلیا کے ترجمے میں لکھا ہے۔ حکم راں کا فرض ہے کہ خشک سالی کے زمانے میں شاہی خزانے سے اور اپنے ذاتی سرمایے سے بیج و دیگر ضروری اشیا کی صورت میں کسان کی مدد کرے۔ علاوہ ازیں صرف اُن لوگوں پر ٹیکس لگائے جن کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت ہے"۔ ان تمام اقتباسات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے بندوبستِ آراضی کے تحت کاشت کاری پر ریاست کے دلی کا مطالبہ ان

فرائض و خدمات کی ادائگی کی بنا پر تھا جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہو نہ کہ زمین کی ذاتی ملکیت کے احساس پر۔

ہندو راج دھانیوں کے زوال پر مسلمان سلاطین کا عہد شروع ہوا۔ یہ صحیح ہو کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن کا ذخیرہ ساتھ لے کر آئے لیکن وہ ہندستان کی سیاسی معاشرتی اور معاشی روایتوں سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مخلوط تہذیب و تمدن کی بنیاد پڑی۔ اب دیکھنا یہ ہو کہ آیا ان سلاطین نے کاشت کاری کی روایاتِ قدیمہ کے ساتھ کیا رویہ برتا۔ اسلامی قوانین کا مطالعہ ثابت کرتا ہو کہ ہندستان کی ملکی کاشت کاری اور اسلامی اصولِ آراضی میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ دونوں قوانین زمین کی تجارت کو گناہ قرار دیتے تھے۔ لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اس سلسلے میں کسی قسم کے ردّ و بدل کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ امیر علی نے تاریخِ خلیفۂ راشدین میں لکھا ہو " حضرت عمرؓ نے فتح فارس کے بعد وہاں ایسے قوانین نافذ کیے جن کی رُو سے زمین کی خرید و فروخت کا رواج خلافِ قانون قرار دے دیا گیا تاکہ کاشت کار اپنے جائز حقوق سے فائدہ اُٹھا سکیں اور خوش حالی و اطمینان سے اپنی زندگی بسر کریں۔ یہ تھے وہ اسلامی اصول جنھیں لے کر مسلمان ہندستان میں داخل ہوئے اور انھی پر کاربند رہے۔

مسلمانوں کے دورانِ حکومت میں بندوبستِ آراضی کے متعلق تفصیلات حاصل کرنے کے لیے ہمیں تاریخ 'شیر شاہ' اور 'آئینِ اکبری' سے مدد لینی پڑے گی۔ سلطنت سرکاروں میں تقسیم تھی اور ہر سرکار پرگنوں میں۔ پرگنے میں دو حاکم ہوتے تھے ایک پر دیوانی کے فرائض کی ذمّے داری تھی دوسرے پر فوج داری قسمے کی۔ اول الذکر کو امین کہتے تھے وہ مزروعہ زمین کے رقبے اور قسموں کی جانچ کر کے پیداوار کا تخمینہ لگاتے تھے۔ اس پیداوار کا ایک تہائی حصہ شاہی خزانے میں داخل کیا جاتا تھا۔ ریاست کی مال گزاری ہر سال کی پیداوار کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ اس دقت سے بچنے کے لیے ٹوڈرمل نے دس سالہ پیداوار کا اوسط نکال کر نقد شرحیں لگادیں اور کاشت کار کو اختیار دے دیا کہ وہ اپنی مناسبت کے لحاظ سے خواہ نقد میں ادا کریں خواہ جنس میں۔ حکومت کے اس ایک تہائی کے مطالبے کو خراج کہا جاتا تھا یہ لگان کا مطالبہ نہ تھا۔ یہ امتیاز اپنی جگہ پر اہمیت کا حامل ہو۔

اس ٹیکس (خراج) کے عوض کاشت کار کو جو حقوق، آسانیاں و رعایتیں حاصل تھیں وہ بھی قابلِ غور ہیں۔ 'آئینِ اکبری' کے صفحات گواہ ہیں کہ ضرورت کے وقت حاجت مند کاشت کار کو شاہی گودام سے مُفت بیج دینے کا رواج عام تھا۔ شاہی خزانے سے کاشت کاروں کو قرض دینے کے سلسلے میں خاصی رقم ہر سال نکل جاتی تھی (واضح رہے کہ سود خواری اسلام میں حرام ہو)۔ چراگاہوں کے استعمال پر ٹیکس لگانے کا رواج نہیں تھا۔ ہر کسان کو چار بیل دو گائیں ایک بھینس رکھنے کی اجازت تھی۔ اس تعداد کے اضافے کی صورت میں ہر بھینس پر چھ دام اور ہر بیل پر تین دام

کا برائے نام ٹیکس لگادیا جاتا تھا۔ رعیت کے مقدمات کا فیصلہ بغیر کسی فیس کے ہوتا تھا۔ چوری کی صورت میں اگر کوتوال چور کا پتا نہ لگا سکتا تو اسے اپنی جیب سے مالِ مسروقہ کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ قحط کے اثرات کے انسداد کے لیے ہر بیگھہ زمین پر دہ سیری کا ٹیکس لگایا گیا تھا، تاکہ اس غلّے سے خشک سالی کے دوران میں شاہی باورچی خانے، لنگر خانے اور گودام کھولے جاسکیں جن سے مفلوک الحال کاشت کار مستفید ہوں۔

اکثر زمین داری کے علم بردار جاگیرداری سسٹم کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ زمین داری کی بنیاد مسلمان بادشاہوں نے رکھی، یہ خیال غلط ہے۔ جاگیرداری کا صحیح مفہوم مال گزاری کی وصولی کا حق تھا نہ کہ ملکیتِ آراضی۔ جاگیردار بہ جائے شاہی حاکموں کے خراج وصول کرتے تھے اور اس کے عوض میں انھیں شاہی خدمات انجام دینی پڑتی تھیں۔ انھیں کاشت کاروں کو بے دخل کرنے یا خراج کی مقررہ شرح بڑھانے گھٹانے کا حق نہ تھا۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس عہد میں بھی کاشت کاروں پر پریشانی و انحطاط کے دور گزرے اور وہ ان حوادث سے محفوظ نہ رہ سکے جنھوں نے شاہی خاندانوں کی بنیادیں ہلادیں۔ لیکن وہ عبوری دور تھا اور وقتی چیز۔ جہاں تک اس عہد کے اصول اور قوانین کا تعلق ہے جن پر عمل پیرا ہونے کا ہماری بدیسی سرکار کو دعوا ہے وہ کاشت کاروں کی فلاح و بہبودی اور آسودگی کے محافظ تھے نہ کہ ان کی مفلسی اور بدحالی کے ضامن۔

سلطنتِ مغلیہ کے زوال پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار بڑھا۔ ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم نے لارڈ کلائیو کو دیوانی یعنی بنگال کے محکمۂ مالیات کے افسرِ اعلا کا عہدہ عطا کیا۔ اب تشکیلِ بندوبست کی ذمے داری ہندستان کے نئے حاکموں کے ہاتھ میں آگئی۔ اس وقت کے نظام کی تفصیلات سے پوری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ان اصول و قواعد کی توضیح و تشریح ضروری ہے جو بندوبستِ آراضی کے سلسلے میں مغرب کے باشندوں کا قومی سرمایہ ہیں۔ عہدِ متوسط کے یورپ اور انگلستان کے معاشی نظام کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ سماج دو متضاد جماعتوں میں منقسم تھا اور درمیانی خلیج نفرت، ظلم اور بربریت سے پُر تھی۔ ایک طرف وہ طبقہ تھا جس کا مستقل پیشہ بے کاری ہے لیکن وہی تمام تر دنیاوی عشرت کا حق دار تھا، اس جنت کے لوگ آراضی کے مطلق العنان مالک تھے اور پیداوارِ زمین کے بلاشرکتِ غیرے طلب گار۔ یہ لارڈ کہلاتے تھے۔ دوسری طرف وہ طبقہ تھا جو دن رات خون پسینہ ایک کرکے مالکوں کی زمین جوتتا بوتا تھا پھر بھی پیٹ بھر روٹی کو ترستا تھا، وہ ذرائع پیداوار ہی سے محروم نہ تھے انھیں اپنی جسم و روح کی ملکیت بھی حاصل نہ تھی۔ ان کا شمار گائے اور بیلوں کی طرح مالک کی موروثی جائداد میں ہوتا تھا۔ وہ "سرف" (SERF) کہلاتے تھے۔ فاتح ولیم نے ۱۰۶۶ء میں اس قابلِ نفرت اور ننگِ انسانیت نظام کی بنیاد انگلستان میں رکھی۔ صنعتی انقلاب [illegible] اس کے

زہریلے اثرات اپنا رنگ دکھاتے رہے۔

یہ تھا بندوبست آراضی کا وہ خاکہ کہ جس کا تصور ذہن میں لے کر کمپنی کے ملازمین ہندستان میں داخل ہوئے۔ وہ تجارت کی غرض سے یہاں آئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنا ان کا حاصلِ زندگی تھا۔ دولت کی اس اندھی محبت کی بارگاہ میں اعلا ترین اصولوں کی قربانیاں بھینٹ چڑھائی گئیں۔ منو کا یہ عقیدہ کہ زمین کاشت کار کی ملکیت ہے ان کے حصولِ مقصد کی راہ میں حائل تھا۔ لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دیوانی حاصل کرنے کے بعد چھ سال تک تو کمپنی نے اس طرف سے بے توجہی برتی لیکن آخر کب تک ۱۷۷۲ء میں بندوبستِ آراضی کے اس مغربی ڈھانچے کی بنیاد ہندستان میں رکھی گئی۔ زمین کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے نیلامی بولیاں بولی جانے لگیں۔ زیادہ سے زیادہ مال گزاری ادا کرنے کا وعدہ کرنے والے کو زمین بارہ سال کے لیے سپرد کر دی جاتی۔ حکومت کے اس طرزِ عمل کا کاشت کاروں پر کیا اثر پڑا۔ تاریخ کے اوراق کھلے ہوئے ہیں ایک طرف عوام کی مفلسی اور غربت بڑھ رہی تھی، دیہی قرضے ہیں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہو رہا تھا۔ قحط اور خشک سالیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چھڑا ہوا تھا۔ زمین کی قوتِ پیدائش سرعت کے ساتھ گھٹ رہی تھی۔ دوسری طرف کمپنی کا خزانہ ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ مغل شہنشاہ کو اور ۳۲ لاکھ نواب بنگال کو پنشن کے طور پر دینے کے بعد بھی مالامال ہو رہا تھا۔ کلکتہ سے زر و جواہر سے لدے ہوئے جہاز آئے دن انگلستان کو روانہ ہو رہے تھے۔

کاشت کاروں کی خستہ حالی سے انگلستان کا ایک نیک دِل طبقہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے کمپنی کے خود غرضانہ اور ظالمانہ برتاؤ کے خلاف پارلیمنٹ میں آواز بلند کی۔ اس سلسلے میں برک کا نام قابلِ ذکر ہے۔ نیلامی نظام کے خلاف ایک تحریک اٹھی اور ۱۷۷۳ء میں لارڈ نارتھ ریگولیٹنگ ایکٹ پاس ہوا جس کے تحت بارہ سالہ بندوبست نے پنج سالہ بندوبست کی اور پنج سالہ نے ۱۷۷۷ء میں سالانہ بندوبست کی صورت اختیار کر لی۔ ان آئے دن کی تبدیلیوں سے حکام بھی عاجز تھے اور رعیت بھی پریشان۔ ۱۷۸۴ء میں "پٹس انڈیا ایکٹ" پاس ہوا جس کی رو سے کمپنی کو مال گزاری کے متعلق ایسے قوانین بنانے کی ہدایت کی گئی جو ہندستان کے قوانینِ قدیمہ سے ہم آہنگ ہوں اور رعیت اور جاگیرداروں کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کر سکیں یہ کام لارڈ کارنوالس کے سپرد ہوا۔ اس وقت تک انگریزوں کے قدم ہندستان میں جم نہیں سکے تھے۔ انھیں ہر لمحہ مخالفت اور بغاوت کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس وقت برطانیہ کو ہندستان میں ایک ایسے طبقے کی ضرورت تھی جو اس کے لیے چوکی داری کا کام انجام دے سکے، جو اس کی ہر جائز و ناجائز حرکت کی حمایت کر سکے۔ لارڈ کارنوالس کی دور بین نگاہوں نے اس ضرورت کو بھانپ لیا اور اس مصلحت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ۱۷۹۳ء میں بنگال میں استمراری بندوبست کی بنیاد رکھ دی گئی۔ زمینداری کو قانوناً [illegible] دے کر ہندستان کے ملکی کاشت کار کے پیدائشی حقوق ہمیشہ کے لیے چھین لیے گئے۔ اب اس کی حیثیت

ایسے آسامی کی ہوگئی جس کی ہستی و نیستی کا دارومدار ہر لحہ زمیں دار کے رحم و کرم کا محتاج ہو۔ مال گزاری کی رقمیں ہمیشہ کے لیے مقرر کردی گئیں۔ آگے چل کر حکومت نے محسوس کیا کہ اس بندوبست کے نقائص حکومت کے مفاد کی راہ میں حائل ہیں، یعنی بعض وقت زمین کی آمدنی کے بڑھ جانے کے باوجود سرکاری مال گزاری میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اس نقصان کو محسوس کرتے ہوئے لازمی طور پر نئے مقبوضات میں اس کا اجرا کچھ ترمیمات کے بعد ہوا۔

موجودہ بندوبستِ آراضی کو حکومت اور رعیت کے درمیانی تعلقات کا لحاظ کرتے ہوئے دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) زمیں داری۔ ہندستان کی مزروعہ آراضی کے انتالیس فی صدی حصّے پر یعنی ۱۴ کروڑ ایکڑ زمین پر یہ طریقہ رائج ہے۔ یہاں حکومت کی طرف سے زمین کو زمیں داروں کے سپرد کردیا گیا ہے۔ وہی مال گزاری کے دین دار ہیں۔ زمیں دار کاشت کے لیے آراضی کسانوں کے سپرد کردیتا ہے اور لگان وصول کرتا ہے۔ لگان اور مال گزاری کا درمیانی تفاوت زمیں دار کی آمدنی ہے۔ اجمالاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ زمیں داری کے تحت میں وہ صوبے اور مقبوضات آتے ہیں جہاں رعیت اور حکومت کے درمیان راست تعلق نہیں ہے اور زمیں دار درمیانی کڑی کا کام دیتا ہے۔ مزروعہ آراضی کے رقبے کا ۱۹ فی صدی حصّہ دوامی بندوبست کے تحت آتا ہے یہاں مال گزاری کی شرحیں ہمیشہ کے لیے معیّن ہیں۔ یہ اصول بنگال اور یوپی کے تعلقے داری رقبے میں کارفرما ہے۔ بقیہ ۲۰ فی صدی پر یعنی یوپی، بنگال اور بمبئی وسی پی، مدراس و پنجاب کی زمیں داری کے علاقوں میں عارضی بندوبست کی پابندی کی جاتی ہے۔ اور شرحِ مال گزاری میں ردّوبدل تخفیف و اضافے کے لیے بیس سے تیس سال تک کی میعاد مقرر ہے۔ سی پی کی مال گزاری سسٹم عارضی بندوبستِ زمیں داری ہی کی دُوسری شکل ہے۔

(۲) رعیت واری۔ برطانوی ہند کے مزروعہ رقبے کا ۵۱ فی صدی یعنی ۲۸ کروڑ پچاس لاکھ ایکڑ زمین رعیت واری تنظیم کے تحت آتی ہے۔ یہاں حکومت و رعیت کے تعلقات براہِ راست ہیں۔ وصولِ مال گزاری کی ذمّے داری سرکاری ملازمین پر ہے۔ زمیں داروں کے توسط کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ شرحِ لگان تیس یا بیس سال کے بعد از سرِ نو مقرر کی جاتی ہیں اور کاشت کار انفرادی حیثیت سے مال گزاری ادا کرنے کے ذمّے دار ہیں۔ مدراس و بمبئی کے علاقوں میں برار، سندھ اور آسام میں یہ طریقہ رائج ہے۔ شمالی ہند کے رعیت واری علاقے میں کُل زمین جو ایک جماعت کی متحدہ ملکیت ہو جمع بندی کی اکائی سمجھی جاتی ہے اور جماعت کا معتبر و بااثر شخص مال گزاری کی ادائیگی کا ذمّے دار سمجھا جاتا ہے۔ رعیت واری کی اس شکل کو محال داری کا نام دیا گیا ہے۔ یہ بندوبست ممالکِ متحدہ کے آگرہ ڈویژن اور پنجاب میں رائج ہے۔

یہ تنظیمی اختلافات محض سطحی اور نظری ہیں۔ حقائق پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ ثابت ہوگا کہ بندوبست کے وہ نقائص جن کا ہمارے کسان طبقے کے مسائل اور مشکلات سے قریبی تعلق ہے عام ہیں اور ہندستان کے ہر گوشے میں معاشی بنیادوں

کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ زرعی طبقے کے یہ مسائل اور مشکلات اقسام و تعداد میں بے شمار ہیں لیکن باوجود اس کثرت کے
کی وجہ پیدائش ایک ہی ہے اور وہ ہے ان کی مفلوک الحالی اور مفلسی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اس ضرب المثل غربت اور
میں کیا تعلق ہے آخرالذکر کی چند اہم ترین خامیوں کی وضاحت کافی ہوگی۔

(۱) بندوبستِ آراضی کا غیر مبتدل ہونا:۔ حصولِ مال گزاری کے اصول اور ضابطوں اور کاشت کار کی دشواریوں کے درمیان بہت کم مطابقت ہے۔ وہ حصولِ آمدنی کے لیے موسمی بارش جیسی ناقابلِ اعتماد شے کا آسرا لگائے بیٹھا رہتا ہے یہاں تک کہ ادائیگی لگان کی مقررہ تاریخیں اس کے سر پر آموجود ہوتی ہیں۔ تاریخ اپنی جگہ پر اٹل ہے لیکن کسان کی جیب خالی ہے۔ قانون کی آہنی گرفت سے بچنے کے لیے ساہوکار کے علاوہ تمام راستے وہ اپنے اوپر بند پاتا ہے بلکہ لگان میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔ تخفیف کی توقع اسی صورت میں کی جاسکتی ہے کہ پیداوار اوسط کے ایک چوتھائی سے بھی کم رہ گئی ہو۔ اس رعایت سے مستفید ہونے کے لیے ان پڑھ اور سیدھے سادے کسان کو ایسا پیچ راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے کہ اسے پچھتاتے ہی بنتی ہے۔ ماہرِ معاشیات کے تجربات و مشاہدات نے ثابت کیا ہے کہ موجودہ عہد میں وہی قرض کے اضافے کی ذمّے داری بہت حد تک ہمارے ناقص بندوبستِ آراضی پر ہے۔

(۲) شرحِ لگان و مال گزاری کی زیادتی:۔ بہ لحاظ حقیتِ آراضی اقسامِ آراضی اور اقسامِ بندوبست لگان اور مال گزاری کی شرحوں میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عارضی زمیں داری بندوبست کے تحت میں لگان کا پچاس فی صدی مطالبہ مال گزاری ہے۔ رعیت واری رقبے کے متعلق اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان مطالبات کا بوجھ کاشت کار کی قوتِ برداشت سے باہر ہے۔ کسان کی خستہ حالی کا تقاضا یہ ہے کہ حکومت جلد از جلد اس بوجھ کو ہلکا کرے کیوں کہ اس طبقے کی اکثریت کے زیرِ کاشت ایسے کھیت ہوتے ہیں جو خود کفیل نہیں ہیں جن سے کسان کی کفالت نہیں ہوتی۔ اور وہ بہ مشکل اس سے اتنا پیدا کر سکتے ہیں کہ گزر بسر کے لیے کافی ہو۔ اس کے علاوہ واقعات و حالات انھیں اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ زرعی پیداوار کی بڑھی ہوئی قیمتوں سے فائدہ اٹھاسکیں کیوں کہ عموماً ان کی فصلیں تیار ہونے سے پیشتر ہی ساہوکار کے ہاتھ بہت کم نرخ پر بک چکی ہوتی ہیں۔ ان مسائل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے لگان اور مال گزاری کی شرحوں میں تخفیف کا مطالبہ وقت کا مطالبہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس رجحان اضافے کی طرف ہے۔ رادھاکمل مکرجی کے خیال کے مطابق یوپی، بمبئی اور مدراس میں لگان اور مال گزاری کے مطالبات میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہو رہا ہے۔ ان صوبجات میں زرعی طبقے کی آمدنی میں بالترتیب ۳۰ و ۲۳ و ۶۰ فی صدی کے حساب سے اضافہ ہوا ہے اس کے مقابلے میں مال گزاری

کا اضافہ ۵۷ - ۵۰۵ اور ۲۲۰۶ فی صدی کے حساب سے ہوا ہے۔ بنگال اور دیگر صوبوں کے اعداد وشمار بھی اسی اندازے کی تائید کرتے ہیں۔ حکومت کا یہ غیر ہمدردانہ اور غیر منصفانہ برتاؤ انتہائی ناجائز ناعاقبت اندیشی پر مبنی ہے۔

(۴) حکومت اور رعیت کے تعلقات کی پیچیدگی:- یہ خصوصیت اسی رقبے تک محدود نہیں ہے جو زمیں داری بندوبست کے تحت ہے۔ زمین کو پٹے اور بٹائی پر اٹھانے کے طریقے نے رعیت واری رقبے میں بھی حکومت اور رعیت کے درمیان خلیج پیدا کر دی ہے۔ اور یہ خلیج روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ اعداد وشمار نے ثابت کر دیا ہے کہ بمبئی اور مدراس میں مزروعہ آراضی کا ۳۰ فی صدی حصہ اصل کاشت کار کے زیر کاشت نہیں ہے۔ حال ہی میں پنجاب میں لگان وصول کرنے والوں کی تعداد میں ۶۰۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰۰۰ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ممالک متحدہ اور صوبہ متوسط میں ان کی تعداد تقریباً دگنی ہو گئی ہے۔ استمراری بندوبست کے تحت آراضی کے متعلق اندازہ لگانے کے لیے سائمن کمیشن کے یہ الفاظ کافی ہیں "اکثر اضلاع میں کاشت کار اور زمیں دار کے درمیان پچاس سیڑھیاں قائم ہو گئی ہیں" زمیں داروں اور بچولیوں کی یہ بڑھتی ہوئی تعداد ناجائز طور پر کاشت کار کی محنت ومشقت سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اور جونک کی طرح اس کا خون چوس رہی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلے دس سال میں کسان تحریک سے متاثر ہو کر صوبجاتی حکومتوں نے ایسی کچھ کارروائیاں کی ہیں جن کا مقصد کاشت کاروں کی بہتری وبہبودی ہے۔ ان میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں۔ بنگال کا ٹینیسی ایکٹ سنہ ۱۹۳۸ء اس ایکٹ کی رو سے بقایا لگان پر شرح سود گھٹ کر ۶½ فی صدی رہ گئی ہے۔ اور زمیں دار سے لگان کی عدم ادائیگی کی صورت میں آراضی کو نیلام کروا لینے کا حق چھین لیا گیا۔

بہار ٹینیسی ایکٹ سنہ ۱۹۳۷ء - اس نے شرح لگان کو گھٹا دیا اور حکام کو غیر معمولی حالات میں ان مطالبات میں مزید کمی کرنے کا اختیار دیا۔ اس کے علاوہ جنس میں مال گزاری ادا کرنے کا طریقہ ممنوع قرار دیا گیا۔ صوبہ بمبئی کا "اسمال ہولڈر ریلیف ایکٹ" سنہ ۱۹۳۷ء اور بمبئی لینڈ ریونیو کوڈ سنہ ۱۹۳۹ء بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان قوانین کی رو سے اس کاشت کار کی بے دخلی خلافِ قانون قرار دے دی گئی جو پچھلے چھ سال سے کاشت کرتا چلا آرہا ہو، بہ شرطے کہ لگان کی ادائیگی کے سلسلے میں اس پر کوئی الزام نہ آتا ہو۔ اس کے علاوہ حکومت کو قیمتوں کے اتار اور چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ لگان اور مال گزاری میں ردوبدل کا اختیار دیا گیا۔

ممالک متحدہ آگرہ واودھ میں آگرہ ٹینیسی ایکٹ سنہ ۱۹۲۶ء اور یو پی ٹینیسی بل سنہ ۱۹۳۹ء بھی اہم ہیں۔ اس میں سے اول الذکر کے تحت کاشت کار کو عمر بھر کے لیے حیاتی حقوق حاصل ہو گئے ہیں اور آخر الذکر کے تحت ان حقوق کو موروثی قرار دے دیا گیا ہے۔

لیکن مجموعی طور پر زرعی طبقہ اور اس کے مسائل پر نظر ڈالتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان تمام کارروائیوں کے باوجود کاشت کاروں کی حالت بہتر ہونے کی بہ جائے گرتی جا رہی ہے۔ مصلحت اندیشی کا اشارہ یہ ہے کہ مروجہ بندوبست آراضی کے اصولوں کو بنیادی طور پر بدل دیا جائے کیوں کہ ان کی بنیادیں خود غرضی اور ناانصافی پر قائم ہیں۔ محض ترمیم اور اصلاح سے کاشتکار کے مفاد کی توقع محض خوش عقیدگی ہے۔ بہ قول لینڈ ریونیو کمیشن بنگال کے سوائے اس کے کہ آراضی کو سماجی ملکیت بنا دیا جائے کاشت کے لیے نجات کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کو اس راہ میں دشواریاں پیش آئیں گی کیوں کہ زمین دار مدت سے کسانوں کے مقابلے میں غیر معمولی فوائد حاصل کرتے رہے ہیں۔ وہ بغیر جد و جہد کے مظلوم اکثریت کے فیصلے کے سامنے سر نہیں جھکائیں گے۔ لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی مسلّم ہے کہ ایک منزل پر آکر سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے جو فطری تضاد ہیں وہی اس کی موت کا باعث بنتے ہیں۔

——— ※ ———

معاشی صورتِ حال

۱- غذا

۲- فضائی نقل و حمل

۳- کنٹرول

۴- مزدوروں کا مسئلہ

۵- سڑک اور ریل کی ہم آہنگی

۶- ریاست حیدر آباد کا بجٹ

غذا ارجنٹائن کو جو ہندستان سے غذائی وفد بھیجا گیا تھا وہ بڑی حد تک کامیاب رہا۔ ستمبر کے پہلے ہفتے میں ایک لاکھ ۴۰ ہزار ٹن مکئی ارجنٹائن سے ہندستان کو جہاز پر لاد کر روانہ کی جا چکی ہے۔ یہ بھی اطلاع موصول ہوئی ہے کہ وفد نے ارجنٹائن کے غذائی حکام سے اس بات کے لیے بات چیت شروع کر دی ہے کہ ارجنٹائن اپنی دسمبر کی فصل کا بڑا حصہ ہندستان کو دے دے۔ انرا (UNRRA) نے بھی اس آڑے وقت ہندستان کی مدد کی ہے اور وہ اس طرح کہ ۲۵ ہزار ٹن گیہوں سے لدے ہوئے تین جہاز جو اس بین اقوامی انجمن کو بھیجے گئے تھے اُسے اُس نے ہندستان کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ جہاز نومبر تک ہندستان پہنچ جائیں گے۔ ۲۰ ہزار ٹن گیہوں برطانیہ سے بھی ہندستان کو نومبر میں پہنچ جائے گا۔ ناروے اور سوئزرلینڈ سے بھی دو جہاز غلہ ہندستان کو آ رہا ہے۔ یہ تمام غلہ اُدھار آ رہا ہے اس وعدے پر کہ جب برما، سیام اور انڈونیشیا سے غلے کی درآمد شروع ہو جائے گی تو یہ ادھار غلہ واپس کر دیا جائے گا۔ سیام میں دیہی علاقوں سے غلہ حاصل کرنے اور جمع کرنے کا جو انتظام ہے اُسے اور بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ہندستان کو جلد اور زیادہ مقدار میں غلہ بھیجا جا سکے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب نے غذائی صورتِ حال کا جو نقشہ کھینچا ہے اُس سے پتا چلتا ہے کہ آنے والے کئی ماہ [illegible] اچھے نہیں رہیں گے۔ ہندستان بڑی حد تک دوسرے مُلکوں کا دست نگر ہے اور باہری امداد [illegible] کام

نہیں چلا سکتے۔ باہری ملکوں سے غذائی امداد کے سلسلے میں جو دقتیں حائل رہی ہیں وہ یہ ہیں، امریکہ میں جہازرانوں کی ہڑتال برازیل سے چاول کے لادے جانے میں تاخیر، پھر غیر معین سیاسی حالات اور ناکافی نقل وحمل کی وجہ سے برما، سیام اور انڈونیشیا سے چاول کے آنے میں تاخیر۔ باہری امداد کے علاوہ ہندستان کو اپنی مدد آپ کرنی چاہیے۔ چناں چہ غذا کو حفاظت سے خرچ کرنے کے علاوہ زیادہ غلہ پیدا کرو کی اسکیم کو بھی پورے طور سے اور از سرِ نو توجہ کے ساتھ عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔

پنجاب کے ۳۲ قصبوں میں اب راشن بندی کی جا رہی ہے جس سے غلے کی بچت ہوگی۔ ملک کی عام غذائی صورتِ حال کے پیشِ نظر ایسا کرنا ضروری تھا۔ حکومتِ مدراس نے فیصلہ کیا ہے کہ امریکہ سے دو لاکھ "ڈنر پیکٹ" کی فرمائش کرے۔ ہر پیکٹ کی قیمت پانچ آنے ہوگی اور اس میں اتنا چاول اور ترکاری ہوگی کہ دو وقت کے لیے کافی ہو سکے۔ اگر امریکہ نے اس فرمائش کی تعمیل کرنا منظور کر لیا تو اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ ملک کی غذائی صورتِ حال کو سنبھالنے میں مدد ملے گی بلکہ عوام کو بے حد سستے داموں پر غذا مل جائے گی۔ اس لیے کہ موجودہ حالات کے تحت پانچ آنے کی قیمت ہی کیا ہے۔

فضائی نقل وحمل

فضائی سروسوں کے متعلق حکومتِ ہند نے حال ہی میں اپنی پالیسی کا اعلان کیا ہے جو کئی باتوں کے لحاظ سے کافی اہم ہے۔ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ لائسنس کے سلسلے میں جو موجودہ قاعدے ہیں اُن کی ترمیم کی جائے گی۔ سب سے پہلے تو خود لائسنس بورڈ کی شکل کو بدلا جا رہا ہے۔ نئے فیصلے کے مطابق یہ بورڈ تین آدمیوں پر مشتمل ہوگا۔ اب اس فضائی نقل وحمل کے لائسنس بورڈ کا سول ہوابازی کے محکمے سے گہرا تعاون رہے گا۔ حکومت نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ وہ انفرادی کمپنیوں کے فضائی نقل وحمل کے کام میں مداخلت نہ کرے گی اور نہ معترض ہوگی اور اگر انفرادی کمپنیاں متعدد اور مختلف ہوائی راستوں پر جہاز چلانا چاہیں گی تو اس پر بھی حکومت کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ہر کمپنی کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ جہاں سے چاہے اپنے لیے ضروری مشین حاصل کرے۔ لائسنس بورڈ کے ذمے صرف کمپنیوں کو راستے سے متعلق اجازت دینے کا کام رہ جائے گا۔ بورڈ صرف اُن کمپنیوں کو ہوائی جہاز چلانے کی اجازت دے گا جو اس بات کا یقین دلا دیں کہ اُن کے پاس ماہر کام کرنے والے موجود ہیں اور اُن کی مالی حالت مضبوط ہے۔ حکومت کی طرف سے مالی امداد نہیں مہیا کی جائے گی۔ حکومت صرف ہوائی اسٹیشنوں کی تعمیر کے اور اُن کو درست رکھنے کے اخراجات برداشت کرے گی اور اپنے خرچ سے وائرلیس اسٹیشن، موسمی اطلاعات اور دیگر آسانیاں مہیا کرے گی۔

جہاں تک ہوائی نقل وحمل کو ذاتی ملکیت سے نکال کر قومی ملکیت بنانے کا سوال ہے حکومت ہند کا یہ فیصلہ غالباً حیرت اور افسوس کے ساتھ دیکھا جائے گا کہ ملکی حدود کے اندر اُسے قومی ملکیت نہ بنایا جائے بلکہ ذاتی ملکیت میں چھوڑ دیا جائے۔ بعض حلقوں کی یہ رائے ہے کہ ہندستان میں ہوائی نقل وحمل کی ابھی ابتدا ہوئی ہے، اس وقت اُسے قومی ملکیت

بنا لینا آسان ہو نہ کہ اُس وقت جب ذاتی کمپنیاں ہوائی نقل وحمل پر اپنا پورا قبضہ جمالیں گی۔ صرف مُلک سے باہر کی ہوائی سروسوں کے سلسلے میں حکومت نے ہوائی کارپوریشنوں میں حصہ لینے کا اعلان کیا ہو۔

تجویز یہ ہو کہ نئی دہلی میں نومبر ۱۹۴۶ء میں ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ہندستان میں سول ہوابازی کے متعلق جو معاملات ہیں اُن پر بحث وتمحیص کی جاے۔ عارضی حکومت سے یہ عام توقع بے جا نہیں ہو کہ وہ خود ہندستان میں ہوائی جہاز کی تعمیر کے لیے کارخانہ قائم کرنے کے مسئلے پر غور وخوض کرے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے تمام ممکن کوششیں عمل میں لائے۔

کنٹرول نئی عارضی حکومت نے برسرِ اقتدار ہونے کے بعد "احکامِ خاص" (ORDINANCES) کے ذریعے اس بات کا فیصلہ کیا کہ ابھی کنٹرول کا سلسلہ برقرار رکھا جائے گا۔ موجودہ حالات کے تحت کنٹرول کو برقرار رکھنا یقیناً ضروری ہو لیکن بعض حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جارہا ہو کہ جس طریقے سے اس بات کا فیصلہ کیا گیا یعنی احکامِ خاص کے ذریعے وہ کچھ صحیح نہیں تھا۔ اس معاملے کو مرکزی اسمبلی کے فیصلے پر اُٹھا رکھا جاتا تو زیادہ اچھا تھا۔ حکومت نے موجودہ کنٹرول کے پورے ڈھانچے کو برقرار رکھا ہو تاکہ آیندہ ضرورتوں کے مطابق خاص خاص حالتوں میں اُس میں ترمیم وتنسیخ کی جاسکے۔ غذا اور کپڑے کے سلسلے میں، اس میں کوئی شک نہیں، کہ کنٹرول کو قائم رکھنے کی اشد ضرورت ہو۔ مُلک کی غذائی صورتِ حال ابھی کچھ عرصے تک اِسی طرح نازک رہے گی۔ سوتی کپڑے کی قلت بھی ابھی دور ہوتی نظر نہیں آرہی ہو، پھر بعض غیر ملکوں سے اناج حاصل کرنے کے لیے بھی ہمیں کپڑا برآمد کرنا ہوگا۔ ان حالات کے تحت اگر کنٹرول کو اُٹھا دیا گیا تو چوربازاری اور اس کے بعد قحط کا رونما ہونا ضروری ہوگا۔ سوتی اور اونی کپڑوں پر اور کوئلہ، لوہا اور اسٹیل، کاغذ اور ابرق پر انھی باتوں کے پیشِ نظر حکومتِ ہند نے کنٹرول برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا ہو۔

مزدوروں کا مسئلہ ماہِ رواں کے دوسرے ہفتے میں نئی دہلی میں تمام صوبوں کے لیبر وزیروں کی کانفرنس ہوئی جس کی صدارت کرتے ہوئے مرکزی حکومت کے لیبر وزیر نے کہا کہ مزدوروں سے متعلق تمام قوانین مرکزی حکومت سے پاس ہونے چاہییں اور صوبوں کے ذمّے صرف اُن قوانین کو عمل میں لانے اور نگرانی رکھنے کا کام ہوگا۔ انھوں نے مزدور مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک پنج سالہ پروگرام تیار کرنے اور اس کو عمل میں لانے کی اہمیت پر بھی زور دیا۔

۱۹۴۰ء، ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء کے بعد لیبر وزیروں کی یہ پہلی کانفرنس ہو۔ ۱۹۴۲ء میں اس کانفرنس کو پھیلا دیا گیا اور اس کا نام ہندستانی لیبر کانفرنس رکھا گیا اور اُس میں مرکزی، صوبائی اور ریاستی حکومتوں کے نمایندوں

کے علاوہ مزدوروں اور مالکوں کے نمایندوں کو بھی شرکت کے لیے بُلایا گیا۔ اب یہ تبدیلی کی گئی ہو کہ ہندستانی لیبر کانفرنس اور مستقل لیبر کمیٹی کے علاوہ اب علاحدہ طور پر لیبر وزیروں کی بھی کانفرنس ہوگی جس کا کام یہ ہوگا کہ مزدور مسئلے کے متعلق حکومت کی پالیسی کی تشکیل کرے۔

لیبر وزیروں کی کانفرنس میں جو تجویزیں رکھی گئیں اُن میں مندرجہ ذیل باتوں سے بحث کی گئی تھی:۔ مالکوں اور مزدوروں کے درمیان مناسب مزدوریوں کے راضی نامے کرانا، صنعتی ٹریننگ کا انتظام کرنا تاکہ مزدوروں کی قوتِ پیدائش اور کمائی کی قوت میں اضافہ ہو۔ مزدوروں کے حالات سدھارنے کی کوشش کرنا، ٹھیکے داروں کے ذریعے مزدوروں کو بھرتی کرنے کے قاعدے کو روکنا، مزدوروں کی ملازمت کی مناسب شرطیں مرتب کرنا، ان کے لیے مالی تحفظ کا انتظام کرنا، اُن کے لیے اچھی جائے رہایش اور مکانات کی تعمیر کرنا اور مزدوروں اور مالکوں کے جھگڑے چکانے کے لیے موزوں اور مناسب انتظام کرنا۔

کانفرنس نے اِس بات پر زور دیا کہ زرعی مزدوروں کی تعداد صنعتی مزدوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو۔ اس لیے ان کی حالت درست کرنا بھی حکومت کا اوّلین فرض ہو۔ لیکن زرعی مزدوروں کے سلسلے میں ایک بڑی دقت یہ ہو کہ اُن کے تمام حالات کی حکومت با اثر طریقے سے نگرانی نہیں کرسکتی۔ بہ ہر حال اُن کی مزدوری کو بڑھایا جاسکتا ہو اور حکومت اس بات کا انتظام کرسکتی ہو کہ انھیں مناسب مزدوری ملے۔ حکومت کی نگرانی میں زرعی مزدوروں کے حالات کی تحقیق و تفتیش کا کام شروع کیا جانے والا ہو۔ اس سلسلے میں کچھ کام تو پہلے ہی ہوچکا ہو۔ تحقیقات کے جو نتیجے برآمد ہوں گے انھی کی بنیاد پر ایسی کارروائیاں کی جائیں گی جن سے زرعی مزدوروں کی مزدوری کا تحفظ ہوسکے گا اور اقل ترین مزدوری کا تعین ہوسکے گا۔

مزدوروں سے متعلّق جو فوری امور حکومت کے پیشِ نظر ہیں وہ یہ ہیں:۔ مناسب مزدوریوں کے راضی ناموں کو فروغ دینا، مہنگائی بھتّے کی شرحوں کو مناسب بنیادوں پر قائم کرنا، مزدوروں کو صنعتی کام کی تربیت دینے کا انتظام کرنا، کارخانوں، کانوں، نقل و حمل کی سروسوں اور دُکانوں میں کام کرنے کے حالات کو بہتر بنانا، ٹھیکے داروں سے مزدوروں کی بھرتی کو موقوف کرانا، بیماری کے دوران میں مزدوروں کے لیے طبّی اور مالی امداد مہیا کرنا، مزدوروں کے رہنے کے لیے اچھے مکانات تعمیر کرانا۔

سڑک اور ریل کی ہم آہنگی

حکومتِ یوپی نے ریل اور سڑک کی ہم آہنگی کی پوری اسکیم مرتب کرلی ہو اور اب اُسے صرف عمل میں لانا باقی رہ گیا ہو۔ اس اسکیم کا مقصد سڑک کی نقل و حمل کو

ترقی دینا ہو۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ گزشتہ جنوری ہی میں ریل اور سڑک کی ہم آہنگی کا سوال .... منظرِ عام پر آچکا تھا۔ اُس وقت صوبوں میں عوامی حکومتیں نہیں بنی تھیں اور موٹر مالکوں کی طرف سے حکومت کے خلاف اس ہم آہنگی کے خلاف آواز بلند کی گئی تھی، ہڑتالیں بھی ہوئی تھیں۔ اُس وقت حکومت نے سڑک اور ریل کی ہم آہنگی کے لیے جو اسکیم تیار کی تھی اس پر کافی اعتراضات بھی کیے گئے تھے۔ موجودہ اسکیم کئی باتوں کے لحاظ سے گزشتہ اسکیم سے مختلف ہو۔ گزشتہ اسکیم کے تحت صوبائی حکومت کو خطّے وار نقل و حمل کی کمپنیوں میں صرف ۵ فی صدی حِصّہ دیا گیا تھا۔ بقیہ ۹۵ فی صدی حصّے کو ریل اور پبلک میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پبلک ہی میں موٹر مالک بھی شامل تھے۔ ریل کے لیے ۴۶ فی صد حصّہ رکھا گیا تھا اور پبلک کے لیے ۴۹ فی صدی۔ اس اسکیم کے تحت ریل کو بہت زیادہ حصّہ دے دیا گیا تھا جس سے کہ دوسرے حصّے داروں کے مقابلے میں سڑک کی نقل و حمل میں ریل کا اقتدار بہت زیادہ بڑھ جاتا۔ اس کے مقابلے میں تنظیمی امور میں صوبائی حکومت بالکل بے بس ہوتی۔ صوبائی حکومت کو بااثر ہونے کے لیے یا تو ریل سے اتّحاد پیدا کرنا پڑتا یا اُسے تمام پبلک حصّوں کو اپنے ساتھ ملانا پڑتا تب ہی وہ ریل کے مقابلے میں اپنا اثر ظاہر کر سکتی تھی۔ لیکن نئی اسکیم کے تحت جسے نئی صوبائی حکومت نے مرتّب کیا ہو، صوبائی حکومت کو ۵ فی صدی کی بہ جائے ۳۴ فی صدی حصّہ دیا گیا ہو اور ریل کو ۲۵ فی صدی حصّہ اور ۴۱ فی صدی موٹر مالکوں کے لیے رکھا گیا ہو۔ صوبائی حکومت کے ہاتھوں میں پُورا اقتدار سونپنے کے لیے اسکیم میں یہ بھی درج ہو کہ صوبائی حکومت کو ہر حصّے کے لیے دو ووٹ کا حق حاصل ہوگا۔ موٹر مالکوں کے مفاد کا خیال رکھتے ہوئے یہ بھی رکھا گیا ہو کہ منافع کی تقسیم میں پہلا تین فی صدی منافع موٹر مالکوں کے لیے مخصوص ہوگا۔ اس طرح نئی اسکیم کے تحت سڑک کی نقل و حمل کے ترقّی کرنے کی توقّع کی جارہی ہو، موٹر مالکوں کو بھی اب زیادہ اعتراض کی گنجایش نہیں رہی اور تنظیم اور نگرانی کا کام حکومت کے سپرد ہو۔

ریاست حیدرآباد کا بجٹ

سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء کے لیے ریاست حیدرآباد کے بجٹ میں آمد و خرچ کے جو تخمینے پیش کیے گئے ہیں وہ جنگ سے پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ جنگ سے پہلے آمدنی ۹½ کروڑ تک پہنچی تھی لیکن زیرِ بحث بجٹ میں آمدنی کا تخمینہ ۲۰ کروڑ ہو۔ اخراجات میں بھی تقریباً اُتنا ہی اضافہ ہوا ہو یعنی سنہ ۱۹۳۹ء میں اخراجات کی سطح ۱۰ کروڑ رُپے تھی (عثمانی سکّہ)۔ اور سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء کے بجٹ میں اخراجات کا تخمینہ ۲۰ کروڑ ہو۔ سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء کے لیے نظرِ ثانی کے بعد آمدنی کا جو تخمینہ کیا گیا ہو اُس سے نئے سال کی آمدنی کا تخمینہ صرف ۴۰½ لاکھ رُپے کم ہو۔ یہ اس لیے حیرت انگیز ہو کہ صوبائی حکومتوں کے بجٹ میں نئے سال کے تخمینے اور سالِ رواں کے نظرِ ثانی کیے ہوئے تخمینے میں بہت کافی فرق پایا جاتا ہو۔ اخراجات کی خاص خاص مدیں یہ ہیں:-

فوج ——— ۸۴,۸۷ لاکھ رُپے

تعلیم	۱۱۸٫۲۴ لاکھ روپے
طب وصحتِ عامّہ	۵۰٫۲۷ " "
میونسپلٹی اور پبلک ترقیاں	۱۴٫۳۷ " "
عمارات ورسل ورسائل	۴۷٫۵۲ " "

۱۰۷ لاکھ روپے ریل کی تعمیر اور معاوضے میں صرف ہوں گے اور ۸۲ لاکھ روپے آب پاشی کی ترقی وتوسیع میں، ۳۹ لاکھ روپے نظام ساگر اسکیم پر، ۷۵ لاکھ روپے سڑکوں پر اور ۲۵ لاکھ روپے مقامی اداروں کی ترقی وتوسیع پر، ۱۴۷ لاکھ روپے گوداوری وادی کی اسکیم اور ۹۶ لاکھ روپے سول امور (مثلاً محکموں کی عمارتوں کی تعمیر) پر خرچ ہوں گے۔

آمدنی کی مدمیں محکمۂ آب کاری کو خاص اہمیت حاصل ہو اگرچہ ریاست شراب کی ممانعت کو عمل میں لانے کے متعلق بھی سوچ رہی ہو ٹیکسوں کے سلسلے میں زیادہ آمدنی بالواسطہ ٹیکسوں (INDIRECT TAXES) سے ہوتی ہو جس کی وجہ سے ٹیکس کا زیادہ بوجھ غریب اور متوسط طبقے پر پڑتا ہو۔ ریاست میں ابھی آمدنیوں پر ٹیکس نہیں لگایا گیا ہو۔ نواب زاہد جنگ نے آمدنی کی مساویانہ تقسیم پر زور دیا ہو اور اس کے لیے دو شرطیں بتائی ہیں:۔ اونچے طبقے کے مفادات کا زیادہ خیال نہ رکھا جائے اور ریاست میں صنعتی ترقی کی جو اسکیمیں ہیں اُن کو ٹھیک طور سے اور کاروباری انداز میں عمل میں لایا جائے۔ ریاست حیدرآباد میں نئے سال سے جبری ابتدائی تعلیم کی اسکیم بھی عمل میں لائی جانے والی ہو۔

کپڑے کی قلّت

(بقیہ صفحہ ۵)

جو کپڑے کی پیدائش کے سلسلے میں حائل ہو وہ مزدوروں کا مسئلہ ہو جو لازمی اور جائز طور پر ہڑتالوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہو۔ ہندو مسلم فسادات نے بھی کپڑے کی پیدائش کی رفتار کو بہت کافی گھٹا دیا ہو۔ فسادات کی روک تھام کے لیے تمام ممکن اور مناسب کاروائیوں کی فوری ضرورت ہو ہمارا خیال ہو کہ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کے مرکزی حکومت میں آجانے کے باوجود فسادات کی لہر کو نہیں روکا جاسکتا۔ چوں کہ آج کل کے فسادات کا عام ملکی سیاسیات سے گہرا تعلق ہو اس لیے فی الحال ہماری کوشش کم سے کم اتنی ہونی چاہیے کہ فسادات کے اثر کو مزدور علاقوں میں اور مزدوروں تک نہ پہنچنے دیا جائے تاکہ پیدائشِ اشیا کی رفتار اور تسلسل میں کوئی خلل نہ پیدا ہو۔ گزشتہ فسادات کے دوران میں کلکتہ اور بمبئی کے مزدور علاقے بڑی حد تک محفوظ رہے ہیں۔ لیکن احمد آباد کے مزدور فسادات کی زد میں آچکے ہیں اور دہلی میں تو فساد خود مزدوروں ہی سے شروع ہوا جو غالباً مِل مالک کے ہتھکنڈوں کا نتیجہ تھا۔ مِل مالکوں نے مزدوروں کی ہڑتال کو روکنے کے لیے ہندو مسلم فساد کو حربے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی ہو۔ جس سے لازمی طور پر پیدائشِ اشیا متاثر ہوئی ہو۔ ضرورت ہو کہ اس قسم کی ناجائز حرکتوں کو منظرِ عام پر لایا جائے اور جہاں تک ہوسکے مزدوروں کو فسادات کی زد میں آنے سے روکا جائے۔

لیکن حکومت اس وقت تک کپڑے کی پیدائش نہیں بڑھا سکتی جب تک وہ مزدوروں کے مسئلے کو حل نہ کرلے۔ مزدوروں کے جائز مطالبوں کے نہ مانے جانے اور مِل مالکوں کی ضد کی وجہ سے جو ہڑتالیں ہوئی ہیں اُن سے کپڑے کی صنعت کو کتنا نقصان ہوا ہو اس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے لگایا جاسکتا ہو۔ جنوری سنہ ۱۹۴۶ء سے لے کر جولائی سنہ ۱۹۴۶ء تک کپڑے کی صنعت میں ۲۱۰۲ دِن ضائع ہوئے یعنی اُتنے دِن کام نہیں ہوسکا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں جنوری اور مئی کے درمیانی عرصے میں کپڑے کی ماہانہ اوسطِ پیدائش ۳۷ کروڑ گز تھی۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں اُسی عرصے میں صرف ۳۵ کروڑ گز کپڑا ماہانہ اوسط کے حساب سے پیدا ہوا۔ سنہ ۱۹۴۶ء کے نصف اوّل میں صرف بمبئی میں کپڑے کی پیدائش میں ۷ کروڑ ۲۰ لاکھ گز کی کمی ہوگئی۔ انھی وجوہ کی بنا پر اپریل سنہ ۱۹۴۶ء میں صوبوں اور ریاستوں کو جو کپڑا مہیا کیا جاتا تھا اُس میں دس فی صدی کی کمی کرنی پڑی اور ۱۵ مئی تا ۳۱ جولائی کے درمیانی عرصے میں دوسرے ملکوں کو کپڑا بھیجا جانا بند کردیا گیا، سوائے اُن ملکوں کے جہاں سے کپڑے کے عوض میں غلّہ وصول ہورہا تھا۔ ہڑتالوں کی روک تھام کا واحد طریقہ یہ ہو کہ نئی قومی حکومت مزدوروں کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے چاہے عارضی ہی طور پر سہی۔ مزدوروں کے مسئلے کو کامیابی سے حل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نئی قومی حکومت مِل مالکوں پر دباؤ ڈالے کہ [illegible]وں

کے مطالبات کو تسلیم کرلیں۔ مزدوروں کے لیے مناسب جائے رہائش کا انتظام کیا جائے۔ اور اُن کی تنخواہوں میں اتنا اضافہ کیا جائے کہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرسکیں۔ مل مالکوں کا تھوڑا سا نفع کاٹ کر اگر مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافہ کردیا جائے گا تو اس سے پورے ملک کی کپڑے کی دقت حل ہوسکتی ہے۔ حکومت کے سامنے دو راستے ہیں:- (۱) مل مالکوں کی عظیم نفع خوری کو کم کرنا (۲) یا پھر پورے مُلک کو ننگا رکھنا۔

کپڑے کی اس عام قلت کے پیشِ نظر مدراس کے وزیر اعظم پرکاسم کا یہ بیان کہ صوبے میں اب کوئی سوتی کارخانہ نہیں بننا چاہئے کچھ عجیب وغریب سا لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی فلسفی کے مبہم اور عینی سماجی اور معاشی نظریوں کی قربان گاہ پر لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی ضروریاتِ زندگی کو بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا۔ حالات ہمیں مجبور کررہے ہیں کہ مُلک میں زیادہ سے زیادہ ملیں قائم کی جائیں تاکہ کپڑے کی قلت دُور ہو اور عوام کی ضروریات پوری ہوں لیکن دُوسری طرف یہ رائے دی جارہی ہے کہ مدراس میں مزید ملوں کی تعمیر یکسر سے بند کردی جائے۔ آخر تضاد کی کوئی حد بھی ہے۔ یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ چرخے اور کرگھے کی مدد سے ہم غیر ملکی کپڑے کے اس عظیم سیلاب کو بالکل نہیں روک سکتے جو مزید ملیں قائم نہ ہونے اور قلت کے برقرار رہنے کی صورت میں اس مُلک میں داخل ہونا شروع ہوں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ حکومتِ مدراس کا یہ بیان صاف اور واضح طور پر مُلک کے معاشی اور معاشرتی مفاد کے خلاف ہے۔

——— ۱۰۰۱ ———

تبصرے

جھگڑے | سیاسی اور لسانی موضوعات پر سات مقالوں کا مجموعہ۔ مصنّف ڈاکٹر رام پرتاب بہادر ام۔ اے۔ ڈی فل، لکچرار شعبۂ معاشیات الہ آباد یونی ورسٹی۔ حجم ۲۸۸ صفحات، مجلّد، سادہ گرد پوش۔ لکھائی چھپائی مناسب قیمت ۳ روپے ۸ر۔ ملنے کا پتا:۔ ہریش چندر۔ ۳۳ کچہری روڈ۔ الہ آباد۔

شروع کے تین مقالات ہندو مسلم مسئلے پر ہیں۔ مقالہ تو دراصل ایک ہی ہے لیکن طوالت کا احساس کم کرنے کے لیے اُسے تین حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ان مقالوں میں مصنّف نے بہ قولِ خود اور ویسے بھی ہندو یا مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بالکل تیسرے اور غیر جانب دار شخص کی حیثیت سے اس بے حد اہم مسئلے کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ تینوں مقالوں میں جو بنیادی خیال ہے اُسے دو لفظوں میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے:۔ کانگریس اور لیگ دونوں کی موجودہ پالیسی ایسی ہے جس سے ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے، اُس سے صرف انگریز کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ہم آج ایک ایسے دلدل میں پھنس گئے ہیں جس سے نکلنے میں کافی دیر لگے گی اور بڑی مصیبتیں بھی اُٹھانی پڑیں گی۔ مصنّف اِس سے آگے نہیں جاتا۔ اُس نے کوئی حل نہیں پیش کیا ہے بلکہ صورتِ حال کا صرف تجزیہ کر دیا ہے جو کافی گہرا، خیال انگیز اور دل چسپ ہے۔ طرزِ بیان عام سیاسی مقالوں جیسا نہیں ہے، بلکہ اُس میں ایک خاص انفرادیت پائی جاتی ہے۔ یہ طرز سائنٹفک سے زیادہ ادبی اور فنّی ہے۔ داخلیت کا عنصر کافی نمایاں ہے، ادبی مقالوں سے ملتا جُلتا اور بات چیت والا طرز ہے جس میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ سامنے کوئی بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ زبان سادہ بلکہ بے حد سادہ اور عام پسند ہے۔

آخر کے چاروں مقالے زبان کے مسئلے سے متعلّق ہیں۔ اِن مقالوں میں بھی مصنّف نے غیر جانب دار رہنے کی انتھک کوشش کی ہے۔ یہ چیز قابلِ تعریف ہے لیکن غیر جانب دار رہنے کے جوش میں مصنّف سے کچھ واقعاتی غلطیاں سرزد ہو گئی ہیں۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر جانب داری اور سائنٹفک واقعیت ہمیشہ ایک ہی چیز کے دو نام نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات اُن میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ بہرحال کتاب پڑھنے کے بعد کوئی شخص فاضل مصنّف کے خلوص اور ایمان داری کی داد دیے ... مقالوں کی انفرادیت، دل چسپی اور خیال انگیزی کا تقاضا ہے کہ ان مسائل سے دل چسپی ...

سوویت یونین کی قومیں — مصنف ڈاکٹر ادھیکاری ۔ مترجم احمد حسین ۔ حجم ۵۹ صفحات ، سرورق مصور ۔ قیمت بارہ آنے
ملنے کا پتا :۔ قومی دار الاشاعت سنڈھرسٹ روڈ ممبئی ۴ ۔

مصنف نے پہلے انقلاب سے پہلے کے زارشاہی نظام میں مختلف قوموں کی حالت کا جائزہ لیا ہو اور اُن کی غلامی اور بدحالی کا نقشہ کھینچا ہو ۔ پھر اُس کے بعد بتایا ہو کہ جب سنہ ۱۹۱۷ء کا سیاسی انقلاب رونما ہوا تو اُن تمام قوموں کو آزادی اور خودمختاری حاصل ہوگئی جنھیں زارشاہی نے مقید کر رکھا تھا ۔ آگے چل کر مصنف نے سنہ ۱۹۲۲ء و سنہ ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصے میں سوویت یونین کی قوموں نے جو زبردست ترقی کی ہو اُس کا تذکرہ کیا ہو اور آخر میں ہندستان کی قوموں کے مسئلے کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہو ۔

متعلقہ مسائل کو بڑے آسان اور سہل طریقے سے پیش کیا گیا ہو اور معلومات و حقائق کا بھی وافر ذخیرہ موجود ہو ۔ احمد حسین صاحب کا ترجمہ بہت صاف ستھرا اور آسان ہو اور ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی بلا کسی دقت کے سمجھ سکتا ہو ۔

انقلاب کی تاریخ — مصنف ام ۔ ان ۔ رائے ، مترجم گوپال متل ، حجم ۵۵ صفحات ۔ لکھائی چھپائی بہت عمدہ ۔ قیمت درج نہیں ۔ ملنے کا پتا :۔ مکتبۂ اُردو ، لاہور ۔

اِس چھوٹے سے پمفلٹ میں دُنیا کے انقلابات کے معاشی اور سماجی اسباب اور بنیادوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہو اور حتی الامکان سائنسی طرزِ استدلال اختیار کیا گیا ہو لیکن شروع میں " ام ۔ ان ۔ رائے اپنی نظر میں " کے عنوان سے جو مضمون ہو وہ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہو اس لیے کہ کتاب کے موضوع سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہو اور ایسا معلوم ہوتا ہو جیسے محض صفحات پُر کرنے کے لیے اُس کا اضافہ کردیا گیا ہو ۔

انجمنِ ترقّیٔ اُردو کی وضع کردہ چند معاشیاتی اصطلاحات

English	اردو
Earned income	کمائی آمدنی
Earning	کمائی
Economic friction	معاشی رُکاوٹ
Economic geology	معاشی ارضیات
Economic holding	معاشی کھیت
Economic liberalism	معاشی آزادخیالی
Economic man	معاشی انسان
Economics applied	معاشیاتِ عملی
Economics external	خارجی کفایتیں
Economics internal	داخلی کفایتیں
Face value	عرفی قدر
Factors of production	عاملینِ پیدائش
Famine relief insurance	بیمہ امدادِ قحط
Farm	مزرعہ
Feudal dues	جاگیرداری مطالبات
Feudal tenure	جاگیری حقیت
Gabell	گیبل (محصول نمک)
Gild	جتھے
Gild socialism	حرفتی اشتراکیت
Gilt-edged-securities	سنہری تمسکات

معاشیات

جلد ۱ — نومبر سنہ ۱۹۴۶ء — نمبر ۱۱

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	رُوپے کی شرح مبادلہ	اڈیٹر	۲
۲	حکومتِ ہند کی صنعتی پالیسی	ڈ۔ ر۔ سمنت	۶
۳	ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے ہندستان کی تجارت	پرشن	۱۶
۴	چھوٹی صنعتیں	معاشی	۲۳
۵	قیمتوں کا معیار	حمیدہ نقوی	۲۹
۶	روس کا نیا پنج سالہ منصوبہ	خلیق احمد نقوی	۳۴
۷	معاشی صورتِ حال	ادارہ	۳۹
۸	انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) کی جدید مطبوعات	"	۴۳

اداریہ

رُپے کی شرح مبادلہ

از :- ——— اڈیٹر

مرکزی اسمبلی نے اپنے گزشتہ مباحثوں میں یہ فیصلہ کیا ہی کہ ہندستان بین اقوامی بینک اور بین اقوامی زرفنڈ میں اپنی رکنیت برقرار رکھے۔ یہ فیصلہ غلط ہی یا صحیح اُس سے قطع نظر اس وقت اہم سوال ہمارے سامنے یہ ہی کہ رُپے کی شرح تبادلہ کیا رکھی جائے۔ رُپے کی شرح تبادلہ بڑھائی جائے یا گھٹائی جائے یا موجودہ شرح کو برقرار رکھا جائے؟ بین اقوامی زرفنڈ کے قاعدے کے مطابق حکومت ہند کو سب سے پہلے اُس شرح تبادلہ کا اعلان کرنا پڑا ہی جو ۲۸ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء کو رائج تھی۔ لیکن ہر ملک کو اختیار ہی کہ ۲۸ر اکتوبر کے بعد ۹۰ دن کے اندر اندر بین اقوامی زرفنڈ کو یہ مطلع کردے کہ ۲۸ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء کو جو شرح مبادلہ رائج تھی وہ اطمینان بخش نہیں ہی اور اُس میں وہ تبدیلی کرنا چاہتا ہی یعنی اُسے بڑھانا یا گھٹانا چاہتا ہی۔ چناں چہ اس وقت ہمارے سامنے یہ سوال ہی کہ ہم ۲۸ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء والی شرح کو برقرار رکھیں یا اُس میں تخفیف یا اضافہ کریں۔ برطانیہ نے تو اپنے اس فیصلے کا اعلان کردیا ہی کہ پونڈ کی شرح تبادلہ ڈالر سے وہی رہے گی جو اس وقت ہی۔ یعنی ایک پونڈ اسٹرلنگ برابر ہی ۵٫۰۳ ڈالر کے۔ سونے کی جو قیمت اس وقت ڈالر کی شکل میں ہی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یعنی ایک ڈالر برابر ہوگا ۱۵ ۵/۲۱ گرین سونے کے۔

یہ تو ظاہر ہی کہ ہندستان ہمیشہ کے لیے شرح تبادلہ کا تعین نہیں کرسکتا۔ اُسے صرف یہ فیصلہ کرنا ہی کہ موجودہ اور فوری حالات کے اندر اُسے شرح تبادلہ بڑھانی یا گھٹانی چاہیے یا وہی رکھنی چاہیے۔ ہمارا خیال ہی کہ اگر موجودہ شرح تبادلہ کو برقرار رکھا جائے تو بہتر ہی۔ اس کے علاوہ ہمارے سامنے اور کوئی بہتر صورت نہیں۔ موجودہ شرح تبادلہ ایک ایسی شرح ہی جسے اگر ابتدائی شرح

کی حیثیت سے تسلیم کرلیا جائے تو آیندہ ۲۰ فی صدی کے اندر اندر شرح تبادلہ کا گھٹانا یا بڑھانا ہماری مستقبل کی ضروریات سے غیر مطابق نہیں رہے گا۔ جن حالات کے تحت شرح تبادلہ کو برقرار رکھنے کا مشورہ دیا جا رہا ہی وہ کم سے کم دو سال تک ابھی اور رہیں گے۔ ان دو سال کے اندر ہماری معاشی ضروریات کیا ہیں اُنھی کے پیشِ نظر ہم شرح تبادلہ کے گھٹانے یا بڑھانے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

ہمارے فوری مسائل کیا ہیں؟ افراطِ زر کی روک تھام کرنا اور قیمتوں کو چڑھنے سے روکنا۔ پھر دُوسری اہم ضرورت ہی مُلک میں بڑے پیمانے پر صنعتوں کو جاری کرنا اور اشیا کی پیدایش کی رفتار کو تیز کرنا۔ کیا شرح تبادلہ کو گھٹا دینے سے ہماری یہ اہم ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ صنعتی ترقی کے لیے بڑے پیمانے پر ہمیں باہر سے مشینیں منگوانے کی ضرورت ہی اس کے علاوہ عام قلت کو رفع کرنے کے لیے ابھی ایک حد تک راست استعمال کی چیزوں کا بھی دُوسرے مُلکوں سے آنا ضروری ہی۔ پھر غلّے کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ رُپے کی قیمت گھٹا دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ درآمد گھٹ جائے گی اور برآمد میں اضافہ ہوگا۔ درآمد کے گھٹنے سے راست استعمال کی چیزیں کافی مقدار میں نہیں آسکیں گی اور مشینوں کی قیمت بڑھ جائے گی جس سے صنعتی توسیع و ترقّی کے کام میں رُکاوٹ پیدا ہوگی۔ جہاں تک برآمد میں اضافہ کرنے کا سوال ہی یہ بالکل ظاہر ہی کہ اس وقت جب کہ ساری دنیا میں چیزوں کی سخت قلت کا سامنا ہی اور ہندستان خود اپنی ضرورتیں بھی پُوری نہیں کرسکتا برآمد میں اضافہ کرنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس لیے سکّے کی قیمت کو گھٹانا ہمارے لیے فضول ہوگا۔ ہندستان کی اس وقت کی ضرورت کا تقاضا تو یہ ہی کہ بہت سی چیزوں کا باہر بھیجا جانا بالکل بند کر دیا جائے اس لیے کہ وہ خود ہماری صنعتوں کے کام آئیں گی مثلاً کچی روئی، روئی کی مصنوعات، تیل کے بیج وغیرہ۔ ہندستان میں اِس وقت فالتو راست استعمال کی چیزیں بھی نہیں پیدا ہو رہی ہیں کہ اُن کی برآمد اور نکاس کے لیے سکّے کی قیمت کو گھٹایا جائے۔ پھر سکّے کی قیمت گھٹانے سے قیمتیں اور بھی چڑھ جائیں گی جو ہمارے لیے مفید نہیں ہی۔

یہ صحیح ہی کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ اور کنیڈا کے مقابلے میں ہماری قیمتوں میں زیادہ اضافہ ہوا ہی۔ اور یہ بات سکّے کی قیمت کو گھٹانے کی طرف اشارہ کرتی ہی لیکن فوری طور پر نہیں بلکہ مستقبل میں اس کی ضرورت ہوگی۔ لیکن فی الحال ہمیں فوری ضرورتوں کے پیشِ نظر ہی فیصلہ کرنا ہی۔ فوری طور پر غیر ملکی فالتو تجارتی مال کی روک تھام کا بھی سوال ہمارے سامنے نہیں ہی جس کے لیے سکّے کی قیمت گھٹائی جائے اس لیے کہ پُوری دُنیا میں اس وقت چیزوں کی قلت محسوس کی جارہی ہی اور آیندہ دو سال تک یہی صورت رہے گی۔ جب وہ وقت آئے گا بھی کہ ہمیں غیر مُلکوں سے آنے والے فالتو مال کی بھرمار کی روک تھام کرنی پڑے تو سکّے کی قیمت گھٹانے سے زیادہ بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ باہر سے آنے والے مال پر مقداری پابندیاں عائد کی جائیں اور

زر سے متعلق ایک موزوں پالیسی اختیار کی جائے۔ دراصل سکے کی قیمت کو گھٹانے والا طریقہ ہر وقت اور ہر گھڑی نہیں استعمال کیا جاسکتا بلکہ بہت ہی خاص اور اہم حالات کے اندر۔ اِس سلسلے میں وقت اور موقع کی بڑی اہمیت ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تجارتِ خارجہ کے نقصان یعنی درآمد کے زیادہ اور برآمد کے کم ہونے کی وجہ سے جو ادائیگی کا فرق ہوتا ہے اس سے بچنے کے لیے سکے کی قیمت کو گھٹانا ضروری ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو آج کل کے حالات میں درآمد کا زیادہ ہونا اور برآمد کا کم ہونا بالکل کوئی تشویش ناک بات نہیں ہے۔ بلکہ اگر یہ چیز ہماری صنعتی ترقی کی معاون ہے تو ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اسٹرلنگ قرضے کے اجتماع سے پہلے کی طرح اب ہمیں سالانہ ۳ کروڑ ۱۰ لاکھ پونڈ کی رقم بھی برطانیہ کو نہیں ادا کرنی پڑے گی۔ چناں چہ تجارتِ خارجہ کا گھاٹا اب ہمارے لیے کوئی پریشان کن چیز نہیں رہا۔ پھر آیندہ اگر تجارتِ خارجہ میں گھاٹے کی وجہ سے ہمارے پاس درآمدی اشیا کی قیمت ادا کرنے کے لیے غیر ملکی سکہ نہیں رہا تو بین اقوامی زر فنڈ سے دست یاب ہوسکتا ہے غرض فوری حالات کے تحت سکے کی قیمت کو گھٹانے کی کسی طرح بھی رائے نہیں دی جاسکتی۔

لیکن موجودہ حالات کے ختم ہوجانے کے بعد وہ زمانہ آسکتا ہے جب کہ ہمیں شاید اِس حربے سے کام لینا پڑے لیکن اُس صورتِ حال کا نقشہ واضح طور پر اس وقت نہیں کھینچا جاسکتا۔ مثلاً موجودہ قلت ختم ہوجانے کے بعد ہندستان کو بڑی مقدار میں اپنی مصنوعات باہر بھیجنے کی ضرورت پیش آئے گی تاکہ مشینوں اور کچے مال کی درآمد کے لیے وہ غیر ملکی سکے حاصل کرسکے اور ہندستان کی صنعت پورے طور پر ترقی کرسکے۔ جب یہ ضرورت پیش آئے گی اور سکے کی قیمت کو گھٹانے کا موقع آئے گا تو ہندستان یقیناً وہ طریقہ اختیار کرے گا۔ اُس سے باہر سے آنے والے مال اور مشینوں کی قیمت ضرور بڑھ جائے گی اور اُس سے ہندستان کے اخراجاتِ پیدائش میں اضافہ ہوگا لیکن سکے کی قیمت گھٹانے سے یہ بھی ہوگا کہ غیر ملکوں میں ہندستانی مصنوعات کی قیمت گھٹ جائے گی اور اُن کی کھپت زیادہ ہوگی۔ پھر سکے کی قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے کچا مال برآمد کرنے والوں کے ہاتھ میں زیادہ پیسے آئیں گے اگرچہ مستقبل میں ہندستان کچھ بہت زیادہ کچا مال باہر نہیں بھیجے گا۔ غرض کہ آگے چل کر ہمیں ممکن ہے رُپے کی قیمت گھٹانے کی ضرورت پیش آئے اور جب ایسا موقع آئے گا تو ہم ضرور گھٹائیں گے لیکن فی الحال ایسا کرنا ہمارے صنعتی مفاد کے مطابق نہیں ہے۔

جہاں تک شرح مبادلہ کے بڑھانے کا سوال ہے عام طور سے کہا جاتا ہے کہ شرح مبادلہ کے بڑھانے سے درآمدی مال کی قیمت گھٹ جائے گی اور وہ ہمیں سستا ملنے لگے گا۔ پھر ملک سے باہر مال کا جانا بہت کم ہوجائے گا۔ اور ہم اپنا اسٹرلنگ قرضہ بھی زیادہ جلد وصول کرسکیں گے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ تینوں باتیں کچھ بہت زیادہ جچتی نہیں ہیں اس وقت جب کہ ساری دنیا میں اشیا کی قلت ہے سکے کی قیمت بڑھا کر درآمد میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنا فضول اور لاحاصل ہوگا۔

پھر جب خود ملک ہی میں سارے مال کی کھپت ہو رہی ہو اور مال باہر نہیں جا رہا ہو تو ایسی حالت میں برآمد پر پابندیاں بٹھانا بھی بے نتیجہ اور بے کار ہی ہوگا۔ جہاں تک اسٹرلنگ قرضے کی جلد وصولی کا سوال ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ مال کی زیادہ درآمد سے اُس مقصد کے حاصل ہونے میں مدد ملے گی۔ لیکن اس کے لیے شرح مبادلہ کو گھٹانا بڑھانا کچھ زیادہ مستحسن نہیں ہے۔ درآمد کو بڑھانے کے اور بھی طریقے ہیں۔

موجودہ اور فوری حالات کے تحت نہ تو ہمیں رُپے کی شرح مبادلہ کو بڑھانے کی ضرورت ہے اور نہ گھٹانے کی۔

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

حکومتِ ہند کی صنعتی پالیسی

از: ــــــــــــــــ ڈ۔ ر۔ سمنت

گزشتہ اپریل میں حکومت ہند نے ایک کمیونکے شائع کیا تھا اور اس میں اپنی صنعتی پالیسی کے عارضی خد وخال بتائے تھے حکومت نے اعتراف کیا تھا کہ اب تک مُلک کی صنعتی ترقی کے سلسلے میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی گئی ہو، صرف گزشتہ جنگ کے بعد حکومت نے کچھ خاص صنعتوں کی حفاظت کے لیے تھوڑی سی مداخلت کی ۔ یہی ایک مثال مداخلت کی ہو، عام رویّہ بہرحال عدم مداخلت کا رہا ہو۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہو کہ حکومت اس پالیسی کو ترک کرنے والی ہو۔

کمیونکے میں یہ الفاظ درج تھے ۔" حکومتِ ہند کا خیال ہو کہ ہندستان میں اس جنگ کے بعد جو حالات پیدا ہوں گے اُن کے تحت موجودہ پالیسی کا جاری رکھنا غلط ہوگا اور اُس سے مکمل معاشی توسیع وتعمیر کے مقاصد نہیں پورے ہوسکتے ۔" چناں چہ حکومت نے فیصلہ کیا ہو کہ ملک کو پُورے پُورے طور پر اور تیزی کے ساتھ صنعت وحرفت کی دولت سے مالا مال کرنے کے لیے خود اپنی طرف سے قدم اُٹھائے اور صنعتوں کی ہر طرح ہمّت افزائی کرے ۔" اس بِنا پر ہم اس کمیونکے کو ہندستان کی معاشی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل قرار دے سکتے ہیں اس لیے کہ اُس میں حکومتِ ہند کی نئی صنعتی پالیسی کا اعلان کیا گیا ہو۔

نئی صنعتی پالیسی کو عمل میں لانے کے لیے حکومتِ ہند نے اپنے سامنے جو مقاصد متعین کیے ہیں اُن کو مختصر طور پر یوں پیش کیا جاسکتا ہو :۔

(۱) ملک میں جلد از جلد صنعت و حرفت کا ایک جال پھیلا دینا۔
(۲) مختلف علاقوں میں صنعتوں کی متوازن تقسیم کرنا۔
(۳) پورے ملک کی معیشت کو متوازن طریقے سے ترقی دینا۔
(۴) قومی نفع کی منصفانہ تقسیم کا انتظام کرنا۔

ملک میں جلد از جلد صنعت و حرفت کو پھیلانا

اِس سلسلے میں حکومت مندرجہ ذیل کارروائی کرنے کے لیے تیار ہی:-

(ا) قومی اہمیت کی تمام بنیادی صنعتوں کو اجتماعی ملکیت کے تحت لانا۔
(ب) جہاں جہاں معاشی تعمیر و توسیع کی ضرورت ہو وہاں ذاتی کاروبار کے پہلو بہ پہلو سرکاری کاروبار شروع کرنا۔
(ج) ذاتی کاروبار کرنے والوں کو مالی امداد فراہم کرنا۔
(د) یہ مقرر کرنا کہ نفع کا کم سے کم اتنا حصہ سرمایے میں شامل کیا جائے گا۔ یا کچھ سال کے لیے سرکاری آمدنی کا نقصان برداشت کرنے کا ذمہ لینا۔ مالی امداد فراہم کرنے کے علاوہ متعدد طریقوں سے صنعتوں کی اعانت کرنا۔ جیسے سائنسی تحقیقات کا انتظام کرنا، پیداوار کو معیاری بنانا، اشیاے اصل یعنی مشینیں اور کلیں وغیرہ فراہم کرنا، فنی ماہرین مہیا کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہی کہ ان کارروائیوں سے ملک میں جلد از جلد اور پورے طور پر صنعت و حرفت پھیلانے کا مقصد پورا ہوتا ہی یا نہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ معاشی پالیسی کے تعین میں نہ صرف ہمارے معاشی اغراض و مقاصد کا ہاتھ ہوتا ہی بلکہ اُن معاشی اداروں اور معاشی نظام کا بھی جس کے تحت ہم اپنے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ دو مختلف قسم کے معاشی نظام میں چاہے اغراض و مقاصد ایک ہی مقرر کیے جائیں لیکن معاشی پالیسی یقیناً مختلف ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں اس استدلال کا مقصد اس بات کو واضح کرنا ہی کہ ہمیں ذاتی کاروبار اور آزاد مبادلے کے تحت رہ کر ہی ملک کے ذرائع اور وسائل کو کام میں لانا ہی اور قومی دولت میں اضافہ کرنا ہی اس لیے ہماری معاشی پالیسی کو بھی اُسی کے مطابق ہونا چاہیے، اگرچہ وہ ذاتی کاروبار اور آزاد مبادلہ بالکل آزاد اور ذاتی نہیں ہوگا بلکہ اُس پر ایک حد تک سرکاری نگرانی بھی رہے گی۔ فی الحال شاید ہمارے سامنے یہی صورت ہی۔

اگر ہمیں ایسے ہی نظام کے تحت عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہی جیسا کہ حکومتِ ہند چاہتی ہی تو پھر یہ مقصد اسی وقت

پورا ہو سکتا ہے کہ عوام کی قوتِ خرید میں اضافہ کیا جائے ۔ اشیا کے استعمال کو بڑھانے کا مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے کہ عوام کے پاس خریدنے کے لیے پیسے ہوں ۔ لوگ اسی وقت زیادہ سے زیادہ چیزیں خریدیں گے جب اُن کی آمدنی تو وہی رہے لیکن اشیا کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی قیمتیں گھٹتی جائیں یا پھر یہ ہو کہ چیزوں کی قیمت وہی رہے لیکن لوگوں کی نقد والی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ جب قیمتیں گر رہی ہوں گی تو ذاتی کاروبار نہیں چل سکتا۔ ذاتی کاروبار کے نظام میں چیزوں کی پیدایش اُسی وقت ہو سکتی ہے کہ کاروبار کرنے والوں کو یقین ہو کہ قیمت اس حد سے نیچے نہ گرنے پائے گی اور وہ حد ایسی ہو جو ان کے لیے نفع بخش ہو۔ غرض پیدایشِ اشیا کو آگے بڑھانے کے لیے پہلے ضروری یہ ہے کہ مانگوں کو آگے بڑھایا جائے۔ محض پیدایش کے ذریعوں کو بڑھانے اور پھیلانے سے چیزوں کے صرف میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ چناں چہ حکومت نے جو معاشی پالیسی بنائی ہے اُس کے دو مقصد ہونے چاہییں :- (۱) پیدایش کے ذریعوں کو ترقی دینا (۲) لوگوں کی مانگوں میں اضافہ کرنا تاکہ پیدا کی ہوئی چیزیں بِک سکیں ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومتِ ہند کی تجویزیں اس معیار پر پوری اُترتی ہیں یا نہیں۔ اگر پیدایش کے ذریعوں کو ترقی نہیں دی گئی اور مانگیں بڑھتی رہیں تو افراطِ زر کا خطرہ پیدا ہوگا اور اگر پیدایش کے ذریعے بہت پھیلا دیے گئے اور چیزیں بڑی مقدار میں پیدا ہونے لگیں لیکن لوگوں کی مانگ میں اضافہ نہیں ہوا تو معاشی ذریعوں اور وسیلوں کی بربادی ہوگی۔

حکومت کے سامنے سب سے پہلا پروگرام یہ ہے کہ کچھ بنیادی صنعتوں کو جو قومی اہمیت کی مالک ہیں قومی ملکیت بنا دیا جائے لیکن اس کے ساتھ ایک شرط ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر کافی ذاتی سرمایہ نہیں آیا تبھی انھیں قومی ملکیت بنایا جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ذاتی سرمایہ اس وجہ سے نہیں آیا کہ کاروبار کرنے والوں کو اُن صنعتوں کا علم نہیں ہے یا وہ اُن کو چلا نہیں سکتے تو ایسی حالت میں اُن صنعتوں کو قومی ملکیت بنانا مفید ہوگا اور مُلک کی صنعتی ترقی ہوگی۔ لیکن اگر ذاتی سرمایہ اس وجہ سے نہیں آیا کہ خود موجودہ معاشی حالات میں خرابیاں ہیں تو صنعتوں کو محض قومی ملکیت بنا دینے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر ذاتی کاروبار میں لوگ سرمایہ نہیں لگاتے تو اس کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ چیزوں کی مانگ کم ہے۔ ایسی حالت میں حکومت اگر اپنا مجوزہ سرمایہ لگائے گی تو اس سے قومی آمدنی پر اچھا اثر نہیں پڑے گا تاوقتیکہ اُن سے لوگوں کی مجموعی مانگ میں اضافہ نہ ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ قطعی غیر اہم ہے کہ کون سرمایہ لگا رہا ہے۔ اصل اور اہم سوال یہ ہے کہ کس طریقے سے سرمایہ لگایا جا رہا ہے۔ اگر سرمایہ ایسی پالیسی کے تحت لگایا جا رہا ہے جس سے دوسرے کاروبار اور صنعتوں میں سرمائے کا لگنا بند یا کم ہو جائے گا تو اس سے ملک کی معیشت میں مجموعی حیثیت سے توسیع اور ترقی نہیں ہو سکے گی۔ ریاست اپنا سرمایہ بنیادی صنعتوں میں لگا رہی ہے جس کا اعلان بھی ہو چکا ہے لیکن اگر صرفی چیزوں کی مانگ مُلک میں نہیں ہے تو یہ بنیادی صنعتیں پیدایش کے جو ذریعے پیدا کریں گی خود اُن کی مانگ نہیں ہوگی۔ جب صرفی چیزوں کی مانگ مُلک میں ہوگی تبھی کاروبار کرنے والے وہ چیزیں یعنی پیدایش کے ذریعے خریدیں گے جو بنیادی صنعتوں سے پیدا ہوں گے۔

پھر صرفی چیزوں کی مانگ بہ جائے خود منحصر ہے لوگوں کی زوالی آمدنی پر ۔ ــــــــــ اگر لوگوں کی زوالی آمدنی میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے تو پھر نہ تو صرفی چیزوں کی مانگ پیدا ہوگی اور نہ اُن چیزوں کی، جو بنیادی صنعتوں سے پیدا ہوں گی چناں چہ ریاست جو سرمایہ لگا رہی ہے اُس سے اگر قوم کی مجموعی زوالی آمدنی میں اضافہ نہیں ہوا تو پھر کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ چوں کہ یہ سرمایے حکومت کی طرف سے لگائے جائیں گے اس لیے جو نقصانات ہوں گے وہ ٹیکس دینے والوں کی جیب سے پورے کیے جائیں گے۔

حکومت ایک اور قسم کی صنعتوں کو قومی ملکیت کے تحت لانا چاہتی ہے یعنی ایسی صنعتوں کو جن میں منافع سے زیادہ ٹیکس کے عنصر کو دخل ہے ۔ لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ کوئی صنعت بہ جائے خود ایسی نہیں ہوتی جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ اس میں منافع کا عنصر کم ہے اور ٹیکس کا عنصر زیادہ ۔ اس فیصلے کا انحصار معاشی حالات اور سماجی پالیسی پر ہے کہ کسی خاص صنعت کو ٹیکس وصول کرنے کا ذریعہ بنایا جائے یا نہیں ۔ نمک کی صنعت ٹیکس کی وصولی کا ذریعہ ہے اور موٹر کی صنعت نہیں ہے لیکن موٹر کی صنعت محض اس وجہ سے ٹیکس کے وصول کرنے کا ذریعہ نہیں ہے کہ وہ موٹر کی صنعت ہے بلکہ اس کے اسباب دلیل موجود ہیں عام طور پر انھی چیزوں کو ٹیکس وصول کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے جن کی مانگ زیادہ رہتی ہے لیکن جس میں لوگوں کو بہت کم پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں ۔ دیاسلائی کی صنعت مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے اسے سب سے پہلے قومی ملکیت کے تحت لانے کی ضرورت ہے ۔ اس کے بعد تمباکو کی صنعت کو لے لیجیے ۔ لیکن ایسا اس لیے ہے کہ ہم نے ٹیکس عائد کرنے کے کچھ اصولوں کو تسلیم کر لیا ہے۔

لیکن صنعت کی توسیع و ترقی کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس قسم کی صنعتوں کو قومی ملکیت کے تحت لانا جن کا مقصد حکومت کی آمدنی میں اضافہ کرنا ہے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ۔ اگر حکومت کی مالی ضرورتوں کے تحت اِن چیزوں کے دام بڑھنے پڑے تو اُن کو قومی ملکیت بنانے کی پالیسی سے نہ صرف ان چیزوں کی مانگ کم ہوگی بلکہ مجموعی حیثیت سے تمام مانگوں میں کمی ہوگی ۔ اس سے صنعتوں کی توسیع و ترقی نہیں ہو سکتی ۔

خاص خاص صنعتوں کو پورے طور پر قومی ملکیت بنانے کے علاوہ حکومت کے سامنے یہ بھی پروگرام ہے کہ کچھ قومی اہمیت کی صنعتوں کو جیسے جہاز سازی ، انجن سازی اور بوائلر بنانے کی صنعتوں میں سرکاری سرمایہ بھی رہے گا اور انفرادی سرمایہ بھی ۔ ـــ شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ ان صنعتوں کے کچھ کارخانے تو حکومت چلائے گی اور کچھ کو سرمایہ دار چلائیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ان صنعتوں کا اجرا سب سے پہلے سرکاری سرمایے اور نگرانی میں ہوگا تو پھر بعد میں سرمایہ داروں کو کیوں آنے کی اجازت دی جائے خاص کر جب کہ آج کل سماجی نقطۂ خیال سے ذاتی سرمایے کے تحت کسی صنعت کا چلنا زیادہ اچھا

نہیں سمجھا جاتا ہو۔ لیکن اگر یہ ہوا کہ صنعتیں انفرادی سرمائے کے تحت جاری ہوجائیں اور بعد میں ریاست داخل ہو اور انفرادی کاروبار کو ختم کرنے کی کوشش کرے تو کچھ اہم معاشی سوالات کا پیدا ہونا ضروری ہو۔ اگر ریاست اس ارادے سے داخل ہوئی کہ سرمایہ داروں کی اجارہ داری کی پالیسی کو ختم کرے تو سرکاری مداخلت کا نتیجہ اچھا نکلے گا۔ لیکن اگر ریاست محض اس لیے داخل ہوئی کہ چوں کہ یہ صنعتیں قومی اہمیت کی حامل ہیں اس لیے اُن کو پھیلانے اور بڑھانے کی ضرورت ہو تو پھر بڑے پیچیدہ معاشی مسئلے پیدا ہوں گے۔ ریاست کے حصّے دار بن جانے کے بعد پیدائش کی جو توسیع ہوگی تو قیمتیں بہت گر جائیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ذاتی سرمایے کے تحت کاروبار بہت گھٹ جائے گا اور معاشی ذریعوں اور وسیلوں کی بربادی ہوگی۔ اگر سرمایہ داروں کو ایک معقول شرح پر منافع دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا تو پھر سرکاری سرمایے سے جو کاروبار چلے گا اُس سے ٹیکس دینے والوں پر بوجھ بڑھ جائے گا۔ سرکار جو سرمایہ لگائے گی اُن کا مالی بوجھ اُسی وقت کم ہوسکتا ہو اگر ان صنعتوں کی پیدا کی ہوئی چیزوں کی مانگ اور خریداری بڑھے۔ موخرالذکر چیز کا انحصار ملک کی عام معاشی ترقی پر ہو۔ یہ خوش حالی اور معاشی ترقی صنعتوں کو قومی ملکیت بنا دینے سے نہیں پیدا ہوگی۔

حکومت کی یہ بھی تجویز ہو کہ ایسی صنعتوں میں جو ملک کی معاشی ترقی کے لیے اہم ہیں اگر سرمایے کافی نہیں لگائے جارہے ہیں تو یا تو لوگوں کو قرضے دیے جائیں کہ وہ سرمایہ لگا سکیں یا حکومت خود سرمایہ دے کر حصّے دار بن جائے۔ یہاں پر بھی حکومت مجبور ہوگی کہ سرمایے دار حصّے داروں کو معقول منافع دینے کے لیے خود منافع نہ لے۔ اس سے ٹیکس دینے والوں پر بوجھ بڑھ جائے گا تا وقتے کہ عام مانگ میں اضافہ نہ ہو۔ لیکن اس طرح سرکاری سرمایہ لگانے سے خود بہ خود مانگ میں اضافہ نہیں ہوگا۔ اس قسم کی مالی امداد کا مطلب یہ ہوگا کہ ٹیکس دینے والوں پر بوجھ اور بڑھ جائے۔

صنعتی پھیلاؤ کی شرطیں

محض حکومت کے سرمایہ لگانے سے معاشی ترقی کی رفتار تیز نہیں کی جاسکتی۔ سرکاری سرمایے سے صنعت کا پھیلاؤ اُسی وقت ہوسکتا ہو کہ اُس کے علاوہ ذاتی سرمایے بھی لگائے جائیں۔ لیکن اگر سرکاری سرمایے نے ذاتی سرمایے کی جگہ لے لی تو اس سے معاشی توسیع نہیں ہوسکتی۔ یہی نہیں بلکہ اگر سرکاری سرمایے کی وجہ سے حکومت پر مالی بوجھ بڑھ گیا تو اس سے ملک کی معیشت پر بُرے اثرات پڑیں گے۔ جب حکومت کاروبار میں سرمایے لگائے گی تو ٹیکس بڑھے گا۔ اس کا اثر اشیا کے صرف پر اور پوری معیشت پر پڑے گا۔

یہ بات صاف ہوگئی کہ صنعتی توسیع و ترقی کے لیے محض اتنا کافی نہیں ہو کہ حکومت صنعتی کاروبار میں سرمایہ لگائے اصل سوال یہ ہو کہ حکومت اگر سرمایہ لگا رہی ہو تو کس قسم کی پالیسی کے تحت۔ اگر سرکاری سرمایے ذاتی سرمایوں کے

علاوہ لگائے جا رہے ہیں تبھی مُلک کے روزگار اور آمدنی میں مجموعی طور پر اضافہ ہوسکتا ہو یعنی زر والی آمدنی میں بھی اضافہ ہوسکتا ہو اور اصل آمدنی میں۔ غرض حکومت کی مالی پالیسی ہی اصل اور فیصلہ کن چیز ہو۔

حکومت کی اس مالی پالیسی کا بیان از سرِ نو تنظیم کے منصوبے کی دُوسری رپوٹ میں موجود ہو۔ رپوٹ کے صفحہ ۵ پر بتایا گیا ہو کہ مرکزی حکومت اپنی طرف سے سرمایہ لگانے کے لیے یا صوبائی حکومتوں کی صنعتی اسکیموں کے لیے ہر ممکن طریقے سے سرمایہ اکٹھا کرے گی چاہے وہ مزید ٹیکس کے ذریعے ہو یا قرضوں کے ذریعے۔ جس کیونیکے کا اُوپر تذکرہ آیا ہو اُس میں بھی اسی مالی پالیسی کا نقشہ پیش کیا گیا ہو۔ حکومت نے بتایا ہو کہ سرمائے کی نکاسی پر نگرانی رکھی جائے گی تاکہ مُلک کی بچت کی رقموں سے کافی سرمایہ حاصل کیا جا سکے۔ غرض اس مالی پالیسی کا مطلب یہ ہو کہ سرکاری سرمایہ ذاتی سرمائے کی جگہ لے لے گا۔ یہ اوپر بتایا جا چکا ہو کہ اس قسم کی پالیسی سے ملک کی معیشت میں توسیع و ترقی نہیں ہوسکتی۔ حکومتِ ہند ابھی تک یہ محسوس نہیں کر سکی ہو کہ جب تک موجودہ زر والی آمدنی سے سرمایہ نکال نکال کر کاروبار اور صنعت میں لگایا جاتا رہے گا اُس وقت تک مُلک کی معیشت کو آگے بڑھایا اور پھیلایا نہیں جا سکتا۔ اس سے صرف یہ ہوسکتا ہو کہ ملک کی معیشت ایک خاص سطح پر قائم رہے، لیکن اس میں توسیع و ترقی نہیں ہوسکتی اس لیے کہ اس طرح سرمایہ لگانے سے مجموعی طور پر مانگوں میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ نہ صرف یہ بلکہ حکومت جب بڑے پیمانے پر قرضے لے کر صنعتی کاروبار میں لگائے گی تو ذاتی کاروبار اور سرمایہ کاری پر اُس کا خراب اثر پڑ سکتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر حکومت کے قرضے لینے کی وجہ سے سود کی شرح میں اضافہ ہوگیا تو پیدائش کے اخراجات میں اضافہ ہو جائے گا، ہندستان کی صنعت دُوسرے ملکوں کی صنعت کا مقابلہ نہیں کر سکے گی اور لوگ سرمایہ کم لگانے لگیں گے۔ غرض حکومت کی صنعتی پالیسی کو اگر اُس کی مالی پالیسی کی روشنی میں دیکھا جائے تو اُس سے صنعتوں کے تیزی سے ترقی کرنے کی امید نہیں پیدا ہوتی۔ ممکن ہو اس پالیسی سے ملک کے پاس سرمائے اور مشینوں کی کمی نہ رہے لیکن کوئی ضروری نہیں کہ لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہو۔

صنعتوں کی متوازن ترقی

ہندستان میں صنعتوں کو اس ڈھنگ سے چلانا ہو کہ کوئی ایک علاقہ دُوسرے علاقوں کی بہ نسبت صنعتی لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ نہ ہو جائے یا کوئی ایک صنعت دُوسری صنعتوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی نہ کر جائے۔ سرکاری کیونیکے میں یہ درج ہو کہ اگر صنعتی معیشت میں باقاعدگی اور باضابطگی قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تو یہ ہوگا کہ سرمایہ دار انھی اسکیموں پر دوڑ پڑیں گے جن میں زیادہ منافع کی امید ہو۔ اس سے کچھ خاص صنعتوں کی پیدائش بہت بڑھ جائے گی اور دُوسری صنعتوں کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں جائے گی چاہے قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے اُن نظرانداز کی ہوئی صنعتوں کی کتنی ہی اہمیت ہو۔ صنعتوں کو باقاعدہ طور پر چلانے کے لیے ضروری ہوگا کہ کچھ خاص مقاصد مقرر کیے جائیں۔

(جیسے فلاں صنعت کی پیداوار اتنی بڑھائی جائے) اور پھر صنعتی پیدائش کا کام علاحدہ علاحدہ علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اس کو مکمل کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ اسکیم میں جو مقاصد مقرر کیے گئے ہیں وہ پورے ہو جائیں۔ لیکن حکومت نے صاف صاف یہ نہیں بتایا ہی کہ اس چیز کو کس طرح عمل میں لایا جائے گا۔ غالباً حکومت قومی پیمانے پر الگ الگ صنعتوں کی اسکیم اور مقاصد مقرر کرے گی اس کے بعد مجموعی طور پر جتنی پیداوار بڑھانے کی اسکیم ہی اس کو مختلف علاقوں میں تقسیم کر دے گی تاکہ ہر علاقہ اپنی اپنی مقرر کی ہوئی پیداوار کی تکمیل کرے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ہوگا کہ جب تک کوئی صنعت اپنے کام کی تکمیل نہ کرے اور اپنی مقرر کی ہوئی پیداوار کی حد تک نہ پہنچ جائے حکومت دوسری صنعتوں کو پھیلنے سے روکے رکھے گی۔ یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہی کہ اگر کوئی پچھڑا ہوا علاقہ اپنی مقرر کی ہوئی حد تک نہ پہنچ سکے تو کیا دوسرے علاقوں میں اس صنعت کو آگے بڑھنے سے حکومت روک رکھے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صنعتی ترقی کی باگ ڈور سب سے پچھڑے ہوئے علاقے کے ہاتھ میں ہوگی۔ اگر وہ علاقہ ترقی نہیں کر رہا ہی تو پوری صنعت کی ترقی و توسیع رکی رہے گی۔

حکومت کے سامنے یہ بھی مقصد ہی کہ صنعتوں کو متوازن طریقے سے مختلف علاقوں میں تقسیم کرنے کے علاوہ مختلف صنعتوں کی توسیع و ترقی بھی متوازن طریقے سے عمل میں لائے۔ عام شکایت یہ پائی جاتی ہی کہ سرمایہ دار انھی صنعتوں کی طرف دوڑتے ہیں جن سے جلد منافع ملنے کی امید ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ کچھ صنعتوں میں تو پیدائش حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہی اور کچھ صنعتیں بے توجہی کی شکار ہو جاتی ہیں۔ اس صورتِ حال کو رفع کرنے کے لیے حکومت کی تجویز ہی کہ کسی صنعت کو ایک مقررہ حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ یہ تجویز اس خیال سے قائم کی گئی ہی کہ اس طرح کسی ایک ہی صنعت میں بہت سا سرمایہ صرف اور ضائع ہونے سے محفوظ رہے گا اور بچا ہوا سرمایہ دوسری ضروری صنعتوں میں لگ جائے گا۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہی کہ یہ اندازہ غلط ہی۔ یہ سوچنا غلط ہی کہ چوں کہ کسی ایک صنعت میں سرمایہ آنا بند ہو جائے گا تو لوگ خود بہ خود دوسری صنعتوں میں سرمایہ لگانا شروع کر دیں گے۔ حکومت زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہی کہ کسی خاص صنعت میں لوگوں کو سرمایہ لگانے سے روک دے لیکن وہ لوگوں کو دوسری صنعتوں میں سرمایہ لگانے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ دوسری صنعتوں میں لوگ اسی وقت سرمایہ لگائیں گے جب کہ ان صنعتوں کی حالت سدھرنے اور ان کے ترقی کرنے کی امید ہو۔ ایک صنعت میں سرمایہ لگانے کی پابندی عائد کرنے سے خود بہ خود دوسری صنعتوں میں سرمایہ لگنا نہیں شروع ہو جائے گا۔ بلکہ ان پابندیوں کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ سرمایہ لگانا ہی بند کر دیں گے۔ اس طرح ملک کی معیشت پھیلنے اور بڑھنے کی بہ جائے اور سکڑنے لگے گی۔ ہمارا خیال ہی کہ جب بے روزگاری پھیلی ہوئی ہو تو کسی ایک صنعت میں بہت سے سرمائے کا لگ جانا بُرا نہیں ہی۔ اس سے سرمایہ لگانے والوں کو چاہے نقصان ہو لیکن بہ حیثیت مجموعی سوسائٹی کو فائدہ ہی پہنچے گا۔ بے روزگاری کی حالت میں غلط راستے پر سرمائے کا لگ جانا اس بات سے بہتر ہی کہ بالکل سرمایہ نہ لگے۔

مُلکی معیشت کی متوازن ترقی

حکومت نے یہ بھی اعلان کیا ہو کہ اُس کا مقصد نہ صرف مختلف صنعتوں کو متوازن طریقے سے آگے بڑھانا ہو بلکہ پورے مُلک کی معیشت کی ترقی میں ایک توازن قائم کرنا ہو۔ اس مقصد کے تحت حکومت چاہتی ہو کہ ذاتی اور انفرادی سرمایے کاری پر نگرانی قائم کرے تاکہ صنعت، زراعت اور سماجی سروسوں میں متوازن طریقے سے سرمایہ لگنا شروع ہو۔ مطلب یہ ہو کہ جس طرف سرمایہ زیادہ لگ رہا ہو اس طرف پابندی عائد کرکے سرمایے کاری کا رُخ اُس طرف پھیرا جائے جدھر سرمایے کی ضرورت ہو۔ ہمارا خیال ہو کہ یہ پالیسی اُسی وقت صحیح ہوسکتی ہو کہ ہماری معیشت میں مکمل روزگار کے حالات موجود ہوں۔ لیکن ہندستان جیسے مُلک میں جہاں ابھی تک کچّا مال اور مزدور اور ذرائع و رسائل بے کار پڑے ہیں اور استعمال میں نہیں آرہے ہیں یہ پالیسی بالکل غلط ہوگی۔ ہندُستان میں جو حالات ہیں ان کے تحت بہتر یہ ہو کہ تمام سمتوں میں اور ہر طرف زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگایا جائے اس لیے کہ یہاں معاشی ذرائع اور وسائل بے کار پڑے ہیں اور ان کو پُورے طور پر کام میں لانے کی ضرورت ہو۔ متوازن اور معاشی ترقی کا مطلب یہ ہو کہ اگر ایک سمت میں ترقی زیادہ ہورہی ہو تو دُوسری سمتوں میں بھی ترقی کی رفتار تیز کی جائے یہاں تک کہ اوّل الذکر کے مقابلے میں اُسے لاکھڑا کیا جائے۔ یہ طریقہ غلط ہو کہ جس سمت میں ترقی ہورہی ہو اس کو روکنے کی کوشش کی جائے۔

قومی منافع کی تقسیم

سرکاری کیونکے میں قومی منافع کی منصفانہ تقسیم کی بھی تجویزیں ہیں۔ حکومت نے تین عناصر پر زور دیا ہو (۱) صنعتی مزدوروں کو اچھی مزدوری دینا، ان کے رہنے سہنے کی حالت کو سدھارنا، کام کرنے کے حالات کی اصلاح کرنا، اور مزدوروں کو ملازمت کا تحفظ عطا کرنا۔ (۲) سرمایے داروں کو بہت زیادہ منافع حاصل کرنے سے روکنا۔ (۳) چند لوگوں یا کسی خاص فرقے کے ہاتھوں میں معاشی اور صنعتی طاقت کو آجانے سے روکنا۔

یہ آخری تجویز ایک بالکل نئی قسم کی تجویز ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے حکومت نے کہا ہو کہ کنٹرول سے کام لیا جائے گا جیسے سرمایے کی نکاسی پر کنٹرول کرنا اور صنعتوں کو مختلف علاقوں میں تقسیم کرنے کا انتظام کرنا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کنٹرول کے ذریعے حکومت آخر کس طرح صنعتی اور معاشی طاقت کو چند افراد یا کسی ایک فرقے کے ہاتھوں میں مجتمع ہونے سے روک سکتی ہو۔ کیا حکومت یہ کرے گی کہ جب کوئی فرد ایک مقررہ حد تک سرمایہ لگادے تو پھر اُس کو مزید سرمایے کاری سے روک دیا جائے؟ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ کسی ایک فرد کے نام پر بہت زیادہ سرمایے کاری کو کامیابی کے ساتھ روکا جاسکتا ہو تو بھی کیا ایسا ہوسکتا ہو کہ اس فرد کے اختیار اور طاقت کو بھی روک دیا جائے؟ اس سے بھی زیادہ سمجھ میں نہیں آنے والی بات یہ ہو کہ حکومت کسی طرح معاشی طاقت کو کسی ایک فرقے کے ہاتھوں میں جمع ہونے سے روک سکتی ہو۔ کیا حکومت یہ کرے گی کہ اُن علاقوں میں مزید سرمایے کاری روک دے یا لائسنس بٹھادے جہاں کسی ایک فرقے کے لوگ زیادہ آباد

ہیں؟ یا حکومت یہ طریقہ اختیار کرے گی کہ سرمایہ کاری کے خاص خاص حدیں مقرر کر دے اور فرقے وارانہ بنیاد پر ان کی تقسیم کرے، تاکہ کسی ایک دولت مند فرقے کا مجموعی سرمایہ اُس وقت تک کسی مخصوص حد سے آگے نہ جانے پائے جب تک سب سے غریب فرقہ اُس مقرر کی ہوئی حد تک نہ پہنچ جائے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی ایک فرد یا فرقے کے ہاتھوں میں اگر فالتو ذرائع اور وسائل موجود ہیں تو ان کا کیا ہوگا۔ کیا وہ ذرائع اور وسائل یونہی بے کار پڑے رہیں گے؟ اگر حکومت یہ چاہتی ہے کہ کسی ایک فرقے یا فرد کے ہاتھ میں بہت زیادہ دولت نہ جمع ہونے دے تو اُس کا پھر ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ حکومت دولت مند فرقے یا فرد کی دولت ضبط کر لے۔

حکومت کی مجوّزہ صنعتی پالیسی کا کیا اثر ہوگا

اوپر جس معاشی پالیسی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اُس سے قومی منافع کی توسیع کی امیدیں نہیں پیدا ہوتیں اور نہ قومی آمدنی کی منصفانہ تقسیم ہو سکتی ہے۔ اس پالیسی سے یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ مُلک کے ذرائع پیدائش بڑھ جائیں۔ لیکن محض پیدائش کے ذریعوں کی موجودگی سے پیدائش میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ پیدائش کی توسیع و ترقی مرکزی حکومت کی مالی پالیسی پر منحصر ہوگی حکومت اس وقت جس قسم کی مالی پالیسی کو چلانا چاہتی ہے اس سے معاشی توسیع کی امید نہیں پیدا ہوتی۔ موجودہ مالی پالیسی کے تحت توسیع و ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے کہ ملک کے اندر مانگ اور خریداری کی جو کمی ہے اُسے غیر ملکوں کی مانگ کے ذریعے پُورا کیا جائے۔ لیکن موجودہ حالات میں ہندستان کے لیے یہ چیز ناممکن ہے۔

اس صنعتی پالیسی سے ہم غیر ملکوں کے دستِ نگر ہو جائیں گے اور ہم پر بہت سی غیر ملکی ذمّے داریاں آ پڑیں گی۔ یہ صورتِ حال اور بھی بدتر ہوگی۔ مُلک کے اندر جو قرضے لیے جائیں گے اُن سے اندرونِ ملک میں ہی قوّتِ خریداری لوگوں کے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ غیر ملکی قرضوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مُلک میں مجموعی حیثیت سے چیزوں کی کھپت کم ہو جائے گی۔ مال کی کھپت کو مال کی پیدائش کے مقابلے میں کم رکھنا پڑے گا یہ تو ایسی صورت میں ہوگا کہ ہمیں غیر ملکوں سے قرضے لینے پڑیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اگر غیر مُلکی قرضوں سے مُلک کی مجموعی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے جو غیر مُلکی قرضوں سے مقدار قیمت میں زیادہ ہے تو ملک کو منافع ہوگا۔ لیکن اگر حکومت ہند کی مالی پالیسی سے پیدائش میں توسیع و ترقی نہیں ہو سکتی تو پھر غیر ملکی قرضوں سے ہمیں منافع کی بہ جائے نقصان ہوگا۔

حکومت نے جس صنعتی پالیسی کا خاکہ پیش کیا ہے اُس سے آمدنی کی تقسیم پر بھی خراب اثر پڑے گا۔ یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ حکومت کی نئی مالی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کی آمدنی پر مستقل طور سے ایک بوجھ قائم رہے گا۔ حکومت یا عوام کی آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ ٹیکس دینے والوں پر بوجھ پڑے گا۔ اس سے اشیاے اصل کا نئی جمع ہو جائیں گی لیکن موجودہ معاشی حالات

کے اندر ذاتی کاروبار کرنے والوں کو فائدہ پہنچنے کی امید نہیں ہوگی۔ اشیائے اصل کی موجودگی سے اُسی وقت فائدہ ہوسکتا ہے کہ ملک میں عام طور سے معاشی ترقی کی صورت پیدا ہو یعنی لوگوں کی قوتِ خریداری میں اضافہ ہو۔ لیکن مجوزہ پالیسی کے تحت قوتِ خریداری میں اضافہ ہونے کی امید نہیں۔ چناں چہ ٹکس دینے والوں پر بوجھ قائم رہے گا اور جب تک مُلک کی مانگوں میں اضافہ نہیں ہوگا اُس وقت تک ٹکس دینے والے بڑے بڑے مالیاتی سرمایہ داروں کو سود کی رقم ادا کرتے رہیں گے۔ اِس سے آمدنیوں کی جو غیر مساوی اور غیر منصفانہ تقسیم ہے وہ اور زیادہ ہوجائے گی۔ حکومت صنعتی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے سماجی سروسوں (جیسے ریل ڈاک وغیرہ) کے اخراجات کم کرنے کی کوشش کرے گی۔ ٹکس کی سختیاں اور بڑھ جائیں گی۔ مختصر یہ کہ حکومت نے جس صنعتی پالیسی کا اعلان کیا ہے اُس سے ٹکس بڑھ جائیں گے، سود کی شرح میں اضافہ ہوگا اور لوگ سرمایہ کم لگائیں گے۔ اِس سے ذاتی کاروبار شروع کرنے کی خواہش لوگوں میں نہیں ہوگی۔ نہ صرف مُلک کی معیشت اور گھٹنی شروع ہوگی بلکہ غیر ملکی مال کی درآمد کے لیے زمین تیار ہوجائے گی۔ اس لیے کہ ہندستان میں غیر ملکوں کے بہ نسبت پیدائش کے اخراجات زیادہ ہوں گے اور ہندُستان کی صنعت دُوسرے ملک کی صنعتوں کا مقابلہ نہیں کرسکے گی۔

[دی انڈین جرنل آف اکانومکس]

مسائلِ حاضرہ (ہندوستان)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے ہندوستان کی تجارت

از: ـــــــ گریس اے۔ وِی دے۔ او۔ اور ڈی۔ اے۔ پرنس پرسٹمن دفتر بین اقوامی شعبۂ تجارت ریاست ہائے متحدہ امریکہ)

جنگ کو ختم ہوئے عرصہ گزر چکا ہی اس لیے اب جنگ کے دوران میں ہندوستان اور امریکہ کے درمیان تجارت کا جو سلسلہ قائم تھا، اُس کا پورا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہی۔ ذیل کی سطروں میں ہم اُسی کا تذکرہ کریں گے اور ساتھ ہی ہندوستان اور امریکہ کی تجارت کے مستقبل کا بھی اندازہ لگائیں گے۔ پہلی جنگِ عظیم کی طرح دُوسری جنگِ عظیم کے دوران میں بھی امریکہ سے کافی مال ہندوستان آیا۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں ۳ کروڑ ۴۳ لاکھ ۴۱ ہزار ڈالر کا مال امریکہ سے ہندوستان آیا۔ اور سنہ ۱۹۴۴ء میں جب کہ قرضہ پٹہ معاہدے کے تحت مال کی سب سے زیادہ درآمد ہو رہی تھی ۷۷ کروڑ ۷۵ لاکھ ۵۷ ہزار ڈالر کا ـــــــ سنہ ۱۹۴۵ء میں یہ درآمد گھٹ گئی۔ اُس سال صرف ۴۹ کروڑ ۱۲ لاکھ ۵۱ ہزار ڈالر کا مال ہندوستان میں آیا۔ اسی طرح جنگ کے دوران میں ہندوستان سے بھی پہلے سے زیادہ مال امریکہ بھیجے گئے۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں ۵ کروڑ ۸۳ لاکھ ۷۴ ہزار ڈالر کا ہندوستانی مال امریکہ بھیجا گیا۔ اور سنہ ۱۹۴۵ء میں ۱۷ کروڑ ۱۳ لاکھ ۷۵ ہزار ڈالر کا۔

رقم کے اس اضافے کی ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ جنگ کے زمانے میں چیزوں کے دام بہت زیادہ تھے لیکن اس کے ساتھ تجارتی مال کی مقدار میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ یعنی ہندوستان نے پہلے سے زیادہ مال امریکہ بھیجا اور امریکہ نے بھی پہلے سے زیادہ مال ہندوستان بھیجا۔ لیکن یہ اضافہ ہر قسم کے مال میں نہیں ہوا۔ گزشتہ سات سال کے اندر جتنی قیمت کا مال امریکہ سے ہندوستان آیا

وہ سنہ ۱۹۱۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۹ء کی امریکی درآمد کے مقابلے میں دوگنی ہے۔ جنگ کے دوران میں جتنا مال امریکہ سے ہندستان آیا اس کا ⅘ حصہ قرضے پٹے معاہدے کے تحت تھا اور بقیہ حصے کے نقد دام ادا کیے گئے۔

لیکن دورانِ جنگ کی تجارت سے مستقبل کی تجارت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ مستقبل کی تجارت کا اندازہ لگانے کے لیے ضرورت ہے کہ دورانِ جنگ کی اُس تجارت کا مطالعہ کیا جائے جو قرضے پٹے معاہدے کے تحت نہیں ہوئی تھی بلکہ جس میں نقد دام ادا کیے گئے تھے۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں ۳ کروڑ ۴۳ لاکھ ۱۴ ہزار کا مال امریکہ سے ہندستان آیا اور سنہ ۱۹۴۲ء میں یہ رقم بڑھ کر ۹ کروڑ ۵ لاکھ ۱۴ ہزار تک پہنچ گئی۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں چوں کہ قرضے پٹے کے تحت زیادہ تجارت ہو رہی تھی اور امریکہ میں برآمد پر اور ہندستان میں درآمد پر جو پابندیاں تھیں اُن کے تحت نقد تجارت گھٹ گئی تھی، اس لیے اس سال صرف دو کروڑ ۴ ۹ لاکھ ۹۴ ہزار ڈالر کا نقد تجارت کا مال ہندستان آیا۔ لیکن اس کے بعد سے یہ تجارت مسلسل بڑھتی ہی رہی۔ چناں چہ سنہ ۱۹۴۵ء میں ۶ کروڑ ۹۰ لاکھ ۸۰ ہزار ڈالر کا مال اور سنہ ۱۹۴۶ء کے پہلے تین ماہ میں دو کروڑ ۶۷ لاکھ ڈالر کا مال ہندستان آیا۔

جہاں تک ہندستانی مال کے امریکہ جانے کا تعلق ہے اُس کے اعداد و شمار یہ ہیں۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں ۵ کروڑ ۳ ۸ لاکھ ۴۷ ہزار ڈالر کا مال ہندستان سے امریکہ گیا اور سنہ ۱۹۴۳ء میں ۲۱ کروڑ ۷۵ لاکھ ۴۸ ہزار ڈالر کا۔ سنہ ۱۹۴۴ء اور سنہ ۱۹۴۵ء میں جتنا مال ہندستان سے امریکہ گیا اس کے نقد دام ادا کیے گئے۔ سوائے اُس مال کے جو ہندستان کے باہمی امداد کے پروگرام کے تحت امریکہ گیا تھا۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں یہ تجارت گھٹ گئی اور اُس سال صرف ۱۱ کروڑ ۵ لاکھ ۷ ۸ ہزار ڈالر کا مال امریکہ بھیجا گیا۔ گھٹ جانے کی وجہ یہ تھی کہ باہمی امداد کے تحت بہت سا ہندستانی مال امریکہ جا رہا تھا جس کی فوری قیمت ادا کرنے کا سوال نہیں تھا۔ پھر کچھ نقل و حمل کی بھی دقتیں تھیں لیکن سنہ ۱۹۴۵ء میں یہ نقد تجارت پھر بڑھ گئی اور اُس سال ۱۴ کروڑ ۹۱ لاکھ ۳۴ ہزار ڈالر کا مال ہندستان سے امریکہ بھیجا گیا۔ سنہ ۱۹۴۶ء کے پہلے تین ماہ میں بھی اس تجارت میں اضافہ ہوا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۵ء کے پہلے تین ماہ میں صرف ۴ کروڑ ۱۱ لاکھ ڈالر کا مال امریکہ بھیجا گیا، لیکن سنہ ۱۹۴۶ء کے پہلے تین ماہ میں ۶ کروڑ ۴ ۸ لاکھ ڈالر کا۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں جب قرضے پٹے کے تحت تجارت بڑھ رہی تھی اور جہاز دستیاب نہیں تھے تو امریکہ سے جو نقد مال ہندستان بھیجا جا رہا تھا اُس کی سہ ماہی مقدار گھٹ کر جنگ سے پہلے کے اوسط سے بھی نیچے گر گئی۔ لیکن سنہ ۱۹۴۶ء کے پہلے تین ماہ میں امریکہ سے نقد مال پھر زیادہ آنے لگا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں ہندستان سے جو مال امریکہ گیا وہ عام طور سے جنگ سے پہلے کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۴۶ء میں ۶ کروڑ ۸۰ لاکھ ڈالر کا ہندستانی مال امریکہ بھیجا گیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۵ء تک جو تجارت ہندستان اور امریکہ کے درمیان رہی اس پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ جتنا مال امریکہ نے ہندستان

کے ہاتھ بیچا اُس سے زیادہ ہندستان نے اپنا مال امریکہ کے ہاتھ فروخت کیا۔ اوسطاً امریکہ کی خریداریاں ہندستان کی خریداریوں کے مقابلے میں دوگنی سے زیادہ رہی ہیں۔ ہندستان کی برآمد کے زیادہ ہونے سے یہ توقع پیدا ہوتی ہے کہ آیندہ ہندستان امریکہ سے زیادہ مال خرید سکے گا۔ اس لیے کہ امریکہ کے ساتھ برآمدی تجارت کے زیادہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ "ڈالر پول" کے ختم ہونے کے بعد ہندستان کے پاس خرچ کرنے کو کافی ڈالر موجود ہوں گے۔

بیس سال سے ہندستان میں امریکہ کے برآمدی مال کا کم سے کم ایک فی صدی اور زیادہ سے زیادہ دو فی صدی حصّہ ہندستان کے بازاروں میں کھپتا رہا ہے۔ اُسی طرح جتنا مال امریکہ نے باہر سے منگایا اُس کا کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ چار فی صدی حصّہ ہندستان نے مہیا کیا۔ دُوسری جنگ عظیم سے پہلے سنہ ۱۹۲۰ء ہی ایسا سال تھا جب کہ امریکہ سے ہندستان کی خریداری ۱۰ کروڑ ڈالر تک پہنچی اور وہ بھی اس وجہ سے کہ پہلی جنگ عظیم حال ہی میں ختم ہوئی تھی اور چیزوں کے دام بہت چڑھے ہوئے تھے۔ لیکن اسی سال امریکہ نے ہندستان سے ۱۷ کروڑ ۷۰ لاکھ ۷۴ ہزار ڈالر کا مال خریدا۔

چوں کہ گزشتہ دو سال میں ہندستان اور امریکہ کے درمیان مختلف رکاوٹوں کے باوجود تجارت بڑھتی رہی ہے اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ جب یہ رُکاوٹیں ہٹ جائیں گی تو ہندستان اور امریکہ کے درمیان تجارت بہت بڑھ جائے گی۔ ہندستان کے پاس ڈالر کم تھے اس کے باوجود ہندستان نے کافی مال امریکہ سے خریدا۔ جب ہندستان کے پاس ڈالر بہت ہوں گے تو وہ امریکہ سے اور زیادہ مال خرید سکے گا

سنہ ۱۹۴۵ء میں امریکہ سے جتنا نقد مال ہندستان آیا اُس میں کیمیائی اشیا کی مقدار سب سے زیادہ تھی۔ اِن کیمیائی اشیا کی قیمت ۱ کروڑ ۵۱ لاکھ ۸۱ ہزار ڈالر تھی۔ امریکہ سے جتنا نقد مال ہندستان آیا اُس کا یہ تقریباً ۲۲ فی صدی حصّہ تھا۔ یہ مقدار سنہ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں چارگنی زیادہ اور سنہ ۱۹۴۴ء کے مقابلے میں ۱/۴ حصّہ زیادہ تھی۔ اِن کیمیائی اشیا میں سب سے زیادہ کول تار کی مصنوعات تھیں۔ (خاص کر رنگ) اِن کول تار کی مصنوعات کی مجموعی قیمت ۶۹ لاکھ ۲۰ ہزار تھی۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں صرف ۲ لاکھ ۴۶ ہزار ڈالر کی کیمیائی اشیا امریکہ سے ہندستان آئی تھیں۔ جنگ کے زمانے میں اس میں جو زبردست اضافہ ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ جرمنی سے کیمیائی اشیا کی درآمد بند ہو گئی تھی۔ سنہ ۱۹۳۸ء اور سنہ ۳۹ء میں ہندستان میں جتنے کول تار کے رنگ منگائے گئے ان کا ۷۵ فی صدی حصّہ جرمنی نے مہیا کیا تھا۔ امریکہ سے ادویات کی درآمد بھی جنگ کے زمانے میں کافی ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے مقابلے میں کہیں زیادہ ادویات امریکہ سے ہندستان آئیں۔ سنہ ۱۹۴۴ء کے بعد سے بھی ادویات کی درآمد میں کافی اضافہ ہوا۔ لیکن سنہ ۱۹۴۴ء کے بعد سے صابن اور آرائش و زیبائش کے سامان کی درآمد میں تقریباً آدھے کی کمی ہوئی ہے۔ صنعتی کیمیائی اشیا وغیرہ کی درآمد میں بھی کمی ہوئی ہے۔ لیکن اگر جنگ سے پہلے جو صورت تھی اس سے مقابلہ کیا جائے

تو ان امریکی اشیا کی درآمد زیادہ ہی نظر آئے گی۔

سنہ ۱۹۴۵ء میں امریکہ سے جتنی نقد خریداری ہوئی اُس میں ۱۵ فی صدی حصہ مشینوں کا تھا۔ کل ملا کر سنہ ۱۹۴۵ء میں ۱ کروڑ ۴ لاکھ ۸۲ ہزار ڈالر کی مشینیں امریکہ سے ہندستان آئیں یعنی سنہ ۱۹۴۴ء کے مقابلے میں مزید ۲۷ لاکھ ۳۵ ہزار کی اور سنہ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں مزید ۳۷ لاکھ ۶۴ ہزار ڈالر کی مشینیں ہندستان آئیں۔ برقیاتی مشینیں اور آلے ۲۴ لاکھ ۷۴ ہزار ڈالر کے اور زرعی مشینیں اور آلے ۵ لاکھ ۷۰ ہزار ڈالر کے آئے۔ چوں کہ ہندستان کے پیشِ نظر اس وقت صنعتی ترقی کا پروگرام ہے اور ہندستان مشینوں اور کلوں کے سلسلے میں امریکہ کا دستِ نگر ہے اس لیے یہ توقع صحیح ہے کہ ہندستان میں امریکی مشینوں کے لیے بہت بڑا بازار موجود ہے۔ کچا تمباکو سنہ ۱۹۴۵ء میں ۹۵ لاکھ ۷۵ ہزار ڈالر کا امریکہ سے ہندستان آیا۔ گویا جنگ سے پہلے کے مقابلے میں پانچ گنی اور سنہ ۱۹۴۴ء کے مقابلے میں دوگنی قیمت کا امریکی تمباکو ہندستان نے خریدا۔ جتنا نقد مال امریکہ سے خریدا گیا اس میں ۱۴ فی صدی حصہ تمباکو کا تھا۔ اگرچہ ہندستان میں تمباکو کافی پیدا ہوتا ہے لیکن ابھی ہندستان کو کئی سال تک امریکی فلوکیورڈ (FLUE-CURED) تمباکو کی ضرورت بڑی مقدار میں رہے گی۔

غذائی اشیا سنہ ۱۹۴۴ء کے مقابلے میں مزید ۲۰ لاکھ ۸۲ ہزار ڈالر کی قیمت کی ہندستان آئیں۔ اس میں سب سے زیادہ حصہ مالٹ لیکر کا تھا۔ اِس کے علاوہ جو باقی غذائی اشیا تھیں وہ سنہ ۱۹۴۵ء میں سنہ ۱۹۴۴ء کے مقابلے میں کم آئیں۔ لیکن پھل اور ترکاریوں کی آمد میں کمی نہیں ہوئی۔

کاغذ اور کاغذ سے متعلق اشیا ۴۶ لاکھ ۶ ہزار ڈالر کی منگائی گئیں، یہ رقم سنہ ۱۹۴۴ء کے مقابلے میں ۱۱ لاکھ ۲۶ ہزار اور سنہ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں ۳۴ لاکھ ۴۴ ہزار ڈالر زیادہ تھی۔ ہندستان میں کاغذ کی بڑی قلت ہے اور اگرچہ یہاں کاغذ کی صنعت نے کافی ترقی کی ہے پھر بھی نیوز پرنٹ اور دیگر قسم کے کاغذات باہر ہی سے آتے ہیں۔ صندوق کے تختے جو ہندستان میں چائے کی تجارت میں کام آتے ہیں سنہ ۱۹۴۴ء میں ۲۲ لاکھ ۲۵ ہزار ڈالر کے امریکہ سے منگائے گئے تھے اور سنہ ۱۹۴۵ء میں ۳۰ لاکھ ۸۱ ہزار ڈالر کے۔ جنگ سے پہلے یہ چیز امریکہ سے بہت کم آتی تھی اس لیے کہ اس وقت یورپ اور جاپان سے تہ دار لکڑی کی درآمد برابر جاری تھی۔

لوہے اور اسٹیل کی چیزیں ۳۰ لاکھ ۸۹ ہزار ڈالر کی امریکہ سے منگائی گئیں جو سنہ ۱۹۴۴ء کے مقابلے میں زیادہ تھیں ہندستان میں لوہے اور اسٹیل کی زیادہ ترقی یافتہ مصنوعات کے لیے آیندہ کافی بڑا بازار ہوگا۔ سنہ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں یہ مصنوعات تین گنی زیادہ آئی ہیں۔ امریکہ سے موٹر گاڑیوں کی سپلائی میں کافی دقتیں رہیں۔ چناں چہ سنہ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں سنہ ۱۹۴۵ء میں موٹر گاڑیوں کی درآمد گھٹ گئی۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں ۵۰ لاکھ ۷۲ ہزار ڈالر کی موٹر گاڑیاں امریکہ سے ہندستان آئیں

وہ تقریباً سب کی سب ٹرک اور بسوں وغیرہ پر مشتمل تھیں۔ اُن کے علاوہ پُرزے بھی آئے۔ مسافر موٹر گاڑیاں اب دوبارہ سنہ ۱۹۳۸ء کی طرح بڑی تعداد میں آنی شروع ہوں گی۔

اور دیگر اشیا جو امریکہ سے ہندستان آئیں وہ مصنوعی کپڑے اور متعلقہ مصنوعات، فوٹوگرافی کے سامان وغیرہ پر مشتمل تھیں۔ یہ سب چیزیں جنگ سے پہلے کے مقابلے میں زیادہ آئیں لیکن چکنا کرنے والے تیل کی درآمد سنہ ۱۹۴۵ء کے مقابلے میں کم ہوئی۔

اگرچہ سنہ ۱۹۴۵ء میں امریکہ میں جتنا مال باہر سے آیا اُس کا صرف ۲،۴ فی صدی حصّہ ہندستان سے گیا لیکن یہ بات اہم ہے کہ آٹھ قسم کی مصنوعات جو امریکہ میں باہر سے داخل ہوئیں وہ سب کی سب ہندستان سے گئی تھیں۔ ان کے علاوہ پندرہ اور چیزوں کا ۸۰ فی صدی حصّہ بھی ہندستان ہی نے سپلائی کیا تھا۔ ان میں مندرجہ ذیل چیزیں تھیں۔ جوٹ اور جوٹ کی مصنوعات، لاکھ اور چپڑا، ابرق، ایلمنائٹ، کاجو، کاجو کے چھلکے کا تیل، ٹلکا، لیموں کا تیل، ہلیلہ کا پھل اور کچّی روئی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ بظاہر امریکہ کی درآمدی اشیا میں ہندستان کا فی صدی تناسب کم ہے لیکن اشیا اور مصنوعات کے لحاظ سے امریکی درآمدی اشیا میں ہندستان کی بڑی اہمیت ہے۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں باہمی امداد کے تحت ۳ کروڑ ۳۹ لاکھ ۵ ہزار ڈالر کا مال ہندستان سے امریکہ گیا۔ اور سنہ ۱۹۴۵ء میں ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ ۴۲ ہزار ڈالر کا۔ ہندستان سے امریکہ جانے والے مال میں جوٹ اور جوٹ کی مصنوعات کی سب سے زیادہ اہمیت رہی ہے۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں مجموعی طور پر یعنی باہمی امداد کے تحت اور نقد ادائیگی کے تحت بھی ۷ کروڑ ۲۹ لاکھ ۸۷ ہزار ڈالر کا مال امریکہ بھیجا گیا جس میں ۴۲ فی صدی حصّہ جوٹ اور جوٹ کی مصنوعات کا تھا۔ اگرچہ سنہ ۱۹۳۸ء اور سنہ ۱۹۴۵ء کے درمیانی عرصے میں جوٹ اور جوٹ کی مصنوعات کی برآمد ۱۰۰ فی صدی سے زیادہ بڑھ گئی لیکن سوائے جوٹ بیگنگ کے اور جتنی جوٹ کی اشیا تھیں ان کی برآمد گھٹ گئی۔ چوں کہ امریکہ جوٹ کی مصنوعات کا سب سے بڑا خریدار رہا ہے اس لیے یہ تجارت ہندستان کے لیے بہت اہم ہے۔

سنہ ۱۹۴۵ء میں امریکہ نے برابر مقدار میں چائے اور کاجو ہندستان سے منگوائے۔ چائے ۱ کروڑ ۵۸ لاکھ ۹۹ ہزار ڈالر کی منگوائی گئی اور کاجو ۱ کروڑ ۵۷ لاکھ ۴۵ ہزار ڈالر کا۔ امریکہ نے جتنا مال ہندستان سے منگوایا اس کا ۹ فی صدی حصّہ چائے پر مشتمل تھا اور مزید ۹ فی صدی حصّہ کاجو پر۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں ۳۸ لاکھ ۴۵ ہزار ڈالر کا کچّا چمڑا ہندستان سے بھیجا گیا۔ اور سنہ ۱۹۴۵ء میں ۷۷ لاکھ ۶۷ ہزار ڈالر کا۔ لیکن یہ اضافہ قیمتوں کے بڑھ جانے کی وجہ سے ہوا۔ قالین کا اُون جنگ کے زمانے میں کم جانے لگا تھا لیکن سنہ ۱۹۴۵ء میں اس کی برآمد بھی بڑھ گئی اور جنگ سے پہلے کے مقابلے میں ۶۰ لاکھ پونڈ مزید اُون امریکہ بھیجا گیا۔ مجموعی اُون کی قیمت ۶۲ لاکھ ۶۴ ہزار ڈالر تھی۔ جنگ سے پہلے صرف ۲۸ لاکھ ۴۶ ہزار ڈالر کا قالین کا اُون امریکہ نے ہندستان سے خریدا تھا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں ہندستان سے کچّی روئی کی برآمد میں بھی اضافہ ہوا اور امریکہ نے جنگ سے پہلے کے مقابلے

میں ڈھائی گنی زیادہ روئی ہندستان سے خریدی۔ سنہ ۱۹۴۴ء کے مقابلے میں بھی زیادہ روئی امریکہ کو برآمد کی گئی۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں ۲۰ لاکھ ۳۹ ہزار ڈالر کی روئی امریکہ نے ہندستان سے منگوائی اور سنہ ۱۹۴۴ء میں ۲۴ لاکھ ۸ ہزار ڈالر کی۔ اور سنہ ۱۹۴۵ء میں ۶۹ لاکھ ۴۸ ہزار ڈالر کی۔ لاکھ کی برآمد مقدار کے لحاظ سے جنگ سے پہلے کے مقابلے میں گھٹ گئی لیکن قیمت کے لحاظ سے بڑھ گئی۔ چپڑے کی برآمد مقدار اور قیمت دونوں لحاظ سے بڑھ گئی۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں ۲۳ لاکھ ۵۴ ہزار ڈالر کی قیمت کا لاکھ امریکہ نے منگوایا اور ۴۷ لاکھ ۹ ہزار ڈالر کا چپڑا۔

جنگ کے ابتدائی سال میں ابرق کی برآمد سنہ ۱۹۳۷ء کے مقابلے میں زیادہ رہی۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں اس کی برآمد سنہ ۱۹۳۷ء کے مقابلے میں آدھی کے قریب گھٹ گئی اگرچہ قیمت کے لحاظ سے وہ زیادہ ہی رہی۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں ابرق کی برآمد سنہ ۱۹۳۷ء کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ لیکن قیمت کے لحاظ سے جہاں سنہ ۱۹۳۷ء میں ۴ لاکھ ۹۸ ہزار ڈالر کا ابرق امریکہ نے خریدا وہاں سنہ ۱۹۴۵ء میں ۳۷ لاکھ ۸۰ ہزار کا۔

سنہ ۱۹۴۵ء میں مندرجہ بالا چیزوں کے علاوہ جو چیزیں امریکہ بھیجی گئیں ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ کھردار بڑی روئی، ناریل کے ریشے، ناریل کے ریشوں کی چٹائیاں، اصلی قیمتی پتھر، مصنوعی پتھر اور مینگنیز۔

جنگ کے زمانے میں ہندستان نے صنعتی ترقی کی طرف قدم بڑھایا۔ درآمد میں کمی ہوئی اور مصنوعات کی برآمد کچے مال کی برآمد سے بڑھ گئی۔ ہندستان کی جدید تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا۔ ہندستان جتنا مال امریکہ بھیجتا ہے اس کا زیادہ حصہ جوٹ کی مصنوعات پر مشتمل ہے اور جتنی مصنوعات امریکہ بھیجی جاتی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ چمڑا، قالین اور دریاں، ناریل کے ریشے، ناریل کے ریشے کی چٹائیاں، تراشے ہوئے ہیرے اور دیگر قیمتی پتھر۔ ہندستان نے اپنے کو صنعتی ملک بنانے کا پورا تہیہ کر لیا ہے اور اس سلسلے میں کافی آگے بھی بڑھ چکا ہے۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہندستان کو مشینوں کی اور فنی امداد اور اعانت کی سخت ضرورت ہے۔ جب صنعتی توسیع کا کام شروع ہو جائے گا تو ہندستان میں امریکی مشینوں کے لیے بہت بڑا بازار پیدا ہوگا۔ گاڑیاں، چکنا کرنے والے تیل، خاص خاص قسم کے اسٹیل اور اسٹیل کی مصنوعات، لکڑی اور کیمیائی اشیا کے لیے بھی ہندستان میں بہت بڑا بازار پیدا ہوگا اس لیے کہ ان چیزوں کا تعلق صنعتی توسیع و ترقی سے ہے۔ یہ اور دیگر چیزیں اس میں کوئی شک نہیں کہ کافی مقدار میں انگلستان سے آئیں گی لیکن چونکہ اب جاپان اور جرمنی تجارتی مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے ان چیزوں کے مہیا کرنے میں نہ صرف انگلستان بلکہ امریکہ کا بھی کافی حصہ رہے گا۔ جہاں تک ہندستانی مال کے امریکہ جانے کا تعلق ہے، اس وقت جو چیزیں امریکہ بھیجی جا رہی ہیں وہ آیندہ بھی بڑی مقدار میں جاتی رہیں گی۔ اس لیے کہ امریکہ میں اشیا کی پیدائش کو ایک بلند سطح پر لے جانے کے

لیے ان چیزوں کی بنا بر ضرورت رہے گی۔ ان کے علاوہ ہم اشیا ہندستان بہت کم بھیج سکتا ہو سوائے چند خاص چیزوں کے جو ہندستان میں بنتی ہیں اور جن کے لیے امریکہ میں آسانی سے خریدار مل جائیں گے۔ ان میں سے بیشتر چیزیں پورے ہندستان میں بنتی ہیں۔ ان کو امریکہ کی ضروریات کے مطابق بنانے کی کوشش نہیں کی گئی ہو۔ اگر ان کو امریکی ضروریات کے مطابق بنایا جائے تو ان کے لیے امریکہ میں اچھا خاصا بازار پیدا ہوسکتا ہو۔ ہندستان کو چاہیے کہ اپنے ڈالر کی مقدار میں اضافہ کرنے کے لیے امریکی سیاحوں کی ہمت افزائی کرے کہ وہ ہندستان آئیں اور یہاں کی سیاحت کریں۔

ہندستان اور امریکہ کی تجارت میں ۱۹۴۶ء کے پہلے تین ماہ میں جو اضافہ ہوا ہو اُس سے اندازہ ہوتا ہو کہ جس طرح پہلی عالمگیر جنگ کے بعد ہندستان اور امریکہ کے مابین تجارت بہت بڑھ گئی تھی، اسی طرح اب بھی بڑھے گی۔ اگر ایسا ہوا تو کم سے کم دو سال تک ہندستان اور امریکہ کے درمیان جو تجارت ہو اس میں بڑی ہم آہنگی اور گرم بازاری رہے گی۔ ہندستان کو امریکہ سے تجارت کے سلسلے میں جو ڈالر حاصل ہوں گے اُن سے وہ کافی مصنوعات امریکہ سے خرید سکے گا۔ اور امریکہ میں پیدائش کی رفتار اگر تیز رہی تو وہ ہندستان کی ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کر سکے گا۔ تجارت سے حاصل ہونے والے ڈالر کے علاوہ ممکن ہو بین اقوامی بینک سے بھی ہندستان ڈالر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ ہندستان اور امریکہ کے درمیان تجارت کی گرم بازاری کتنے عرصے تک رہے گی اس کا انحصار اس بات پر ہو کہ دونوں ملک کس قسم کی تجارتی پالیسی پر عمل کرتے ہیں۔ بین اقوامی تجارتی کانفرنس میں جو پالیسی طے ہوگی اُس پر اس کا بڑا انحصار ہو۔ ہندستان کو اس کانفرنس کے ابتدائی مباحثوں میں حصّہ لینے کی دعوت دی گئی ہو۔ چناں چہ اُس کانفرنس میں جو فیصلے ہوں گے اور جو کافی دُور رس ہوں گے ان کو متعین کرنے میں ہندستان کا کافی حصّہ ہوگا۔ اور دیگر باتیں جن پر ہندستان اور امریکی تجارت کے مستقبل کا انحصار ہو وہ یہ ہیں۔ ہندستان کتنے عرصے تک درآمد کی لائسنس سسٹم برقرار رکھے گا۔ اور جتنے عرصے تک اُسے برقرار رکھا جائے گا اس کا استعمال کیا ہوگا۔ پھر ہندستان کس حد تک صنعتی لحاظ سے ترقی کر سکے گا۔

جہاں تک کہ امریکہ کا تعلق ہو تجارت کی گرم بازاری اس بات پر منحصر ہو کہ اٹلی، جاپان اور جرمنی کے تجارتی مقابلے کے ختم ہوجانے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوگیا ہو اس کو امریکی کمپنیاں جلد بھر سکتی ہیں یا نہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد دُوسرے مُلکوں کے مقابلے میں امریکہ جلد ہندوستان کا بازار کھو بیٹھا تھا۔ اگرچہ ہندستان امریکہ سے بہت دُور ہو اور زیادہ تر امریکی ہندستان سے ناواقف ہیں اور اگرچہ اس وقت ہندستان کی قوتِ خریداری نسبتاً کم ہو پھر بھی یہ سوچنا چاہیے کہ ہندستان ایک بہت بڑی قوم ہو اور آج بہت سی امریکی مصنوعات کے لیے اہم بازار کا کام دے سکتا ہو۔ آگے چل کر آج سے کہیں زیادہ امریکی مصنوعات ہندستان میں فروخت ہوں گی۔ ہندستان کے لوگ امریکہ کی مصنوعات کی بڑی قدر کرتے ہیں یہی موقع ہو کہ دوراندیش امریکی کمپنیاں ہندستان کے بازاروں سے اچھی اور گہری واقفیت پیدا کریں اور حسبِ ضرورت ہو اپنے نمایندے اور ایجنٹ بھیجیں تاکہ وہ ہندستان میں امریکی مصنوعات کی فروخت کو بڑھا

صنعت

چھوٹی صنعتیں

از :——— معاشی

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جب کسی ملک میں مشینوں اور کلوں کا رواج ہوتا ہے اور بڑے بڑے کارخانے قائم ہوتے ہیں تو چھوٹی اور گھریلو صنعتیں ختم ہو جاتی ہیں اور اُن کی جگہ بڑی بڑی صنعتیں لے لیتی ہیں۔ لیکن بعض ایسی چھوٹی صنعتیں بھی ہیں جو مشینوں اور کلوں کے رواج پذیر ہونے کے بعد بھی چلتی رہتی ہیں۔ اس کی متعدد وجہیں ہیں۔ مثلاً موجودہ بڑے پیمانے کے طریقِ پیدائش میں بھی ہمیں کوئی نہ کوئی حد مقرر کرنی پڑتی ہے کہ فلاں چیز اس سے زیادہ بڑے پیمانے پر نہ پیدا کی جائے ورنہ فائدہ جاتا رہے گا۔ یعنی بڑے پیمانے پر چیزیں پیدا کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے جس کا اگر خیال نہ کیا جائے تو پھر اشیا کی خاصیت اور صنعت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ پھر بڑے پیمانے یا چھوٹے پیمانے کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر بھی ہے کہ ہم مشینوں کو چلانے کے لیے کس قسم کی طاقت کام میں لا رہے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جیسے جیسے نظامِ پیدائش میں بجلی کا استعمال بڑھتا جائے گا کارخانے بھی چھوٹے ہوتے جائیں گے۔ بہت سی ایسی چیزیں اور عیش و تفریح کے سامان ہیں جو بڑے پیمانے پر پیدا بھی نہیں کیے جا سکتے اُن کے لیے چھوٹے کارخانوں کا وجود ضروری ہے، مثلاً کشیدہ کاری کی چیزیں، مجسمے وغیرہ بنانا۔ بہت سی ایسی چھوٹی صنعتیں ہیں جو خود بڑی صنعتوں کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں اور اُنھی کی وجہ سے وہ قائم بھی رہتی ہیں، جیسے موٹر مرمت کرنے کی چھوٹی سی دکان یا کارخانہ۔ چھوٹی صنعتوں کا وجود اس لیے بھی برقرار رہتا

ہے کہ نئی صنعتیں شروع میں چھوٹے ہی پیمانے پر چلائی جاتی ہیں۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر چھوٹے پیمانے کی صنعتیں بڑی صنعتوں کے پہلو بہ پہلو چلتی رہتی ہیں، اور ایسا نہ صرف پچھڑے ہوئے ملکوں میں ہوتا ہے بلکہ صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی۔

ہندستان میں بھی جب مشین کی آمد ہوئی اور بڑے کارخانے قائم ہوئے تو بہت سی چھوٹی صنعتیں تباہ ہو گئیں۔ جیسے ہاتھ سے کپڑا بننے کی صنعت پر خراب اثر پڑا۔ لیکن بہت سی چھوٹی صنعتیں جاری رہیں۔ اس کی متعدد وجہیں ہیں۔ جیسے قدامت پسندی کی وجہ سے بہت سے لوگ اپنا آبائی پیشہ نہیں چھوڑنا چاہتے یا کارخانوں کی موجودہ حالت انھیں بہت جلد کام سے اکتا دیتی ہے اور وہ پھر کارخانوں میں جانے کا نام نہیں لیتے۔ وغیرہ۔ لیکن یہ چھوٹی صنعتیں آیندہ جاری نہیں رہ سکتیں۔ جب ملک میں صنعتوں کی ترقی ہوگی، کارخانوں کی فضا اور حالات بدلیں گے اور دیگر معاشی اور سماجی تبدیلیاں ہوں گی تو ان صنعتوں کا ختم ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ لیکن کچھ ایسی چھوٹی صنعتیں بھی ہیں جو ملک کے معاشی لحاظ سے بہت آگے بڑھ جانے کے بعد بھی باقی رہیں گی اس لیے کہ ان کے باقی رہنے کی ضرورت بھی ہے۔ اُن کو بڑے بڑے کارخانوں سے خطرہ بھی نہیں لاحق ہے، جیسے بہت سی ایسی صنعتیں جو زراعت کے پیشے سے متعلق ہیں جیسے رستے بنانا۔ ایسی چھوٹی صنعتیں جن میں کاریگروں نے جدید مشینوں کا استعمال شروع کر دیا ہے مثلاً کپڑا سینا۔ ظاہر ہے کہ یہ چھوٹی صنعتیں کبھی ختم نہیں ہو سکتیں۔

گزشتہ جنگ سے پہلے چھوٹی صنعتوں کی حالت بہت خراب تھی، ایک طرف تو ملکی اور غیر ملکی کارخانوں کا بنا ہوا مال چھوٹی صنعتوں کو تباہ کر رہا تھا۔ دوسری طرف عام معاشی پستی اور بدحالی کی وجہ سے یوں بھی لوگوں کے پاس قوتِ خرید نہیں رہی تھی۔ چھوٹی صنعتوں کا مال تو کجا بڑی اور جدید صنعتوں کے مال کے لیے بھی بازار نہیں مل رہا تھا لیکن جنگ نے آکر کافی حد تک صورتِ حال کو بدل دیا۔ زیادہ تر چھوٹی صنعتوں کو ایک نئی زندگی ملی اور وہ پھر سے چل نکلیں۔ اگرچہ بعض چھوٹی صنعتوں کو نقصان بھی پہنچا لیکن بہ حیثیتِ مجموعی ہم یہی کہیں گے کہ جنگ نے چھوٹی صنعتوں کو فائدہ پہنچایا ہے۔

جنگ کے زمانے میں عام صنعتوں اور چھوٹی صنعتوں کی ترقی کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں۔ غیر ملکی مال کی آمد میں تخفیف، حمل ونقل کی دقتیں، بیمہ اور حمل ونقل کے اخراجات میں اضافہ، جہازوں کا مشکل سے دست یاب ہونا، غیر ملکوں میں اشیاے صرف کی پیدائش میں تخفیف، بین اقوامی تجارت اور مبادلے کی پابندیاں، اندرونِ ملک میں اشیاے صرف کی پیدائش کی کمی، فوجی خریداریاں، ہندستان کا جاپان کے خلاف جنگی مرکز بن جانا، مشرقِ وسطیٰ، چین اور امریکہ وغیرہ میں ہندستانی اشیا کی مانگ کا بڑھ جانا۔ اس پوری صورتِ حال کو ہم دو لفظوں میں پیش کر سکتے ہیں: غیر ملکی مال کی درآمد میں کمی اور فوج کے لیے اور ملکی و غیر ملکی بازاروں کے لیے ہندستانی مال کی مانگ میں اضافہ۔ یہ مانگ اتنی زیادہ تھی کہ بڑی صنعتیں اُسے پورا نہیں کر سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹی صنعتوں کی پیدا کی ہوئی اشیا کی مانگ پیدا ہوئی۔ بڑی صنعتوں کے لیے جنگ کے زمانے میں نقل وحمل کی دقتوں اور فوجی ضرورتوں

کی وجہ سے خام اشیا کا مہیا کرنا اور پھر پیدا کی ہوئی اشیا کی نکاسی کرنا بھی مشکل ہوگیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہر علاقے کی اپنی اپنی چھوٹی صنعتیں چل پڑیں اور لوگ اپنی مانگیں انھی کی پیدا کردہ اشیا سے پوری کرنے لگے۔ فوج نے بھی اپنی ضرورت کے لیے چھوٹی صنعتوں کی چیزیں خریدیں۔ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء میں دہلی میں چھوٹی صنعتوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ جنگی ضروریات کا ۲۵ فی صدی حصہ چھوٹی صنعتوں کے ذریعے پورا کیا جائے۔ صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے چھوٹی صنعتوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

اب ہم الگ الگ کچھ خاص چھوٹی صنعتوں کے حالات کا مطالعہ کریں گے:-

کپڑا بُننے کی صنعت اس صنعت نے جنگ کے زمانے میں ضرور آگے قدم بڑھایا ہے مگر چوں کہ خود جنگ کی پیدا کردہ کچھ خاص دقتیں حائل رہی ہیں اس لیے اتنی ترقی نہیں ہوسکی جتنی کہ امید کی جارہی تھی یا جتنی پہلی عالم گیر جنگ سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء میں ہوئی تھی۔ پہلی عالم گیر جنگ کے زمانے میں ہندستان میں کپڑے کی ملیں زیادہ نہیں تھیں، چناں چہ جنگ کی وجہ سے جو مانگ بڑھی تو اس کا کافی حصہ ہاتھ سے کپڑا بُننے کی صنعت کو ملا۔ لیکن گزشتہ جنگ کے دوران میں ملک میں کپڑے کی ملیں بہت سی تھیں چناں چہ زیادہ تر انھوں نے ہی جنگی اور شہری ضروریات کو پورا کیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں سوت کی کمی جاپان سے پوری ہورہی تھی اس لیے کہ جاپان اتحادیوں کے ساتھ تھا۔ لیکن گزشتہ جنگ میں سوت کی کمی ہی کی وجہ سے ہاتھ سے کپڑا بُننے کی صنعت زیادہ ترقی نہیں کرسکی۔ جاپان اتحادیوں کے خلاف تھا اس لیے وہاں سے سوت نہیں حاصل کیا جاسکتا تھا۔ ہندستان کو گزشتہ جنگ کے دوران میں ایک تو خود اپنی ضرورت کے لیے سوت کاتنا پڑ رہا تھا، دوسرے غیر ملکوں خاص کر "مشرقی گروپ" کو بھی ہندستان ہی سے سوت مہیا کیا جارہا تھا۔ ان حالات کے تحت اپریل سنہ ۱۹۴۱ء سے خاص طور سے سوت کی بڑی کمی پڑ گئی جس کی وجہ سے ہاتھ سے کپڑا بُننے کی صنعت کی ترقی رُک سی گئی۔ پھر سنہ ۱۹۴۲ء سے کپڑے کی ملوں میں تین تین شفٹوں میں کام ہونے لگا۔ زیادہ تر سوت کی کھپت ملوں میں ہونے لگی اور ہاتھ سے کپڑا بُننے والوں کو سوت کم ملنے لگا۔ مئی سنہ ۱۹۴۵ء میں کھادی بُننے والوں کی "کُل ہند انجمن" نے یہ فیصلہ کیا کہ اس انجمن کے تحت جتنے کھدر بھنڈار ہیں وہ صرف انھی لوگوں کے ہاتھ کھادی فروخت کریں گے جو ہاتھ کا کاتا ہوا سوت مہیا کرسکتے ہیں۔ پھر سنہ ۱۹۴۶ء میں "دیہاتیوں کی کل ہند انجمن" نے یہ طے کیا کہ کھدر صرف اُن لوگوں کو دیا جائے گا جو اپنے ہاتھ سے سوت کاتتے ہیں۔ لیکن ان کارروائیوں کا اثر یہ ہوا ہے کہ کھدر کی خرید و فروخت کم ہوگئی ہے۔ ملوں کا کتا ہوا کافی سوت ہاتھ سے کپڑا بُننے والوں کو نہیں مل رہا تھا۔ چناں چہ اپریل سنہ ۱۹۴۵ء میں حکومتِ ہند نے اپنے "کپڑا اور سوت کنٹرول" آرڈر کے ذریعے سوت کی تقسیم کی ایک اسکیم مرتب کی جس نے پہلے سے اچھی صورتِ حال پیدا کی۔ ایک بات البتہ کھادی اور گاڑھے کے لیے مفید رہی ہے۔ اور وہ یہ کہ کھدر کے لیے حکومت کی طرف سے قیمت نہیں مقرر کی گئی یعنی وہ کنٹرول سے باہر رہا۔ حکومت بمبئی نے بھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ کھدر پر بکری ٹیکس نہیں عائد کیا جائے۔ بنگال اور مدراس کی حکومتوں نے پہلے ارادہ ظاہر کیا تھا کہ کھدر

پر کنٹرول لگادیا جائے مگر اُس پر اب تک عمل نہیں کیا گیا۔ اس سے کھدر کی قیمت کافی چڑھ گئی اور اس صنعت کو فائدہ پہنچا۔

ہاتھ سے بُنے ہوئے اونی کپڑے :- پہلے ہندستان میں تمام اونی کپڑے ہاتھ ہی سے بُنے جاتے تھے ۔ مگر جب ملیں آئیں اور اُن کے بُنے ہوئے اونی کپڑے زیادہ پسند کیے جانے لگے تو ہاتھ سے صرف کمبل تیار کیے جانے لگے ۔ بمبئی، میسور، پنجاب، یو۔پی اور کشمیر اس صنعت کے خاص مرکز ہیں۔ (اونی چیزوں کے ساتھ ساتھ قالین اور دریاں بھی ہندستان میں بڑے پیمانے پر ہاتھ سے بُنی جاتی ہیں اور مرزاپور، امرتسر، سری نگر، بنگلور اور ایلور اس کے لیے خاص طور پر مشہور ہیں) جنگ کے دوران میں فوج کو اتنے کمبلوں کی ضرورت تھی کہ ملوں کے علاوہ ہاتھ سے کمبل تیار کرنے کی صنعت کو بھی ترقی دینی پڑی ۔ لڑائی سے پہلے پانی پت اور مظفر نگر میں تھوڑے بہت کمبل ہاتھ سے تیار کیے جاتے تھے ۔ چناں چہ حکومت نے فیصلہ کیا کہ بڑے پیمانے پر ہاتھ سے کمبل تیار کرانے کا انتظام کیا جائے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں اسی سلسلے میں ریاستوں اور صوبائی حکومتوں کی ایک کانفرنس ہوئی اور حکومت کی طرف سے کمبل کے آرڈر دیے گئے ۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں ۱۰ لاکھ کمبل تیار کیے گئے ۔ یہ کمبل یو۔پی، پنجاب، سرحدی صوبہ، ریاست پٹیالہ اور دیگر صوبوں اور ریاستوں میں تیار کیے گئے تھے ۔ غرض جنگ کے دوران میں ہاتھ سے اونی کپڑے بُننے کی صنعت نے کافی ترقی کی ۔ اور نہ صرف کمبل بلکہ اور ہاتھ سے بُنے ہوئے اونی کپڑے بھی کشمیر سے فوجی ضروریات کے لیے خریدے گئے ۔ مثلاً موزے اور سوئٹر پٹو اور ٹوئیڈ وغیرہ ۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ جنگ کے بعد والے دور میں جب کہ مشین کے بنے ہوئے اونی کپڑے کافی پیدا ہونے لگیں گے ، ہاتھ سے اونی کپڑے بُننے کی صنعت کچھ زیادہ فلاح نہ پا سکے گی اور نہ مشین کا مقابلہ کر سکے گی۔ خاص کر ہاتھ سے بُنے ہوئے کمبل تو اور بھی کم خریدے جائیں گے ۔ ہاں کشمیری ٹوئیڈ کا البتہ کچھ مستقبل ہے اس لیے کہ صنعت کے لحاظ سے وہ اعلا ہوتا ہے ۔

ہندستان کی ایک اہم چھوٹی صنعت جو ہزاروں برسوں سے جاری ہے کاردگری کی صنعت ہے ۔ چھرے، چاقو، قینچی، چمچے وغیرہ گانو کے لوہار بناتے ہیں جن سے کہ مقامی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں ۔ بعد میں عمدہ قسم کے چھرے، چاقو، چمچے وغیرہ غیر ملکوں سے آنے لگے ۔ علی گڑھ، مرادآباد، نظام آباد، میرٹھ، وزیر آباد وغیرہ اس صنعت کے لیے خاص طور پر مشہور ہیں ۔ گانو کے لوہار ان چیزوں کے بنانے کے لیے خود ہی اسٹیل بھی تیار کرتے ہیں جو مشین کے تیار کیے ہوئے اسٹیل سے یقیناً کم تر درجے کا ہوتا ہے ۔ جنگ کے دوران میں فوجی ضرورت کے لیے بڑے بڑے کارخانوں سے چمچے، چاقو، چھریاں، قینچیاں وغیرہ تو خریدی ہی گئیں ۔ اس کے علاوہ ٹھیکے داروں کے ذریعے دیہی علاقوں سے بھی حاصل کی گئیں ۔ یہ ضرور تھا کہ دیہات سے خرید کر شہر کی کارگاہوں میں ان کو عمدہ بنا لیا جاتا تھا ۔ جب باہر سے یہ چیزیں آنا بند ہو گئیں اور فوجی ضروریات میں اضافہ ہوا تو شہری ضرورت کے لیے گانو کے بنے ہوئے چاقو، چھریوں وغیرہ کے لیے بازار پیدا ہوا ۔ اس طرح اس صنعت کو کچھ ترقی نصیب ہوئی ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جنگ کے بعد والے زمانے

میں ہاتھ کے مہارت سے کارگری کی صنعت زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی اور مشین اس کی جگہ ضرور لے لے گی سنہ ۱۹۴۳ء میں ۹۶ لاکھ روپے کی یہ چیزیں فوجی ضرورت کے لیے خریدی گئیں اور ان کے سپلائی کرنے میں گانو اور دیگر مقامات کی پرانے طرز کی کارگری کی صنعت کا کافی حصہ ہے۔ لڑائی کے زمانے میں جب جاپان اور دیگر مقامات سے چینی کے برتن وغیرہ کا آنا بند ہوگیا تو خود ہندستان میں چینی کے برتنوں کے علاوہ مٹی کے عمدہ قسم کے پالش کیے ہوئے برتن اور چائے کے سیٹ وغیرہ بڑی تعداد میں بننا شروع ہوئے۔ مرزاپور میں اور اعظم گڑھ کے دیہی علاقوں میں اس صنعت نے خوب ترقی کی۔ تانبے اور دھات کی صنعت نے بھی آگے قدم بڑھایا اور پرانے طرز کے برتنوں کے علاوہ اونچے طبقے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے نئے طرز کے برتن، پلیٹیں، پیالے اور چائے کے سیٹ بننے لگے۔

ہندستان میں رسّے بنانے کی صنعت بہت دنوں سے ایک چھوٹی صنعت کی حیثیت سے جاری ہے۔ یہ صنعت زراعت سے گہرے طور پر متعلق اور وابستہ ہے۔ کلکتہ اور اس کے گرد ونواح کے علاقوں میں سن کے رسّے بنانے کے کارخانوں کے علاوہ ہاتھ سے بھی سن کے رسّے بنائے جاتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں فوجی ضروریات کے لیے رسّوں کی مانگ بڑھی جس نے شہری مانگ بھی بڑھادی۔ فوجی ضروریات کے لیے ۵۰ فی صدی رسّے خریدے گئے۔ جنگ کے ابتدائی زمانے میں جب یورپ پر جرمنی کا قبضہ ہوگیا تو ناریل کے ریشے کی صنعت کو نقصان پہنچا اس لیے کہ یورپ ہندستانی رسّوں کا خریدار تھا۔ بہت سی کارگاہیں بند ہوگئیں لیکن فوجی ضروریات کے بڑھنے سے وہ کارگاہیں دوبارہ کھل گئیں اور رسّے بنانے کی صنعت چل پڑی خطرہ یہ ہے کہ جنگ کے بعد والے زمانے میں ملک میں رسّوں کی بہتات ہوجائے گی خاص کر سن سے بنے ہوئے رسّوں کی، اور بہت سی کارگاہیں بند ہوجائیں گی۔ جہاں تک ناریل کے رسّوں کا تعلق ہے اُن کے لیے اکیاب، بینانگ، رنگون، سے گانو وغیرہ مقامات پر آسانی سے بازار مل جائے گا ٹھیک جس طرح جنگ سے پہلے تھا۔

جنگ سے پہلے جاپان اور اٹلی سے آنے والے بٹنوں کے مقابلے میں ہندستان کی بٹن بنانے کی صنعت ترقی نہیں کررہی تھی۔ لیکن جب وہاں سے مال کا آنا بند ہوگیا تو وہ چل پڑی۔ اگرچہ فوجی ضروریات کے لیے وہ بٹن نہیں خریدے گئے لیکن شہری مانگ اتنی کافی تھی کہ بٹن کی چھوٹی صنعت نے کچھ نہ کچھ ترقی ضرور کی ہے۔ دھاگے کے بٹن، لوہے کے بٹن، سینگ، ہڈی اور ناریل وغیرہ کے بٹن کی صنعت نے جنگ سے پہلے کے مقابلے میں کافی ترقی کی۔ لیکن ڈر یہ ہے کہ جنگ کے بعد والے زمانے میں ہندستان کی یہ چھوٹی صنعت اطالوی اور جاپانی صنعتوں کا مقابلہ نہ کرسکے۔ جنگ کے زمانے میں دیاسلائی بنانے کی صنعت زیادہ ترقی اس لیے نہیں کرسکی کہ سوئیڈن سے برابر دیاسلائی پہنچتی رہی۔ ریشم بنانے کی صنعت بھی اس لیے ترقی نہیں کرسکی کہ جاپان کا بازار ہاتھ سے جاتا رہا۔

جنگ کے زمانے میں اور کئی قسم کی چھوٹی صنعتوں نے ترقی کی ہو مثلاً چوڑیاں بنانے کی صنعت۔ شیشے کی صنعت کی یہ شاخ ہندستان میں جنگ سے پہلے کے زمانے میں بھی کافی ترقی یافتہ تھی۔ جنگ کے چھڑنے پر جب جاپان اور زیکوسلاویکیہ سے چوڑیوں کا آنا بند ہوگیا تو ہندستان میں اس صنعت نے زبردست ترقی کی۔ چمڑا کمانا، جوتے بنانا، کپڑے سینا، وغیرہ بھی چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں شامل ہیں اور جنگ کے زمانے میں ان کو بڑی زبردست شہ ملی۔ دستی کاغذ سازی کی صنعت نے بھی جنگ کے زمانے میں کافی ترقی کی ہو۔ جب حکومت نے کارخانوں کے بنے ہوئے کاغذ کا ستر فی صدی حصہ خریدنا شروع کیا تو حیدرآباد اور میسور وغیرہ ریاستوں میں دستی کاغذ بنانے کی صنعت خوب زوروں سے چل پڑی اور نجی اور شہری ضرورتیں بڑی حد تک اُس سے پوری ہوئیں۔

چوں کہ اب جنگ کے لیے سرکاری خریداریاں بند ہوگئی ہیں اس لیے ملک میں بے روزگاری کا پھیلنا یقینی ہو۔ خیال کیا جاتا ہو کہ بجٹ میں اخراجات کا جو تخمینہ پیش کیا گیا ہو اُس سے ۷ ارب روپے کم خرچ ہوں گے۔ بے روزگاروں کے لیے روزگار فراہم کرنے میں ہمیں چند اہم اور خاص چھوٹی صنعتوں کو دوبارہ جاری کرنے اور اُن کو پھیلانے کی ضرورت ہوگی۔ فی الحال ہمیں مشینوں اور کلوں کے حصول میں بڑی دقتیں ہیں جس کا مطلب یہ ہو کہ ابھی ہم پورے ملک کو اُس حد تک صنعتی نہیں بنا سکتے کہ ہماری تمام ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ ایسی حالت میں غیر ملکی مال کے سیلاب سے مُلک کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک طرف تو درآمد پر پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت ہو اور دوسری طرف چھوٹی صنعتوں کو ترقی دینے کی، چاہے موخرالذکر چیز عارضی ہی کیوں نہ ہو۔ ہندستان کے ساڑھے پانچ کروڑ افراد اپنی روزی چھوٹی صنعتوں سے حاصل کرتے ہیں۔ اور ایک کروڑ بچاس لاکھ صنعتی مزدوروں میں سے صرف بیس لاکھ ایسے ہیں جو بڑی صنعتوں میں کام کرتے ہیں اور بقیہ چھوٹی صنعتوں میں لگے ہوئے ہیں۔ دیہاتی صنعتوں کی کل ہند انجمن نے عملاً یہ واضح کردیا ہو کہ بہت سی چھوٹی صنعتوں کو —— جیسے دھان کوٹنا، آٹا پیسنا، مدھ مکھیاں پالنا، تیل نکالنا —— اگر ترقی دی جائے تو کافی لوگوں کے لیے روزگار مہیا کیا جاسکتا ہو۔ اس وقت کپڑے کی ملوں میں مزدوروں کی جتنی تعداد کام کررہی ہو اُس سے نصف تعداد کو کپڑا بُننے والوں کی کل ہند انجمن نے روزگار فراہم کیا ہو حال آں کہ موخرالذکر کا سرمایہ صرف ۵۰ لاکھ ہو اور کپڑے کی ملوں کا مجموعی سرمایہ ۵۰ کروڑ ہو۔

چناں چہ یہ کہنا بالکل صحیح ہو کہ جب تک ہندستان پورے طور سے صنعتی مُلک نہ بن جائے اور بڑے پیمانے پر صنعتی پیدائش کا طریقہ نہ اختیار کیا جائے اُس وقت تک جنگ کے بعد کی بے کاری اور بے روزگاری کا مقابلہ کرنے کے لیے چھوٹی صنعتوں سے بہت کام لیا جاسکتا ہو۔ اس لیے ضرورت ہو کہ حکومت چند اہم چھوٹی صنعتوں کو تحفظ عطا کرے اور اُن کو اور آگے بڑھانے کی کوشش کرے۔

———— ✻ ————

نظری معاشیات

قیمتوں کا معیار

از:- ایملی برنس ——— (مترجمہ حمیدہ نقوی)

جب برطانیہ کی معیاری اکائی سونے کی تھی یعنی جب پونڈ سے ایک مخصوص وزن کا سونا مراد تھا تو قیمتوں کا گھٹاؤ بڑھاؤ بہت شدید نہیں تھا۔ روئی اور گیہوں جیسی چیزوں کی قیمت سال بہ سال پیدائش کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ یہ گھٹنا بڑھنا اُن اشیا کی رسد کی کمی یا بیشی کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ قیمتیں گھٹتی بڑھتی تو رہتی تھیں مگر صرف ایک تنگ دائرے کے اندر ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ سے پہلے آج کی طرح تمام اشیا کی قیمتوں میں ایک ہی ساتھ ایک بارگی شدید قسم کا تغیر نہیں ہوتا تھا۔

جنگ ۱۹۱۴-۱۸ء سے پہلے کے زمانے میں تقریباً ہر چیز کی قیمت مبادلے کی قدر کے نزدیک ہی رہتی تھی۔ جیسے انگلستان میں پونڈ، سونے کے چوتھائی اونس کے برابر تھا، اب سونے کے اس وزن کو ڈھلنے میں اگر بیس گھنٹے کی محنت صرف ہوتی تو اسی لحاظ سے اگر کسی شئ کی پیدائش میں بیس گھنٹے کی محنت صرف ہوتی تو اس کی قیمت اس سونے کے وزن کے برابر ہوتی۔ اس لحاظ سے جس چیز کی پیدائش میں ۱۰ گھنٹے صرف ہوتے اس کے دام ۱۰ شلنگ ہوتے تھے۔ ہر پیداوار کی قیمت مقرر کرتے وقت پیداوار کی قدرِ مبادلہ ایک مستقل ٹھیراؤ کا کام کرتی ہے۔ اگر اُس چیز کے دام گر گئے مثلاً ۱۰ شلنگ کی بجائے ۹ شلنگ ہوگئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیچنے والے کی ایک گھنٹے کی محنت رایگاں گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس چیز کے پیدا کرنے والے اُس کی پیدائش بند کرنا چاہیں گے تاکہ جو محنت اس کی پیداوار میں صرف ہوتی ہے وہ کسی اور ایسی کارآمد چیز کی پیدائش میں صرف ہو جس کی فروخت سے انھیں ۱۰ گھنٹے کی محنت کی اجرت ۱۰ شلنگ مل سکے۔ اور پھر ان ۱۰ شلنگ سے وہ کوئی ایسی چیز خرید سکیں جس کی لاگت ۱۰ گھنٹے کی محنت ہو۔ اب پہلی

شے جس کی پیدائش کم کر دی گئی تھی، اس کا اسٹاک جب ختم ہونے لگے گا، اور اس کی کمی محسوس ہونے لگے گی تو اس کی قیمت میں پھر اضافہ ہو جائے گا جس سے وہ اپنی پہلی سطح پر پہنچ جائے گی۔ یا ممکن ہے اس سے بھی زیادہ بڑھ جائے، چناں چہ پیدا کرنے والے پھر اس چیز کی پیدائش میں محنت صرف کرنا شروع کریں گے۔

اگرچہ اشیا کی قیمت رسد و طلب سے برابر گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مگر یہ کمی بیشی اس چیز کی قدر کے لحاظ سے اوسطِ قیمت کے ذرا سی ادھر یا اُدھر رہتی ہے۔ اگر رسد زائد ہے تو قیمتیں گر جائیں گی اور پیداوار بھی کم ہو جائے گی۔ جب تک رسد کی زیادتی کم ہو جائے گی اور قیمت پھر بڑھنا شروع کرے گی۔ اور اگر اس چیز کی مقدار مانگ سے بہت کم ہو گئی تو قیمت اس کی قدر سے بھی زیادہ بڑھ جائے گی۔ چناں چہ جب پیدا کرنے والا اسے فروخت کرے گا تو اسے صرف کیے ہوئے گھنٹوں سے زیادہ کی قیمت ملے گی۔ تب زیادہ لوگ اس شے کی پیدائش شروع کر دیں گے۔ جس سے رسد بڑھ جائے گی اور اس کی قیمت قدر کی قیمت پر دوبارہ واپس آ جائے گی۔

لیکن ایسے دور بھی آئے ہیں جس میں تمام قیمتیں ایک ساتھ بڑھ جاتی ہیں اور تمام قیمتیں ایک ساتھ گھٹ جاتی ہیں۔

۱۹۱۴ء کی جنگ سے پہلے کی دُنیا میں قیمتوں کی اس طرح عام تبدیلی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سونے کی قدر ہمیشہ بدلتی رہتی تھی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب برطانیہ کا سکہ سونے کے معیار پر تھا تو سونے کا چوتھائی اونس ایک پونڈ سے کم یا زیادہ ہو جاتا تھا، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، پونڈ سے مراد صرف اتنے ہی گھنٹے کی محنت ہے جتنی چوتھائی اونس سونے کے ڈھالنے میں صرف ہوتی ہے۔ اس لیے اس سونے کے سکے کی قیمت ہمیشہ ایک پونڈ رہتی ہے، چاہے سونے کے ڈھالنے میں زیادہ عرصۂ محنت صرف ہو یا کم۔ سونے کی قدر بدل سکتی ہے اس سے یہ مراد ہے کہ اس میں صرف کی ہوئی محنت کم یا زیادہ ہو سکتی ہے، مثلاً جس زمانے میں پہلے پہل آسٹریلیا کی سونے کی کانوں کو فروغ دیا گیا تھا تو وہاں سونے کی پیدائش پہلے سے موجود کانوں کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے ہوتی تھی، اور سونا اتنی زیادہ مقدار میں پیدا کیا جاتا تھا کہ چوتھائی اونس سونے کی پیدائش میں صرف ہونے والی اوسط محنت کم ہو گئی، حال ہی میں سونے کی پیدائش کو استدلالی طور پر منظم کرنے سے یہی نتیجہ حاصل ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ یعنی ان طریقوں اور ترکیبوں کے اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن سے اتنی ہی محنت میں زیادہ مقدار میں سونا پیدا ہو سکے، یا بہ الفاظِ دیگر سونے کی اتنی ہی مقدار میں کم محنت صرف ہوتی ہے۔

اس تبدیلی کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو مگر ہوتا ہمیشہ یہ ہے کہ سونے کی پیدائش میں جب نسبتاً کم محنت صرف ہوتی ہے تو عام طور پر چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں، اور اگر ایک مرتبہ ہم بہ خوبی اس چیز کو ذہن نشین کر لیں کہ معیاری اکائی مثلاً برطانیہ کا پونڈ محض اس عرصۂ محنت کا نام ہے جو چوتھائی اونس سونے کے سکے کے ڈھالنے میں صرف ہوا ہے تو اس کی وجہ صاف ظاہر ہو جائے گی۔ اگر چوتھائی اونس سونا ڈھالنے کا عرصۂ محنت کم ہو جائے مثلاً ۲ گھنٹے سے صرف ۱ گھنٹے رہ جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک جوڑے جوتے

کی قیمت جس میں ۲۰ گھنٹے کی محنت صرف ہوئی ہو، بہ جائے چوتھائی اونس کے نصف اونس ہو جائے گی۔ چاندی کی رقم سے بجائے ایک پونڈ کے دو پونڈ ہو جائے گی۔ اور یہ تو موٹی سی بات ہو کہ اس قسم کا ردّوبدل اچانک نہیں ہوتا بلکہ کئی سال کے عرصہ میں ہوتا ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ جوں جوں سونے کی پیدائش استدلالی طور پر منظم کی جاتی ہو یعنی رفتہ رفتہ کم محنت لگائی جاتی ہو اسی لحاظ سے دیگر اشیا کی پیدائش بھی استدلالی طور سے منظم ہوتی ہو۔ اگر ایک ٹن کوئلے کی پیدائش میں اُسی حساب سے عرصۂ محنت کی کمی ہوئی ہو جس حساب سے چوتھائی اونس سونے کے ڈھالنے میں ہوئی ہو تو کوئلے کی قیمت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ اور چوں کہ اعلا صنعتی پیدائش کی استدلالی تنظیم زمین سے دھاتوں کے نکالنے کے طریقوں کی بہ نسبت زیادہ آسان ہو نیز سونے کے ایک مخصوص وزن کی پیدائش کے عرصۂ محنت میں متواتر تخفیف کی وجہ سے کام کے گھنٹے صنعتی طرز کی پیداوار کے برابر یا تقریباً برابر ہیں اس لیے بہت زمانے تک قیمتیں گرتی جاتی ہیں۔

مگر قیمتوں کے معیار میں عام ردّ و بدل کی عمومی وجہ یہ نہیں تھی کہ خود سونے کی قدر یا دیگر اشیا کی قدر میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ یہ سب کو معلوم ہو کہ گزشتہ سو سال کی تجارت میں گرم بازاری اور سرد بازاری برابر ہوتی رہی ہو جس کو تجارتی گردش بھی کہتے ہیں۔ اور یہ حالت ایسے دور میں تھی جب کہ موجودہ پیدائشی نظام (جو سرمایہ داری کے نام سے موسوم ہو) اچھی طرح ساری دنیا میں رائج ہو چکا تھا۔ تجارت کے اس وقتی اور مسلسل اُتار چڑھاؤ کے اصلی اسباب کی مفصّل تشریح کرنے کا یہ موقع نہیں ہو۔ مگر پھر بھی قیمتوں اور زر کی تشریح کے لیے یہ معلوم کرنا لازمی ہو کہ اس میعادی گرم بازاری و سرد بازاری کے زمانے کی نوعیت کیا ہو۔

جس زمانے میں تجارت زوروں پر رہتی ہو، یکے بعد دیگرے چیزوں کی مانگیں خود پیدائش کی رسد سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ اس لیے خریداروں میں زبردست مقابلہ ہوتا ہو، چیزوں کے حصول کے لیے وہ پہلے سے زیادہ دام ادا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اس طرح قدرِ مبادلہ سے چیزوں کی قیمتیں زیادہ بڑھ جاتی ہیں اور صنعت سے بہت منافع ملنے لگتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو جن کے پاس سود پر لگانے کے لیے بہت سا سرمایہ اکٹھا ہو جاتا ہو، وہ نئی کانیں کھودنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ نئے کارخانے قائم کر کے اُن چیزوں کی رسد بڑھاتے ہیں جن پر مزید منافع ملتا ہو، تھوڑے عرصے تک تو یہ ترکیب بہت کامیاب ہوتی ہو، اور اس وقت تک یہی حالت رہتی ہو جب تک اس چیز کی مزید رسد بڑھتی ہوئی مانگ کے برابر نہ ہو جائے۔ اس کے بعد وہ دور آتا ہو جب قیمتیں گرنے لگتی ہیں۔ مگر نئے کارخانے اور کانیں پُرانی کانوں اور کارخانوں کی طرح اس چیز کی پیدائش جاری رکھتی ہیں۔ جس کا لازمی انجام یہ ہوتا ہو کہ رسد کی بہت زیادہ فراوانی ہو جاتی ہو، اور قیمتیں بہت تیزی سے گرنے لگتی ہیں، اس لیے کہ ہر پیدا کرنے والا اپنا مال سب سے پہلے فروخت کرنے کی فکر میں رہتا ہو، اور جب ہر پیدا شدہ چیز کے لیے کافی خریدار نہیں ملتے تو رفتہ رفتہ ایسا وقت آجاتا ہو جب ان کی قیمتیں مبادلۂ قدر سے بھی کم ہو جاتی

ہیں، اور تب ان اشیا کے پیدا کرنے والے ان کی صنعت بند کر دیتے ہیں یا کم کر کے صرف اتنی ہی مقدار میں پیدا کرتے ہیں جتنی بک سکے۔ جب کسی صنعت کی پیداوار اس طرح رو کی جاتی ہے تو دوسری صنعتوں کی پیداوار بھی رُک جاتی ہے۔ کیوں کہ پیداوار کے روکنے یا کم کرنے کے دو معنی ہوتے ہیں اول یہ کہ خام پیداوار کی مانگ کم ہو جاتی ہے، دوسرے پیدائش کی کمی کے باعث مزدوری پانے والے مزدوروں کی تعداد میں کمی ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے استعمال کرنے کی چیزوں کی مانگ کم ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ان بے کار مزدوروں کے پاس اپنے استعمال کی چیزیں خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔

اس طرح سرد بازاری ایک سے دوسری صنعت تک پھیل جاتی ہے، اور پھر ملک بھر کی صنعتوں کا ایک حصہ یا تو بے کار ہو جاتا ہے یا کم کام کرتا ہے۔ ہر قسم کی ضروری خام پیداوار کی زیادتی ہو جاتی ہے اور استعمال کی چیزیں بے کار پڑی رہتی ہیں۔ بہت عرصے تک اسی طرح چیزوں کی قیمتیں گرتی رہتی ہیں مگر بعد میں لوگ آخر کار یا تو یہ فاضل سامان استعمال کر ڈالتے ہیں یا ضائع اور برباد کر دیتے ہیں۔ ہر سرد بازاری کے دور میں اشیائے خوردنی مثلاً گیہوں اور کافی وغیرہ کی بڑی بڑی مقدار اس غرض سے برباد کر دی جاتی ہے تاکہ باقی ماندہ اشیا نسبتاً گراں داموں پر فروخت ہو سکیں۔ اکثر کانیں تو مستقل طور سے بند کر دی جاتی ہیں، کارخانے گرا دیے جاتے ہیں اور مشینریاں توڑ ڈالی جاتی ہیں تاکہ جب پھر مانگ بڑھے تو پیدائش کو مانگ سے زیادہ نہ ہونے دیں اور گنجائش کم رہے۔ ان تمام ترکیبوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیمتیں پھر سے بڑھنی شروع ہو جاتی ہیں اور پیدائش بھی زیادہ ہونے لگتی ہے، پھر سے گرم بازاری ہو جاتی ہے، اور چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں، پیدائش زیادہ ہوتی ہے، اور رفتہ رفتہ پھر سرد بازاری کا زمانہ آجاتا ہے۔

ان میعادی گرم بازاری اور سرد بازاری کی وجہ سے ہر چند سال کے بعد قیمتیں بڑھتی اور گرتی ہیں۔ سونے کی قدر میں تبدیلی یا عرصۂ محنت میں کمی بیشی ہونے کے باعث اشیا کی قیمتوں میں ردّ و بدل تو واقع ہوتا ہی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی یہ ردّ و بدل بجائے خود ایک الگ چیز ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ قیمتوں کی تبدیلی صرف رسد اور مانگ پر منحصر ہے، متواتر تبدیلی کی وجہ سے ظاہرا طور پر تو یہی پتا چلتا تھا کہ پیدائش کی مانگ و رسد کے لحاظ سے اس میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا ہے، انھوں نے اس بات کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا کہ ہر چیز کی ایک قدرِ مبادلہ بھی ہوتی ہے، جس کی بنیاد پر قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں اور قدرِ مبادلہ اس عرصۂ محنت کو کہتے ہیں جو کسی چیز کی پیدائش میں اوسط طور پر صرف ہوتا ہے۔

قیمتوں کے گھٹاؤ بڑھاؤ کا اندازہ کرنے کے لیے کسی ایک خاص وقت کی اوسط قیمتوں کو لے کر بنیاد بنا لینا ضروری ہے۔ چاہے ہم ایک چیز کی پیدائش کو لیں یا کئی چیزوں کی یا تمام خاص خاص چیزوں کی اس سے کوئی فرق نہیں ہوگا۔ قیمتوں کا اندازہ کرنے کے لیے سنہ ۱۹۰۰ء کی قیمتیں اور سنہ ۱۹۱۳ء کو کافی عرصے تک بنیاد کے طور پر کام میں لایا جا رہا ہے مثلاً اگر یہ کہا جاتا ہے کہ سنہ ۱۹۱۳ء کے بعد سے گیہوں کی قیمت میں ۵۰ فی صدی کا اضافہ ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر سنہ ۱۳ء میں اس کی قیمت ۱۰۰ تھی تو اب اس لحاظ سے ۱۵۰ ہے۔

کسی مخصوص پیداوار یا تمام چیزوں کے اضافے کو جوڑ دینے سے پیداوار یا پیداوار کے ایک گروپ کی بدلی ہوئی اوسطاً قیمت کی عام انڈکس معلوم ہو جاتی تھی۔ اس طرح عام انڈکس جمع کرنے میں یا کسی مجموعی پیدائش کی انڈکس مرتب کرتے وقت ہر خصوصی پیداوار کی اہمیت اور توازن میں خفیف سا فرق رہتا ہے۔ مثال کے طور پر اخبار یا اکانومسٹ رسالہ یا تجارتی بورڈ کے انڈکس نمبر میں ذرا فرق ہوتا ہے۔ بتائی ہوئی فی صدی مختلف ہو سکتی ہے مگر قیمتوں کے ردّ و بدل کا رُخ سب میں یکساں ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ چیز زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کہ فی صدی مقرر کرنے کے لیے کیا پیمانہ استعمال کیا گیا ہے۔

سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ کے بعد یہ دستور رہا کہ جس سال کی قیمتوں کی فی صدی تبدیلی کو بنیاد بنانا ہے اُسے اس سال کی قیمتوں میں ردّ و بدل کر دیا جائے۔ اگر ہم قیمتوں کی حرکت کو جانچ رہے ہیں تو یہ وثوق سے معلوم کر لینا ضروری ہے کہ اگر قیمتیں ۸۰ یا ۱۲۰ فی صدی ہیں تو بنیادی سال کون سا ہے؟ کیوں کہ ممکن ہے کہ فی صدی کے ظاہری اختلاف کے باوجود دونوں صحیح ہوں۔ مثلاً اگر سنہ ۳۲ء کو بنیادی سال مانا جائے تو جب قیمتیں بہت گری ہوئی تھیں تو ۲۰ فی صدی قیمتوں کے بڑھنے سے عام قیمتوں کی انڈکس ۱۲۰ فی صدی ہو جائے گی اور اگر سنہ ۲۹ء کو بنیادی سال مانا گیا جب کہ دام بڑھ گئے تھے تو عام انڈکس ممکن ہے کہ صرف ۸۰ ہی فی صدی رہ جائے۔ یعنی سنہ ۳۲ء کے بعد سے قیمتیں ۲۰ فی صدی چڑھ جانے کے بعد بھی ۲۰ فی صدی کم ہیں۔ سرکاری اخباروں اور محکموں میں اس کی بہت گنجائش رہتی ہے کہ وہ بنیادی سال کو بدل کر ایک قطعی طور پر غلط اور گمراہ کرنے والا انڈکس نمبر چھاپ دیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر ملک کی ہر پیدائش کی تبدیلی قیمت اس جگہ کے رائج سکّوں کی اکائی سے ناپی جاتی ہے۔ مثلاً برطانیہ میں پونڈ سے، امریکہ میں ڈالر سے اور ہندستان میں رُپے سے بدلی ہوئی قیمت ناپی جائے گی۔ اور جس زمانے میں ہر اہم ملک میں سونے کی معیاری اکائی ہوتی تھی تب ان تمام ملکوں کی تھوک بندی کی قیمت کی انڈکس نمبر تقریباً برابر ہوتی تھی اگرچہ ہر ملک میں مقامی رسد اور مانگ کے لحاظ سے قیمتوں میں خفیف سی تفریق لازمی طور پر واقع ہو جاتی تھی۔ چیزوں کے استعمال کی جو بکری ہوتی ان کی قیمتیں تمام ملکوں میں یکساں نہ تھیں۔ مثلاً اگر کسی ملک میں چائے پر محصول عائد ہو گیا تو استعمال کے لیے جو چائے خریدی جائے گی اس کی قیمت ۱۰ یا ۲۰ فی صدی تک بڑھ جائے گی۔ جب کہ دیگر ممالک میں وہ پہلے ہی کی سی رہے گی۔

جونھی کوئی مُلک سونے کے معیار سے ہٹ جاتا ہے اس کی قیمتوں کا انڈکس ایک حد کے اندر دُوسرے مُلکوں کی قیمتوں کی حرکت سے قطعاً بے تعلق ہو جاتا ہے، اس لیے کہ وہ قیمتیں اب دُوسرے مُلکوں کی معیاری اکائیوں سے سونے کے ذریعے کسی براہِ راست علاقے میں منسلک نہیں ہوتی ہیں۔

مسائلِ حاضرہ (غیر ممالک)

روس کا نیا پنج سالہ منصوبہ

از : ـــــــــ خلیق احمد نقوی

جنگ کے خاتمے پر دُنیا کے ہر ملک میں کوشش کی جارہی ہو کہ معاشی حالت بہتر کی جائے، جنگ کے نقصانات کی تلافی کی جائے اور اس طرح ملک کو خوش حال بنانے کی کوشش کی جائے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور خود ہمارے مُلک میں نئے نئے منصوبے تیار ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں روس کی منصوبے بندی دِل چسپی سے خالی نہیں۔ جنگ میں رُوس کو سب سے زیادہ قربانی پیش کرنی پڑی۔ اس کی صنعت تباہ ہوگئی، زراعت کو دھکّا پہنچا، ملک کا معاشی توازن بگڑ گیا جس حیرت انگیز طریقے سے روس کے معاشین اور حکومت نے جنگ کے زمانے میں اپنی معیشت کی تنظیم کی وہ قابلِ قدر ہو۔ اب وہ اپنے ملک کو پھر منظم کرکے خوش حالی کے راستے پر گام زن ہونا چاہتے ہیں۔ یہ نیا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۴۶ء - ۱۹۵۰ء) اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو۔

اس سے پہلے کہ آپ نئے پنج سالہ منصوبے کے اغراض ومقاصد کا مطالعہ کریں، یہ بہتر معلوم ہوتا ہو کہ آپ جنگ سے پہلے کے روس کی معاشی حالت کی بنیادی اہمیت سمجھ لیں۔ روس میں ۱۹۱۷ء میں انقلاب ہوا تھا۔ چار سال تک دنیا کے تمام بڑے ملکوں کی فوجیں اس نئی اشتراکی ریاست کو ختم کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ مُلک کے اندر شکست خوردہ سرمایے دار طبقے نے بھی ان کی مدد کی۔ اس زبردست جدوجہد میں لینن نے روس کی معیشت کی تنظیم کی۔ اس کے بعد ۱۹۲۸ء تک "نئی معاشی پالیسی" (ن، م، پ یا نمیپ) کے ذریعے ملک کو ۱۹۱۳ء کے معیار تک لانے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۲۸ء میں پہلی دفعہ ایک پنج سالہ منصوبہ بنا جس کے ماتحت زراعت کو پنچایتی کیا گیا اور ملک میں صنعت کی ترقی ہوئی۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے بعد ۱۹۱۳ء

کے مقابلے میں صنعت آٹھ گنا ترقی کر چکی تھی اور ملک ایک زراعتی درجے سے اوپر اٹھ کر معاشی حیثیت سے خود مختار ہو گیا تھا۔ اس طرح روس میں اشتراکیت کی بنیاد مستقل ہو گئی تھی۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ روس میں اشتراکیت سے آگے بڑھ کر اشتمالیت کے زینے پر قدم رکھا جائے یعنی پیدائش اتنی بڑھائی جائے کہ ہر ایک کو اس کے کام کے مطابق معاوضہ دینے کی بجائے اس کی ضرورت کے مطابق چیزیں دی جائیں۔ ابھی یہ تیسرا پنج سالہ منصوبہ پورا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ جرمنی نے ۲۲ جون سنہ ۱۹۴۱ء کو روس پر حملہ کر دیا اور ملک کے سارے وسائل، جنگ کے کام میں لگ گئے۔ جنگ کے دوران میں روس کی صنعت، زراعت، ذرائع رسل و رسائل اور آمد و رفت نے جس طرح سرخ فوج کے محاذ کو سنبھالا اس نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ اوّل جنگِ عظیم میں روس کی شکست اور معاشی تباہی سے جب دوسری جنگِ عظیم کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکی نظام میں کیسے کوئی ملک ترقی کرتا ہے۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ چوتھا پنج سالہ منصوبہ کیا ہے اور منصوبہ بندی کرنے والوں نے کون سے مقاصد اپنے سامنے رکھے ہیں۔

اس پنج سالہ منصوبے کا سب سے اہم سیاسی اور معاشی مقصد یہ ہے کہ جنگ کی تباہیوں کی تلافی ہو، صنعت اور زراعت کو جنگ سے پہلے کے معیار تک پہنچایا جائے اور پھر اس معیار سے بھی آگے بڑھایا جائے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل کام اپنے سامنے رکھے گئے ہیں۔

پہلا کام یہ ہے کہ صنعتی پیداوار کو جنگ کے پہلے کے مقابلے میں ڈیڑھ گنا کیا جائے اور خاص طور پر بھاری صنعتوں اور ریل کو ترقی دی جائے۔ بغیر اس کے ملک کی معاشی حالت سدھارنا ناممکن ہے۔

دوسرا کام یہ ہے کہ زراعت کی پیداوار بڑھائی جائے اور تصرف کی اشیا پیدا کرنے والی صنعتوں کی ترقی ہو تاکہ روس کے عوام افراط سے اپنی ضرورت کی اشیا پا سکیں اور مادی خوش حالی بڑھے۔ جنگ سے پہلے کی قومی آمدنی میں اضافہ ہو، چیزوں کی قیمت کم کی جائے اور معیارِ زندگی اونچا ہو۔

تیسرا کام یہ ہے کہ ملک کی معیشت کی ہر شاخ میں فن کو ترقی دی جائے۔ پیداوار کو بہت حد تک بڑھانے اور مزدوروں کی قوتِ پیدائش زیادہ کرنے کے لیے یہ فنی ترقی بہت ضروری ہے۔ ملک کے سائنس دانوں کی مدد کی جائے تاکہ سویت سائنس دوسرے ملکوں کے سائنس سے بازی لے جائے۔

چوتھا کام یہ ہے کہ اشتراکی اجتماع بہت تیزی سے ہو۔ تباہ شدہ علاقوں کی معیشت کو پھر سے پرانی حالت پر لانے کے لیے اور پورے ملک کی معاشی ترقی کے لیے نئی مشینیں قائم کرنا اور پرانی مشینوں کو کام کے قابل بنانا بہت ضروری ہے۔

پانچواں کام یہ ہے کہ روس کی مدافعت کے لیے فوج کو سب سے نئے اور بہترین اسلحہ جات سے مسلح کیا جائے۔ اتفاقی حملوں اور امن کی محافظت کے لیے اس کی بہت اہمیت ہے۔ روس کے لوگ جانتے ہیں کہ اجارتی سرمایہ داری (MONOPOLY CAPITALISM) اب بھی جنگ چھیڑ سکتی ہے۔ اس حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا بہت ضروری ہے۔

ابھی بتایا جاچکا ہے کہ تیسرے پنج سالہ منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ اشتراکیت سے اشتمالیت کے زینے پر قدم رکھا جائے جنگ نے کچھ عرصے کے لیے اس ترقی کو روک دیا تھا۔ موجودہ پنج سالہ منصوبہ اسی کام کو آگے بڑھائے گا۔ غیر طبقاتی اشتراکی سماج قائم ہوجائے گا اور رفتہ رفتہ اشتمالی عہد شروع ہوجائے گا۔ اس منصوبے کی بہ دولت آبادی کی فی کس پیداوار دوسرے تمام ملکوں سے بڑھ جائے گی۔ روس کے سامنے یہ سب سے بنیادی کام ہے۔

ان مقاصد کی نظر میں موجودہ پنج سالہ منصوبہ (سنہ ۱۹۴۶ء ـــ سنہ ۵۰ء) میں ترقی کی یہ رفتار ہوگی۔

صنعت:۔

سنہ ۱۹۵۰ء تک، جو اس منصوبے کا آخری سال ہے، روس کی خام پیداوار (GROSS OUTPUT) ۲۰۵ ارب روبل (سنہ ۱۹۲۶ء ـــ سنہ ۲۷ء کی قیمتوں کے مطابق) کے برابر ہوگی۔ جنگ سے پہلے کے مقابلے میں یہ ۴۸ فی صدی زیادہ ہے۔ جن علاقوں میں دشمن کا قبضہ ہوا تھا وہاں صنعتی پیدائش جنگ کے پہلے کے مقابلے میں ۱۵ فی صدی زیادہ ہوگی۔ پیداوار کی اتنی ترقی کے لیے سوویت صنعت کو بہت آگے بڑھانا ضروری ہے۔ 'نمپ' کے زمانے میں (سنہ ۱۹۲۱ء ـــ سنہ ۲۶ء) سالانہ اضافہ ۲ ارب ۴ کروڑ ۹۰ لاکھ روبل تھا۔ پہلے پنج سالہ منصوبے میں ۵ ارب ۷۴ کروڑ ۸۰ لاکھ روبل، دوسرے پنج سالہ منصوبے میں سالانہ اضافہ ۱۰ ارب ۴۳ کروڑ ۸۰ لاکھ روبل ہوگیا تھا اور تیسرے پنج سالہ منصوبے کے پہلے تین سال میں ۱۴ ارب ۳۱ کروڑ ۶۰ لاکھ روبل سالانہ اضافہ ہوا۔ نئے پنج سالہ منصوبے میں ہر سال ۱۵ ارب ۶۰ کرور روبل پیداوار کا سالانہ اضافہ ہوگا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ انقلاب کے بعد سے سالانہ اضافہ بڑھتا جارہا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مشینوں کی تباہی کی وجہ سے اس عرصے میں ذرائع پیدائش کی پیداوار تصرف کی اشیا کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بڑھے گی۔

زراعت:۔

زراعت کی ترقی کے لیے جماعتی کھیتوں کو ترقی دینا ضروری ہے، معاشی اور تنظیمی طریقے سے زراعت میں زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر مشینوں کا استعمال ہوگا۔ اگر ہم زراعت کی خام پیداوار پہلے پنج سالہ منصوبے کے آخر میں ۱۰۰ مان لیں تو دوسرے منصوبے کے اختتام تک (سنہ ۱۹۳۷ء) وہ ۱۵۳ پہنچ گئی، سنہ ۱۹۴۰ء تک ۱۷۷ اور سنہ ۱۹۵۰ء میں ۲۲۵ پہنچ جائے گی۔

اس ترقی کے لیے کھیتی کے علاقے کو بڑھایا جائے گا، اچھی کھاد اور بیج استعمال ہوں گے، فصل کی ردوبدل سے زیادہ سے

زیادہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں پانچ لاکھ بارہ ہزار ٹریکٹر کھیتوں کو ملے تھے، اس نئے پنج سالہ منصوبے میں سات لاکھ بیس ہزار ٹریکٹر ملیں گے۔ بجلی کا استعمال بڑھے گا، مویشیوں کی تعداد زیادہ ہوگی اور اس طرح زراعتی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔

صنعت اور زراعت کی اس ترقی سے ملک کی معاشی حالت بہتر ہوگی، اشتراکی نظام میں یہ کوشش مستقل طور پر جاری رہتی ہے کہ پیدائش کے خرچ کو کم کیا جائے۔ اس سے اجتماع میں اضافہ ہوتا ہے اور عوام کو تصرف کے لیے زیادہ ملتا ہے۔ نئے پنج سالہ منصوبے میں صنعتوں کے پیدائش کے خرچ میں ۱۷ فی صدی کی کمی ہوگی۔ ٹریکٹر کی پیدائش کے خرچ میں ۱۶ فی صدی اور ریل کی پیدائش کے خرچ میں ۱۸ فی صدی کم خرچ ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ صنعتی، زراعتی اور نقل و حمل کی پیداوار بہتر بنائی جائے گی۔ اس طرح روس کی معاشی خوش حالی بڑھے گی۔ پیدائش کی ہر شاخ میں ترقی ہوگی۔ خود ملک کے وسائل کی مدد سے بنیادی سرمایے میں اضافہ ہوگا، معیارِ زندگی اونچا ہوگا اور فنی ترقی بھی ہوگی۔

ملک کی قومی آمدنی میں اضافہ کرکے ملک کی مادّی خوش حالی کو فروغ دیا جائے گا۔

عوام کی مادّی اور تمدنی ترقی

روس کی قومی آمدنی سنہ ۱۹۱۳ء میں ۲۱ ارب روبل تھی، سنہ ۱۹۳۲ء میں ۴۵ ارب ۵۰ کروڑ روبل، سنہ ۱۹۳۷ء میں ۹۶ ارب ۳۰ کروڑ، سنہ ۱۹۴۰ء میں ۱۲۸ ارب ۳۰ کروڑ اور سنہ ۱۹۵۰ء میں ۱۷۷ ارب روبل ہوگی (سنہ ۱۹۲۶ء - سنہ ۲۷ء کی قیمتوں کے مطابق)۔ چوں کہ جنگ کے اخراجات میں کمی ہوگئی ہے اس لیے اس آمدنی کا ۳۷ فی صدی حصہ تصرف میں آئے گا، ۱۲ فی صدی جمع ہوگا اور ۶ فی صدی ریاست کے ذخیرے میں جائے گا۔

مزدوروں کی اوسط آمدنی میں ۴۸ فی صدی کا اضافہ ہوگا۔ شہروں اور دیہاتوں کی سماجی اور تمدنی خدمتوں میں سنہ ۱۹۴۰ء کے مقابلے میں ۲ر۶ گنا زیادہ خرچ ہوگا۔ تعلیم کا بہتر انتظام کیا جائے گا۔ نئے مکانات بنائے جائیں گے۔

نئے پنج سالہ منصوبے میں عوام کا معیارِ زندگی اونچا کیا جائے گا۔ چیزوں کی قیمت کم کی جائے گی، نئے مکانات اور دوسری تمدنی اور سماجی خدمتیں زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائیں گی، مزدوروں کی قوتِ محنت اور صلاحیت بڑھنے کے ساتھ ساتھ مزدوری میں اضافہ ہوگا، اجتماعی کھیتوں کی آمدنی بڑھائی جائے گی۔ حکومت کے منصوبے کو پورا کرنے اور اس سے بھی زیادہ پیدا کرنے والوں کو خاص انعام ملے گا۔ سائنس اور انجنیری کی ترقی کے لیے بھی انعام مقرر کیے جائیں گے۔

نتیجہ

یہ ظاہر ہے کہ اگر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا گیا تو روس کی معیشت میں زبردست ترقی ہوگی۔ یہی نہیں کہ جنگ کی تباہیوں کی تلافی ہو جائے گی بلکہ روس اس سے بھی آگے بڑھ جائے گا۔ جب روس کا پہلا پنج سالہ منصوبہ تیار ہوا تھا تو دنیا کے ہر ملک کے معاشیین نے اسے شیخ چلّی کا منصوبہ بتایا تھا۔ وہ سوچ بھی نہ پاتے تھے کہ پانچ سال کے اندر ایک زراعتی

ملک کو صنعتی ملک بنایا جاسکتا ہی۔ لیکن روس کے عوام نے اس پنج سالہ منصوبے کو چار سال ۳ مہینے میں پورا کر کے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہی حال دوسرے اور تیسرے منصوبوں کا ہوا۔ ہمیشہ یہ منصوبے شروع میں ناممکن العمل معلوم ہوتے تھے مگر روسیوں نے ہمیشہ اپنے منصوبے سے آگے بڑھ کر دکھا دیا۔ اس تجربے کی بنیاد پر ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس بار بھی روسی صرف اپنا یہ پنج سالہ منصوبہ ہی پورا نہیں کریں گے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔

(اقتباس از رپوٹ وازنے سنسکی، صدر، روسی ریاستی منصوبہ کمیشن)

معاشی صورتِ حال

۱۔ برٹین ووڈز اور ہندستان
۲۔ ٹریڈ یونین ایکٹ
۳۔ غذائی مسئلہ

برٹین ووڈز اور ہندستان | ۹؍اکتوبر ۱۹۴۶ء کو مرکزی اسمبلی نے اتفاقِ رائے سے یہ سرکاری تجویز منظور کرلی کہ ہندستان بین اقوامی بینک اور بین اقوامی زرفنڈ میں اپنی رکنیت برقرار رکھے۔ اسمبلی کے شروع سال کے اجلاسوں میں جو کمیٹی ہندستان کی شمولیت کے مسئلے پر غور وخوض کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی اُس کی سفارشات کا ماحصل یہ تھا کہ ہندستان کی شمولیت کو اسٹرلنگ قرضے کی وصولی پر مشروط رکھا جائے۔ گزشتہ بحثوں میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا کہ بین اقوامی بینک اور زرفنڈ میں شامل ہونے کے ساتھ ساتھ اسٹرلنگ قرضے کا وصول ہونا ہندستان کے لیے ازحد ضروری ہے۔ اس مسئلے پر وزیر مالیات نے بتایا کہ حکومتِ ہند اسٹرلنگ قرضے کے مسئلے کو حل کرنے کی ان تھک کوشش کررہی ہے اور ملک معظم کی حکومت بھی جلد از جلد بات چیت شروع کرنے کی خواہش مند ہے۔ صنعت اور سپلائی کے وزیر ڈاکٹر جان متھائی نے کہا کہ اسٹرلنگ قرضے کی تخفیف کا کسی صورت سے بھی مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جتنا جلد ممکن ہوسکے اس قرضے کا زیادہ سے زیادہ حصہ آزادی کے ساتھ بدلے جانے والے سکے کی شکل میں وصول ہوجائے۔ اور جتنا حصہ بچ رہے اُسے مختصر سے مختصر عرصے میں مناسب شرح سود پر وصول کیا جائے۔ گیڈگل صاحب نے کہا کہ اسٹرلنگ قرضے کی وصولی کے طور پر ہندستان میں جو برطانیہ کا کاروبار اور سرمایہ موجود ہے اُسے لے لیا جائے۔

بین اقوامی زرفنڈ اور بینک میں شامل ہونے کا ایک اور سوال سے تعلق ہے اور وہ ہے رُپے کی شرح تبادلہ کا۔ سر جان متھائی

نے بتایا کہ اگرچہ زرفنڈ میں شریک ہونے کا مطلب یہ ہو کہ رُپے کی شرح تبادلہ کے سلسلے میں ہم کچھ پابندیاں قبول کر رہے ہیں اور ممکن ہو آئندہ چل کر یہ پابندیاں ہماری صنعت اور زراعت کو نقصان پہنچائیں۔ لیکن آیندہ اگر ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی تو ہم بین اقوامی زرفنڈ سے اپنے سکّے کی شرح تبادلہ کے گھٹائے یا بڑھائے جانے کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اگر ایسی صورتِ حال عارضی طور پر پیدا ہوئی تو مالی امداد کے ذریعے اور غیر ملکی مال پر محصولات عائد کر کے ہم اپنی صنعت اور زراعت کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

صنعت اور سپلائی کے وزیر نے یہ بھی بتایا کہ بین اقوامی زرفنڈ کا امریکی تجارتی تجویزوں سے بھی گہرا تعلق ہو۔ اس سلسلے میں آیندہ کے لیے حکومت ہند آزاد تجارت کی حامی ہو لیکن عبوری دور کے لیے صنعت اور زراعت کی حفاظت کی خاطر حکومت ہند یقیناً ضرورت کے مطابق تجارتی پابندیوں سے کام لے گی، اس لیے کہ ہندستان ایک پچھڑا ہوا ملک ہو اور اُسے تجارتی پابندیوں کی ضرورت ہو۔ دُنیا میں خوش حالی پیدا کرنے کے لیے محض یہ ضروری نہیں ہو کہ دُنیا کی مجموعی آمدنی میں اضافہ ہو بلکہ اُس سے زیادہ ضروری یہ ہو کہ جو آمدنی پیدا ہو وہ دُنیا کے ملکوں میں منصفانہ طور پر تقسیم ہو۔ اس کے لیے ضروری ہو کہ ہندستان اور دوسرے پچھڑے ہوئے ملک ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں اپنی معاشی حفاظت کریں۔

بین اقوامی زرفنڈ اور بینک کی رکنیت برقرار رکھنے کے خلاف بھی رائے پیش کی گئی جس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہو۔ مثلاً مسٹر منو صوبے دار نے کہا کہ سب سے پہلی بات تو یہ ہو کہ برطانیہ کے ذمّے ہندستان کے ۱۷۰۰ کروڑ رُپے اسٹرلنگ قرضے کے سلسلے میں باقی ہیں اور اُس کا سود بھی ہمیں نہیں مل رہا ہو۔ ایسی حالت میں بین اقوامی بینک اور زرفنڈ میں شامل ہو کر ۳۲۰ کروڑ رُپے کا چندہ دینے کی ذمّے داری قبول کرنا کہاں تک مناسب اور جائز ہو۔ برطانیہ اُس وقت تک زرفنڈ میں شامل نہیں ہوئی جب تک کہ اُسے امریکی قرضہ نہیں مل گیا، پھر ہندستان کیوں اُس کا رکن بن گیا ہو جب کہ ابھی برطانیہ نے ہندستان کا قرضہ ادا کرنے کی بات چیت بھی نہیں شروع کی ہو؟

ٹریڈ یونین ایکٹ

۳۱ اکتوبر کو لیبر وزیر کی پیش کردہ یہ تجویز منظور کر لی گئی کہ وہ مسودۂ قانون جس میں ۱۹۲۶ء کے ٹریڈ یونین ایکٹ کی ترمیم کی گئی ہو غور و خوض کے لیے ایک سلیکٹ کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے۔ اسمبلی کے بعض حلقوں کی طرف سے جو یہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا کہ فرقہ وارانہ بنیاد پر بھی مزدوروں کی انجمنوں کو تسلیم کیا جائے۔ وہ مزدوروں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے ایک غلط مطالبہ تھا اور یہ اچھا ہوا کہ اُسے منظور نہیں کیا گیا۔ مزدوروں کی انجمنوں کا لازمی طور پر تسلیم کیا جانا اُن کے تحفظ کے لیے ضروری ہو، اگرچہ اُس کے ساتھ جو شرطیں وابستہ کر دی گئی ہیں وہ مزدور تحریک پر بہت سا بوجھ ڈال دیں گی۔ بہ ہر حال اب دیکھنا یہ ہو کہ سلیکٹ کمیٹی کے غور و خوض کے بعد اس مسودۂ قانون کی کیا شکل و صورت ہوتی ہو۔ یوروپین گروپ کی یہ رائے تھی کہ مزدور انجمنوں کے سیاسی نظریوں کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ سماج کا نظام ہی جڑ سے بدل ڈالیں۔ ہماری رائے میں یہ رائے

بالکل بے انصافی پر مبنی تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ مزدور انجمنوں کو اس بات کا حق حاصل ہو کہ وہ اپنے لیے جس قسم کا سیاسی نظریہ چاہیں متعین کریں۔ لیکن مسودۂ قانون میں کچھ خرابیاں بھی موجود ہیں۔ مثلاً اس میں یہ درج ہو کہ مزدوروں کی انجمنوں کو اس بات کا حق حاصل ہو کہ مالک اُن کے سوالات اور عرض داشتوں کا جواب دیں۔ اب سوال یہ ہو کہ کیا محض اتنا کافی ہو؟ گورو سوامی صاحب کا یہ کہنا کہ ممکن ہو مالک مزدوروں کے مطالبات کا جواب نفی میں دے۔ چناں چہ مسودے میں صاف طور پر یہ ہونا چاہیے کہ مزدوروں کو مالکوں کی طرف سے مناسب اور معقول جواب ملنا چاہیے۔ ہمارا خیال ہو کہ یہ تجویز بالکل صحیح اور مناسب ہو ورنہ پھر مالکوں کے خلاف مزدوروں کے مفاد کی حفاظت نہیں ہو سکتی اور مسودۂ قانون کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ مسودے میں مزدوروں اور مالکوں کے جھگڑے کو چکانے کے لیے ثالثی فیصلے کو لازمی قرار دیا گیا ہو۔ اور ساتھ ہی ہڑتال کی بھی مخالفت کی گئی ہو۔ ہمارا خیال ہو کہ یہ دونوں باتیں مزدوروں کے طبقاتی مفاد کے خلاف ہونے کے علاوہ اُن کو کچھ جائز حقوق سے محروم کر دیتی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں زمانۂ جنگ کی یادگار ہیں اور انھیں اب بالکل ختم ہو جانا چاہیے۔

غذائی مسئلہ

مرکزی اسمبلی میں ۴ نومبر کو غذائی صورتِ حال پر تقریر کرتے ہوئے وزیرِ غذا نے بتایا کہ ہندستان قحط کے دروازے پر کھڑا تھا، لیکن اب وہ نازک صورتِ حال گزر چکی ہو اور خدا خدا کر کے قحط کا خطرہ ٹل گیا۔ اگرچہ نومبر اور دسمبر کے مہینے کچھ اچھے نہیں رہیں گے لیکن یہ بات ہماری تشویش دور کر دیتی ہو کہ اس سال موسمی بارش میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور بھادوں کی فصلوں سے جو اناج ہوا ہو وہ اب استعمال میں آئے گا۔ گزشتہ آٹھ ماہ میں ۱۷ لاکھ ٹن غلہ باہر سے آسکا ہو حال آں کہ ۴۰ لاکھ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ بقیہ ضرورت ہندستان سے پوری ہوگئی۔ یعنی دیہاتوں سے کوئی ۲۸ لاکھ ٹن غلہ جمع کیا گیا۔ ۱۷ لاکھ ٹن غلہ جو باہر سے منگوایا گیا اس کے لیے ۹۱ کروڑ روپے کی قیمت ادا کی گئی اور ۱/۲ ۱۵ کروڑ روپے کی امدادی رقم (SUBSIDY) خرچ کی گئی۔ ظاہر ہو کہ ہندستان کی مالی حالت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ رقم بہت زیادہ ہو۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہو کہ کہ جلد از جلد مزید غلہ پیدا کرنے کی اسکیم عمل میں لائی جائے اور غلے کو بربادی سے محفوظ رکھنے کے جدید طریقے اختیار کیے جائیں تاکہ ہندستان ہر سال اتنے زبردست مالی خسارے سے بچ سکے۔ کم سے کم ۱۹۴۷ء تک غذائی صورتِ حال پر سخت نگرانی قائم رکھنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ وزیر غذا نے یقین دلایا ہو کہ دوسری فصل تک نہایت تن دہی کے ساتھ دیہاتوں سے غلہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ۶ کروڑ ٹن کی مجموعی پیداوار میں دو کروڑ ۴۰ لاکھ ٹن غلہ کاشت کاروں کے پاس استعمال کے بعد فاضل بچ رہتا ہو۔ اس میں سے ۴۰ لاکھ ٹن غلہ اُن سے حاصل کیا جا سکا ہو

سب سے زیادہ غلے کی وصولی مدراس میں ہوئی ہو جہاں کاشت کار کے فاضل غلے کا ۹۴ فی صد حصہ وصول کیا گیا ہو اور بمبئی میں ۶۰ فی صدی۔ یو۔پی بھی کام یاب وصولی کی وجہ سے مرکزی حکومت کی امداد سے بے نیاز ہو گیا ہو۔

جہاں تک راشن بندی کا تعلق ہے مارچ سنہ ۱۹۴۳ء میں ۲۰ لاکھ آدمیوں کو راشن سے غلّہ مِل رہا تھا اور اب سنہ ۱۹۴۶ء میں ۵ کروڑ آدمیوں کو مِل رہا ہے ـــــــــــ ابتک ہر صوبے میں اتنے غلّے کا ذخیرہ جمع رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ چھ ہفتے تک کام آسکے۔ لیکن اب کمی کے باعث نومبر سے صرف چار ہفتے تک کا غلّہ جمع رکھا جاسکے گا۔ بہرحال اس سال کچھ علاقوں کے سیلاب سے تباہ ہونے کے باوجود مجموعی طور پر غذائی صورتِ حال اچھّی رہے گی لیکن اتنی ہی اچھّی کہ لوگ فاقے سے بچ جائیں گے۔ فالتو غلّے کے صوبوں نے مثلاً وسطی صوبہ، اڑیسہ اور پنجاب نے بھی قلّت کے صوبوں کی بڑی مدد کی ہے، ان صوبوں سے کوئی ۴۵ ہزار ٹن غلّہ وصول کیا جاسکا ہے۔

لیکن غذائی قلّت کا سوال ابھی ہمارے سامنے سے نہیں ہٹا ہے۔ ابھی غیر ملکوں سے غلّہ برآمد کرنے کی ضرورت برقرار ہے۔

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) کی جدید مطبوعات

پروگرام ۱۹۴۶ء

جنگ ختم ہو چکی ہے لیکن مطابع کی کاروباری مشغولیت بہ دستور ہے جس سے طباعت میں تعویق یقینی ہے۔ لیکن عملے نے تن دہی اور مستعدی سے کام کیا اور امید تھی کہ وسط نومبر میں طباعت کے کام کی تکمیل ہو جائے گی۔ لیکن موجودہ انتشار سے مطابع کئی دن تک حسبِ معمول کام نہ کر سکے۔ اس لیے اب توقع ہے کہ انشاء اللہ آخر دسمبر تک پروگرام کی پوری کتابیں طبع ہو جائیں گی۔ آخری چار کتابیں زیرِ طبع ہیں۔ باقی سب دفترِ صحافی میں آ چکی ہیں :-

۱۔ انتخابِ داغ تاج الشعرا داغ دہلوی کا کلام کئی جلدوں میں ہے اور مدارس کے طلبہ کے لیے اُن سب کا پڑھنا دشوار ہے۔ اس لیے ان طلبہ کی سہولت کے لیے یہ انتخاب کیا گیا ہے جس میں شاعر کے کلام کی رُوح نکال کر رکھ دی ہے اور وہ تمام اشعار چن لیے گئے ہیں جن میں کوئی خاص خوبی، جدت یا لطفِ بیان موجود ہے۔ انجمن کے امتحانات کے نصاب میں بھی یہ انتخاب شامل ہے۔ قیمت مجلد ع۱۲/ بلا جلد عہ۱۲/۔

۲ و ۳۔ سلسلۂ تعلیم بالغاں اوّل و دوم تعلیم بالغاں کے سلسلے کی کتابیں بہت ہی کم یاب ہیں اور ماہرینِ تعلیم کی متفقہ رائے ہے کہ جب تک اس تحریک کو تیزی سے آگے نہ بڑھایا جائے گا اس وقت تک ہندستان کی تعلیمی کم مایگی رفع نہ ہوگی اور صرف بچّوں کی تعلیم پر اکتفا کرنے سے ملک کو تعلیم یافتہ بنانے میں مدّتِ دراز لگ جائے گی۔ اس بنا پر انجمن نے دہلی کے مشہور اہلِ قلم اشرف صبوحی صاحب کی نگرانی میں یہ سلسلۂ کتب تیار کرایا ہے۔ جس کے چار حصّے مرتب ہو چکے ہیں جو بہ تدریج شائع کیے جائیں گے۔ قیمت حصّۂ اوّل مجلد عگ/ بلا جلد عہ/۔ حصّہ دوم مجلد عگ/ بلا جلد عہ/

۴۔ دیوانِ فائز شمالی ہند میں اُردو کا سب سے پہلا صاحبِ دیوان شاعر فائز دہلوی کا کلام جو وَلی دکنی کا ہم عصر تھا

آج تک مرہونِ اشاعت نہیں ہوا تھا اور اس کے دو ایک قلمی نسخے جو کہیں محفوظ تھے وہ آیندہ نسلوں میں فراموش ہو جاتے۔ سید مسعود حسن صاحب رضوی نے نادر قلمی نسخے سے ان کا دیوان مرتب کیا ہی جو پہلی مرتبہ انجمن سے شائع ہو رہا ہی۔ فائز عہدِ اورنگ زیب سے عہدِ محمد شاہ تک زندہ رہے اور اُن کے اس دیوان سے اندازہ ہوگا کہ اس وقت اُردو زبان ترقی کے کس درجے تک پہنچ چکی تھی۔ لسانی مسائل کے محققین اور عام طلبہ کے لیے یہ نادر موقعہ ہی۔

قیمت مجلد ۳ بلا جلد ۲؎

۵۔ مشاہیر یونان و روما (جلد چہارم)

پلوٹارک کی شہرۂ آفاق اور مقبولِ عام کتاب کا اُردو ترجمہ مترجمہ مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی جس کی تین جلدیں اس کے پیش تر شائع ہو چکی تھیں۔ چوتھی جلد شائع کردی گئی ہی۔ قیمت مجلد ۵؎ بلا جلد للعہ۔

۶۔ نباتی دباغت

گوالیار کے ماہر و مشہور دباغ سید امداد علی صاحب کی ایک کتاب "معدنی دباغت" کے نام سے اس سے پیش تر انجمن نے شائع کی تھی۔ 'نباتی دباغت' اسی سلسلے کی دوسری کتاب ہو جس میں نباتی اجزا سے چمڑے کو پختہ کرنے اور رنگنے کے اصول بیان کیے گئے ہیں اور ایسے انداز میں کہ فن کا نہ جاننے والا بھی کتاب پڑھ کر اس فن کو حاصل کر سکتا ہی۔ اُردو زبان میں کارآمد فنی لٹریچر مہیا کرنے کے سلسلے میں اس کتاب کی اشاعت بھی بہت بڑی ادبی خدمت ہی۔ بے شمار تصاویر سے مزین ہی۔

۷۔ سراج الدولہ

بنگال کا آخری خود مختار تاج دار سراج الدولہ گو آج تک بنگال کی روایات اور گیتوں میں وقعت اور عزت ہی نہیں بلکہ والہانہ عشق کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہی مگر انگریزی تاریخوں میں اس کی تصویرکشی بالکل ہی غلط اور خلافِ واقعہ کی گئی ہی۔ اور اس کے سیاسی اسباب ظاہر ہیں۔ مرحوم محمد عمر (نورالٰہی) نے اس کتاب میں نہایت محنت و کاوش سے فارسی، انگریزی ماخذوں کی چھان بین کرکے یہ تاریخ مرتب کی ہی جو استناد کے ساتھ پہلی مرتبہ انجمن سے شائع کی جا رہی ہی۔ ہندستان کی تاریخ اگر از سرِ نو مرتب کرنی ہی تو یہ کتاب اُس کے لیے بہت معین ہوگی۔ قیمت مجلد للعہ بلا جلد ۲؎

۸۔ قواے طبیعہ

طبِ یونانی کے مسلّم امام حکیم جالینوس کے ایک یادگار مقالے کا مستند انگریزی ترجمے سے اُردو میں ترجمہ فاضل مترجم جناب صادق حسین صاحب ایم۔بی۔بی۔ایس نے نہایت شستہ زبان میں کیا ہی۔ کتاب میں بتایا گیا ہی کہ قدرت نے طبیعت میں جو قوت رافعت رکھی ہی وہ جسم پر کیا اثر کرتی ہی۔ طبیعات پر جامع و مستند کتاب ہی۔ قیمت مجلد ۳ بلا جلد ۲؎

۹- الف لیلہ ولیلہ (جلد ہفتم)

عربی کے شہرۂ آفاق افسانے کے ترجمے کی ساتویں اور آخری جلد مترجمہ ڈاکٹر منصور احمد صاحب مرحوم، اُستاد مُسلم یونی ورسٹی، یہ کتاب اس قدر مشہور و مقبول ہی کہ مزید تعارف کی ضرورت نہیں صرف یہ کہنا کافی ہی کہ اس کے اور ترجمے جو بازار میں ملتے ہیں انگریزی سے کیے گئے ہیں اور انجمن نے بہ راہِ راست عربی سے ترجمہ کرایا ہی۔

قیمت مجلد للعہ بلا جلد سہہ۔

۱۰- اَدَبُ الجاہلی

زمانۂ جاہلیت میں ادب کا رجحان کیا تھا اور ذہنی سرگرمیوں کی رفتار کیسی تھی۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا ایک نادر اجتہادی مقالہ جسے نہایت احتیاط سے اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہی۔ عربی ادبیات کے ہر محقق اور طالب علم کے پڑھنے کے لائق کتاب ہی۔ اُزدو ادب میں اس بحث پر ایسی جامع اور پُر از معلومات کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی ہی۔ قیمت مجلد معہ، بلا جلد ستے،

۱۱- جدید معلوماتِ سائنس

یہ کتاب جس میں سائنس کے ضروری اور اہم مسائل نہایت سلیس زبان میں بیان کیے گئے ہیں مسٹر آفتاب حسن صاحب بی۔ ایس سی (لندن) انسپکٹر مدارس سائنس حیدرآباد دکن کی تالیف ہی اور کئی جلدوں میں ختم ہوگی۔ سالِ حال کے پروگرام میں اس کی پہلی جلد کی اشاعت شامل ہی۔

معاشیات

جلد ۱ — دسمبر ۱۹۴۶ء — نمبر ۱۲

فہرست مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱ ۔	قومی اور بین اقوامی غذائی صورتِ حال	ایڈیٹر	۲
۲ ۔	ہندستان میں کیمیائی صنعت	"	۴
۳ ۔	فریڈرک لسٹ کی صدسالہ برسی	پروفیسر عطاء اللہ علی گڑھ یونی ورسٹی	۹
۴ ۔	برطانوی معیشت ۔ جنگ کے بعد	مارگرٹ ہمن من	۱۲
۵ ۔	چالیس کروڑ عوام کے معاشی مسائل	ہنڈرل مون	۲۱
۶ ۔	سب کے لیے غذا	پروفیسر آر ۔ وی ۔ راؤ ، ام ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی	۲۳
۷ ۔	ہندستان میں نئی کپڑے کی ملیں	ادارہ	۳۸
۸ ۔	جنگ اور سرمایہ داری	مورس ڈوب	۳۹
۹ ۔	معاشی صورتِ حال	ادارہ	۴۲
۱۰ ۔	تبصرے	"	۴۷

اداریہ :-

قومی اور بین اقوامی غذائی صورتِ حال

ایڈیٹر

تمام حالات بتا رہے ہیں کہ اب ہندستان میں غذا کے لحاظ سے صورتِ حال اِتنی نازک نہیں رہی جتنی پہلے تھی۔ مرکزی حکومت میں تبدیلی کے بعد سے حکومت کی غذائی کوششوں میں ایک نئی جان اور ایک نئی بیداری آگئی ہے جس کی بدولت ہمارے دِلوں پر اب پہلے کی طرح خوف اور فکر طاری نہیں رہا۔ وزیرِ غذا نے اناج کی سپلائی کے سلسلے میں مختلف سمتوں میں اپنے تعلقات اور رابطے بڑھائے جس سے قلت کا خطرہ دور ہوا۔ اس سلسلے میں صوبوں کا دورہ بھی کافی مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ صوبوں نے وقت سے پہلے ہی اپنے اپنے کوٹے کا تھوڑا سا حصہ مرکز میں بھیجنے کا وعدہ کیا۔ مرکزی اسمبلی میں وزیرِ غذا نے حال اور مستقبل کا ایک واضح نقشہ ہمارے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی جس سے قحط اور شدید قلت کا خوف دور ہوا۔ لیکن وزیرِ غذا نے یہ بات بھی صاف کر دی کہ اگرچہ صورتِ حال پہلی جیسی نازک نہیں ہے لیکن کچھ نہ کچھ قلت کا سامنا ابھی ضرور ہے۔ بہر حال دوسری فصل تک ملک کسی طرح اپنا کام چلالے گا۔ لیکن وزیرِ غذا نے اس کی خاص وجہ یہ بتائی ہے کہ ہندستان میں لوگ اب کم غذا کھا کر کسی طرح زندہ رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ پورے ملک... کی قلت کا مقابلہ کرنے میں پنجاب، اُڑیسہ اور وسطی صوبہ خاص طور پر آگے آگے رہا ہے۔ ان صوبوں نے جو غلّہ قلت کے صوبوں کے لیے بھیجا وہ موعودہ مقدار سے زیادہ تھا۔ وزیرِ غذا نے بتایا کہ غذائی قلت کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت نے تین طریقوں پر عمل کیا ہے۔ ایک تو دوسرے ملکوں سے غلّہ درآمد کرنا، دوسرے اجارہ دارانہ طریقے سے ملک کے اندر غلّے کی وصولی اور کنٹرول کے ذریعے اُس کی تقسیم اور تیسرے غلّے اور غذائی اشیا کی پیدائش کو

بڑھانا۔ غلّے کی وصولی کے سلسلے میں حکومت کی کوششیں سو فی صدی کامیاب رہی ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جہاں باہر سے صرف ۷ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن غلّہ درآمد کیا جا سکا وہاں خود اندرون ملک سے ۳۰ لاکھ ٹن غلّہ وصول ہوا۔ غلّے کی مناسب تقسیم کا کام بھی اچھی طرح انجام پایا چنانچہ ۱۹۴۶ء میں ۱۵ کروڑ آدمیوں کو راشن سے اناج دیا گیا۔ جہاں تک غذائی پیداوار کو بڑھانے کا سوال ہے وزیر غذا نے بتایا کہ حکومت نے ۴۰ لاکھ ٹن مزید غلّہ پیدا کرنے کا ایک پنج سالہ پروگرام بنایا ہے۔ حکومت اس سلسلے میں جن طریقوں پر کاربند ہوگی وہ یہ ہیں:- آب پاشی کے مزید انتظامات کرنا، مصنوعی کھاد اور اچھے بیج مہیا کرنا، جہاں ممکن ہو وہاں مشین کا استعمال کرنا، صوبوں، کاشت کاروں اور مزدوروں کا تعاون حاصل کرنا وغیرہ۔

بنگال کی غذائی صورت حال کے متعلق غذائی سپلائی کے اڈیشنل کمشنر نے جو بیان دیا ہے وہ مایوسی کو دور کرنے والا ہے۔ چنانچہ نائب وزیر ہند نے دوسری دسمبر ۱۹۴۶ء کو پورے ہندوستان کا جو غذائی نقشہ کھینچا ہے اس میں بھی ہمیں امید کی جھلک نظر آتی ہے۔ چاول کی فصلیں اچھی ہوئی ہیں جس سے چاول کھانے والے علاقوں کو اس سے کوئی مدد نہیں پہنچتی۔ خطرہ اس لیے ہے کہ انھیں پنجاب اور سندھ کو وہ گیہوں واپس دینا ہے جو انھوں نے قرض کے طور پر لیا تھا۔ چنانچہ آئندہ بہار تک گیہوں کھانے والے علاقوں کو دقتیں جھیلنی پڑیں گی یا ممکن ہے غیر ملکوں سے اتنا گیہوں پہنچ جائے کہ کسی خاص دقت کا احساس نہ ہو۔

جہاں تک بین الاقوامی صورت حال کا تعلق ہے فصلوں کے بارے میں بحیثیت مجموعی اچھی رپورٹیں آئی ہیں۔ امریکہ میں مکئی کی فصل بہت شاندار ہوئی ہے اور صفت کے لحاظ سے بھی وہ اعلا درجہ کی ہے۔ گزشتہ بہار میں ارجنٹائن میں مکئی کی فصل سوکھ خراب ہو جانے کے باعث بین الاقوامی غذائی بازار پر بہت خراب اثر پڑا تھا۔ دنیا بھر میں کتنا چاول پیدا ہوگا اس سے متعلق جو اندازے لگائے گئے ہیں ان کے مطابق پیداوار میں دس فی صدی کا اضافہ ہونا چاہیے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ جن ملکوں کے متعلق اضافے کے اندازے پیش کیے گئے ہیں وہ خود اپنی غذائی ضرورتیں نہیں پوری کر سکتے اور انھیں دوسرے ملکوں سے غلّہ منگانا پڑتا ہے چنانچہ چاول کے اس اضافے سے دوسرے ملکوں کو براہ راست کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بہرحال یہ ضرور ہوگا کہ اپنی پیداوار میں اضافے کی سبب یہ ممالک عالم گیر ذخیرے سے آیندہ سال کم غلّہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح عالم گیر ذخیرے پر سے کافی بڑا بوجھ ہٹ جائے گا اور دوسرے ملکوں کو فائدہ پہنچے گا۔ آیندہ فصلوں کے متعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شعبۂ زراعت اور روائٹروں کے مالیاتی اڈیٹر کے اندازے بہت پُر امید ہیں۔ ان دونوں ذریعوں سے پتا چلتا ہے کہ اس سال اناج کی فصل خاص کر گیہوں اور مکئی کی فصل بہت اچھی ہوگی۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ سر جان بوائڈ اور نے غذائی صورت حال کے متعلق وائنا میں جو بیان دیا ہے وہ کافی مایوس کن ہے۔ موصوف کی رائے میں آیندہ موسم بہار میں دنیا پھر غذائی بحران کی گرفت میں ہوگی ممکن ہے سر جان کا اشارہ اس حقیقت کی طرف ہو کہ فصلوں کے اچھے ہونے کے باوجود اگر دنیا کے ملکوں کے درمیان معاشی تعاون اور اشتراک عمل نہیں رہا

تو یورپ کے جنگ زدہ ملکوں کو سخت غذائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔اس خیال کا پس منظر دراصل سویت یونین اور امریکہ کی موجودہ کشیدگی ہو۔ انرا سے امداد پانے والے ملکوں کی معاشی بحالی کے بارے میں جو رپوٹ مجلس اقوام متحدہ کے سامنے پیش کی گئی ہو اس سے پتا چلتا ہو کہ وہ ممالک اب بھی باہری امداد کے محتاج ہیں اور غذائی لحاظ سے اپنے پانو پر نہیں کھڑے ہوسکتے۔ چین، اٹلی، یونان، یوگوسلاویہ، آسٹریا، البانیہ، پولینڈ، زیکوسلاویکیہ کا شمار انھیں ملکوں میں ہو۔ یہاں زرعی پیداوار ابھی دوبارہ بحال نہیں ہوسکی ہو۔ پھر ان ملکوں کے پاس نہ تو غیر ملکی سکّہ ہو اور نہ فالتو مال جس سے دوسرے ملکوں سے خاص کر امریکہ سے غلّہ منگوا سکیں۔ جنگ کے بعد کی پہلی فصل ان ملکوں میں خراب آئی ہو۔ ایسے نازک موقع پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا یہ فیصلہ ان ملکوں کے لیے اور بھی مایوس کن ہو کہ آیندہ سال سے امریکی حکومت غیر ملکی حکومتوں کے لیے غلّے کی خریداری بند کر دے گی۔ اس کا مطلب یہ ہو کہ اوپر جن ملکوں کا تذکرہ آیا ہو وہ غیر ملکی سکّے یا فالتو مال کے بغیر امریکہ سے غلّہ نہیں حاصل کر سکیں گے۔ امریکہ کا یہ فیصلہ دو باتوں کا نتیجہ ہو ایک تو امریکہ میں کنٹرول کا اُٹھ جانا اور دوسری یہ بات کہ امریکہ کو جرمنی کے اُس علاقے میں پہلے ہی سے کافی غلّہ بھیجنا پڑتا ہو جو اُس کے فوجی قبضے میں ہو۔ گزشتہ انتخابات میں ری پبلکن پارٹی کی فتح نے امریکی صدر کے اُن خصوصی اختیارات کے لیے خطرہ پیدا کر دیا ہو جو زمانۂ جنگ کے لیے عطا کیے گئے تھے اور جن کو کام میں لاکر امریکی صدر اپنے غذائی وعدے پورے کر سکتا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو اس وقت ضروری ہو کہ فالتو غلّے والے ملک خاص کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ جنگ زدہ ملکوں کو غذائی امداد دینے کا سلسلہ منقطع نہ کرے چاہے وہ تبادلے کے ذریعے ہو یا قرضے پٹّے کے ذریعے یا امداد کے طور پر۔ امریکہ کا فرض ہو کہ وہ یورپ کے ملکوں کی غذائی مشکلات کو اپنی سامراجی چال بازیوں کے لیے نہ استعمال کرے۔

ہندستان میں کیمیائی صنعت :-

ہندستان کے کیمیائی صنعت گروں کی انجمن میں صدارتی تقریر کرتے ہوے ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید نے اس ملک میں کیمیائی صنعت کے ماضی، حال اور مستقبل پر روشنی ڈالی جو دلچسپی سے خالی نہیں ہو۔ تقریر سے جو باتیں واضح ہوئیں وہ مختصر طور پر یہ ہیں :-

جنگ نے ہندستان کو کئی قسم کی کیمیائی اشیا تیار کرنے کا موقع عطا کیا اور جو صنعتیں جنگ سے پہلے اس ملک میں نہیں تھیں وہ وجود میں آئیں۔ گندک کا ترشہ بنانے کی صنعت نے کافی آگے قدم بڑھایا، جنگ سے پہلے اس کی پیداوار کی مقدار ۰ ہزار ٹن سالانہ تھی اور اب ایک لاکھ ٹن ہو۔ امریکہ میں اس کی سالانہ پیداوار بہت زیادہ ہی یعنی ۹۰ لاکھ ٹن اور انگلستان، آئرلینڈ اور

اسکاٹ لینڈ میں مجموعی طور پر ۱۵ لاکھ ٹن - چوں کہ گندھک کا تزشہ کیمیائی اشیاء میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس کی پیدائش کے اخراجات زیادہ نہیں ہونے چاہئیں، چناں چہ اس صنعت کے اخراجات کا بار کم کرنے کے لیے حکومت کو چاہیے کہ گندھک کی درآمد کے لیے امدادی رقم عطا کرے، جیسے انگلستان میں ہوتا ہے۔ جب کچا مال یعنی گندھک کی قیمت کم ہو جائے گی تو یہ صنعت ترقی کرے گی۔ بہت سی بنیادی اہمیت کی اشیاء ہندستان میں بہت کم مقدار میں پیدا کی جاتی ہیں مثلاً کلورو سلفینک ایسڈ، ایسے ٹک ایسڈ سوڈیم، میگنیشیم اور فاسفورس۔ ہندستان میں راب کی کمی نہیں پھر بھی یہاں تخمیری صنعت کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ جہاں تک دوائیاتی صنعت کا تعلق ہے ہندستان کے پاس کافی سے زیادہ ذرائع اور وسائل موجود ہیں اور یہ ملک اس خاص سلسلے میں خود کفیل ہو سکتا ہے لیکن چوں کہ کیمیائی صنعت کے راستے میں بہت ہی رکاوٹیں ہیں اس لیے دوائیاتی صنعت بھی آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ ہندستان میں کچے مال کی اتنی بہتات ہے کہ وہ ساری دنیا کو قلیا سا مہیا کر سکتا ہے لیکن اس مخصوص صنعت کے راستے میں دو بڑی رکاوٹیں حائل ہیں ایک تو یہ کہ بنیادی اہمیت کے کچے مال پر پابندیاں عائد ہیں اور دوسرے دوسرے ملکوں سے بنی بنائی اشیا اتنی مقدار میں آ رہی ہیں کہ ہمارے ملک کی صنعت اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جہاں تک کونین کا تعلق ہے ملک میں اس کی قلت کے باوجود حکومت اس کی درآمد پر سے پابندیاں نہیں اٹھا رہی ہے۔

کیمیائی صنعت گروں کی انجمن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ۵ کروڑ روپے کے سرمائے سے ایک کل ہند کیمیائی صنعت کا قیام عمل میں لایا جائے جس میں ایسی کیمیائی اشیا تیار کی جائیں جو انفرادی اور ذاتی سرمائے کے بل پر نہیں تیار کی جا سکتیں۔ کیمیائی صنعت پر اس وقت کئی پابندیاں اور رکاوٹیں ہیں جن کا دور ہونا ضروری ہے اور حکومت کو اس طرف جلد از جلد توجہ کرنی چاہیے۔ ان رکاوٹوں کا تعلق نقل و حمل، محصولات، درآمدی تجارتی پابندیاں اور اکسائز کے قوانین سے ہے

* * *

فریڈرک لسٹ کی صدسالہ برسی

از ـــــــــــ پروفیسر عطاء اللہ ۔ علی گڑھ یونی ورسٹی

فریڈرک لسٹ ۱۷۸۹ء میں رٹلنجن میں پیدا ہوا۔ میراث پدر خواہی علمِ پدر آموز کے اصول پر لسٹ کو جس کے گل ریزہ قلم کے لیے تاریخ معاشیات وسیاسیات کے کتنے ہی ابواب کی رنگینی وگل کاری مقدر ہو چکی تھی چودہ برس کی عمر میں چمڑا کمانے اور رنگنے کی تعلیم دی جانے لگی۔ ہرن پر لادی جاتی ہو کہیں گھاس؟ لسٹ ایسے علم دوست اور صاحب ذوقِ جمیل کو اس چمرنگی وچماری میں کیا لطف آتا۔ لسٹ جلد ہی بھاگ نکلا۔ لسٹ کو کچھ عرصہ نجی طور پر تحصیلِ علم میں مصروف رہنے کے بعد سترہ برس کی عمر میں ایک سرکاری دفتر میں کلرکی میسر آگئی۔ اپنی قابلیت۔ محنت اور فرض شناسی کی بدولت لسٹ نے پے بہ پے کئی ترقیاں حاصل کیں۔ تحصیلِ علم کی شوق کی تسکین کا سامان میسر آیا تو وہ ٹوبنجن یونی ورسٹی میں داخلِ درس ہو گیا۔ لسٹ کا ذاتی مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ اُس نے مشاہیر مصنفین مثل سمتھ ئے ۔ رؤسو اور مانٹیسکو کے دفتر کھنگال ڈالے تھے۔ لیکن بیس برس کی عمر ہی میں اُس کا فکر وعمل اُسے دوسروں سے ممتاز کر رہا تھا۔ وہ لکیر کا فقیر نہ تھا۔ اُس کے نظریات کا محور قیاساتِ گزشتہ نہیں مشاہداتِ حالیہ اور واقعاتِ حاضرہ تھے۔ لسٹ نے ۱۸۱۶ء میں "ہمدردِ عوام" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا اور جرمنی کی صنعت وتجارت کے فروغ کے لیے صناعوں اور تاجروں کی ایک انجمن قائم کی اور خود اُس کی روحِ رواں بن گیا۔ ۱۸۱۷ء میں ٹوبنجن یونی ورسٹی میں سیاسیات کی پروفیسری پر لسٹ کا تقرر ہو گیا۔ لسٹ کو زمانۂ ملازمت میں نظم ونسق حکومت کا کچھ تجربہ ہو گیا تھا وہ حکومت کو ایک فن سمجھتا تھا لیکن اپنے زمانے کے قانون سازوں کو حسنِ تخیل اور عملی قابلیت سے معرا جانتا تھا۔

لسٹ کی یہ رائے کہ معاشیین کو نظم و نسقِ حکومت سے گہری عملی وابستگی ہونی چاہیے امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ محکم و مسلم ہوتی چلی جا رہی ہے۔

لسٹ نے ورٹمبرگ کی حکومت کو پارلیمنٹ کے رجعت پسندوں کے ساتھ اتحاد پر ملامت کی۔ سول سروس والوں کو خوب لتاڑا۔ اور ملوکیت مقیدہ کی حمایت کی۔ اُس زمانے کی حکومت بھلا اُن شوخیوں اور روشن خیالیوں کی کیوں کر تاب لا سکتی تھی لسٹ کو پروفیسری سے سبک دوش ہونا پڑا۔

لسٹ ۱۸۲۰ء میں ورٹمبرگ کی پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا لیکن اُس کی روشنی طبع یہاں بھی رنگ لائے بغیر نہ رہی۔ لسٹ ایک ایسے انقلاب کا علم بردار تھا جس کے لیے اُس کا ملک تیار نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ محصول رہ گیری معاف ہو جائے۔ وہ یکی منسوخ ہو۔ محصولاتِ ملکی ہٹا دیے جائیں۔ زمین پر سے جاگیری بار اُڑا دیے جائیں۔ مقدمات کی سماعت جیوری کے ذریعے ہوا کرے۔ وہ سول سروس کے خلاف تھا اور مصارفِ حکومت کے لیے تنہا انکم ٹیکس کے اجرا کا حامی تھا۔ ورٹمبرگ کی حکومت نے لسٹ کو الزامِ بغاوت میں دھر لیا اور دس ماہ کی قیدِ بامشقت کے اعلان کے ساتھ لسٹ اسپیرگ کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ لسٹ کو جس کے بہار آفریں قلم اور اصابت فکر و روشن ضمیری نے جہانِ سیاست و معیشت کے لیے ایک سدا بہار چمنستان مہیا کر دیا ہے زمانہ قید میں نقل نویسی کا کام دیا گیا۔ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔ لسٹ آج تحسین و ستائش کا سزاوار ہے اور اُس پر عتاب کرنے والے مستوجب نفریں۔

سفرِ امریکہ

ورٹمبرگ کی حکومت لسٹ کے ایک دوست کے اصرار پر اُسے اس شرط پر رہا کرنے کے لیے رضامند ہوئی کہ وہ جرمنی سے چلا جائے۔ لسٹ نے اپنی جلا وطنی کے لیے امریکہ کو پسند کیا۔ لسٹ اپریل میں روانہ ہوا اور جون میں نیویارک پہنچا وہاں اس نے ملک بھر کا دورہ کیا اور بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات کی۔ وہ چاہتا تھا کہ رابرٹ اووِن کی نئی آبادی میں جو امدادِ باہمی کے اصول پر قائم کی گئی تھی رہایش اختیار کرے لیکن یہاں بھی وطن کی محبت غالب آئی اور جرمن آبادکاروں کے درمیان ہرلیس برگ میں کاشت کاری میں مشغول ہو گیا لیکن لسٹ سے اہلِ قلم کے لیے ہل کی ہتھی میں کوئی دلچسپی نہ تھی وہ جلد کرسیِ ادارت پر متمکن ہوا۔ مجلسِ تامینِ صنائع نے لسٹ کی خدمات حاصل کر لیں اور امریکہ کا پریس تامین کی تائید میں لسٹ کی پرجوش مہم کے لیے وقف ہو گیا۔ اُس کی خطابت نے بڑے بڑے اجتماعات کو مسخر کر لیا۔ لسٹ کی آرا و دلائل کو امریکہ کے [illegible] کانگریس میں بہ طور سند پیش کیا گیا۔ اس کی تحریرات و مقالات کو بعد میں "مبادیاتِ معاشیاتِ امریکہ" کے نام سے [illegible]۔

اور ہم نامین کی کامیابی کی خوشی میں اہل امریکہ نے لسٹ کے اعزاز میں ایک دعوت منعقد کی۔

امریکہ میں لسٹ کے خیالات پر ہملٹن اور ریمنڈ کے خیالات کا اثر پڑا۔ امریکہ کی معاشی حالت اور تدبیر ترقی لسٹ کے نظریات سے مطابقت رکھتی تھی۔ لسٹ کہتا تھا کہ امریکہ کی معاشی زندگی بہترین اور مستند ترین کتاب معاشیات ہے اس کا مطالعہ ہمارے کامل احترام وانہماک کا سزاوار ہے۔ یہاں صدیوں کی منزلیں سالوں میں طے ہو رہی ہیں۔ یہاں دیکھتے دیکھتے بنجر شاداب اور ویرانے آباد و معمور ہو رہے ہیں۔ یہاں زراعت وصنعت کی منزلوں کی تفاوت پوری شدت سے نظر آرہی ہے اور ایک جذبۂ بغاوت پیدا کرتی ہے۔

لسٹ کے مکان کے قریب ایک کوئلے کی کان دریافت ہوئی اور لسٹ کی خواہش پر اُس کان کو ریل کے ذریعے ایک مشہور شہر سے ملا دیا گیا۔ ریل کو جاری ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا اور لسٹ معاشی ترقی اور ملکی سیاسی اتحاد میں ریل کے نظام کی اہمیت کو بھانپ گیا تھا اور چاہتا تھا کہ جرمنی واپس پہنچ کر ریل کے نظام کی ترویج و توسیع کو جرمن اتحادِ معاشی و سیاسی کی بنا قرار دے۔

وطن کو واپسی

امریکہ میں سات برس قیام کے بعد ۱۸۳۲ء میں لسٹ کو حکومتِ امریکہ نے اپنا سفیر بنا کر لیپزگ بھیجا۔ جرمنی واپس پہنچتے ہی لسٹ نے جرمن ریلوے کے حق میں بے پناہ پروپگنڈا شروع کر دیا اور اُس کے خاطر خواہ نتائج مترتب ہوئے جرمن ریلوے کی تمام تر تکمیل بعد میں اُسی ترتیب سے عمل میں آئی جو لسٹ نے تیار کی تھی۔

شہرۂ آفاق تصنیف

لسٹ اپنی شہرۂ آفاق اور لازوال کتاب تین جلدوں میں مکمل کرنا چاہتا تھا لیکن کارکنانِ قضا و قدر نے اُسے ۱۸۴۱ء میں 'قومی نظام معاشیات' کی صرف جلدِ اول کی اشاعت کی توفیق مرحمت فرمائی۔ اس کتاب کا موضوع بین اقوامی تجارت حکومت کے وظائف، تجارتی کروڑگیری اور جرمنی کا اتحاد ہے۔ ایڈم سمتھ نے اپنی کتاب کا نام 'دولت اقوام' رکھا تھا لسٹ نے اقوام کو چھوڑ کر صرف ملکی و قومی دولت پر خامہ فرسائی کی۔ دونوں کتابوں کے نام کی تفاوت ہی اُن کے مختلف نقطہ ہائے نظر کی وضاحت کرتی ہے۔ سمتھ اس مکتبِ خیال کا بانی سمجھا جاتا ہے جس نے معاشیات میں عالم گیریت کی تعلیم دی اور تقسیم عمل کے ذریعے دُنیا کی معاشی ترقی کو جس سے ہر قوم اور ہر فرد مستفید ہوگا تجارتِ آزاد پر منحصر سمجھا۔ لسٹ کی کتاب انہی نظریات کے خلاف ایک اعلانِ بغاوت تھا۔ لسٹ عالم گیریت کو محض ایک نصب العین ہی سمجھتا تھا۔ لسٹ کہتا تھا کہ تمام دُنیا کے

شہریوں کے ایک عالمگیر اتحاد میں مربوط کرلینا غیر قدرتی نظر آتا ہے افراد کے منافقشات کی طرح اقوام کی جنگ و جدل بھی فطرت انسانی کا ایک مظاہرہ ہے۔ لسٹ کہتا تھا کہ وہ کسی نظام وفاق عالم کی موجودگی میں جو دائمی امن عالم کا ضامن ہوسکے سمتھ اور سئے سے متفق ہوسکتا ہے لیکن یہ لوگ ایک امید موہوم پر واقعات حاضرہ سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کیوں نہیں دیکھتے کہ دُنیا میں مختلف قومیں موجود ہیں وہ ایک دوسرے سے دست و گریباں بھی ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے مال و آبرو پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے موقع کی تاک میں لگی رہتی ہیں۔ لسٹ کا خیال تھا کہ عالم گیریت اور انفرادیت کے درمیان امن و جنگ دونوں حالتوں میں قومیت ایک مضبوط اور اہم حلقہ ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی قوم کا فرد ہوتا ہے اور اس کی مادی خوش حالی بڑی حد تک اس قوم کی سیاسی قوت پر منحصر ہوتی ہے۔ قوم کا وجود دائمی ہے قوم کے افراد میں ہزاروں مفادات مشترک کی بنا پر ایک یگانگت پائی جاتی ہے۔ قوم میں زبان۔ ادب۔ تاریخ۔ قوانین۔ ادارات اور مخصوص رجحانات و ضروریات معاشی کی بنا پر ایک وحدت موجود ہوتی ہے قوم کے مستقل فائدے کی خاطر جس پر اس کے بیش تر افراد کا بیش تر فائدہ منحصر ہو افراد کے فوری مفادات جو لازماً ہمیشہ قوم کی ترقی و کامرانی کے ضامن نہیں ہوا کرتے افراد کے فائدے کو قربان کر دینا چاہیے۔ لسٹ کا فوری مقصد تجارتِ آزاد کے اصول کا قلع قمع کر دینا تھا وہ قوموں کو بتانا چاہتا تھا کہ انگلستان کی خطرناک صنعتی برتری سے کیوں کر نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

لسٹ کا خیال تھا کہ قومی ترقی عالم گیر تجارت آزاد کے لیے ضروری ہے۔ انگلستان بقول لسٹ اُس منزل ترقی پر پہنچ چکا تھا جہاں تجارت آزاد سے اسے فایدہ پہنچ سکتا ہے لیکن جرمنی اور امریکہ کو تامین کی ضرورت ہے کیوں کہ انگلستان اپنی اوّلیت۔ ترقی اور کثرتِ پیداوار کی بنا پر ان سے کوسوں آگے نکل چکا ہے۔

لسٹ کی مخصوص تعلیمات

جرمنی متعدد ریاستوں میں بٹا ہوا تھا ان ریاستوں کے اندر ایک دوسرے کے خلاف قسم قسم کے محصولات صنعت و تجارت کو برباد کر رہے تھے دوسرے ملکوں کے خلاف کوئی محصول رائج نہ تھا۔ ملک میں کوئی مرکزی سیاسی قوت موجود نہ تھی۔ لسٹ چاہتا تھا کہ جرمنی کے اندر مختلف ریاستوں کے درمیان کروڑ گیری کا حصار برباد کر کے جرمنی کو ایک ملک قرار دیا جائے اور پھر اُسے غیر ملکوں کے خلاف ایک حصار محصولات سے محفوظ کرلیا جائے۔ لسٹ نے مختلف ریاستوں کو محضرنامے بھیجے عرضیاں لکھیں مقالات شائع کیے اخبارات میں مہم جاری کی۔ تاجروں اور صناعوں کی انجمنیں قائم کیں اور اس سرگرمی اور انہماک سے کام کیا کہ ۱۸۳۴ء میں صدیوں کی معاشی زنجیریں ٹوٹ کر گر پڑیں۔ جرمنی کے بین الریاستی معاشی محصولات ختم

ہو گئے اور تمام ملک ایک حلقہ اتحاد معاشی میں مربوط ہو گیا۔

لسٹ کا خیال تھا کہ قومیں مختلف منازلِ معاشی طے کر کے صنعتی و تجارتی منزل تک پہنچتی ہیں اور صنعتی منزل ہی تہذیب کا نام ہے۔ صنعت کی ترقی کے بغیر قوموں پر عہدِ بربریت مُسلط رہتا ہے۔ ہر ملک میں صنعت و زراعت اور ذرائع حمل و نقل میں متوازن ترقی ہونی چاہیے۔ جس مُلک میں یہ تینوں قوتیں ایک رہنما سیاسی قوت کے ہاتھ میں ہوں وہاں دائمی امن و عافیت کا دَور دَورہ رہ سکتا ہے۔ تقسیمِ عمل کے افادے سے لسٹ مُنکر نہ تھا لیکن اس کے عملی خطرات کو بہ خوبی محسوس کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر تقسیمِ عمل بین الاقوامی پیمانے پر اختیار کی جائے تو پیدائشِ دولت میں منافی ربط پیدا ہو جائے گا۔ اور زمانہ جنگ میں عالم گیر تقسیمِ عمل ناممکن بن کر اقوامِ عالم کو مصیبت میں گرفتار کر دے گی لہٰذا لسٹ کا خیال تھا کسی بھی ملک کو اپنے ذرائع آمد و رفت اور مصنوعات میں دُوسروں کا دست نگر نہ ہونا چاہیے۔

لسٹ کا سب سے بڑا قیاسی کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ملکوں کی صلاحیت پیدایشِ دولت کی پرورش و تربیت کو خود دولت پر ترجیح دی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ یہ ٹھیک نہیں کہ قوموں کی دولت کی بنا صرف محنت ہے کتنی ہی قومیں خون پسینہ ایک کر کے بھی پیٹ بھر روٹی نہ کما سکیں گی۔ اصل چیز مادّی دولت نہیں اس دولت کے پیدا کرنے کے ذرائع کا حصول ہے اس لیے ہر قوم کو قربانی کرنی چاہیے اور اپنی دولت کو حصول ثقافت و فنون اور متعلقہ پیدایشِ دولت کی صلاحیت حاصل کرنے کے لیے خرچ کرنے میں دریغ نہ کرنا چاہیے۔

لسٹ کا خیال تھا اور آج کون اس خیال سے متفق نہ ہوگا کہ کسی قوم کی قوت پیدایشِ دولت میں اُس کے سیاسی ادارات۔ مذہب اخلاق۔ آزادیٔ خیال۔ آزادیٔ ضمیر۔ آزادیٔ تحریر و تقریر۔ معدلت گستری۔ نظم و نسق حکومت اور نیابتی طرزِ حکومت کو بہت کچھ عمل دخل حاصل ہے۔ ان چیزوں کو وہ قوموں کا غیر مادّی سرمایہ اور معاشی ترقی کی اساس گردانتا تھا۔

لسٹ کا قد چھوٹا بدن گٹھا ہوا۔ سر قد کے تناسب سے بہت بڑا۔ بڑی بڑی چمک دار آنکھیں۔ مزاج میں تُندی۔ طبیعت میں خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور اسی خلوص کی بنا پر اُسے ہمیشہ اپنی کامیابی کا یقین ہوتا تھا۔ اُس کی خطابت سحر آفریں اور اس کا سوزِ یقیں مخالفت کے فولاد کو موم کر دیتا تھا۔ اُس نے انگلستان کا سفر بھی کیا تھا اور انگلستان کے قوانین غلہ کی تنسیخ کے وقت وہ دارالعوام میں موجود تھا۔ کابڈن سے جو اُس کے تامینی نظریات کا دشمن تھا اس کے مراسم دوستانہ تھے۔

لسٹ کو دنیا ہمیشہ جرمنی کی معاشی و سیاسی عظمت کا بانی سمجھے گی اور تاریخ معاشیات میں اس کا نام روز افزوں اور غیر فانی احترام کا سزاوار رہے گا۔

انجام

لسٹ کا انجام نہایت اندوہ ناک ہوا۔ اُس کی صحت مسلسل خراب رہنے لگی۔ وہ اکثر پژمردہ و غمگین نظر آنے لگا۔ اور

رفتہ رفتہ صحت یابی سے قطعاً مایوس ہوگیا۔ تیس نومبر سنہ ۱۸۴۶ء کو آج سے پوری ایک صدی پہلے جرمنی کا بیٹا [illegible]
کا نام دُنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور جسے دُنیا ہمیشہ خراجِ تحسین و آفریں پیش کرتی رہے گی کشمکش سے باہر نکلا اور اپنی ہی گولی سے
اپنا کام تمام کرلیا۔ اب جرمنی کو معلوم ہوا کہ لسٹ کتنی متاعِ گراں بہا تھا۔ اُس کے خاندان کے لیے چندہ جمع ہوا۔ جرمنی اور
آسٹریا نے اس کی مشترک یادگار قائم کی۔

جرمنی آج اُفتادہ و درماندہ ہی امید نہیں کہ اُس کا ذہن لسٹ کی صدسالہ برسی کی طرف منتقل بھی ہوسکے لیکن اسے القا و
کرامت ہی سمجھنا چاہیے کہ لسٹ کی صدسالہ برسی پر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب امیر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے لسٹ کی کتاب کا
ترجمہ 'معاشیاتِ قومی' کے نام سے ۱۹۴۶ء میں شائع فرما کر لسٹ کو مشرق کے اہلِ علم کی طرف سے خراجِ تحسین و ستایش پیش
کیا ہی۔ یقیناً یہ لسٹ کی کرامت ہو اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے دل پر ستایش کی اس مستقل نوعیت کا یقیناً القا ہی ہوا ہی۔
لسٹ دُنیائے علم و فکر کی ایک متاعِ گراں بہا ہو جس کی یاد سے نوعِ انسان ہمیشہ مسرت و سود مندی حاصل کرتی رہے گی۔

مسائلِ حاضرہ (غیر ممالک) :-

برطانوی معیشت۔ جنگ کے بعد

از ———— مارگٹ ہین مین

گزشتہ جنگ نے عالم گیر معیشت کے تار و پود بکھیر دیے ہیں۔ اب اُس کی از سرِ نو تعمیر و تنظیم کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ اسی پس منظر میں ہمیں اُن اغراض و مقاصد کے لیے جد و جہد کرنی ہے جن کا ۱۹۴۵ء کے برطانوی انتخابات میں لیبر پارٹی کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا۔ یہاں پر میں ناظرین کی توجہ مشہورِ عالم ماہرِ معاشیات الی ورگا کے لکھے ہوئے ایک مضمون[1] کی طرف دلانا چاہتا ہوں جس میں اُس نے جنگ کے بعد کی عالم گیر معیشت کے بارے میں خاص خاص اندازے لگائے تھے۔ اُس نے بتایا تھا کہ امریکہ کی قوتِ پیدائش بہت بڑھ گئی ہے اور چوں کہ وہاں کی معیشت میں کسی منصوبے کی پابندی نہیں کی جاتی اس لیے پیداوار بہت زیادہ اور غیر منظم ہوگی۔ جنگ سے پہلے کے مقابلے میں وہاں ستر فی صدی مزید پیداوار ہوگی۔ مختصر ہی عرصے میں زیادتیٔ پیداوار کا بُحران رونما ہوگا۔ اس کے برخلاف یورپ میں پیداوار کی کمی کی وجہ سے نازک صورتِ حال پیدا ہوگی۔ اس لیے کہ وہاں جنگ کے زمانے میں پلینٹ مشینیں اور کلیں اور پیدائش کے بہت سے ذرائع اور وسائل تباہ و برباد ہوگئے ہیں۔ چناں چہ یورپ میں اشیا کی پیداوار کی رفتار بہت سُست ہوگی۔ اس طرح یورپ میں بے روزگاری اور افراطِ زر کا دور دورہ ہوگا۔ اسی معاشی پس منظر میں ہمیں برطانیہ کی موجودہ معاشی صورتِ حال کا مطالعہ کرنا ہے۔

جنگ نے برطانیہ کی معاشی حیثیت کو بدل ڈالا ہے۔ یہ بات خاص طور پر اہم ہے کہ برطانوی سرمایہ داروں نے اپنے سمندر پار کے

---

[1] یہ مضمون معاشیات کے مارچ ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں چھپ چکا ہے۔

بہت سے سرمایے اور کاروبار فروخت کر دیے ہیں جس کی وجہ سے سرمایہ کاری کی آمدنی میں بیس کروڑ پونڈ سے لے کر دس کروڑ پونڈ سالانہ تک کا نقصان ہوا ہو۔ چناں چہ برطانیہ کو اب غذا اور کچے مال کی فالتو درآمد کا سہارا نہیں رہا۔ اس لیے کہ برطانیہ لندن کو پہلے کی طرح منافع اور سود کی رقم نہیں ادا کر سکتی جس کے بدلے میں غذا اور کچا مال منگایا جا سکے۔ بلکہ اب تو خود برطانیہ پر تین ارب پونڈ غیر ملکوں کا قرضہ ہو گیا ہو۔

اب تک برطانیہ کے لوگ اس زبردست فرق اور تبدیلی کو دو باتوں کی وجہ سے نہیں محسوس کر سکے ہیں۔ ایک تو قرضہ پٹہ معاہدے کی وجہ سے اور دوسرے امریکہ نے جو قرضہ دیا ہو اس کی وجہ سے، خاص خاص قسم کے کچے مال کی درآمد زیادہ نہیں گھٹی ہو۔ لیکن ابھی اس بات کی ضرورت ہو کہ زرعی پیداوار ملک میں اور زیادہ آئے اور برطانیہ کی مصنوعات کی دوسرے ملکوں میں کھپت ہو۔ ملک میں غذا اور کچے مال کی سپلائی کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے ضرورت ہو کہ لڑائی سے پہلے کے مقابلے میں پچاس سے لے کر پچھتر فی صدی تک مزید مصنوعات برطانیہ سے باہر بھیجی جائیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے صنعتوں کی مجموعی پیداوار بڑھانا چاہیے اور ساتھ ہی صنعتوں کی قوتِ پیدایش کو بھی ترقی دینا چاہیے۔ یہ تو محض اس بات کے لیے ضروری ہو کہ باہر سے کچا مال اور اناج وغیرہ آتا رہے۔ لیکن لڑائی سے پہلے کے مقابلے میں رہنے سہنے کے معیار کو اونچا کرنے کے لیے اس سے بھی زیادہ پیداوار بڑھانے کی ضرورت ہوگی۔ اگر امریکی قرضے کے سہارے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سا قیمتی وقت برباد ہو جائے گا۔ اسی درمیان میں امریکہ کا معاشی بحران رونما ہوگا جس کا اثر ساری دُنیا کی معاشی حالت پر پڑے گا۔ چناں چہ برطانیہ کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں۔ اسی چیز کو ذہن میں رکھ کر برطانیہ میں معاشی دُرستی کی رفتار کو تیز کرنا ہو اور اس کسوٹی پر اگر دیکھا جائے تو جو کچھ اس وقت برطانیہ میں ہو رہا ہو اُس کی رفتار بہت سُست ہو۔

کام کرنے والے

مئی ۱۹۴۵ء میں برطانیہ کی صنعتوں میں ایک کروڑ ۹ لاکھ سے زیادہ آدمی کام کر رہے تھے، اس کا مقابلہ ۱۹۳۹ء سے کیجیے جب کہ ایک کروڑ ۷، ۹ لاکھ آدمی صنعتی کاموں میں مصروف تھے۔ مئی ۱۹۴۵ء میں فوج کی تعداد ابھی تک جنگ سے پہلے کے مقابلے میں چار گنی زیادہ تھی۔ ۱۹۳۹ء میں ۴ لاکھ ۸۰ ہزار آدمی فوج میں تھے اور مئی ۱۹۴۵ء میں ۲۲ لاکھ ۷، ۵ ہزار۔ پھر ۸ لاکھ آدمی فوج کے لیے سامان مہیا کرنے کے کام میں لگے ہوئے تھے۔ اس طرح کام کرنے والے لوگ جن کی مجموعی تعداد کوئی دو کروڑ ہو ان میں سے ۳۰ لاکھ آدمی فوجی کام میں لگے ہوئے تھے۔

۱۹۳۹ء میں فوج میں اور صنعتوں میں ۵۰ لاکھ ۹۴ ہزار عورتیں کام کر رہی تھیں اور ۱۹۴۳ء میں اُن کی تعداد بڑھ کر ۷۷ لاکھ ۵۳ ہزار تک پہنچ گئی۔ مئی ۱۹۴۵ء میں اُن کی تعداد گھٹ کر ۷، ۵ لاکھ ۹ ہزار ہو گئی۔ گھٹنے کا سلسلہ جاری ہو اور جنگ کے زمانے میں عورت کام کرنے والیوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوا تھا اس کا ۱/۴ حصہ کم ہو گیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ کے بعد

عورت مزدوروں کی تعداد میں کچھ کمی کا واقع ہونا ایک لازمی امر تھا لیکن تنخواہ کی کمی کے باعث بھی ہزاروں عورتوں نے کام چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔

جون ۱۹۴۷ء میں برطانیہ میں بے روزگاروں کی تعداد ۳ لاکھ تھی۔ یہ بے روزگار زیادہ تر اُن علاقوں میں تھے جن کو مصیبت زدہ کہا گیا ہے۔ اِن علاقوں کی مزدور تحریکوں میں بے چینی بہت زیادہ بڑھ رہی ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت صنعتوں کے دوبارہ اجرا کے مسئلے پر پوری توجہ نہیں صرف کر رہی ہے۔

اشیائے صرف کی کمی

جنگ سے پہلے کی معمولی پیداوار کے مقابلے میں بھی عام شہری استعمال کی اشیا کم پیدا ہو رہی ہیں اور برطانیہ کے بازاروں کے لیے کافی اشیا دست یاب نہیں ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ برآمدی مال کی پیدائش اور برآمدی تجارت پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ برآمدی مال کی پیدائش کے سلسلے میں ۱۹۳۹ء میں جتنے مزدور لگے ہوئے تھے اُس سے ۳۳۰۰۰۰ زیادہ مزدور جون ۱۹۴۷ء میں تھے، اور اندرونی بازار کی مانگ پوری کرنے کے لیے جن اشیا کی ضرورت تھی اُن کی پیدائش میں ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں ۶۵۰۰۰۰ مزدور گھٹ گئے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی معیشت میں توازن کی کمی ہے۔

شہری ضرورت کی چیزوں کی سپلائی میں ہمواری نہیں ہے۔ مثلاً موٹر سائیکل، برقی لوہا، کیتلی، ویکیوم کلینر وغیرہ کی بہتات ہے، اور نئے مکانات، کپڑے، فرنیچر اور گھریلو ضرورت کی اشیا بہت کم بازار میں آ رہی ہیں۔ خاص کر سوتی کپڑے کی پیدائش جنگ سے پہلے کے مقابلے میں نصف ہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۳ء کی سطح تک بھی پیدائش نہیں پہنچ سکی ہے۔ حالاں کہ ۱۹۴۳ء میں اور سال کے مقابلے میں سب سے کم کپڑا پیدا کیا گیا تھا۔ اینٹوں کی سپلائی جنگ سے پہلے کی بہ نسبت نصف سے ذرا سی اُوپر ہے۔ کوئلے اور فونڈری کی پیدائش میں بہت کمی ہے، ساتھ ہی اسٹیل کی بھی بڑی قلت پیدا ہو رہی ہے۔

جب تک صنعتوں میں کام آنے والی بنیادی اشیا کی پیدائش نہیں بڑھے گی اُس وقت تک قلت عرصے تک موجود رہے گی، چاہے صنعتی اشیا کی صنعتوں کی قوتِ پیدائش بڑھ ہی کیوں نہ جائے، تعمیرات کی صنعت میں بے روزگاری پہلے ہی سے موجود ہے اس لیے کہ فونڈری کی ڈھالی ہوئی چیزوں کی عدم موجودگی میں مکانات کی تعمیر مکمل نہیں کی جا سکتی۔

سرکاری پریس کہتا ہے کہ قوتِ پیدائش کی کمی اس لیے ہے کہ مزدور سخت محنت نہیں کرتے۔ حالاں کہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ یہ نازک صورتِ حال اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ ضروری اور بنیادی صنعتوں میں مزدوروں اور کام کرنے والوں کی کمی ہے۔ چناں چہ یہ کہنا غلط ہے کہ قوتِ پیدائش کی کمی اس کا سبب ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مجموعی طور پر کام کرنے والوں کی کمی ہو گئی ہے۔ خاص کر بنیادی صنعتوں میں کافی کام کرنے والوں کو نہیں لگایا گیا ہے۔ اس لیے کہ آیندہ ترقی کی صورت نہیں رہنے کی وجہ سے

اور ان صنعتوں میں ماحول اور حالات کے اچھے نہیں رہنے کے باعث مزدور کام کرنا پسند نہیں کرتے۔ پچھڑی ہوئی بنیادی صنعتوں میں فی کس فی گھنٹہ پیداوار بڑھانے کے لیے کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی گئی تاکہ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۸ء کے مقابلے میں پیداوار بڑھائی جا سکتی۔

کوئلے کی مثال لے لیجیے جہاں سب سے خراب حالت ہے کوئی ایک سال میں جا کر لیبر حکومت نے فیصلہ کیا کہ کوئلے کی صنعت کو قومی ملکیت بنایا جائے گا۔ سال بھر تک یہ صنعت غیر یقینی حالت میں رہی اس کی معمولی توسیع و ترقی بھی نہیں ہو سکی۔ نئے مزدوروں کو اس صنعت میں لانے کے لیے کوئلہ کھودنے والوں نے جس اعلان نامے کا مطالبہ کیا تھا اُسے کھٹائی میں ڈال دیا گیا۔ چناں چہ ۱۹۴۸ء میں کوئلے کی صنعت کی حالت ۱۹۴۵ء کے مقابلے میں بھی ردّی ہے۔ نہ تو کام کرنے کے حالات اور ماحول کو دُرست کرنے کی کوشش کی گئی ہے نہ نئی مشین کے لیے آرڈر دیا گیا ہے اور نہ نئی کُھدائی کی طرف قدم بڑھایا گیا ہے۔ تاکہ مزدوروں میں یہ اعتماد پیدا ہو کہ ایک نئی کوئلے کی صنعت کی تعمیر ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ مزدوروں کے راشن کے سلسلے میں بھی کچھ نہیں کیا گیا ہے۔ جب تک کوئلے کی صنعت کو قومی ملکیت بنانے کا قانون نہیں پاس ہو رہا تھا اس وقت تک کے لیے یعنی عارضی طور پر اگر کوئلے کی کانوں کو حکومت اپنے اختیار میں لے لیتی اور ایک بورڈ بنا دیا جاتا جو کوئلہ کھودنے والوں کے ساتھ مل کر لیبر حکومت کی معاشی پالیسی کو مجموعی طور پر کامیاب بنانے کی کوشش کرتا تو اس صنعت کی حالت خراب نہیں ہوتی۔ اس وقت جو بورڈ ہے اُس میں نو میں سے دو ممبر مزدور تحریک کے نمایندے ہیں۔ اُن کے اختیارات محض "خوش حالی کے امور" اور "مزدوروں کے تعلقات" تک محدود ہیں۔ پیداوار اور مالی مسائل سابق مالکوں اور کاروباری آدمیوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیے گئے ہیں۔

جتنی تیزی سے معاشی بحران آ رہا ہے اُس کا مقابلہ کرنے کے لیے موجودہ کنٹرول اور بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت بنانے کی موجودہ رفتار ہرگز کافی نہیں ہے۔ اسٹیل اور بجلی کی صنعتوں کا جہاں تک تعلق ہے سرمایہ داروں نے صاف طور پر دیکھ لیا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ حکومت ان صنعتوں کو چلانے کے لیے جن کو قومی ملکیت بنا دیا گیا ہے، سرمایہ داروں ہی پر بھروسہ کر رہی ہے چناں چہ وہ حکومت کو مشورہ دینے یا اشتراکِ عمل کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ کئی اسٹیل کے فرموں نے اعلان کر دیا ہے کہ اگرچہ توسیع و تجدید کی اس کئی سال کی تیار شدہ اسکیمیں اُن کے پاس موجود ہیں لیکن وہ اس کو اس لیے عمل میں نہیں لا رہے ہیں کہ ابھی یہ ٹھیک نہیں کہ اسٹیل کی صنعت قومی ملکیت بنائی جائے گی یا نہیں۔ اگر حکومت چاہتی تو اسٹیل مزدوروں کی جو یونین ہے اُس کی طرف سے ایک آدمی کو لے کر کنٹرولر بنا سکتی تھی۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اُس کی بجائے حکومت ایک کنٹرول بورڈ بنا رہی ہے جس میں اسٹیل کی صنعت کے سرمایہ داروں کو اختیار اور قابو حاصل ہوگا۔ یہ بورڈ اسٹیل کی صنعت

کی از سرِ نو تعمیر و تنظیم کی نگرانی کرے گی۔ لیکن حکومت نے اسٹیل کی صنعت کو قومی ملکیت بنانے کے بارے میں اب تک کچھ نہیں کہا ہے۔

بہت سی بنیادی صنعتوں میں ایسی پالیسی اختیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو مزدوروں اور مالکوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ مالکوں نے اس صنعت کو قومی ملکیت بنانے کے خلاف اور ذاتی ملکیت قائم رکھنے کی حمایت میں اپنی خواہش کا اعلان کر دیا ہے اور بہت سے ماہرین بھی لیبر حکومت کی پالیسی سے ہم دردی نہیں رکھتے۔ ایک سال کے طویل عرصے کے بعد روئی کی صنعت پر جو رپوٹ موصول ہوئی ہے۔ اس میں بھی اختلاف رائے موجود ہے۔ برتن سازی کی رپوٹ میں بھی بڑے دھیمے الفاظ سے کام لیا گیا ہے۔ اور پھر وہ نامکمل بھی ہے۔ اور دونوں صنعتوں کی حالت کو دُرست کرنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

انجنیری کی صنعت

اس صنعت میں کام کرنے والوں کی تعداد لڑائی سے پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہے لیکن کسی خاص منصوبے کے تحت ایسا نہیں ہے بلکہ محض اتفاقیہ طور پر۔ کانوں، روئی کی ملوں، فونڈریوں وغیرہ کی نئی تنظیم کے لیے اس سے پوری پوری مدد لی جا سکتی ہے ——— لیکن اس وقت اس صنعت کو کام میں لانے کے لیے کوئی قومی پلان موجود نہیں ہے۔ اور نہ یہ طے کیا گیا ہے کہ جو صنعتیں اس وقت موجود ہیں اُن میں سے کس کو انجنیری کی صنعت سے پہلے مدد پہنچائی جائے گی اور کس کو بعد میں۔ حکومت نے اس صنعت کو دُوسری صنعتوں کے مطابق کام میں لانے کے لیے احکام جاری کرنا ترک کر دیا ہے۔ چناں چہ اشیا کی پیدایش کے کام میں انجنیری کی صنعت سے خاطر خواہ مدد نہیں پہنچتی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں جو بدنظمی اور بے ترتیبی پائی جاتی ہے اُسی کے مطابق انجنیری کی صنعت بھی چل رہی ہے جس سے یہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز بہت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے اور کوئی چیز بہت کم۔ آج کل سرمایہ داروں کے مفاد کے مطابق انجنیری کی صنعت کام میں لائی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر آج کل انگلستان میں مشینوں کے پُرزوں کی پیدایش بہت گھٹ گئی ہے اور پرائیوٹ کاروں اور موٹر بائیسکلوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ کپڑے کی مشینوں اور کان کھودنے کی مشینوں سے متعلق ہمارے پاس اعداد و شمار موجود نہیں ہیں لیکن جو رپوٹیں موصول ہوئی ہیں اُن سے یہ پتا چلتا ہے کہ اُن کی پیدایش بالکل ناکافی ہے۔ انجنیری کی صنعت میں جو مزدوروں کی انجمنیں ہیں وہ چھے ماہ سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ اس صنعت کی مجموعی ترقی کے لیے ایک متحدہ مشاورتی بورڈ بنایا جائے لیکن اب تک یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ مسئلہ قومی قوتِ پیدایش کے بڑھانے کا ایک اہم مسئلہ ہے۔

غرض جنگ کے زمانے میں اشیا کی پیدایش پر حکومت کا جتنا کنٹرول تھا وہ اب پہلے سے بہت کم ہو گیا ہے۔ حکومت جنگ کے زمانے کے برخلاف اب سب سے بڑے پیمانے پر چیزیں نہیں خریدتی ہے۔ سرمایہ کاری پر سے حکومت کا کنٹرول اب ڈھیلا پڑ گیا ہے اور اگر حکومت نے پیدایش اشیا کا کوئی پلان بنایا بھی ہے تو سرمایہ داروں کی ریشہ دوانی کا مقابلہ

کرنے کے لیے ذرائع ووسائل نہیں دریافت کیے ہیں۔

قومی آمدنی کی تقسیم

ہرصنعت کی پیداوار کو دوحصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہی، ایک تو مزدوروں کی مزدوری اور دوسرے وہ فالتو قدر جسے سرمایہ دار کا منافع کہا جاتا ہی۔جنگ کے زمانے میں یہ تقسیم سرمایہ داروں کے موافق رہی ہو یعنی مزدوروں کو تنخواہیں کم ملی ہیں اور سرمایہ داروں کو منافع زیادہ ملا ہی۔ ۱۹۴۵ء تک منافع میں چھیاسی فی صدی کا اضافہ ہوا ہی لیکن مزدوری کی تنخواہوں کے بل میں ترسٹھ فی صدی کا۔جنگ کے زمانے میں جو ٹیکس عاید تھے وہ اب گھٹا دیے گئے ہیں،اس کا اثر لوگوں کی مجموعی آمدنی پر بھی پڑنے لگا ہی۔

مزدوروں کی ہفتے وار آمدنیوں میں بھی بہت کمی ہوگئی ہو اس لیے کہ فالتو وقت کا کام اب مزدوروں کو نہیں ملتا اور ایسے کام بھی اب نہیں ملتے جن میں تنخواہ وقت کے لحاظ سے نہیں بلکہ کام کے لحاظ سے دی جاتی ہی۔پھر ایک وجہ یہ بھی ہو کہ مزدور جنگی صنعتوں سے ہٹ کر امن کے زمانے کی صنعتوں میں لگا دیے گئے ہیں جن میں تنخواہیں کم ملتی ہیں۔جولائی ۱۹۴۵ء اور جنوری ۱۹۴۶ء کے درمیانی عرصے میں مردوں کی تنخواہوں میں سات شلنگ تین پنس کی کمی ہوئی اور عورتوں کی تنخواہوں میں تین شلنگ چار پنس کی۔تنخواہ کی شرحوں میں جو اضافہ ہوا ہو اور پی۔اے۔وائی۔ای میں جو کمی ہوئی ہو اس کمی کا ازالہ نہیں ہوسکا ہی۔جولائی ۱۹۴۶ء میں یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں تنخواہ کی شرحیں اکسٹھ فی صدی زیادہ ہیں لیکن خردہ قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہو اُس کے مقابلے میں تنخواہوں کی شرحوں کا یہ اضافہ کم ہی۔چناں چہ مزدوروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ۱۹۴۵ء میں خردہ قیمتوں میں اضافے ۲/۱ ۵۸ فی صدی تھا اور جولائی ۱۹۴۶ء میں تھوک قیمتوں میں ۶ فی صدی کا اور اضافہ ہوا ہی۔

جب تک کہ چیزوں کی پیدایش میں کمی رہے گی اس وقت تک یہ خطرہ موجود رہے گا کہ افراطِ زر کی وجہ سے قیمتیں بڑھ جائیں۔خاص کر اشیائے اصل کی قیمتوں کے بڑھنے کا اور بھی خطرہ ہو اس لیے کہ اُن کی راشن بندی نہیں کی گئی ہو اور اُن کی قیمتوں پر عام طور سے کنٹرول نہیں ہی۔مشین، پلینٹ، تعمیرات کی چیزیں اور بعض دھاتوں کی قیمتیں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں۔جولائی ۱۹۴۵ء سے قیمتوں میں ۲/۱ ۲ فی صدی کا اضافہ ہوا ہی اور یہ رجحان بڑھتا ہی جا رہا ہی۔جون اور جولائی میں تھوک قیمتوں میں ۲/۱ ۱ فی صدی کا اضافہ ہوا ہو ایک ہی مہینے کے اندر قیمتوں کا اتنا زیادہ اضافہ تشویش ناک ہی۔چھ سال سے آج تک ایسا نہیں ہوا۔

حکومت قیمتوں کو اوپر چڑھنے سے روکنے کے لیے کافی کوشش نہیں کر رہی ہی۔ریل کے کرایے، فرنیچر اور کچھ خاص قسم کے کپڑوں کی قیمتیں چڑھ گئی ہیں۔افراطِ زر کا سب سے زیادہ خطرہ اس سے پیدا ہو رہا ہی کہ زرِ سرمایہ داروں کے

ہاتھ میں جمع ہو رہا ہی۔ زائد منافع ٹیکس کے اُٹھ جانے اور انکم ٹیکس کے گھٹ جانے کے بعد خاص طور سے ایسا ہوا ہی۔ بینکوں کے جمع میں ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۶ء میں ۷½ فی صدی کا اضافہ ہوا ہی۔ یہ جمع مجموعی طور پر پانچ ارب پونڈ تھا۔ یہ سب سے اُونچا ریکارڈ ہی۔ اگر حکومت غیر پیداواری چیزوں پر اور سامراجی اسکیموں پر بینک میں جمع شدہ زر بے دستور خرچ کرتی رہی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ افراطِ زر کا خطرہ بہت بڑھ جائے گا۔

اس وقت سرمایہ دار مشینوں، پلینٹوں اور صنعتی سامان کو بڑی سے بڑی قیمت پر بھی خریدنے کے لیے تیار ہیں۔ سرمایہ دار اس لیے ایسا کر رہے ہیں کہ اُنھیں بھروسہ ہی کہ غیر ملکوں میں اُن کی چیزیں فروخت ہوں گی اور جنگ کے زمانے کی جمع شدہ قوتِ خرید اُن کی صنعتی پیداوار کی کھپت کو آسان بنا دے گی۔ لیکن اگر قیمتیں عام لوگوں کی آمدنی سے بالکل بے تعلق ہوگئیں تو بہت جلد اشیائے اصل کی صنعتوں میں نازک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے کہ چیزوں کی قیمتیں زیادہ رہنے سے جنگ کے زمانے کی بچت کی رقمیں جلد خرچ ہو جائیں گی۔ معاشی بحران اس طرح بھی پیدا ہو سکتا ہی کہ امریکہ کے مقابلے سے غیر ملکوں کے بازاروں میں برطانوی مصنوعات کی فروخت کم ہو جائے گی۔ ایسا اس وقت ہوگا جب کہ ابھی لوگوں کی فوری ضرورتیں مثلاً کپڑا، امکانات اور فرنیچر کی ضرورتیں باقی رہیں گی یعنی صورتِ حال یہ ہوگی کہ ایک طرف تو سرمایہ دار چیزوں کی پیدایش کو روک دیں گے اور دُوسری طرف لوگوں کی مانگیں برقرار رہیں گی۔

برطانیہ میں جو موجودہ حالات ہیں اُن کے تحت اس بات کا خطرہ ہی کہ موجودہ کمئ پیداوار والا معاشی بحران قائم رہے اور پھر اُس کے ختم ہوتے ہی زیادتی پیداوار والا معاشی بحران آ موجود ہو۔ کوئی ضروری نہیں کہ ان دونوں کے درمیان معاشی خوش حالی کا عرصہ آئے۔

تجارتِ برآمد آگے چل کر جو سب سے بڑا خطرہ ہی وہ یہ ہی کہ کہیں برآمدی تجارت نہ ماند پڑ جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں برآمدی تجارت میں پچاس فی صدی کا اضافہ ہوا ہی لیکن اس سے لوگوں کے ذہن میں غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہیے۔ برطانیہ اور امریکہ دونوں دُنیا کے بازاروں پر اپنا قبضہ کر رہے ہیں جنگ کے زمانے میں دُنیا کے مُلکوں کی مانگیں خاص طور پر غیر جانب دار ملکوں کی مانگیں پوری نہیں ہو سکیں۔ چناں چہ وہاں مال کی کھپت کی زبردست گنجایش ہی اور نقد کھپت کی گنجایش۔ نوآبادیات اور برطانوی ڈومینین میں بھی خاص طور پر مانگ بہت زیادہ ہی۔ اس وقت ہر چیز کسی قیمت پر بھی فروخت ہو سکتی ہی۔ برطانیہ اور امریکہ کے درمیان مقابلہ اس وقت اس بات کا ہی کہ کون ملک زیادہ تیزی کے ساتھ مال پیدا کر سکتا ہی لیکن شمالی امریکہ میں جو مال جا رہا ہی اس کی مقدار اس وقت بہت کم ہی اور برطانیہ امریکی ڈالر کی بڑی محتاج ہی۔ اس سے خطرہ یہ ہی کہ جب امریکہ کا دیا ہوا قرضہ خرچ

ہو جائے گا تو برطانیہ کی برآمدی تجارت بہت گھٹ جائے گی اور برطانیہ میں کچے مال کی بہت کمی پڑ جائے گی جب امریکہ زیادہ تیزی کے ساتھ مقابلہ کرے گا تو یقیناً برطانیہ میں اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہوگی۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ امریکہ میں فی کس قوتِ پیداوار برطانیہ کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

اب تک حکومت نے درآمدی مال کو خریدنے کا وعدہ پورا نہیں کیا ہے۔ اور نہ روس، یوگوسلاویہ، زیکوسلوویکیا سے تجارتی عہدنامے کیے ہیں حالاں کہ ان ملکوں نے چوں کہ اشتراکی معیشت کا راستہ اختیار کیا ہے اور منصوبے بندی کے تحت وہاں کی معاشی زندگی ترتیب پا رہی ہے اس لیے بہت جلد وہاں زیکوسلوویکیا اور یوگوسلاویہ میں برطانیہ کے بھاری مال کی مانگ بڑھے گی۔ حکومت نے ان ملکوں سے مختصر عرصے والے قرضے کی بات چیت بھی نہیں کی ہے۔ یوگوسلاویہ کا دھات اور بلقان کا تمباکو امریکہ کی سپلائی کے مقابلے میں اعلا نعم البدل ثابت ہو سکتا تھا لیکن ان ملکوں سے برطانیہ کی تجارت محض برائے نام ہے۔ نوآبادیات کے مزدوروں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی یعنی نوآبادیات میں اچھا بازار پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے۔

ایسی صورت میں کیوں کر اُمید کی جا سکتی ہے کہ لیبر حکومت پیداوار کی موجودہ کمی کو دور کر سکتی ہے اور آگے چل کر زیادتی پیداوار کا جو بحران پیدا ہوگا اُس کا مقابلہ کر سکتی ہے؟

ذیل میں ہم اُن کارروائیوں کا مختصر تذکرہ کریں گے جن کا عمل میں لانا موجودہ لیبر حکومت کے لیے ضروری ہے۔

(۱) مزدوروں کی تنخواہیں بڑھائی جائیں، عورتوں کو مردوں کے برابر تنخواہ دی جائے، تنخواہوں پر جو ٹیکس ہے اس کو کم کیا جائے، جو مال اور غذائی چیزیں دست یاب ہیں ان کو ویسٹ اور ایسٹ اینڈ میں منصفانہ طور پر تقسیم کیا جائے۔ اس سلسلے میں کان کے مزدوروں کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔

(۲) صنعتوں کو قومی ملکیت بنانے کی رفتار تیز کی جائے مزدوروں اور ماہرینِ فن کو اس کام میں لگا دیا جائے حکومت کے انتظام کے تحت اشیا پیدا کی جائیں۔ حکومت مال کی بڑی بڑی مقدار خریدے اور ترجیہات کا طریقہ اختیار کرے۔ اشیائے صرف کی قیمت اور سرمائے کی فراہمی اور سرمائے کی قیمت کو کم رکھنے کی کوشش کرے۔ سرمایہ دار کتنا منافع کما رہے ہیں اس کی کھلے طور پر تحقیقات کی جائے۔ کتنی چیزیں پیدا کی جا رہی ہیں اس کے متعلق تحقیقات کی جائے اور پیدا کرنے کے کام میں منظم شدہ مزدوروں سے مشورہ اور مدد لی جائے۔

(۳) یورپ کے ملکوں سے خاص کر روس کو مختصر عرصے کے لیے قرضے دیے جائیں اور اُن کا کچا مال بڑی مقدار میں خریدا جائے۔ مزدوروں کی انجمنوں کا عالم گیر وفاق بنایا جائے اور امریکہ میں ترقی پسند طاقتوں کو آگے بڑھانے کے

کام میں [illegible] جائے۔ یورپ کی نئی جمہوریتوں اور روس سے بین اقوامی سیاست میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ سامراجی دباؤ اور ظلم کو ترک کر دیا جائے۔

معاشی معاملات میں ضرورت ہے کہ حکومت زیادہ سیدھا اور تیز رفتار راستہ اختیار کرے اور سرمایہ داروں اور استحصال کرنے والوں کے ساتھ جانب داری کا رویّہ ترک کر دیا جائے۔ تمام معاشی معاملات میں منظّم شدہ مزدوروں اور ان کی انجمنوں سے پورے پورے طور پر مشورہ اور رائے لی جائے اور انھیں کے ذریعے تمام امور چلائے جائیں۔ آج کل یہ ہو رہا ہے کہ بات کے طے ہو جانے کے بعد مزدوروں کی انجمنوں سے مشورہ لیا جاتا ہے یہ طریقہ جلد از جلد ترک کر دیا جائے اور ہمیشہ مزدوروں کی انجمنوں سے رائے لی جائے۔

اگر ان باتوں پر عمل کیا گیا تو آج کل کمی پیداوار کو جس کی وجہ سے جو مشکل مسائل پیدا ہو رہے ہیں دور کرنے میں مزدور جی جان سے لگ جائیں گے اور چیزوں کی کمی آسانی سے دور ہو جائے گی۔

مسائلِ حاضرہ (ہندستان) :-

چالیس کروڑ عوام کے معاشی مسائل

از ———— چندرل مون

ہندُستان ایک قدیم تہذیب کا ملک ہی۔ وہ وسیع اور رنگارنگ ذرائع کا حامل ہی۔ اِس کے عوام محنتی ہیں اور کسی وقت اپنی کاریگری کے لیے بھی مشہور تھے۔ برطانیہ کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے یہ ملک جدید صنعت اور مغربی سائنس کے آثار سے بھی بہرہ مند ہی اور تقریباً ایک سو سال اس کی سرحدوں میں امن و امان قائم رہا ہی۔ اس کے باوجود ہندُستان اپنے افلاس اور غریبی کی وجہ سے بدنام ہی۔ اس کے عوام ازمنہ وسطیٰ کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ ابھی تک رسُوم اور قسمت کے غلام ہیں اور بیماری، جہالت اور نیم فاقہ میں مُبتلا ہیں۔ جہاں یورپ ترقی کے راستے پر گام زن رہا ہی وہاں ہندستان دلدل میں پھنسا رہا ہی اور اپنی نیم فاقہ کی زندگی میں گمن ہی۔

ہندُستان کے گونگے عوام کی زندگی کا غریبی امتیازی وصف ہی۔ ان کے لیے سیاست کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ غالباً ان میں سے بیش تر کو اس کی مطلق پرواہ نہیں کہ اُن کے آقا سفید فام ہیں یا گندمی رنگ کے برہمن لیکن اُن کے کچی مٹی کے مکانوں والے دیہات اور تنگ و تاریک گلیوں والے قصبات میں غریبی ایک ٹھوس اور ناقابلِ انکار حقیقت ہی۔

اعداد و شمار عینی شہادت کا کوئی اچھا بدل نہیں۔ لیکن اعداد و شمار کی مدد سے ہندستان کے افلاس کا تھوڑا بہت خاکہ ضرور کھینچا جاسکتا ہی۔ اگرچہ یہ خاکہ نامکمل ہوگا۔ ہندستانیوں کی اوسط آمدنی کے متعلق وقتاً فوقتاً اندازے لگائے گئے ہیں۔ ان کے متعلق بڑی بحث ہوئی ہی اور اُن میں اختلاف بھی کافی پایا جاتا ہی۔ سائمن کمیشن کی رپوٹ کے مطابق ہندستانیوں کی اوسط آمدنی ۱۵ اشلنگ سالانہ ہی۔ لارڈ کرزن کے دوران حکومت میں جو رپوٹ شائع ہوئی تھی اس کے مطابق ہندستانیوں کی اوسط آمدنی

سو شلنگ [illegible]ستانی فی تھی۔ اس اوسط آمدنی کا مقابلہ اگر اہل برطانیہ کی اوسط آمدنی سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں ایک برطانوی کو [illegible] ہو وہاں ایک ہندستانی کو شلنگ دست یاب ہوتا ہے۔ کیوں کہ سنہ ۱۹۳۱ء میں جو اعداد و شمار شائع کیے گئے تھے اُن کے مطابق برطانویوں کی اوسط آمدنی ٹھیک ۹۴ پونڈ تھی۔

اگر ضروریاتِ زندگی کو مدِ نظر رکھا جائے تو ان اعداد و شمار کا مطلب کیا ہے؟ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہندستان میں مناسب طریق پر زندہ رہنے کے لیے نسبتاً کم کپڑوں، کم خوراک، کم ایندھن اور نسبتاً چھوٹے مکانوں سے کام چل جاتا ہے لہٰذا اہلِ برطانیہ کے پونڈ اور اہلِ ہند کے شلنگ کا موازنہ کسی قدر گمراہ کن ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ بہت سے ہندستانیوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ پیٹ بھر کر کھانا کیا ہوتا ہے۔ حکومت کی ایک رپورٹ کے مطابق جو سنہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی، ان میں سے اکثر کو صرف اس قدر کھانے کو ملتا ہے کہ وہ زندہ رہ سکیں۔ دو مشہور ہندستانی ماہرینِ معاشیات پروفیسر کے ٹی شاہ اور کے جی کھمباتا کے الفاظ میں ہندستانیوں کی اوسط آمدنی اس قدر ہے کہ تین میں سے صرف دو آدمیوں کو کھانا مل سکے یا ہر آدمی اپنی ضرورت کے نسبت دو تہائی کھانا کھائے۔ اس پر بھی یہ شرط ہے کہ وہ کوئی کپڑا نہیں پہنے گا۔ تمام سال کھلے میدانوں میں زندگی بسر کرے گا اور خوراک کے علاوہ اسے کوئی آسایش مہیا نہ ہوگی بلکہ خوراک ادنیٰ ترین اور ناقص ترین ہوگی اور اس میں زندگی بخشنے والے اجزا صرف برائے نام ہوں گے۔

غُربت کے اسباب

اس غریبی کے اسباب کیا ہیں۔ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ ہندستان میں تخلیقی قوتیں سُست رو ہیں۔ لیکن اس سُست روی کے اسباب کیا ہیں؟ کیا ہندستان میں زرخیزی اور بار آوری کی کمی ہے؟ ماضی میں ہندستان کی دولت مندی روایت کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اب ہم ہندستان کی لامحدود امکانی دولت کا ذکر اکثر سُنتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے قدرتی ذرائع صرف کافی ہیں غیر معمولی ہرگز نہیں۔ جہاں تک معدنی دولت کا تعلق ہے یہ زیادہ کوئلے، لوہے میگنیز اور ابرق پر مشتمل ہے۔ لیکن کوئلے اور لوہے کی تقسیم بہت غیر مناسب ہے۔ یہ کوئلہ اور لوہا تقریباً سارے کا سارا بہار اور مغربی بنگال میں ہے اور یہ ایسا ہے جیسے یورپ کا تمام لوہا اور کوئلہ صرف بلقان میں موجود ہو۔

زرعی اعتبار سے ہندستان کی ترقی میں بارش کا غیر یقینی ہونا رکاوٹ بنا ہوا ہے اس کلیے کا تعلق ملک کے دونوں حصوں سے ہے یعنی شمالی ہندستان جو سندھ اور گنگا کے درمیانی علاقے پر مشتمل ہے اور جنوبی ہندستان جو ایک جزیرہ نما کی حیثیت رکھتا ہے شمالی ہندستان کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ اگر بارش مناسب مقدار میں ہو جائے یا مصنوعی آب رسانی کا انتظام ہو تو یہاں تقریباً ہر

قسم کی فصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً گندم، مکئی، چاول، باجرہ، دالیں، کپاس، گنا اور تمباکو۔ اس کے علاوہ اس حصۂ ملک میں سال میں دو تین فصلیں بھی ہو جاتی ہیں۔ لیکن مشرقی یعنی بنگال اور بہار میں بارش عام طور پر ۸۰ انچ سے تجاوز کر جاتی ہے۔ وہاں سے مغرب کی طرف بارش عموماً ۲۰ انچ سے کم ہوتی ہے۔ اس حصۂ ملک میں جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے بعض حصوں کو کسی حد تک صحرا سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے اور جب تک کنوؤں اور نہروں پر زرکثیر صرف نہ کیا جائے ان علاقوں میں کاشت کاری ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے حصے ایسے بھی ہیں جہاں آب پاشی کے انتظام کی صرف گھٹیا قسم کی فصلیں ہی بوئی جا سکتی ہیں اور بعض مرتبہ تو کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا۔

جنوبی ہندستان کا علاقہ مرطوب ہے۔ ساحلی علاقے اور اُس کے آس پاس کی زمین زرخیز ہے، فصلیں بارآور ہوتی ہیں، آبادی گھنی ہے اور بارش عام طور پر کافی ہوتی ہے لیکن ملک کا اندرونی علاقہ ناقص اور ناقابلِ کاشت ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ صرف خال خال آبادی کا کفیل ہو سکتا ہے۔ یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے اور یہاں صرف گھٹیا قسم کی فصلیں ہی بوئی جا سکتی ہیں۔

اگر ہندستان کے تمام رقبے کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ دُنیا کے خوش قسمت ترین خطوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے قدرتی ذرائع اتنے ناکافی بھی نہیں کہ انھیں ہندستانی عوام کے افلاس کی توضیح تصور کر لیا جائے۔ ایسے بہت سے ملک ہیں جن کے ساتھ قدرت نے اِتنی فراخ دِلی کا سلوک بھی نہیں کیا۔ لیکن اُن کا معیارِ زندگی نسبتاً کافی بلند ہے۔

تو کیا ہندستان کے افلاس کی وجہ آبادی کی کثرت یا اُس آبادی کا کیرکٹر ہے؟

گزشتہ چند سال سے بعض مصنف "بچوں کے تباہ کارانہ سیلاب" پہ اظہارِ تشویش کر رہے ہیں اور ہندستان کے افلاس کی بُنیادی وجہ آبادی کی کثرت کو قرار دے رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندُستان کے افلاس میں اُس کی آبادی کو بڑا دخل ہے لیکن تمام واقعات کا مناسب جائزہ بہت ضروری ہے۔ ہندستان کی آبادی ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۳۸۸۹۹۸۰۰۰ تھی۔ یہ کافی زیادہ ہے۔ لیکن اوسطاً یہ اتنی گھنی نہیں جتنی جاپان میں ہے اور انگلستان اور ویلز کے مقابلے میں تو بہت ہی کم ہے۔ ہندُستان میں اوسط آبادی ۲۴۶ فی مربع میل ہے، جاپان میں ۴۳۹ فی مربع میل ہے اور انگلستان اور ویلز میں ۶۹۵ نفوس فی مربع میل ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ گزشتہ ایک سو سال سے ہندُستان میں آبادی کی رفتار بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس معاملے میں بھی ہندُستان ۱۹۲۱ء تک یورپ سے پیچھے تھا اور آج بھی یہاں آبادی میں اضافے کی رفتار وہی ہے جو امریکہ میں ہے اور رُوس تو اس معاملے میں ہندستان سے بڑھا ہوا ہے۔

دُوسری طرف اگر ہندُستان کے معلومہ قدرتی ذرائع کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ ہندُستان کی آبادی یقینی طور پر زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے ہندستان کی حالت چین اور جاپان کے مقابلے میں اگرچہ اچھی ہے لیکن رُوس اور امریکہ کے

مقابلے میں بہت طور پر خراب ہی۔ البتہ ہندستان اور مشرقی یورپ کی حالت یکساں ہو۔ لیکن ہندستان کی آبادی میں روز بہ روز اضافہ ہوتا رہا ہو۔ مزید برآں اگر اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھا جائے کہ ہندستان کی ستر یا پچھتر فی صدی آبادی کا انحصار صرف زراعت پر ہو تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہندستان کی آبادی واقعی زیادہ ہو۔ اگر روس کو نکال دیا جائے تو یورپ میں صرف پچاس فی صدی آبادی کا انحصار زراعت پر ہو۔ صرف پولینڈ بلغاریہ اور یوگوسلاویہ جیسے غریب ممالک کی ستر فی صدی آبادی اپنی روزی کے لیے زراعت پر انحصار رکھتی ہو اور مغربی یورپ میں تو زراعت صرف چالیس فی صدی آبادی کی روزی کا سبب بنتی ہو۔ ہندستان کے افلاس کا حقیقی سبب یہی ہو کہ اس کی بیش تر آبادی کا انحصار صرف زراعت پر ہو۔ جس ملک کی اتنی بڑی آبادی زراعت کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہو وہاں فی کس پیداوار لازمی طور پر کم ہوگی۔

پسماندہ زراعت

اگر بہترین حالات کا تصور کر لیا جائے تو بھی زراعت کا پیشہ صنعت اور دوسرے پیشوں کے مقابلے میں کم بار آور ہو۔ اس کا ایک سبب یہ ہو کہ جہاں صنعت میں انسان سال کے ۳۶۵ دنوں میں سے ۳۰۰ دن مصروف رہتا ہو وہاں قدرتی مجبوریوں کے باعث زراعت میں وہ سال بھر میں صرف ۲۰۰ دن مصروف رہ سکتا ہو۔ اگر باقی باتیں برابر ہوں تو جو شخص سال میں ۳۰۰ دن کام کرے وہ اس شخص کے مقابلے میں یقینی طور پر فائدے میں رہے گا جو سال بھر میں صرف ۲۰۰ دن کام کر سکتا ہو۔ ہندستان میں زراعت چوں کہ اہم ترین پیشہ ہو لہذا یہ ملک مجموعی اعتبار سے گھاٹے میں رہتا ہو۔

لیکن ہندستان میں چوں کہ ضرورت سے کہیں زیادہ آبادی زراعت کو پیشہ بنائے ہوئے ہو۔ اس لیے یہ مصیبت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہو۔ جتنے آدمیوں کی پوری فصل تیار کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہو۔ اس سے زیادہ آدمی ہندستان میں صرف زمین پر ہل چلانے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس طرح ہندستان کے تمام دیہات میں بیش تر لوگ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں یہ بات ظاہر اس لیے نہیں ہوتی کہ اپنے چھوٹے قطعوں پر کسانوں کے وقت ضائع کرنے کے متعلق کوئی اعداد و شمار مرتب نہیں کیے گئے۔ بہر حال اس حقیقت کے نفس الامری ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

زمین پر ضرورت سے زیادہ آبادی کا انحصار صرف براہ راست ہی فی کس پیداوار میں تخفیف کا سبب نہیں بنتا بلکہ بالواسطہ یہ پیداوار کو سست بنانے کا موجب بنتا ہو کیوں کہ اس کی وجہ کاشت کاری کے ابتدائی اور فرسودہ طریقے رائج رہتے ہیں چھوٹے چھوٹے کاشت کار جن کے پاس صرف چند ایکڑ زمین ہوتی ہو نہ تو کاشت کاری کے جدید سائنسی آلات کی خریداری کے متحمل ہو سکتے ہیں اور نہ وہ اتنے تعلیم یافتہ ہی ہوتے ہیں کہ ان کے طریق استعمال سے آگاہ ہو سکیں۔ کام کرنے

والوں کی زیادتی اور علم کی کمی کے سبب اہلِ دیہات کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ قدیم آلاتِ کاشت غیر مفید اور تکلیف دہ ہیں۔ ضرورت سے زیادہ لوگوں کا انحصار کاہلی اور مشرق کی تقدیر پرستی تھا۔ اِن تمام باتوں نے کاشت کاری کے قدیم اور فرسودہ طریقوں کو برقرار رکھتے ہوئے ہندستانی دیہات کے دروازے جدیدیت کے لیے بند کر دیے ہیں۔

اِتنے بڑے ملک میں زندگی کے طور طریقوں کا مختلف اور متضاد ہونا اگرچہ یقینی ہی۔ لیکن تقریباً تمام ہندستان میں دیہاتی زندگی کا عام انداز کافی حد تک یکساں ہی۔ کاشت کار ایک جاہل کسان ہی جو اس وقت تک کاشت کے اُنھی طریقوں کو استعمال کر رہا ہی جو ہومر کے زمانے میں مروّج تھے۔ وہ اس وقت تک لکڑی کا ہل استعمال کرتا ہو ہاتھ سے فصلوں کو سینچتا اور چھاج کے ذریعے دانہ صاف کرتا ہی۔ وہ اپنے بیلوں کے ہم راہ مٹی کے ایک تنگ و تاریک مکان میں بسر کرتا ہی ۔ اس قسم کے مکانوں کے مجموعے میں اگر ایک مشترکہ کنویں ایک بڑے سایہ دار درخت اور ایک بدبو دار جوہڑ کو شامل کر دیا جائے تو ہندستانی گاؤں بن جاتا ہی۔ اگر کسان خوش قسمت ہو تو اس کے پاس مختصر سا قطعۂ زمین بھی ہوتا ہی۔ ورنہ وہ صرف کرایہ دار ہوتا ہی۔ بہرحال دونوں حالتوں میں کاشت کا کام صرف کسان ہی کرتے ہیں۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہو کہ بڑی بڑی جاگیروں کا انتظام اُن کے مالک خود کریں اور کاشت کے جدید طریقوں کو رواج دے کر تنخواہ دار مزدوروں سے کام کرائیں۔ بیش تر اوقات ان جاگیروں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے کاشت کار کسانوں کو دے دیا جاتا ہی جو اجناس کی شکل میں ان کا کرایہ ادا کرتے ہیں۔ جاگیر کے مالکوں سے ان کاشت کاروں کو یہ امید نہیں ہوتی کہ وہ زراعت کے معاملے میں انھیں مفید مطلب مشورے دیں — بلکہ وہ ان سے صرف یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ انھیں پڑوسیوں کے ظلم اور پولیس کی مداخلت سے محفوظ رکھیں۔

ہندستان میں کسانوں کے پاس کس قدر مختصر زمین ہوتی ہی اس کا اندازہ صرف ایک صوبے کے اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہی۔ پنجاب میں ۲۲٫۵ فی صدی کاشت کاروں کے پاس صرف ایک ایکڑ یا اس سے کم زمین ہی۔ ۱۵٫۴ فی صدی کاشت کاروں کے پاس ایک اور اڑھائی ایکڑ کے درمیان زمین ہی۔ ۱۷٫۹ فی صدی کاشت کاروں کے پاس پانچ اور دس ایکڑ کے درمیان زمین ہی۔ صوبۂ بمبئی کے علاوہ جہاں صورتِ حال غالباً پنجاب جیسی ہی ہوگی۔ باقی تمام صوبوں میں فی کاشت کار اوسط زمین اس سے بہت کم ہی۔ اس کے علاوہ ان چھوٹی چھوٹی زمینوں کی تقسیم در تقسیم ہوتی رہتی ہی۔ ایک کسان کی موت کے بعد اس کی زمین اُس کے تمام بیٹوں میں مساوی طور پر تقسیم ہوجاتی ہی۔ اور ہر لڑکا ہر قسم کی زمین میں سے اپنا حصہ بانٹ سکتا ہی۔ یوں طرح زمینیں چھوٹے چھوٹے بے شمار ٹکڑوں میں تقسیم ہوجاتی ہیں۔

اِن چھوٹے چھوٹے کھیتوں سے ایک کسان اتنی فصل کی بھی اُمید نہیں رکھ سکتا جو اُس کے اور اُس کے خاندان کے لیے بہ مشکل کافی ہوسکے اگرچہ بعض رقبوں میں فصلیں بوئی جانے لگی ہیں اور اُن کی زیادہ قیمت وصول ہوجاتی ہی لیکن بیش تر

زمین میں صرف اپنی ضرورت کی چیزیں بوتے ہیں۔ اپنے خاندان کی ضرورت پوری کرنے کے بعد اس کے پاس ان اجناس کا بہت تھوڑا حصہ بچتا ہو۔ کوئی چھوٹی موٹی مصیبت بیل کی موت، یا کوئی شادی اُسے بنیے کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور کرتی ہو اور ایسا بہت کم ہوتا ہو کہ کوئی کسان مقروض نہ ہو، وہ اس بات کی کبھی اُمید نہیں کرسکتا کہ اُسے اپنی زمین کی حالت کو بہتر بنانے کی توفیق ہوسکے گی۔ اور نہ وہ یہ جسارت کرسکتا ہو کہ کسی جدید فصل کا تجربہ کرے۔ اس کے علاوہ مادّی حالات، سماجی رواج اور قدامت پسندی بھی جسے مذہب سے تقویت ملتی ہو اس کے راستے میں حائل ہو جاتے ہیں۔ بعض اصلاحات مثلاً کنویں بنانا صرف اسی صورت میں مفید ہو اگر اس کی زمین یک جا ہو۔ لیکن یہ زمین چوں کہ مختلف چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی شکل میں متعدد جگہ ہوتی ہو اس لیے کسی قسم کی اصلاح کی گنجایش نہیں۔ وہ اگر گندم بونے کے بجائے کاشت کاری کی کسی اور صورت کو زیادہ فائدہ بخش سمجھے تو بھی سماجی پابندیوں کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ مثال کے طور پر مرغیاں پالنا یا صرف سبزیوں کی کاشت کرنا ایک کسان کی شان کے منافی خیال کیا جاتا ہو۔ یا صرف یہی چیز اس کے راستے میں حائل ہوسکتی ہو کہ اس کے گانو اور نزدیکی بازار کے درمیان کوئی سڑک نہیں۔ جب فصل کا موسم نہیں ہوتا اور وہ صرف اپنے بچّوں کے ساتھ بے کار بیٹھ کر وقت ضائع کرتا ہو۔ اس کے لیے یہ بہتر ہوسکتا ہو کہ وہ کپڑا بُننے یا کسی اور مفید کام کی طرف متوجہ ہو لیکن گانو کی بہت کم صنعتیں ایسی ہیں جو ایک کسان کے لیے مفید یا مناسب خیال کی جاسکتی ہوں۔ بہت سے کام تو ایسے ہیں جو صرف نچلے طبقے کے لوگوں کے لیے مخصوص ہیں اور باقی میں پہلے ہی ضرورت سے زیادہ لوگ مصروف ہیں۔

ہندستانی کاشت کار اگرچہ اپنا تمام وقت کاشت کاری کی نذر کرتا ہو لیکن اس کے باوجود اس کی محنت باقی ممالک کے کسانوں کی طرح بارآور نہیں ہوتی۔ پیداوار کی کمی میں اُس کی نا اہلیت کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ سچ ہو کہ اپنے بیلوں اور آلاتِ کاشت کو وہ جس انداز سے استعمال کرتا ہو وہ ایک برطانوی کاشت کار کے لیے استعجاب کا باعث ہوسکتا ہو۔ لیکن پیداوار کی کمی کی بیشتر ذمّے داری مناسب کھاد اور زمین میں نمی کی کمی پر ہو اور کھاد کی قلت تو تمام ہندستان میں ہو۔ ہندستانی کاشت کار عام طور پر ان قلتوں کی تلافی نہیں کرسکتا۔ مصنوعی آب رسانی اور مصنوعی کھاد دونوں پر رُپیہ خرچ آتا ہو۔ قدرتی کھاد بھی جو اُس کے مویشی پیدا کرتے ہیں تمام کی تمام زمین کو زرخیز بنانے کے کام نہیں آتی۔ اس کا بہت سا حصّہ اس کی بیوی اور لڑکی اُپلوں میں تبدیل کرکے بطور ایندھن استعمال کرلیتی ہیں دوسرے قسم کا ایندھن چوں کہ دست یاب نہیں ہوتا اس لیے کھاد کو اس طرح ضائع نہ کرنا اُن کے بس کی بات نہیں۔ آبادی میں اضافے کی وجہ سے وہ ایندھن جو جنگلوں کو کاٹ کر حاصل کیا جاتا تھا نایاب ہوتا جارہا ہو۔

ہندستانی کسان کو جس طرح زمین سے کم پیداوار حاصل ہوتی ہو۔ اُسی طرح اُس کے مویشی بھی اُس کے لیے کچھ زیادہ منفعت بخش نہیں ہوتے۔ ہندستان میں گائے اس قدر قیمتی ہو کہ اُسے تقدّس کا درجہ حاصل ہوگیا ہو۔ لیکن اس جانور کی سبب سے

زیادہ قیمت اس کی کھال اور ہڈیوں میں مضمر ہے۔ ہزاروں بیمار اور بوڑھی گائیں چراگاہوں کی گھاس اجاڑتی پھرتی ہیں۔ [illegible] کرتی ہیں نہ دودھ دیتی ہیں لیکن مذہب ان کو ہلاک کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مسلمان علاقوں میں جہاں مذہب حائل نہیں [illegible] کسان ضرورت سے زیادہ گائیں پال لیتے ہیں۔ مویشیوں کی زیادتی امارت کی نشانی خیال کی جاتی ہے۔ لہذا لوگ کسی معاشی فائدے کے لیے نہیں بلکہ صرف اپنے غرور کی تسکین کے لیے ضرورت سے زیادہ مویشی پال لیتے ہیں۔

مویشیوں کو کسان کاشت کاری کے معمولی کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔ بیلوں کی جوڑی ہل چلاتی، کنوئیں سے پانی نکالتی ہے اور چھکڑے کو کھینچ کر بازار تک لے جاتی ہے۔ بعض اوقات بیل قابلِ برداشت حد تک تن درست اور توانا ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر دُبلے اور پست قد ہوتے ہیں۔ اگر ان کی نسل اور صحت کو بہتر بنایا جا سکے تو ان کی تعداد میں لازمی طور پر کمی کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک گایوں کا سوال ہے وہ زیادہ تر بیل پیدا کرنے کے ہی کام آتی ہیں۔ ان میں سے بعض برائے نام دودھ دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر صوبہ جاتِ متحدہ میں ایک گائے دن بھر میں صرف ۲ پونڈ دودھ دیتی ہے۔ حالاں کہ برطانیہ کے ایک اچھے ڈیری فارم کی گائے ۲۸ پونڈ دودھ دیتی ہے۔ ہندستان میں مویشیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ۳۵-۱۹۳۴ء کے اعداد و شمار کے مطابق یہ ۰۰۰۰۰۰ ۲۱۴ تھی لیکن جس طرح ہندستان کی انسانی آبادی کی محنت بار آور نہیں۔ اسی طرح یہاں کے مویشی بھی کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتے۔ بیش تر ہندستانی گائے کا گوشت بالکل نہیں کھاتے اور بہت کم دودھ پیتے ہیں۔ ہندستان میں باقی تمام ممالک کی نسبت کم دودھ استعمال کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ یہاں مویشیوں کی تعداد باقی تمام ممالک سے زیادہ ہے۔

امدادِ باہمی کے ادارے

امداد باہمی کی امکانی ترقیات اگرچہ بے اندازہ ہیں۔ لیکن اس وقت تک اس مفید تحریک سے کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ اگر مجموعی طور پر غور کیا جائے تو اس سلسلے میں گزشتہ چالیس سال میں جو کام کیا گیا ہے۔ اس کے نتائج کافی حد تک یاس انگیز ہیں۔ اس وقت تقریباً ساٹھ لاکھ ہندستانی امداد باہمی کی سوسائٹیوں کے ممبر ہیں اور ان میں سے بعض کو ان سوسائٹیوں کی ممبری سے کوئی خاص مادی یا اخلاقی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ بیش تر سوسائٹیوں کے وجود کا صرف یہ مقصد ہے کہ وہ اپنے ممبروں کو سستی شرح سود پر قرض دیں۔ کاشت کار کے لیے قرض لینا ناگزیر ہے۔ لہذا جاپان کے علاوہ کسی ایشیائی ملک میں بھی ہندستان کے پیمانے پر قرضہ دینے والی سوسائٹیوں کو فروغ حاصل نہیں ہوا۔ ہندستان میں قرض دینے والی سوسائٹیوں کی تعداد ایک لاکھ ہے۔ یہ سوسائٹیاں اپنے ممبروں کو غیر معمولی شرح سود خصوصاً سود در سود کی لعنت سے نجات دلاتی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ان سوسائٹیوں کی بدولت کم از کم بعض قصبوں میں ساہوکار اپنی شرح سود گھٹانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ لیکن بیش تر اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ قرض دینے والی سوسائٹیاں اپنے

ممبروں کو جو قرض دیتی ہیں وہ اُس قرض کے علاوہ ہوتا ہی جو یہی ممبر ساہوکاروں سے حاصل کرلیتے ہیں۔ اس طرح سود خور ساہوکار کا وجود ان سوسائٹیوں کے قیام کے باوجود باقی رہتا ہی۔ بعض سوسائٹیوں کا وجود صرف اس لیے ختم کردینا پڑا کہ وہ اپنے ممبروں سے قرض کا روپیہ واپس لینے میں ناکام رہی تھیں۔ تجربے نے ثابت کردیا ہی کہ ہندستانی کسان کو سستی شرح پر قرض کی نسبت اس بات کی زیادہ ضرورت ہی کہ قرض سے حاصل کیا ہوا روپیہ مناسب طریق پر استعمال کیا جائے اور یہ کہ اُدھار لینے کی نسبت وقت بے وقت کی ضرورت کے لیے روپیہ بچانا زیادہ مفید ہی۔ امدادِ باہمی کی تحریک کسانوں کو مشترکہ ذمہ داری اور کفایت شعاری کا درس دے کر اُن کی طبیعت کے رجحان کو بدل سکتی ہی۔ لیکن ظاہر ہی کہ اس عمل میں کافی دیر لگے گی۔ ہندستانی کاشت کار یا تو معمولی ضروریات مثلاً بیج یا چارے کی خرید کے لیے قرض لیتے ہیں اور یا کسی پُرانے قرضے کی ادائگی مقصود ہوتی ہی اس کے علاوہ بیاہ شادی کے سلسلے میں بھی قرض لے لیتے ہیں۔ یہ بات شاذ و نادر ہی وقوع پزیر ہوتی ہی کہ قرض سے حاصل کیا ہوا روپیہ کسی ایسے کام میں صرف ہو جو مستقل طور پر اُن کی آمدنی میں اضافہ کرنے کا باعث ہوا۔ یہی وجہ ہی کہ قرضہ دینے والی سوسائٹیاں کچھ زیادہ کام یاب نہیں ہوئیں اگرچہ ان کی اس افادیت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بعض حالات میں وہ کسانوں کے قرض کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہیں۔

کسی اور تعمیری مقصد مثلاً جدید آلاتِ کاشت کی خرید یا مویشیوں کی نسل کو بہتر بنانے کے لیے امدادِ باہمی کی سوسائٹیوں کا قیام پنجاب کے علاوہ اور کسی صوبے میں رواج نہیں پاسکا۔ پنجاب میں اشتمال اراضی کے لیے جو سوسائٹیاں قائم کی گئیں وہ دس لاکھ ایکڑ کھیتوں کو یک جا کرنے میں کام یاب ہوئیں۔ یہ تمام کام یابی کسانوں کی اپنی رضامندی سے حاصل کی گئی جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہی کہ اگر کسانوں کو یہ یقین ہوجائے کہ آپس میں تعاون کرنا ان کے مفید ہی تو تحریک امدادِ باہمی کے نتائج بہت دوُر رس ہوسکتے ہیں۔ اشتمالِ اراضی کے فائدے کسانوں پر اس حد تک منکشف ہوچکے ہیں کہ اب اس مقصد کے لیے اتنی کثیر تعداد درخواستیں موصول ہوئی ہیں کہ اُن کی فوری تعمیل دشوار تر بنتی جارہی ہی۔ لیکن ہندستان کے کسانوں میں امداد باہمی کی تحریک اس حد تک کام یاب نہیں ہوئی کہ یہ زرعی پیداوار میں کسی قابلِ قدر اضافے کا موجب بن سکتے۔ البتہ اس تحریک کا بالواسطہ نتیجہ یہ ضرور ہوا ہی کہ ہندُستانی کسان کا احساس بے بسی کی حد تک زائل ہوگیا ہی اور وہ نئے طریقوں اور نئے خیالات کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہی۔ اگر ہندستان کے سیاسی لیڈر حکومت کی جاری کردہ اس تحریک کی سرگرم حمایت کرتے تو امدادِ باہمی کا یہ پہلو اور بھی نمایاں ہوسکتا تھا۔ شاہی زرعی کمیشن نے آج سے سولہ سال پہلے لکھا تھا کہ اگر ہندُستان میں امداد باہمی کی تحریک ناکام ہوگئی تو تو بھی ہندستان کی بہترین اُمنگوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ہندُستان کے سیاسی لیڈروں کی بے پروائی اور بھی افسوس ناک ہوجاتی ہی۔

زراعت اور علمی تحقیق

ہندستان میں زراعت کے متعلق علمی تحقیقات کی بنا لارڈ کرزن نے ڈالی۔ جنھوں نے سنہ ۱۹۰۱ء میں پوسا کے مقام پر شاہی زرعی ادارہ قائم کیا۔ اِس کے بعد ہندستان کے ہر صوبے میں تجرباتی اور مثالی کھیت قائم کیے۔ جہاں سرکاری افسر جدید آلاتِ کاشت اور نسبتاً زیادہ کارآمد فصلوں کے متعلق کسانوں کو معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ طریقے کافی حد تک کامیاب رہے ہیں اور اُن کی کامیابی کے راستے میں اگر کوئی شے حائل ہوئی ہو تو وہ کھیتوں کی محدودیت ہی۔ گندم، روئی اور کسی حد تک گنا چاول کی بہتر فصلیں تیار ہونے لگی ہیں اور بہتر فصلوں کی پیداوار رواج پکڑ رہی ہی جس سے لاکھوں روپے کسانوں کی جیب میں جا چکے ہیں۔ لیکن یہ ترقی بعض مقامات پر اگرچہ کافی نمایاں ہی لیکن اسے ہندستان گیر نہیں کہا جا سکتا۔ سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء کے اعداد و شمار کی رُو سے ہندستان کے تمام زیرِ کاشت رقبے میں صرف دسویں حصّے میں بہتر قسم کی فصلیں بوئی گئی تھیں۔ دُوسری پیداوار کے نئے طریقوں اور جدید آلاتِ کاشت کا پروپیگنڈا اگر بالکل ہی ناکام نہیں ہوا تو اُسے بہت ہی حقیر کامیابی حاصل ہوئی ہی۔

آب پاشی

حکومت کی کوششوں کو سب سے زیادہ کامیابی آب پاشی کے ذرائع کو وسعت دینے میں حاصل ہوئی ہی۔ ہندستان سے باہر کی دُنیا کو ان کوششوں کا بہت کم علم ہوا ہی۔ ایک صدی سے زائد عرصہ ہوا جب برطانوی انجینیروں نے ہندستان کے لاوارث ذرائع آب پاشی کو جن کی مدّتوں سے مرمّت نہیں ہوئی تھی دُرست کرنا شرُوع کیا۔ اس کے بعد وہ جدید ذرائع آب پاشی کی طرف متوجہ ہوئے اور انیسویں صدی کے نصف اواخر میں یہ سلسلہ کامیابی سے جاری رہا۔ لارڈ کرزن نے ان کوششوں کو اور مہمیز لگائی اور یہ حقیقت ہی کہ گزشتہ چالیس سال میں آب پاشی کی بے اندازہ اسکیموں کو کامیابی سے عملی جامہ پہنایا گیا ہی۔ ان میں بعض اسکیمیں اتنی دوُر رس ہیں کہ ساری دُنیا میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ مدراس میں تیور کے مقام پر جو بند باندھا گیا ہی وہ تین لاکھ ایکڑ نئی زمینوں کی مکمل اور ایک لاکھ ایکڑ زمین کی جزوی آب یاری کرتا ہی۔ نہروں کے دو جدید ترین سلسلے یعنی سکھر بیراج اور وادیٔ ستلج کی نہریں اِتنے بڑے علاقے کو پانی بہم پہنچاتی ہیں جو مصر کے کُل زیرِ کاشت رقبے کے برابر ہی۔ سکھر کی نہریں پچاس لاکھ ایکڑ زمین کو سیراب کرتی ہیں۔ اس میں تیس لاکھ ایکڑ زمین پہلے صحرا کی طرح بنجر تھی۔ وادیٔ ستلج میں بھی نہریں اسی پیمانے پر زمینوں کو سیراب کرتی ہیں۔ ہندُستان کے بڑے بڑے قطعاتِ ارض جو آج سے بیس یا تیس سال پہلے صرف بنجر علاقے تھے جن میں کانٹے دار جھاڑیوں کے علاوہ کچھ بھی پیدا نہ ہوتا تھا اور جو صرف خانہ بدوشوں کی گزرگاہ تھے آج اُن کا شمار ایشیا کے

[illegible]خیز ترین خطوں میں ہوتا ہے۔جہاں تن درست اور توانا کسان پچیس پچیس ایکڑ کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔اور خوب صورت دیہات میں
رہتے ہوئے اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ اُن کی کوششوں کو ایک نئی دُنیا کی تعمیر میں کافی دخل ہے۔اِن نوآباد اضلاع میں
[illegible] زراعت کے [illegible] کی بڑی مانگ رہتی ہے۔کھیتوں میں بہترین قسم کی گندم، کپاس اور گنا بویا جاتا ہے۔یہاں سنگتروں اور
کھجوروں کے باغ بھی اور بیل تن درست، توانا اور اچھی نسل کے ہیں۔پُرانے دیہات کے کچے گندے مکانوں اور تنگ و
تاریک گلیوں کی بجائے یہاں کشادہ گلی کوچے موجود ہیں۔مکانوں میں ہوا روشنی اور صفائی کا پورا پورا انتظام ہے اور صحنوں
میں پھولوں کی کیاریاں موجود ہیں۔اِن دیہاتوں سے قصبوں کی منڈیوں تک پختہ سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔اور ان منڈیوں میں
یہاں رُوئی، آٹے اور تیل کی ملیں بھی موجود ہیں۔نواحی علاقوں کی تمام زائد پیداوار بہ آسانی پہنچ جاتی ہے۔

ان خوش قسمت خطوں میں ایک نیا سُورج طلوع ہوچکا ہے۔وہاں زندگی سادہ ضرور ہے۔لیکن یہ فارغ البالی کی زندگی ہے۔
[illegible]مان پھل کھاتے ہیں اور گراموفون خرید سکتے ہیں۔ان کے دل میں نئی امنگیں پیدا ہوچکی ہیں اور ان کا معیارِ زندگی بھی نیا ہے۔یہ
تبدیلیاں بہت اہم ہیں اور پیداوار میں بھی قابلِ قدر اضافہ ہوگیا ہے۔لیکن یہ تمام ترقیات ہندستان کی وسعت کے مقابلے
میں ہیچ ہیں۔خوش حال برطانیہ پولینڈ کے افلاس کی تلافی نہیں کرسکتا اور ہالینڈ کے انڈے اور مکھن جنوبی اٹلی کے کسان
کی بھوک کو دور نہیں کرسکتے۔اسی طرح شمال مغربی ہندستان کی خوش حال نہری نوآبادیاں بنگال اور دکن کے لوگوں کا
معیار زندگی بلند نہیں کرسکتیں۔یہ نوآبادیاں کتنی ہی وسیع سہی لیکن سارے ہندستان کا تو وہ نہایت ہی قلیل حصّہ
ہیں۔برطانوی ہندستان کی ۲۲ کروڑ زیر کاشت زمین میں سے صرف چھ کروڑ ایکڑ کے لیے نہری پانی کا انتظام کیا گیا ہے۔نوآبادیاتی
زمین اس سے کہیں کم ہے۔جن علاقوں کو نہری پانی سے سیراب کیا جاتا ہے ان میں بیش تر علاقے ایسے ہیں جن کو پہلے کنووں یا تالابوں
سے سیراب کیا جاتا تھا اور وہاں پہلے بھی ضرورت سے زیادہ لوگ آباد تھے۔اس کے علاوہ جدید نہری نوآبادیوں میں بھی
خطرہ موجود ہے کہ موجودہ آبادی کو جو فائدے حاصل ہیں وہ دو تین نسلوں کے بعد جب وہاں کی آبادی بڑھ جائے گی ختم
ہوجائیں گے اس وقت بھی پُرانی آبادیوں میں تقسیم در تقسیم کا دور شروع ہوچکا ہے اور آبادی کی زیادتی کی وجہ سے گزر اوقات دشوار
ہوجاتی ہے۔

شدید تر کارروائی کی ضرورت

ان تمام کامیابیوں کے باوجود جو برطانوی انجنیروں کو حاصل ہوئیں یہ حقیقت ہے کہ ہندستان میں انسانی زندگی اگرچہ
[illegible]تا بہتر ہوگئی ہے لیکن اس میں کوئی بنیادی تبدیلی رُونما نہیں ہوئی۔تقریباً تمام ہندستان میں کسان ابھی تک پُرانے معاشی
[illegible] میں گرفتار ہیں۔حکومت کی کوششیں اتنی ہمہ گیر نہیں تھیں کہ ہندستانی کسان کو یکایک زندگی کے ایک نئے راستے پر

ڈال دیتیں۔ حکومت کی کوششوں کے محدود ہونے کا سبب یہ ہو کہ معاشی ترقی کی طرح ہندستان کے کروڑوں عوام کی [illegible] کو بدلنے کے لیے بھی جس قدر انسانی کوششوں اور سرمایے کی ضرورت تھی وہ حکومتِ ہند کی دست رس سے باہر تھا۔ حکومت ہند نے زراعت کی بار آوری میں اتنا اضافہ ضرور کیا کہ وہ بڑھتی ہوئی آبادی کی کفیل ہوسکے لیکن وہ ہندستان کے افلاس کا کوئی خاص تدارک نہیں کرسکی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ترقی کی رفتار کو بہت زیادہ تیز ہونا چاہیے تھا اور اس رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت ہو :-

(۱) زیادہ سرمایہ

(۲) تربیت یافتہ عملے کی کثیر تعداد۔

(۳) عوام کا سرگرم تعاون۔

حکومتِ ہند کو ان تینوں میں سے کوئی چیز بھی حاصل نہیں تھی۔

ہندستان کو جس فوری سماجی اور سیاسی انقلاب کی ضرورت ہو اس کا تجربہ اگر کسی ملک میں کیا گیا ہو تو وہ صرف رُوس ہو۔ رُوس قدرتی ذرائع کے معاملے میں ہندستان کے مقابلے میں زیادہ خوش قسمت ہو اور جب اس نے نئے تجربے کی ابتدا کی تو اُس کے قدرتی ذرائع کے مقابلے میں آبادی بھی زیادہ کثیر نہیں تھی۔ ہندستان کا مسئلہ اس سے کہیں زیادہ مشکل ہو۔ لہٰذا ایک غیر ملکی دفتری حکومت مطلوبہ تبدیلیاں رُونما نہیں کرسکتی تھی۔ بنیادی سماجی اور معاشی تبدیلیاں صرف حکومت کے حکم سے رونما نہیں ہوسکتیں۔ کسی وائسرائے کی ذہنی اُپج نہ تو ہندستان کو ایک صنعتی ملک بنا سکتی ہو اور نہ اس کے زرعی نظام میں انقلاب رُونما کرسکتی ہو کسی راہ نمائی کو قبول کرنے کی اُمنگ خود عوام میں موجود ہونی چاہیے۔ حکومت رُوس نے بڑی بے دردی سے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنایا لیکن اسے اپنے سرگرم حامیوں کی کثیر تعداد کی حمایت پر تو پورا پورا یقین تھا۔

ہندستان میں حکومت اور عوام کے درمیان سرگرم تعاون کی کمی ہو۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہو کہ بیش تر اوقات حکومت کو سرگرم عدم تعاون سے پالا پڑا ہو۔ اگر ہندستانی کسانوں کو اس بات پر آمادہ کرنا ہو کہ اپنی معاشی ترقی کے لیے سماجی اور مذہبی رسوم کو تبدیل کریں اور اپنے قدیمی طور طریقوں اور روایات کو بدل ڈالیں تو اس مقصد کے لیے ایک مجاہدانہ جذبے کی ضرورت ہو لیکن ایسی حکومت جس کی عنان غیر ملکیوں کے ہاتھ میں ہو اپنے خلاف تو مجاہدانہ جذبات پیدا کرسکتی ہو لیکن انھیں کسی اور مقصد کے لیے نہیں اُبھار سکتی۔ یہ ایک حقیقت ہو کہ بہت سے سرگرم اور پُرجوش عناصر جو سماجی اور معاشی اصلاح میں مصروف ہوسکتے تھے۔ اپنا تمام وقت حکومت کے خلاف سیاسی جنگ میں صرف کر دیتے ہیں۔

ہندستانی بالغ النظر لوگوں کو اس لیے موردِ عتاب ٹھیرانا کہ وہ سماجی اصلاح میں کوئی دل چسپی نہیں لیتے اور [illegible]

...نے صرف سیاست کو اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز بنا رکھا ہو بے سود ہو۔ موجودہ حالات میں اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ برنارڈ شا نے ایک جگہ لکھا ہو کہ "محکوم ملک سرطان کا مریض ہوتا ہو۔ وہ اس مرض کے علاوہ اور کسی چیز کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔ جب تک اس ملک کی قومیت کو بحال نہ کیا جائے وہ کسی مصلح، کسی فلاسفر اور کسی مبلغ کی بات نہیں سُن سکتا۔ ایسا ملک اپنی آزادی اور اپنے استقلال کے علاوہ اور کسی بات کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔"

ہندستان کے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے جو سکیم بھی تیار کی جائے گی۔ اُس کی کام یابی کے راستے میں یہ "سرطان کا مرض" حائل ہو جائے گا۔ جب تک اس مرض کا علاج نہیں کیا جاتا اس کا مریض اور کسی طرف متوجہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا پہلی ضرورت یہ ہو کہ ہندستان کے سیاسی مسئلے کو حل کیا جائے۔ برطانوی اقتدار کو طول دینا امن کو برقرار رکھنے کے لیے خواہ کتنا ہی مفید ہو لیکن ہندستان کی ترقی کے راستے میں ضرور رُکاوٹ ڈالے گا۔ اب برطانوی حکومت یقینی طور پر بانجھ ہو چکی ہو۔ اس کی موجودگی میں اب کسی بھی ترقی کا امکان نہیں۔ کیوں کہ یہ عوام کی تخلیقی قوتوں کو نہیں اُبھار سکتی اور نہ اُن سے کوئی فائدہ اُٹھا سکتی ہو۔ یہ تمام اہلیتیں صرف برطانیہ کی مخالفت میں ضائع ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا اس حقیقت کے باوجود کہ ہندستان کا بنیادی مسئلہ معاشی ہو اور اسی مسئلے کا کروڑوں جاہل عوام کی زندگی سے تعلق ہو اسے اس وقت کام یابی سے حل نہیں کیا جا سکتا جب تک پہلے سیاسی مسئلہ حل کر کے ہندستان کو آزادی نہیں دے دی جاتی۔

مسائل حاضرہ (ہندستان) :-

سب کے لیے غذا

از ———— پروفیسر آر-وی-راؤ، ام-اے-پی-ایچ-ڈی

گزشتہ نومبر میں کوپن ہیگن کے مقام پر اقوامِ متحدہ کی غذائی اور زرعی انجمن کا اجلاس ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس سے پہلے کے اجلاسوں کے برخلاف اس بار کانفرنس کی فضا جھگڑے اور سازش سے پاک تھی۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ عالم گیر غذائی اور زرعی انجمن قائم کرنے کا تصور سب سے پہلی بار صدر روزولٹ نے پیش کیا تھا۔ اور ہاٹ اسپرنگز کے مقام پر روزولٹ کے زمانے میں جو کانفرنس ہوئی تھی وہ عالم گیر پیمانے پر غذائی اور زرعی مسائل کو حل کرنے کی پہلی کوشش تھی۔ اسی کانفرنس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ہر فرد کے لیے وافر اور صحت بخش غذا یقیناً حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہاٹ اسپرنگز کے بعد سے واقعاتِ عالم نے کئی رنگ بدلے اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ غذا کے سلسلے میں سب سے بڑا حال ہندستان کا ہے۔ چار سال کے مختصر سے عرصے میں اس بدقسمت ملک کو دو بار قحط اور غذائی قلت کا سامنا کرنا پڑا۔

ہمارا خیال ہے کہ ہندستان میں جس چیز کی طرف سب سے کم توجہ دی گئی ہے وہ غذا کی منصوبے بندی ہے۔ ہندستان کی زمین زرخیز ہے اور یہاں دُنیا میں سب سے زیادہ مویشی پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہیں سب سے زیادہ غربت اور مفلسی کا بھی دور دورہ ہے۔ ایک طرف تو دنیا میں غذا کے عظیم ذخیرے موجود ہیں اور دوسری طرف ہندستان میں لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ غذائی قلت محض جنگ کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئی ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ امن کے زمانے میں بھی ہندستان غذائی مسئلے سے دوچار رہا ہے۔ لیکن ہمیں اس صورتِ حال کا اندازہ اس وقت ہوا جب بنگال قحط کے

پیچھے گرفتار ہو چکا تھا۔ ہندستان میں غذائی پیداوار بڑھانے کی مہم جو شروع کی گئی تو محض بنگال کے قحط کے زیر اثر۔ یعنی اگر وہ ہولناک سانحہ نہ ہوتا تو خوابیدہ ہندستان کو اپنے بگڑتے ہوئے غذائی صورتِ حال کا احساس بھی نہ ہوتا اور نہ غذائی اشیا کی پیدائش بڑھانے کی تجویز عمل میں آتی۔ گرگیری کمیٹی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندستان میں اگر کئی سال کا اوسط نکال کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ملک کی مجموعی ضرورت سے کچھ کم ہی غذا پیدا ہوتی ہے۔ یہاں پر ایک اور بات کا خیال رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ یہاں ضرورت سے مراد ہے ادنا ترین ضرورت۔ صحت کے نقطۂ نظر سے ہر فرد کو جتنی غذا ملنی چاہیے اُس کے لحاظ سے دیکھا جائے تب تو غذا کی پیداوار ہندستان میں اور بھی کم معلوم ہوگی۔ سرکاری اور غیر سرکاری تحقیقات سے اس حقیقت کا ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ ہندستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ہمیشہ قحط کے خطرے سے دوچار رہتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس اپنی زراعت سے متعلق وافر اعداد و شمار بھی موجود نہیں ہے جن پر بھروسہ کیا جا سکے۔ چناں چہ شروع میں حکومتِ ہند کو یہ صحیح صحیح نہیں معلوم ہو سکا کہ ملک میں کتنی غذا کی قلت ہے۔

ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی کا اندازہ ہے کہ ہندستان میں صرف اُتنی ہی غذائی اشیا پیدا ہوتی ہیں جو کہ ۳۳ کروڑ ۷۰ لاکھ افراد کے لیے کافی ہو سکے، حالاں کہ ہندستان کی آبادی چالیس کروڑ ہے۔ (اس طرح گویا ۶ کروڑ ۳۰ لاکھ افراد کو دوسروں کے حصّے سے غذا ملتی ہے۔) ہندستان کی آبادی میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں ہندستان کی آبادی ۲۸ کروڑ تھی اور ۱۹۴۱ء میں ۳۸ کروڑ ۹۱ لاکھ، اندازہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں آبادی ۴۵ کروڑ ہو جائے گی۔

جہاں تک ہندستانی غذا کے قوت بخش ہونے کا سوال ہے وہاں بھی ہمیں مایوسی ہوتی ہے اس لیے کہ اس میں وافر مقدار میں پروٹین نہیں ہوتی اور پروٹین والی غذائی اشیا کی پیدائش میں اضافہ اور توسیع نہیں کی جا رہی ہے۔ ہندستانی غذا میں اناج کو جو اتنی اہمیت حاصل ہے تو وہ دراصل غربت کی نشانی ہے۔ جن غذاؤں سے جسم کی حفاظت ہوتی ہے اور آدمی امراض کا مقابلہ کر سکتا ہے—— مثلاً دودھ، پھل، سبزی وغیرہ —— ان کا استعمال بہت کم ہے، فی کس دودھ کا استعمال صرف ۷ اونس روزانہ ہے۔ سر جان میگاؤ نے بتایا ہے کہ ہندستان میں صرف چالیس فی صدی لوگوں کو مناسب غذائیت میسّر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کی قوتِ خرید بہت کم زور ہے۔ چناں چہ وہ قوت بخش غذائی اشیا نہیں خرید سکتے۔ غرض ملک میں غذا سے متعلق جو صورتِ حال ہے وہ بے حد غیر اطمینان بخش ہے۔ وسیع قومی پیمانے پر غذائی مہم چلانے کی ملک میں ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے۔ بدقسمتی سے حکومتِ ہند کو اس وقت تک اس چیز کا احساس نہیں ہوا جب تک حالات نے نازک صورت اختیار نہیں کر لی۔

غذا کی منصفانہ تقسیم

جنگ کے بعد غذائی صورتِ حال بہتر ہونے کی بجائے اور خراب ہو گئی ہے اور ڈر یہ ہے کہ ملک میں بہت بڑے پیمانے پر قحط نہ پھیل جائے۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ غذا کی سپلائی کے سلسلے میں مفتوح ملکوں یعنی جرمنی [illegible] کی حالت بھی بہت خراب ہے اور اُن کا ہمیں خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ وہاں کافی عرصے تک ابھی غذائی اشیا

بہت کم پیدا ہوں گی۔ لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کم غذائی کی سب سے زیادہ شکایت ہندُستان جیسے ایشیائی ملکوں میں پائی جاتی ہو۔ جب تک دُنیا بھر کے لیے کوئی ایسی غذائی پالیسی اختیار نہ کی جائے گی جس کا مقصد غذائی ذرائع وسائل کی منصفانہ تقسیم ہو اُس وقت تک ہندُستان میں بھی غذا سے متعلق نازک صوُرتِ حال قائم رہے گی۔ دُنیا کے دوُسرے ملکوں کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ہندُستان نے گزشتہ جنگ میں نہ صرف اپنے مادّی ذرائع اور وسائل سے مدد کی تھی بلکہ فتح کے لیے جانوں کی بھی قربانی کی تھی۔ انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جنگ کے زمانے میں گیہوں کے آٹے کی خوراک اور بڑھ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان ملکوں میں بہت غور وخوض کے بعد غذا پیدا کرنے اور اس کو خرچ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور اس پر عمل کیا گیا۔ چنانچہ اس وقت دوسری قوموں کا فرض ہو کہ وہ ہندستان کی مدد کریں اور یہاں کی غذائی صوُرتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ کناڈا کے سیاسی لیڈر مسٹر گورڈن نے کہا ہو کہ جس ملک میں غذا کی قلّت ہو گی وہاں فسادات اور خون خرابے کا ہونا ضرورُی ہو۔ اگر امریکہ اور انگلستان ہندُستان کو اپنے مال کا گاہک سمجھتے ہیں تو اُنھیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ گاہک جب دولت مند ہوگا تب ہی اُن کا مال زیادہ فروخت ہوگا۔ ہندستان کو قحط کا شکار بنتے ہوئے دیکھ کر دُنیا کی کسی قوم کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

حکومت ہند نے راشن میں کمی کر دی ہو لیکن یہ کارروائی خطرے سے خالی نہیں ہو اس لیے کہ موجودہ راشن سے ہمارے جسم کو بس اتنی ہی غذائیت اور طاقت حاصل ہو سکتی ہو جس سے کہ ہم امراض کا مقابلہ کر سکیں لیکن اس سے ہماری صحت کی ترقی نہیں ہوسکتی۔ کم غذائیت کی یہ سب سے آخری حد ہو اور ہمارے موجودہ راشن کی مقدار اسی پر مبنی ہو۔ ضرورت ہو کہ حکومت ہند جلد از جلد ہندستان کے کروڑوں عوام کو کافی غذا مہیا کرنے کے لیے کوئی کارروائی کرے۔

غذا کے منصوبے بندی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ملک کی ضرورت کے مطابق غلّہ پیدا ہو، لوگوں کو متوازن قسم کی غذا میسّر ہو اور عوام کی قوتِ خرید میں اتنا اضافہ کیا جائے کہ ہر فرد کافی اور متوازن قسم کی غذا حاصل کر سکے۔ ہمارے سامنے وادی ٹینیسی کی روشن مثال موجود ہو اور ہمیں اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔ جو زمینیں بے کار پڑی ہوئی ہیں ان میں کاشت کر کے غلّہ اور سبزی پیدا کی جاسکتی ہو۔ آب پاشی کا معقول انتظام کر کے فی ایکڑ زمین کی پیداوار بڑھائی جاسکتی ہو۔ بہتر کھاد استعمال کر کے بہتر فصلیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔

کچھ تجویزیں

راشن بندی کے لیے گاؤں سے غلّہ جمع کرنے کا جو طریقہ اس وقت رائج ہو اس کی بھی اصلاح کرنے کی ضرورت ہو۔ پھر جمع شدہ غلّے کی منصفانہ تقسیم بھی ہونی چاہیے۔ پروپیگنڈا اور تعلیم کے ذریعے بھی حکومت لوگوں کو غذائی صوُرتِ حال کو بہتر بنانے کے کام میں مدد کرنے کے لیے آمادہ کر سکتی ہو۔ مثلاً لوگوں کو بتایا جائے کہ ہاتھ سے کوٹا اور چھانٹا ہوا چاول اگر ہم استعمال کریں تو چاول کی سپلائی میں دس فی صدی کا اضافہ ہو سکتا ہو، اس لیے کہ مشین میں کٹنے

اور چھانٹنے سے چاول کا دس فی صدی وزن گھٹ جاتا ہو۔ اسی طرح اگر تیل نکالنے کی چھوٹی صنعت کی توسیع کی جائے تو ہمارے مویشی کے لیے زیادہ کھل پیدا ہوگی اور مویشی سے زیادہ مقدار میں دودھ دست یاب ہوسکے گا۔ دودھ کے متعلق کہا گیا ہو کہ وہ سب سے مکمل غذا ہو۔

حکومت کو یہ بھی چاہیے کہ خاص خاص علاقوں کو جو غلہ نہیں پیدا کرتے مجبور کرے کہ وہ غیر غذائی اشیا کی بجائے غذائی اشیا پیدا کریں۔ ایسی حالت میں حکومت کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ کاشت کار کے لیے غلے کی ایک خاص قیمت کا تعین کر دے تاکہ وہ خسارے میں نہ رہے۔ بچوں اور حاملہ اور بچے والی عورتوں کے لیے رعایتی قیمت پر دودھ مہیا کیا جائے۔ حکومت کا فرض ہو کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ لوگوں کو ایک خاص معیار کی غذا کے ملنے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے۔ ایسی غذا جس سے اُن کی صحت قائم رہے۔ غذا کے لیے جو پلان تیار ہو اُسے لازمی طور پر عام معاشی توسیع و ترقی کے پروگرام کا ایک حصہ ہونا چاہیے اور اس عام معاشی پلان کے تحت ہر فرد کے لیے روزگار کا دروازہ یکساں طور پر کھلا رہے گا۔

غذا کا مسئلہ جنگ اور امن کا مسئلہ ہی دُنیا کے امن اور تحفظ کا تقاضا ہو کہ ہندستان میں قحط کے روک تھام کی کوشش کی جائے اس لیے کہ لڑائی کی ابتدا کا سب سے زیادہ خطرہ قحط زدہ ملک ہی میں ہوتا ہو۔ دُنیا کے جو ممالک امن کے خواہش مند ہیں اور اس کا اعلان بھی کرتے آئے ہیں اُن کا فرض ہو کہ وہ تمام ملکوں کے درمیان منصفانہ طور پر غلّے کی تقسیم کرائیں اور ہندستان کو قحط کے خطرے سے بچانے کی کوشش کریں۔

جنگ کے زمانے میں تو ناکارہ افسر شاہی کے ہاتھوں مزید غلہ پیدا کرو کی مہم بالکل ناکام یاب ثابت ہوئی لیکن اب، جب کہ صوبوں میں عوامی وزارتیں قائم ہیں اور مرکز میں قومی حکومت با اقتدار ہو، غذائی مسئلے کو حل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے۔ خود لوگوں کو بھی چاہیے کہ اپنی ضروریات کو کم کرنے کی کوشش کریں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہو کہ خوش حال ملکوں کی مدد کے بغیر ہندستان اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہو۔ پھر بھی یہ ظاہر ہو کہ اگر باہر سے مدد نہیں آئی تو ہندستان خود اپنے پانو پر کھڑے ہونے کی کوشش کرے گا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد ممبر زراعت نے اس بات پر زور دیا ہو کہ ہمارے سامنے فوری کام یہ ہو کہ غذائی اشیا کی پیداوار بڑھائی جائے۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ہمارے لیے محض اتنا کافی نہیں ہو کہ غذا کافی مقدار میں مہیا ہو بلکہ یہ بھی کہ غذا اچھی اور قوت بخش ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہو۔ یہ ایک ایسا کام ہو جس میں مختصر عرصے کے پروگرام کے علاوہ طویل عرصے کے لیے بھی پروگرام بنانا ہوگا۔ اس وقت فوری طور پر پیداوار بڑھانے کے لیے تمام لوگوں کے تعاون اور اشتراکِ عمل کی ضرورت ہو۔

یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف ہندستان اور دوسرے کئی ملک تو قحط کا سامنا کر رہے ہیں اور فوری طور پر غذائی پیداوار بڑھانے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور دوسری طرف عالم گیر غذائی اور زراعتی انجمن کا ڈائرکٹر جنرل سر جان بوائڈ اور بار بار یہ اعلان کر رہا ہے کہ مستقبل قریب میں غذائی اشیا کی قیمتیں بالکل گھٹ جائیں گی، ساتھ ہی وہ اس کی روک تھام کی اہمیت پر بھی زور دے رہا ہے۔

بہر حال جو کچھ بھی ہو یہ اچھا ہوا کہ اس سلسلے میں ایک عالم گیر غذائی بورڈ قائم کر دیا گیا ہے۔ ہندستان میں بھی زرعی اشیا کی قیمتوں میں استحکام پیدا کرنے کے لیے انتظامات ہو رہے ہیں تاکہ جب قیمتیں گھٹنے لگیں تو کسان مشکلات کا سامنا نہ کریں قیمتوں کے استحکام سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ان ملکوں میں جو کہ پچھڑے ہوئے ہیں اور جہاں قحط اور کم غذائی عام ہے غذائی پیداوار کا کام زوروں سے آگے بڑھے گا۔

لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ عوام تک کافی غذا پہنچانے کے لیے محض اتنا کافی نہیں ہے کہ غذائی پیداوار بڑھا دی جائے۔ ہاٹ اسپرنگز کانفرنس میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ قحط اور ناکافی غذائیت کی پہلی وجہ لوگوں کی مفلسی اور غربت ہے جب تک قومیں اور افراد اتنے دولت مند نہ ہوں کہ غذائی اشیا خرید سکیں، مزید غذا پیدا کرنا قطعی لاحاصل اور بے معنی ہوگا۔ چناں چہ قوت خرید پیدا کرنے کے لیے پوری معیشت کو توسیع و ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ اگر تمام ملکوں میں روزگار موجود ہو اور بے کاری کا نام و نشان بھی نہ ہو، صنعتی پیدایش زوروں پر ہو، استحصال کا خاتمہ ہو جائے اور قومی اور بین اقوامی سرمایہ کاری اور سکہ جات کا باقاعدہ انتظام ہو اور بین اقوامی لحاظ سے معاشی توازن قائم ہو تو جو غذائی اشیا پیدا کی جائیں گی وہ سبھوں تک پہنچ سکیں گی۔ اگر عالم گیر غذائی بورڈ یہ مقصد حاصل کرنے میں کام یاب ہو جائے تو پھر کیا کہنے ہیں۔

اب فرد کو (چاہے وہ آجر ہو یا صارف) خود مختار اور بے لگام معاشی طاقتوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ انسان کو غربت اور مفلسی کے دلدل سے نکالنے کا مسئلہ دراصل ایک نیا معاشی ڈھانچہ تیار کرنے کا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے بڑے پیمانے پر منصوبے بندی اور تنظیم کی ضرورت ہے۔ اس بات پر ڈاکٹر راجندر پرشاد ممبر زراعت نے کافی زور دیا ہے۔ ہندستان سے غربت کے دور ہونے سے پہلے ہمیں بے شمار اندرونی اور خارجی رکاوٹوں سے گزرنا ہے۔ ضرورت ہے کہ فرقے وارانہ انتشار رفع ہو اور تمام فرقے ہندستان سے غذائی قلت کو دور کرنے کے کام میں اشتراکِ عمل سے کام لیں۔ زراعت اور صنعت کو جدید شکل دینے کے لیے ہمیں اشیائے اصل اور فنی امداد کی ضرورت ہے۔ وادی ٹینیسی کی مثال کے پیشِ نظر ہندستان کو بھی چاہیے کہ اپنی دریائی وادیوں کو اچھی طرح کام میں لائے۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اب تک ان اہم کاموں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ چوں کہ کوئی قومی حکومت برسرِ اقتدار نہیں تھی اس لیے بنگال کے قحط سے اچھی طرح

نہیں حاصل کیا جا سکا۔ اس وقت ملک کے کئی حصوں میں قحط کا ڈر ہی۔ لیکن مرکز میں قومی حکومت قائم ہی جس کے سامنے قومی غذائی پالیسی کا نصب العین موجود ہی۔ ایک اور چیز کی ضرورت ہی اور وہ ہی کاشت کاروں کی ہمت افزائی کرنا۔ اس کا طریقہ یہ ہی کہ کاشت کاروں کو غلے کی زیادہ قیمت دی جائے۔ لیکن آیا ہم اس طریقے پر عمل کر سکتے ہیں یا نہیں یہ ایک علاحدہ بحث کی حیثیت رکھتا ہی۔

ہندستان میں نئی کپڑے کی ملیں

مرکزی اسمبلی میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوے مسٹر راج گوپال اچاریہ نے فرمایا کہ ہندستان میں ۱۲۵ نئی کپڑے کی ملیں کھولنے کی تجویز ہی۔ مختلف صوبوں میں کس طرح یہ ملیں تقسیم کی جائیں گی اس کا شمار مندرجہ ذیل ہی:۔

بمبئی	۲۴	۳۵۲۰۰۰	اسپنڈل
مدراس	۱۶	۳۲۵۰۰۰	"
بنگال	۱۲	۲۶۴۰۰۰	"
یو۔پی	۱۵	۴۳۷۰۰۰	"
بہار	۶	۱۵۱۰۰۰	"
سی۔پی اور برار	۴	۱۱۹۰۰۰	"
اڑیسہ	۳	۷۵۰۰۰	"
سندھ	۴	۱۰۰۰۰۰	"
ریاستیں	۳۲	۷۰۸۸۰۰	"

اِس وقت ہندستان میں ۴۱۷ کپڑے کی ملیں چل رہی ہیں۔

نظری معاشیات:-

جنگ اور سرمایہ داری

از ——————— موریس ڈوب

سرمایہ داری کوئی ایسا نظام نہیں جسے ایک ہی بار ہمیشہ کے لیے ڈھال لیا گیا ہو یہ نظام ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ یہ بجائے خود پیدا ہوا ہے ایک پیچیدہ قسم کے تاریخی ارتقا کی چنانچہ تاریخی ارتقا کے ساتھ وہ خود بھی بدلتا رہتا ہے۔ ہر دس بیس سال کے بعد اس میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ملک بہ ملک بھی اس کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ ہر ملک کی سرمایہ داری وہاں کے مخصوص حالات کے مطابق اور تاریخی ماحول کے تحت مختلف شکل رکھتی ہے۔ سرمایہ داری سے اشتراکیت کی طرف جو تبدیلی ہوتی ہے وہ بھی ایک پورے تاریخی دور کی حامل ہوتی ہے۔ جن جن منازل سے اس تبدیلی کو گزرنا پڑتا ہے اُن کا تعین بھی ہر ملک کے اندرونی حالات ہی کرتے ہیں پھر خارجی دنیا سے اس ملک کے جو تعلقات ہوتے ہیں اُن کا بھی اس میں ہاتھ ہوتا ہے۔ کسی ملک میں کسی خاص زمانے میں سرمایہ داری کس منزل پر ہے اس کو سمجھنے کے لیے اور اس کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لیے مندرجہ بالا حقائق کو اچھی طرح ذہن میں واضح کر لینا ضروری ہے۔ چنانچہ ذیل میں ہم اُن تبدیلیوں کا مطالعہ کریں گے جو سرمایہ داری کے نظام میں جنگ کے زمانے میں پیدا ہوئیں۔

موجودہ زمانے کی جنگ میں جو حالات پیدا ہوتے ہیں اُن کے تحت تبدیلیوں کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ اس قدر تیز کہ ہمارے لیے یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ تبدیلیاں ہمیں کہاں لیے جا رہی ہیں۔ ان میں سے کچھ تبدیلیاں دائمی ہوتی ہیں جو لازمی طور پر سرمایہ داری کے نظام کو جنگ سے پہلے کے مقابلے میں کچھ بدل دیتی ہیں اور کچھ تبدیلیاں جنگی حالات کی مجبوریوں کے

باعث پیدا ہوتی ہیں اور دائمی نہیں ہوتیں۔ ان تبدیلیوں کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جنگی معیشت کا ایک حصہ ہیں اور امن کے زمانے کی سرمایہ داری کا حصہ نہیں بن سکتیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ موجودہ زمانے میں امن اور جنگ کے درمیان کوئی صاف اور سیدھی سی لکیر نہیں کھینچی جا سکتی۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ معاشی اور سیاسی دونوں لحاظ سے بعض ایسی چیزیں جنھیں صرف جنگ کی پیداوار کہا جاتا تھا امن کے زمانے میں بھی برقرار رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر جرمنی کی فاشستی معیشت جنگ چھڑنے سے کئی سال پہلے وجود میں آ چکی تھی اور اس کے اندر ایسی خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں جو صرف جنگ کے زمانے کی معیشت سے وابستہ ہوتی ہیں۔

گزشتہ جنگ میں سرمایہ داری کے نظام میں جو پہلی اہم تبدیلی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ سرمایہ داری اب تیزی کے ساتھ ریاستی سرمایہ داری کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یعنی ریاست اور صنعت کے درمیان گہرے رشتے اور تعلقات قائم ہو رہے ہیں۔ (ریاست بھی دراصل بڑے بڑے سرمایہ داروں ہی کا ایک آلۂ کار ہوتی ہے) یہ تبدیلی اس لیے ہوئی کہ جنگ کے زمانے میں صنعت کا پچاس فی صدی سے زیادہ حصہ ریاست کی ضرورتیات اور اُس کی فرمائشوں پر لگا دیا جاتا ہے اور عام بازار کی ضرورتیات کو صنعتیں بہت کم پورا کرتی ہیں مثلاً انگلستان میں زیادہ تر صنعتی طاقت سپلائی کی وزارت یا بحری وزارت وغیرہ کی فرمائشیں پوری کرنے میں لگ جاتی ہیں۔ چیزوں کی پیدائش کا نظام سرمایہ داروں ہی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ لیکن ریاست کی حیثیت چوں کہ خریدار کی ہوتی ہے اس لیے وہ صنعتوں پر اپنی کچھ نگرانی قائم رکھتی ہے اس لیے کہ ان صنعتوں سے جنگی سامان مہیا ہوتا ہے۔ ریاست صنعتوں کی کارکردگی اور قیمتوں پر بھی کنٹرول رکھتی ہے۔ پھر ریاست کچے مال کی راشن بندی کے ذریعے بھی صنعتوں کو اپنے زیرِ اختیار رکھتی ہے۔ ریاست لائسنوں کے ذریعے مختلف صنعتوں کے درمیان کچے مال کی تقسیم کا انتظام کرتی ہے۔ جنگ کے زمانے میں نئے کارخانوں کے قیام پر بھی ریاست کا اختیار ہوتا ہے۔ اور بھی بہت سے طریقے ہیں جن سے ریاست صنعتوں کی نگران بنی رہتی ہے۔ جو صنعتیں عام بازار کے لیے چیزیں پیدا کرتی ہیں ان پر بھی ریاست کا کچھ نہ کچھ اختیار قائم ہو جاتا ہے۔ مثلاً جنگی ضرورتیات کی پیدائش بڑھانے کے لیے ریاست کچھ ایسے فرموں کو بند کر سکتی ہے جو شہری ضرورت کی چیزیں مہیا کرتے ہیں تاکہ اس طرح جو مزدور بے کار ہو جائیں ان کو فوراً جنگی صنعتوں میں لگا دیا جائے۔ اس طرح جنگی سامان کے پیدا کرنے میں پہلے سے زیادہ کارخانے لگ جاتے ہیں۔ اور کچا مال شہری چیزیں پیدا کرنے کی بجائے جنگی صنعتوں کے کام آنے لگتا ہے۔ غرض انفرادی اور ذاتی فرموں کو جنگی مفاد کے ماتحت کر دیا جاتا ہے اور پورے نظام کے مفاد کے پیشِ نظر خاص خاص صنعتوں اور فرموں کے مفاد کو دبا دیا جاتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ریاست اپنے کنٹرول اور نگرانی کو عمل میں لانے کا کام بڑے بڑے اجارہ داروں اور سرمایہ داروں ہی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیتی ہے یعنی ریاست اگر سرمایہ داری کے نظام پر کنٹرول رکھتی ہے تو سرمایہ داروں ہی کے ذریعے مثلاً کچے

مال پر سرکاری کنٹرول میں جو اسٹاف ہے وہ بڑی بڑی اجارہ دار انجمنوں ہی کا اسٹاف ہے۔ اگر کسی خاص صنعت میں ریاست جب کی پیدائش تیز کرنا چاہتی ہے تو اس سے متعلق تمام اسکیمیں اس صنعت کے جو فرم قائم ہیں انھیں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ریاستی سرمایہ داری دراصل اجارہ دارانہ سرمایہ داری ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے جس میں اجارے دار جماعتیں سرکاری مدد سے کسی مخصوص صنعت کو اپنے قبضے میں کر لیتی ہیں اور اس صنعت سے متعلق چھوٹے چھوٹے فرموں پر اُن کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔

جن ملکوں میں جمہوری حکومت قائم ہے وہاں جنگ کے زمانے میں ایک اور تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور وہ یہ کہ مزدور طبقے کی طاقت اور اثر میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ برطانیہ یا امریکہ اور فاشسٹ ملکوں کے درمیان یہی فرق رہا ہے۔ جمہوری ملکوں میں بے کاری تقریباً دور ہو گئی ہے اور جتنے کام کرنے والے ہیں اُن سے زیادہ روزگار مہیا ہیں۔ مزدوروں کی انجمنوں کی رکنیت بہت بڑھ گئی ہے اور اُن کے اور حکومت کے درمیان تبادلۂ خیالات اور باہمی مشورے کا سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ مزدور انجمنوں کے نمائندوں سے نگرانی کے کام میں مدد لی جاتی ہے اور انھیں اس سلسلے میں کچھ اختیارات بھی حاصل ہیں مثال کے طور پر انگلستان کے علاقائی پیداوار کے بورڈ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ چوں کہ مزدور طبقے کا اثر قومی کاموں میں بڑھتا جاتا ہے اس لیے اُس نے دوسری سماجی جماعتوں مثلاً فنی ماہروں، پیشہ وروں اور متوسط طبقے کے دوسرے عناصر سے اپنے تعلقات مضبوط کر لیے ہیں۔
مزدور طبقے کی تنظیم بھی زیادہ پھیل گئی ہے ان کی ڈسپلن میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کا اتحاد اور سیاسی تجربہ بھی بڑھ گیا ہے۔

غرض جنگ کے زمانے میں دو قسم کی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں یا تو پیدائش کے نظام پر اجارہ دارانہ سرمایہ داری کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتی یا خود اجارہ دارانہ سرمایہ داری پر جمہور کی نگرانی اور اختیار قائم ہوے۔ ان دونوں باتوں کا انحصار اس بات پر ہے کہ جنگ کے زمانے میں مزدور طبقے کی تنظیم اور طاقت میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔ اگر اضافہ نہیں ہوا ہے تو پیدائش کے نظام پر سرمایہ داروں کا قبضہ بڑھ جائے گا اور اگر مزدوروں نے اپنی تنظیم مضبوط کر لی ہے تو خود سرمایہ داری اور اجارہ داری پر جمہور کی نگرانی قائم ہو جائے گی۔ موجودہ جنگ میں کسی ملک میں سرمایہ داری کس حد تک بدلی ہے اور کس سمت میں بدلی ہے اُس کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس ملک میں مزدوروں اور ترقی پسند طاقتوں نے جنگ کے زمانے میں کیا کیا ہے اور فاشسٹ طاقتوں کے خلاف جد و جہد کرنے کے سلسلے میں انھوں نے اپنی تنظیم اور طاقت کو آگے بڑھایا ہے یا نہیں۔ اس بنیادی حقیقت کی روشنی میں ہم اُن تبدیلیوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں جو مختلف ملکوں میں سرمایہ داری کے نظام میں پیدا ہوئی ہیں۔

معاشی صورتِ حال :-

(۱) غلّہ

(۲) زرعی قرض داری

(۳) کوئلہ کمیٹی کی رپوٹ

(۴) مزدوروں کی حالت

(۵) کنیڈا اور ہندستان وغیرہ

غلّے کے لیے سرکاری امدادی رقم

گزشتہ نومبر میں حکومتِ ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ دوسرے ملکوں سے جو غلہ ہندستان آ رہا ہی اُس کی خرید کے لیے حکومت کی طرف سے امدادی رقم دی جائے۔ تاکہ باہر سے آنے والے غلّے کی بڑھی ہوئی قیمت کا ہندستان کی قیمتوں پر بُرا اثر نہ پڑے اس لیے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں غلّے کی قیمت درآمدی غلّے کی قیمت کے مقابلے میں کم ہی۔ چناں چہ اس سلسلے میں حکومت کو سنہ ۱۹۴۶ء کے لیے تقریباً ۱۲ کروڑ رپے خرچ کرنے پڑیں گے۔ حکومت کا یہ فیصلہ یقیناً اچھّی نظروں سے دیکھا جائے گا اس لیے کہ اگر امدادی رقم کے ذریعے باہر سے آنے والے غلّے کی قیمت کو کم نہ کیا گیا تو عام لوگوں کی حالت پر بُرا اثر پڑے گا جو جنگ کے زمانے میں بڑھی ہوئی قیمتوں کے باعث پہلے ہی سے کافی پریشان ہیں اگر ایسا نہ کیا جاتا تو صوبوں میں جو آج قیمتیں رائج ہیں اُن کا بھی توازن بگڑ جاتا۔

زرعی قرض داری

ریزروبنک کے زرعی قرض داری کے محکمے کی طرف سے صوبہ مدراس کی دیہی قرض داری کے سلسلے میں تحقیقات کی گئی ہی۔ یہ تحقیقات ڈاکٹر بی۔ وی نرائن سوامی نائڈو کے ذریعے دسمبر ۱۹۴۴ء سے شروع ہوئی اور اب رپوٹ منظرِ عام پر آگئی ہی۔ ریزروبنک نے اس لیے یہ تحقیقات کرائی ہی کہ اس بات کا پتا چلایا جاسکے کہ جنگ کے زمانے میں بڑھی ہوئی قیمتوں کا زرعی قرض داری پر کیا اثر پڑا ہی۔ ڈاکٹر نائڈو نے جو رپوٹ پیش کی ہی اس سے پتا چلتا ہی کہ دیہاتیوں میں کسان اسی طرح قرضوں کے بوجھ کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ ڈاکٹر نائڈو نے اس بات پر زور دیا ہی کہ اس قرض داری کو دور کرنے کے لیے مؤثر کارروائی کی جائے۔ مثلاً امدادِ باہمی کے تحت کاشتکاری شروع کی

کی جائے۔ کھیتوں کو اس طرح تقسیم ہونے سے روکا جائے کہ وہ بہت چھوٹے چھوٹے ہو کر آمدنی اور اچھی کاشت کا ذریعہ نہ ہیں امداد باہمی کے تحت جو قرضے کسانوں کو دیے جاتے ہیں اُن کو منظم اور صحیح طریقے سے کام میں لانے کا انتظام کیا جائے لگان سے متعلق جو قانون ہیں اُن کی اصلاح کی جائے، آب پاشی کا بہتر انتظام کیا جائے، اور زرعی انکم ٹیکس بٹھایا جائے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر مانڈو نے دو تین اور باتوں پر زور دیا ہے۔ قیمتوں کو مستحکم کرنے کی کوشش کی جائے، زمینداری ختم کی جائے اور غلے کے انشورنس کا انتظام کیا جائے۔

کوئلہ کمیٹی کی رپورٹ

دسمبر ۱۹۴۵ء میں حکومتِ ہند کی طرف سے ایک کوئلہ کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس کے سامنے دو مقاصد رکھے گئے تھے۔ اب تک مختلف کوئلہ کمپنیوں نے وقتاً فوقتاً جو تجویزیں پیش کی ہیں اُن پر نظرِ ثانی کرنا۔ اور آج کل کوئلے کی صنعت سے متعلق جو مسئلے ہیں اُن پر غور و خوض کرنا مثلاً اعلا درجے کے کوئلے کی حفاظت کا انتظام، کوئلے کی کانوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی روک تھام، نئی کانوں کی دریافت اور کھدائی، کوئلے کی قیمتوں کا استحکام وغیرہ وغیرہ۔

اس کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں مختلف تجویزیں رکھی گئی ہیں ایندھن اور قوت کا ایک نیا مرکزی محکمہ کھولا جائے، ایک قومی کوئلہ کمیشن مقرر کیا جائے جو ریلوں کے کوئلہ کی کانوں کا انتظام اور ملکیت اپنے ہاتھوں میں لے لے، بنگال اور بہار میں معدنیات کے حقوق ریاست حاصل کرلے تاکہ آگے چل کر کوئلے کی صنعت کو قومی ملکیت بنانے میں دقت نہ ہو۔ کمیٹی کی رائے میں ۱۹۵۶ء تک ہندستان میں ...... ۳۹ ٹن کوئلے کا خرچ بڑھ جائے گا۔ آج کل کوئلے کا خرچ ...... ۳۰ ٹن ہے یہ خرچ اس لیے بڑھے گا کہ ہندستان کے سامنے بڑے پیمانے پر صنعتی توسیع و ترقی کا پروگرام ہے۔ کمیٹی نے رائے دی ہے کہ حکومت ..۲۵ فٹ سے نیچے کے تمام کوئلوں پر اپنے حقوق قائم کردے اور جن علاقوں میں ابھی تک کوئلے کی کانیں نہیں کھودی گئی ہیں اُن پر بھی اپنے حقوق کا اعلان کردے۔ کمیٹی کا اندازہ ہے کہ ہندستان میں اچھے کوکنگ کوئلے کی مقدار شاید .... ۷ یا ... .۵۰,۷ ٹن سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر موجودہ رفتار سے وہ کوئلہ خرچ کیا جاتا رہا تو ۶۵ سال میں ذخیرہ ختم ہو جائے گا۔ اس لیے اعلا درجے کے کوئلے کی حفاظت لازمی ہے۔ کمیٹی نے یہ بھی رائے دی ہے کہ اگر بجلی کی طاقت کے استعمال کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا جائے تو کوئلے کی بچت ہوگی۔ بجلی کی طاقت پیدا کرنے میں جب کوئلہ خرچ ہوگا تو اس سے نہ صرف کوئلے کی حفاظت اور بچت ہوگی بلکہ ملک کی صنعتی توسیع و ترقی میں بھی مدد ملے گی۔ کمیٹی نے یہ رائے دی ہے کہ بنگال اور بہار میں .....۵ کیلو واٹ کے تین تین بجلی کے پلینٹ قائم کیے جائیں۔ کوئلے کی تقسیم پر جو آج کل کنٹرول ہے اُسے برقرار رکھا جائے۔ کوئلے کی قیمتوں پر ابھی کنٹرول کی سخت ضرورت ہے اور اُسے برقرار رکھنا چاہیے۔

ایک سب سے بڑی خرابی جس کی وجہ سے ہندستان میں کوئلہ کم پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ کوئلے میں مستقل طور پر مزدور کام نہیں کرتے، ہمیشہ کچھ مزدور کام چھوڑتے رہتے ہیں اور کچھ مزدور آتے رہتے ہیں۔ کوئلے میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت بھی بہت خراب ہے۔ اور اُسے سُدھارنے کی سخت ضرورت ہے۔ جو کوئلے کی کانیں مستحق ہیں اُن کو مالی امداد پہنچائی جائے صنعتی مالیاتی کارپوریشن کی طرف سے طویل عرصے کے لیے کوئلے کی صنعت کو امداد مہیا کرنے کی ضرورت ہے۔ کمیٹی کی یہ تجویز یقیناً کوئلے کی صنعت کی حالت بہت حد تک سُدھار دے گی اور ضرورت ہے کہ حکومت اس پر جلد سے جلد عمل کرنے کی کوشش کرے۔

مزدوروں کی حالت

مزدوروں اور مزدوری کی حالت پر تین سرکاری رپوٹیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ایک رپوٹ اس بات پر ہے کہ کارخانوں سے متعلق ۱۹۳۴ء والا قانون کس طرح عمل میں آرہا ہے۔ دوسری رپوٹ کا تعلق اس بات سے ہے کہ ۱۹۲۶ء والا مزدوروں کی انجمنوں سے متعلق جو قانون تھا اُس پر ۴۴-۱۹۴۳ء میں کس طور پر عمل کیا گیا۔ تیسری رپوٹ برطانوی ہند کے صنعتی مزدوروں کی تن دُرستی پر ہے۔

مجموعی طور پر ان رپوٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۴۴ء اور اس سے پہلے کے چند سال میں مزدوروں کی تعداد میں ور مزدوری میں بھی اضافہ ہوا۔ آسام میں ۶۷ فی صدی اور بمبئی میں ۳۰ سے لے کر ۵۰ فی صدی تک اضافہ ہوا۔ اس اضافے کی وجہ مہنگائی بھتّہ اور بونس وغیرہ ہے۔ لیکن جہاں تک صفائی کا انتظام اور صحت کا تعلق ہے حالت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ کارخانوں میں حادثات بھی پہلے سے زیادہ ہوے ہیں۔

جہاں تک مزدوروں کی انجمنوں کا تعلق ہے ۴۴-۱۹۴۳ء میں رجسٹرڈ انجمنوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ مذکورۂ بالا سال کے آخر میں مزدور انجمنوں کی تعداد ۸۱۰ تھی اور اُن کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۷۸۰۹۶۷، ان میں ۲۰۸۶۶ عورتیں تھیں۔ صحت کی جو رپوٹ ہے اس میں رپوٹ کے مصنف ڈاکٹر بیڈ فورڈ نے کئی باتوں کی سفارش کی ہے مثلاً مزدوروں کے لیے اچھے مکانات، صفائی، پانی، غذا اور تعلیم وغیرہ کے معقول انتظامات کرنا۔ کارخانوں کی تعمیر کے متعلق تحقیقات کرنا، کارخانوں میں صاف اور تازہ ہوا اور روشنی کا بندوبست کرنا، امراض خاص کر دق اور گرد سے پیدا ہونے والی بیماریوں کی روک تھام کرنا۔ وغیرہ۔

بیرونی ممالک سے ہندستان کی تجارت

جنگ کے دوران میں سلطنتِ برطانیہ کے ملکوں سے ہندستان کی درآمدی تجارت بہت گھٹ گئی اور برآمدی تجارت میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں ہندستان سے ۸۵ کروڑ رُپے کا مال سلطنتِ برطانیہ کے ملکوں کو گیا تھا اور ۱۹۴۵ء میں ۱۳۹،۱۲ کروڑ رُپے کا۔ ہندستان کی بیرونی تجارت حصہ مجموعی تجارت کا پہلے ۲۵،۷ فی صدی تھا اور اب ۵۹،۷ فی صدی ہو گیا۔ لیکن اس درمیان میں درآمد میں بہت ہی

قلیل اضافہ ہوا ہی۔ پہلے سلطنتِ برطانیہ سے درآمدی تجارت مجموعی تجارت کا ۲ ، ۷۰ فی صدی تھی اور سنہ ۱۹۴۵ء میں گھٹ کر ... فی صدی ہوگئی۔ بہر حال جنگ کے دوران میں جو کچھ بھی مال سلطنتِ برطانیہ کے ملکوں سے ہندستان آیا اُس میں کنیڈا اور جنوبی افریقہ کا سب سے زیادہ حصہ ہی۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں کنیڈا سے اس ملک میں ۷۰ لاکھ رُپے کا مال منگوایا گیا تھا اور سنہ ۱۹۴۵ء میں ۵ کروڑ ۱۹ لاکھ رُپے کا۔ یعنی اس تجارت میں ۴۷۰ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ لیکن ہندُستان سے جتنا مال کنیڈا بھیجا جاتا تھا اس میں صرف ۳۶۰ فی صدی کا ــــــ سنہ ۱۹۳۸ء میں کنیڈا کو جانے والے ہندُستانی مال اور ہندستان آنے والے کنیڈا ہی مال کا تناسب ۷۰ : ۲۰۴ تھا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں یہ تناسب ۵۱۹ : ۲۶۳ ہوگیا۔ ہندستان کو کنیڈا سے تجارت میں جو نفع ہوتا تھا اس میں بھی کمی واقع ہوئی ہی۔ یعنی سنہ ۱۹۴۴ء میں ۲۶۳ لاکھ رُپیہ منافع تھا اور سنہ ۱۹۴۵ء میں ۲۴۴ لاکھ رُپے کا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں بھی کنیڈا سے بہت سا مال ہندستان آیا۔ ایک ہی سال کے اندر اس مال کی مقدار اتنی زیادہ ہوگئی ہی کہ اس کی قیمت ۲۰۲ لاکھ رُپے سے ۵۱۹ لاکھ رُپے ہوگئی۔

تیلوں اور تلہنوں پر کنٹرول

کُل ہند تلہن کانفرنس جو ستمبر میں منعقد ہوئی تھی اُس کی سفارش پر غور کرنے کے بعد حکومت نے فیصلہ کیا ہی کہ خوردنی تیلوں اور تلہن کی قیمتوں اور نقل و حمل پر ارتباطی کنٹرول قائم کرنے کی پالیسی کل ہند بُنیادی اسکیم کے مطابق جاری رکھی جائے۔ صوبائی اور ریاستی حکومتوں کو مشورہ دیا گیا ہی کہ وہ اس پالیسی کے نفاذ کے لیے فوری کارروائی کریں۔

رہا تیلوں اور تلہن کی برآمدوں کا معاملہ تو حکومت کی اِس موجودہ پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی کہ صرف ایسی مقدار برآمد کرنے کی اجازت دی جائے جو ملک کی ضرورتیں پورا کرنے کے بعد بچ جائیں اور تلہن کے بجائے تیلوں کی برآمد کی اجازت دی جائے۔ حکومت برآمدی قیمتوں اور برآمد کے طریقے اور برآمدی مقداروں کے متعلق تفصیلات پر توجہ کر رہی ہی۔

مٹی کا تیل

اب برطانی ہند کے صوبوں کو اوسطاً اس مقدار کا ۱/۲ ۷ واں حصہ مل رہا ہی۔ جو انھیں سنہ ۱۹۴۱ء میں حاصل ہو رہی تھی یہ معلومات ورکس مائنز اینڈ پاور ڈپارٹ منٹ کے سکریٹری مسٹر بی۔ کے گوکھلے نے ۱۲ نومبر سنہ ۱۹۴۶ء کو ایک سوال کے جواب میں مرکزی مجلس قانون ساز کو مہیا کی۔ انھوں نے کہا کہ مٹی کے تیل کی قلت نہ صرف ہندستان بلکہ تمام دنیا میں ہی مگر ملکِ معظم کی حکومت کے رُوبرو عرض داشت پیش کرنے کے بعد ہندستان کی رسدوں میں اضافہ ہوگیا ہی۔ سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء میں ہندستان نے مجموعی طور پر ۵۰۷۸۴۶۵ ٹن مٹی کا تیل درآمد کیا۔ اور سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء سنہ ۴۴-۱۹۴۳ء اور سنہ ۴۵-۱۹۴۴ء میں یہ مقدار بالترتیب ۱۵۶۱۴۴۳ ٹن ۲۹۱۹۴۱ ٹن اور ۲۷۸۲۲۴۴ ٹن تھی۔ جنگ سے پہلے عام طور پر ہندستان ...۰۰۰ ۷ ٹن مٹی کا تیل لیتا تھا مسٹر گوکھلے نے کہا کہ تیل کے جہازوں کی صورتِ حال ابھی تک غیر تسلی بخش ہی لیکن توقع ہی کہ ہندستان کو کچھ زیادہ

...ہوں گی اُن کے لیے ٹنکیاں حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

انھوں نے کہا کہ صابونوں کی رسد بڑھ جانے کی وجہ سے مٹی کا تیل صرف کرنے والوں کے راشن میں اضافہ ہوسکے گا لیکن موجودہ حال کی اصلاح کا انحصار ٹین کی چادروں کی درآمد پر ہو جن کی قلت ہو کیوں کہ زیادہ مقدار اور تھوڑی مقدار کی تقسیم اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتی جب تک ٹین کی چادروں کے ذخیرے میں جلد اضافہ نہ ہوجائے۔ یہ معاملہ ایجنٹ جنرل حکومتِ ہند مقیم واشنگٹن کے ذریعے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے رُوبہ رُو پیش کیا گیا ہو۔
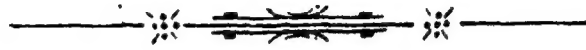
تبصرے

سیاسی نظریے سیاسی نظریوں کی مختصر تاریخ۔ حجم ۹۵ صفحات، خوش نما لکھائی چھپائی، سرورق رنگین۔ قیمت عہ۔
ملنے کا پتا، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

یہ لندن یونی ورسٹی کے پروفیسر سیاسیات مسٹر ہیرنشا کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ آخری باب جس میں موجودہ زمانے کے سیاسی نظریوں سے بحث کی گئی ہے مترجم نے خود بڑھایا ہے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب کا ترجمہ بہت اچھا اور صاف ستھرا ہے اور آخری باب بھی افادیت سے خالی نہیں ہے۔

جنگ کے دوران میں اُردو جاننے اور پڑھنے والوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا ہے جو سماجی علوم کا مطالعہ انگریزی میں نہیں بلکہ اُردو میں کرنا چاہتا ہے۔ چناں چہ اب اُردو میں ہمیں خالص تخلیقی ادب، شاعری اور افسانہ وغیرہ کے علاوہ سیاسیات، و معاشیات وغیرہ سے متعلق بھی کتابیں نظر آنے لگی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کا شائع ہونا اس لیے مفید ہے کہ یہ بہت ہلکے پھلکے انداز میں اور اختصار کے ساتھ ہمیں سیاسی افکار کی تاریخ اور اس کے بنیادی مسائل سے روشناس کرا دیتی ہے۔ سیاسی نظریہ علم تاریخ کا بہت ہی خاص اور مشکل موضوع ہے، ایسے مشکل موضوع پر اُردو میں ایک مفید کتاب کا شائع ہوجانا یقیناً باعثِ مسرت ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہ کتاب ہمیں سیاسی نظریوں کی تاریخ سے بہت مختصر طور پر آگاہ کرتی ہے اور غالباً اس موضوع سے متعلق سب کچھ جاننے کے لیے ہرگز اتنا کافی نہیں ہے۔ یہ کتاب بہت سے ادوار کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہے، قدیم یونانی اور رومی سیاسی نظریوں سے شروع ہوکر عہدِ متوسط اور جدید یورپ کے اور بالکل حال کے سیاسی نظریوں پر ختم ہوتی ہے۔ بہرحال اُردو میں اس موضوع سے دل چسپی لینے والوں کے لیے یہ ابتدائی اور بنیادی کتاب کا ضرور کام دے سکتی ہے۔

نظامِ نو مصنف مظہر الدین صدیقی، حجم ۹۶ صفحات، قیمت ۱۲؍
ملنے کا پتا:۔ مکتبہ نشاۃ الثانیہ۔ حیدرآباد دکن۔

مصنف نے موجودہ سیاسی اور سماجی حالات سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے اور ایک ایسے تمدن کی آرزو ظاہر کی ہے جس میں سماجی امن اور خوش حالی کے علاوہ اعلا اخلاقی نصب العین پر عمل کیا جا سکے۔ اس حد تک یقیناً کسی مفکر کو اختلاف رائے نہیں ہوسکتا، لیکن موجودہ عہد کے امراض کے جو اسباب مصنف نے بتلائے ہیں اور جو علاج پیش کیا ہے وہ یقیناً سائنسی طرزِ فکر اور طرزِ استدلال

ہیں بلکہ سراسر جذبات اور بنے بنائے عقیدوں پر، طرزِ بیان بھی خالص پادریانہ ہی۔ مصنف کا مطالعہ محدود ہی اور سیاسی و معاشی علوم کی کتابوں سے بالکل سپاٹ قسم کی لاعلمی ظاہر ہوتی ہی۔ بہرحال یہ جاننے کے لیے کہ ہمارے ملک کے لوگ کِن کِن سمتوں میں سوچ رہے ہیں اس کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں ہی۔

ہندستان کا مستقبل

مصنف پنڈرل مون۔ حجم ۲۱۱ صفحات۔ طباعت خوش نما اور دیدہ زیب۔ قیمت درج نہیں ہی۔
ملنے کا پتا: مکتبہ جدید لاہور۔

گزشتہ دو تین سال میں ہندستان پر غیر ملکیوں کی لکھی ہوئی متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ مثلاً بیورلی نکلس کا "فیصلہ ہندستان" ریک دوڈمرے کا "ورڈکٹ آن انڈیا" پنڈرل مون کا "اجنبی راج" وغیرہ۔ ان کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں ہی اس لیے بعض اوقات ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ غیر ملکی ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں، زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہی ان میں سے بعض کتابوں میں غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا طومار اور ہمارے لیے نفرت کا جذبہ یا ہماری خامیوں اور کم زوریوں کا مذاق ہی اور بعض کتابوں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہی کہ مصنف غیر ملکی ہونے کے باوجود ہماری طرف دوستی اور ہم دردی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہی۔ اگرچہ اس کے ہاتھ بڑھانے میں تھوڑی سی پس و پیش اور جھجک بھی ہوتی ہی۔ بیورلی نکلس کا "فیصلہ ہندستان" پڑھنے کے بعد پنڈرل مون کا "اجنبی راج" اور "ہندستان کا مستقبل" کا مطالعہ ہمارے ذہن میں اسی فرق کا احساس پیدا کرتا ہی۔ مصنف کے طریقۂ علاج سے چاہے ہم متفق نہ ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے ہندستان کی مشکلات اور اس کے مسائل و معاملات کو ہم دردی اور توجہ کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہی لیکن مصنف کا نقطۂ نظر آزاد ہونے کے باوجود سیاسی نقطۂ نظر سے کافی حد تک متاثر ہی۔ زیرِ نظر تصنیف میں جس قسم کا طرزِ عمل ہمیں ملتا ہی وہ ہندستان کے ساتھ برطانیہ کے موجودہ نیم اشتراکی اور نیم رجعتی طرزِ عمل کی ایک مثال ہی جس میں ایک طرف تو ہندستان کے سیاسی جذبات اور ارادوں کے صحیح ہونے کا اعتراف بھی ہوتا ہی، دوسری طرف بنیادی تبدیلیوں کی مخالفت اور اصلاحی نسخوں کی حمایت کی جاتی ہی۔ ساتھ ہی برطانیہ اور ہندستان کے درمیان سیاسی تعلقات کی قائم رکھنے کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہی۔